آگ کا دریا

قرۃ العین حیدر کی دیگر کتب

۱۔ ہمیں چراغ ہمیں پروانے
۲۔ کارِ جہاں دراز ہے
۳۔ پت جھڑ کی آواز
۴۔ سیتا ہرن
۵۔ فصلِ گل آئی یا اجل آئی
۶۔ گلگشت
۷۔ کوہِ دماوند
۸۔ چائے کے باغ
۹۔ جگنوؤں کی دنیا
۱۰۔ روشنی کی رفتار
۱۱۔ آدمی کا مقدر
۱۲۔ ماں کی کھیتی
۱۳۔ تلاش
۱۴۔ ڈھنگو
۱۵۔ آپس کے گیت
۱۶۔ جہانِ دیگر

آگ کا دریا

(ناول)

قرۃ العین حیدر

مکتبۂ اردو ادب

بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ لاہور

ناشر : سرفراز ملک

مطبع : ریٹا پریس لاہور

قیمت : ۱۲۵/- روپے

زہرآء حیدر کے نام

میں دیوتاؤں کے متعلق زیادہ نہیں جانتا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دریا
ایک طاقتور مٹیالا دیوتا ہے۔ تُند مزاج، غصیلا
اپنے موسموں اور اپنے غیظ و غضب کا مالک، تباہ کُن
وہ اُن چیزوں کی یاد دلاتا رہتا ہے جنہیں انسان بھول جانا چاہتے ہیں
وہ منتظر ہے اور دیکھتا ہے اور منتظر ہے
دریا ہمارے اندر ہے۔ سمندر نے ہمیں گھیر رکھا ہے۔
خاتمہ کہاں ہے — بے آواز چیخوں کا
خزاں میں خاموشی سے مرجھاتے پھولوں کا
جو چُپ چاپ اپنی پنکھڑیاں گراتے ہیں
جہاز کے بہتے ہوئے شکستہ ٹکڑوں کا خاتمہ کہاں ہے؟

خاتمہ کہیں نہیں ہے۔ صرف اضافہ ہے
مزید دنوں اور گھنٹوں کا گھسٹتا ہوا تسلسل۔
ہم نے کرب کے لمحوں کو ڈھونڈ نکالا۔
(سوال یہ نہیں کہ یہ کرب غلط فہمی کا نتیجہ تھا
یا غلط چیزوں کی تمنا کا۔ یا غلط چیزوں کے خوف کا)
یہ لمحے مستقل ہیں۔ جس طرح وقت مستقل ہے
ہم اس بات کو بہ نسبت اپنے کرب کے دوسروں کے کرب میں
بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں
کیونکہ ہمارا اپنا ماضی کرم کی دھاراؤں میں چھپا ہے
لیکن دوسروں کی اذیت ایک غیر مشروط تجربہ ہے
جو کبھی فرسودہ نہیں ہوتا
لوگ بدل جاتے ہیں۔ مسکراتے بھی ہیں مگر کرب موجود رہتا ہے
لاشوں اور خس و خاشاک کو اپنی موجوں میں بہاتے ہوئے دریا کی مانند
وقت جو تباہ کُن ہے، قائم بھی رکھتا ہے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کیا کرشن کا یہی مطلب تھا
کہ مستقبل ایک مدھم گیت ہے۔

اور ان کے واسطے جو ابھی پچھتانے کے لئے پیدا نہیں ہوئے
پچھتاوے کا گلِ سُرخ
جو ایک ایسی کتاب کے پیلے اوراق میں رکھا ہے
جو کبھی کھولی نہیں گئی۔
آگے بڑھو مسافرو۔ ماضی سے بھاگ کر
تم مختلف النوع زندگیوں یا کسی قسم کے مستقبل کی طرف
رواں نہیں ہو۔
آگے بڑھو۔ تم جو سمجھتے ہو کہ سفر میں ہو
تم وہ نہیں جنھوں نے بندرگاہ کو پیچھے ہٹتے دیکھا
یا جو دوسرے ساحل پر اُترو گے۔
اس لمحے کہ دونوں کناروں کے درمیان وقت معطل ہے
مستقبل اور ماضی پر یکساں دھیان کرو
یہ لمحہ کرم یا بہ کرم کا نہیں۔ جانو
کہ موت آنے کے سمے انسان کا دماغ وجود کے جس نقطے پر
بھی مرکوز ہو (اور موت کا سمے ہر لحظہ ہے)
وہ محض ایک کرم ہے
جو دُوسروں کی زندگیوں میں بار آور ہو گا۔
کرم کے پھل کا خیال نہ کرو۔ آگے چلو
او مسافرو اور ملاحو!
تم، جو گھاٹ پر اترو گے اور
تم، جن کے جسم سمندر کے فیصلے سہیں گے
یا جو کچھ بھی تم پر بیتے گی، یہ تمھاری منزل ہے،
کرشن نے ارجن سے میدانِ جنگ میں کہا
الوداع نہیں۔ بلکہ — آگے بڑھو
مسافرو

(ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ)

۱

گوتم نیلمبر نے چلتے چلتے ٹھٹھک کر پیچھے دیکھا۔ راستے کی دھول بارش کی وجہ سے کم ہو چکی تھی۔ گو اس کے اپنے پاؤں مٹی سے اٹے تھے۔ برسات کی وجہ سے گھاس اور درخت زمرد کے رنگ کے دکھلائی پڑ رہے تھے۔ اسوک کے نارنجی اور سرخ پھول گہری ہریالی میں تیزی سے جھلملاتے تھے اور ہیرے کی ایسی جگمگاتی پانی کی لڑیاں گھاس پر ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئی تھیں۔ ندی کے پار پہنچتے پہنچتے بہت رات ہو جائے گی۔ گوتم کو خیال آیا۔ گھاٹ پر کشتیاں کھڑی تھیں اور برگد کے نیچے کسی من چلے ملّاح نے زور زور سے ساون الاپنا شروع کر دیا تھا۔ آم کے جھرمٹ میں ایک اکیلا مور پر پھیلائے کھڑا تھا۔ شراوستی یہاں سے پورے پچیس کوس تھا۔ اور گوتم نیلمبر کو ندی تیر کر پار کرنا تھی۔ گھاٹ پر تین لڑکیاں ایک طرف کو بیٹھی باتیں کر رہی تھیں ان کے ہنسنے کی آواز یہاں تک آ رہی تھی۔ لڑکیاں کتنی باتونی ہوتی ہیں۔ گوتم نے سوچا۔ انھیں بھلا کون سے مسئلے حل کرنا ہیں۔ اس کا دل چاہا کہ نظر بھر کر انھیں دیکھ لے۔ خصوصاً اس کیسری ساری والی لڑکی کو جس نے بالوں میں چمپا کا پھول اڑس رکھا تھا۔ اس کے ساتھ نچلی سیڑھی پر جو لڑکی آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ اس کے گھنگھریالے بال تھے۔ اور کتابی چہرہ اور جڑی ہوئی سیاہ بھویں۔ قریب پہنچ کر گوتم نے ان دونوں کو لحظہ بھر کے لئے دھیان سے دیکھا اور پھر جلدی سے نظریں جھکا لیں۔ گھاٹ کی آخری سیڑھی پر پہنچ کر اس نے تیزی سے پانی میں چھلانگ لگا دی اور دوسرے کنارے کی طرف پیرنے میں مصروف ہو گیا۔

لڑکیوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ کوئی ودیارتھی جان پڑتا ہے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ ملّاح اپنی اپنی ڈونگیوں میں بیٹھے دوسرے مسافروں کا انتظار کر رہے تھے۔ کشتیاں جو برگد کے سائے میں بندھی تھیں۔ ان میں چولہے روشن کیے جا چکے تھے اور رات کا کھانا بننا شروع ہو چکا تھا۔

ٹپ سے بارش کا ایک قطرہ چمپک کے بالوں پر آن گرا۔ اُس نے ندی کی اور دیکھا جدھر وہ اجنبی طالب علم لہروں کے خلاف ہاتھ پاؤں مارتا کسی انجانی سمت جا رہا تھا۔

"بڑی کٹھن زندگی ان بے چاروں کی ہوتی ہوگی۔" نرملا کو اپنے بھائی کا خیال آگیا۔ جو اسی کی طرح ان گنت ندیاں، چٹیل میدان اور دشوار گذار پہاڑیاں عبور کر کے بہت دُور تکشلا گیا ہوا تھا اور اب تک نہیں لوٹا تھا۔

"جب یہ لوگ اتنا پڑھ جاتے ہیں تو کیا ہوتا ہے۔" تیسری لڑکی نے بے دھیانی سے پوچھا۔ اس لڑکی کا نام سروجنی تھا۔

"ہوتا کیا ہے۔ جھک مارتے ہیں۔ کسی نئے دھرم کا اوشکار کر لیتے ہیں یا کسی نئے فلسفے کا پرچار شروع کر دیتے ہیں۔" نرملا نے جل کر جواب دیا۔ اس کا اکلوتا بھائی تکشسلا میں ریاضی اور صرف و نحو سے سر کھپانے کی بجائے یہاں گھر پر ہوتا تو کیا چمپک اس سے بیاہ نہ کر لیتی۔

"باہمن بچارے کریں بھی کیا۔ پڑھیں نہیں تو کہاں جائیں۔ پڑھنا تو ان کے بھاگیہ میں لکھا ہے۔" سروجنی نے منہ لٹکا کر کہا۔

ندی کے وسط میں پہنچا تو بارش کی دوسری بوند گوتم کے سر پر آن گری۔ برسات کی وجہ سے سرجو کا پاٹ بے حد چوڑا ہو گیا تھا۔ سون ندی کے پاٹ سے بھی زیادہ چوڑا جسے پاٹلی پتر جاتے ہوئے گوتم نے ایک مرتبہ تیر کر عبور کیا تھا۔ اس نے پیرتے پیرتے پلٹ کر ایک بار دیکھا۔ گھاٹ پر لڑکیاں اب تک بیٹھی تھیں اور وہ بھی موجود تھی جس کے بالوں میں چمپا کا پھول تھا۔ ان لوگوں کو مینہ میں بھیگنے کا بھی ڈر نہیں گوتم نے دل میں کہا اور پھر جلدی جلدی لہروں کا مقابلہ کرنے میں منہمک ہو گیا۔ سامنے دوسرے کنارے پر دریائی گھاس اور نیلے پھولوں کی گھنی بیلیں پانی کی سطح پر جھک آئی تھیں۔ برگد کے سائے تاریک ہو چلے تھے۔ سارس اور مور سمٹے سمٹائے اداس کھڑے تھے۔ چار پانچ آدمی انگوچھے کندھے پر ڈالے جلدی جلدی گاؤں کی اور قدم بڑھا رہے تھے۔ کنارے پر پہنچ کر گوتم نے اپنے کپڑے نچوڑے اور ناتراشیدہ پتھروں سے بنے ہوئے مندر

میں گیا جس کے ایک کونے میں وہ اپنا زادِ راہ چندرا دیوی کو سونپ کر ایودھیا گیا تھا
ایک چھوٹی سی پوٹلی میں اس کے موقلم تھے اور سفید ریشم کے چند ٹکڑے۔اس کا کمبل
تھا۔ایک سفید رنگ کی دھوتی اور چمڑے کے چپل۔اس نے بے پروائی سے پوٹلی اٹھائی
پیر صاف کر کے چپل پہنے اور مندر سے باہر نکل آیا۔چاروں اور بڑا سناٹا تھا اور مندر
کے آنگن میں تنہا اُسے بڑا ڈر لگتا تھا کیسی خوفناک بات ہے۔ ہی شکل برہما جب شکل
میں ظاہر ہوتا ہے تو اس نے سے گھبراہٹ کیوں ہوتی ہے۔کیا انسان کو دوسرے کے
وجود پر اعتماد نہیں۔گوتم نیلمبر نے خوف کے جذبے کا اکثر تجزیہ کرنا چاہا تھا۔زندگی کا
خوف۔موت کا خوف۔ زندہ رہنے کا خوف۔ رگ وید میں لکھا تھا کہ ابتدا میں خودی تھی
جو پُرش کی شکل میں نمودار ہوئی۔اُس نے چاروں اور دیکھا اور سوائے اپنے اسے کوئی
نظر نہ آیا۔اُس نے کہا یہ میں ہوں۔چنانچہ وہ خود کو "میں" سمجھنے لگا۔اُسے ڈر لگتا تھا
چونکہ وہ تنہا تھا اِس لیے جو اکیلا ہوتا ہے۔ اسے ڈر لگتا ہے۔پھر اُس نے سوچا
میرے سوا کوئی موجود نہیں تو پھر مجھے کاہے کا ڈر ہے؟ لہٰذا اُس نے خوفزدہ ہونا چھوڑ
دیا مگر اسے مسرت حاصل نہ تھی۔

کیونکہ تنہائی میں اداسی ہوتی ہے۔

اور اداسی سے ڈر لگتا ہے۔ مجھے اپنی روح کی تنہائی سے ڈرنا نہیں چاہیے۔
گوتم نے اپنے آپ سے کہا۔

مندر بہت پُرانا تھا۔ آس پاس گوتم کو کوئی پروہت یا پجاری بھی نظر نہ آیا جس سے
وہ پوچھتا کہ شراوستی جانے کے لیے کون سا راستہ اختیار کرے۔ یہاں سے کھیت
ختم ہوتے تھے اور آگے شیشم کے گھنے جنگل تھے اور ڈھاک کے جھنڈ اور بیہڑ اور
ان گنت ندی نالے۔اور ان سب کو عبور کر کے اسے اپنے آشرم واپس پہنچنا تھا۔مندر
کی سیڑھیاں اتر کر وہ گاؤں کی سمت بڑھا۔سرجو کے پار ایودھیا کی روشنیاں جگنوؤں کی ایسی
جھلملا رہی تھیں۔ بارش کی دھند میں سارا منظر نیلا اور راداسا دکھلائی دے رہا تھا جس میں
نارنجی رنگ کی دھاریاں ایسی پھیل گئی تھیں۔ گوتم نے آبادی میں پہنچ کر دو تین دروازوں پر

دستک دی۔ رات کے کھانے کے لیے اسے صرف دال درکار تھی۔ ایک پیپے پتے کچے مکان کی دیوار پر روشنی جل رہی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر کا گرہست اس روشنی میں بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔ برآمدے کے باہر گھپ اندھیرا تھا۔ گوتم کی آواز سن کر وہ اسے شاکیہ منی کا کوئی بھکشو سمجھا۔ پھر وہ چراغ اٹھا کر باہر لایا۔ اور اس کے اجالے میں اسے گوتم کے سفید کپڑے نظر آئے۔

”آج کل یہاں شاکیہ منی کے بھکشوؤں کی ایک ٹولی آئی ہوئی ہے۔ میں سمجھا تم ان ہی میں سے ہو۔“ اس نے رسان سے کہا: ”جب سے یہ نئی ہوا چلی ہے۔ لڑکے تو لڑکے لڑکیاں بھی گھر بار چھوڑ کر جنگل بسا رہی ہیں۔“

”مجھے تھوڑی سی دال دے دو۔“

گرہست نے چراغ برآمدے کی منڈیر پر رکھا اور اپنی بی بی کو آواز دی۔ اس کے بعد پھر سے باتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ”رکمنی۔ ایک برہمن برہمچاری ہمارے دوار پر آئے ہیں۔“

پھر وہ گوتم سے مخاطب ہوا۔ ”سامنے نگر میں ایک بٹیا ہیں۔ رانی رینوکا کی ایسی روپ وان کل میری بی بی جب ہاٹ کے لئے نگر گئی تو راج نواس کی داسیوں سے اس نے سنا کہ وہ بٹیا بھی کسی وہار میں جانے والی ہیں — یہ اندھیر دیکھو۔“ اتنے میں اس کی بی بی آٹا دال لے آئی۔ جو گوتم نے اپنی چادر پھیلا کر اس سے لے لیا اور اسے دعا دی۔ گرہنی نے جھک کر اسے پرنام کیا اور اندر چلی گئی۔ اس کا میاں خوشدلی سے ہنستا رہا — ”اچھی ہوا چلی ہے میں تو کہتا ہوں۔ ماں باپ اب اپنی لڑکیوں کی شادی بیاہ کی فکر سے بھی نشچنت ہو گئے۔“ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

اناج کی پوٹلی باندھنے کے بعد گوتم ذرا کی ذرا برآمدے کے کھمبے سے ٹکا۔ یہ گرہست بڑا خوش مزاج معلوم ہوتا تھا۔ گوتم کا جی چاہا کہ کچھ دیر رک کر اس سے باتیں کرے۔ مگر اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ عیش و آسائش کی طرف راغب ہو رہا ہے چنانچہ اس نے فوراً اس خیال کو دل سے نکال پھینکا۔ گو یہ جان کر اسے خوشی ہوئی

کہ بدھ طالب علموں کا گروہ بھی ادھر آیا ہوا ہے۔ اگر کہیں مل گئے تو رات اچھی گذر جائے گی۔ اسے بدھ طالب علموں اور فلسفیوں سے بحث مباحثہ کرنے میں بہت لطف آتا تھا۔

"وہ لوگ کدھر گئے ہیں؟" اس نے گرہست سے پوچھا۔ "یہ تو مجھے پتہ نہیں باہمن تم اندر کیوں نہیں آجاتے۔ آؤ بیٹھو تمھاری سیوا تو میرا دھرم ہے ـــ"

"نہیں اب میں چل ہی دوں ـــ" گوتم نے جواب دیا۔ وہ اپنی اس عزت و تکریم کا عادی تھا۔ چلتے پھرتے ہر سمے اس کا ادب کیا جاتا۔ سڑک پر سے گذر رہا ہوتا۔ تو راہگیر اس کے لیے راستہ چھوڑ دیتے۔ بڑے بڑے شہزادے اس کی خاطریں کرتے۔ غریب کسان اسے آنکھوں پر بٹھلاتے محض اس لئے کہ وہ طالب علم تھا اور علم کا محافظ۔

گرہست نے چراغ منڈیر پر سے اُٹھایا اور اندر جا کر پھر پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ گوتم چند لمحوں تک اندھیرے میں کھڑا یہ منظر دیکھتا رہا۔ اندر بچے کھیل رہے تھے۔ گرہست کی بی بی، سانولی دُبلی سی لڑکی جس نے اُسے آٹا لا کر دیا تھا چولھے کے آگے بیٹھی تھی۔ دروازے کی چوکھٹ پر پہاڑی مینا کا پنجرہ ٹنگ رہا تھا کس قدر پُرسکون منظر تھا۔ اس سے بھی اسے ڈر لگا۔ گرہیہ اگنی کے مدھم اجالے میں جگمگاتی ہوئی لڑکی جو اس معمولی صاف ستھرے کچّے مکان کی مالکن تھی، برآمدے پر جھکے ہوئے کیلے کے ٹھنڈے پتے، پروں میں چونچ دے کر سوتی ہوئی مینا۔ گرہیہ اگنی یونہی جلتی رہتی ہے، اور ایک دن چتا کے شعلوں میں تبدیل ہو جاتی ہے اور چتا کے انگاروں کی آگ سے ایک اور گھر کے چولھے کی بنیاد پڑتی ہے۔ یہی آگ دلہن اپنے ساتھ گھر سے لے کر نکلتی ہے۔ یہ سارے دور ہر انسان پر گذرتے ہیں۔ اس پر بھی گذریں گے۔ مناظر کے کیا معنی ہوتے ہیں وہ کبھی نہ سمجھ پایا۔ شراوستی میں اس کا سہ منزلہ مکان تھا۔ جس کے برآمدے کے چوبی کھمبوں پر رنگین نقش و نگار بنے تھے۔ اس سڑک پر اس کا مکان سب سے اونچا تھا۔ اس کا باپ بہت دولت مند آدمی تھا اور اس کی بہن کا بیاہ حکومت کے ایک اعلیٰ عہدے دار سے ہوا تھا۔ یہ اس کی تعلیم کا آخری سال تھا۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد اب ساری دُنیا اس کے قدموں میں بکھری پڑی ہوگی۔ وقت اس کا اپنا تھا۔ فراخ دلی کے ساتھ وہ فلسفوں کو پرکھتا اور سوچتا مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ کیا تھا کہ چیزوں سے وہ خوف زدہ تھا۔ بارش میں بھیگتی لڑکیاں جو اس پار گھاٹ پر بیٹھی تھیں۔ برگد کا یہ جنگل جس میں نارنجی لباس پہنے بھکوؤں کی ٹولی کہیں گھوم رہی ہوگی۔ اس ادھیڑ عمر کے باتونی گرہست کی بیوی جس کا نام رکمنی تھا۔ یہ سب چیزیں کیوں تھیں۔

آبادی سے لوٹ کر وہ مندر کی طرف واپس آیا۔ آنگن میں پہنچ کر اس نے زمین میں چھوٹا سا گڑھا کھود کر چولھا بنایا اور مٹی کی ہانڈی میں چاول اُبالنے کے لیے چڑھا دیے۔

کچی پکی دال بھات کھانے کے بعد وہ مندر کی دیوار سے پیٹھ ٹکا کر بیٹھ گیا۔ سامنے دریا پر تاریکی گہری ہو چکی تھی۔ چاند بہت مدھم تھا اور کہیں بادلوں میں چھپا تھا۔ ہوا میں تازہ پھولوں کی مہک تھی۔ سارا جنگل اندھیارے میں سائیں سائیں کر رہا تھا۔ صبح سویرے اُٹھ کر اُسے اپنا سفر جاری رکھنا ہے۔ اس نے سوچا۔ اُسی وقت دفعتاً اسے پیروں کی آہٹ اور کسی کی مدھم ہنسی کی آواز سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ چند لمحے منتظر رہنے کے بعد وہ سرک کر فرش پر لیٹ رہا۔ نیچے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر مندر کی دیوار پر سے کسی نے جھانکا۔ اندھیرے میں گوتم کو اس کی صورت نظر نہیں آئی۔

"تم کون ہو بھائی۔" نیچے سے کسی نے پوچھا۔

"میں ہوں۔" گوتم نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔

"تمہارا کیا نام ہے۔؟"

"میں کا کوئی نام نہیں ہوتا۔"

"تفریق کے لیے نام ضروری ہے۔"

"شراوستی کے جن پنڈتوں کے گھرانے میں پیدا ہوا وہاں دوسرے پنڈتوں سے پوچھ کر میرا نام گوتم رکھا گیا تھا۔"

"بھائی گوتم نیچے آجاؤ۔"

تم خود اوپر کیوں نہیں آتے۔"

"اونچائی اور نیچائی محض ذہنوں کے فرق سے ہوتی ہے۔"

"ہوں۔"

"تم کو کیا معلوم جسے تم اونچائی سمجھ رہے ہو وہ پاتال سے بھی گہری ہو۔"

"بھائی۔" گوتم نے اسی طرح دیوار سے نیچے جھانکے بغیر سوال کیا۔ "کیا تم بھگوت ہو—؟"

"نہیں—مگر تم مندر سے نیچے نہیں اترو گے؟"

"نیچے سانپ ہوں گے اور کیڑے مکوڑے۔ اور کیڑے مکوڑوں سے دوستی کرنا میں نے ابھی شروع نہیں کیا۔" اتنا کہہ کر گوتم دل میں ہنسا۔ ممکن ہے یہ آواز کسی جین سنیاسی کی ہو— پاٹلی پتر کے شاہی خاندان نے جین عالموں کو بہت سر چڑھا رکھا تھا اور باضابطہ ان کے سدھانت کا مطالعہ کرتے تھے۔ "میں یہاں پتھر کے فرش پر لیٹا ہوں۔ تم بھی یہیں آجاؤ۔" اس نے یاد از بلند پھر کہا۔ سوفسطائی ٹھگ پرست دہریئے—منطقی—جنگلوں جنگلوں بحثیں کرتے مل جاتے تھے۔ یہ بھی ان میں سے کوئی دل چلا ہے— گوتم نے سوچا۔ ان گنت منطقی گنگا کی وادی میں گھومتے پھرتے تھے۔ ماہرین کلام روایتی مذہب پر حملے کرتے۔ آرار اور اشیاء کی اضافیت کو ثابت کرنے میں مصروف رہتے۔ ان میں سے بہت سے مابعد الطبعیاتی نظریات کے حامل تھے۔ اکثر مادہ پرست تھے۔ جین اور بدھ فلسفی بیک وقت یوگی بھی تھے اور سوفسطائی بھی۔ انھی گھنے جنگلوں میں بڑے بڑے شہزادے اور بادشاہ جٹائیں بڑھائے سادھو دل کی زندگی گزار رہے تھے اور پچھلی صدی میں کپلا وستو کے شہزادے نے بھی جنگل کا راستہ اختیار کر کے ملک کی اس روایت کو نبھایا تھا۔ ان کی آمد کے وقت باسٹھ مدرسہ ہائے فکر اپنی مختلف شاخوں سمیت پہلے سے موجود تھے۔ خیالات کی اس سلطنت میں انھوں نے بھی جو شاکیہ منی سدھارتھ کہلائے فلسفے کی ایک اور نوآبادی قائم کر دی تھی۔

باسٹھ مختلف نظریئے—اور زندگی ایک ہے—اور انسان تنہا ہے۔

گوتم نے آنکھیں بند کرلیں اور اسی طرح لیٹا رہا۔
"تم کون ہو بھائی؟" کچھ دیر بعد گھبرا کر اُس نے دوبارہ آواز دی۔ "اب یہ سوال میں تم سے کرتا ہوں۔ گو اگر تم اپنی اصلیت مجھ سے چھپانا چاہو تو مجھے کوئی آپتی نہیں۔"
"نام آوازوں کی ایک سمشٹی ہے بھائی گوتم۔ اور ہری شنکر کی آواز پر میں چونک اُٹھتا ہوں۔ کیونکہ یہی میرا نام ہے۔"
"بھائی ہری شنکر کیا تم کرشن واسودیو کے بھگوت ہو۔؟"
"نہیں۔ میں اس سمے اُتر پچھم کی اور سے آ رہا ہوں۔ جہاں شیو کی ارادھنا کی جاتی ہے۔ گوتم میں نے کاشمیرا کی برف میں بڑی خوبصورت جگہیں دیکھی ہیں۔ بعض دفعہ خیال آتا ہے کہ زندہ رہنا بڑی نعمت ہے۔"
"میں نے زیادہ سیاحت نہیں کی۔ مجھے اس کا بڑا دکھ ہے۔"
"صرف اسی کا دُکھ ہے؟ تم نے دُکھ کے فلسفے پر کتنا غور کیا ہے بھائی گوتم؟"
"آج کل میں اسی پر غور کر رہا ہوں۔"
"جہاں میں پڑھتا تھا وہاں ہم لوگ فلسفے اور ساہتیہ کے بجائے گنت وویا اور قانون اور طبیعیات پر زیادہ دھیان دیتے تھے۔ لیکن رنج سے میرا بڑا گہرا سمبندھ ہے گوتم نیلمبر۔"
"کیا تم اجینی سے آرہے ہو؟"
"نہیں۔ اس سے بھی بہت آگے سے۔"
"تکشسلا۔؟"
"ہاں۔"
"میرا وہاں جانے کو بہت جی چاہتا ہے۔ تم نے اپنی تعلیم ختم کرلی؟"
"ہاں — پھر میں بہت لمبے سفر پر نکل گیا۔ اپار سمندر کے کنارے میں نے

۱؎ اعتراض۔ ۲؎ مجموعہ

دوارکا کے درشن کیے میں متھرا گیا۔ برہم ورت میں ہستناپور کے کھنڈر میں نے دیکھے۔ گوتم میں نے اندازہ لگایا کہ وقت بہت خوفناک چیز ہے۔ کیا تم کبھی وقت کے خوف سے لرزتے ہو؟"

"ہاں ۔۔" گوتم نے آنکھیں بند کیے کیے جواب دیا ۔۔ اندھیرے مندر کے برآمدے پر جھکے ہوئے پیپل کے پتے سُرخ نظر آ رہے تھے۔

"کیا تم بدھ ہو ۔۔" گوتم نے کچھ دیر بعد پوچھا

"ہاں !۔ تمھیں کیسے معلوم ہُوا ؟"

"شام جب میں بھیک مانگنے کے لیے گاؤں میں گیا تو ایک گرہست نے مجھے بتلایا تھا کہ تم لوگوں کی ایک ٹولی ادھر آئی ہوئی ہے ۔"

"تم بھی ۔۔ ہو ۔۔ ؟"

"میں نے اپنے ذہن کا دروازہ ابھی کھلا چھوڑ رکھا ہے ۔"

"اور دل کا ۔؟"

"دل اور ذہن کا کیا سمبندھ ۔۔ ؟"

"میں تم کو ایک بات بتلاؤں ۔۔ ؟" اتنا کہتے کہتے دوسرا نوجوان منڈیر کود کر مندر کے برآمدے میں آگیا۔ بحث کے جوش میں اس نے اپنے کھڑاؤں اتار کر ایک طرف کو پھینکے اور چنڈی کے سامنے سے دیا اٹھا کر اُس کی روشنی میں گوتم کو غور سے دیکھنے لگا گوتم اٹھ کر دیوار کے سہارے بیٹھ گیا ۔ اس نے بھی دلچسپی سے نووارد کو دیکھا جو بہت دُور سے آ رہا تھا

"تم یہیں کہیں آس پاس کاشی واشی میں پڑھتے ہو ۔۔ ؟" دوسرے لڑکے نے گوتم کے قریب پاؤں پھیلا کر بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

"میں شراوستی میں پڑھتا ہوں۔ کاشی کی پاٹ شالہ تو خالی مہا پنڈت تیار کرتی ہے"

"اور تم کیا بننا چاہتے ہو ؟"

"یہی تو سمجھ میں نہیں آتا۔"

"تمھاری زندگی کا مقصد کیا ہے گوتم نیلمبر ۔۔؟"

"تم بھی اس اندھیارے میں سے نمودار ہو کر مجھ سے یہی سوال کرنے آئے ہو ۔۔؟" گوتم نے چڑ کر کہا ۔ اب ہوا میں خنکی آچلی تھی ۔ جنگل کی بھیگی ہوئی ہوا جو سرجو پر سے بہتی آ رہی تھی ۔ اس کے جھونکوں میں چراغ کی لو جھلملا اٹھی ۔ گوتم نے اپنے نئے ساتھی کو غور سے دیکھا ۔ اس کا ذہین اور خوبصورت چہرہ گوتم کو مانوس سا نظر آیا ۔ گہری سیاہ جڑی ہوئی بھویں اور کتابی چہرہ ۔ اور گھونگھر والے بال یہ شکل میں نے پہلے کہاں دیکھی ہے؟ ابھی ابھی دیکھی ہے ۔ گوتم نے بڑبڑا کر سوچا اگر یہ اپنے گھنگر یالے بال منڈوا دے تو شاید کچھ مختلف معلوم ہو ۔ ورنہ یہ تو جانا پہچانا سا چہرہ ہے ۔

"تم نے اپنا سر نہیں گھٹوایا ۔۔ کیسے بھکشو ہو ۔" گوتم نے ذرا بشاشت سے سوال کیا ۔

"میں نے بھی اپنے ذہن کا دروازہ ابھی کھلا چھوڑ رکھا ہے ۔۔"

"اور تمھارا سنگھ ۔۔؟"

"میرا سنگھ اور میں دو مختلف چیزیں ہیں میں آزاد ہوں ۔ اور مزید آزادی کی تلاش میں مصروف ۔۔"

"تم کہاں کے رہنے والے ہو ۔۔؟"

نوجوان نے دریا کی سمت اشارہ کیا "اس پار کا ۔"

"اچھا ۔" گوتم ذرا چونک کر اٹھ بیٹھا ۔

"تمھیں اتنا اچنبھا کاہے کے لیے ہوا؟ ہم سب کو کہیں نہ کہیں تو پیدا ہونا ہی ہے ۔ ممکن تھا کہ میں میفس میں پیدا ہوا ہوتا اور تم یاوادیپ میں ۔" ہری شنکر نے تبسم کے ساتھ گوتم کو دیکھا

"تم یہیں کے رہنے والے ہو اور اب بھکشو بنے اجنبیوں کی طرح گھوم رہے ہو"

"ہم سب ایک دوسرے کے لیے ازلی اور ابدی اجنبی ہیں ۔"

گوتم خاموش ہو گیا ۔ ہری شنکر ۔ اس نے اپنے دل میں کہا ۔ تم بحث میں مجھے

ہری نہیں سکو گے۔ شاکیہ منی بھی آخر اسی کوشل دیس کے رہنے والے تھے۔ وہ بھی شراوستی میں اکثر برسوں رہے۔ انھیں پری نروان حاصل کیے ابھی زیادہ مدت نہیں گذری تھی مگر سارا ملک ایک نئے۔ نارنجی رنگ میں رنگتا جا رہا تھا۔ اس کی تیوری پر بل آ گئے۔ اس نارنجی ساری والی لڑکی کی یاد اُس کے ذہن میں کوندی اور اسے بڑی کوفت ہوئی۔ "جب سے یہ ہوا چلی ہے لڑکیاں بھی گھر بار تج کر جنگل بسا رہی ہیں —" اُس نے باوازِ بلند دہرایا "تمھیں ویدوں پر یقین نہیں رہا جو تم نے یہ حلیہ بنایا ہے۔" اس نے ذرا جھنجلا کر کہا "بھکشو کا فلسفہ اور تمھاری ساری پراکی بھاشا اپنشدوں میں موجود ہے۔ شاکیہ منی شروع سے آخر تک کپل کے نظریوں سے متاثر تھے۔ خود بدھ کا لفظ وید سے نکلا ہے۔ کوئی چیز خیالات کی دُنیا میں نشس کیول[1] اور بے تعلق نہیں ہے۔ تم الفاظ کا پریوگ[2] کیوں کرتے ہو —؟"

ہری شنکر چپکا بیٹھا رہا۔ پھر اُس نے ذرا مسکرا کر پوچھا "تم کو لڑکیوں کی کیا فکر ہے۔ کوئی خاص لڑکی وہار میں جانے والی ہے —؟"

"تم لوگ اس طرح ہنستے کیوں ہو —؟ دیکھو تمھارے آنند پر کیا بیتی تھی —" گوتم نے اور زیادہ چڑ کر کہا۔

"گوتم نیلمبر میں اس سمے۔ بحث بالکل نہیں کرنا چاہتا۔" ہری شنکر نے ٹانگیں اور پھیلا کر آرام سے لیٹے ہوئے جواب دیا۔

"تم کاہے سے بھاگ رہے ہو۔" گوتم نے غصے سے پوچھا

"تم کاہے کی تلاش میں ہو —؟" ہری شنکر نے اسان سے کہا "میرے بھیا تو ساری تلاش ختم ہو چکی —"

"اگر میری درس گاہ میں اعلیٰ اخلاق برتنے کا اپدیش نہ دیا جاتا تو میں ہی کھڑاؤں تمھاری۔ تمھاری ناک پر لگاتا —!"

---

[1] خالص [2] استعمال

ہری شنکر نے قہقہہ لگایا" اگر مجھے دوستوں کی ضرورت نہ رہی ہوتی تو میں تمہیں اپنا دوست بنا لیتا۔"

"تم خود پرست ہو ۔"

" اور تم ذہن کے غرور میں مبتلا ہو۔"

"تمہیں ناٹک سے دلچسپی ہے۔؟" گوتم نے موضوعِ گفتگو بدلا

"تھی ۔" مختصر جواب ملا

"اچھا۔؟؟ مگر الفاظ کا ناٹک تو تم ہر سے کھیلتے ہو۔" ہری شنکر خاموش رہا اُس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔ گوتم جوش میں آ کر بولتا رہا " تین سو سال ہوئے تمہارے تکششلا میں ایک شخص گزرا ہے جس کا نام پانِنی تھا۔ اس نے الفاظ کے اسرار کی ایک نئی کائنات دریافت کی تھی۔ جب تلاش ختم ہو چکی ہے تو الفاظ کا استعمال کیوں کرتے ہو۔ الفاظ کو بھی ملتوی کر دیکھو۔"

ہری شنکر کروٹ بدل کر کہنیوں کے بل بیٹھ گیا۔ "گوتم میں نے پانِنی کی آٹھوں کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ میں کاشمیرا کے مدرسوں میں گیا ہوں جہاں سنسکرت کو مکمل بنایا جا رہا ہے۔ میں نے یادُنوں کی بولی بھی سیکھی ہے اور پارسیکا ون کی بھی۔ لیکن اب میں الفاظ کو ختم کرنا چاہتا ہوں ۔

"کیونکہ ۔" ہری شنکر کہتا رہا " زبان ۔ الفاظ وعدے کرتے ہیں جو نبھائے نہیں جاتے۔ خیالات کا اظہار کرتے ہیں جن کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ ان کے معنی کی کھوج میں بھاگنا شروع کیا تو بھٹک کر میں کہاں سے کہاں جا نکلا اسی وجہ سے گوتم سدھارتھ نے کہا تھا کہ ۔"

"لیکن ۔" گوتم نیلمبر نے ہری شنکر کی بات کاٹی ۔ " لیکن ادم کے تین حرفوں اور ساپاسا کے تین سُروں کے درمیان ۔ تو کائنات کا سارا وجود بندھا ہوا

ہ اہلِ یونان

ہے۔ آواز آکاش کا ایک گن ہے۔"

"رک جاؤ۔" ہری شنکر بولا

"برہسپتی مادہ پرست آکاش کو نہیں مانتے ۔ تم تو مانتے ہو۔"

"مگر تمہارے ہمنام گوتم نے تو کہا تھا کہ اگر آواز ابدی ہے تو زبان سے پہلے ہی لفظ سنائی دے جانا چاہیے۔ کیونکہ آکاش اور ہمارے کانوں کے درمیان کوئی روک نہیں ہے۔" ہری شنکر نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"لفظ بھی ابدی ہے۔" گوتم نے جواب دیا۔ "حرف م ہمیشہ سے موجود ہے۔ یا حرف ن — اس کو جب بھی ادا کیا گیا ہوگا اس کی آواز یہی رہی ہوگی۔ جیمنی کہتا ہے کہ آواز اس لیے ابدی ہے کہ سننے کے بعد دماغ کو یاد رہتی ہے اور بیک وقت ہر جگہ موجود ہے اور کبھی ختم نہیں کی جا سکتی۔"

"اور اسی لیے ویدوں کو — کیونکہ وہ الفاظ ہیں۔ کبھی رد نہیں کیا جا سکتا —؟" ہری شنکر نے نظریں اٹھا کر پوچھا۔

"تم کیسے فلسفی ہو جو الفاظ میں یقین نہیں رکھتے —" گوتم نے جھنجھلا کر جواب دیا "پانینی تمہارے تکششلا کے استاد نے کہا تھا اپنے یا دوسروں کے خیالات کے مظاہر صرف الفاظ ہی ہو سکتے ہیں ان کی ماہیئت کا مطالعہ کرنا کس قدر ضروری ہے۔ الفاظ کے راستے کے بنا خالص خیال تک کس طرح پہنچ پاؤ گے؟ آواز الفاظ کا پراکرتک گن ہے۔ اور مادہ ابدی ہے۔ وید زبان کی شکل میں برہما ہے۔ اور مادہ برہما ہے۔"

"وقت کو ابدیت سمجھ کر تم لوگوں نے بہت گڑبڑ پھیلائی ہے۔" ہری شنکر نے دوبارہ فرش پر لیٹتے ہوئے اظہارِ خیال کیا۔

"معنی اصل چیز ہے۔" گوتم نے جواب دیا۔ "پانینی کا کہنا ہے کہ سارے الفاظ

گا ماحصل خالص وجود ہے۔ ست — اصلیت۔ اور مختلف چیزوں کے لئے برہما کے الگ الگ نام ہیں۔ وہ سامنے سے گزرتا ہوا بھورا سور — گھاٹ پر بیٹھی ہوئی ایودھیا کی لڑکیاں۔ تم ہری شنکر یہ سب مہان آتما ہے۔"

"تم تعجب ہے اب تک ویدانت سے آگے نہیں بڑھے۔"

"انت[1] کے آگے اور کیا ہو سکتا ہے۔"

"تم ہی بتاؤ۔"

"پرم آتما اور جیو آتما میں اودیا کی وجہ سے دوئی قائم ہے۔ لہٰذا لفظ اور غیر لفظ دو برہما ہیں۔ اور لفظ پر دھیان کر کے غیر لفظ کا انکشاف ہو سکتا ہے۔"

"وہ غیر لفظ میں خود ہوں۔" ہری شنکر نے کہا۔ گوتم خاموش ہو گیا۔

"علیت کا قانون بجائے خود مکمل ہے۔ کوئی چیز کسی دوسری چیز کی مانند نہیں ہے۔ صرف اپنے لمحاتی وجود کے علاوہ کسی شے کا کسی شے سے تعلق نہیں۔ سمجھے۔ سب وقتی ہے۔ اور مصیبت ہے۔ سروم دکھم دکھم —" ہری شنکر نے کہا "جسم اور آتما دونوں فانی ہیں — دونوں کے اکٹھا ہونے سے بھی کوئی مستقل وجود پیدا نہیں ہوتا۔ آتما ابدی نہیں ہے۔ انسان چراغ کی طرح بجھ جاتا ہے محض واقعات اور احساسات کا دور تسلسل قائم رہتا ہے۔ ایک لڑکی تھی۔ سو رہے ہو بھائی گوتم —؟"

"نہیں کہے جاؤ۔"

"ایک لڑکی تھی۔ اُس نے بھی مجھے ابدیت کا قائل کرنا چاہا تھا۔ وہ بھی سا پا سا میں زمان و مکان کو محیط کر لیا کرتی تھی۔ دنیا پر وہ صبح صبح بھیرو اور منگھ بجاتی — دوپہر کو جب ساری دنیا سونے کے رنگ میں رنگ جاتی۔ تب میں اُس سے دیپک اور شری راگ سنتا۔ رات پڑے وہ ہنڈول گاتی۔ اس لڑکی کو سنگیت کا جنون تھا۔"

"تم نے گیت اور الفاظ ملتوی کر دئے مگر سُر باقی رہیں گے۔ سُر اٹل ہیں۔" گوتم

---

[1] خاتمہ

بولا۔

کچھ دیر بعد ہری شنکر نے پھر کہنا شروع کیا۔ "میں جب اتر کوشل کی سرحد پر واپس پہنچا تو گلم استھان کے پہرے دار نے للکار کر مجھ سے پوچھا۔ تم کہاں سے آ رہے ہو۔ میں یہیں سے گیا تھا اور یہیں لوٹ کر آیا ہوں۔ میں نے جواب دیا اور یہی تم سب کا حشر ہو گا۔ اس چکر سے بچنے کی کوشش کرو۔

"تم اس کا مطلب سمجھے۔ پہریدار نے اپنے ساتھی سے کہا۔ یہ بھی کوئی فلسفی جان پڑتا ہے اور پھر وہ دونوں کوڑیاں کھیلنے میں مصروف ہو گئے۔ مگر میں جب ایودھیا میں داخل ہوا تو مجھے پتہ چلا کہ سُر ابھی باقی ہیں — گوتم زندگی کا پھیلاؤ بہت زبردست ہے۔ ملک بستیاں۔ نئے نئے لوگ۔ بھانت بھانت کی بولیاں میں نے پاٹلی پتر سے لے کر پشکروتی تک سارا راستہ یہی کھڑاؤں پہنے پہنے طے کیا ہے۔ یہاں سے تھوڑے فاصلے پر گومتی کے کنارے لکشمناوتی آباد ہے جسے سری لچھمن نے بسایا تھا۔ سنگم پر پریاگ ہے۔ پھر کانیا کبج اور ہستنا پور تکشلا۔ اس کے آگے سرحد کا شہر پشکروتی۔ اس لمبی شاہراہ پر میں نے بہت طویل سفر طے کیا مگر ہنڈول کے سُر برابر میرا پیچھا کرتے رہے۔ تب کئی سال میں تکشلا میں رہا اور میں نے انھیں بھلائے رکھا۔ یہاں لوٹ کر پھر وہ آوازیں میرے کانوں میں آ رہی ہیں۔ تم مجھ سے لفظ اور آواز کی ابدیت کی بات کرتے ہو۔ مجھ سے پوچھو۔ مجھے معلوم ہے۔ یہ سب جگہوں کے سحر کا اثر ہے۔ اصلیت کچھ نہیں۔ سروم دکھم — دکھم۔

"سُنا ہے وہ پراچین ایودھیا کی رانی رینوکا کی ایسی خوبصورت ہے۔"

"کس کا ذکر کرتے ہو۔" ہری شنکر نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا۔

"پتہ نہیں۔" گوتم نے جواب دیا۔ پھر وہ بھی آنکھیں بند کر کے فرش پر لیٹ رہا۔

"مقدس سرجو۔ رگ وید میں بہنے والی ندی۔ میری ماں۔ جانے کب تک اسی طرح بہتی رہے گی۔ سامنے میرا شہر ہے۔" ہری شنکر کی خوبصورت مدھم آواز اس کے کانوں میں آتی رہی۔ خوبصورت شاندار ایودھیا۔ کتنے زمانے سے اسی جگہ پر پونمی راتوں کو

جگمگاتا رہا ہے۔ کتنے جگ بیتے جب منو کا بیٹا اس کا پہلا بادشاہ بنا تھا اور شیو بھگت بھاگیرت اور دِگ وِجے رام چندر۔ اجودھیا۔ آج کا۔ برہما کا شہر۔ جسے کوئی جیت نہیں سکتا۔ تم نے کبھی اس نگری کے رقاصوں اور سنگیت کاروں کو دیکھا ہے۔ یہاں کے ناچوں میں شامل ہوئے ہو۔ راج محل میں بسنت کا تہوار منایا ہے؟ یہیں پر چمپک رہتی ہے اور یہیں پر میرے گھر والے اور میری بہن میرے منتظر ہیں — جس طرح سری کرشن کو اپنی بہن سبھدرا پیاری تھی ویسے ہی میں اپنی بہن کو عزیز رکھتا تھا۔ مگر میں نے اس کی محبت کو دوسری محبتوں اور وفاداریوں کے ساتھ دل سے نکال پھینکا اور پھر اودھ لوٹ آیا۔ — رام نے چودہ برس کی بن باس کے بعد لوٹنے کا وچن دیا تھا۔ میں بھی واپس آیا ہوں مگر سدھارتھ نے مجھے وعدوں کے بندھن سے بھی آزاد کر دیا ہے — میری بہن — رام چندر کی بہن شانتا کی ایسی خوبصورت اور معصوم ہے اور لوگ کہتے تھے کہ اسی اجودھیا میں جس طرح ڈیڑھ ہزار سال قبل شانتا اور سیتا کی جوڑی تھی ایسے ہی نرملا اور چمپک چاند اور سورج کی مانند جگمگاتی ہیں — دیکھو الفاظ نے پھر میرے ساتھ غداری کی ہے۔" اس نے اداسی سے بات ختم کی —

گوتم نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ باہر درختوں پر بارش برسنا شروع ہو گئی تھی برسات کا موسم ہے۔ یہ موسم سارے بھکشو وہاروں میں بسر کرتے ہیں — گوتم کو خیال آیا۔ اس نے کروٹ بدل کر ہری شنکر سے پوچھا۔ "تم شروَن کا زمانہ کہاں گزارو گے"

"پتہ نہیں —"

"تمھارے باقی دوست کہاں جا رہے ہیں؟"

"میرے ہم سفر — تمہارا مطلب ہے —"

"ہم سفر ہی کہہ لو —"

"یہ بھی معلوم نہیں —"

لہ تاریخ عالم ٹلہ اودھ کے لغوی معنی وچن کے ہیں

"ٹیکسلا تو برہمنوں کی درس گاہ ہے۔ تم وہاں کہاں پہنچ گئے۔"

"میں۔۔ میں تو پچھناؤں کے دیس میں بھی رہا ہوں۔ جہاں اُتر کے نیلی آنکھوں والے سفید فام ولائتی شیو کی عبادت کرتے ہیں۔ میں نے ایراوتی[1] اور چندر بھاگا[2] کی وادیوں کی سیر کی ہے۔ میں سندھو کی لہروں پر تیرا ہوں۔ پورب میں ونگا تک گیا ہوں۔ میں نے برہم پتر اور سندربن اور چندرا دیپ کی دلدلوں میں جنگلی دھان اُگتے دیکھے ہیں۔ جہاں سیاہ لباس پہنے لمبے بال کندھوں پر چھٹکائے مرگ نینی لڑکیاں ہرے بانس کے جھنڈوں میں رہتی ہیں اور پریوں کی طرح گاتی ہیں ۔۔۔ گوتم زندگی کا پھیلاؤ بہت عظیم ہے۔ اس کی وسعت سے بچتے رہو ۔۔ کائنات ۔۔ اور اس کی وسعت کہاں سے پیدا ہوتی ہے کہاں جاتی ہے۔ ہم کہاں پیدا ہوئے ہیں۔ کس طرح اور کس وجہ سے زندہ ہیں اور یہاں سے کہاں جائیں گے۔ تم جو برہما سے واقف ہو ذرا بتلاؤ دکھ یا سکھ میں مبتلا کس کے حکم سے ہم یہاں رہ رہے ہیں۔ وقت یا فطرت ۔۔ یا حادثے۔ یا عناصر کو سبب سمجھا جائے یا اُسے جو پُرش کہلاتا ہے جو تمہارے نزدیک پرم آتما ہے۔" ہری شنکر نے بات ختم کی۔

"اپنشدوں میں لکھا ہے کہ کائنات آزادی میں پیدا ہوتی ہے۔ آزادی میں موجود رہتی ہے۔ اور آزادی میں کھو جاتی ہے۔"

"وہی ابدیت۔" ہری شنکر نے رنجیدہ آواز میں کہا۔ "آزادی اور ابدیت خود ایک اور قید نہیں؟"

بارش تیزی سے شروع ہوگئی۔ دیا ہوا کے جھونکے سے بجھ چکا تھا۔ شنکر نے انگوچھے کا تکیہ بنا کر سرہانے رکھ لیا۔ گوتم نے اپنی سفید چادر اوڑھ کر دیوار کی طرف کروٹ بدل لی۔ دونوں کچھ دیر تک چپ چاپ اندھیرے میں پلکیں جھپکایا کیے۔ پھر پُروائی کے جھونکوں سے انھیں بھی نیند آگئی

---

[1] راوی [2] چناب

اس رات گوتم کو عجیب عجیب خواب نظر آئے۔ مندر کی کوٹھڑی میں سے نکل کر چنڈی دیبی اپنے گوری کے روپ میں چھن چھن کرتی باہر آئیں۔ پھر وہ کیسری ساری والی لڑکی میں تبدیل ہونا شروع ہوئیں۔ اس کے بعد ان کی شکل پھر مختلف نظر آئی — پہلے وہ دلھن بنیں۔ ستی کے روپ میں مہادیو سے ان کا بیاہ ہوا۔ پھر پل کی پل میں ایک بوڑھی عورت ۔ درگا سے بھی زیادہ خوفناک ۔ آلتی پالتی مارے اس کے سرہانے آن بیٹھی۔ اور زور زور سے رونے لگی ۔ میری ماں ۔ میری ماں ۔ گوتم نے لرز کر کہا ۔ لیکن بوڑھی عورت نے دانت نکوس کر جواب دیا ۔ میں تمھاری ماں نہیں ۔ ارے میں تو ویشالی کی — اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ایک بیل درخت کی شاخ پر سے ٹوٹ کر ٹپ سے آنگن میں آن گرا اور گوتم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ شنکر بڑے سکون سے سو رہا تھا۔ بارش تھم چکی تھی۔ ندی کے کنارے چنڈال کسی کی لاش مرگھٹ کی اور لیے جا رہے تھے ۔ اور کشتیوں کی روشنیاں اندھیرے میں اگیا بتیال کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس نے جلدی جلدی منتر پڑھنے شروع کر دیے ۔ بہت دیر بعد اسے نیند آئی۔

منہ اندھیرے جب شنکر کی آنکھ کھلی اس وقت گوتم چنڈی پاٹھ میں مصروف تھا۔ گھاٹ پر برہمن کھنکار رہے تھے۔ آم کا باغ چڑیوں کی چہکار سے گونج اٹھا تھا۔ گوتم عبادت کے بعد باہر نکلا تو ہری شنکر اسے دیکھ کر مسکرایا۔ دفعتاً گوتم نے اس سے پوچھا —

"ویشالی میں کون رہتا تھا — ؟"

"میں ویشالی کی کسی مہیلا سے واقف نہیں۔" شنکر نے بڑی سنجیدگی سے سر ہلا کر جواب دیا۔ اور پھر ہنسنے لگا۔ گوتم کو اس کی بے تکی ہنسی پر بہت غصہ آیا۔

وہ دونوں مندر کی سیڑھیاں اتر کر جنگل کے راستے پر آ گئے۔ ندی کے کنارے بھکشوؤں کا گروہ نہانے کے لیے آیا ہوا تھا۔

"تم اب شراوستی واپس جاتے ہو —" شنکر نے پوچھا

"ہاں۔ تم نہ چلو گے۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر کپلاوستی ہے ۔ ادھر پورب میں کوسی نگر ہے اور گیا۔ تم ان سب جگہوں کی یاترا کے لیے نہ جاؤ گے ؟"

"تم اپنا مطلب بیان کرو۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ تم بھی میرے ساتھ چلو۔ تم میرے آشرم میں ٹھہر سکتے ہو۔ یا اگر میرے ماں باپ کی عزت بڑھانا چاہو تو شہر کے اندر میرا گھر حاضر ہے۔"

"میرا ارادہ کاشی جانے کا تھا۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم میری راہ میں حائل ہوتے ہو۔"

"یہی بات دوسری طرح بھی کہی جا سکتی ہے — تم میرا راستہ کھوٹا کر رہے ہو بھائی ہری شنکر۔ پگڈنڈی پتلی ہو اور دو راہگیر آمنے سامنے آن کھڑے ہوں تو ان میں سے ایک کو ہٹ جانا چاہیے ورنہ دونوں کھڈ میں جا گریں گے۔" گوتم نے کہا

"پھر میں تمھارے ساتھ شراوستی کیوں چلوں — اس لیے کہ تمھیں میرے مذہب سے دلچسپی ہے یا اس لیے کہ تم ایودھیا کی کماری چمپک کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنا چاہتے ہو۔"

ہری شنکر اگر تم نے شاکیہ منی کے چیلوں کا یہ گیروا پہناوا نہ پہن رکھا ہوتا تو میں تمھاری ٹھکائی کر دیتا۔ گوتم نے دل میں کہا۔

وہ دونوں آبادی کو چھوڑ کر شراوستی کی طرف بڑھنے لگے۔

آسمان پر سے بادل چھٹ گئے تھے۔ ہوا میں کچی کلیوں کی مہک اڑ رہی تھی کدم کے ایک جھنڈ میں مور پر پھیلائے ناچ رہا تھا۔ کھیتوں کی منڈیر پر دھانی اور کپاسی ساریاں پہنے کسان عورتیں ادھر سے ادھر آجا رہی تھیں۔ اشوک کے جنگلوں میں جگہ جگہ جو دیو استھان اور دیوگرہ بنے تھے گوتم ان پر پھل پھول چڑھاتا راستہ طے کرتا رہا۔ شنکر خاموشی سے اس کے ساتھ ساتھ آرہا تھا۔

شام پڑے دونوں لڑکے مور پالنے والوں کے ایک گاؤں کی فصیل کے اندر داخل ہوگئے۔ ان گنت مور چاروں اور باغوں میں گھوم رہے تھے۔ چھپروں کے نیچے موروں کے پنکھے اور مورچھل تیار کیے جا رہے تھے۔ چوپال میں گانا ہو رہا تھا۔

گوتم اور ہری شنکر کنوئیں کی من پر بیٹھ گئے — پل کی پل میں سارے میں خبر پھیل گئی۔

دو دو باتھی گاؤں میں مہمان آئے ہیں۔ ان کی آؤ بھگت شروع ہوئی۔ شنکر آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔

ایک لڑکی دو خوبصورت پنکھیاں نذر کرنے کے لیے لے کر آئی۔ گوتم نے لڑکی کے ہاتھ سے پنکھیا لے لی اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اس کے پروں پر انگلیاں پھیریں لڑکی بڑے ادب سے ایک طرف کو منتظر کچھ فاصلے پر کھڑی رہی۔ یہ پنکھے کہاں کہاں کن کن دور دراز کے شہروں اور ملکوں کو بھیجے جائیں گے۔ کیسے کیسے لوگ ان کو استعمال کریں گے وہ سوچ رہا تھا۔ یہ پنکھیا جو میں چھو رہا ہوں یہی اجودھیا کے بازار میں جاکر بکے گی اور شاید وہ لڑکی ہی اسے خرید لے۔ پھر اس نے دونوں پنکھیاں واپس کر دیں۔ ہمیں عیش و آرام کا علم نہیں۔ ہمیں یہ تمہارے خوبصورت پنکھے نہیں چاہئیں۔ مور کے پروں کو ہم بن میں دیکھ کر خوش ہو لیتے ہیں۔۔۔ اس نے جلدی جلدی کہا۔ لڑکی نے پنکھیاں اٹھالیں اور پرنام کے لیے جھکی۔ اور شنکر چونکہ بھکشو کا نارنجی لباس پہنے تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر شنکر کے پاؤں چھوئے۔۔

"تمہارا نام سجاتا تو نہیں؟"۔ گوتم نے ہنس کر اس سے پوچھا اور شنکر پر نظر ڈالی۔ وہ اب بھی آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔

"نہیں ۔۔۔ میرا نام نندبالا ہے۔۔ سجاتا میری بڑی بہن ہے۔" لڑکی نے سادگی سے جواب دیا اور پھر کنوئیں کے من پر سے اتر کر گاؤں کی طرف لوٹ گئی۔

"بھائی گوتم۔ ہر زمانے میں ہر موڑ پر تمہیں کوئی نندبالا ملے گی۔ کوئی سجاتا۔۔ اور وہ تمہارے نزدیک آکر تمہاری پرستش کرنا چاہے گی۔ اب بھی وقت ہے۔ آنکھیں کھول لو۔" ہری شنکر نے کہا۔

صبح سویرے وہ پھر اپنے سفر پر چل کھڑے ہوئے۔ اور دو دن تک چلتے رہے اب شراوستی زیادہ دور نہ تھا۔ شیشم کے جنگلوں کے اختتام پر آبادی شروع ہو گئی تھی۔ سڑک پر دو رویہ درخت لگے تھے جن کے پرے امرا کے مکانات تھے ان مکانوں کے باغوں میں نقلی پہاڑیاں بنی تھیں اور امرود اور انار کے درختوں کے

جھنڈ تھے جن پہ سبز پروں والے طوطے شور مچا رہے تھے۔ پالتو مور مرمریں تالابوں کے کنارے کھڑے پانی میں اپنا عکس دیکھتے تھے۔ جامن کے درختوں میں جھولے پڑے تھے۔ مکانوں کی دیواروں کی سفیدی ہلکی ہلکی دھوپ میں دُور سے جگمگا رہی تھی۔ برابر کی پگڈنڈی پر سے خانہ بدوشوں کا ایک قافلہ بیلوں پر بیٹھا گاتا بجاتا گزر گیا۔

چلتے چلتے دفعتاً رُک کر شنکر نے گوتم کو مخاطب کیا۔ "بھائی گوتم — ویشالی کی امباپالی تھی۔ گو چپک۔ اور سجاتا اور رنبا بالا سب ایک ہیں۔ اپنے ذہن کو انتشار سے محفوظ رکھو۔" اور پھر ہری شنکر پگڈنڈی پر سے اتر کے واپس تکشیلم کے جنگلوں کی طرف مڑ گیا۔ گوتم اسے آوازیں دیتا رہ گیا لیکن وہ نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

۲

شراوستی کا خوبصورت شہر راپتی کے جنوبی کنارے دور دور تک پھیلا تھا۔ اس کے اتر میں ذرا فاصلے پر ہماوت کے گلابی اور نیلے پہاڑ استادہ تھے۔ ان پہاڑوں کے دامن میں کیسر کے کھیت لہلہاتے تھے اور دیودار کے گھنے جنگل اور آس پاس ترائی کے نرکلوں میں باگھ اور بگھیلے گھومتے تھے۔

پہاڑوں کا یہ سلسلہ بہت اُوپر سے آ رہا تھا۔ جہاں مان سرور کی جھیل تھی جس کی شفاف لہروں پہ دنیا کی آتما کا راج ہنس اکیلا تیرتا تھا۔ ہماوت کے اُونچے برفانی پہاڑ رونگا اور کامروپ تک پھیلے تھے۔ ان پہاڑوں کے اس پار اتر میں سونے کی رنگت والے کنچوں کا دیس تھا۔ وادیوں میں ان گنت رو پہلے آبشار اور ٹھنڈے پانی کی ندیاں تھیں اور خوشبو دار پتوں کے درخت اور دھان کے کھیت اور تاریک خنک جنگلوں میں گروکل بنے تھے جہاں ملک کے نوجوان لڑکے — شہزادے اور مفلس برہمن۔ اور کشتری امیر زادے علم حاصل کرنے میں جُٹے تھے۔ تعلیم سارے میں عام تھی۔ اس ملک کے ایک بادشاہ نے ایک مرتبہ فخریہ کہا تھا کہ اس کی مملکت میں ایک شخص بھی جاہل نہیں۔

انھیں جنگلوں میں۔ پہاڑیوں کی ڈھلوان پر جہاں دن میں بھی گھُپ اندھیرا رہتا تھا ہاتھی پلے تھے۔ راجن سال میں ایک بار کھیدا کے لیے وہاں آتے۔ ہاتھی پکڑنے والے ہانکا لگاتے درباریوں کا پڑاؤ ہوتا جنگل میں منگل لگ جاتا۔ ہاتھیوں کا راستہ تلاش کرنے والوں اور سدھانے والوں کا عملہ جنگلوں کے کنارے لکڑی اور بانس کے جھونپڑوں میں رہا کرتا تھا۔ ان کی لڑکیاں مونگے اور فیروزے کے روپہلی زیور پہنے بالوں کی بندھیاں گوندھے ہاٹ بازار کے لیے جب میدانوں کی طرف آتیں تو شہری لڑکیاں ان کی رنگ برنگی سیاہ۔ سُرخ اور زرد دھاریوں والی پوشاک کو بڑی دلچسپی سے دیکھا کرتیں۔

اتر کوشل کی ریاست میں نگر۔ پور اور نگریاں ان گنت شہر اور قصبے اور گاؤں ان ہرے بھرے میدانوں میں آباد تھے۔ جنگلوں کی افراط تھی جن کی لکڑی سے خوبصورت مکان بنائے جاتے۔ اب آبادی بڑھ رہی تھی اور جنگل کٹتے جاتے تھے۔

شراوستی کا شہر بہت گنجان اور بارونق تھا۔ دور دور کے دیشوں سے آئے ہوئے لوگ یہاں رہتے تھے۔ الگ الگ محلوں میں کاری گر۔ سنار۔ بزاز۔ آڑھتی اور دوسری پیشہ ور جماعتیں آباد تھیں۔ ان کی اپنی اپنی منڈلیاں تھیں اپنے قوانین۔ چوروں تک کی منڈلی مع ایک باضابطہ شاستر کے موجود تھی۔ بارہ مہینے بلا کی چہل پہل رہتی۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی تہوار منایا جاتا۔ ہر شخص اپنے اپنے کام میں منہمک تھا مصوروں اور سنگ تراشوں کی ٹولیاں اپنے نگارخانوں میں مصروف رہتیں۔ ناٹک منڈلی میں صبح سے کھیل شروع ہو جاتا اور دن بھر جاری رہتا۔ ناٹک اور نائکائیں زرق برق کپڑے پہنے چہروں پر روغن لگائے مشہور تمثیلیں پیش کرتیں چوراہوں پر مداری اپنے کرتب دکھلاتے۔ بھنگ کی دوکانوں پر آوارہ گردوں۔ اچکوں اور ٹھگوں کا مجمع رہتا۔ تہواروں کے موقع پر بنجارے تاڑی پی کر زور زور سے گاتے پھرتے۔ ڈوم نقلیں کرتے سودیش ناریاں چھن چھن کرتی اپنی گلیوں میں ٹہلتیں۔ امیر زادیاں سولہ سنگار کیے تھالیوں میں گھی کے چراغ جلائے مندروں کی اور جاتی نظر آتیں۔ عود اور لوبان کی خوشبو سے فضا بوجھل ہو جاتی۔

رتھ کار، مٹی کے برتن بنانے والے کلال اور بید کی ٹوکری بننے والے شہر کے باہر رہتے تھے۔ آبادی سے بالکل الگ تھلگ چنڈالوں کی بستی تھی۔ ان کا پنچم طبقہ چاروں ذاتوں سے کمتر تھا۔ محض لاشیں اٹھانا اور مردے جلانا ان کی قسمت میں لکھا تھا یہی ان کا پیشہ تھا۔ وہ صرف مردوں کی اترن پہن سکتے تھے۔ ان کو حکم تھا کہ ٹوٹے پھوٹے برتنوں میں کھانا کھائیں اور صرف کانسی کے گہنے استعمال کریں۔

لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ شراوستی میں کپلاوستی کے شاکیہ منی آن کر رہے تھے۔ اور انھوں نے اور ان کے حواریوں نے اپنے وعظوں میں بتلایا تھا کہ آدمی پیدائش کی بنا پر نہیں عمل کی بنا پر ملیچھ یا اچھوت بنتا ہے اور اب نارنجی لباس والے بھکشوؤں کی ٹولیاں بستی بستی گھوم کر چنڈالوں اور اچھوتوں کو نیک عمل کی تلقین کر رہی تھیں۔

شراوستی کی رونق ہر موسم میں قائم رہتی۔ گرمیاں آتیں تو امراء اپنے باغات میں تالابوں کے کنارے جا بیٹھتے یا خنک تہ خانوں میں آرام کرتے۔ شام کے سمے بازاروں میں کھوے سے کھوا چھلتا۔ بوڑھی عورتیں موتیا اور چنبیلی کے گجرے گھروں کی ڈیوڑھیوں پر لے جا کر بیچتیں۔ خوبصورت لڑکیاں اونچے مکانوں کے جھروکوں میں سے نیچے جھانکتیں۔

شہر سے باہر کھلے سبزہ زاروں میں کشتری سورما سندھ اور ایران اور عرب کے اصیل گھوڑوں پر سوار ہوا سے باتیں کرتے نظر آتے۔ گاؤں کی سمت جانے والے سایہ دار کچے راستوں پر کسانوں کی بیل گاڑیاں اور بہلیاں چرخ چوں کرتی نرم روی سے چلتی رہتیں۔

۳

تون برت رکھنے والے برہمنوں کی مانند۔ سال بھر گم سم رہنے کے بعد مینڈکوں نے طوفان کے دیوتا سے زندگی کی لہر حاصل کی ہے اور اب کیسے زور زور سے چلا رہے ہیں۔ جس طرح طالب علم اپنے استاد کے الفاظ یک زبان ہو کر دہراتے ہیں۔

اسی طرح ایک مینڈک دوسرے مینڈک کی بولی کی نقل کرتا ہے۔ سب کے سب تھیا میں لپٹے برساتی راگ —— الاپنے میں جٹے ہیں۔"

گوتم نے مسکرا کر کتاب بند کر دی اور نظریں اٹھا کے سامنے دیکھا۔ بارش جھما جھم برسنا شروع ہو گئی تھی۔ مینڈک ٹرا رہے تھے۔ مور جھنکار رہے تھے۔ پپیہا غل مچا رہا تھا۔ ساون کی گھٹائیں جھوم کر اٹھی تھیں۔ رگ وید میں صدیوں پہلے برکھا رت کی جیسی منظر کشی کی گئی تھی۔ وہ منظر مکمل طور پر ویسا کا ویسا اس کے سامنے موجود تھا۔ کٹی کے پھونس پر لوکی کی بیل پھیلی تھی۔ اس پر سے پانی کے قطرے ٹپک ٹپک کر گوتم کے پیروں کو بھگوئے ڈال رہے تھے۔ وہ کٹی کے برآمدے میں بیٹھا ساون کی آوازیں سنتا رہا۔ سازوں کا ایک بہت عظیم اجتماع تھا جس پر سرسوتی میگھ راگ بجا رہی تھی۔ امن اور سکون کا راگ —— میگھ —— ؟ اس کا ذکر میں نے ابھی کسی سے سنا ہے ؟ کیا میں ابھی تک اپنے حافظے پر قابو نہیں پا سکا۔ مجھے غیر ضروری باتیں کیوں یاد رہتی ہیں —— اُس نے اداسی سے سوچا اور کتاب بند کر کے ایک طرف کو رکھ دی اور بارش کی بوندوں کو دیکھنے لگا۔ ساون کی پورنماشی آ گئی تھی اور پڑھائی شروع ہونے والی تھی۔ گوتم نیلمبر اپنے آشرم واپس آ چکا تھا۔ آشرم شہر سے دور اسوک کے جنگل میں واقع تھا۔ ندی کے کنارے جھونپڑوں میں طالب علم رہتے تھے۔ اس پار گرو کے کھیت تھے جو سرکار کی طرف سے آشرم کو ملے ہوئے تھے۔ بارش تھمتی تو طالب علم ان میں کام کیا کرتے۔ خزاں کے مہینے میں تبت کی طرف سے اڑتے ہوئے ہنس آتے اور بسنت کے زمانے میں شمال کی اور لوٹ جاتے۔ طالب علم جب صبح صبح اشنان اور عبادت کے لیے گھاٹ پر جاتے تو انھیں اپنے یہ خاموش رفیق سنیاسیوں کی طرح مراقبے میں ڈوبے ملتے۔

گوتم اپنے گرو کے پاس جنھیں اچاریہ کا درجہ حاصل تھا۔ مدتوں سے پڑھ رہا تھا۔ یہ اس کی تعلیم کا آخری سال تھا۔ اس دوران میں اُس نے ناٹک لکھنے اور تصویریں بنانے میں بہت شہرت پا لی تھی۔ اپنے آشرم سے باہر دوسری درس گاہوں میں بھی اس کا نام عزت سے لیا جاتا تھا۔ اگر یہ پیدائشی شاعر ہے تو اسے پروہت بنانے کا کیا فائدہ۔

اس کے معلم نے سوچا تھا۔ مگر گوتم کے سامنے یہی راستہ اٹل تھا۔ راج دربار میں پروہت کی مسند اس کی منتظر تھی جس پر اس وقت اس کا باپ بیٹھا تھا۔ ممکن ہے ایک روز وہ ایکا پروہت کے رتبے تک پہنچ جائے اور راج کونسل کے علاوہ دوسری ریاستوں کا مشیر بھی بنے۔ وہ بے حد ذہین لڑکا تھا اور اس کے پورو دیس میں علم کی قدر بہت کی جاتی تھی۔ اسے فنونِ جنگ بھی سیکھنے پڑے تھے اور اگر اسے لکھنے پڑھنے سے زیادہ دلچسپی نہ ہوتی۔ تب بھی اس کا کوئی نقصان نہ تھا۔ مغرب میں کورو پنچالوں کے وہاں سیناپتی کو پروہت پر فوقیت حاصل تھی۔ گوتم اندر پرستھ جا کر فوج میں نوکری کر سکتا تھا مگر اس نے طے کر رکھا تھا کہ وہ صرف ناٹک لکھا کرے گا۔ فن کے نظریوں پر کتابیں تصنیف کرے گا۔ تصویریں اور مجسمے بنائے گا۔ شاعروں نے سماج سے ہمیشہ ہی بغاوت کی ہے۔ پر اس کے ساتھ ہی اسے اپنے گرو کا بڑا خیال تھا۔ وہ کبھی کوئی ایسی بات نہ کرے گا جس سے اس کے گرو کو دکھ پہنچے۔

گرو چیلے کا یہ سلسلہ صدیوں سے، عالموں کے بادشاہ جنک اور رشی دتاتریہ کے زمانے سے چلا آ رہا تھا۔ اسی آشرم کے آس پاس۔ ایک ہزار سال قبل۔ سرجو کی ایک شاخ ملینا ندی کے کنارے ایک مشہور درس گاہ موجود تھی۔ یہ کنج جہاں گوتم اور اس کے ساتھیوں کے جھونپڑے تھے۔ یہیں دوسرے لڑکے گھوما کرتے ہوں گے۔

دوسرے لڑکے۔ دوسری لڑکیاں۔

برہمچاریہ کی زندگی بسر کر کے لڑکیاں بھی اکثر اعلیٰ تعلیم حاصل کرتیں۔ رگ وید کی کئی نظمیں اور "راہبات کے نغمے" لڑکیوں نے لکھے تھے۔ شاعرہ اپالا کی نظمیں گوتم نے پڑھی تھیں — لڑکیاں بھی کیسی عجیب ہستیاں ہوتی ہوں گی۔ گوتم کو اکثر خیال آتا۔

دوسرے برہمن زادوں کی مانند گوتم نیلمبر کی پڑھائی بھی پانچ سال کی عمر سے شروع کر دی گئی تھی۔ اب وہ پورے چوبیس سال کا ہو چکا تھا اور اس نے الٰہیات۔ تمثیل۔ ادب۔ بھوت ودیا[1]

---

[1] علم عناصر

ریاضی، صرف و نحو، منطق، فلسفہ، اخلاقیات، اداکاری، کیمیا، طبیعات نصاب کے سبھی علوم پر دسترس حاصل کر لی تھی۔ فن سپہ گری کے علاوہ وہ راگ ودیا کا ماہر تھا۔ اترپردیش کے بسنے والے اہل زبان سمجھے جاتے تھے۔ گوتم کو بھی زبان کی صحت کا بہت خیال رہتا۔

برسوں سے اس کی زندگی اسی ڈھرے پر چل رہی تھی۔ وہ ماں باپ سے الگ۔ آشرم میں رہتا۔ گرو کے جاگنے سے قبل طلوع آفتاب سے پہلے اٹھ بیٹھتا۔ ندی پر جا کے نہانے کے بعد جنگل کے خاموش ترین حصے میں بیٹھ کر عبادت کرتا۔ درختوں کے مقدس کنجوں سے جو دیویوں اور دیوتاؤں کے نام سے معنون تھے۔ اس سمے سُریلے بھجنوں کی آوازیں بلند ہوتیں عبادت کے بعد گوتم آبادی میں جا کر دن بھر کی خوراک کے لیے بھیک حاصل کرتا۔ پھر لکڑیاں چُن کر لاتا اور گرو کی کٹی کی آگ روشن کی جاتی۔ آشرم میں روزانہ چاول اُبالے جاتے تھے اور جو کی روٹی بنتی تھی۔ شراوستی میں بڑے بڑے قصاب خانے موجود تھے۔ شہر کی دعوتوں میں اکثر گائے کا گوشت بھی پکتا تھا۔ لیکن طالب علم کو گائے کا گوشت کھانے کی ممانعت تھی۔ لہٰذا گوتم اور اس کے ساتھی گرو کو کھلانے کے بعد الگ الگ بیٹھ کر خود بھی ساگ پات ہی کھاتے۔

اس دیس کے رہنے والوں کو صفائی کا جنون تھا۔ آشرم میں دن میں دس بار جھاڑو بہارو کی جاتی۔ پیتل کے برتن جھونپڑوں کے برآمدوں میں رکھے جگر جگر کرتے۔ بات بے بات پیر دھوئے جاتے۔ تنکا بھی فرش پر نظر نہ آتا۔ پھر باغ کی صفائی کی جاتی۔ اس ساری مشقت کے بعد پڑھائی ہوتی۔ پڑھائی کے بعد یادِ خدا۔ برہمچاریہ کے قوانین کٹھن تھے۔ گوتم کو شروع سے سکھلایا گیا تھا کہ وہ عطر پھول استعمال نہیں کر سکتا۔ سرمہ لگانے۔ جوتا پہننے۔ بارش یا دھوپ میں چھتری سے کر چلنے کی اسے سختی سے ممانعت تھی۔ دریا پار کرنے کے لیے وہ کشتی استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ اسے بتلایا گیا تھا کہ طالب علم کو دن بھر کھڑا رہنا چاہیے۔ رات بیٹھ کر گذارنی مستحسن ہے۔ موٹا جھوٹا پہننا اور روکھا سوکھا کھانا اس کا وطیرہ ہے لڑکیوں کے ساتھ عزت سے پیش آنا اس کا فرض ہے۔ بے ضرورت دوڑ بھاگ نہ مچاؤ۔ زبان نہایت صاف اور شستہ بولو۔ ایک لفظ بھی غیر فصیح مُنہ سے نہ نکلنے پائے۔ لڑکیوں

کا مذاق کبھی نہ اڑانا عیش و عشرت۔ راگ رنگ سے تمھیں کوئی سروکار نہ ہونا چاہیے۔ شہر کے سرکاری قمار خانے میں معززین شام کو جمع ہو کر جوا کھیلتے۔ گوتم جو طالب علم کی حیثیت سے بھیک مانگ کر اپنا پیٹ پالتا تھا محض خواب ہی میں سکّوں کے درشن کر سکتا تھا۔ چنانچہ ایک روز اس نے خواب میں دیکھا کہ قیمتی دوشالہ اوڑھے گھٹنوں کے بل بیٹھا پن پر پن داؤ پر لگا رہا ہے اور اس کے چاروں اور عجیب عجیب شکلوں کے لوگ جمع ہیں۔ ایسے لوگ جو اس نے جاگتے میں شراوستی کے بازار میں بھی کبھی نہیں دیکھے تھے۔

لیکن گوتم اپنے گرو کا نہایت فرماں بردار اور عقیدت مند چیلا تھا اور گرو کے احکام کی تعمیل کرنا اس کا ایمان تھا۔ لہٰذا جب کبھی وہ شراوستی کے ناچ گھر یا قمار خانے کی عالی شان عمارت کے سامنے سے گزرتا تو اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا کرتا۔

ناچ گھر کی سیڑھیوں پر سے اکثر پاتریں گھنگھرو سنبھالے اترتی یا چڑھتی نظر آجاتیں۔ سبھی طالب علم اسی طرح گرو کے تابع تھے۔ بعض بعض مرتبہ وہ گرو کے لیے اپنی جان پر کھیل جاتے۔ بھیک مانگ کر سب سے پہلے گرو کو لاکر دیتے اور اکثر خود بھوکے رہ جاتے۔ پچھلے وقتوں میں پنچالوں کے علاقے کا ایک طالب علم ارونی جو ٹکسشلا میں پڑھتا تھا اپنے استاد کے کھیتوں کو سیلاب سے بچانے کے لیے بندھ باندھنے کے بجائے خود پانی کی باڑھ کی زد میں لیٹ گیا تھا۔

طالب علم کو حکم تھا کہ وہ ذات اور نسل کے غرور اور شہرت اور زینت کی تمنا سے دُور رہے۔ یہ شیخی اور خود نمائی کے جذبات پر قابو پائے۔ دماغ کا سکون اور دل کا صبر و ضبط حاصل کرے۔

ساون کی پورنماشی سے لے کر پوس کی پورنماشی تک پڑھائی ہوتی تھی۔ طریقۂ تعلیم سوال و جواب پر مبنی تھا۔ چیلا سوال کرتا۔ گرو اس کا جواب دیتا۔ پھر درختوں کے سائے میں بیٹھ کر آپس میں بحث و مباحثے ہوتے۔ بال کی کھال نکالی جاتی۔

اگر کبھی سیاسی ہنگاموں۔ جنگوں یا بیرونی حملوں کی وجہ سے پڑھائی ملتوی کرنا پڑتی یا تہواروں کی چھٹیاں ملتیں تو گوتم اکیلا ہی اپنی کٹی میں بیٹھا چراغ جلائے رات رات بھر

نظمیں لکھا کرتا۔ گیدڑوں کا چلانا پڑھائی کے لیے بُرا شگون تھا۔ مرگھٹ میں اور سڑک کے کنارے بیٹھ کر پڑھنا بھی منع تھا۔

جاڑوں کی راتوں میں نزدیک کے جنگلوں میں گیدڑ چلاتے۔ بے چاروں کو سردی لگتی ہے۔ اوڑھنے کے لیے راجن سے کمبل مانگتے ہیں۔ گوتم کی ماں بچپن میں اس سے کہا کرتی جب وہ اپنے شاندار مکان کے ایک اندرونی کمرے میں گرم کپڑوں میں ملفوف چھپرکھٹ پر لیٹا پنچ تنتر کے قصے چندا ماموں اور ان کی بی بی روہنی اور راہو اور کیتو کی کہانی سنتا تھا۔ چندا اس کے ماموں تھے۔ سب بچوں کے ماموں تھے۔ کیونکہ ماموں کا رتبہ اس عہد میں بہت بڑا تھا۔ وہ ماں کا بھائی تھا اور ماں بے حد قابلِ تکریم ہستی تھی۔ جاڑوں کی طویل راتوں میں گیدڑ چلاتے۔ سارا جنگل چاندنی میں سائیں سائیں کرتا۔ چندا ماموں اوپر کمرے میں تیرا کرتے۔ اسے اپنی ماں یاد آجاتی۔ پھر وہ کوشش کر کے دوبارہ صرف و نحو میں منہمک ہو جاتا۔

طویل چھٹیوں کے زمانے میں گوتم نیلمبر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ یا تنہا اپنے موقلم اور رنگوں کی کلھیاں لے کر دور دور نکل جاتا۔ اسی طرح وہ ایودھیا گیا۔ ایک مرتبہ کوسمبی جا پہنچا۔ مگدھ میں راج گیر کے کھنڈر اس نے چاندنی رات میں دیکھے اور بہت اداس ہوا اور وہیں بیٹھ کر اس نے بھیم بسار کی زندگی کے آخری دنوں کے متعلق ایک ناٹک لکھا۔ یہ ایک واقعہ تھا کہ اب اس کا دل صرف و نحو میں نہیں لگ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ محض فن کے نظریات پر اور بہت کچھ پڑھے اور لکھے۔ قدم قدم پر جو سوالات ذہن کو الجھاتے ہیں ان کا کوئی ایک حل کھوجے۔ ہری شنکر جو اسے ایودھیا سے واپسی پر ملا بہت دلچسپ تھا مگر اس کے معدومیت کے فلسفے سے بھی گوتم کو ڈر لگا۔ قدیم برہمنوں کا فلسفہ مسرت کا فلسفہ تھا۔ زندگی سے موسیقی سے زندہ رہنے کی لگن سے بھرپور اور اپنشدوں کی اداسی کو شاکیہ منی نے اور گہرا کر دیا تھا۔ وہ جواب تک بڑے صبر و ضبط اور ذہنی سکون کی زندگی گزار رہا تھا اسے اب سرجو کے گھاٹ پر بیٹھی لڑکی یاد آجاتی جس نے کیسری ساری پہن رکھی تھی۔ اس کا جی چاہتا کہ ایودھیا واپس لوٹ کر اسے تلاش کرے۔ پتہ چلائے کہ

وہ کون ہے کیا کرتی ہے۔ غم گر اس کمبخت منحوس بدھ بھکشو سے جو پل کی پل میں چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا۔ اس کا کیا تعلق ہے۔

اقامتی درس گاہوں میں نئے نئے نظریوں کی ہوا وقتاً فوقتاً چلا کرتی تھی۔ اسی طرح اپنشدوں کے مختلف فلسفے وجود میں آئے۔ ان کی شرحیں لکھی گئیں۔ مختلف مدرسہ ہائے فکر قائم ہوئے۔ بدھ مت تازہ ترین ذہنی رواج تھا۔ گوتم نیلمبر کے جامعہ میں بہت سے لڑکے اسی مسلک کے حامی ہو چکے تھے۔ گوتم کی کٹیا میں شام پڑے دوسرے طالب علم آ بیٹھتے۔ شہر کے مصور، سنگتراش، اداکار، شاعر، لیکھک اور دوسرے لوگ جن کا فنونِ لطیفہ سے تعلق تھا اور کلا جن کا پیشہ تھا۔ گوتم کے چھوٹے سے کمرے میں محفل جمتی لپے پتے فرش پر چٹائی بچھا دی جاتی۔ درمیان میں چراغ جلتا رہتا۔ رات گئے تک مختلف موضوع زیر بحث لائے جاتے۔ ادب اور فنون کے پرانے اور نئے نظریوں پر تبادلہ خیالات ہوتا سنگیت کا مظاہرہ کیا جاتا سیاسیات کا بھی فنون لطیفہ میں شمار کیا جاتا تھا گوتم کے دوستوں میں سبھاؤں کے نیتا شامل تھے

طالب علم تھے جو سیاسیات پر کتابیں لکھ رہے تھے۔ ان محفلوں میں سیاسی موشگافیاں کی جاتیں۔ ریاست اور عدم ریاست میں کیا فرق ہے۔ راجہ اور پرجا میں کیا تعلق ہونا چاہیے — وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ جائداد ریاست کو غیر ریاست یا مہاتما بدھ کی سکھ وتی سے ممیز کرتی ہے اور سکھ وتی وہ کیفیت ہے جس میں انسان کا جسم بھی اس کا اپنا نہیں اور ریاست اور سیاست کی حدود سے ماوراء ہو کر انسان یا جانور بن جاتا ہے یا خدا — ملکیت 'یہ میرا ہے' کے تصور اور دھرم حساس سے ریاست بنتی ہے اور ملکیت کی اجازت ریاست عطا کرتی ہے۔

ریاست کا نتیجہ ہے — اس کی وجہ نہیں۔ لہٰذا سیاست کے طالب علموں ہے ۔ کیا کہ ریاست اس کیفیت کا نام ہے جہاں دروازے کھلے چھوڑ کر سو سکتے ہوں اور عورتیں زیور پہن کر بغیر مرد کی رکھوالی کے باہر نکل سکتی ہوں اور ملکیت۔ فرض اور سزا کی بنیاد پر ریاست قائم ہوتی ہے۔ مہابھارت میں لکھا تھا کہ ڈنڈ یعنی سزا نہ ہو

تو طاقتور کمزور کو اس طرح نگلیں جس طرح بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھاتی ہے اور مہابھارت کی کتاب "شانتی" میں لکھا تھا کہ انسان خطرناک حد تک حریص اور تشدد پسند ہے۔ لہٰذا "یہ میرا ہے"، کا فقرہ بھلا دینا چاہیے۔ مانتوا۔ احساس ملکیت سارے جھگڑے کی جڑ ہے۔ ظلم انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ تہذیب اسے اخلاق سکھلاتی ہے اور متمدن بناتی ہے۔ ریاست ڈنڈ کے ذریعہ انسان کی جبلت کو ضابطے میں لاتی ہے۔ بادشاہ ڈنڈ دھر ہے۔ مگر وہ بھی قانون سے بالا نہیں۔ لہٰذا منو نے حکم دیا تھا کہ نالائق بادشاہ کو بھی ڈنڈ سزا دے سکتا ہے۔ ریاست اور سیاسی نظام انسان کے لیے ضروری ہے۔ مہابھارت اور منو دونوں کے نزدیک حکومت کا سخت گیر ہونا لازمی تھا۔ کیونکہ انسان فطرتاً بد تھا۔ عوام کا فرض تھا کہ وہ اپنے ورن کے لحاظ سے اپنا فرض ادا کریں سپاہی کو محاذ پر مرنا ہوگا۔ طالب علم شادی نہیں کر سکتا۔ بادشاہ کا کام انصاف کرنا ہے یہ تفریق عمرانیات کی بنیاد پر کی گئی تھی۔ چنانچہ جب ریاست ظہور میں آتی ہے تو پرجا کے ساتھ لامحالہ ورن آشرم کا بھی ظہور ہوتا ہے۔ اگر پرجا اپنے فرائض انجام نہ دے تو ورن آشرم کا خاتمہ ہے۔

سیاسیات کے بڑے متضاد نظریے تھے۔ جو گوتم نے پڑھے جیمنی نے کہا تھا کہ افعال اچھے یا برے۔ اپنے نتائج خود پیدا کرتے ہیں۔ ورنہ دنیا کے دکھوں کا سرچشمہ اگر خدا کو قرار دیا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا ظالم ہے۔ لہٰذا جیمنی نے ثابت کیا کہ دنیا کی اخلاقی حکومت کے لیے کسی خدائی نظام کی ضرورت نہیں۔ گوتم کے بدھ ساتھی بھی یہی کہتے تھے۔

سیاسی آزادی کا تصور ان سب کو بہت عزیز تھا۔ یہ آزاد انسانوں کا سماج تھا یونان۔ مصر۔ بابل۔ نینوا اور ایران کی ہم عصر تہذیبوں کے برعکس اس دیس کا معاشی نظام غلامی کے ادارے پر مبنی نہ تھا شہنشاہ بھی اب تک نمودار نہ ہوئے تھے۔ ترائی کے علاقوں میں کشتریوں کی جمہوریتیں مہابھارت کے زمانے سے بھی پہلے سے موجود تھیں بادشاہ زمین کا مطلق العنان مالک نہ تھا۔ اسے الوہی درجہ بھی حاصل نہ تھا۔ کرم کی طاقت

کے ساتھ کسی خودمختار الوہی حکومت کی گنجائش نہیں رہتی۔ کرم نے ہر شے کو غیر ضروری بنا دیا ہے۔ گوتم کے ایک ہم جماعت نے اپنے ایک مقالے میں لکھا۔ لہٰذا خدا بھی پاداش اور مکافات کے قانون کو نہیں توڑ سکتا۔" اس قسم کے نظریات کی موجودگی میں ملک میں مطلق العنان حکومت کا قیام ناممکن تھا۔

جمہوریتوں کے زمانے میں کوی نے بادشاہ کو سنگھ مکھیا کی حیثیت سے مخاطب کر کے کہا تھا۔ تیرے ہاتھ میں راج آیا ہے۔ اٹھ اور اسی شان سے حکومت کر۔ تجھ کو عوام نے اپنا بادشاہ چنا ہے۔ انسانوں کے اندر کی طرح اپنی راہ چل۔ تو جو گوپا ہے گوالا — ورونا — اٹھ اور دنیا کے گلے کی رکھوالی کر —

سارے ملک میں مختلف حیثیتوں کی حکومتیں موجود تھیں۔ جنوب کے راجہ بھوج کہلاتے تھے۔ شمال کے وراٹ۔ مغرب کے سوراٹ لیکن سامراجیہ کی داغ بیل مگدھ میں پڑنی شروع ہو چکی تھی یہاں کے بادشاہ مدتوں سے سمراٹ کہلاتے ہے تھے۔ جس عالمگیر قومیت اور شہنشاہی کے تصور کا ذکر نیتی شاستروں میں کیا جا رہا تھا۔ اس کو قائم کرنے کے لیے کوئی ایکراٹ بادشاہ جو سارے ملک کا حاکم ہو۔ ابھی پیدا نہ ہوا تھا۔ چکرورتی بادشاہ جس کی مملکت کے رتھ کا پہیہ بغیر کسی روک کے چلتا رہے۔

اور شاکیہ منی نے کہا تھا۔ میں شہنشاہ ہوں اے سیلا۔ میں نے اچھائی کے رتھ کا چکر چلایا ہے۔

۴

وشنو گپتا — گوتم نیلمبر کی کٹی میں ایک شام حسب معمول محفل جمی تھی۔ ہری شنکر نے جو نیا نیا تکشِلا سے لوٹ کر آیا تھا۔ ایک نئے نام کا ذکر کیا۔ وشنو گپتا۔ نیتی پر اس کے وچار بھی سننے کے قابل ہیں تکشِلا میں تو اس نے اپنی ذہانت کی دھوم مچا رکھی تھی۔

میں نے سنا ہے وہ آج کل کسم پور کے دربار میں موجود ہے۔

"تم کیا کرتے رہتے ہو۔" گوتم نے ہری شنکر سے پوچھا۔

"میں — میں نے ایک نئی مورتی شروع کی ہے۔ کسی روز شہر آؤ تو دکھلاؤں۔"
"تم شِلا کاروں¹ کی منڈلی میں شامل ہو گئے — ؟ کیوں کشتریوں کا نام ڈبوتے ہو —!"
گوتم نے اسے چڑانے کو کہا۔

"تکشِلا سے لوٹ کر بہت دن ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا رہا۔ کوئی جنگ ہی شروع نہیں ہوئی۔ کیا کرتا —!!" اکلیش نے ہنس کر جواب دیا۔

"جنگ — ؟" وملیشور جو ایک کونے میں بیٹھا ایک ایلچی ایسے شاعر سے بروستی اُن کی نظم سُن رہا تھا۔ کان کھڑے کر کے بولا۔ "تم کو کسم پورے کی تازہ ترین خبریں معلوم ہیں — ؟"

سب اپنی اپنی باتیں چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ "دھن نند جوا لاکھی کے مُنہ پر بیٹھا ہے۔" وہ کہتا رہا "اتنی بڑی فوج کا خرچہ دیس کو اٹھانا پڑ رہا ہے۔" پھر جگیشور نے مڑ کر کہا۔ "یہ شراوستی میں وقائع نویس تھا — دودھ دہی۔ نمک، کھانڈ، گھاس، لکڑی، پھل پھول ترکاری۔ بیگار۔ ڈھور ڈنگر ہر چیز میں سرکار اپنا حصہ بٹا رہی ہے۔ تم سمجھتے ہو پرجا چُپ رہے گی — ؟"

ملک کے سیاسی حالات پر زور شور سے گفتگو شروع ہو گئی۔ گوتم ایک طرف کو خاموش بیٹھا سنتا رہا۔ عجیب عجیب نام لیے جا رہے تھے۔ واقعات دُہرائے جا رہے تھے۔ رائیں دی جا رہی تھیں۔ ان سب میں شامل اور سب سے الگ وہ بیٹھا سنتا رہا۔ خود بھی اپنے تئیں بحث مباحثے میں شامل پایا۔ کبھی وہ جوش میں آ کر زور سے بولتا۔ کبھی ہنستا۔ کبھی کسی ساتھی سے کسی نکتے پر جھگڑنے لگتا۔ لیکن ایک گوتم نیلمبر کٹیا سے باہر موجود تھا۔ جنگلوں میں گھوم رہا تھا۔ سرجو کی لہروں کو عبور کرنے میں مصروف تھا۔ ترائی کے نرکلوں میں گھاس پر سر رکھے لیٹا تھا۔ جبکہ یہ گوتم نیلمبر اپنے ساتھیوں سے مگدھ کی سیاست پر تبادلہ خیالات کرنے میں منہمک رہا۔

---

¹ سنگتراش

مگدھ میں ان دنوں نندوں کی حکومت تھی جو خدائے دولت کبیر سے بھی زیادہ امیر تھے مگدھ ملک کی ریاستوں میں سب سے زیادہ طاقت ور تھا۔ ایک زمانہ تھا جب کوشل بھی عروج پر تھا۔ اجین کے بادشاہ مہاتیین نے یہاں کی شہزادی سے شادی کی تھی۔ مہاکوشل اور اور پرسن جیت جیسی ہستیاں یہاں حکومت کرتی تھیں۔ عہدِ عتیق میں جب ایودھیا اس سارے دیس کی راجدھانی تھی۔ اس کے سورما شہزادے دور دور دکن اور لنکا تک مہمیں سر کرنے کے لیے جاتے تھے۔ ایودھیا کے شاہی خاندان کی ایک شاخ نے شراوستی میں اپنا راج قائم کرنے کے بعد شاکیہ اور کاشی کا علاقہ بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا جب اتر کوشل کی طاقت کی ٹکر جنوبی مگدھ سے ہوئی۔

مگدھ والے ہمیشہ سے کوئی نہ کوئی گڑبڑ پھیلاتے آئے تھے۔ یہاں کا ایک راجہ جرا سندھ جنگِ عظیم میں سری کرشن اور ان کے ساتھیوں کے خلاف لڑا تھا اور بھیم کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ پرستان کا ایسا شہر گری ورج اس کا پایہ تخت تھا اور وہ راجہ ایسا زورآور تھا کہ مہابھارت میں لکھا تھا کہ بھوج ہنس کے اٹھارہ حکمران اس کے رعب سے اتر پچھم بھاگ گئے تھے۔ گری ورج کے قلعے میں سیکڑوں بادشاہ اس نے قید کر رکھے تھے جس طرح پہاڑوں کے غار میں شیر ہاتھیوں کو قید کرتے ہیں اور انھیں سری کرشن دیوکی پتر نے آکر آزاد کیا تھا۔ اسی جراسندھ کے باپ راجہ براہدرتھ نے تخت و تاج اس کے حوالے کر کے غور و فکر کی زندگی گزارنے کے لیے اپنی دونوں رانیوں کے ہمراہ بن کی راہ لی تھی اور بنوں میں جا کر فلسفی ساکیانہ کا چیلا بن گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کتابوں میں لکھا ہے کہ رشیوں کے گھر میں راکھشس جنم لیں گے۔

گر جنگِ عظیم کے بہت پہلے اسی علاقے کی شمالی ریاست متھلاپوری کی راج دلاری ایودھیا کے شہزادے سے بیاہ کر آئی تھی۔ کوشل دیس کی اس بہو کا نام سیتا تھا۔

ویدوں کے عہد سے لے کر اب تک مگدھ پوری طرح سے برہمنوں کے اثر میں کبھی نہ آیا تھا۔ یہاں کی آبادی ہمیشہ مخلوط رہی۔ ان کی اونچی ذاتوں کو بھی باہر والوں نے کبھی خالص نہ سمجھا اور مگدھ کے برہمن اور کشتری بھی کوشل دیس والوں کی نظروں میں حقیر تھے

پچھلی دونوں صدیوں میں شیش ناگ خاندان کی مگدھ پر حکومت رہی۔ اس خاندان کے بادشاہ بھیم بسار کے عہد میں شہزادہ مہاویر اور شہزادہ سدھارتھ نے اپنے فلسفوں کا پرچار کیا تھا۔

— زندگی کی ندی پر پل بنانے والا چوبیسواں مہاویر جو ویشالی کے کند گرام میں پیدا ہوا۔ اہنسا کی تلقین کرتا سارے دیس میں گھوما —————— اور پھر دور دنگا کے گھنے جنگلوں کی طرف نکل گیا۔ — کپلاوستو کے لمبنی گرام میں پیدا ہونے والا سدھارتھ جو گری ورج کی سبز پہاڑیوں پر چلا۔ نرنجن ندی میں نہایا۔ پیپل کے درخت کے سائے میں جسے گیان حاصل ہوا۔ شراوستی اور کاشی کے باغوں میں جہاں ہرن کلیلیں بھرتے تھے اس نے وعظ کہے اور جو کوسی نگر میں مرا —

بھیم بسار کے زمانے میں یہ دونوں آئے تھے۔ اس کی راجدھانی کا نام گری ورج تھا۔ اس کے چاروں اور سرسبز پہاڑیاں تھیں اور خوبصورت دریا اور اس کی سرزمین شاداب تھی اور سونا بہا کر لانے والی سون ندی اس میں بہتی تھی۔

کوشلا دیوی۔ شراوستی کی شہزادی۔ مہاراجہ پرسین جیت کی بہن۔ بھیم بسار کی ملکہ نے گری ورج کے اتر میں —— راج گیر آباد کیا۔ لیکن اس کے بیٹے اجات شترو نے اپنے باپ کو فاقے دے دے کر مار ڈالا اور خود سنگھاسن پر جا بیٹھا۔ رانی نے اپنے شوہر کے غم میں رو رو کر جان دے دی۔ تب شراوستی کے پرسن جیت نے گرج کر کہا۔ میری لاڈلی بہن مرنے کے لیے مگدھ نہیں بھیجی گئی تھی۔ اتر کی جمہوریتیں کاشی کوشل کی ساتھی بنیں اور کوسی نگر۔ اور ویشالی اور شراوستی مگدھ کے مقابل میں صف آرا ہوئے۔

اور تب مگدھ کے وزراء نے ویشالی والوں کے حملے روکنے کی خاطر پاٹلی گرام کی چھوٹی سی بستی کے چاروں اور ایک فصیل بنائی۔

مگر اجات شترو جیتا اور اپنے ماموں راجہ پرسن جیت کی بیٹی بیاہ کر لے گیا۔ اس کے پوتے اودے نے کسم پورہ آباد کیا۔ پاٹلی گرام۔ پشپ پورہ۔ پاٹلی پتر۔ پھولوں کا شہر۔ پریوں کا شہر۔ ملک کا سب سے عظیم الشان دارالسلطنت۔ جہاں سون ندی کے کنارے

کنارے دیش ناریوں کے نقرئی بجرے تیرا کرتے۔ جہاں پاٹلی کی کلیاں بالوں میں سنوارے سنہری آنکھوں والی سورنا کشی لڑکیاں مرمریں چبوتروں پر رقص کرتیں۔

اور گوتم سدھارتھ نے پیشین گوئی کی تھی کہ ایک وقت آنے والا ہے جب یہ شہر آگ۔ اور سیلاب اور جنگ کے نذر ہو گا۔ اودے اس شہر کا بانی ایران کے شہنشاہ دارَیوش اوّل کا ہم عصر تھا جس نے یونان پر قبضہ کیا۔

گوتم نیلمبر کو ایران سے بہت دلچسپی تھی۔ اکلیش اور جو دوسرے طالب علم تکشیلا سے واپس آتے گوتم ان سے کرید کرید کر اس انوکھے۔ ملک کے متعلق پوچھتا۔ پارسیکاؤں کے شہنشاہ جو بہت زبردست اور مطلق العنان تھے (ان کی راج نیتی کے اصول جانے کیا ہوں گے؟) ان کے مذہب میں اگنی کی پرستش مقدم تھی۔ وہ ویدوں کے سارے خداؤں کو پوجتے تھے۔ وآہو کے علاوہ جسے وہ وآہیو کہتے تھے۔ وہ سورج دیوتا مترا کو مانتے تھے۔ ان کی زبان سنسکرت کی ایک شاخ تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ خود بھی آریہ تھے۔

مگر دوسرے ملکوں پر وہ حملہ کیوں کرتے ہیں۔ گوتم نے اداسی سے کہا۔ انسانوں کی ایک جماعت کو دوسری جماعت پر قابض نہ ہونا چاہیے۔ کسی ایک قوم کا دوسری قوم کو تسخیر کرنا کسی ایک تہذیب کا دوسری تہذیب کی بیخ کنی کرنا غلط ہے۔ اخلاقی گناہ ہے۔ سیاست کے نظریے کی بات مت کرو کہ ایک مچھلی دوسری مچھلی کو کھاتی ہے۔

ایرانیوں نے جب گندھارا دیس پر حملہ کیا۔ وہاں کے راجہ نے بھیم لسبار کے پاس اپنا سفیر بھیجا تھا۔ ہخامنشی شہنشاہیت نے سپت سندھو کے اتر پچھمی علاقوں کو اپنا باج گزار بنائے رکھا۔ سب سے زیادہ چاندی یہیں سے ایرانی خزانے میں داخل کی جاتی تھی۔

ایرانی سلطنت بہت زبردست تھی۔ اتنی زبردست کہ ایک لمحے کے لیے اسے احاطہ تصور میں نہ لایا جا سکتا تھا۔ اس سامراج میں مصر اور بابل۔ اور شام اور اناٹولیہ کوچک

اور یونان کے شہر اور جزیرے اور سپت سندھو کے اترا پتھ صوبے بھی شامل تھے اور ٹریوش کے بعد دارا نے کہا تھا۔ میں داریوش ہوں۔ شہنشاہ۔ شاہوں کا شاہ۔ ملکوں کا بادشاہ جن میں بھانت بھانت کے انسان بستے ہیں۔ اس وسیع و عریض زمین کا حاکم — گشتاسپ کا بیٹا۔

ایرانی۔ ایرانی کا بیٹا۔ آریہ۔ آریہ گھرانے کا فرزند —— اور اس کے جہازوں کے بیڑے مقدس سندھو کی لہروں پر تیرتے تھے۔

اور داریوش اوّل کے بیٹے ارتخشیر نے اتراپتھ کی ان مقبوضات کے متعلق فخریہ اعلان کیا تھا۔ یہ علاقے جہاں دیو پوجے جاتے تھے۔ اہورمزدہ کی خواہش کے مطابق ".....دیووں کے مندروں کی بنیادیں ہلادیں۔

"سوس کی کیا خبریں ہیں۔ تم تو ....ئے ہو۔" وفاتمع ذلیس نے اکلیش کو مخاطب کیا۔

"پچھلے دنوں کچھ تاجر پری سی پولس سے جان.... "آئے تھے وہ کہتے تھے کہ ایران میں بہت زبردست لڑائی چھڑی ہے۔"

"کہیں اور جنگ چھڑ گئی۔۔۔؟" ملبشور نے دوسرے کو ےا کر سوال کیا۔

"یا دنوں نے جب سے ایران کی غلامی سے چھٹکارا پایا ہے۔ ارا ....

ہوتی جارہی ہے۔ تمھیں ایک مار.... ب لیا، وچولپتا .... جا ،یت جترانت ریاست کی ضرورت ہے۔

---

۱ کسری

جس کی دُنیا کے چاروں کھونٹ تک وسعت ہو۔ مضبوط سامراجیہ۔"

"مجھے مضبوط سامراجیہ نہیں چاہیے۔" گوتم نے کہا

"ایرانیوں کی سلطنت ان کے شاہی خاندان کی پھوٹ نے ختم کی" اکلیش اطمینان سے کہتا رہا۔ "پچھلے دنوں اردشیر سوئم قتل ہوا۔ پھر اس کے بیٹے کو زہر دیا گیا۔ ان کے یہاں اتنی خون کی ندیاں بہی ہیں کہ اس کے بعد تخت پر بٹھانے کے لیے انھیں کوئی بھائی بھتیجا زندہ نہ ملا اور وہ ایک دور کے عزیز دارا کو پکڑ کر لائے۔ پرسی پولس کے تاجر کہتے تھے کہ دارائوش سوئم بہت بہادر بادشاہ ہے لیکن اس غریب کو یاونوں کے سیناپتی سکندر نے شکست دی جو دُور پچھم سے بڑی بھاری فوج لے کر آیا ہے۔"

گوتم سنتا رہا۔ بھاری فوجیں۔ خون کی ندیاں۔ شکست۔ فتح۔ اکلیش کتنے مزے سے یہ خوفناک واقعات بیان کر رہا تھا۔

"اور اب سارا ایران سکندر کے ہاتھ میں ہے۔" اکلیش نے بات ختم کی۔

"یعنی پارسیکاون کی خزانت ریاست کا مالک اب جس کا تم نے نام لیا۔ سکندرا ہے۔؟" گوتم نے ہلکے سے تبسم کے ساتھ پوچھا۔ "ہاں۔ وہی ہے۔" اکلیش نے بکلخت ذرا جھجک کر جواب دیا۔ وہ گوتم کے تبسم کے معنی سمجھ گیا تھا۔

"بھائی اکلیش تم کھشتری ہو۔ حکومتیں قائم کرنا اور حکومتیں اکھاڑ کر پھینکنا تمھارا کام ہے۔ میں تم کو کیا سمجھا سکتا ہوں۔" گوتم نے کچھ دیر بعد آہستہ سے کہا۔

"گوتم!" اکلیش نے چراغ میں تیل ڈال کر اسے پھر وسط میں رکھ دیا اور گوتم کو غور سے دیکھنے لگا۔ "تم کو اگر کسی جنگ میں شامل ہونا پڑا تو کیا تم لڑنے سے انکار کرو گے؟"

گوتم، اکلیش کے اس سوال سے لڑکھڑا گیا۔ یہ سوال وہ مدتوں سے اپنے آپ سے کر رہا تھا۔ کیا دنیا میں ایسے لوگوں کی جگہ ہے جو بغیر لڑے زندہ رہنا چاہتے ہیں؟ اسے جو فنونِ جنگ سکھلائے گئے ہیں کیا وہ انھیں استعمال کرے گا۔

"تم سمجھتے ہو پرجا چُپ رہے گی ۔" کٹی کے دوسرے کونے میں بیٹھا ہوا جوگیش وشو سے کہہ رہا تھا
"ہرگز نہیں ۔" دوسرے نے جوش سے جواب دیا "کوئی دن جاتا ہے ۔ کوئی دن ۔ دیکھ لینا ۔"
گوتم ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوا جو مگدھ کے سیاسی حالات پر زور شور سے تبصرہ کرنے میں مصروف تھے ۔
اجات سترو کے پوتے کے بعد مہا پدم نند پاٹلی پتر کے تخت پر قابض ہوا اس کی ماں شودر تھی ۔ باپ نائی ۔ یہ مہاپدم پتی نند تھا ۔ بے حد حساب دولت کا مالک ۔ ۔ اور اگر سین تھا ۔ زبردست فوجوں کا سپہ سالار ۔ اس کے بعد اس کے آٹھ بیٹے بارہ سال کے عرصہ میں یکے بعد دیگرے تخت پر بیٹھے اور اس لیے یہ خاندان نو نند کہلایا ۔ اس کا آٹھواں بیٹا دھن نند تھا جس کے خزانے ہیرے جواہرات اور سونے چاندی سے پٹے پڑے تھے اور جس کے لشکر میں بیس ہزار سوار ، دو لاکھ پیادے ۔ دو ہزار جنگی رتھ اور تین ہزار ہاتھی تھے ۔ اور جو محصول بڑھاتے جا رہا تھا اور جس کی پرجا بے چین تھی ۔
سارے دیش میں برہمنوں اور کھشتریوں کا راج تھا ۔ سندھ کی وادی میں برہمنوں کی حکومت تھی ۔ لیکن مگدھ میں مہاپدم پتی نند کے عہد سے کھشتریوں کی حکومت کا خاتمہ شودروں کے دور کا آغاز ہوا تھا ۔
شراوستی والے مگدھ کے باسیوں کو پہلے ہی کب خاطر میں لاتے تھے ۔ برہمنوں کا احساس برتری ان کے مشرقی یورپ کے زمانے کی یادگار تھا ۔ جب انہیں ڈینیوب کے ساحلوں پر قبائلی فوقیت حاصل تھی ۔ اس زمانے میں روما کا ہم عصر سماج اور فرانس کا کیلٹک معاشرہ ، کاہنوں ، جنگجو سپاہیوں اور عام کاریگروں کے فرقوں میں بٹا ہوا تھا اور اس احساس برتری کا برہمنوں کے پاس اب بہرحال کوئی علاج نہ تھا ۔
اور گو طالب علم کا فرض تھا کہ وہ نسل اور ذات کے غرور سے بچے لیکن گوتم اور اس کے

جمہوریت پسند ساتھی شودروں کو بہرحال برداشت نہ کر سکتے تھے۔
پاٹلی پتر کا دھن نند جرا لالکھی کے دہانے پر بیٹھا تھا۔

5

ایک روز طالب علموں کی ایک ٹولی کے ساتھ ہری شنکر بھی آشرم میں آن موجود ہوا۔ گوتم جو اس سمے اپنی کٹی میں کھڑکی کے پاس بیٹھا ایک تصویر بنا رہا تھا اسے دروازے میں کھڑا دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔

"میں اندر آ جاؤں ۔۔۔؟" وہ بلیز پر پہنچ کر شنکر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"آؤ ۔۔۔ آؤ ۔۔۔ کیسے آنا ہوا ۔۔۔" گوتم نے گلہری کی دم کا موقلم اور رنگوں کی کلھیاں اور سفید چینی پٹہ ایک طرف کو سمیٹتے ہوئے ہڑبڑا کر کہا۔
ہری شنکر کمتے کے ساتھ ہی چینی پٹے کو غور سے دیکھنے میں محو ہو گیا

گوتم نے جلدی سے فرش پر دوبارہ جھاڑو دے کر چٹائی بچھائی۔ بھوج پتر، ریشم اور تانبے کی تختیوں پر لکھی ہوئی کتابوں کا جو انبار چاروں طرف بکھرا پڑا تھا اسے سمیٹ کر ایک کونے میں رکھا۔ دوسرے کونے میں مٹی کے چند برتن اوندھے سیدھے پڑے تھے۔ کھڑکی کے نزدیک اس کا کمبل بچھا تھا جس پر رات کو وہ سوتا تھا۔ اس کا کشکول چھپر کے ایک بانس میں لٹکا تھا۔ کٹیا میں اس وقت خاصی بے ترتیبی تھی۔ گوتم کو بڑی ندامت محسوس ہوئی۔ وہ ہری شنکر کی سحر انگیز اور پرسکون شخصیت سے بے حد متاثر ہو چکا تھا۔ جانے مجھے یہ کیسا بے ڈھنگا لڑکا سمجھے گا۔ اس نے پریشان ہو کر سوچا۔ پھر سرعت سے مہمان نوازی میں جٹ گیا۔

اس نے ٹھنڈے پانی کی گڈوی ہری شنکر کے سامنے رکھ دی۔ پھر برآمدے میں جا کر اس نے چولہا روشن کیا اور چاول ابالنے کے لیے چڑھا دیے۔
ہری شنکر متبسم انداز سے اپنے میزبان کی یہ ساری تیاریاں دیکھتا رہا۔ گوتم نت

کے بغیر مہمان نوازی مکمل نہ ہو سکتی تھی۔ اسی ہڑبڑاہٹ میں وہ چادر کندھے پہ ڈال کر باہر جانے کے لیے اُٹھا۔

"کہاں جاتے ہو؟" گوتم نے چونک کر دریافت کیا

"بستی سے ماس مانگ لاؤں۔ ابھی آیا۔"

"ماس —" ہری شنکر کے خوبصورت چہرے پہ کرب کی لہر دوڑ گئی۔

"ارے —" گوتم دفعتاً چُپ ہو گیا۔ اسے اور زیادہ خفت محسوس ہوئی۔ اسے اپنی بیوقوفی پر سخت غصہ آیا۔ وہ جانتا ہے کہ ہری شنکر بھکشو ہے اور اہنسا کے اس نئے اصول کا قائل۔ پھر اسے شنکر کو ماس کھلانے کا خیال کیسے آیا۔ کیونکہ وہ خود مدتوں سے ماس کھانے کے لیے بے چین ہے لیکن برہمچاریہ کے قوانین کو توڑ نہیں سکتا اور یہ انوکھا بے تکا بھکشو اسے بہت عزیز ہے اور اپنی عزیز ہستی کو اپنی پسندیدہ ترین شے ہی پیش کر کے دل کو خوشی ہوتی ہے۔ اس طور پر اپنی حماقت کا تجزیہ کر کے اسے ذرا اطمینان ہوا۔ دفعتاً اسے خیال آیا کہ ایک اور پسندیدہ شے ہے جسے وہ سرجو کے اس پار چھوڑ آیا ہے۔ غالباً وہ دونوں چھوڑ آئے ہیں اور اسے ہری شنکر جانتا ہے اور حسد کا جذبہ اس کے دل میں امڈا اور اس کے چہرے پر سے ایک بادل سا گزر گیا۔

پھر وہ ہری شنکر سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ وہ اتنے دنوں کہاں رہا۔ کہاں کہاں گیا۔ کیا کیا سوچا۔ کیونکہ سوچنا ہی ان لوگوں کا خاص مشغلہ تھا۔

اس کے بعد سے اُس نے شنکر کے سامنے سے اس کے جھوٹے برتن اٹھائے

"تم میری اتنی عزت کیوں کرتے ہو؟" شنکر نے پوچھا

"پتہ نہیں۔ کیونکہ اگر دیکھا جائے تو میں خود کافی عزت کے قابل ہوں —"

اس نے ہنس کر جواب دیا

"براہمن — ایک بات بتلاؤ —"

"ہوں۔"

"خواہشیں تم کو بہت ستاتی ہیں —؟"

"یعنی۔"

"مثلاً یہی ——— اس کی خواہش ——"

"پتہ نہیں۔"

"تم نے کبھی قربانی کے فلسفے پر غور کیا ہے۔"

"آج کل میں اسی پر غور کر رہا ہوں۔ مگر کس طرح کی قربانی۔ جان کی ——— یا روح کی ——؟"

"جو بھی شے تمہارے تصرف میں آئے گی وہ گویا اپنے وجود کی قربانی تمہیں دے گی"

"میں سمجھا نہیں۔"

"تم خوب سمجھتے ہو۔"

"میں کیا کر سکتا ہوں اگر ——" گوتم نے گھبرا کر بات ٹالنا چاہی ——" اگر میرے پس منظر میں خون ہے۔ میرے چاروں طرف خون ہے۔ میں اتنے سارے خون کا کفارہ کس طرح ادا کروں گا ——؟"

ہری شنکر خاموش رہا۔ پھر وہ دونوں کھڑکی میں جا کر کھڑے ہو گئے۔

باہر سبزہ زاروں میں کسانوں کے بیلوں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں اور چرواہوں کی بانسریوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شکاریوں کے بالوں میں سجے ہوئے پر ہوا میں لہراتے تھے۔ ندی کے اس پار کھشتری امیرزادے اپنے باغوں میں تیر اندازی سیکھنے میں مصروف تھے۔ زندگی جاری تھی۔

"مجھے زندگی کے متعلق کچھ بتلاؤ ——"

"تمہاری زندگی تمہاری اپنی ہے۔ میری زندگی سے علیحدہ ہے۔ میں تم کو کچھ نہیں بتا سکتا ——"

گوتم نے دھیرے سے کونے میں جا کر ایک تاڑ کا صاف پتہ اٹھایا۔ مجھ سے اہنسا کے متعلق باتیں کرو۔ میں لکھوں گا۔ وہ ۔" اس نے قلم نکالا اور فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا "میں اپنی کتاب کا دوسرا باب لکھوں گا۔"

"لیکن تمہاری کتاب کا آخری باب کون لکھے گا۔؟"

"سارے میں تاریخ کا اتھاہ سمندر ہے۔ جس میں ہم اور تم پتوں کی طرح ڈول رہے ہیں۔ مجھ سے پہلے اب تک جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے یا نہیں ہے ؟ بتاؤ۔ میں کیا لکھوں ۔" گوتم نے پوچھا

"وقت کا تعین کرنے کی ضرورت نہیں۔ سب خواب کی طرح گزر رہا ہے ــــ گذر جائے گا ۔" ہری شنکر نے جواب دیا

"گذر جائے گا یا گذرتا رہے گا ۔؟" گوتم نے پوچھا

"یہ تمہارا اپنا مسئلہ ہے ۔"

"مجھے اہنسا کے متعلق بتاؤ ۔"

"برہمن ہو کر اہنسا کے قائل ہونا چاہتے ہو ۔؟" ہری شنکر نے ہنس کر پوچھا۔

گوتم بھی ہنسا "ہاں بڑی عجیب بات ہے۔ ہے نا ؟" اس نے نظریں اٹھا کر شنکر کو دیکھا۔

جانوروں کو مارنا ہزاروں برس سے برہمنوں کا خاص مشغلہ رہا تھا۔ جب یہ مشرقی یورپ اور وسط ایشیا کی چراگاہوں میں گھومتے تھے تب زندہ رہنے کے لیے اور گرم رہنے کے لیے درندوں کا شکار ان کے لیے ضروری تھا۔ اسی وجہ سے گنگا اور جمنا کے انتر ویدی علاقے میں آن کر بسنے کے بعد بھی ان کی معرفت اور ان کے فلسفے کے ارتقا میں جانوروں کے خون بہانے کا بڑا دخل رہا۔ ان کی کوئی عبادت قربانی کے بغیر مکمل نہیں تھی۔ خود تخلیق کائنات مابعد الطبیعات کے نقطہ نظر سے ایک عظیم آفاقی قربانی تھی۔ سام وید کے اصولوں کے مطابق قربان گاہ ایک زبردست رمزیت کی حامل تھی اور کائنات کی کلیت اور اس کے بقا کی علامت تصور کی جاتی تھی۔ بکر ودتی ماجھ کے لیے

گھوڑے کی قربانی لازمی تھی۔

کھیتوں کے اس پار الاؤ روشن کیے جا رہے تھے۔ بہت دور گاؤں کے سرے پر چوپال میں محفل جمی تھی۔ بھاٹ جنگِ عظیم کی داستان سنا رہا تھا۔ شام کے مکمل سناٹے میں ہوا کے جھونکے کے ساتھ اس کی پاٹ دار آواز کی لہر تیرتی ہوئی گوتم کی کٹی سے ٹکرائی پھر خاموشی چھا جاتی۔ کبھی کبھی مجمع تحسین و توصیف کے نعرے بلند کرتا۔ پھر ان سب پر بھاٹ کی آواز غالب آ جاتی۔ مردنگ زور زور سے بجائی جا رہی تھی۔ اس کی مدھم سی گونج کے ساتھ گوتم کا دل دھڑک اٹھتا۔ اس کے بعد ہوا تھمتی تو پھر خاموشی چھا جاتی۔

لیکن گوتم کا دل دھڑکتا رہا۔

یہ سناٹے مجھے طرح طرح کی داستانیں سناتے ہیں۔ الفاظ کے خاتمے میں بھی میری نجات نہیں — گوتم نے اپنے آپ سے کہا اور ہری شنکر کو دیکھتا رہا۔

قربانی کا تصور۔ لڑائی کا فلسفہ۔ جنگ اور امن کا مسئلہ۔ یہاں برہمن تلوار لیے گھومتے تھے اور کھشتری فلسفی بن جاتے تھے۔ ورن اور جاتی کی تفریق ابھی شدید نہیں تھی۔ نیتی شاستر، ویدوں اور اتہاس پرانوں کی تعلیم برہمن اور کھشتری دونوں کے لیے لازمی تھی۔

ویدوں کے عہد میں بھی کرت آ گئی۔ راستے تیار کرنے والی مقدس آتش کی عبادت گھنے جنگلوں میں پگڈنڈیاں بناتی مشرق تک پہنچ چکی تھی۔ پورب میں گوتم نیلمبر کے سفید فام ہم قوموں نے ناگاؤں کو اپنی تہذیب کے دامن میں سمیٹا۔ پچھم میں سندھو کے کنارے بسے ہوئے شہروں پر اندر کا قہر ٹوٹا۔ ہری یوپیا کا نگر میدان کارزار میں تبدیل ہو گیا جہاں اندر کے زرہ بکتر میں ملبوس تیس ہزار سپاہی لڑے اور فتح یاب ہوئے۔ سندھو کا شہر جہاں کہنیوں تک کپڑے پہنے ماتھے پر تلک لگائے گلے میں سیاہ پوتھ پہنے کندن کے رنگ والی سہاگنیں شیو۔ درگا۔ دیپ لکشمی اور پیپل کی دیوی کی آرتی اتارتیں۔ یہ لوگ جنھوں نے اپنے تمدن کو راجستھان۔ سوراشٹر اور بھی اترپردیش تک پھیلایا تھا۔ ایک روز شمال مغرب کے اونچے پہاڑوں کے اس پار۔ کسی انجانے دیش سے

اندر مہاراج کا سبک رفتار جنگی رتھ آیا اور ان سب کو روندتا ہوا نکل گیا۔ برہم ورت پہنچ کر یہ شہر سے رتھ رُکے اور ان لوگوں نے اندر پرستھ آباد کیا اور حمدیں لکھیں اور موسیقی تیار کی۔

اب تہذیب کے مرکز اندر پرستھ اور یدو خاندان کی راجدھانی سے ہٹ کر مشرق تک آ چکے تھے۔ یہ ایودھیا اور شراوستی اور اجینی کے عروج کا زمانہ تھا۔ مگدھ اور اتر کوشل کے انتہائی مہذب باشندے اب شمال مغرب اور سرسوتی کے اس پار رہنے والوں کو نیم وحشی اور جاہل گردانتے تھے۔

گوتم نیلمبر کی تاریخ عظیم ناموں سے پُر تھی۔ ان میں سے بہت سے نام اب روایت اور اسرار کے دھندلکے میں جا چھپے تھے۔ جس طرح بھارت کی اونچی چوٹیوں پر دھند جمع ہو جاتی ہے۔

گوتم کو ماضی سے ڈر لگتا تھا۔ کیا ضرورت تھی۔ کیا وجہ تھی کہ ان سب کا یہ تسلسل قائم تھا۔ جاری و ساری — اور کب تک ایسا رہے گا؟ ڈگ وجے شری رام چندر کے عہد سے دواپار شروع ہوا تھا جس کا اختتام جنگِ عظیم پر ہوا۔ اور جنگِ عظیم کے بعد — سری کرشن کے عالم موجودات سے روپوش ہونے کے ساتھ ہی کالی یگ شروع ہو گیا! — جواب تک باقی تھا۔

اس کالی یگ میں کیا ہوگا —؟

پُرانوں کی داستانیں اس نے پڑھ رکھی تھیں۔ جن میں کائنات کی مادے سے تخلیق کا بیان تھا اور خداؤں اور فلسفیوں کے قصے۔ اور شاہی خاندانوں کے نسب نامے۔ پراکرت کی تاریخوں پر ان قصوں کی بنیاد تھی جو صدیوں سے درباروں اور چوپالوں میں داستان گو سناتے آ رہے تھے۔ ان پرانوں میں چالیس چالیس ہزار اشعار ہوتے تھے جو وشنو اور شیو کی حمد کے ساتھ شروع کیے جاتے تھے۔ پرانوں کے مطابق ارجن کے پوتے کے وقت سے لے کر جس کے دربار میں پہلی بار جنگ نامہ سنایا گیا تھا مہاپدم نند کے عہد تک ایک ہزار سال کا وقفہ گزر گیا تھا۔ ارجن سے لے کر ادوتے تک چوبیس پشتیں

گزر چکی تھیں۔ اودے کے دورِ حکومت میں شاکیہ منی پیدا ہوئے۔

گوتم نیلمبر نے نظریں اٹھا کر ہری شنکر کو دیکھا جو بڑی دلچسپی سے پیتل کی ایک تختی پڑھنے میں مصروف تھا۔ کھڑکی کے باہر گیندے کے پھول غروب آفتاب کی روشنی میں قرمزی نظر آ رہے تھے۔ گوتم کی جھنجھلاہٹ بڑھتی گئی۔

اس کا فیصلہ کرنے والا کون ہو گا کہ کون کس سے برتر ہے۔ کس نے کس پر فتح پائی۔ کون کورو ہے کون پانڈو

جنگِ عظیم آج سے سینکڑوں برس قبل کوروکشیتر میں لڑی گئی تھی اور ہستناپور کے ان بہادروں کے قصے جنھوں نے دروپدی سے بیاہ رچانے کے بعد اندر پرستھ کا ایسا خوبصورت شہر آباد کیا تھا۔ گانے والے وینا اور مردنگ بجا بجا کر گاؤں گاؤں سناتے پھرتے تھے۔ ان گنت سورماؤں کا تذکرہ رگ وید اور قدیم ترین برہمن ادب میں موجود تھا جس میں ہر چیز اصل سے بڑی دکھلائی دیتی تھی۔ بادلوں کی گرج۔ ہاتھیوں کی چنگھاڑ۔ عظیم معرکے دلاور سورما۔ نورانی رشی۔ آسمانی سنگیت۔ پری وش لڑکیاں شکنتلا۔ دمینتی۔ کاشی کے راجہ کی بیٹی امبا۔ یہ سب طلسماتی ہستیاں ڈیڑھ دو ہزار برس قبل زندہ رہی ہوں گی۔ انہی جنگلوں پر چلتی پھرتی ہوں گی۔ یہ سب سوچ کر گوتم کو بڑا عجیب سا لگتا کہ ایک وقت تھا کہ نربدا اور تاپتی کے درمیان راجہ نل کی حکمرانی تھی۔ دمینتی برار کی ـــــ راجکماری تھی۔ سیتا مہارانی کے بابا کا ملک اسی گنگا کے اتر میں گنڈک ندی کے کنارے کنارے آباد تھا۔ پل کی پل میں وہ سارا زمانہ داستان میں تبدیل ہو گیا۔ اور یہ وقت جس میں وہ زندہ تھا وہ خود۔ گوتم نیلمبر برہمن۔ ہری شنکر بھکشو جو کھڑکی کے پاس بیٹھا مطالعے میں مصروف تھا اور ایودھیا کی

چمپک اور باہر آشرم کے کنج میں ٹہلتے ہوئے طالب علم یہ سب کے سب ایک آن میں ماضی کے دھندلے ناقابلِ یقین۔ غیر حقیقی کرداروں کی حیثیت اختیار کر لیں گے جن کی کائنات کے، وقت کے بہتے ہوئے سمندر میں کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔ بھیم۔ دریودھن۔ کرشن۔ ارجن۔

اگر مجھے کسی جنگ میں شامل ہونا پڑ گیا تو کیا میں لڑوں گا۔؟ اس نے چوروں کی طرح ہری شنکر کو دیکھا۔ اکلیش کہہ رہا تھا کہ جنگ کوئی دن جاتا ہے کہ چھڑ جائے گی۔ "تم لڑو گے۔؟" اس نے یکلخت بآوازِ بلند سوال کیا۔

"ہم محض اپنے خیالات کا نتیجہ ہیں۔" ہری شنکر نے جواب دیا۔

"لیکن کیا تم لڑو گے۔؟" گوتم نے ضد سے دہرایا۔

"ہر انسان سے اس کے افعال۔ ضرورت یا حالات یا اس کی فطرت کی وجہ سے سرزد ہوتے ہیں۔ وہ خود مختار نہیں ہے۔ ذمہ داری کے کوئی معنی نہیں۔" ہری شنکر تختیاں ایک طرف رکھ کر کھڑکی کے نزدیک چلا گیا۔

دفعتاً دریا پر بہت سی روشنیاں جھلملا اٹھیں۔

"کسی کی بارات جا رہی ہے۔" گوتم نے اظہارِ خیال کیا۔

"ہوں۔"

"یا ممکن ہے شاہی بجرے نے ادھر کا رخ کیا ہو۔"

"چلو باہر چلیں۔ اندھیرے میں میرا دم گھبراتا ہے۔" ہری شنکر نے یک بیک وحشت زدہ ہو کر کہا۔

وہ دونوں آشرم کے باغ سے نکل کر گاؤں کے راستے پر آ گئے۔ بارشوں کا زمانہ کب کا ختم ہو چکا تھا۔ فضا میں ہلکی سی خنکی آ گئی تھی۔ چوپال کی طرف سے بھاٹ کی گانے کی آواز اب زیادہ صاف سنائی دینے لگی تھی۔

گوتم خاموشی سے شنکر کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ پھر ٹھٹک کر اس نے

اُداسی سے کہا۔ "تم خود پرست ہو ہری شنکر۔ تم کو دوسروں کی پرواہ نہیں۔ اپنے ذہن کے بل پر اپنے آپ کو ارہت کے درجے پر پہنچا دینا کون بڑی بات ہے۔ تم کو اس سے کیا غرض کہ دوسروں پر کیا بیت سکتی ہے۔"

"مجھ کو خوب معلوم ہے کہ دوسروں پر کیا بیت سکتی ہے۔" ہری شنکر نے مختصراً جواب دیا۔ "آؤ اُدھر چل کر دیکھیں کیا ہو رہا ہے۔"

گوتم چپ ہو گیا۔ وہ دونوں چوپال کی طرف بڑھنے لگے۔

"تم بھیشم کا قصہ سنو گے؟" مجمع کے قریب پہنچ کر گوتم نے ذرا غیر یقینی انداز میں اپنے ساتھی سے پوچھا۔

"کیا حرج ہے۔" اُسے جواب ملا۔

ان دونوں کے بر بھچاری لباس دیکھ کر سامعین نے فوراً تعظیماً ان کے لیے جگہ خالی کر دی۔ جاٹ لہک لہک کر قصہ سنا رہا تھا۔ گوتم نے اسے پہچان لیا۔ وہ شراوستی کا برہمن تھا۔ اُس نے وہیں سے کھڑے کھڑے مسکرا کر اسے پرنام کیا اور خود بھی قصہ سننے میں مصروف ہو گیا۔

یہ لوگ کسان۔ مزدور۔ غریب۔ امیر۔ شہری۔ دیہاتی۔ مرد۔ عورت صدیوں سے اسی طرح گاتے بجاتے اور ان داستانوں پر سر دھنتے چلے آ رہے تھے۔ رگ وید کے زمانے میں اندرا اور دوسرے خداؤں کی تقدیس کے لحن الاپے جاتے۔ بادشاہوں کے اشومیدھ[1] منعقد کروانے والے فرمانروا کے قصیدے پڑھے جاتے۔ "اس نے ایسے ایسے دان دیئے۔ ایسی ایسی لڑائیاں لڑیں۔ ایسی ایسی فتوحات حاصل کیں۔" اور کاہن ہوتر سے کہتا۔ قصے کا آغاز کرو۔ قربانی کرنے والے کو دوسرے انسانوں سے اُوپر اٹھاؤ۔ شام پڑے بربط نواز اتر مندر راگ کی دھن میں رزمیہ گیت چھیڑتے۔ عہد عتیق میں ارجن۔ واسو دیو اور دوسرے بہادروں کے درباروں میں اسی طرح دنیا عزرنگ

---

[1] گھوڑے کی قربانی۔

اور شنکھ کی سنگیت میں یہ نغمے الاپے گئے تھے۔
عمر مسلسل ہے —

پرانے زمانے میں درباری بھاٹ کھشتری ہوتا تھا۔ بعد میں درباری شاعری نے رزمیہ داستانوں کے لیے راستہ تیار کیا۔ اب چھوٹی چھوٹی ریاستیں ٹوٹ کر ختم ہو رہی تھیں اور شاعر جو پہلے درباروں سے وابستہ تھے اب گلی گلی اور گاؤں گاؤں گھوم کر اپنی روزی کماتے تھے۔ رسمی اور باضابطہ مذہب کی جڑیں مضبوط ہوتی جا رہی تھیں۔ خالص رزمیہ شاعری میں مذہبی عنصر شامل ہو رہا تھا۔ پروہتوں نے مہابھارت کے جنگ نامے کو اخلاقیات کے درس میں تبدیل کر دیا تھا۔ کھشتری بھاٹ کی جگہ برہمن داستان گو نے حاصل کر لی تھی۔ تاریخ رفتہ رفتہ پیچھے ہٹتی جا رہی تھی۔ تاریخ کے کردار فلسفیانہ اور مذہبی لبادہ اوڑھ چکے تھے۔

اب داستان گو کاشی کے راجہ کی تینوں بیٹیوں کی کہانی بیان کر رہا تھا۔ جن کو بھیشم جین اُن کے سوئمبر کے وقت لے اڑے تھے۔ کچھ دیر بعد ارجن کا قصہ شروع ہوا۔ گوتم اب ذرا آرام سے ایک ستون کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ ہری شنکر ماحول سے بے نیاز دوسری سیڑھی پر بیٹھا رہا۔

یہ ارجن بھی خوب شے تھے۔ گوتم نے سوچا۔ سب سے پہلے انھوں نے دروپدی سے بیاہ رچایا۔ جب بارہ برس کی بن باس انھیں ملی تو وہ بسری کرشن کی بہن سبھدرا کو بھگا لے گئے۔ جلاوطنی کے زمانے میں منی پور کی شہزادی چترانگدا سے شادی کر لی ان سب کے علاوہ بھائی ارجن نے الوپی کو بر چایا۔ وہ الگ۔ گوتم کو ہنسی آ گئی۔ وہ ذرا غور سے کہانی سننے میں مصروف ہو گیا۔

اس وقت تک دونوں فریق کورو کھشیتر کے میدان میں آمنے سامنے پہنچ چکے تھے۔
رزمیہ شاعری میں نسلوں یا قوموں کی ایک دوسرے سے جنگ کا تذکرہ نہ ہوتا تھا۔ بہادر سورماؤں کا ایک دوسرے سے مقابلہ اصل موضوع تھا۔ شہرت حاصل کرنا سورما کا مقصدِ حیات تھا اور اپنی شجاعت پر نازاں ہونا اس کے لیے جائز۔ اس کے

حریف کے لیے لازم تھا کہ اس کا ہم پایہ ہو۔ بادشاہوں کے بیٹے اپنے سے کم حیثیت انسانوں سے جنگ نہیں کر سکتے تھے۔ جس وقت گوتم سبھا سے اٹھ کر باہر جانے لگا۔ اس سمے ارجن للکار کر کرن سے اس کا شجرۂ نسب دریافت کر رہا تھا۔

مہابھارت کے یہ سارے کردار جنگجو ہونے کے علاوہ فلسفی بھی تھے۔ یہ روایتیں نہیں تھیں۔ تاریخی شخصیتیں تھیں۔ حتیٰ کہ نیم الوہی کردار بھی صحیح تھے جن کی دیوی لکشمی کی طرح کنول کے پھول سے تخلیق ہوئی تھی اور جن کی جٹاؤں سے گنگا بہتی تھی۔ کیونکہ گوتم اپنے ملک کے شعراء کے زورِ تخئیل کا بڑا قائل تھا اور دیومالا بہرحال فلسفے کی ٹھوس شکل تھی اور روایت کا جال بُن لینا ذہن کے لیے بہرحال آسان ترین بات ہے۔ گوتم خود بھی شاعر تھا اور شاعر ہمیشہ اپنے کرداروں کو مثالی بنا کر پیش کرتے ہی آئے ہیں۔ اروشی اگر اپسرا تھی تو کیا وہ لڑکی جو ایودھیا کے گھاٹ پر بیٹھی تھی کوئی بھی کوی اسے اپسرا نہیں سمجھے گا تو اور کیا سمجھے گا۔ کیا وہ اس روز پانی کے کنارے میٹھی جل پری نہیں معلوم ہو رہی تھی۔

سڑک پر آ کر تاروں بھرے آسمان کے نیچے گوتم نے ایک لمبا سانس لیا۔ بھاٹ کی آواز اس کا تعاقب کرتی رہی۔ بھیم۔ ارجن۔ کرن۔ بھیم۔

جگمگاتے ہوئے بجرے دریا کو پار کر چکے تھے اور دور سے ندی کے گھاٹ پر بڑی چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ یہ کسی کی بارات ہے؟ — اس نے ایک راہگیر سے سوال کیا

"نہیں تو۔ راجن ایودھیا سے آئے ہیں۔" راہگیر نے جواب دیا۔

گوتم نے چونک کر شنکر کو آواز دی۔ پھر پلٹ کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ لیکن شنکر حسبِ معمول غائب ہو چکا تھا اور گاؤں والوں کی بھیڑ میں جو چوپال کے باہر جمع تھی، شنکر کا پتہ چلانا ناممکن تھا۔

گوتم نے چادر کندھے پر ڈالی اور شہر کی طرف چل کھڑا ہوا۔

وسطِ شہر میں پہنچ کر اسے اپنی حویلی کی روشنیاں دکھلائی پڑیں۔ وہ فوراً دوسری گلی میں مڑ گیا۔ سنہرے اور سبز اور گلابی مکانوں پر ہلکی ہلکی دھند چھا رہی تھی۔ ایک عورت لمبا سا گھونگٹ کاڑھے چھاگل بجاتی قریب سے گزر گئی۔ تاڑی خانوں میں ہلڑ مچ رہا تھا۔ دوکانوں پر خرید و فروخت

ہو رہی تھی۔ بازار کی سڑک پر دونوں طرف مشعلیں روشن تھیں۔ ان کی جھلملاتی روشنی میں شہر کے امیر زادے اور بانکے زرتار کپڑے پہنے مونچھوں پر تاؤ دیتے اکڑتے پھر رہے تھے۔ بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دے رہی تھیں۔ اس ہجوم میں خود کو موجود پا کر ایک لمحے کے لیے گوتم کو بڑا اچنبھا سا ہوا۔ میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔ تیز تیز قدم اٹھاتا وہ شہر سے باہر نکل گیا۔ جدھر آم کے کنج میں ایک خاموش عمارت پتوں میں چھپی کھڑی تھی۔ اس عمارت کے سامنے جھیل تھی۔ جھیل میں ایک اکیلی ناؤ۔ جس کا ملاح مسافروں کے انتظار میں بیٹھا بیٹھا سو چکا تھا۔

اس عمارت میں سَو برس ادھر شاکیہ منی آ کر رہے تھے۔ اس کنج میں ان کے چیلے گھوما کرتے تھے۔ صرف سَو سال اِدھر۔

گوتم کا جی چاہا وہ عمارت کے اندر جائے اور اس کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھ کر سوچتا رہے۔

مگر قریب جانے کے بجائے وہ پھر آدھے راستے سے لوٹ آیا اور آہستہ آہستہ آشرم کی طرف روانہ ہو گیا۔

آزادی نہیں ہے۔ آزادی نہیں ہے۔ کھلی فضاؤں میں، سُر ساگر کی لہروں میں۔ ذہن کی وسعت میں، آزادی کہیں نہیں ہے۔ میں بندھا ہوا ہوں میں کچھ نہیں کر سکتا۔ کچھ نہیں کر سکوں گا۔

یہاں تک کہ ایک روز تاریخ۔ ناموں کا تسلسل۔ زمان و مکان مجھے نگل جائیں گے۔

آشرم میں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ گرو کے جھونپڑے میں چراغ جل رہا تھا۔ وہ دبے پاؤں اندر داخل ہوا جہاں ہری شنکر اور دوسرے طالب علم جمع ہو چکے تھے۔

۶

گرو نے وینا ایک طرف رکھ دی اور سر اٹھا کر گوتم کو دیکھا۔ "یہ ہے — یہ ہے" — انھوں نے کہا۔ "یہ نہیں ہے — یہ نہیں ہے —؟"

"ہاں" گوتم نے جواب دیا
"قید کی حالت میں انند مایا سب سے بڑی مسرت ہے جو جیو حاصل کرسکتا ہے"
گرو نے کہا۔
"آنند مایا سب سے بڑی مسرت ہے۔" گوتم نے دہرایا
"مقید رُوح کے لیے پرکھوں کی راہ موجود ہے۔ وہ جسے بار بار جنم لینا ہے۔"
"میرے پرکھ ۔" بھاٹ کی آواز گوتم کے کانوں میں گونجی۔
"اور روح دھوئیں اور رات اور اماوس کی اندھیری تاریخوں میں سے گزرتی ہے۔
وقت اپنے آپ سے منحرف نہیں ہوتا۔ وقت سے تم نہیں بچ سکتے اور اپنی اصلی حالت
کو پاکر کوئی چیز اپنے آپ سے انحراف نہیں کرتی۔"
گرو نے مزید کہا "وقت کے سامنے کوئی رشتے نہیں ہیں۔ کوئی منطق۔ کوئی طاقت
وقت پر تمھارا قابو نہیں رہ سکتا۔ جو آنکھیں رکھتا ہے وہ وقت کے ارتقاء کو پہچان لیتا
ہے۔"
"لیکن آنکھیں کہاں ہیں۔؟" گوتم نے سوال کیا "پراکرتی اندھی ہے اور پرش
لنگڑا ایسا ہی جو اندھی پراکرتی کے کندھے پر سوار ہے۔"
"پراکرتی اندھی ہے اور بے حس۔" گرو نے جواب دیا "پرش اسے دیکھتا ہے
کو شعور کا خارجی اور مادی دنیا میں اور داخلی اور ذہنی دنیا میں اکٹھا ارتقاء ہوتا ہے اور
ادراک اور خیال کی تخلیق۔ پراکرتی ابدی ہے۔ ہمہ وقت مصروفِ عمل جب تک پرش
کی نظروں میں رہے۔ ارتقاء کی منزلیں طے کرتی ہے۔ بے حس مادہ ذہن کی جوت سے
روشن ہوجاتا ہے۔ ذہن میں بڑی طاقت ہے ۔"
"ذہن میں بڑا خطرہ ہے ۔" اگلیش نے کہا "ویدانت میں لکھا ہے گیان
نیکی اور بدی سے زیادہ اہم ہے ۔ کیونکہ خیر و شر مایا میں شامل ہیں اور گیان مایا سے نجات
دلاتا ہے۔ میں گیان سے عاجز آچکا ہوں۔"
گرو نے کہا "ادراک انانیت کے بغیر کام نہیں کرسکتا۔ لہٰذا دنیا کو خارجی اور

داخلی میں تقسیم کرنا ضروری ہے۔ یہ میں ہوں۔ یہ باقی دوسری چیزیں۔ برہما ایک ہے۔ جیو آتمائیں بہت سی ہیں۔ جو کچھ ہے۔ وہ اس کا نتیجہ ہے۔ ہم اپنے حسیات کی وجہ نہیں ہیں۔

پراکرتی رقاصہ ہے۔ پرش اسے دیکھ رہا ہے۔ جب وہ اس کی طرف سے آنکھیں ہٹا لیتا ہے تو وہ بھی اسے نہیں دیکھتی۔ کیونکہ دوسرے پرش اسے دیکھ رہے ہیں۔ بالآخر وہ ان پرشوں کو آزادی عطا کر دیتی ہے۔ پرش باہر اندھیری رات میں آکر آزاد ہو جاتا ہے۔"

"لیکن دُکھ کون سہتا ہے؟ — پرش یا اس کی پراکرتی —" گوتم نے سوال کیا۔

"دکھ کا تعلق پراکرتی سے ہے۔ مقید زندگی کا احساس بذاتِ خود تکلیف ہے۔" گرو نے جواب دیا۔

"ویدانت والے کہتے ہیں کہ پرش ایک ہے۔ ایکم ست۔" اکلیش نے پوچھا

"ہاں اور کپل کا کہنا ہے کہ پرش ایک ہوتا — تو اگر ایک انسان خوش ہوتا تو سارے انسان خوش ہوتے۔ ایک رنجیدہ ہوتا تو سب کے سب رنجیدہ ہو جاتے لیکن انسان اپنے اعمال اپنی نسل۔ اور اپنی زندگی کے ادوار اور ورن اشرم کے لحاظ سے مختلف ہیں۔" گرو نے کہا۔

"بھگوت گیتا میں سری کرشن نے کہا ہے کہ پراکرتی کے گُن اعمال پر ہر طرح سے اثر انداز ہوتے ہیں لیکن خودی یہ سمجھتی ہے کہ یہ میں ہوں —" اکلیش نے کہا۔

"اور شاکیہ منی نے پوچھا ہے کہ کوئی محدود خودی ہے بھی یا نہیں۔ ممکن ہے یہ سب احساس کی مختلف کیفیتیں ہوں۔" گوتم نے دل میں سوچا۔

"پراکرتی کے گُن تین ہیں۔ نیکی، شدت اور تاریکی —" گرو نے کہا

گوتم آہستہ سے اُٹھا اور جھونپڑے سے باہر نکل آیا اور دوبارہ ندی کی سمت چل دیا۔ کچھ دیر قبل جس طرح بھاٹ کی بات دار آواز نے اس کا تعاقب کیا تھا۔ اب گرو اور اکلیش کی مدھم آوازیں اس کا پیچھا کرتی رہیں۔ ست کاریہ واد۔ اودیا۔ مایا۔ شکتی۔ پراکرتی۔ پراکرتی کے گن۔

ندی کے کنارے پہنچ کر اُس نے خود کو ٹھنڈی گھاس پر گرا دیا۔

اپنشد میں لکھا تھا کہ جس کو اپنی آتما کی تمنا ہے اس کے لیے باپ باپ نہیں۔ ماں ماں نہیں۔ دُنیا دُنیا نہیں۔ دیوتا دیوتا نہیں۔ چور چور نہیں۔ قاتل قاتل نہیں اس کو نیکی و بدی کی فکر نہیں کیونکہ وہ دل کے سارے رنجوں پر فتح پا چکتا ہے۔

گوتم نیلمبر اب چوبیس سال کا ہو چکا تھا۔ اتنی مدت میں پہلے وہ سوفسطائی بنا پھر اُس نے رِشُو کی پوجا کی۔ ہری کا بھگورت بنا۔ کپل کے نظریوں پر اُس نے بسیط شرحیں لکھیں۔ اُس نے اپنے ہمنام فلسفی گوتم کا مطالعہ کیا جس نے براہمنوں کے مذہب کے قوانین بنائے تھے اور وقت کے مسئلے پر سوچ بچار کیا تھا۔ ہری شنکر سے ملنے کے بعد اسے گوتم سدھارتھ سے دلچسپی پیدا ہو چلی تھی لیکن اب تک وہ اس دیس کی ازلی اور ابدی سوچنے اور کھوجنے والی روح تھی جو کبھی اور کسی جگہ مطمئن نہ ہوتی تھی جو برابر اس سوال کے جواب کی تلاش میں مصروف تھی کہ ہم کس طرح جانیں۔

وہ مدتوں سے اس کھوج میں تھا۔

ہم کس طرح جانیں۔ یہ سب کیا ہے —

وہ سہما ہوا گھاس پر لیٹا رہا۔ پچھلے پہر کی مدھم چاندنی سائیں سائیں کر رہی تھی۔ لیٹے لیٹے آہستہ آہستہ اس کا ذہن صفر کے نقطے تک پہنچ گیا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو ان گنت حصوں میں تقسیم کر دیا۔ بہت سے گوتم جو بول رہے تھے۔ گا رہے تھے۔ لکھ رہے تھے۔ قہقہہ لگا کر ہنس رہے تھے۔ اداس تھے۔ اچنبھے میں تھے۔ اسے اور زیادہ ڈر لگا۔ گرو کی آنکھوں میں اسے وہ خود نظر آیا۔ جو چراغ کی روشنی میں اسے گھور رہی تھیں اور بالوں کی سفید جٹائیں اس کے کندھوں پر بکھری تھیں۔ اکلیش کا مسکراتا چہرہ۔ بازار کے لوگوں کی شکلیں۔ نوکیلی مونچھوں والے ناگرک۔ پرسکون چہروں والے بھکشو۔ چندھی آنکھوں والے پہاڑی۔ ان سب میں اسے اپنا آپ نظر آیا اور اسے اور زیادہ ڈر لگا۔ وہ آج کل اس قدر

خوفزدہ تھا کہ اس کا دل چاہتا تھا کہ کسی ویران مندر کے تاریک گربھ گرہ میں چھپ جائے اور اندر سے کنڈی چڑھالے۔ گربھ گرہ کے خیال پر اسے چنڈی کی بھیانک مورتی یاد آئی جس نے اسے سرجو کے کنارے ڈرایا تھا۔

یہ ساری دُنیا ل کر چاروں طرف سے اس پر حملہ آور کیوں ہو رہی تھی۔ سب اس کے خلاف ایک لشکر تیار کر رہے تھے اس لشکر میں وہ گھاٹ والی لڑکی شامل تھی۔ ہری شنکر شامل تھا گوور پرشوتم اور سارے پرانے اور نئے حکمار شامل تھے۔ خدا کا تصوّر شامل تھا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور کوشش کر کے اپنے ذہن کو ماسوا سے عاری کرنا چاہا۔ اُس نے سوچا۔ کاش وہ کم از کم یوگا ہی کا ماہر ہوتا۔ کاش ایک لطیف سا خلاء اس کے دماغ میں کہیں سے اُگر ہر جاتا آخر اس کا کیا قصور ہے۔ اُس نے تو ہمیشہ جاننے کی کوشش کی ہے۔

اسے وقت سے ڈرنا نہیں چاہیے۔

وقت کے راستے سے ہٹ کر وہ ایک طرف سڑک کے بیٹھ گیا۔ تھکے ہوئے آرام کے احساس کے ساتھ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے سوچا جیسے وہ زمان و مکان سے آزاد بہار کے بادلوں کی طرح اُوپر اُٹھتا جا رہا ہے۔ چاروں اور خلاء ہے اور اس میں ہمیشہ کی طرح صرف وہ تنہا موجود ہے۔ دنیا کا ازلی اور ابدی انسان تھکا ہوا۔ شکست خوردہ۔ بشاش۔ پر اُمید۔ رنجیدہ۔ انسان جو خدا میں ہے اور خدا سے الگ ہے کائنات کا اوّلیں ذی ہوش جسے یہ ساری چاندنی۔ سارے پھول۔ ساری ندیاں۔ سارا حسن دے دیا گیا ہے۔ اولین روشنی کا زمانہ اور برہما کا محل سنسان پڑا ہے۔ اس میں محض نور ہے۔ نور کی دُنیا سے ایک ہستی آن گری ہے۔ جو پُرش ہے اور اکیلا ہے۔

(اس اولین انسان نے آنکھیں کھول کر چاروں اور نظر ڈالی اور اس نے دیکھا کہ دور دور تک بستیاں جگمگا اُٹھی ہیں اور کھیتوں میں سرسوں لہلہاتی ہے اور اودھ کا تری برہمن ست تانتو ساز کے تار چھیڑ کر سام وید کے گیت گا رہے ہیں اور اندو رم جھم

برس رہی ہے۔ باغوں کا نوجوان خدا اندر لڑکیوں کی چنریاں اپنی پھوار سے بھگوئے ڈالتا ہے۔ سنہرے بالوں والے نوجوان آریہ سورما میدان میں رتھ دوڑا رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں تیر کمان ہیں۔ یہ جنگ اور شاعری کے دیوتاؤں کے پرستار نوجوانوں کا عہد ہے۔ شجاعت کا دور۔ طاقتور کمزور کو زیر کرتا ہے۔ یہ بے خوف نڈر انسان عناصر سے۔ ظلم سے۔ موت سے لڑتے ہیں۔ سوما پی کو رقص کرتے ہیں۔ ان کا فلسفہ تیاگ کا فلسفہ نہیں ہے۔ یہ زندگی پر جی جان سے عاشق ہیں۔ انھوں نے پھولوں کے نگر آباد کیے ہیں۔ مٹی کے فصیلوں والے پور بنائے ہیں۔ لکڑی کے مکانوں میں اگنی شالائیں روشن ہیں۔ سو سو دیواروں والے پتھر کے قلعے تعمیر کیے جا رہے ہیں۔ جمنا کی وادی میں گائیں چر رہی ہیں۔ رنگین پگڑیاں باندھے۔ بالوں کی چار چار چوٹیاں گوندھے۔ مرگ نینی لڑکیاں پشپ کرما کے لیے پھول چن رہی ہیں۔ ہمالیہ کی وادی میں عظیم شوالک دریا بہہ رہا ہے۔ سبزہ زاروں میں دویکا اور الکھ نندا اور بھاگرتی ندیاں گنگناتی ہیں۔ سرجو اور ورناوتی کوشل دیس کو سیراب کر رہی ہیں۔ اُتر کے گیہوں کے کھیتوں کی گنبھ اور روتستا اور ویاس آبیاری کرتے ہیں۔ جنوب میں یمنا ندی بہتی ہے۔

یہ سریلی ندیوں کا بہت اتم سنگیت ہے۔

دریا کی لہریں چاندنی میں رواں ہیں۔ گوتم نے آنکھیں بند کر لیں اور اس نے تصور کیا۔

وہ اس سے دو ہزار سال قبل کی دنیا میں پہنچا ہوا ہے۔ وہ اس خنک۔ آرام دہ پیاری زمین پر بیٹھا ہے۔ یہ زمین اس کی زمین ہے۔ اسے اس زمین سے عشق ہے صدیوں سے وہ اس زمین کو سینچ رہا ہے۔ اس نے اس میں خوبصورت درخت لگائے ہیں۔ دلفریب شہر بسائے ہیں۔ اس زمین پر اس نے محبت کی ہے۔

وہ سنہرے بالوں والا بلند و بالا آریہ جو اپنے سنہرے رتھ پر دھرتی کو روندتا مغرب سے مشرق کی طرف آیا تھا۔ اندر کی کمان اس کی معیت میں۔ پاربتی اس کے

ساتھ ساتھ ناچتی آ رہی ہیں۔ برہما کی بی بی سرسوتی نے اپنی بطخ پر سے جھک کر اس کے کان میں کہا ہے۔ علم تیرا ہے۔ گنیش نے سونڈ اٹھا کر قلم اس کے ہاتھ میں دے دیا ہے۔
تخیل میں کتنی طاقت ہے جس نے عناصر اور چرندوں پرندوں کو شخصیتیں عطا کی ہیں۔ پرتھوی اور ورونا۔ اندھیرا آسمان اور اگنی اور اندر۔ عناصر کی یہ تمثیلیں فلسفے کی اولیں مجسم شکلیں ہیں۔ ان کے ذریعے تسبیب کے قانون کو مزین کیا جا رہا ہے۔ یہ دنیا کے اولیں فلسفی ہیں۔ فلسطین کی پہاڑیاں خاموش پڑی ہیں۔ اسرائیل کے نغمہ نواز ابھی پیدا نہیں ہوئے مگر ان شاعروں کی آواز برہم ورت پر جھکے ستاروں سے جا کر ٹکرا رہی ہے۔ یہ صبح کے ستاروں کے راگ ہیں اور خدا کے بیٹوں کی للکار۔ انھوں نے فطرت کے اس عظیم الشان ناٹک کو اتنے بہت سے حصوں میں منقسم کر دیا ہے۔ ان کو کھوج لگی ہے۔ یہ سب کیوں ہے؟ اس کا مصنف کون ہے۔ اداکار کون۔ تماشائی کون۔ مترا روزِ روشن کو سامنے لاتا ہے۔ ہم سب کا دوست ورونا اندھیرے آسمان کا مالک ہے۔ سُوریہ روشنی کا خزانہ ہے۔ اوشا صبح کی کنواری۔ وایو ہوائیں چلاتا ہے۔ ماروت طوفان کے فرشتے ہیں۔ پُشن دیوتا سڑکوں اور گلوں کا نگہبان ہے۔ رُدر آسمانوں کا چنگھاڑتا ہوا بیل ہے۔ عالمِ بالا کا سُرخ سُورج —

او ورونا۔ ایک صاف گہری آواز فضا میں گونجی۔ گوتم نے گھاس پر لیٹے لیٹے پہچانا۔ یہ اس کی اپنی آواز تھی جو دو ہزار سال قبل بلند ہوئی۔ وہ اُونی شال لپیٹے۔ کانوں میں کرن شوبھا اور گلے میں سنہرے رُکما پہنے ایک اُونچی چٹان پر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کمنڈل تھا۔ اُس نے پکار کر کہا، کیونکہ اندھیرے آسمان کے نیچے وہ اس سمے تنہا کھڑا تھا۔
او ورونا۔ ہم نے اپنے رفیق، اپنے بھائی۔ اپنے دوست۔ اپنے ہمسائے یا کسی اجنبی کا دل دکھایا ہے۔

تُو ہماری اس خطا کو درگزر کر۔
اپنی کمزوریوں کی وجہ سے تیرے قوانین کی جو خلاف ورزی کی ہو —
او ورونا اس کی سزا نہ دے۔

اور اسی تاریکی میں کوئی دوسرا شاعر آہستہ آہستہ کہتا تھا،
"میں جو بیوقوف ہوں اور جاہل —
میں نے چاہا کہ دیوتاؤں کے چھپے ہوئے گھر کا پتہ چلاؤں۔
میں نے مُنیوں سے پُوچھا۔
وہ جس نے چھ آسمانوں کو سہارا دیا۔
کہیں یہ وہی خدائے واحد تو نہیں؟
پہلوٹھی کے لڑکے کو کس نے دیکھا ہے؟
وہ جس کے جسم میں ہڈیاں نہیں اس نے ہڈیوں والی مخلوق کو جنم دیا۔
وہ کون جنگل تھا۔ کون درخت۔ جس کی لکڑی سے یہ کائنات گھڑی گئی —؟
وہ کون تھا جو جاننے والے کے پاس یہ پوچھنے گیا —؟
یم — دنیا کا پہلا انسان جس نے مر کر موت کا پتہ چلایا — اسے بھی جواب معلوم نہیں"
پھر اس شاعر نے سوچ کر دوسرے شاعر کو جواب دیا
"وہ طاقتور زین دنیا کا باپ ہے
وہ مبارک ہے یعنی شیو ہے۔
اس کے قہر سے گائیں اور انسان مر جاتے ہیں۔"
پھر اس نے پُوچھا
"موت مجھے ختم کر دے گی۔ موت کو کون ختم کرے گا —؟ وہ کون چیز ہے جو انسان سے اس کی موت کے گھنٹے میں جدا نہیں ہوتی؟
مرنے کے بعد انسان کا کیا ہوتا ہے؟ راجہ پریکشت کی نسل کہاں گئی؟ وہ کون ہے جو ہر شے پر قادر ہے لیکن ہر شے سے علیحدہ ہے؟"

موت سے سہم کر شاعر نے زمین سے استدعا کی۔

وسیع مہربان دھرتی ۔ ماں ۔ اسے اپنی گود میں جگہ دے۔
نوجوان لڑکی جو اُون کی طرح ملائم ہے۔
تجھے تباہی سے بچائے رکھے گی۔
دھرتی ۔ اپنے آپ کو دھیرے دھیرے جھکولے دے۔
اسے اپنے بوجھ سے نہ دبا۔
اسے آرام کرنے دے۔
اسے اس طرح چھپا لے جس طرح ماں اپنے بچے کو آنچل اڑھا لیتی ہے؛
شمشانوں میں روشنی ہو رہی ہے۔
اگنی اس کو جلانا نہیں۔ اس کی کھال اس کے جسم کو بھون کے نہ رکھ دینا۔
اسے کھا لینے کے بعد اسے اس کے پرکھوں کے پاس بھیج دینا۔
جب یہ اپنے پرکھوں کے پاس پہنچ جائے گا۔ تب خداؤں کی مرضی پوری ہوگی۔
اور ایسا ہو کہ اس کی آنکھیں سورج کے پاس جائیں۔ اس کی سانس ہوا میں تحلیل ہو یا آسمان پر جائے یا زمین پر رہے جیسا اس کا مقدر ہو۔
اور اس کے ہاتھ پاؤں پودوں کی شکل میں پھر سے نمودار ہوں"

(انسان بہت کمزور نکلا۔ جو اپنی ساری دھوم دھام۔ ساری شان و شوکت سارے ارادوں کے باوجود ختم ہو جاتا ہے۔ شاندار شہر نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ دریا غائب ہو جاتے ہیں۔ پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑتے ہیں۔ باغوں میں بسنت منانے والوں کا نشان تک نہیں ملتا)

ہر شے فانی ہے۔ صرف ستوپ باقی بچتے ہیں۔
مسرت بیکار ہے۔ دل کی لگن بیکار ہے۔ اب میں کسے پکاروں ؟ — کس کی مناجات کروں — ؟

اندر کی مناجات کرو — رگ وید کے شاعروں نے کہا۔
اندر کی مناجات کرو۔ آواز بازگشت لکڑی کے مکانوں اور پتھر کے قلعوں میں

گونجی۔

اندر کی مناجات کرو۔ انھوں نے دہرایا۔ اگر وہ واقعی موجود ہے۔
اندر کا کوئی وجود نہیں۔ دوسرے شاعر نے سوال کیا
اسے دیکھا کس نے ہے ۔؟ میں کس کو پوجوں ؟ اور اندر نے گرج کر گھنگھور
گھٹاؤں میں برس کر جواب دیا۔
میں ادھر ہوں۔ او مغنی — مجھے دیکھ۔
میں ساری مخلوقات سے عظیم ہوں ۔
نظام کائنات نے مجھے عظیم تو بنایا ہے۔
پھر انھوں نے کہا۔ "او پہاڑوں پر رہنے والے رودر —
اپنے تیز — قہرناک تیروں سے
کسی انسان۔ کسی حیوان کو نقصان نہ پہنچا۔
کیونکہ موت خوفناک ہے ۔"

(لیکن موسیقی موت کو ختم کرے گی۔ موسیقی کی وسعت اس کی گہرائی میں موت کہیں تنکے کی طرح ڈوب کر رہ جاتی ہے۔ موت دراصل بہت حقیر ہے۔ موسیقی خدا ہے۔
رگ وید کے شاعر چٹان پر بیٹھے رہے نیچے وقت کا تاریک دریا بہہ رہا تھا۔ اس دریا کی سطح پر روشنی کے چھوٹے چھوٹے بھنور پیدا ہو گئے۔
اس اولین موسیقار کے ہاتھ میں وینا تھی۔ انھوں نے سات سُروں کی سرگم تخلیق کر لی تھی۔ سرگم کا ایک ایک سُر وینا کے تاروں پر علیحدہ علیحدہ گونج رہا تھا)
اب سارے تار اکٹھے ہو کر ایک آواز پیدا کر رہے ہیں۔
ویشودیو۔ سارے خدا ایک ہیں۔ اگنی۔ اوشا۔ ورونا۔ سوما۔ گندھرو، ساری طاقتیں ایک وشو بھونانی ہیں۔
تدائکم — خدا ایک ہے۔ مضراب کی ایک جھنکار سے فضا مرتعش ہو گئی۔

مگر میں کس کی عبادت کروں۔
کس کی بارگاہ میں قربانی چڑھاؤں —
اور شاعر نے خود ہی جواب دیا
"وشوکرما۔ وشودیو مہان اسی۔
تو سب کا خالق ہے۔ خدائے بزرگ و برتر۔ پرجاپتی
کون کھمبا تھا۔ کون سہارا
کس طرح ایسا ہوا کہ وشواکرمن نے اپنی طاقت سے زمین بنائی اور آسمان تانا۔
وہی ایک خدا ہے جس کی چاروں طرف آنکھیں ہیں۔
اور مُنہ — اور بازو — اور پاؤں۔
جو اپنے دو بازوؤں اور پروں کی دھونکنی سے دُنیا کو گھڑتا ہے۔
سب سے پہلے تو ر پیدا ہوا۔ وہ سارے وجود کا خدا تھا۔
اس نے آسمان اور زمین بنائے۔
میں کس خدا کی بارگاہ میں قربانی چڑھاؤں؟
وہ جو زندگی اور طاقت بخشتا ہے۔
ابدیت اور فنا جس کی پرچھائیاں ہیں۔
میں کس خدا کی بارگاہ میں قربانی چڑھاؤں؟
وہ جو اس سانس لیتی اور سوتی ہوئی کائنات کا مالک ہے۔
وہ جس نے فضا میں روشنی کی پیمائش کی۔
جس نے جگمگاتے عظیم پانیوں کو تخلیق کیا۔
وہ جو ایکا دیوا ہے ماد پران اور سکمبا[۱]۔
قصہ مختصر یہ کہ وہ برہما ہے۔

---

[۱] کھمبا۔ سہارا

خدائے واحد۔ جو نہ مرد ہے۔ نہ عورت۔ اس کی کوئی جنس نہیں۔ کوئی ثانی نہیں
نہ کسی نے اس کو پیدا کیا ہے۔ نہ یہ کسی کو پیدا کرتا ہے۔ ایکا دیوا۔
برہما۔ جو بڑھتا ہے۔ جو باہر لاتا ہے اور پھیلاتا ہے جو دنیا کی تخلیق کا مادّی
سبب ہے لیکن خود غیر مادّی ہے اور دُنیا جو اس نے تخلیق کی بذاتِ خود غیر حقیقی ہے۔
محض اوم اصل حقیقت ہے۔ خلا، روشنی اور آواز۔
لفظ۔ جو اس زبان سے ادا ہوتا ہے۔ برہسپتی جو پھیلتا ہے۔ برہسپتی کی حیثیت
سے برہما خدائے نطق ہے۔
لفظ جو شروع میں تھا اور خُدا تھا۔ (مدتوں بعد فلسطین کے حکما، یہ جملہ دہرا کر ایک
ایک نئے خیال کا پرچار کریں گے۔ یونان میں لوگوس کے مسئلے کی ترویج ہوگی۔ عہد نامہ
قدیم میں صوفیہ علم کی صورت میں ظاہر ہوگی۔)
ویدوں کی تقدیس مضبوط تر ہوتی جا رہی ہے۔
کیونکہ وید زبان کی شکل میں برہما ہے۔
اب لفظ اور خیالات کے باہم رشتے پر غور کیا جا رہا ہے۔ زبان نے ایک حمد
میں کہا۔

میں رُدرا اور وسوؤں اور وشودیو کے ساتھ گھومتی ہوں۔
میں مترا، ورونا اور اگنی کی مددگار ہوں۔
میں ملکہ ہوں دولت جمع کرتی ہوں۔ میں جاننے والی ہوں۔
ان سب میں افضل جن کی عبادت کرنا چاہیے۔
بغیر جانے انسان مجھ ہی پہ بھروسہ کرتا ہے۔
میں جسے پسند کروں اسے برہما۔ رشی اور اگنی بنا دیتی ہوں۔
میں رُدرا کی کمان موڑتی ہوں تاکہ وہ جو برہما سے متنفر ہے اسے ختم کیا جا سکے۔
میں جنگیں کرواتی ہوں۔ میں ہوا کی مانند چاروں کھونٹ پھیلتی ہوں۔
شبد برہما۔

برہما جو بذاتِ خود ذہن ہے اور کنول کے ریشے سے زیادہ لطیف بادل کی چھایا سے زیادہ ہلکا۔ جو اس کائنات کا حامل ہے جو اپنے کو تقسیم کرتا ہے تاکہ دوسرے پیدا ہوں۔ وہ دوسرا میں خود ہوں۔ آتما۔ جو زبان اور ذہن اور سانس کا دوسرا نام ہے۔ جو خود اپنی گواہ آپ ہے اور جو روحِ کائنات۔ پرماتما۔ بھی ہے۔

اب برہما اور آتما کا مجرد تصور۔ وحدت وجود کے نظریے کے لیے راہیں تیار کر رہا ہے۔

پرجاپتی کے تخیل نے واحدانیت کا بیج بویا ہے۔

"شروع میں پانی تھا جس پر پرجاپتی ہوا کی طرح منڈلایا اور کائنات کی تخلیق کی۔" (فلسطین کا فلسفی کئی صدیوں بعد کہنے والا تھا — شروع میں پانی تھا جس پہ خدا کی روح دھوئیں کی طرح منڈلاتی تھی —)۔

ان شاعروں کے تخیل نے ساری کائنات کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ ان کے لاشعور کی وسعت میں قطب شمالی کی طویل راتیں۔ مدھم سرخ سورج اور وسیع سبزہ زار تھے کھلی فضائیں موسم کی تبدیلیاں۔ پھولوں کے رنگ۔ بسنت رت کی زردی۔ سرسوں اور کپاس اور ٹیسو اور ہرسنگھار۔ اور ساون بھادوں کی جھڑیاں اور مور کی "مینھ آؤ" "مینھ آؤ" کی صدائیں اور جب درخت جامن، فالسوں اور کگرونددوں سے لد جاتے ہیں اور خزاں، جب دھان کی فصل کٹتی ہے اور سردیاں، جب چوپالوں میں الاؤ جلتے ہیں اور کھلیانوں کے اوپر ہیمنت کا چاند دھند میں تیرتا ہے۔ یہ موسموں کی لاگ مالا انھوں نے اس وینا کے تاروں میں قید کر لی ہے۔ برہما اور شکتی کا تصور سنگیت میں ڈھل چکا ہے۔ برہما آگ ہے۔ سرسوتی راگنی۔ پانچ سُر مہا دیو نے تخلیق کیے ہیں۔ کھرج اور پنچم پاربتی نے بنائے ہیں۔ فضائے بسیط تونبورو۔ نارد منی اور چترا سین کی موسیقی سے گونج اٹھی ہے۔ یہ عناصر کی موسیقی ہے جسے متشکل کر لیا گیا ہے۔

نٹ راج کا ڈمرو آکاش تت سمار کا مظہر ندا جس میں ساری آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ رعد آندھیوں کا خدا اپنی پر شکوہ وینا چھیڑ رہا ہے۔

جمنا کے کنارے مہا وشنو بانسری پر نغمۂ حیات بجا رہے ہیں۔ گوپیاں آفاقی طاقتیں، اس کی دھن پر رقصاں ہیں۔

کائنات اَن گنت سازوں کی جھنکار سے گونج رہی ہے۔ راگ تخلیق ہو رہے ہیں جن کے پردے سے آواز کی دُنیا جھلملا اٹھی ہے۔ فضائے بسیط میں بھیرو۔ مالکونس۔ ہنڈول۔ میگھ۔ دیپک۔ سری کے دیو گرج رہے ہیں۔ اساوری اور رام کلی کی نازک پریاں ہوا میں پر پھیلاتی ہیں۔ جنگل کے پرندے اور جانور بھی شاعر اور موسیقار کے ساتھی اور دوست ہیں۔ ان کی آواز۔ ان کے رنگ اور ان کی چال کو رقص و نغمہ کے تخیل میں محیط کر لیا گیا ہے۔ مور کھرج میں جھنکارتا ہے۔ پپیہا رکھب میں اپنی رٹ لگاتا ہے۔ بکری گندھار میں ممیاتی ہے۔ کلنگ مدھم میں پکارتا ہے۔ کوئل کی کوک میں پنچم کا سُر ہے۔ دھیوت گھوڑے کا ہنہنانا ہے۔ نکھاد ہاتھی کی چنگھاڑ ہے۔

تان پورے پر سُر چھیڑا گیا۔ تان پورے کی آواز جو گیت سے پہلے شروع ہوتی ہے۔ گیت کے دوران میں موجود رہتی ہے اور گیت ختم ہونے کے بعد تک گونجتی رہتی ہے سُر جو ذاتِ مطلق ہے۔ جو ہمیشہ سے تھا۔ ہے۔ اور رہے گا۔

سنگیت کار کے فن میں فلسفے۔ رنگ و نور۔ خیال اور جذبات کا دھارا اکٹھا بہہ رہا ہے۔

اس شاعری اور موسیقی کے پس منظر میں بہت عظیم رنگوں اور آوازوں کی دُنیا پھیلی ہوئی ہے آسمان سے الوہی پانی برستا ہے۔ اور الوہی شفاف ندیوں میں بدل جاتا ہے۔ آسمان کی روشنی کا سمندر اوشا کے اجالے کے ساتھ ساتھ صبح کے رنگوں میں گھل مل جاتا ہے اور اس مقدس کہرے پر سنہری دیبی سرسوتی تیرتی ہے۔ [illegible] جو تخلیق کرنے والی۔ ماں کا تصور ہے۔ جو مہاگنی ہے علم ہے۔ جو زندگی کا مقصد ہے۔ علم سے آزادی ملتی ہے علم سارے وجود کی بنیاد ہے۔ گیان میں نجات ہے۔ سوچتے سوچتے گوتم وقت کے اس نقطے پر واپس لوٹ آیا جہاں وہ اس سمے موجود تھا) قید اس لیے ہوتی ہے۔ اس نے گھاس پر سے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا کہ خود ہی اپنے آپ کو اپنے ذہن سے مماثل کر لیتی

ہے۔ اور لہٰذا دکھ اور گناہ اور ذہنی اور اخلاقی کمزوریوں کا شکار ہو جاتی ہے اور پراکرتی کا تجربہ کسی کو تو کرنا ہے۔

یہ تجربہ خالص روح کرتی ہے۔

یہ تجربہ میں بھی کر رہا ہوں۔ اس نے سوچا

یہ تجربہ کرتے کرتے میں کدھر نکل جاؤں گا۔

لیکن کوئی پرواہ نہیں۔

سوال حقیقت پسندی یا تصوریت کا نہیں۔ صحیح عمل اصل چیز ہے۔

وہ گھاس کی پتیوں کو توڑ توڑ کر اکٹھا کرتا رہا اور پھر زمین پر پتھر کے سہارے نیم دراز ہو گیا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ دور درختوں کے جھرمٹ میں کسی یوگی کی جھونپڑی کے سامنے آگ جل رہی تھی۔ اس نیم تاریکی میں اس کی روشنی آنکھوں کو بہت اچھی معلوم ہوئی۔

پتہ نہیں بیچارہ اس وحشت اور ویرانے میں وہاں بیٹھا کیا سوچتا ہوگا۔ گوتم کو ایک لمحے کے لیے بڑا اچنبھا ہوا۔

وہ ان شعلوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ وقت سنسناتا ہوا اس کے چاروں اور ڈول رہا تھا۔ ذہن کی جوت کے آگے اب قربانیوں کی آگ مدھم پڑ چکی تھی۔ انسانی دماغ دیومالا کی تخلیق مدتیں ہوئی کر کے ختم کر چکا تھا۔ خیال کے صنم خانے آباد ہو کر نئے پرانے بھی ہو گئے دماغ اب دقیق مسئلوں کا حل تلاش کرنے میں مصروف تھا۔ مذہب اب محض کمتر درجے کا علم سمجھا جاتا تھا۔ اصل چیز فلسفہ تھا اور مابعد الطبیعات۔ سارے ملک میں خیالات کی فرمانروائی تھی اور آزادیِ افکار اور مذہبی رواداری ایک ہی کنبے کے افراد برہما کے مختلف مظاہر کی پرستش کرتے اور متضاد نظریوں پر یقین رکھتے۔ مادہ پرست۔ ثنویت کے قائل — ملحد۔ بے خوفی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے کیونکہ سچائی کی تلاش ان سب کا مشترکہ مقصد تھا۔ ہر فلسفی اپنی اپنی جگہ سے جو اس نے اپنے لیے منتخب کی تھی۔ ذرہ برابر سرکنے کو تیار نہ تھا مگر ان سب نے علم معقولات کو سب سے زیادہ فوقیت دی تھی — حسی ادراک۔ استنباط اور لفظ کی شہادت اور سند پر اس جستجو کی بنیاد تھی۔

ملحد حکیم کپل کئی سو سال قبل گزرا تھا۔ چونکہ ادراک، استنباط اور لفظ کی شہادت میں سے کوئی چیز بھی خدا کے وجود کا ثبوت بہم نہ پہنچا سکتی تھی۔ لہٰذا کپل نے بڑی دلیری سے ایشور کی بجائے ان ایشور پر زیادہ توجّہ دی تھی۔ منطقی کی حیثیت سے وہ خدا سے منکر ہونے کے بجائے محض اسی پر مطمئن رہا کہ شہادت کے عام ذرائع سے خدا کے وجود کو ثابت نہیں کر سکتا۔ گو اس قدر روادار تھا کہ عوام کے دیوتاؤں شیو اور وشنو تک گوارا کر لیتا تھا کہ ممکن ہے وہ موجود ہی ہوں۔ لیکن اس کے نزدیک یہ محض تخلیق شدہ دنیوی خدا تھے۔ اس کے خیال میں ایشور تک کا وجود مظاہری تھا۔ ساتھ ہی وہ کہتا تھا کہ کوئی چیز زمان و مکان میں مقیّد ایسی نہیں جو بالآخر حقیقت اور ابدیت پر مبنی نہ ہو۔

کپل ناستک یا معدومیت پرست نہ تھا۔ سیدھا سادہ ملحد تھا۔ برہما کے بجائے اس نے پراکرتی کو وجہ کائنات ثابت کیا تھا۔ پراکرتی یا فطرت۔ جو کارن کاریہ نظریے کی بنیاد تھی۔ پراکرتی اولیں کارن ہے۔ ذہن خودی۔ حواس خمسہ اور عناصر اربعہ اس کی ترکیب اور سارا ارتقا اس میں مشتمل ہے اور پُرش جو خالص رُوح ہے جو نہ کسی کا کارن ہے اور نہ کاریہ۔ اور پراکرتی سے الگ کھڑا ہے۔ پُرش ابدی شخصی شاہد ہے۔ اور اس کے اور پراکرتی کے ملاپ سے دُنیا ظہور میں آتی ہے۔ ان دونوں کے علاوہ تیسری طاقت کوئی نہیں ہے اور ان دونوں کی علیحدگی سے قطعی کامل مسرت اور مطلقیت پیدا ہوتی ہے کپل کا کہنا تھا کہ ارتقا محض اتفاقاً نہیں ہُوا۔ موجودہ کائنات کے پس منظر میں کوئی اور حقیقت بھی ہوگی۔ کاریہ کارن میں پہلے سے موجود رہتا ہے۔

ویدانت والے موحد خدا پرست جو ایک برہما کو قادرِ مطلق جانتے تھے کاریہ کارن بھید کے مسئلے پر کپل سے متفق نہیں تھے۔ ان کے نزدیک کاریہ اور کارن ایک ہی تھے۔ کیونکہ ہر شے برہما تھی۔ تت توم اسی — تو — وہ — ہے — جیو آتما — بندہ — دراصل — وہ — ہے — تو ہی خدا ہے۔

لیکن ہر شے برہما ہے تو یہ دُوئی کاہے کے لیے — ؟ کپل کے ملحد ساتھیوں نے پوچھا۔

یہ دوئی دراصل مایا کا فریب ہے۔ مایا پراکرتی کا — انھوں نے جواب دیا۔ مادہ پرست کپل کی "فطرت" کو ویدانت والوں نے برہما کا سایہ قرار دیا۔ انھوں نے ادراک پر الہام کو ترجیح دی۔ ادراک اور استنباط محض عالم موجودات ہی کے لیے سند سمجھے جا سکتے تھے اگر برہما ایک ہے تو دنیا میں کثرت کیوں ہے۔ تجربے متنوع کیوں ہوتے ہیں لیکن برہما کی ذات کا ایک پہلو — نام روپ بھی ہے۔ اس کی مایا۔ شکتی اور پراکرتی دنیا کی تخلیق کرتی ہے۔ لیکن اصل ذات خداوندی نام روپ۔ اور مایا سے بلند تر اور بے نیاز ہے۔ گیانی جن کے لیے ساری دنیا سراب کے مانند ہے۔ اصل برہما غیر مشروط اور قطعی ہے ہماری اودیا کی وجہ سے وہ ہمارے ذہن میں آکر مشروط۔ عملی۔ خالق اور شخصی بن جاتا ہے۔ دُنیا کی تخلیق بھی اودیا اور ازلی اودیا کی وجہ سے ہمارے ادراک سے باہر ہے۔ یا شکتی کے ذریعے ہوتی اور اس کی وجہ سے برہما کا درجہ کم ہو گیا بڑھا نہیں۔ برہما صفات سے متاثر نہیں۔ جس طرح ہماری اپنی مشروطیت ہماری اصل روح کو متاثر نہیں کرتی۔ جس طرح صفات خود برہما ہمیں تخلیق کرتا ہے۔ اسی طرح ہماری مشروط آتما اس برہما کو تخلیق کرتی ہے۔ مایا کی دوسرا اتھ میں نرگن برہما ساگن بن جاتا ہے۔

نا — نا — برہما کے لیے ہم محض یہی کہہ سکتے ہیں۔ وہ یہ نہیں ہے — وہ یہ بھی نہیں ہے۔ ویدانت میں لکھا تھا — وہ ست بھی ہے اور است بھی۔ وجود بھی ہے اور عدم وجود بھی عظیم ترین وجود۔ اور عدم وجود یوں کہ جن چیزوں کو دُنیا وجود سمجھتی ہے وہ اس سے مختلف ہے۔ برہما غیر شخصی ہے اس کی خارجی صفات نہیں۔ اگر وہ جانتا ہے تو محض خود کو جان سکتا ہے۔ جس طرح سورج اپنے آپ کو روشن کرتا ہے۔ ہمارا برہما کے متعلق علم محض برہما کا احساس ہو سکتا ہے جو خود ہمارا اپنا احساس ہے۔ بھکتی سے ایشور۔ مظہری خدا آپ سے آپ ظاہر ہو سکتا ہے۔

یہ حکما بجائے خود بدعتی تھے۔ کیونکہ فلسفی تھے۔ ویدانت والوں نے اسی آزادی کو استعمال کرتے ہوئے خود ویدوں کو منتخب کیا اور الہام سمجھ کر ان کے آگے جھکے۔ گو سند کو بڑی آسانی سے منظور یا نامنظور کیا جا سکتا تھا۔ خود کپل کا ایسا منطقی بھی ویدوں

کو کہیں کہیں سے اس شرط کے ساتھ مان لیتا تھا کہ وید بھی غلط کو صحیح ثابت نہیں کر سکتے۔

ابدیت پرست کہتے تھے کہ روح اور دُنیا دونوں ابدی ہیں۔ بعض زندگیوں کا تسلسل قائم ہے اور ابدالآباد تک رہے گا۔ چند کے نزدیک آتما اور دُنیا ایک حد تک ابدی تھیں اور ایک حد تک نہیں۔ انتا نتکوں کے نزدیک دُنیا یا محدود تھی یا غیر محدود۔ اس کے ساتھ ہی دنیا محدود تھی نہ غیر محدود۔ سیادواد یوں کا خیال تھا کہ ہر چیز ہے بھی اور نہیں بھی وہ خود کسی بارے میں قطعی رائے نہیں دیتے تھے۔ دوسری دُنیا ہے یا نہیں۔ حادثہ ہے یا نہیں ۔ جزا و سزا ہے یا نہیں۔ حیات بعد الممات ہے یا نہیں۔
کچھ لوگ سمجھتے تھے کہ دُنیا اور آتما محض حادثے کے طور پر ظہور میں آئے۔ کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ انھیں خود یاد تھا کہ کچھ عرصے قبل وہ نہیں تھے۔ اور اب ہیں۔
صدیاں گزرتی گئیں۔ ذہن اپنشدوں کی شدید مابعد الطبیعات سے اکتا گیا۔ رفتہ رفتہ خُدا جو فلسفے کا ایک مسئلہ تھا شخصی بنا۔
تاکہ بالآخر دل کو ذہن پر فتح حاصل ہو۔ "وہ ایک ہے۔ ایک اپنشد میں لکھا گیا۔ جو انسانوں کے دل میں رہتا ہے اور اسے پہچان کر ساری اَودیا کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔
مابعد الطبیعات کے کارن نے اوتار کا روپ دھارا۔ اضافی کا مطلق سے تعلق خرد کے بجائے وجدان ٹھہرا۔ بے جنس برہما مرد بنا۔
وشنو۔ جو پتے کے گہنے میں نہاں ہے۔

نارائن ۔ جو خود مجھ میں ہے۔
ورندابن سے بانسری کی تان بلند ہوئی۔ اور گنگا اور جمنا کے کناروں پر چھا گئی
امنگ رنگ ساگرم ۔

مدھوسودن ۔ جو محبت کا اتھاہ سمندر ہے۔ گردھر گوپالا۔ کرشنا ۔ کرشنا۔ کرشنا۔
گوتم نے گھاس پر سے سر اٹھایا اور ندی پر برستے سناٹے کو دھیان سے

سننے لگا۔

اور کرشنا نے کہا "او ارجن میں بے پایاں وقت ہوں۔ میں تباہ کن موت ہوں میں رازوں کا سنّاٹا ہوں۔ میں ابتدائے عالم ہوں اور میں ہی اس کی انتہا۔ او کنتی کے بیٹے میں پانی کا سواد ہوں۔ سورج اور چاند کی روشنی۔ میں سارے ویدوں میں لکھا ہوا اوم ہوں میں آکاش کی آواز ہوں۔ میں انسانیت کا اجتماعی شعور ہوں۔ او کنتی کے بیٹے۔ میں عورت کی ذہانت اور وفاداری اور رحم دلی ہوں۔ میں گائتری منتر ہوں۔ میں اچھوں کی اچھائی ہوں او ارجن میرے الوہی مظاہر بیکراں ہیں۔ میں عالم الغیب ہوں لیکن مجھے کوئی نہیں جانتا۔"

اور کرشنا نے کہا "مجھے چاہو۔ مجھ سے محبت کرو۔ میں تمہارا سکھا ہوں۔ تمہارا ساتھی۔ تمہارا محبوب۔ میں محبت کا سمندر ہوں۔ اننگ رنگ ساگرم ——"

کائنات اس کی بانسری کی آواز سے مسحور ہو گئی۔ پھر ویشالی کے مہاویر نے کہا "خداوند عالم کا کوئی وجود نہیں۔ دنیا ابدی ہے اور اپنے وجود میں قائم۔ اور مادے اور خلا اور دھرم اور ادھرم اور روحوں کی ترکیب سے بنی ہے۔ صرف یہی ایک حقیقت ہے۔"

اور شاکیہ منی نے کہا۔ "خدا ہو یا نہ ہو۔ حقیقت محض یہ ہے کہ دکھ موجود ہیں۔ باسٹھ فلسفے اور دیا کے باسٹھ گن ہیں۔ محبت بیکار ہے۔ فلسفہ بیکار ہے۔ سب مہاموہ ہے۔ سب مایا ہے۔ سب دھوکہ ہے۔ شروع میں نہ وجود تھا اور نہ عدم وجود۔ ہر شے خلا، غیر حقیقی ہے۔ پھر یہاں خواہشوں کا گزر کہاں؟ کون تمنا کرے گا اور کس چیز کی؟ کسی چیز کا کسی چیز کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ ہر شے اپنا لمحاتی وجود خود ہے اور شاکیہ منی نے کہا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم ہیں۔ حالانکہ ہم اضافیت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

ہر شے تکلیف ہے۔ سروم دکھم دکھم۔ ہر شے فانی ہے۔ جسم اور روح دونوں کی کوئی اصلیت نہیں۔ روح لازوال نہیں۔ محض اس کو تشکیل دینے والے عناصر باقی رہتے ہیں۔ روح کا آواگون نہیں محض کرم کا آواگون ہے۔ انسان اس طرح دفعتاً بجھ جاتا ہے۔ جیسے چراغ کو پھونک مار کر گل کر دیا جائے۔ صرف واقعات اور احساسات کا دورِ تسلسل قائم ہے اور رہے گا۔"

پانی کی نقرئی لہریں کنارے تک آ آ کر لوٹتی رہیں۔ گوتم نے آگ پر سے نظریں ہٹا لیں اور ندی کو دیکھا جو بڑے سکون سے رواں تھی۔

میں دکھ سہنا چاہتا ہوں۔ میں کمزور رہنا چاہتا ہوں۔ میں اپنی حماقتوں کا نظارہ خود کروں گا۔ میں تکلیفیں اٹھاؤں گا۔

دل و دماغ کے رنج اور آزمائشیں۔ میں مکتی نہیں چاہتا۔ میں مکتی بالکل نہیں چاہتا۔

رحم بہت بڑی چیز ہے شاکیہ منی لیکن ممکن ہے مجھے خود تم پر ہی ترس آتا ہو۔ سوال یہ بھی ہے مقدس شہزادے کہ کون کس پر ترس کھائے گا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ افق پر صبح کا اُجالا ابھرنے لگا تھا لیکن دھندلکے کی وجہ سے ندی کا دوسرا کنارہ ابھی صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ایک طویل انگڑائی لی اور پانی میں کود گیا۔

رات وہ کچھ سویا تھا۔ کچھ جاگا تھا۔ رات اس نے بڑی بے چینی سے گزاری تھی پانی سے باہر نکل کر آشرم کی طرف جانے کے بجائے اس نے گھنے جنگل کا رُخ کیا اور ساحل کی ریت پر ایک سمت کو روانہ ہو گیا۔

۷

ترائی کا راستہ جو شراوستی سے اتر کی طرف جاتا تھا۔ اس میں دونوں طرف بیہڑ تھے اور اونچے سرکنڈے اور ڈھاک کے جنگل۔ اور رنگ برنگے پھولوں والی جھاڑیوں میں لمبی دموں اور جھلملاتے پروں والے پرندے سیٹیاں بجاتے تھے۔ اور ادھر ادھر چکر کاٹ کر پھر گھنے پتوں میں چھپ جاتے تھے۔ دریا اس پھولوں کے جنگل میں سے لہراتا ہوا گزرتا تھا۔ اس کے مشرقی کنارے پر گھاٹ تھا۔ جہاں شاہی بجرا رات کو کنارے پہ آن کر لگا تھا

راجہ جنم اور ان کا دربار صبح سویرے کھیدا کے لیے اتر کی طرف کوچ کرنے والے تھے مگر راستہ تلاش کرنے والوں نے اطلاع دی تھی کہ ہاتھیوں کے علاقے میں بالکل غیر متوقع

بارش شروع ہو گئی ہے۔ بجرے سے اتر کر شاہی قافلہ ہاتھیوں، پالکیوں، رتھوں اور بہلیوں پر سوار ہو رہا تھا۔ جب یہ خبر ملی تو قافلے نے اپنا رُخ پھر گھاٹ کی طرف موڑ دیا اور گروپردشوتم کے آشرم سے چند میل کے فاصلے پر مہوا کے جھنڈ میں خیمے لگ گئے۔

آناً فاناً جنگل میں منگل ہو گیا۔ باغ جہاں صرف ہرنوں کی ڈاروں اور مرغابیوں اور موروں کی عملداری تھی اور جہاں کبھی کبھار اکا دکا طالب علم مراقبے میں غرق کسی پگڈنڈی پر سے گزرتا نظر آجاتا تھا۔ وہاں پل کی پل میں میلہ سا لگ گیا۔ شراوستی کے سنار اور بزاز اپنی اپنی دوکانیں شہزادیوں کی خدمت میں حاضر کرنے کے لیے اٹھا لائے۔ پھول والوں نے تازہ کلیوں کے گجروں کے انبار لگا دیے۔ بھاٹوں نے اپنا ڈیرا جمایا۔ اور لہک لہک کر قصیدے گانے لگے۔ بنجاروں کی ٹولیاں، طوطے، مینائیں، پالتو بندر اور موتی مونگے خچروں اور بیلوں پہ لاد کر اس امید میں آکر دور کھڑی ہو گئیں۔ کہ شاید کوئی راجکماری کوئی طوطا خرید لے۔ کئی مصور اور سنگتراش اپنا اپنا سامان لے کر فروخت کرنے کی نیت سے آن موجود ہوئے۔ نٹ اور بازیگر اپنے کرتب دکھلانے لگے۔ رات کو مشعلوں اور الاؤ کی روشنی سے جنگل کی چڑیاں جگ اٹھتیں اور خوب شور مچاتیں۔

شاہی قافلے کی لڑکیاں دن بھر باغوں میں گھومتیں۔ اندھیرا پڑے ندی میں جاکر تیرتیں۔ کبھی دن میں تیر کمان لے کر ہرنوں کا شکار کرتیں۔ ورنہ پھر خیموں کے باہر یا درختوں کے نیچے بیٹھ کر گپیں ہانکتیں۔

دو تین دن کے اندر ہی چمپک کا اس بے مصرف زندگی سے جی اکتا گیا وہ بنجاروں سے ان کے سارے مونگے موتی، بزازوں سے ان کے چینی ریشم اور پشمینے، سناروں سے ان کے گہنے اور مصوروں سے ان کی تصویریں خرید چکی تھی۔ کسی سائل کو لوٹانا اس کے بس کا کام نہ تھا۔ دوکانداروں سے اس نے بیکار کی چیزیں بھی خرید لی تھیں کہ کہیں ان کا دل ٹوٹ نہ جائے۔ وہ لوگوں سے اُن کی بیوقوفی کی باتیں سنتی رہتی تھی اور کبھی ان سے یہ نہ کہہ سکتی تھی کہ آپ لوگ سب کے سب عموماً کس قدر گدھے ہیں۔ لوگ

اس سے اپنی اپنی کتھائیں سناتے تھے۔ ہر انسان اس سے ہمدردی کا خواہاں تھا۔ کیونکہ سارے میں مشہور تھا کہ وہ بڑی گُنی ہے۔ بڑی نیک دل ہے۔ بڑی فیاض ہے یہ ہے۔ وہ ہے۔ دُنیا بھر کی باتیں اس کے لیے مشہور تھیں اور اسے ہنسی آتی تھی۔

تین دن جنگل میں رہ کر اس کا جی اس مسلسل سیر و شکار سے گھبرا گیا۔ اس نے نرملا کو ساتھ لیا اور چپکے سے آبادی کی طرف چل کھڑی ہوئی۔

سامنے آم کا گھنا جھرمٹ تھا۔ یہاں بڑا سکون تھا۔ اور خنکی۔ آسمان پر جھٹ پٹے کے قرمزی رنگ بکھر گئے تھے اور باغ میں رہٹ چل رہا تھا۔

"آؤ ادھر چلیں جدھر سے گانے کی آواز آ رہی ہے۔" نرملا نے کان لگا کر کچھ سنتے ہوئے تجویز کیا۔

"چلو یوں سب راستے ایک جیسے ہیں۔" چمپک نے کہا۔

وہ پتوں کو روندتی آم کے جھرمٹ کی اور بڑھتی رہیں۔ درختوں کی شاخوں میں سے دُور کسی آشرم کے جھونپڑے نظر آ رہے تھے۔

"یہ کون جگہ ہے۔" چمپک نے کدم کی ایک شاخ پہ ہاتھ رکھ کر ٹھٹکتے ہوئے کہا۔

"یہ سامنے کون لڑکے ہیں۔" نرملا نے بے ساختہ سوال کیا۔

ہر جگہ ہر برہمچاری لباس والے کو دیکھ کر اسے اپنا بھائی یاد آجاتا تھا۔

۸

گوتم نیلمبر تین دن اور تین راتیں مستقل بھوکا پیاسا ندی کے کنارے ادھر ادھر گھومتا رہا۔ رات کے وقت وہ گھنٹوں ٹھنڈے پانی میں ایک ٹانگ پر کھڑا رہا۔ پھر ریت پہ ببول کے کانٹے بچھا کر ان پر سویا۔

ایک دن اس نے سارا چیونٹیوں کو آٹا کھلانے میں صرف کیا جو وہ ملاحوں سے

مانگ لایا تھا۔ پھر دل اس نے آنکھ بند کر کے منتر پڑھے۔
لیکن چوتھے روز وہ اس قدر جھنجھلایا کہ اُس نے پھر واپسی کی ٹھان لی۔
شام پڑے وہ ڈھیلے ڈھالے قدم رکھتا آشرم کو جانے والی سڑک پر چل رہا تھا کہ اسے کسی نے پیچھے سے آواز دی۔
اس نے مڑ کر دیکھا۔ اکلیش ہنستا ہوا اس کی سمت آ رہا تھا۔
"بھائی گوتم — تم تین دن سے کہاں غائب تھے۔ سارے میں تمہاری ڈھنڈیا مچی ہے۔"
"میں تو یہیں تھا۔ تم یہاں اس وقت کیا کر رہے ہو۔؟" گوتم نے سکون سے پوچھا۔
"وہی جو تم کر رہے ہو۔" اکلیش نے خوشدلی سے جواب دیا۔
"میں تو بھگوان کی لیلا دیکھ رہا ہوں۔"
"میرا بھی ان دنوں یہی مشغلہ ہے۔"
"آشرم میں سب خیریت ہے۔" گوتم نے یونہی بات جاری رکھنے کے لیے پوچھا۔ اس وقت اسے احساس ہوا کہ ہری شنکر ٹھیک کہتا تھا۔ الفاظ بیکار ہیں۔
"ہاں۔ تم اس طرح خیریت پوچھتے ہو جیسے برسوں کے بعد لوٹے ہو — وہاں تو یہ خبر اُڑ گئی ہے کہ تم تپوّن کے لیے اندھیرے جنگلوں میں چلے گئے اب کبھی نہ لوٹو گے۔"
"مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے ۔" گوتم نے دفعتاً کہا۔ "چلو سامنے پڑاؤ ہے۔ وہاں سے چل کر کھانا لے لیں۔"
"میں دیکھتا ہوں کہ تم کسی اور چکر میں ادھر آئے تھے۔"
"کیسا چکر — ؟" گوتم نے سادگی سے پوچھا۔ وہ بھوک کی وجہ سے نڈھال ہوا جا رہا تھا۔

"گرو یہ معلوم کرکے بہت خوش ہوں گے کہ چیلا اتنا سعادت مند نکلا۔" اکلیش نے پھر خوشدلی سے کہا۔

"گرو کو خوش تو ہونا چاہیے۔ تین دن تین رات میں نے بھگوان کی لیلا کا نظارہ کیا ہے۔" گوتم نے معصومیت سے جواب دیا۔

"بھگوان کی لیلا کی ایک جھلک تو میں نے بھی کل دیکھی۔ تیر کمان لیے ایک ہرن کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ مجھے آتا دیکھ کر فوراً درخت پر چڑھ گئی۔"

گوتم کی سمجھ میں نہ آیا کہ اکلیش کیا کہہ رہا ہے۔ وہ اداسی سے اکلیش کی بشاش شکل دیکھتا رہا۔

املتاس کے پتے ہوا میں اڑتے ہوئے آئے اور پگڈنڈی پر آن کر ان کے چاروں اور گر گئے۔

ہر طرف خوبصورت درختوں پر زرد اور سرخ پتوں نے آگ ایسی لگا رکھی تھی۔ سارا باغ شام کی مختلف روشنیوں سے جھلملا رہا تھا۔

بن دیوی — بن دیوی۔ دور جھرمٹ میں کوئی بھجن گاتا ہوا جا رہا تھا۔ بن دیوی۔

تم دور سے جھلک دکھا کر غائب ہو جاتی ہو۔

کبھی ہمارے گاؤں میں آؤ۔

کیا تمھیں آدمیوں سے ڈر لگتا ہے۔؟

گوتم اور اکلیش ہوا کی مدھم خوشبو حلق میں اتارتے گھاس پر چلتے رہے۔

— جب گپھاؤں کے ڈکرانے کا جھینگر جواب دیتا ہے اور گھنٹیاں بجتی ہیں اس سمے بن دیوی ——

ہرے کنجوں میں رقصاں ہوتی ہے ——

طالب علم بھجن گاتا ہوا جھرمٹ میں غائب ہو گیا۔

بن دیوی —— گوتم نے اس کا ساتھ دینا شروع کیا۔ پھر اس کی خوبصورت آواز شام کی نیم تاریکی میں بلند ہوتی گئی۔

بن دیوی — کبھی اس کی جھلک دکھلائی پڑ جاتی ہے۔
جیسے بہت دور گائیں چر رہی ہوں
یا درختوں میں کوئی گھر چھپا کھڑا ہو۔
رات کو بن دیوی کی آواز ایسی آتی ہے
جیسے کہیں دور بیل گاڑیاں گزر رہی ہوں
جیسے کوئی اپنی گئیوں کو پکارے
جیسے درخت گرے
یا بہت دور کوئی چپکے چپکے روتا ہو۔
بن دیوی — جو جنگلی پھل پھول کھا کر جیتی ہے جو جہاں جی چاہے ٹھہر کر آرام کرتی ہے۔
جو مہکتی ہے — جو سارے جنگل کی ماں ہے۔
گوتم اور اکلیش گاتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ کچھ فاصلے پر بانسری بجاتے ہوئے لڑکوں کی ایک ٹولی آبادی کی اور جا رہی تھی۔ آج زراعت کی دیوی سیتا اور کھیتوں کے خدا کھشیتر پتی کی عبادت کا تہوار تھا۔ گاؤں میں بڑی چہل پہل تھی۔
بالآخر گوتم تھک کر ایک درخت کے نیچے ٹھٹک گیا۔
"ایک طرف دیویاں ہیں دوسری طرف اپسرائیں اور درختوں کی پریاں دونوں وقت ملتے ان شاخوں کے سائے میں کھڑے نہ ہونا۔" اکلیش نے اسی طرح مصنوعی سنجیدگی سے کہا۔
"کیونکہ درختوں کی پریاں انسانوں کو دور خلا کے لے جاتی ہیں۔ دیکھنا کسی اور پاٹلی پتر کی بنیا وہیں نہ پڑ جائے —!"
"ارے — یہ سامنے کون کھڑا ہے۔" گوتم نے یکلخت ہڑبڑا کر پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔
"کون —؟" اکلیش نے کہا "مہا بھارت کے کوی نے پوچھا ہے — تو کون ہے

جو کدم کے درخت کی ٹہنی جھکائے ہے۔ دیوتا ہے؟ یا یکشی یا اپسرا—؟ درختوں کے اسرار بہت گہرے ہیں بھائی گوتم—"

"کیسے درخت—؟"

"گوتم—تم بھولتے ہو کہ ہمیں لڑکیوں پر نظر ڈالنے کا حکم دیا۔" ہری شنکر نے دفعتاً سنجیدہ ہو کر جواب دیا اور آنکھیں بند کر کے ایک شاخ کی اوٹ میں چلا گیا۔

گوتم نے چونک کر دوبارہ سامنے دیکھا۔

کدم کے نیچے اجودھیا کے گھاٹ والی لڑکی کھڑی تھی۔

۹

چمپک نے گوتم کو نہیں دیکھا۔ وہ نرملا سے باتیں کرتی دوسری پگڈنڈی پر مڑ گئی۔ ہری شنکر ایک پتھر پر بیٹھ کر دھیان میں مصروف ہو چکا تھا۔ "آؤ آشرم چلیں۔" اس نے ایک آنکھ کھول کر گوتم کو مخاطب کیا۔

انھوں نے پھر راستہ طے کرنا شروع کر دیا۔

گاؤں کے قریب پہنچ کر گوتم رک گیا "آشرم میں کچھ کھانے کو ملے گا۔"

"میں دیکھتا ہوں کہ تم بے حد مادہ پرست ہوتے جا رہے ہو۔"

"میں پوچھتا ہوں۔ تمھاری کٹی میں چاول ہوں گے؟"

"نہیں۔ آج صبح سے سب لڑکے سیتا کی پوجا میں لگے ہیں ایک روز اور بھوکے رہ لو۔"

"میں دکھشنا لے کر ابھی آتا ہوں۔"

"اچھا۔" ہری شنکر چپ ہو گیا "مگر جلدی آنا بھائی گوتم۔"

"بھائی ہری شنکر ابھی آیا۔"

ہری شنکر سے پیچھا چھڑا کر وہ تیزی سے اس سمت روانہ ہو گیا۔ جدھر لڑکیاں گئی تھیں۔ راہیں کانٹوں پر دوڑنے سے اس کے پاؤں بھی زخمی ہو گئے۔

چمپک پڑاؤ کے نزدیک پہنچی تو اُسے محسوس ہُوا کہ پتّوں پر چلتا کوئی اس کے پیچھے پیچھے آرہا ہے۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔

اس کے سامنے وہ سرجو کو تیر کر پار کرنے والا لڑکا کھڑا تھا۔ جس کی کالی آنکھیں تھیں اور کھلی رنگت اور جس نے برہمن طالب علموں کا سفید لباس پہن رکھا تھا۔

مجھے معلوم ہُوا تھا کہ اجودھیا والے ادھر آئے ہوئے ہیں۔ میں نے سوچا آج کی بھیک یہیں سے لے لوں وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"تم کہاں پڑھتے ہو۔" چمپک نے رسان سے پوچھا

"ادھر۔ کل پتی گرو پرشوتم کے آشرم میں۔"

"جنگل میں بن دیوی کا بھجن تم ہی گا رہے تھے۔"

"کہہ نہیں سکتا کہ میں کون ہوں اور جو بھجن گا رہا تھا وہ کون ہے۔"

"اچھا۔ یہ بات ہے۔؟ آؤ کسی روز مجھ سے بحث کرو۔" چمپک نے تبسم کے ساتھ کہا۔

"اس جگ میں مائیتری اور گارگی کی جانشین بننے کا تمہارا ہی ارادہ ہے۔" وہ فوراً بحث پر تیار ہو گیا۔

"ارادہ ایک نہایت فضول لفظ ہے۔ شاید تمھیں معلوم نہیں کہ عام طور پر الفاظ کے معنی نہیں ہوتے۔ تمھارے مضامین کیا ہیں؟"

"فلسفہ۔ اخلاقیات۔ اور۔" پھر گوتم دفعتاً جھنجھلا کر چپ ہو گیا۔ یہ لڑکی اسے بیوقوف بنا رہی تھی۔

"تم تصویریں بناتے ہو۔؟"

"ہاں۔"

"میں نے سُنا ہے کہ گرو پرشوتم کے آشرم کا گوتم نیلمبر تصویریں اچھی بناتا ہے تمھاری شکل دیکھ کر لگتا ہے کہ تمھارا ہی نام گوتم نیلمبر ہو سکتا ہے۔ میں ناموں کے اسرار کی بہت قائل ہوں۔ تم ناموں کے اسرار کے قائل نہیں ہو۔؟"

"میں وہی ہوں جس کا تم نے شاید چند احمقوں سے ذکر سنا ہو۔ اور تم نے ٹھیک سُنا ہے۔"

"تو غالباً تم بھی میری تصویر بناؤ گے۔ آج صبح یہاں بہت سے چترکار آئے تھے"

"میں پرتیماکاریک ہوں۔ صرف تخیل کی بنا پر دل کی آواز سن کر تصویریں بناتا ہوں۔" اس نے ذرا فخر سے کہا۔ "میری قدر وشنواکرمن تک کو کرنا پڑے گی جو سب سے بڑا چترکار ہے۔"

"وشنواکرمن — ! تو تم ملحد نہیں ہو — ؟ آج کل تو طالب علم کپل اور شاکیہ منی کے زیادہ قائل ہیں۔"

"مجھے آٹا لا کر دو۔ میرا راستہ کھوٹا ہوتا ہے۔" گوتم نے ذرا بگڑ کر کہا۔ اس لڑکی کو دوبارہ دیکھنے کے لیے وہ مدتوں گھوما گھوما پھرا تھا اور اب وہ اس کے سامنے موجود تھی تو وہ اس سے کھڑا جھگڑ رہا تھا۔ کیونکہ اسے یکلخت احساس ہوا کہ وہ اس کی اپنی چیز تھی۔ اس کے اپنے وجود کا اپنے ذہن اور دل کا ایک حصہ یہاں دوئی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہاں کسی تکلف، کسی غیریت، کسی حجاب کی گنجائش یا ضرورت نہ تھی۔ وہ اسے ازل سے جانتا تھا۔

اس نے دوسری لڑکی پر نظر ڈالی جو اسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ گوتم نے اسے پھر ذرا دھیان سے دیکھا۔ یہ لڑکی ہری شنکر کی بہن تھی۔

چمپک خیمے کے اندر جا کر آٹا نکال لائی اور گوتم کے کشکول میں ڈال دیا۔

"اب جاؤ۔ پھر کبھی آنا۔" چمپک نے رسان سے کہا۔

وہ اسے پرنام کر کے پڑاؤ کے باہر آگیا۔ اسے اب تک معلوم نہ تھا کہ یہ دونوں لڑکیاں کون ہیں۔ اور راجن کے لاؤ لشکر سے ان کا کیا تعلق ہے۔ خیموں کے آس پاس ان ہی کی طرح کی اور بہت سی لڑکیاں ادھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ مگر یہ دونوں اُس

ا؎ الوہی مصور

ہجوم میں سب سے علیحدہ اور ممتاز نظر آتی تھیں۔

"یہ دونوں کون ہیں۔" اس نے بڑی ہمت کر کے ایک بڑھیا سے پوچھا۔ جو تیز تیز قدم رکھتی رسوئی کے خیمے کی طرف جا رہی تھی۔

بڑھیا نے اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے اسے گھورا۔ "تم تو برہمچاری نظر آتے ہو" ۔اس نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ "پھر تم کو یہ جان کر کوئی دلچسپی نہ ہونا چاہیے کہ ان میں سے ایک راج گرو کی بیٹی چمپاوت ہے اور دوسری راجکماری نرمل ہے اور یہ دونوں راجن کے ساتھ کھیدا کے لیے جا رہی ہیں اور تم آئندہ ادھر نہ آنا۔ آج کل بہت سے چور اچکے سنیاسیوں کا بھیس بدل کر ٹھگی کرتے پھرتے ہیں۔"

"کٹنی کہیں کی۔ چڑیل۔" گوتم نے چپکے سے کہا اور آشرم کی طرف روانہ ہو گیا۔

دوسرے دن وہ چادر لپیٹ کر پھر پڑاؤ کی سمت چل کھڑا ہوا۔ سارے میں گھوما مگر وہ اسے نظر نہ آئی۔ (راج گھرانے کی لڑکیاں یوں بھی مجمع عام میں سامنے نہ آتی تھیں) ممکن ہے وہ اندر کسی زربفت کے شامیانے کے نیچے بیٹھی طوطے کو پڑھا رہی ہو۔ یہ سوچ کر وہ مسکرایا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ طوطے کو پڑھانا امیرزادیوں کا خاص مشغلہ ہے۔ ممکن ہے وہ پالکی میں بیٹھ کر سیر کرنے کے لیے شہر چلی گئی ہو۔ وہ شراوستی کی طرف مڑ گیا۔ جہاں سڑکوں، بازاروں اور چوراہوں میں بہت سے چہرے نظر آئے جو ایک جیسے تھے۔ وہ پھر باغ کی سمت لوٹ آیا۔ شاہی خیمے میں کاتک پورنیما کے تہوار کی تیاری کی جا رہی تھی۔ ان گنت لڑکیاں پھول سنبھالے، ساز اٹھائے ادھر اُدھر آ جا رہی تھیں۔ رنگ برنگی ساریاں پہنے ہری شاخوں کے نیچے رقص میں مصروف تھیں۔ ان میں چمپک کون سی ہے۔ اس نے ہڑبڑا کر سوچا۔ کیونکہ اب اسے ہلکا سا شبہ ہوا کہ عورتیں سب ایک سی ہوتی ہیں۔ ان میں سے چمپک کون ہے۔ اس نے ذرا اچنبھے سے دل میں کہا۔

"میں یہ ہوں۔" کدم کے درخت کے پیچھے سے کود کر وہ نیچے اُتر آئی۔

وہ اور زیادہ پریشان ہو گیا۔

"تم بھی اداس ہو۔ ؟ میں اس اداسی سے اب عاجز آتی جا رہی ہوں۔ کل سے نرملا بھی بہت رنجیدہ ہے۔ آؤ ہمارے ساتھ ناچو۔"

"میرا خیال تھا تم مجھ سے بحث کرنا چاہتی تھیں۔"

"فی الحال تو میرا جی ناچنے کو چاہ رہا ہے۔"

"نرمل کیوں رنجیدہ ہے۔"

"اس کا بھائی راج پاٹ چھوڑ کر غائب ہو گیا ہے۔ کل تمہیں دیکھ کر اسے اپنا دلارا بھائی یاد آ گیا۔"

"آنند نے بھی دُنیا تیاگ دی تھی۔ یہ راہیں بہت کٹھن ہوتی ہیں۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔"

"اس کے بھائی کا نام کیا ہے۔؟"

"مہاراجکمار ہری شنکر۔"

"اور اس نے دُنیا۔"

"دُنیا کے علاوہ اس نے اور بہت کچھ تیاگ دیا۔ گدھا کہیں کا۔۔" چمپک نے گوتم کی بات کاٹی۔

گوتم نے اسے دھیان سے دیکھا۔

"سُنا ہے آنند نے اپنی جیتی سندری کو چھوڑ دیا تھا اور وہ بھی سدھارتھ گوتم کے ذرا سے کہنے پر۔"

"تو پھر تمہارا مطلب۔ ؟"

"میرا مطلب یہ کہ دنیا میں لاکھوں سندریاں اور ہوں گی اور لاکھوں آنند اور ہری شنکر یہ چکر تو بہت وسیع ہے چمپک رانی۔"

"تیاگ کا فلسفہ اپنی جگہ پر خود ایک اور چکر نہیں ؟"

"اس سندری کو کیا اس بات کا بہت رنج ہے ؟" گوتم نے تجاہل عارفانہ سے

کام لیتے ہوئے پوچھا۔

وہ خاموش رہی

"اور اگر آنند واپس آجائے؟ — کیونکہ مجھے معلوم ہُوا ہے کہ وہ ابھی پورا ارہت نہیں بن سکا اس کی راہ کی مشکلیں ابھی باقی ہیں۔ وہ بار بار لوٹ آتا ہے۔ وہ ابھی پوری طرح آزاد نہیں ہُوا"

"یہ تو بڑی بُری خبر ہے"۔ چمپک نے کہا "کیونکہ آزادی بڑی بھاری چیز ہے۔ اس سے کہنا کیا وہ بھول گیا کہ شاکیہ منی نے مہامتی سے کیا کہا تھا؟"

"کیا کہا تھا —؟" گوتم نے ذرا چڑ کر پوچھا

"شاکیہ منی نے کہا تھا "اے مہامتی جس طرح ناٹک کے ناچ گانے، وینا بجانے، مصوری اور دوسری کلاؤں کی مہارت بتدریج حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح ارہت بھی ایک دن میں نہیں بن جاتا، ہمارے مہاراج کمار نے بھی تو تیاگ کو ایک قسم کی کلا سمجھ رکھا ہے۔"

وہ باتیں کرتے کرتے تالاب کی منڈیر پر بیٹھ گئے جو خیمہ گاہ کے عقب میں تھا۔ دور سے آشرم کے جھونپڑے نظر آ رہے تھے جن پر پھیلی ہوئی کدو اور لوکی کی ہری بیلیں آنکھوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ "لیکن تم کچھ کہنا چاہتے ہو۔ کیا بات ہے؟" چمپک نے سوال کیا۔

اظہار۔ اسے محسوس ہُوا وہ اظہار نہیں کر سکتا۔ سارے اظہار کا ایک مقصد ہے جو اظہار سے ماورا ہے۔ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ "چلو میں تمھیں اپنی تصویریں دکھاؤں۔" اس نے گڑبڑا کر کہا۔

"اس کا مجھے کیا فائدہ ہوگا۔" اس نے بشاشت سے پوچھا۔

"تم سمجھتی ہو میں بالکل نکما تخیل پرست مسخرہ ہوں جیسے سب طالب علم ہوتے ہیں۔ مگر چمپک رانی ایک روز تم سنو گی کہ شراوستی کا گوتم نیلمبر بہت بڑا چترآچاریہ بن چکا ہے۔" اس نے بچوں کی طرح غصے سے کہا اور پھر چمپک کو دیکھنے لگا کہ شاید وہ خفا ہو گئی اور اب اسے

لڑکی برتر کی جواب دے گی مگر وہ چپ رہی۔

وہ منڈیر پر خاموش بیٹھی رہی۔ کیونکہ اسی طرح آج سے چند سال پہلے ہری نے اس سے کہا تھا۔ تم مجھے نکما اور تخیل پرست مسخرہ سمجھتی ہو جیسے سب طالب علم ہوتے ہیں۔ لیکن ایک روز تم سنو گی چمپا رانی کہ ایودھیا کا مہاراج کمار بہت بڑا ریاضی دان بن چکا ہے۔

اظہار مقصد سے ماورا ہے۔ ویدانت میں آیا ہے کہ آتما کو اپنی خواہشوں کے زیر اثر کائنات سراب کی ایسی دکھلائی پڑتی ہے جس طرح پیاسے ہرن کو ریگستان میں ندیاں نظر آتی ہیں۔ اسی مرگ ترشنا نے مجھ کو۔ ہری کو بہت پریشان کیا تھا۔ مقصد کیا ہے — اصل مقصد کیا ہے۔ وہ منڈیر پر سے اٹھ کھڑی ہوئی "اگر تمہارا آنند تمھیں کہیں ملے تو اس سے کہہ دینا کہ سندری مرگ ترشنا سے بھی آزاد ہو چکی ہے۔ اسے فکر نہ کرنا چاہیے۔"

"تم — یہ خبر صحیح ہے کہ وہار میں جانے والی ہو —؟"

"شاید —! کیا حرج ہے۔ یہ تجربہ بھی کر دیکھنا چاہیے — سبھا رانی نے تو اپنی آنکھیں نکال دی تھیں کہ دنیا کی ترغیبات سے بچیں۔"

"چمپک تمھاری عمر کتنی ہے —؟"

"کئی سو سال — اتنے سو سال کہ مجھے یاد بھی نہیں رہا۔" اس نے ہنس کر کہا۔ "چند روز ہوئے میں نے بھاٹوں سے بھیشم اور ارجن کا قصہ سن کر یہ سوچا تھا کہ چترانگدا اور اتوپی کیسی رہی ہوں گی۔"

"مجھے دیکھ کر تھیں معلوم ہو گیا —!؟" وہ پھر ہنسی۔ اور اس نے کہا۔ —"تم تو پرتیما کا ایک ہو —!"

"ہاں۔ لیکن تم بھولتی ہو کہ ہر فن پارہ نام وت اور روپ وت کا امتزاج ہے ایک سے کان دوسرے سے آنکھ آشنا ہوتی ہے۔"

"لیکن جو شے خالص ماہیت ہے جس کا ادراک خالی عقل کے ذریعے کیا جاتا ہے

اسے محسوس نہیں کیا جا سکتا ورنہ تم خود اپنے نظریئے کی تردید کر رہے ہو۔"

"خالص ہیئت صرف ماہیت ہے۔ موزونیت نہیں۔" گوتم نے جواب دیا "کسی مادی علامت کے ذریعے اس کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے اسے مادی علامت سے مماثل نہیں سمجھا جا سکتا۔"

"آکاشے روپم لکھیا ۔۔۔!" چمپک نے ہنس کر کہا۔

"خالص ہیئت ۔!" گوتم نے جوش سے بولنا شروع کیا "وجود کی تشریح کرتی ہے۔ خود اس کا وجود نہیں۔"

"تم کیا بنانا چاہتے ہو؟"

"میں تم کو بتاؤں گا۔ ایک دن میں تم کو ضرور بتاؤں گا۔ میں کیا بنانا چاہتا ہوں تم میرے گرو سے نہیں ملو گی ۔۔۔؟"

"نہیں۔ میں نے ایودھیا میں اپنے استادوں سے اتنا پڑھا کہ وہ لوگ مجھے پڑھا پڑھا کر اکتا گئے۔ دیکھو نرملا کے کتنے مزے ہیں۔ دن بھر سنگھار پٹار میں مگن رہتی ہے۔ ناچ اور گانا سیکھ ہی چکی ہے۔ پڑھنے میں اس کا جی نہیں لگتا۔"

"نرملا تمھاری بہت دوست ہے ۔۔۔؟"

"وہ ہماری اور تمھاری جہار اجکماری ہے۔"

"پڑھنا تو اس کا بھی فرض ہے۔"

"اس کا فرض ہے کہ اب وہ گھر بسائے۔" چمپک نے بزرگوں کی طرح کہا۔

"تم بھی تو اپنا برہمچاریہ کا زمانہ ختم کر کے بیاہ ویاہ کر ڈالو گے ۔۔۔"

پیچھے سے چھاگل کی آواز آئی۔ نرملا بہت سارے سفید پھول ٹوکری میں اٹھائے مالینی بنی پگڈنڈی پر سے آ رہی تھی۔ گوتم کو دیکھ کر اس نے ٹوکری منڈیر پر رکھی اور ہاتھ جوڑ دیے۔ گوتم نے بڑے پہنچے ہوئے اور مقدس برہمن کی طرح اسے اشیرباد دی اور اُلٹے پاؤں لوٹ گیا۔

"علاوہ تصویریں اور مجسمے بنانے کے تم ناٹک بھی اچھا کھیل سکتے ہو۔" چمپک

نے بشاشت سے کہا اور گوتم کو درختوں میں اوجھل ہوتا دیکھتی رہی ۔

۱۰

مبارک ہیں وہ جن کو شانتی میسر آچکی ہے — چمپک نے دل میں دہرایا اور اسے گوتم سدھارتھ کا وہ وعظ یاد آگیا جو انھوں نے گیا میں دیا تھا — ساری چیزوں میں، اسے پروہت، آگ لگی ہے ۔ آنکھیں آگ میں جلتی ہیں اور اشکال، اور بصارت، حسیات وفورِ شوق، آوازیں، خوشبوئیں، ذہن و دماغ، خیال، جسم، تصوّرات سب دھڑا دھڑ اس آگ میں جل رہے ہیں، اور نفرت اور محبت اور پیدائش اور بڑھاپے اور موت اور رنج و الم اور دُکھ اور گریہ وزاری اور مایوسی نے اسے پروہت یہ الاؤ تیار کیا ہے —

آشرم کا طالب علم لڑکا واپس جا چکا تھا۔ جنگل پر وائی ہوا میں سنسنا رہا تھا۔ درختوں کے نیچے سے چند بھکشونیاں کشکول سنبھالے اپنی جھونپڑیوں کی طرف جا رہی تھیں۔ ان کے چہروں پر کس قدر سکون تھا۔ کیونکہ وہ ندی میں داخل ہو چکی تھیں۔ اس راستے پر چل رہی تھیں جہاں سے کبھی واپسی نہیں ہوتی۔ کیا میں بھی ندی میں داخل ہو سکوں گی ۔ چمپک نے اداسی سے سوچا۔ مبارک ہیں وہ۔ اس نے دل میں دہرایا۔ اس نے پلٹ کر خیمہ گاہ پر نظر ڈالی جہاں جشن کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ پھر وہ چپکے سے منڈیر سے اتر کر اس پگڈنڈی پر آگئی جدھر سے گوتم اپنے آشرم کی اور لوٹا تھا اور جس پر سے گذرتی ہوئی بھکشونیاں ندی کے کنارے اپنی جھونپڑیوں کی طرف گئی تھیں ۔

چمپک درختوں کی ٹہنیاں کو سامنے سے ہٹاتی راہبی کی اور روانہ ہو گئی۔ سامنے کچھ فاصلے پر کٹی تھی جس پر ترئی کی بیل پھیلی تھی اور اس میں سے گنگنانے کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ یہاں اس نے سن رکھا تھا کہ بزرگ ترین راہبہ گوتمی رہتی ہے جو کوشل دیس کے ایک راجہ کی بہن تھی ۔ اور پچاس سال سے سنیاسن کی حیثیت سے اس کٹی میں رہتی آئی تھی ۔

شراوستی بھکشونیوں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس وقت بھکشونیوں کی ٹولیاں بھیک مانگ کر

لوٹ رہی تھیں۔ ان میں ہر طبقے اور ہر عمر کی عورتیں شامل تھیں۔ چمپک حیرت اور اچنبھے سے ایک طرف کھڑی ان کو دیکھتی رہی۔ انھوں نے کام لوک فتح کر لیا ہے اور ربیم کو میں داخل ہو چکی ہیں۔ کیا میں بھی کام لوک فتح کر سکوں گی۔ اسے گوتم نیلمبر کی یاد آئی۔ اسے ہری شنکر کا خیال آیا جو برسوں سے اس کے دل میں رہتا تھا۔ ان بھکونیوں نے کام لوک کس طرح تسخیر کیا۔ وہ سوچتی رہی مگر اس کی ہمت نہ پڑی کہ ان کے قریب جا کر ان سے بات کرے۔ وہ جو زرتار بنارسی ساری اور سونے کے زیوروں سے مزین تھی وہ جو جی بھر کر راگ اور رنگ کی دنیا سے محظوظ ہوتی تھی۔ حیات کی غلام۔ جو جب سے اس لڑکے سے باتیں کر کے آئی تھی جی ہی جی میں ایک نامعلوم سی خوشی کی کیفیت محسوس کر رہی تھی۔ وہ ایسی حقیر بندی۔ ان اونچی، پوتر دیو بالاؤں سے کیا بات کر سکتی تھی۔

"بہن — ادھر آؤ — وہاں کاہے کھڑی ہو" ان میں سے ایک نے گویا اس کی کشمکش کو بھانپ لیا "ادھر آؤ۔ ہمارے سنگ بیٹھو" ایک بھکونی نے قریب آکر بڑی شفقت سے اس سے کہا۔

"میں — میں دیوی سمن سے مل سکتی ہوں — ؟"

"ہاں کیوں نہیں۔ بہن سمن تو تمھاری ہی راہ دیکھ رہی ہیں۔"

ڈرتے ڈرتے چمپک اس نوجوان بھکونی کے ساتھ کٹی میں داخل ہوئی۔

سامنے سمن بیٹھی تھیں۔ جوشِ عقیدت سے چمپک کا گلا رندھ گیا اور اس کو اپنے جسم میں جھنجھناہٹ ایسی محسوس ہوئی۔ سری کرشن کی پجارن چمپک۔ کسی خدا کو نہ ماننے والی راہبہ سمن کے آگے جھک گئی۔

باہر اندھیرا چھا رہا تھا۔ سمن ان سب سے الگ مرگ چھالے پر بیٹھی تان پورہ بجا بجا کر گا رہی تھی۔

یہ گانا راہبہ چتا نے راج گیر کی چوٹیوں پر چڑھ کر گایا تھا۔

"— گو میں کمزور اور دکھی ہوں اور میری جوانی ختم ہو چکی ہے۔
اور میں لاٹھی کے سہارے پہاڑ پر چڑھتی ہوں اور میری چادر میرے کاندھے سے

لگی ہے۔

اور میرا کاسہ اُلٹا ہے۔

چٹان کے سہارے کھڑے ہو کر میں نے اپنی خودی کو سہارا دیا ہے۔

اور آزادی کی ہوا میرے چاروں اور منڈلاتی ہے۔

بُدھ کی خواہش پوری ہوئی'۔

چمپک کٹی کی دہلیز میں بیٹھی رہی۔ بھکونیاں گا رہی تھیں۔ یکلخت چمپک نے طے کر لیا کہ وہ اپنی بنارسی ساری پہن پھینکے اور کیسری دھوتی لپیٹ کر اُن سے آن ملے گی۔ ان لوگوں کے اور اس کے درمیان مغائرت کی جو دیوار کھڑی ہے اس کو وہ اپنے اس لباس اور اس زندگی کے ساتھ کبھی عبور نہیں کر سکتی۔

"مجھے کچھ گوتم کے بارے میں بتلاؤ — کچھ شاکیہ منی کے بارے میں بتلاؤ۔" اُس نے ڈرتے ڈرتے سمن سے کہا۔

سمن خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ ایک لمحے کے لیے چمپک کو ڈر سا لگا۔ ان آنکھوں میں گزرے ہوئے وقت کی چھایا جھلملا رہی تھی اور چمپک کو معلوم تھا کہ سمن کتنی بوڑھی ہے اور چمپک کو وقت سے ڈر لگتا تھا۔

"مجھے کچھ اپنے سنگھ کے بارے میں بتلاؤ" اُس نے ہڑبڑا کر دوبارہ کہا۔

سمن اٹھارہ سال کی عمر میں اپنا راج گھر انا تج کر سنگھ میں شامل ہوئی۔ وہ بیس سال کی تھی جب شاکیہ منی نے مہاپری نروان حاصل کیا۔ ان کو گئے اسّی سال ہو چکے تھے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں راجکماری سمن کے حُسن کی شہرت دُور دُور تک پھیلی تھی۔ اب ایک اٹھانوے سالہ بوڑھیا پھونس گیروا لباس پہنے اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ دُنیا تج کر بھی اسے کیا ملا۔ چمپک کے دل میں کسی چور نے پوچھا۔ اگر میں نے دُنیا چھوڑ دی تو مجھے شانتی مل جائے گی؟ اور اگر یہاں بھی شانتی نہ ملی تو — ؟ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر اس نے آہستہ سے سمن کی ساری کے کنارے کو چھوُا۔ سمن گزرتے ہوئے وقت کی گواہ۔ شاکیہ منی کے قدموں میں بیٹھ چکی تھی۔ جیت وَن وِہار کی گندھ کُٹی میں

داخل ہو چکی تھی۔ کنڈل کیشی سے مباحثے کر چکی تھی۔ چمپک نے اس کی ساری کے کنارے کو چھوا اور اسے محسوس ہوا جیسے اس لمس کے ذریعہ وہ شاکیہ منی تک بھی پہنچ گئی ہے اور اس احساس سے اسے ایک لمحے کے لیے بڑا سکون ملا۔

روہنی ندی کے کنارے شاکیہ منی کا وعظ سننے کے بعد ملک کے پانچ سو امرا نے دنیا تیاگ دی تھی۔ ان کی بیبیاں شاکیہ منی کی خالہ اور سوتیلی ماں مہاپرجاپتی کے پاس آئیں۔ جنھوں نے اپنے شوہر کے مرنے کے بعد رہبانیت اختیار کر لی تھی اور انھوں نے پرجاپتی سے کہا کہ ہم بھی ترک علائق کے خواہش مند ہیں۔ شاکیہ منی نے ان کا سنگھ قائم کیا اور شہزادیاں اور گرہستنیں اور ہر طبقے اور ہر عمر کی لڑکیاں بھکونی بننے لگیں ان کے نغموں سے جنگل اور وادیاں گونج اٹھیں۔ وہ گرو کی چیلی بن کر بعد میں خود گرو بنتیں دوسروں کو پڑھاتیں۔ دھرم کا پرچار کرتی تھی علمی مباحثوں میں حصہ لیتی تھیں۔ پتا جو پہلے چندربھاگ ندی کے کنارے پیدا ہوئی تھی اور جس نے اب کے سے شراوستی کے ایک امیر گھر میں جنم لیا اور جس نے جوانی ہی میں ارھت کا درجہ حاصل کیا۔ اور دھیرا اور بھدرا۔ اور ابھی روپ نندا جسے اپنے حسن پر بڑا ناز تھا۔ اور بنارس کی ویشیا ادھا کاشی اور اُتّا جو پہلے جنم میں داسی تھی اور دوسرے جنم میں شراوستی کے ایک سیٹھی کے یہاں پیدا ہوئی اور راجہ بھیم بسار کے پروہت کی لڑکی سوما جو جیت ون کے نیم تاریک کنج میں بیٹھی تھی اور مارا نے ہوا میں نمودار ہو کر اسے مخاطب کیا کہ او عورت جس کے پاس صرف دو انگلیوں کا احساس ہے تو اس میدان کو تسخیر نہیں کر سکتی جس پر بڑے بڑے رشی منی چلتے ہوئے گھبراتے ہیں (کیونکہ عورت جو سات آٹھ سال کی عمر سے رسوئی میں چاول اُبالنا شروع کرتی ہے اور سارے وقت یہ معلوم کرنے کے لیے کہ چاول گلے ہیں کہ نہیں ڈوئی سے نکال نکال کر اپنی دو انگلیوں سے ان کی گُنا دیکھتی ہے) پر سوما نے مارا کو مار بھگایا اور ارھت بن گئی۔ اور ویشالی کی طوائف وِملا اور ویشالی کے سپہ سالار کی لڑکی سہا جس نے گایا "میں جسے چیزوں کا دکھ اور ڈکھ بہت ستاتا تھا اور گزرے وقتوں کی یاد بہت تنگ کرتی تھی۔ میں نے خودکشی کی ٹھانی تاکہ پھر سے اس ذلیل زندگی

میں زندہ رہوں مگر مجھے راستہ مل گیا اور بدھ کی خواہش پوری ہوئی اور شراوستی کی برہمن زادی مکتا اور ویشالی کی رقاصہ امبا پالی اور ہنس وتی شہر کی سندری نندا اور راج گیر کی گھنگھریالے بالوں والی کنڈل کیشی جو ایک ڈاکو کے عشق میں دل شکستہ ہو کر پہلے جین سنیاسن بنی اور جو سیب کی ٹہنی ہاتھ میں لیے گاؤں گاؤں للکارتی پھرتی تھی کہ کوئی ہے جو آن کر مجھے بحث میں ہرائے، اور چندا اور راج گیر کی ملکہ کھیم جو اپنے حسن پر بڑی مغرور تھی اور جس نے بانس کے جھنڈ میں پہلی بار شاکیہ منی کو دیکھا تھا اور خوبصورت امیر زادی آنوپم اور مہارانی کھیم کی سہیلی وجے، اور سبھا رانی، آم کے باغ میں ایک نوجوان نے ان پر ڈورے ڈالنا چاہے تھے تو جنھوں نے اپنی آنکھیں نکال لی تھیں۔

یہ سب اب دوبارہ پیدا نہیں ہوں گی کیونکہ انھوں نے ارہت کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ یہ سب ندی میں داخل ہو چکی تھیں اور یہ جتنی بھکونیاں اس وقت موجود تھیں یہ بھی کتنی خوش قسمت تھیں کیونکہ انھوں نے کشمکش سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا تھا۔

چمپک نے کٹی کے باہر نظر ڈالی۔ درختوں کے اس پار خیمہ گاہ میں روشنیاں جھلملا اٹھی تھیں۔ باہر کوئی اسے آوازیں دے رہا تھا۔

وہ کٹی سے نکلی۔ خواصیں اور ہرکارے اسے ڈھونڈتے ہوئے یہاں آ پہنچے تھے کیونکہ جشن کے لیے خیموں میں اس کا انتظار کیا جا رہا تھا۔

عورتوں کے متعلق ہمارا کیا رویہ ہونا چاہیے۔ سو سال قبل یہیں شراوستی میں ایک اہم سوال کیا گیا تھا

ان کی طرف دیکھنا بھی نہیں آنند۔ جواب ملا تھا۔

لیکن فرض کیجیے وہ نظر ہی آ جائیں۔

ان سے بات مت کرنا۔

لیکن اگر وہ خود ہم سے بات کرنے لگیں تو — ؟

برابر جاگتے رہنا۔

کئی راتوں تک متواتر جاگتے رہنے کے بعد دفعتاً گوتم کو نیند کا زوردار جھونکا آگیا لیکن کوشش کر کے اس نے اپنی آنکھیں کھُلی رکھیں۔

طالب علمی کے زمانے میں جب وہ آشرم میں یا کتب خانوں میں مختلف کتابیں پڑھتا تو عجیب و غریب متضاد نظریے عورتوں کے متعلق اس کے مطالعے میں آتے۔ مہابھارت کی بارھویں کتاب میں لکھا تھا کہ عورت کبھی غیر مقدس ہو ہی نہیں سکتی۔ لیکن تیرھویں کتاب کا بیان تھا کہ عورت ہی ساری برائیوں کی جڑ ہے۔ اس کی طبیعت میں اوچھاپن ہے اور یہ کہ اچھے گھرانوں کی خواتین طوائفوں کی ملبوسات اور گہنوں پاتوں کو رشک کی نظر سے دیکھتی ہیں اور چونکہ سارا شر پیدائش کی وجہ سے ظہور میں آتا ہے اور عورت پیدا کرنے والی ہے۔ لہٰذا عورت ہی دُنیا کے سارے شر کی ذمّے دار ہے اور یہ کہ عورت صرف محبت کی بھوکی ہے اور سخت ناقابلِ اعتبار۔ لیکن اسی صحیفے میں یہ بھی لکھا تھا کہ ان سب کمزوریوں کے باوجود عورت کی عزت کرنا چاہیے۔ ساتھ ہی ساتھ عورت کو دیوی کا درجہ حاصل تھا۔ اس کی وفاداری، شرافت، شرم و حیا کی رشی منی قسمیں کھاتے تھے۔ لیکن شراوستی کی ویشیائیں اور ناٹک میں اداکاری کرنے والی ناٹیکائیں۔ اور سیاسی خدمات انجام دینے والی جاسوس عورتیں اور وِش کنیائیں بھی تو عورتیں تھیں۔

اور اروشی نے اپنے چاہنے والے سے کہا تھا کیوں اپنی جان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہو۔ خود کو بھیڑیوں کے پنجوں سے بچاؤ۔۔۔!

عورتوں سے دوستی رکھنا ناممکن ہے کیونکہ ان کے دل بھیڑیوں کے دل کی مانند ہوتے ہیں۔

اور دوسری طرف گندھاری تھی جس نے اپنے اندھے منگیتر کی خاطر خود بھی اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لی تھی اور ساتسویا اس قدر وفا شعار تھیں کہ اپنے پتی کو خود اپنی سوتن کے گھر پہنچانے گئی تھیں۔ اور کہیں پر یہ بھی لکھا تھا کہ پتی ورتا عورت کے لیے دوسرے آدمی ساٹے کے سمان ہیں اور منو مہاراج نے کہا تھا کہ جس جگہ عورتوں کی عزت کی جاتی ہے وہاں دیوتا خوشی سے رہتے ہیں۔

لیکن شاکیہ منی نے کہا تھا۔ عورت بیوقوف ہوتی ہے آنند۔ عورت حاسد ہوتی ہے آنند۔ عورت بدباطن ہوتی ہے آنند۔ عورت سے بچو۔ عورت سے بچو۔

ناری نرتی ہے۔ مجسمہ شر۔

ایک مرتبہ شاکیہ منی اپنے بارہ سو چیلوں سمیت اسی جیت ون میں موجود تھے جو جھیل کے اس پار نظر آ رہا تھا اور راجہ پرسین جیت نے ان کی دعوت کی تھی اور آنند جو کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ اس دعوت میں نہ پہنچ سکا تھا۔

خوبصورت آنند نے اپنا کشکول اٹھایا اور ہمیشہ کی طرح سوچ میں ڈوبا شہر میں بھیک مانگنے کے لیے نکل گیا۔ اس کے لیے کشتری اور چنڈال سب برابر تھے اور اسے اپنی نیکنامی کا بڑا خیال تھا اور بڑے وقار کے ساتھ اس نے شہر پناہ کی خندق عبور کی اور فصیل کے پھاٹک میں داخل ہوا اور بھیک مانگتے مانگتے ایک مشہور رقاصہ کے دروازے پر پہنچا اور رقاصہ کی لڑکی اس پر عاشق ہو گئی اور اس نے ایسا جادو ڈالا کہ بے چارہ آنند دکھشنا لینا بھول کر سیدھے اس کے گھر میں داخل ہو گیا۔

اور شاہی محل کے ایوانِ ضیافت میں بیٹھے بیٹھے شاکیہ منی کو علم ہوا کہ آنند بڑی آفت میں مبتلا ہے اور انھوں نے دوسرے چیلے کو اس کی دستگیری کے لیے روانہ کیا۔

اور شاکیہ منی نے آنند سے کہا "میں اپنے پری نروان کے بعد چاہتا ہوں کہ تم سب میرے خاص چیلے بودھی ستو۔ مہاستو اور ارہت مکمل نجات حاصل کرنے کے بجائے آخری کلپوں میں دوبارہ پیدا ہونا منظور کر لو۔ تم طالب علموں، عام آدمیوں، بادشاہوں، امیروں، وزیروں، برہمچاریوں، حتیٰ کہ طوائفوں، بیواؤں، بدمعاشوں، چوروں، قصابوں اور ساطیوں کی صورت میں جنم لو تاکہ تم ہر طبقے کے انسانوں میں گھل مل کر انھیں مکتی کا راستہ دکھلا سکو۔ صرف مرتے وقت اپنی اصلیت ظاہر کرنا ورنہ بدعتی تمھیں ورغلائیں گے۔

اور اگر کوئی چیلا اپنے پہلے کلپ کی عادتوں کو ترک نہ کر سکا تو تم اس پر وہ اسرار منکشف کرنا جو مجھ پر بودھی درخت کے نیچے کنول کے پھولوں کے درمیان ظاہر ہوئے تھے۔

"آنند ابھی جب تم کو اس لڑکی نے بہکایا یہ محض اس جنم یا اس کلپ کا اتفاقی حادثہ نہ تھا۔ کئی کلپوں سے تم اس کی کشش میں مبتلا ہو۔ لیکن وہ پچھلے کلپوں کا بندھن اب ٹوٹ چکا ہے۔ تم اور وہ دونوں آزاد ہیں۔"

آزادی کا مقصد کیا ہے۔ اس کے معنی کیا ہیں۔ اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ کون آزاد ہے اور کون نہیں۔ گوتم نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ ہری شنکر تم کو آزادی کی تلاش میں کیا ملا۔ آنند اسرار جو تم پر منکشف ہوئے وہ سوائے تمہارے اور کون جانے گا۔ ہم سب اپنے اپنے اسرار میں کسی دوسرے کو شریک نہیں کر سکتے۔

شاہی خیمہ گاہ کی طرف سے جھانجھ اور شہنائی کی آوازیں بلند ہونا شروع ہو چکی تھیں کبھی کبھی گھنگھروؤں کی جھنکار سنائی دے جاتی تھی۔ چودھویں تاریخ کا چاند ڈولتا ڈولتا آشرم کے صحن اوپر آ گیا تھا اور اس کے اجالے میں پھولوں کی بیلوں سے ڈھکے ہوئے جھونپڑے بے انتہا پُرسکون نظر آ رہے تھے۔ اکا دکا چراغ جل رہے تھے۔ باقی طالب علم سو چکے تھے۔ صرف اب تک وہی جاگ رہا تھا۔

جانے اس سمے راجن کے پڑاؤ پر کیا ہو رہا ہو گا۔ روشنی، موسیقی اور رقص۔ اس نے اپنے ذہن میں چمک کے تصور کو انہیں تین چیزوں سے وابستہ کر رکھا تھا۔

روشنی، موسیقی اور رقص۔

وہ آہستہ سے اٹھا اور کندھے پر چادر اچھی طرح سے لپیٹ کر دبے پاؤں آشرم سے باہر نکلا اور مہوا کے باغ کی سمت روانہ ہو گیا۔ اس سمے وہ بڑی بھاری چوری کر رہا تھا۔ اور اس چوری پر شدت سے مسرور تھا۔ اس کا سایہ زمین پر اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ اس کے پیروں کے نیچے خشک پتیاں زور زور سے کھڑکھڑا رہی تھیں۔ ایک گلہری اس کی آہٹ پر چونک کر تیزی سے بھاگی۔ ادھر ادھر دیکھتا ہوا کہ کوئی اسے پہچان نہ لے۔ وہ دھیرے سے مہوے کے باغ میں داخل ہوا جہاں مشعلوں کی تیز روشنی ہو رہی تھی۔ وسط میں منڈپ ایسا بنا تھا جس کے ایک جانب سنگیت کار لڑکیاں مردنگ اور اکتارے اور جھانجھ لیے بیٹھی تھیں۔ راج گھرانے کے مرد اور عورتیں چاروں اور

جمع ہنسنے بولنے میں منہمک تھے۔ ایودھیا کے لوگ رقص اور موسیقی میں اپنی مہارت کے لیے سارے دیس میں مشہور تھے۔ اس مجمع میں ہر شخص کلا ونت جان پڑتا تھا۔

دفعتاً گوتم کی نظر اس بوڑھی خادمہ پہ پڑی جس نے کل اسے ڈانٹا تھا۔ وہ ذرا گھبرا کے ایک خیمے کی آڑ میں ہو گیا۔ اگر کوئی اسے اس سمے دیکھ لے تو کیا ہو۔ وہ گوتم نیلمبر آشرم کا سب سے سعادت مند اور قابل طالب علم، مشہور لیکھک اور رچیتر کار، برہمچاری، اس طرح چوتوں اور آوارہ گردوں کی طرح ایک خیمے کے پیچھے چھپا لڑکیوں کو ناچتا ہوا دیکھ رہا تھا

۱۱

ناچ — ناچ — ناچ —

چھایا پتھ پر اپسرائیں ناچ رہی ہیں۔ مرگھٹ میں کالی رقصاں ہے۔۔ دل کے سنہرے ایوانوں میں شیو ناچتا ہے اور گوکل میں نٹور گردھاری۔ کیلاش پہ اوما ناچتی ہے اور یہاں راپتی کے کنارے مہوا کے جھرمٹ میں خزاں کے چاند تلے وہ ناچ رہی ہے جسے کوئی کماری چمپک کہتا ہے کوئی چمپا رانی۔ کوئی چمپاوتی۔ اس کے ہزاروں نام ہو سکتے ہیں کیونکہ اس کے ان گنت روپ ہیں۔ اس کی اداسی۔ اس کی ہنسی۔ اس کی مسکراہٹ۔ اس کا دکھ اس کا ویراگ۔ اس کی مسرت اس کی نفرت۔ یہ ایسے بھاؤ اور ایسے رس ہیں جنھیں بھرت منی بھی نہیں سمجھ سکتے کسی شلپ شاستر میں اس ناچ کا ذکر نہیں جو میں نے اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھا۔ کسی نند کشور، کسی بھرت منی نے اپنی کتابوں میں اس کی مدراؤں کا تذکرہ نہیں کیا۔ اس ناچ کے قوانین نہیں بنائے۔ یہ بڑا انوکھی راس لیلا ہے۔ یہ بڑا اتم شرنگار رس ہے۔ لڑکیاں سازوں پر چھایا راگ الاپ رہی ہیں۔ سبز طوطے پر سوار کام دیو اپنا پھولوں کا بان چلاتا ہے اور پیاکرتی مایا بن جاتی ہے۔ شو کی تیسری آنکھ کے شعلے نے کام دیو کو جلا کر

ا۔ کہکشاں

بھسم کر دیا تھا۔ لیکن کام دیوتا اننگ ہے۔ انسانوں کے دلوں میں موجود ہے۔ شیو اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

اور وہ اس طرح ناچ رہی ہے مانو پاروتی نے دیبی آدشا کے بجائے اسی کو بھارت ناٹیم کی تعلیم دی تھی۔ رقاص شہزادے ارجن نے مانی پور کی چترانگدا اور کرشن کی راجکماری اُترا کی جگہ اس کو اپنا شاگرد بنایا تھا۔ وہ جو سفید ساری پہنے کمدی اُتسو کا تہوار منا رہی ہے۔ اُس نے بالوں میں کیسر کے پھول اڑس رکھے ہیں۔ اس کے جوڑے کو رتنا جلی نے ڈھانپا ہوا ہے اس کے گلے میں وجینتی مالا ہے جس کے صدف اور یاقوت، زمرد اور نیلم اور ہیرے چاندنی میں جھلملاتے ہیں۔ اس کے گلے کی مکتاولی اور شنکھ ہار اور سفید موتیوں کی سدھ ایکاولی کی چھوٹ اس کے چہرے پر پڑ رہی ہے۔ اس کے کانوں میں کرن پھول ہیں۔ اس کے کنول ایسے پیروں میں پدم جگمگا رہی ہے۔ اس کے ماتھے پر طلائی بیس پھول سجا ہے۔ وہ سولہ سنگار کیے اپسرا اُتر شوتی کی طرح خزاں کے چاند تلے ناچتی ہے۔ سارا شراوستی سارا اودھیا سارا کسم پورہ سارا جمبو دیپ[۳] کا تک پورنماشی منا رہا ہے اور شیو نے آنکھ کھولی ہے۔ خزاں جو شیو کے جسم کے مانند زرد ہے۔ شیو بھبوت رمائے ہاتھی کی کھال پہنے لیٹا ہے اس کی جٹاؤں سے گنگا بہہ رہی ہے۔ اس کے ماتھے پر ہلال جگمگاتا ہے۔ وہ بہت کم کم ہنستا ہے۔ چترماسا[۱] گزرنے کے بعد وشنو اپنی گہری نیند سے جگا ہے۔ وشنو جو اننت[۲] کی پیٹھ پر پڑا سوتا تھا۔ وشنو پیتمبر جو خلا کو نگل چکا ہے جو ساری کائنات کا زہر ہلاہل پی چکا ہے۔ اننت پر بیٹھا ہوا وہ زمان و مکان کی قیود سے بلند ہے اور وشنو اپنی ڈمرو بجا رہا ہے اور زمان و مکان اس کے ڈمرو کی آواز پر لرز رہے ہیں اور سبزہ زاروں پر چاند کی روشنی برس رہی ہے۔ اور سفید چنور اور سفید ساریاں اور سفید پھول اُس سفید روشنی میں جگمگا رہے ہیں۔ وقت نور کی ایک عظیم دھارا میں ڈھل گیا ہے جو خلا میں بہتی

---

۱ چار مہینے ۲ لامحدود عقل کا مظہر شیش ناگ ۳ قدیم ہندوستان

جاری ہے اور چاندنی فضا میں گھل گئی ہے اور جب دنیا احساس اور چھونے اور دیکھنے اور تجربہ کرنے کی دنیا اس قدر دلکش ہے تو اس میں مرگ ترشنا کا کیا دخل یہ سب اصلیت ہے۔ زندگی سب سے بڑی اصلیت ہے۔ تخلیق سب سے بڑی حقیقت ہے۔ تخلیق عظیم ہے شکتی کی تقدیس کرو جو تخلیق کرتی ہے۔ دیوی کی تقدیس کرو جو ماں ہے۔ ماں — اوما — گوری — لکشمی — جس کا دوسرا نام آشا ہے۔ جس کا دوسرا نام کملا ہے۔ جس کے تصور کی تشکیل کنول کے پھولوں نے کی۔ وہ چمپا کے پھول کی طرح معطّر ہے۔ وہ ماں ہے جیسے زمین ماں ہے جیسے ندی ماں ہے۔ ماں الوہی ہے۔ عورت الوہی ہے کیونکہ ماں ہے۔ چمپک الوہی ہے۔ اس کی حمد کرو۔ اس کی عبادت کرو۔ اس کے آگے جھک جاؤ۔ وہ اس خنک زرد گھاس۔ اس ہری زمین کی دیبی ہے ابدی ماں۔ اور ابدی رفیق۔ میری بہت پرانی ساتھی ہے۔ کیا میں اس کو جانتا نہیں —؟

رگ وید میں لکھا ہے کہ میاں بی بی وہ ہیں جو ذہنی طور پر ایک دوسرے سے بندھے ہوں

کیا کبھی ایسا ہوگا کہ میں اسے ڈولے[1] میں بٹھلا کر اپنی دلھن کی طرح اپنے گھر لے جاؤں گا —؟

۱۲

مجمع چونک اٹھا۔ ایک نوجوان خیمے کے پیچھے سے نکلا۔ منڈپ میں آ کر اس نے جھک کے گھنگرو باندھے اور اپنی سفید چادر ایک طرف پھینک کر انند تانڈو ناچتا سامنے آگیا۔

---

[1] رتھ

مجمع مسحور ہو کر اس کا رقص دیکھتا رہا۔ لگتا تھا جیسے نٹ راج نے اپنا فن اسے خود سکھلایا ہے۔ وہ خود ہی نٹ راج ہے۔

چمپک ناچتے ناچتے رُک گئی اُس نے رقاص کو اچنبھے سے دیکھا۔

مردنگ زور زور سے بجتی رہی۔ سندھیا تانڈو ناچتا ہوا وہ منڈپ کے وسط میں آ گیا۔ اس نے شو کی مانند رقص کے ایک سو آٹھ مختلف مظاہرے کیے۔ اس نے آٹھوں رس دکھلائے۔ یہ وشنو کا شرنگار رس ہے۔ یہ اندر کا ویر رس۔ یہ یم کا کرونا یہ رودرا کا رودر رس یہ کال کا بھیانک رس ہے یہ گندھروکا ادبھت رس۔ یہ شانت رس ہے۔ یہ شو کا رقص ہے اس کی مدراؤں میں کائنات کا سارا عمل ارتقاء مضمر ہے۔ اس کی زبان سارا اظہار ہے۔ اس کا لباس چاند اور ستارے ہیں۔ شو جو مجسم تان ہے اور مجسم سنگیت۔ جو آفاقی لَے کا مظہر ہے۔

مادرِ کائنات اوما ہماوتی کو کیلاش کے سب سے اونچے تخت پر بٹھلا کر نٹ راج اس کے سامنے ناچتا ہے۔ سرسوتی وینا بجا رہی ہے۔ اندر بانسری۔ برہما جھانجھ بجاتا ہے۔ لکشمی گاتی ہے اور وشنو مردنگم بجا رہا ہے۔ سارے دیوتا اور گندھرو اور سدھ اور ودیادھر آس پاس کھڑے ہیں۔ یہ شام کا سمے ہے۔ سندھیا کا رقص۔

چمپک اپنی جگہ سے اُٹھی اور ناچتی ہوئی اس کے برابر آ گئی۔

ان دونوں نے مل کر اوما تانڈو شروع کر دیا۔ وہ گوری تھی اور شنکر کے ساتھ رقصاں تھی۔

چاندنی کھلے میدانوں پر نغمہ ریز تھی اور چاندی کے رنگ کے بادل ندی پر تیر رہے تھے اور چاندی کے رنگ کے سارس پروں میں چونچ چھپائے بالو پر سو رہے تھے اور کاتک کا پورا چاند پھولوں کے اوپر سے جھانکتا تھا۔

مگر وہ رات بھی ختم ہوئی اور تہوار منانے والوں کا ہنگامہ کم ہوا اور ان کے گیتوں اور گھنگروؤں کی آوازیں مدھم پڑ گئیں اور پو پھٹتے سمے تک شاہی خیمہ گاہ پر خاموشی چھا گئی

اور منڈپ میں پھولوں کے چند گجرے اور کلیوں کے انبار بکھرے پڑے رہ گئے۔

۱۳

صبح ہوئی۔ ہمالیہ کی چوٹیوں پر دھند تیر رہی تھی۔ تالابوں میں سُرخ کنول کھل گئے تھے گاؤں کی سڑک پر جاتی ہوئی گوالنوں کی رنگین گگریاں دھوپ میں جگمگا رہی تھیں۔ مہوا کے پیلے پھولوں پر منڈلاتی ہوئی مدھوکر[۱] اس کے کانوں میں بھنبھنایا کی اور جب سُورج کی تیز کرنیں اس کے پپوٹوں میں گھسیں تو وہ آنکھیں ملتا اٹھا۔ اور اس نے اپنے آپ کو تالاب کی شکستہ سیڑھیوں پر لیٹا ہُوا پایا۔ اُس نے گھبرا کر چاروں اور دیکھا وہ کہاں تھا اور یہ سب کیا تھا۔ اُس نے دماغ پر بہت زور ڈالنے کی کوشش کی لیکن اسے کچھ یاد نہیں تھا۔

چمپک — چمپک — چمپک —

سارے وقت مدھوکر صرف یہی بھنبھناتی رہی تھی۔ وہ اطمینان سے انگڑائی لے کر اُٹھا اور دوسری انگڑائی لے کر پھر سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ دفعتاً اس کی نظر مہوا کے جھنڈ پر پڑی جو سنسان پڑا تھا۔ یہ جگہ جہاں ساری دنیا کی رونقیں سمٹ آئی تھیں اس وقت بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ ایک ہرن درخت کے پیچھے سے بھاگا چند گلہریاں بیل کے پھل کترتی رہیں۔ ہرے طوطوں کی ایک ڈار شاخ پر سے اُڑ گئی جنگل خاموش پڑا رہا۔ وہ حیران پریشان وہاں بیٹھا تھا۔ پھر اسے رفتہ رفتہ بہت دُھندلے خواب کی طرح یاد آیا اس جگہ رات بھر پہلے شاہی خیمہ گاہ تھی اور اس میں وہ منڈپ کے نیچے رات گئے تک ناچا تھا۔ وہ سب ناچے تھے اور جب وہ ناچتے ناچتے تھک گیا تھا تو راجن نے اسے بلا کر اپنے پاس بٹھلا لیا تھا اور اس نے راجن کے ساتھ خوب جی بھر کر مدرا پی تھی اور بھنا ہُوا ماس کھایا تھا اور زرنگار چھتر کے نیچے اطلسی مسند پر بیٹھا تھا اور اس محفلِ رنگ و بو میں اس کی

---

[۱] شہد کی مکھی

نظریں برابر چمپک کی متلاشی رہی تھیں لیکن وہ رقص ختم ہوتے کے ساتھ ہی شہزادیوں کے ساتھ زنانے خیمے کی طرف چلی گئی تھی اور اس کے انتظار میں وہ پو پھٹنے سمے تک وہاں بیٹھا رہا تھا۔ جب وہ منڈپ سے باہر نکل کر لڑکھڑاتا ہوا آشرم کی طرف لوٹ رہا تھا اس وقت اسے نیند کا جھونکا آیا تھا اور وہ تالاب کے کنارے پڑ کر سو گیا تھا اور صبح صبح کوچ کا نقارہ بجا تھا اور خیمے اٹھا دیے گئے تھے اور جب شاہی قافلہ کھیدا کے لیے روانہ ہو رہا تھا۔ اس وقت چمپک نرملا کے ساتھ تالاب کے کنارے سے گزری تھی اور نرملا نے اس سے کہا تھا کیسا اوکھا برہمن ہے۔ پرسوں تم سے چترکاری کے متعلق بحث کر رہا تھا۔ رات کو نٹ راج کی طرح ناچا اور اس وقت بچوں کی طرح پڑا سوتا ہے۔ جانے سے پہلے آؤ اسے جگا کر پرنام تو کرلیں۔

چمپک چند لمحوں کے لیے گم سم کھڑی رہی تھی اور پھر اس نے جواب دیا تھا نہیں۔ کیونکہ جو جاگتا ہے اسے ایک دن نیند آجاتی ہے اور جو سوتا ہے وہ ایک روز جاگ اٹھتا ہے۔ ان لوگوں کی طرف دیکھو جو برابر جاگتے رہتے ہیں اور پھر وہ اپنی منقش پالکی کی سمت چلی گئی تھی۔

اور اب مہوے کے باغ میں مکمل سناٹا تھا وہ تالاب کی سیڑھیوں پر بیٹھا رہا چنتا رہا۔ اس ایک رات میں وہ دفعتاً بڑا ہو گیا تھا۔ اس نے دل کی کائنات کی سیاحت کی تھی اس نے مایا کا تجربہ کیا تھا اور وہ اس تجربے سے غیر مطمئن نہیں تھا لیکن یہ کیسا عجیب احساس تھا جیسے شیو کے بجائے زندگی کا سارا ہلاہل اس نے خود پی لیا ہو۔ یہ کیسا اوکھا تجربہ تھا۔ اس کی شرط تو اس نے کپل سے نہیں لگائی تھی اور ہری شنکر تو کہیں ہزاروں میل کے فاصلے پر کھڑا رہ گیا تھا۔

اس کا جی چاہا کہ دوڑتا ہوا جائے اور شاہی قافلے سے جا ملے۔ راجن کا ایک حقیر کہار بن کر ان لوگوں کے ساتھ چلے اس لڑکی کے پیچھے پیچھے افق کے دوسرے کناروں تک پہنچ جائے۔

لیکن وہ تو اس سے چلتے وقت مل کر بھی نہیں گئی۔ اس نے اسے قریب آکر جگایا

تک نہیں۔

چنانچہ وہ مجھ سے ایک بات کہے بغیر ہی آگے چلی گئی اور ایک لمحے کے لیے اسے بڑی طمانیت محسوس ہوئی۔ اس کا یہ احساس شدید ہو گیا کہ وہ اس سے الگ نہیں ہے اس کے وجود میں شامل ہے۔ اسے مجھ سے بات کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو مجھ سے ہر سمے باتیں کرتی رہتی ہے مگر یہ بھی غلط ہے۔ بکواس۔ میں تو اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہوں۔ میں مایا کے فریب میں اچھی طرح مبتلا ہو چکا ہوں۔ وہ مجھ سے الگ ہے بہت دور ہے بھلا میں کہاں اور وہ کہاں یہ سب جھوٹ ہے۔

بہت اچھا۔ اُس نے تالاب کی سیڑھی پر سے اُٹھتے ہوئے کہا (یہیں اُس روز وہ بیٹھی تھی) تم اپنے کرّوفر کے ساتھ ہاتھیوں کے شکار کے لیے روانہ ہو چکی ہو۔ اور زندگی — تمہارے بنا بھی گزر سکتی ہے۔

آشرم کے راستے پر چلتے ہوئے اُسے یاد آیا۔ یہ اس کی تعلیم کا آخری سال ہے۔ عنقریب اس کا باپ اسے گھر لے جانے کے لیے آئے گا۔ گرو اسے رخصت کرتے وقت اپنی نصیحت کریں گے وہی الفاظ دہرائیں گے جو ہر فارغ التحصیل طالب علم کے سامنے صدیوں سے دہرائے جاتے تھے۔ سچ بول اور دھرم کر (دھرم — ؟) آشرم کے سارے لڑکے اس کے عمر بھر کے ساتھی اسے گھاٹ تک پہنچانے جائیں گے۔ فضیلت کی پگڑی باندھ کر وہ آنکھوں میں پہلی بار انجن لگائے گا۔ کانوں میں مانی کنڈل پہنے گا۔ کیسری لباس کے ساتھ کاندھوں پر ادنی کمبل ڈال کر پیروں میں جوتے پہن کر بالوں میں بانس کے کانٹوں سے بنی کنگھی اُڑسے، چھتری لگائے وہ شان سے شراوستی کی سڑکوں پر نکلے گا۔ ایودھیا اور پاٹلی پتر کے درباروں میں جائے گا۔ وہ پروہت کی مسند پر بیٹھے گا۔ حکومت کے منتری منڈل میں شامل ہو گا۔ جبکہ وہ بیچاری مورکھ لڑکی۔ مگدھ کے کسی اجاڑ وحشت خیز دیہات میں سر گھٹائے بیٹھی شاکیہ منی کے بتلائے ہوئے نروان کے حصول میں جٹی ہو گی۔

اگر وہ اپنے ذہن پر اس قدر غرور کر سکتی ہے تو کیا میں اپنے رتبہ پر نازاں نہیں ہوں اور خالی مصوری اور سنگتراشی میں کیا رکھا ہے۔ میں ستار دھر بنوں گا۔ میں تو انہیں

بناؤں گا۔ منو، کپل اور جیمنی میری گرد کو نہیں پہنچ سکتے۔ میں ذہن کی دنیا تہ و بالا کر کے رکھ دوں گا۔ علم میرا ہے۔ گنیش کا قلم میرا ہے۔ اگر چمپک میری نہیں ہو سکتی تو کیا اندھیر ہو گیا۔ سرسوتی تو میری ہے۔ وہ مجھے کبھی اس طرح چھوڑ کر نہ جائے گی۔

اور چمپک میں ہی کیا رکھا ہے۔ خوبصورت تو دنیا میں ہزاروں لڑکیاں ہیں نرملا کتنی خوبصورت تھی۔ چمپک، اگر غور سے دیکھا جائے تو تم ایسی حسین بھی نہیں۔ اس کی شکل بھلا کیسی تھی۔ اُس نے غصّے سے چلتے چلتے تین چار کنکروں کو ٹھوکر لگائی۔ میں نے کم از کم یہ تو طے ہی کر لیا ہے کہ تمھاری تصویر ہرگز نہیں بناؤں گا۔ تم سمجھتی کیا ہو اپنے آپ کو۔ میں تمھیں کچھ نہیں سمجھتا۔ میں تو اس کی شکل بھی بھولتا جا رہا ہوں شکل محض ہیولے ہے۔ میرے دل کے اندر جو روپ محفوظ ہے اسے صرف وشواکرمن پہچان سکتا ہے۔

وہ اپنی کٹی میں داخل ہوا۔ پھر باہر نکل آیا اور ادھر ادھر گھوما گھوما پھرا۔ آشرم کے لڑکوں نے اسے حیرت سے دیکھا۔ کسی نے اس سے پوچھا کل رات سے نظر نہیں آئے، کہاں تھے تو اُس نے رکھائی سے ان کی بات ٹال دی۔

اکلیش سے اُس نے جھوٹ بولا کہ ندی کے کنارے تپسیا کر رہا تھا۔ عمر میں پہلی بار اُس نے جھوٹ بولا تھا اور اب اسے سارے جھوٹ بہت اچھے لگ رہے تھے۔ اس نے سندھیا نہیں کی گرو کے درشن کے لیے گیا آشرم کے کنجوں میں مارا مارا پھرتا رہا۔

میں اس کی تصویر ہرگز نہیں بناؤں گا۔ میں پرتیما کار یک ہوں۔ فن پارے کو زندگی کے سارے رشتوں سے بلند تر ہونا چاہیے۔ اُس نے بار بار دل میں دہرایا لیکن بالآخر اس سے رہا نہیں گیا۔ وہ کلاکار تھا اور تخلیق کی لگن نے اسے بہت پریشان کر رکھا تھا۔

دوسرے روز صبح سویرے وہ اپنا تصویر کشی اور مجسمہ سازی کا سامان لے کر مہوے کے باغ کی سمت روانہ ہو گیا۔ تالاب کے کنارے بیٹھ کر اس نے گیرو پیسا اور اس کا سُرخ رنگ تیار کیا۔ نیل کی ٹِیا مٹی کے کٹورے میں گھولی۔ ہلدی اور کیسر سے زرد

اور زعفرانی رنگ تیار کیے۔ دوسرے رنگوں کے لیے جڑی بوٹیاں اُبالیں اور سفید چینی پٹہ سامنے پھیلا کر تصویر بنانے بیٹھ گیا۔ مگر روپ اور اروپ کی کش مکش نے پھر اس کا موقلم روک لیا۔ میں کیا بناؤں۔ معنی کیا ہیں۔ پھر اس نے سوچا۔ معنی کا کوئی مقام نہیں ہوتا۔ ایک ہی معنی کو مختلف علامتوں کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے اور ان علامتوں کو مختلف مقامات سمجھا جا سکتا ہے۔ ان کی وجہ سے معنی محدود نہیں ہو جاتے۔ تصویر رنگ نہیں مصور کی روح ہے۔ دیکھنے والوں کی آنکھیں ہیں۔ جنھوں نے اس کا اشارہ سمجھ لیا ہے رنگمے ناودِیاتے چترم — آنکھ صرف رنگ دیکھتی ہے جو سطح پر موجود ہیں۔ جس طرح شاعری محض بیان ہے جسے حس نے تحریک دی۔ حس کا کوئی مقام نہیں حس تجربہ حس میں موجود ہے۔

اسے یاد آیا۔ ویدانت والے کہتے ہیں ذاتِ مطلق امورت ہے جس کی کوئی شکل نہیں۔ جو ادراک سے باہر ہے۔ وہ تو ذہنی تصوّر یا خیال بھی نہیں۔ اس لیے ویدانت والوں کے نزدیک فن کا تصوّر اپار برہما یا کمتر درجے کی علامت سے آگے نہیں بڑھتا۔ برہما ایشور ایسی ذات ہے جسے شکل سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے اور اس تصویر کا اصل مخرج روشنی ہے۔ اس کی اصل ہیئت یا سروپ مختلف چیزوں کی ہیئت ہے۔ وشوا روپ۔

اصل مسئلہ یہ تھا کہ خیال محض علامت ہی کے ذریعے دیکھنے والوں تک پہنچایا جا سکتا تھا۔ سارے چترکار اور نقّاد کم از کم اس بات پر متفق تھے۔ اسی نظریے نے اصنام پرستی کی ترویج شروع کی تھی۔

مگر خیال سے علیحدہ، گوتم نے سوچا، زندہ ہستی تو بذاتِ خود زندگی ہے علامت نہیں۔ اس کی طرف کششِ جذبات پر مبنی ہے۔ پھر کلاکار خالص خیال کو کس طرح پیش کرے اس کا رویہ تو خیر جانبدار نہیں رہ پائے گا۔ دھیان — جو کلاکار کا اصل فن ہے — سالم نہیں رہ سکتا۔ خالص ہیئت — شے کا تصوّر جو خود شے میں ہے — اصل دھیان ہے شے کی شخصی کیفیت کو کس طرح نظر انداز کیا جائے۔

حقیقت — زندگی سے آنکھیں نہیں چرائی جا سکتیں۔

اسی طرح تالاب کے کنارے بیٹھے بیٹھے اس نے بہت سی تصویریں بنائیں [illegible]

بگاڑ دیں۔ سُرخ مٹی سے بہت سی مورتیاں گھڑیں اور توڑ ڈالیں۔

آشرم کے لڑکوں میں کانا پھوسی شروع ہوئی یہ گوتم کچھ باؤلا ہوتا جا رہا ہے۔ اسے کیا ہو گیا۔ اکلیش نے غصّے سے کہا۔ نہیں گوتم باؤلا نہیں ہوا۔ اس پر ایک استری کی دُھن سوار ہے۔ ایسی شرمناک بات آج تک اس آشرم میں کبھی ہوئی تھی ـــ؟ کلا کار بنتا ہے اور خیال کے بجائے روپ کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔

شہر کی چتر شالاؤں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ گوتم نیلمبر کیا اب ناگرک مصوّری[1] کرے گا۔ سُنا ہے اُس نے ایودھیا کی کماری چمپک کی تصویر بنائی ہے

ہاں میں نے بھی یہی سُنا ہے۔ چتر کاروں کی منڈلی کے پرمکھ نے اظہارِ خیال کیا۔

اب وہ پرتیما کار ٹھیک نہیں رہا۔

گوتم تصویریں اور مجسّمے بناتا رہا۔ اس نے آشرم کی زرد دیواروں پر مٹی اور راکھ اور چونا پھیر کے ـــــ گہرے رنگوں کے خطوط بنائے۔ اُس نے سُرخ مٹی کی مورتیاں ڈھالیں اب تک جو تختیاں سینکی جاتی تھیں۔ ان پر زیادہ تر مابعد الطبیعیات کی علامتوں کے نقوش ابھرے ہوئے تھے۔ ترشول اور زندگی کا درخت اور زمین کے کنول اور دُنیا کے پہیے اور کنول کے سنگھاسن اور آگ کے ستون۔ گوتم نیلمبر کی تختیوں پر گاؤں کے مناظر تھے۔ عورتیں۔ بیل۔ پتے۔ گائیں۔ پھولوں کے نمونے۔ کسان لڑکے۔ ان نقوش میں قوت تھی اور زندگی کی سرخی اور تپش۔ ماورائے حیات کے بجائے یہ اصل حیات تھی۔ یہ زمین کی اپنی تخلیق تھی۔

پھر ایک دن اس نے سدرشن یکشنی کا مجسمہ مکمل کر لیا۔ سدرشن یکشنی جو کدم کی ڈالی جھکائے درخت کے تنے سے لگی کھڑی تھی۔

شہر کے فن کاروں نے اسے دیکھ کر سر ہلایا چتر شالاؤں اور مندروں میں اسے ناپسند کیا گیا۔ عوام جن میں فن کا ذوق عام تھا اسے دیکھ کر خاموش رہے۔ نقادوں نے

---

[1] فیشن ایبل پورٹریٹ پینٹنگ۔

گہری نظروں سے اس کے خطوط کو جانچا۔ لیکن گوتم کی تعریف کسی نے نہیں کی سب کو اچنبھا تھا۔

فنکاروں اور ذہن پرستوں کے حلقے میں اس کے متعلق زوردار بحثیں چھڑ گئیں۔ گوتم خاموشی سے سب کی سنتا رہا۔ خود کچھ نہ بولا وہ فلسفے کا راستہ چھوڑ چکا تھا اس لیے یہ نہ بتا سکا کہ خالص — جمالیاتی تجربہ دراصل کیا چیز ہے۔ کس طرح حاصل ہوتا ہے۔ کس طرح دوسروں تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ روپ اور اروپ بھاؤ اور ابھاؤ کے جھگڑوں کا فیصلہ کرنے والا کون تھا۔ وہ تو محض یہ چاہتا تھا کہ انسانوں کو، ان کے اسرار کو، پتھر میں مقید کرے۔ انسان جیسے وہ ہیں۔ ویدانت کے پرستار کی حیثیت سے اس نے سوچا کہ خالص جمالیاتی تجربہ غیر متعلق آنند ہے۔ بجلی کی طرح ہے۔ اکھنڈ ہے۔ اسے تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ خود ظاہر ہوتا ہے یعنی سوپرکاش ہے۔ جس طرح فن کار کا تصور وشواکرمن کے تصور میں شامل ہے۔ اسی طرح دیکھنے والا آتما یا خودی میں موجود ہے۔ جو ہمہ وقت دیکھتا ہے اور جس کا یہ روپ ساری کائنات کا مظہر ہے وشوا روپ۔ رودم رودم پرتی روپ۔ جمالیاتی لگن کا مکمل نمونہ وہ ہے جو دنیا کی تصویر کو محض خودی سمجھتا ہے جو خودی کی سطح پر بنائی گئی ہے۔ یہی خالص وجود ہے خالص راگ اور خالص حیات۔ دل کا نگار خانہ جہاں ساری تصویریں موجود ہیں سارے تخیل موجود ہیں جہاں پہنچ کر ساری شبیہیں ایک ہو جاتی ہیں۔ جہاں مختلف رنگین شیشوں میں سے ایک ہی روشنی گزرتی رہتی ہے اور ہر شے جو ڈھنگ سے بنائی گئی ہے اور سچائی سے بنائی گئی ہے مکمل فن پارہ ہے اور فن کار اور دیکھنے والا دونوں کے لیے یہ ایک ہی مارگ ہے اور سمجھنے والے، ودوان، پربودھ، اسے سمجھ سکتے ہیں۔

سدرشن یکشنی کی تخلیق کے ساتھ سنگتراشی کا ایک نیا مدرسہ شروع ہوا۔ سنگتراش کا فن خالص دنیاوی بناسان مجسموں میں شدید حقیقت پسندی تھی۔ یہ کدم اور پاٹلی کے درختوں کی پریاں اندرلوک کی دیوبالائیں دراصل ایودھیا اور شراوستی کی امیر زادیاں تھیں۔ گاؤں کی کسان لڑکیاں تھیں جو اصل زندگی میں پنگھٹ پر پانی بھرنے جاتی تھیں۔ ساون گاتی تھیں

کھیتوں کی نزاکتیں کرتی تھیں۔

سدرشن یکشنی کمر پر سے بل کھائے انداز میں کھڑی تھی۔ اس کی باہیں گداز تھیں۔ آنکھیں بہت بڑی بڑی اس کا جسم بہت مضبوط اور بہت سڈول تھا۔ یہ خطوط اور حجم کے توازن شانت اور لوچ اور حرکت کے احساس کا مکمل امتزاج تھا۔ اس انداز میں جان تھی اور حرکت اور قوت اور آزادی اور زندگی اور اطمینان کی شدید کیفیت۔ یہاں قید نہیں تھی۔ بندھن نہیں تھا۔ کلاکار کو بالآخر قید سے آزادی ملی تھی۔ اب اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کیا بنائے گا۔

اب سنگتراش راہب نہیں رہا۔ اُس نے خوبصورت۔ تندرست۔ مسکراتی ہوئی عورتوں اور مردوں کے پیکر تراشے۔ عورتیں جو دلآویز کاہلی اور آسائش کے احساس کے ساتھ کھڑی تھیں یا بیٹھی تھیں۔ ان کے چہروں پر افسردگی کہیں نہیں تھی۔ چہرے جو سوچ میں ڈوبے مسکرا رہے تھے۔ یہ بہت حقیقی بہت اصل بہت واقعاتی دنیا تھی۔ دنیا جو اُس پاس۔ چاروں اور دور دور تک پھیلی تھی اور کلاکار جس کی شکتی اسے سرسوتی کا چہیتا بناتی تھی۔ سکون سے زندہ رہنے کا خواہاں تھا۔

ایک روز گوتم اپنی چند نئی تصویریں لے کر کملیشور کے نگار خانے میں پہونچا۔ وہاں حسبِ معمول اس کے سارے دوستوں اور مخالفوں کا مجمع موجود تھا۔ اس گروہ میں اسے چند لیپی کار[1] اور پتی ویدک[2] بھی نظر آئے اور اسے ذرا تعجب ہوا۔ یہ سب ایک زمانے میں سیاست پر گفتگو کرنے کے لیے اس کی کٹیا میں جمع ہوا کرتے تھے۔ سب لوگ چپ چاپ کسی گہری فکر اور سوچ میں ڈوبے بیٹھے تھے۔ انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر خاموش رہے وہ چپ چاپ کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا اور نیچے بازار کی چہل پہل کو دیکھنے لگا۔

"تم کو نہیں معلوم۔" کملیشور نے بالآخر بات شروع کی۔

---

[1] و [2] رپورٹر

"کیا — ؟" گوتم نے پوچھا

"تم نے کچھ بھی نہیں سنا — ؟ آخر کس دنیا میں رہتے ہو ؟"

"کیا ہوا بتاؤ تو —"

باہر کسی نے کنڈی کھڑکھڑائی اور اکلیش داخل ہوا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور اس کے پیر گرد آلود تھے۔ معلوم ہوتا تھا وہ بہت دور سے بھاگتا ہوا آرہا ہے۔

"بھائیو" اُس نے آہستہ سے کہا "اپنا اپنا سامان سمیٹو اور فوراً یہاں سے بھاگ نکلو۔"

"کیوں — کیا ہوا" — گوتم نے سوال کیا۔

"مگدھ میں لڑائی چھڑ چکی ہے بھائی گوتم۔ چندر گپت کی فوجیں سارے دیس پر قبضہ کرتی ہوئی اس طرف آرہی ہیں۔ اب یہاں ہل چل جائیں گے میدانوں میں سکندؔ امینہ نے اپنا رقص شروع کر دیا ہے۔ اب تمہارا وقت ختم ہوا۔ موت جنگ کا نقارہ بجاتی تمہارے تعاقب میں آرہی ہے۔ موت جو روپ اور اروپ، بھاؤ اور ابھاؤ کے جھگڑوں کو مٹا دیتی ہے۔" اکلیش تھک کر چٹائی پر بیٹھ گیا اور اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا "راجن کھیدا سے واپس آرہے تھے جب وشنو گپتا کے سپاہیوں نے ان کے قافلے پر حملہ کر دیا سب کے سب مارے گئے۔"

"سب کے سب" گوتم نے لڑکھڑاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ سنا ہے۔ شہزادیاں نامی تیر کے پنچالوں کے علاقے کی اور نکل گئیں مگر سپاہی ان کے تعاقب میں ہیں۔"

"کیا چمپک بھی ماری گئی ہوگی — ؟"

"وہ کون ہے۔ ؟" اکلیش نے آنکھ کھول کر بڑی بے رحم آواز میں کہا "جنگ میں انسان نہیں رہتے صرف نام رہ جاتے ہیں۔" پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

ٹ جنگ کا دیوتا

"تم کہاں جاتے ہو بھائی اکلیش۔"

"میں لڑنے جا رہا ہوں۔ مگر شاید تم نہیں لڑو گے کیونکہ تم اہنسا کے قائل ہو چکے ہو"
اس نے اپنی چپلوں سے گرد جھاڑی اور اسی سکون سے باہر نکل گیا۔

جنگ۔ امن۔ خونریزی۔ اہنسا ——

وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کملیشور کو مخاطب کیا۔ "مجھے کوئی بتاؤ۔ تم سب کلاکار اور عالم جو یہاں موجود ہو۔ بتاؤ کس وقت لڑا جائے۔ کس وقت نہیں۔ کوئی ہری شنکر سے یہ پوچھنے جاؤ۔ جیو ہتیا کس سمے جائز ہے کب ناجائز۔" وہ کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگا۔ "بھائیو۔ مجھے نند راجہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں وشنو گپتا کو نہیں جانتا۔ چندر گپت سے میرا کوئی جھگڑا نہیں۔ یہ سب مل کر مجھے اپنی لڑائی میں کیوں گھسیٹتے ہیں۔ لیکن مجھے بھی دوسروں کو مارنا پڑے گا مجھے تو ان سب کی جانیں بہت پیاری ہیں۔ میں خود بھی زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ میں اب کیا کروں گا؟" کھڑکی کے پٹ سے سر لگا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

اس اثنا میں لوگ جو نگار خانے میں موجود تھے اپنے اپنے جوتے پہن کر باہر نکلنے لگے۔ ان کے جانے کی آہٹ پر گوتم نے آنکھیں کھولیں اور دیکھا کہ کمرہ سنسان پڑا ہے وہ ان کے پیچھے پیچھے برآمدے تک بھاگا اور زور زور سے چلّانے لگا۔ "ارے اپنی اپنی مورتیاں چھوڑ کر کہاں جاتے ہو۔ یہ ٹوٹ جائیں گی۔ بھائیو — بھائیو —"

لیکن دفعتاً نیچے بازار میں شور قیامت بلند ہوا۔ شہر پر جنگی رتھوں اور ہاتھیوں کی یلغار شروع ہو چکی تھی۔ پل کی پل میں سارا بازار رن میں تبدیل ہو گیا۔ ڈھول اور ہاتھیوں کی چنگھاڑ اور زرہوں کی سنسناہٹ اور تلواروں اور ڈھالوں کی جھنکار اور عورتوں اور بچوں کے رونے اور چیخنے کی صداؤں کے خوفناک بھنور میں اس کی اپنی آواز ڈوب کر رہ گئی۔ وہ سکتے کے عالم میں برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑا سامنے کا منظر دیکھتا رہا۔ بازار کی اینٹ سے اینٹ بج چکی تھی۔ اس کے چترکار ساتھیوں کی لاشیں سڑک پر ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ چانکیہ کے سپاہی بڑی صفائی سے لوگوں کی گردنیں اتارنے میں

مشغول تھے۔ گوتم کی نظروں میں اندھیرا چھا گیا۔ آخر وہ لڑکھڑاتے قدموں سے نگار خانے کی سیڑھیوں سے اترا۔ اس نے مرے ہوئے کملیشور کے ہاتھ میں سے تلوار نکالی اور خواب کے عالم میں چلتا، تلوار گھماتا۔ کیونکہ خود فنونِ جنگ میں طاق تھا، سڑک پر اتر گیا۔

گوتم رات گئے تک لڑتا رہا۔ اور آخر زخموں سے نڈھال ہو کر ایک گلی میں گر پڑا جہاں چاروں طرف اہلِ شہر کی لاشوں کے انبار لگے تھے۔

افق کے نزدیک شہر سے کچھ فاصلے پر جیت ون کی عمارت چپ چاپ درختوں میں چھپی کھڑی تھی۔ اس کا کلس اندھیرے میں مدھم مدھم یوں جھلملا رہا تھا جیسے اس سارے نقشے پر خاموشی سے ہنستا ہو۔

۱۴

وقت گزرتا جا رہا ہے۔ دیس پر اب مور کے نشان والے شہنشاہ کا راج ہے وہ جو دیس کی چترانت ریاست کا پہلا سمراٹ ہے۔ اتہاس پران میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ بادشاہوں کے نسب نامے لکھنے والوں کے قلم یہاں پہنچ کر رک گئے ہیں۔ یہ پر یہ ورشن نرمی چندر، انسانوں کا چاند جو پاٹلی پتر کے سنہاسن پر طلوع ہوا ہے۔

یہ شودرماں کا بیٹا۔ جسے گڈریوں نے پالا جسے چانکیہ نے ٹکسشلا میں پروان چڑھایا۔ اب نئی تواریخ لکھوائے گا۔ روایت کے زمانے ختم اور نندوں کے ننانوے کروڑ اشرفیوں کے خزانوں کے قصے خواب و خیال ہوئے۔

یہ عہدِ جدید ہے۔

چندر گپت بڑا زبردست بادشاہ ہے۔ اس کی سلطنت کا ڈنکا سارے عالم میں بج رہا ہے۔ اس کا پایہ تخت دنیا کے عظیم ترین شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی فوجی طاقت سے دوسرے ممالک خوفزدہ ہیں۔ اس کے ہزار ستونوں والے چوبی محل میں

دور دور کی سلطنتوں کے سفیر موجود ہیں۔ اس کے دربار میں ملیچھ[1] لوگوں کا ہجوم ہے ۔ دُور پچھم کے دیسوں کی سفید فام لڑکیاں محل میں نرتکیوں اور داسیوں کی حیثیت سے ملازم ہیں۔ سارا شہر دلہن کی طرح آراستہ ہے وسیع تماشا گاہ میں نیزہ بازی اور رتھوں کے مقابلے ہو رہے ہیں۔ سڑک پر سے سمراٹ کی سواری گذرتی ہے۔ جلوس میں موسیقار شہنائی اور تنکھ بجاتے ساتھ ساتھ جا رہے ہیں۔ چوراہوں پر رقص ہو رہا ہے۔ جھروکوں میں سے پھولوں کی بارش ہوتی ہے عوام جے شبد بولتے ہیں۔ اب گرام بھوجک ان سے زبردستی لگان وصول نہیں کرتا۔ اب وہ چوری اور بدامنی کی آفتوں سے محفوظ ہیں۔ ان کی خوشحالی میں اضافہ ہوا ہے۔

کیونکہ وشنو گپتا جس کا دوسرا نام چانکیہ ہے جس کا دوسرا نام کوٹلیا ہے۔ جس نے مہا پدم نند کو اپنی سیاست سے شکست دی۔ وہی وشنو گپتا مشیر سلطنت ہے۔ (اور شاکیہ منی نے کہا تھا کہ فتح نفرت پیدا کرتی ہے۔ کیونکہ مفتوح دکھ کی نیند سوتے ہیں۔ لیکن فتح و شکست سے بلند، شانت آدمی سکھ میں رہتا ہے)

لیکن ہر فتح یا شکست تاریخ کے راستے پر ایک موڑ ہے جس کی وجہ سے دنیا کسی نہ کسی طرح آگے بڑھتی ہے۔ اس فتح کے بعد سے عوام پہلی بار قومیت کے تصور سے دوچار ہوتے ہیں۔ ان کو ایک مبہم سا احساس ہوا ہے کہ وہ ایک قوم ہیں جو بہت سارے قبیلوں اور ذاتوں اور خاندانوں سے بلند تر ایک اور شے ہے وہ ایک ایسی قوم ہیں جنھوں نے چندر گپت پریہ درشن کی قیادت میں ایرانیوں اور یونانیوں کو اپنے دیس سے نکال باہر کیا ہے۔

وشنو گپتا ٹکسشلا کا برہمن۔ اپنے سیاسی تصورات کو اب عملی جامہ پہنا رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ نیکی کا سیاست میں بدلہ نہیں ملتا۔ سیاست میں جرائم کی بھی سزا نہیں دی جاتی۔ جزا اور سزا کے مسئلے کو اس نے دھرم شاستر والوں کے لیے چھوڑ دیا ہے۔

---

[1] دوسری زبان بولنے والا غیر ملکی۔

وہ کہتا ہے سیاست میں صرف غلطی سے احتراز کرنا چاہیئے۔ ریاست کی بہتری شخصی فائدے سے برتر ہے۔

معدنیات، بازار، منڈیاں، نہریں، آبپاشی، شفاخانے، مالیات، تجارتی گودام، باغات، محصول، دیوانی، فوجداری، طلاق، شادی، وراثت کے قوانین، تعلقاتِ عامہ، امورِ خارجہ، دفاع، چراگاہوں اور قصاب خانوں کے اس نے الگ الگ محکمے قائم کیے ہیں۔ سارے میں جاسوسی کا جال پھیلا دیا گیا ہے جو برہمن اپنے علم کے ذریعے روزی نہیں کما سکتے اور ناکام سوداگر، حجام، نجومی، نوکر چاکر، طوائفیں اور کسان ہر شخص اپنی قابلیت کی بدولت جاسوسی کے محکمے میں شامل ہو سکتا ہے سادھوؤں کے بھیس میں ادھر اودھر گھوم کر جاسوس چندر گپت کے تخت و تاج کی حفاظت میں جٹے ہیں۔ بغاوت کا پتہ چلاتے ہیں۔ ویشیاؤں کے گھروں اور قمار خانوں میں جا کر عوام کے خیالات سے باخبر رہتے ہیں۔ جرائم کی بیخ کنی کے لیے بھیدی کا کام کر رہے ہیں۔ سارے میں امن قائم ہے۔ منو نے کہا تھا جہاں سیاہ فام سُرخ آنکھوں والی ڈنڈ مجرموں کو ختم کرتی زمین پر گھومتی ہو وہاں کی پرجا تنگ نہیں ہوتی۔

یہاں بادشاہ ڈنڈ دھر ہے اور پرجا خوش ہے۔

پاٹلی پتر پر اتنی رونق اس سے پہلے کبھی نہیں آئی۔ نئی نئی عمارتیں بن گئی ہیں۔ آبادی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ زبان میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ مگدھ نام[1] پراکرت میں بدلتی جا رہی ہے۔ ناٹک اور موسیقی کے فنون اپنے عروج پر ہیں۔ گلی کوچوں سے گیتوں کی تانیں بلند ہوتی ہیں۔ کاریگر نئے نئے زیور گھڑ رہے ہیں۔ دور دور کے ملکوں کا سامان بازاروں میں فروخت ہو رہا ہے۔ بیراگی اور سپیرے گلیوں میں دوتارہ اور بین بجاتے پھر رہے ہیں۔ بہروپیئے منڈپوں کے نیچے سوانگ بھر رہے ہیں۔

ایک ناٹک منڈلی جو کاشی سے آئی ہے نئے نئے تماشے دکھا رہی ہے۔ ان

---

[1] شاکیہ منی کے زمانہ کی مگدھ کی عوامی بولی

ناٹکوں کا لیکھک پہلی بار پاٹلی پتر آیا ہے۔ لیکن اس کی شہرت اس سے پہلے یہاں پہنچ چکی ہے۔ اس کے بارے میں طرح طرح کے افسانے مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے وہ بہت بڑا گنی اور کلاونت ہے۔ ایک زمانے میں چترکار تھا اور مورتیاں بناتا تھا۔ نٹ[1] ہے بہت معرکے کا ناچتا ہے۔ نائک[2] ہے۔ غضب کی اداکاری کرتا ہے۔ بھرت منی کا سارا فن اس نے گھول کر پی رکھا ہے۔ برسوں برس اس نے ایودھیا کے گنی جنوں اور گندھرویوں کی سنگت میں گزارے ہیں۔ سارے سُر اس کے قابو میں ہیں۔ بڑے بڑے گائیک اس کا لوہا مانتے ہیں۔ پر تب بھی اسے چین نہیں پڑتا۔ سارے دیس میں گھوما گھوما پھرتا ہے۔ کسی ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھتا۔ کسی ایک فن کو اپنی پوری توجہ کا مرکز نہیں بناتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے بادل کی چھایا کو اپنی گرفت میں لینا چاہتا ہو اور وہ اس کے ہاتھ نہیں آتی۔

اس ناٹک کی بہت دھوم مچی ہے۔ سارا پاٹلی پتر ناٹک گھر کی اور امنڈا چلا آرہا ہے۔ خواتین کے رتھوں اور پالکیوں کا تانتا بندھا ہے۔ راج محل کی شہزادیاں۔ امیروں، وزیروں اور تاجروں کی بیٹیاں، انتظامی ملازمتوں کے افسروں کی بیبیاں سبھی رنگ برنگی ساریاں، زرنگار پٹکے اور سنہری کردھنیاں پہنے آآ کر ناٹک گھر کے ایوان میں بیٹھ رہی ہیں۔ بن بیاہی نوجوان لڑکیاں اس اداکار اور لیکھک کو دیکھنے کی بہت مشتاق نظر آتی ہیں۔ انھوں نے سن رکھا ہے کہ وہ بہت خوبصورت آدمی ہے اور خواتین کی ایک بری عادت یہ ہے کہ وہ کلا کی اچھائی یا برائی کے مسئلے کو کلاکار کی شکل و صورت سے گڑبڑا دیتی ہیں۔

سفید پردہ ایک طرف کو سرکایا گیا۔ منقش چوبی رنگ بھومی[3] کا عقبی پردہ کلسوں، پھولوں اور تصویروں سے سجا تھا۔ سازندوں کی روشن چوکی سامنے بیٹھی تھی۔ سنگیت کار لڑکیوں نے پہلو کے ستونوں سے برآمد ہو کر مہادیو کی استوتی[4] کی اور ان میں سے ایک لڑکی ٹولی سے

---

[1] رقاص [2] ایکٹر [3] اسٹیج [4] حمد

باہر آ کر کمر پر ہاتھ رکھے ایک طرف کو کھڑی ہو گئی۔ یہ لڑکی تمثیل کی نائکہ[1] تھی۔ اس کی لمبی چوٹی میں موتیا کا گجرا گندھا تھا اور اس کی طلائی کردھنی میں یاقوت جڑے ہوئے تھے۔

پھر پردیپ کی روشنی میں رنگ بھوم کے سفید روغنی تختوں پر وہ نمودار ہوا جس کا اتنی دیر سے سب کو انتظار تھا۔ اُس نے کیسری رنگ کے ریشمیں کپڑے پہن رکھے تھے اس کے کانوں میں کرن بھوشن جگمگا رہے تھے۔ وہ بڑی شان سے سر اٹھائے سامنے خلا میں دیکھتا باوقار انداز سے قدم رکھتا سامنے آیا اور چند لحظے تک سب کی طرف نظر ڈال کر اُس نے قاعدے کے مطابق نٹی[2] سے اس ناٹک کے موضوع کے متعلق مکالمہ شروع کیا۔ مجمع اس کی خوبصورت آواز سے مسحور ہمہ تن گوش رہا۔ سب ٹکٹکی باندھے اپنی اپنی جگہ پر ساکت و صامت گردنیں آگے بڑھائے اسے دیکھنے میں مصروف تھے۔

مکالمے کے دوران میں کسی بات پر زور ڈالنے کے لیے اس نے پہلے اپنا دایاں اور پھر بایاں ہاتھ ہوا میں بلند کیا۔

تماشائی چونک اُٹھے ان کے چہروں پر دکھ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ خواتین نے تاسّف کی شدت سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس خوبصورت اور انوکھے کلاکار کے دونوں ہاتھوں کی کئی انگلیاں کٹی ہوئی تھیں۔

گوتم نیلمبر کے سامنے ایک اور شہر تھا۔ تماشائیوں کا ایک اور ہجوم جو حسبِ معمول عقیدت اور محبت سے اسے دیکھ رہے تھے وہ سب کو تماشے دکھاتا تھا لیکن اس کا تماشا کسی نے نہ دیکھا تھا جس طرح رنگ بھومی کے عقبی پردے کے پیچھے ایک اور رنگ بھومی ہوتی ہے جو دیکھنے والوں کو نظر نہیں آتی۔

پاٹلی پتر کے یہ مہذب باوقار شہری جو ایوان میں بیٹھے اس کے مکالمے پر عش عش کر رہے

---

[1] ہیروئن [2] ایکٹرس

تھے۔ ان میں سے کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کیسی کیسی دنیاؤں کی سیاحت پر نکلا ہے۔ اس نے زندگی کے سارے تجربے کر دیکھے ہیں اور اب کچھ باقی نہیں۔ جن چیزوں سے اُس نے بچنا چاہا۔ جن باتوں کو اُس نے نظر انداز کرنے کی کوشش کی —— محض یہ سوچنا چاہا کہ زندگی محض خلا ہے یا محض روشنی یا محض تاریکی مگر یہاں محض کا وجود نہ تھا۔ وہ ماسوا کو اپنے راستے سے نہیں ہٹا سکتا۔ دُنیا قدم قدم پر اپنے —— ہر روپ میں اس کے سامنے موجود اس کا منہ چڑا رہی ہے۔ وہ جنگ کے خلاف تھا اور اس نے اپنی تلوار سے شراوستی کے معرکے میں مخالف فوج کے پانچ سپاہیوں کو قتل کیا پانچ انسان —— جو اس کی اپنی دنیا کے باسی تھے اسی کی طرح بولتے تھے گیت گاتے اسی کا ایسا دل و دماغ رکھتے تھے۔ وہ برہمچاری تھا لیکن برہمچاریہ کے سخت قوانین کو توڑ کر اس نے ایک لڑکی کو دیوانہ وار چاہا۔ اس کی سوچ کو منجمد کرنے کے لیے اس کے پیکر تراشنے کی خاطر اس نے کلا کی دُنیا میں پناہ ڈھونڈی۔ یہ بالآخر اس کی اپنی دُنیا تھی۔ خالی الفاظ اور سوکھے فلسفے کے مسائل سے بلند تر۔ یہاں رنگوں اور پتھروں کی سنگت میں وہ زندہ رہا۔ لیکن جنگ میں لڑتے سمے "دشمن" کی تلوار سے اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں قلم ہو گئیں۔

شراوستی کے بازار میں حملہ آوروں سے وہ دن بھر لڑا تھا۔ رات گئے تک لڑتا رہا تھا اور پھر نیزے کے ایک وار کی تاب نہ لا کر گر پڑا تھا جب اسے ہوش آیا اور اس نے سر اٹھا کر دیکھا کہ رات کی سیاہی آسمان پر سے مدھم ہوتی جا رہی ہے وہ زخموں سے چُور ہے اور اس کے ہاتھ لہولہان ہیں۔ اس نے لیٹے لیٹے بڑی مشکل سے اپنی ہتھیلیوں کو پھیلایا جو خون میں لت پت تھیں۔

تب اسے ایک اٹل حقیقت کا اندازہ ہوا۔ ہاتھ انگلیاں جو حسن کی تخلیق کے لیے بنائی گئی ہیں خون میں نہلا دی جاتی ہیں۔ کسی خاموش وِہار میں بیٹھ کر وہ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ کلاکار کی حیثیت سے انسان کا ہاتھ اس کے لیے بہت بڑی علامت تھی انگلیاں جو رقص کی مدراؤں کے ذریعے کائنات کے سارے اسرار ساری زندگی کے

معنی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ جو مکان بناتی ہیں۔ باغوں کو سینچتی ہیں۔ بانسری بجاتی ہیں۔ تھپک تھپک کر بچے کو سلاتی ہیں۔ آرتی کے لیے کدم کے نارنجی پھول چنتی ہیں اور دوسری حقیقت یہ تھی کہ انگلیاں تیر گری کرتی ہیں۔ نیزے ڈھالتی ہیں۔ دوسرے انسانوں کا اپنی گرفت سے گلا گھونٹتی ہیں۔

تب اس نے اپنی کٹی ہوئی انگلیوں کو دیکھا اور سوچا کہ یہ اس کے کرم کا پھل ہوگا اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ کرم کے فلسفے سے اسے بڑا سکون حاصل ہوا۔ اگر یہ فلسفہ میرے پاس نہ ہوتا تو میں سوچ سوچ کر دیوانہ ہو جاتا۔

ذرا سی سکت آنے کے بعد وہ اٹھا اور لاشوں کو پھلانگتا گلیوں کی دیواروں کا سہارا لیتا اپنے مکان کی سمت گیا۔ جہاں اس کی ماں تھی جو اس کے زخم دھوئے گی۔ اس کو اپنی گود میں سلائے گی۔

لیکن اس کا مکان سنسان پڑا تھا۔ یہاں وہ بیس سال بعد اس وقت پہنچا تھا۔ جب اس کے ماں اور باپ چند گھنٹے قبل لڑائی میں مارے جا چکے تھے۔

لڑکھڑاتا ہوا وہ شہر سے باہر آشرم کی سمت روانہ ہوا۔ جہاں ہُو کا عالم تھا۔ جھونپڑے خاموش پڑے تھے۔ گرو کی کٹیا خالی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ مہوے کے باغ میں داخل ہوا اور تالاب کی سیڑھیوں پر لیٹ گیا اس کے زخموں کے خون نے تالاب کے شفاف پانی کو ارغوانی کر دیا۔

ایک نوجوان گوالن نے جو ادھر سے گزر رہی تھی اسے سسکتا ہوا دیکھا۔ وہ گھبرا کر دوڑی ہوئی اس کے قریب آئی اس نے پانی سے اس کے گھاؤ صاف کیے اسے گلئے کا تازہ دودھ لا کر کھلایا

اور بجائے اس کے کہ وہ اس کا شکریہ ادا کرتا اسے بڑے زور سے ہنسی آ گئی۔

گوالن اسے اچنبھے سے دیکھنے لگی۔ کیسا انوکھا سپاہی ہے۔ میدانِ جنگ سے لڑتا مرتا ہوا آ رہا ہے اور ہنستا ہے۔

اس کو اتنی ہنسی آئی کہ اس کا جی چاہا کہ زور زور سے قہقہے لگائے ... اس وجہ سے

اُس نے ازراہِ مذاق بھی گوالن سے یہ نہ پوچھا کہ تمہارا نام سجاتا ہے یا نند بالا۔

کیونکہ اسے اس سمے ہری شنکر کے الفاظ یاد آچکے تھے ـــ " بھائی گوتم! ہر زمانے میں ہر موڑ پر تھیں کوئی نند بالا ملے گی۔ کوئی سجاتا۔ اور وہ نزدیک آ کر تمہاری خدمت۔ تمہاری پرستش کرنا چاہے گی۔ اب بھی وقت ہے آنکھیں کھول لو۔" یہ دوسرا تجربہ تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ عورت کی خدمت، اس کی پرستش کو ٹھکرانا خدا کا سب سے بڑا ناشکرا پن ہے۔ اُس نے آنکھیں نیم وا کر کے بڑے سکون اور بڑے اطمینان کے ساتھ گوالن کے کنگنوں کو چھُوا۔ پھر اس کے پلّو پر سر رکھ کر سو گیا۔

گوالن اسے اٹھا کر اپنے گھر لے گئی۔ جہاں وہ کئی دن ـــ جب تک اس کے زخم اچھے نہیں ہوئے اس کا مہمان رہا۔ یہ اس کا ہمسایہ گاؤں تھا لیکن اب اجاڑ پڑا تھا۔ گاؤں کے بہت سے باسی مہاراج چندر گپت کی فوج کے خوف سے بھاگ کر اِدھر اُدھر چلے گئے تھے۔ گوالن نے اسے روکنا چاہا لیکن ایک روز وہ چپکے سے اس گاؤں سے نکل گیا۔ نند بالا کہ یہی اس گوالن لڑکی کا نام تھا۔ بہت روئی لیکن وہ ندی پار کر کے بہت دُور پہنچ چکا تھا۔

رفتہ رفتہ ملک میں امن قائم ہوا۔ چندر گپت کی سلطنت مستحکم ہو گئی۔ گوتم گھومتا پھرتا کاشی جا نکلا۔ وہ عالم برہمن تھا۔ سوائے اپنے علم و فن کے اس کے پاس کوئی اور تجارت نہ تھی لیکن اسے فکر نہیں تھی۔ ودیارتھی برہمچاری کی حیثیت سے اسے ہمیشہ سے بھوکا رہنے اور سختی اٹھانے کی عادت تھی۔ اسے یہ دنجاروں کی ایسی زندگی بُری نہیں لگی۔ مگر اب وہ عالموں کی صحبت سے اور ان سے بحث کرنے سے بچتا تھا

کاشی میں ایک روز ایک ناٹک گھر کی نائیکا سے اس کی ملاقات ہوئی جو دیکھتے ہی اس پر ریجھ گئی۔ اس نے گوتم کو اپنی منڈلی میں شامل کر لیا۔

اپنی کٹی ہوئی انگلیوں سے وہ اب تصویریں نہیں بنا سکتا تھا۔ مورتیاں نہیں ڈھال سکتا تھا۔ ناچ نہیں سکتا تھا۔ صرف اداکاری کے ذریعے اپنا اظہار کرنے کا راستہ اس کے سامنے تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں اس نے ناٹک لکھے تھے۔ فن اداکاری کا مطالعہ

اس کی تعلیم کا ایک جزو رہ چکا تھا۔ وہ فلسفی، عالم، چترکار اب نائیک بن گیا۔

نٹ شاستر میں لکھا تھا کہ اداکار کے لیے ضروری ہے کہ اس کی آنکھیں طویل ہوں ہونٹ سرخ۔ دانت چمکیلے۔ اس میں وقار، تمکنت اور غرور ہونا چاہیے۔ اسے فنِ عروض فنِ خطابت اور فنونِ لطیفہ پر دسترس حاصل ہونی چاہیئے۔ گوتم میں یہ سارے وصف موجود تھے۔ یہ علم بحرِ ذخار تھا۔ اس کا رتبہ بلند تھا۔ اسے بھی رقص اور موسیقی کی مانند الوہی حیثیت حاصل تھی۔ کہا جاتا تھا کہ برہما نے اندر کی خواہش پر پانچویں وید کی حیثیت سے ناٹک قائم کیا۔ شیو اس فن میں دیوتاؤں کے استاد بنے۔ پاروتی نے اپسراؤں کو اپنی شاگردی میں لیا۔ وشواکرمن نے رنگ بھوم تیار کی۔ ایک مرتبہ گندھرو اور اپسراؤں نے ایک تمثیل میں ایک رشی کا مذاق اڑایا جس کی بددعا کی وجہ سے ان اداکاروں کو دیولوک چھوڑ کر دنیا میں آنا پڑا۔ یہاں بھی ان کے درجے میں کمی نہیں آئی۔ اداکار کُشی لو کہلاتے تھے۔ کیونکہ رام کے دونوں بیٹے خانہ بدوش مغنیوں کے بھیس میں اپنے باپ کے دربار میں پہنچے تھے۔

سارا عالم بہروپ سے خوش ہوتا ہے۔ گوتم ان روایتوں کے متعلق سوچ کر خیال کرتا۔ بہروپ ایک اور حقیقت ہے۔

ناٹک کا فن بہت ترقی یافتہ اور ہمہ گیر تھا۔ بھرت منی نے اس کے قوانین کی تشکیل کی تھی۔ انھوں نے اڑتالیس قسم کے نائیک اور پونے چار سو اقسام کی نائیکاؤں کی فہرست بنائی تھی۔ انھوں نے ہدایت کاری اور رنگ بھوم کی آرائش اور اداکاروں کے اوصاف کے متعلق تفصیل سے لکھا تھا۔ سکون اور توازن تمثیل کے لیے لازمی تھا۔ شدید المیے اور قتل و دہشت کے مناظر سے گریز کیا جاتا تھا تاکہ تماشائیوں کے ذہنی سکون میں خلل نہ پڑے۔

فراق تمثیل کا خاص موضوع تھا۔ گوتم نیلمبر نے بھی اس روایت کو قائم رکھا۔ فراق کے علاوہ اور کون سے موضوع وہ اپنے لیے منتخب کر سکتا تھا؟

ناٹیہ، نرتیہ اور نرت کے سام گیت میں اس نے خود کو سمو دیا۔ ایک روز ناٹک گھر

کی اس نائیکا نے اس سے کہا "میں نے سُنا ہے تم بہت اچھا ناچتے ہو۔ مجھے بھی سکھلا دو۔"

"تم کو سکھلا دوں —؟ تم کو ابھی اور سیکھنے کی ضرورت ہے۔" گوتم نے چڑ کر کہا "مجھے تو کچھ نہیں آتا جاتا۔" اس روز اس پر شدید بدمزاجی اور چڑچڑاہٹ کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ وہ سہم گئی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا "پتہ نہیں۔ لوگ کہتے ہیں انھوں نے تم کو خود ناچتے ہوئے دیکھا ہے۔"

"کون لوگ —" وہ پھر گرجا۔

"جانے کون۔ ایودھیا کے کچھ نٹ بتا رہے تھے ایک دفعہ انھوں نے جنگ سے پہلے کسی تہوار میں تمھیں ناچتے دیکھا تھا۔"

ایودھیا کے۔ گوتم کا دل ڈوب سا گیا۔ وہ یکلخت نرم پڑ گیا۔ اسے اس لڑکی پر ترس آیا۔ وہ اس بدلتی ہر ہمی طرح فریفتہ تھی — بے چاری۔ "کون لوگ تھے —؟" اس نے پھر کہا "کیا معلوم — ناٹک گھر میں دسیوں طرح کے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔" لڑکی نے ذرا بے پرواہی سے جواب دیا۔ "اچھا اب میں گھنگرو باندھتی ہوں۔"

وہ ادھا تانڈو کرتی رہی۔ وہ اسے دیکھا کیا۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

گھنگھروں کی آواز اس کے کان میں پہنچا کی۔ وہ ایک اور حقیقت سے دوچار ہوا۔ سارے نظام کائنات میں لے ہے۔ آفاق میں لے ہے اور ہردیہ برم[1] جو کائنات کا مرکز ہے۔ شوا اس میں ناچتا ہے۔ نرتکو کسی تخیلی خدا کا نام نہیں جو پہاڑوں پر رہتا ہو۔ وہ میرے اپنے دل میں موجود ہے۔ وہ جو تخلیق ہے اور تخریب بھی۔ جو بناتا بھی ہے اور بگاڑتا بھی ہے۔ جو وجود اور عدم وجود موت وزیست کا مکمل قانون ہے۔

اور ہر شے میں تال، لے اور سُر پنہاں ہے۔ تخلیق اور ارتقا اور بقا اور تخریب میں رقص ہے۔ روح کی تشکیل اور اس کی آزادی میں رقص ہے۔ برہما جس نے تخلیق کی ہے۔

---

[1] انسان کا دل

وشنو جو بقا ہے رُدر جو خاتمہ ہے مہیشور جس نے روحیں تشکیل کی ہیں۔ سدا شیو جو انھیں ان کے چکر سے نجات دلاتا ہے۔ یہ سب اس کے مختلف پہلو ہیں جو ذاتِ مطلق ہے جو ازلی اور ابدی رقاص ہے۔

اس ناچ کے رس اور بھاؤ انسان کی ساری ذہنی، دلی اور روحانی کیفیتوں کے عکاس ہیں اور آفاقی تصورات سے انھیں نسبت دی گئی ہے۔ شرنگار رس وشنو کا ہے۔ اس میں ان کے اوتار نٹور گردھاری ورندابن میں اپنی گوپ لیلا رچاتے ہیں۔ ویر رس کڑکتے گرجتے بادلوں کے سنہرے خدا اندر سے منسوب ہے۔ کرونا ترحم کا جذبہ ہے۔ یم سے اس کا رشتہ جوڑا گیا ہے۔ رُدر غیض کی کیفیت ہے۔ ہاسیا سفید رنگ میں ملبوس مزاح ہے۔ بھیانک رس کا رنگ سیاہ ہے۔ کال سے منسوب بھاسیہ شیو کے مہاکال روپ کی نیلی علامت ہے۔ ادبھت رس میں حیرت ہے

ان کیفیتوں کے اظہار کے لیے مکمل قوانین ہیں۔ ان کے لیے کس طرح کی اداکاری کی جائے۔ کیسے رنگ ہوں کیسے پس منظر کون کون راگ۔

میگھ، سری، ہنڈول، توڑی، چھایا، للت، شرنگار رس کے محبت کے راگ ہیں۔

گوری، سوم اور ویدکری ویر رس کے ساتھ گائے جاتے ہیں۔ رام کلی اور آساوری کرونا کے راگ ہیں۔ شنکرا ہاسیا کا نغمہ ہے۔

اداکار رقاص اپنے سر، اپنی آنکھوں، اپنی بھوؤں، اپنے بازوؤں اپنے ہاتھوں اپنی انگلیوں، اپنے پیروں، اپنے پورے جسم، سارے وجود کے ذریعے کائنات و زندگی کی کہانی سناتا ہے۔ آنکھوں اور انگلیوں اور بازوؤں میں آہنگ قائم کر کے ناچتا ہے۔ آنکھوں کے تین طرح کے اشاروں کی پینتالیس قسمیں ہیں۔ گردن کے نو مختلف اشارے ہیں۔ ہاتھوں کی مدراؤں کی چار قسمیں اور ہر قسم کی چوبیس علیحدہ علیحدہ شاخیں۔ ان گنت طرح کے لوچ اور جھکاؤ ہیں۔ جسم کی حرکات ایک سو آٹھ انداز کی ہیں جس طرح گایتری منتر ایک سو آٹھ دفعہ پڑھا جاتا ہے یا جیسے آرتی کے پردیپ

میں ایک سو آٹھ چراغ روشن ہوتے ہیں۔ اسی طرح نٹ راج کے ایک سو آٹھ مختلف ناچ ہیں۔

کاشی کی خوبصورت پاتر اس کے سامنے ناچا کی۔ اُس نے پیروں کی مختلف چالوں کا مظاہرہ کیا۔ یہ مور کی چال ہے۔ یہ ہرن کی، یہ ہاتھی کی، گھوڑے، شیر اور مینڈک کی۔ کودنے کے پانچ، قدم رکھنے کے دس۔ چکّر کاٹنے کے آٹھ انداز ہیں۔ ہاتھوں کی دو سو سینتالیس مدراؤں نے ساری کائنات کو سمیٹ لیا ہے۔ ساری کیفیات۔ احساسات خیالات۔ درخت۔ پھل۔ پھول۔ پرند۔ عہدِ عتیق کے شہنشاہ۔ انسانی رشتے۔ دیوی دیوتا۔ وشنو کے نو اوتار۔ چتر ورن۔ تاریخی ہستیاں۔ ساتوں سمندر۔ مشہور ندیاں۔ ساتوں طبقات ارضی۔ ساتوں طبقات سماوی۔ ان سب کا مدراؤں کی زبان سے بیان کیا جاتا ہے۔ المیہ اور طربیہ اداکاری کے سارے اتار چڑھاؤ پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ تال، لے اور گیت کا مکمل آہنگ ہے۔

یہ بھارت ناٹیم ہے۔

شیو کا ناچ۔ بھارت منی نے جس کے قوانین دنیا کے سامنے پیش کیے۔

کاشی کی رقاصہ بھارت ناٹیم ناچ رہی ہے جس طرح ایک مرتبہ چمپک ناچی تھی جس طرح جب تک تال اور لے اور سُر قائم ہے بھارت ناٹیم ناچا جائے گا۔

مگر میں نٹ راج کا ایک حقیر بندہ کبھی نہیں ناچ سکوں گا کیونکہ میں اپاہج ہوں۔

اس نے لڑکی کو غصے سے دیکھا جو ناچے جا رہی تھی۔ وہ خود شنکر نہیں تھا۔ وہ گوری بھی نہیں تھی۔ تخیل کا جادو ٹوٹ چکا تھا۔ تب اُسے یہ بھی معلوم ہوا کہ خواب زیادہ دیر تک قائم رہنے والی چیز نہیں۔

لڑکی ناچتے ناچتے اُکتا کر اُس کے قریب آ بیٹھی اور اداسی سے اُس کی شکل دیکھنے لگی۔ شاید وہ سوچ رہی تھی کہ میں اس آدمی کو کبھی نہیں سمجھ پاؤں گی۔ مگر کیا آدمی کو سمجھنا ضروری بھی ہے۔؟ کیا یہی کافی نہیں کہ وہ میرے پاس بیٹھا ہے اور کم از کم گزرتے ہوئے وقت کے اس حصّے میں میرا ہے۔؟

تمثیل گھر کی اس حسین لڑکی کا نام امبیکا تھا۔ یہ بڑی مشہور اداکار تھی۔ بڑے بڑے امیر زادے اور بانکے اس کے نام کی مالا جپتے تھے مگر وہ ریجھی بھی تو کس پر — ایک مفلس برہمن طالب علم جس کے ہاتھوں کی انگلیاں کٹی ہوئی تھیں۔

تب گوتم ایک اور حقیقت سے آگاہ ہوا۔ تم جس کو چاہو وہ تمہاری پروا نہیں کرتا اور جو تم پر جان دیتا ہے اس میں تمہارے لیے کوئی کشش نہیں۔ یہ بھی زندگی کا ایک ایسا تجربہ تھا۔ جو اس سے پہلے ہزاروں کر چکے تھے مگر اس کے لیے نیا تھا۔

امبیکا میں روپ وتی ہونے کے علاوہ وہ ساری خوبیاں اور ہنر موجود تھے جو ایک رقاصہ اور اداکار کے لیے لازمی تصور کیے جاتے تھے۔ وہ سنگیت کار تھی۔ شاعری کرتی تھی۔ پھولوں کو سجانے کا فن جانتی تھی۔ ضلع جگت کی استاد تھی۔ فن باغبانی تیر اندازی اور منطق کی ماہر تھی۔ اس کی آنکھیں بادام کی ایسی تھیں۔ اس کا رنگ خزاں کے پتوں کی مانند پیلا تھا۔ کستوری کی پنکھڑیوں کا غازہ چہرے پر مل کر کُم کُم اور کاجل سے آراستہ ہو نفیس مینا کاری کے گہنے پہن کے جب وہ تماشا گاہ میں نمودار ہوتی تھی تو چاروں اور تہلکہ مچ جاتا تھا۔

پر گوتم ان تمام اوصاف کے باوجود اس پر ملتفت نہ ہوا۔ وہ امبیکا کی منڈلی کے ساتھ سارے دیس میں گھوما۔ موریہ سلطنت میں خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ فنونِ لطیفہ کو زبردست مقبولیت حاصل ہو چکی تھی اب گوتم بھی امیر زادوں کے سے ٹھاٹھ سے رہتا شرابیں پیتا۔ نت نئی لڑکیوں پر ڈورے ڈالتا اور پھر فوراً ان سے اکتا جاتا۔ امبیکا اس کی پجارن۔ اس کی ان ساری بری عادتوں کے باوجود اس کی پرستش کیے گئی۔ وہ اس کی محبت کے جواب میں اس سے انتہائی بے رحمی کا برتاؤ کرتا اور اس کو دکھ پہنچا کر دل ہی دل میں خوش ہوتا۔

اب اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی۔ اس کی بدمزاجی اس کے اکل کھرے پن اس کے غرور اور اس کی عشرت پسندی کے قصے بھی مشہور ہو چکے تھے۔

یہ سب تھا مگر ایک خیال دل و دماغ پر برابر مسلط تھا۔ اس کی روح کی گہرائیوں میں

تان پورے کے سُروں کی طرح گونجتا رہتا تھا۔ چمپک — چمپک — چمپک —

اُس نے چمپک کی تلاش میں دور دراز کی یاترائیں کیں۔ شاید وہ زندہ ہو۔ مارے جانے سے بچ گئی ہو۔ شاید کسی پرانے مٹھ و بہار میں دکھلائی دے جائے۔ وہ شاکیہ منی کی بھکشنوں کی ٹولیوں کو غور سے دیکھتا۔ وہ ہر پنگھٹ، ہر بزاز کی دکان، ہر سنگیت منڈلی میں، ہر اس جگہ چمپک کو تلاش کرتا جہاں لڑکیاں جمع ہوتی تھیں مگر وہ کہیں نہ ملی۔

تب اُس نے تھک کے اپنی کھوج ختم کر دی اور انبیکا کی محبت کے آگے اپنی ہار مان لی۔ اب وہ صرف انبیکا کے ساتھ ہی رہتا۔ اس نے دوسری لڑکیوں کی طرف توجہ بھی کم کر دی۔ انبیکا کے ساتھ اس کی زندگی میں ایسا سکون آگیا تھا جو صرف ایک گرہست ہی کو میسر ہوتا ہے۔ بعض دفعہ وہ انبیکا کو افسوس سے دیکھتا یہ بے چاری کس لیے کیوں اپنا وقت خراب کر رہی ہے۔ بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب اس کے بال سفید ہو جائیں گے اس کی آنکھوں کے نیچے لکیریں پڑ جائیں گی۔ خوبصورت عورت کی اصل موت اس کا بڑھاپا ہے۔ بیوقوف انبیکا کیوں نہیں ان لوگوں کی طرف دیکھتی جو سچ مچ اس کی قدر کرتے ہیں۔

مگر برس اسی طرح نکلتے گئے۔ گوتم نیلمبر اب اڑتیس سال کا ہو چکا تھا۔ اس کے بھونرا ایسے کالے بالوں میں چاندی کے تار جھلملانے لگے تھے۔ وہ اب بھی اسی طرح ہنستا تھا۔ مشرقی ونگا کی شدید ملائم ململ اور قیمتی ریشم میں ملبوس اپنے منقش رتھ میں انبیکا کے ساتھ ہوا خوری کے لیے نکلتا تھا۔

آج وہ پاٹلی پتر میں موجود تھا اور حسب معمول تمثیل کے دوران میں انبیکا کے ساتھ مکالمہ ادا کر رہا تھا اور تماشائی اسے عقیدت سے دیکھ رہے تھے۔ تماشائی جو بہروپ کے عاشق ہیں جو اصل گوتم نیلمبر کو کبھی نہیں دیکھ پائیں گے۔

ؔ بنگال

١٦

خواتین نے تاسّف کی شدت سے اپنی آنکھیں بند کرلیں خواب پرست لڑکیوں نے حیرت اور دکھ سے اپنے دانتوں تلے انگلی داب لی۔

انھیں خواتین کی صفوں میں ایک طرف چمپک بیٹھی تھی۔ اُس نے نقرئی پھولوں والی اودے رنگ کی ریشمیں ساری پہن رکھی تھی اور اپنی سہیلی سے باتیں کرنے میں مصروف تھی۔

جب اُس نے نظریں اٹھائیں تو اسے گوتم نیلمبر نظر آیا۔ وہ لرز اٹھی اور اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی دُھند تیرنے لگی اور اس دھندلکے میں گوتم کا چہرہ اس کے سامنے جھلملاتا رہا۔

گوتم نے گرج کر کچھ کہتے ہوئے سامنے دیکھا اور تماشائیوں کے اس ہجوم میں اسے وہ دکھلائی دی۔ چند لمحوں تک اپنا مکالمہ فراموش کرکے وہ مبہوت اسے دیکھتا رہا پھر یکلخت اُس نے اپنی نظریں جھکا لیں۔

کیونکہ چمپک جو اودی ساری پہنے اس کے سامنے بیٹھی تھی جو اتنے انتظار، اتنی تلاش کے بعد اسے یوں اچانک نظر آگئی تھی۔ گوتم نے اسے اس وقت دیکھا جبکہ اس کی مانگ میں سیندور تھا اور پیروں میں سُرخ مہندی اور بچھوے اور اپنے چھوٹے سے بچے کو گود میں لیے تماشاگاہ کے فرش پر سہیلیوں کے ساتھ آلتی پالتی مارے اطمینان سے بیٹھی تھی۔

اور آن کی آن میں وہ دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ کیونکہ پہلے وہ مقدس تھی اب مقدس تر ہو چکی تھی وہ ماں تھی۔ اور اب یک بیک اس پر انکشاف ہوا کہ شکنتلا، دمینتی، ساوتری اور سیتا کیسی رہی ہوں گی۔ کیسی لگتی ہوں گی۔

اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ اتفاقات، حادثے، وقت کے انوکھے کھیل بھی بہت بڑی

حقیقت ہیں۔
وہ سنبھل کر پھر اداکاری میں مصروف ہو گیا۔

وہ آپ ہی آپ چپکے چپکے آنسو پیتی رہی۔ ایک شخص نے دنیا تیاگ دی پھر بھی اس کی یاد دل سے نہ ہٹا سکا۔ وہ ہری شنکر تھا۔ ایک شخص نے اس کی یاد سے بچنے کے لیے تیاگ کی بجائے دنیا میں پناہ ڈھونڈی اور پھر بھی بیراگی رہا۔ گو ظاہر میں مکمل دنیادار بنا۔ وہ گوتم نیلمبر تھا۔ وہ خود، وہ دکھیاری نہ دنیا تیاگ پائی نہ دنیا میں زندگی کی مسرتوں ہی کو حاصل کر سکی۔ یہ سب مایا کے کھیل تھے۔

اسے وہی کرنا پڑا جو عورت کی حیثیت سے اس کے بھاگ میں لکھا تھا اور جو غالباً اس کا فرض تھا۔ راجن کے قتل کے بعد اسے دوسری شہزادیوں کے ساتھ پکڑ کر پاٹلی پتر لایا گیا۔ ایودھیا کے راج گھرانے کی ساری لڑکیوں سے فاتحین نے شادیاں رچائیں۔ اس کا بیاہ بھی — چانکیہ مہاراج کے ایک افسر سے کر دیا گیا جو پچاس سالہ، موٹا، گنجا اور نہایت چالاک برہمن تھا جو مالیات کے محکمے میں ملازم تھا اور ہر وقت بناوے کے پھیر میں پڑا رہتا تھا۔

چمپک کا دھرم تھا کہ اس کی پرستش اور اس کی خدمت کرے کیونکہ وہ اس کا شوہر تھا اور وہ اس کی خدمت کرتی تھی جیسے پاٹلی پتر کی اور ہزاروں گرہستنیاں تھیں ان میں سے ایک وہ بھی تھی اس میں کوئی خاص بات نہ تھی اور اس کی گود میں اس کا بچہ تھا اور وہ اپنی سہیلی سے ادھر ادھر کی عام باتیں کرنے میں مصروف تھی۔ فلسفوں کے تذکرے کا وقت نکل چکا تھا۔

اس نے احتیاط سے اپنے آنسو پونچھے کیونکہ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ پتی ورتا عورت ہونے کی حیثیت سے اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

کچھ دیر بعد جب تمثیل کا پہلا باب ختم ہوا اور پردہ گرا تو اس نے آہستہ سے اپنی داسی کے کان میں کچھ کہا۔ داسی ادھر اُدھر دیکھتی سرعت سے باہر چلی گئی۔

۱۷

پہلے باب کے خاتمے پر گوتم بھی رنگ بھومی کے پیچھے سنگھار کمرے میں گیا جہاں دوسرے اداکار آآکر جمع ہورہے تھے۔

"ایک داسی تم سے ملنا چاہتی ہے۔" امبیکا نے آئینے کے سامنے اپنی مالائیں اتارتے ہوئے مڑکر اس سے کہا۔

"کون ہے۔" گوتم نے رسان سے پوچھا۔ اُس کی آواز میں سے ساری درشتی سارا چڑچڑاپن غائب ہوچکا تھا۔ امبیکا اس کی اس اچانک تبدیلی پر ہکا بکا رہ گئی۔ وہ کس قدر شانت معلوم ہورہا تھا۔ اس کے چہرے پر گہرا سکون تھا۔

"پتہ نہیں"۔ امبیکا نے ذرا ہکلا کر جواب دیا۔ "تم خود دیکھ لو—" اور پھر وہ اپنے ملبوسات اٹھا کر دوسری رقاصاؤں کی طرف چلی گئی۔

گوتم سنگھار کمرے کی سیڑھیوں پر آیا جو باہر باغ میں اترتی تھیں نیچے ایک سانولی سی خادمہ کھڑی تھی۔ اُس نے جھک کر گوتم کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور اس نے کہا "میری رانی نے یہ بھجوایا ہے اور تم کو پرنام کیا ہے اور کہا ہے کہ کیا تم جاتے وقت ان سے مل کر نہ جاؤ گے۔"

وہ ایک سیڑھی اتر کر نیچے آیا اور چند لمحوں تک گم سُم کھڑا رہا۔ پھر اس نے جواب دیا "نہیں — اپنی رانی سے کہو۔ جو جاگتا ہے اسے ایک دن نیند آجاتی ہے اور جو سوتا ہے وہ ایک روز جاگ اُٹھتا ہے۔ ان لوگوں کی طرف دیکھو جو برابر جاگتے رہتے ہیں — ان سے کہنا اب میں بھی جاگ رہا ہوں اور اب کوئی شے میرے راستے میں نہیں رُک سکتی — اور ان سے یہ بھی کہنا کہ کیا وہ بھول گئیں کہ پتی ورتا عورت کے لیے دوسرے مرد سائے کے سمان ہیں —؟ اب تم جاسکتی ہو —"

وہ چھاجھن بجاتی تمثیل گاہ کے اندر گئی اور چند لمحوں بعد واپس آگئی — اور اسے یہ دیکھ کر ذرا بھی تعجب نہ ہوا کہ وہ اب تک وہیں سیڑھیوں پر کھڑا تھا۔ اس نے قریب آکر

کہا: "میری رانی کہتی ہیں۔ تمھارا خیال ٹھیک ہے۔ اگر اب جاگ گئے ہو تو یہ بھی بہت اچھا ہے۔ دوسری بات کا جواب یہ ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ تم پتی ورتا کے معنی کیا جانو۔ لیکن ٹھیک ہے۔ کسی شے کو تمھارا راستہ روکنے کا کوئی حق نہیں ہے اب تم بھی جا سکتے ہو۔"

اتنا کہنے کے بعد وہ جلدی سے منہ پر گھونگھٹ کھینچ کر تماشائیوں کے ہجوم میں غائب ہو گئی۔ جو دوسرا باب شروع ہونے کے لیے اندر جا رہے تھے۔

تمثیل ختم ہونے کے بعد، گوتم، تماشائیوں پر نگاہ ڈالے بغیر رنگ بھوم سے باہر نکلا۔ سنگھار کمرے میں جا کر اس نے اپنے ریشمیں کپڑے اور گہنے اتارے۔ ایک سفید چادر کندھے پر ڈال کر ننگے پاؤں، وہ ہجوم کی نظروں سے بچتا تماشا گاہ سے باہر آگیا اور اس قدر تیز رفتاری سے شہر کے پھاٹک کی طرف بڑھنے لگا جیسے کوئی مجرم قید خانے سے نکل بھاگا ہو اور ڈرتا ہو کہ پہرے دار اسے پھر سے نہ پکڑ لیں۔ ہر طرف گہما گہمی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف سرایوں میں تیز روشنی جل رہی تھی۔ طعام خانوں میں سے کھنکتے قہقہوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ شفا خانوں میں مریض لیٹے موت کا یا تندرستی کا انتظار کر رہے تھے۔ بازاروں میں چاندی اور تانبے کے سکے کھنک رہے تھے۔ سوتی ساریاں پہنے مزدور عورتوں کی ٹولیاں کپڑا بننے کے سرکاری کارخانوں میں کام کر رہی تھیں۔ ہتھیار خانوں میں اسلحہ گھڑے جا رہے تھے۔ دریا کی بندرگاہ پر جہاز بن رہے تھے۔ چلتے چلتے وہ ویشیاؤں کے علاقے میں سے گزرا۔ جہاں ٹھگوں، جواریوں، مداریوں اور نقلی جادوگروں کے اڈوں پر جوا ہو رہا تھا۔ دور سے راج محل کے بلند کنگورے نظر آ رہے تھے۔

اس وقت سمراٹ اپنے دیوان خانے میں لیٹے چانکیہ مہاراج کے ساتھ چترنگ[1] کھیل رہے ہوں گے۔ یہ سوچ کر بھی وہ مسکرایا۔

۱؎ شطرنج

ایک ویشیا اس کے قریب سے اُسے بغور دیکھتی ہوئی گزر گئی۔ غالباً یہ بھی دوسری قابل وش ناریوں کی مانند جاسوسی کے محکمے میں ملازم تھی۔

سوال یہ ہے، چانکیہ مہاراج سے کوئی پوچھے، اس نے دل میں کہا، کہ کون کس پر جاسوسی کرے گا— وہ پھر مسکرایا۔

اب اندھیرا چھا رہا تھا اور تاروں بھرے آسمان کے نیچے فصیل کے برجوں میں پہرے دار للکار رہے تھے۔ وہ ایک پھاٹک کے قریب پہنچ کر ٹھٹک گیا۔ اس شہر پناہ کے چونسٹھ پھاٹک ہیں۔ کون سا پھاٹک میری منزل کے راستہ پر کھلتا ہے—؟

پہرے دار نے اسے کوئی غریب باعزت برہمن سمجھ کر خاموشی سے باہر جانے دیا وسیع خندق عبور کر کے وہ شاہراہ پر آ گیا جو پریاگ کی سمت جاتی تھی۔

سون ندی عبور کرنے کے بعد کئی دن تک وہ سرگرم سفر رہا۔ راستے میں اندھیرے جنگل پڑتے تھے اور ندیاں نالے، ندیوں کے کنارے ان گنت سادھو تپسیا میں مصروف تھے۔ ون پرستھ جو گرمیوں میں چلچلاتی دھوپ میں بیٹھتے، برسات میں بارش میں شرابور ہوتے، جاڑوں میں بھیگے کپڑے پہنتے تاکہ جسم کی تکلیف زیادہ ہو۔ اسے یاد آیا وہ بھی ایک بار ببول کے کانٹوں پہ سویا تھا پانی میں ایک ٹانگ سے رات بھر کھڑا رہا تھا۔

ون پرستھ کے بعد سنیاس کا دور آتا ہے۔ جب تارک الدنیا انسان مستقل سفر میں رہتا ہے۔ غالباً میرا ابھی یہی دور ہے— وہ زمانہ جس میں نہ موت کی تمنا رہتی ہے نہ زندگی کی۔ وہ چلا گیا۔ راہ میں شہر تھے، سرکاری کھیت، آشرم، مور پالنے والوں کے گاؤں، اس کا ٹھکانہ کدھر ہے۔

لیکن ڈرنے کی کیا بات تھی۔ وہ زمین کے ساتھ تھا۔ زمین اس کی ماں تھی، وہ اس کا ساتھ دے گی—

گھاس کی بھینی خوشبو، پتھروں کی خنکی اور مٹی کی قوت اس نے اپنے تلووں کے

پنچے محسوس کی اس نے بازو پھیلا کر ہوا کو چھوا اور آہستہ آہستہ دہرانا شروع کیا۔ زمین[1] تیری پہاڑیاں، برفانی پہاڑ اور جنگل مسکرا رہے ہیں۔ میں تیری سطح پر کھڑا ہوں۔ میں مغلوب نہیں ہوا۔ مجھے کوئی گزند نہیں پہنچا۔ مجھے زخم نہیں لگے۔ میں سالم ہوں۔ مجھے کوئی ختم نہ کر سکا۔

زمین تیرے اندر کیا کچھ ہے۔ تو جو بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے انسانوں کو اپنے اوپر لادے ہے، جس نے ہزاروں ندیوں کی صورت میں مجھے دولت عطا کی ہے کون گاؤں، کون جنگل، کون سبھائیں زمین پر ہیں، جہاں ہم تیری تقدیس کرتے ہیں۔۔ زمین مجھے ٹھکانہ دے۔۔ مجھے کہیں ٹھکانہ دے۔

اسے چلتے چلتے کئی دن گزر گئے۔ طرح طرح کے پودوں اور پھولوں کی ٹہنیاں اس کے راستے میں جھک جھک آئیں۔ پرندے اس کے ہمراہ سیٹیاں بجا رہے تھے۔ ساون کی بوندیں کنول کے پتوں پر جل ترنگ چھیڑ رہی تھیں۔

کھیتوں پر بادل جھکے کھڑے تھے۔ لڑکیوں کی چنریاں ہواؤں میں اڑ رہی تھیں۔

وہ ایک منڈیر پر کھڑا ہو گیا اور بھیگی آنکھوں سے اس نے اس منظر کو دیکھا۔ بڑھتی جاؤ۔۔ بڑھتی جاؤ، او جو کی بالیو۔۔ تاکہ ہمارے گھڑے بھر جائیں۔ طوفانوں سے محفوظ رہو۔۔ جو کی الوہی بالیو۔۔۔ سمندر کی طرح اتھاہ رہو۔ وہ سب امر ہیں جو تمہاری خدمت کرتے ہیں۔ تمہارے کھلیان امرٹ رہیں۔۔

اس نے چپکے سے اپنی پلکوں کو خشک کیا۔ پھر آسمان کی اور دیکھا۔ بادلوں میں سے ایک قطرہ ٹپ سے اس کی پلکوں پر آن گرا۔۔ جس طرح سیپی میں بہار کی بوندیں ٹپک جاتی ہیں۔۔

وہ منڈیر پر سے اتر کر پھر پگڈنڈی پر آ گیا اور سڑک پر چلنے لگا۔ افق پر سیاہ بادل گرج رہے تھے۔ وہ خوشی سے سرشار تھا۔ اس کے دل میں طوفانی دریا لہریں مار رہے

---

[1] یجر وید کی ایک حمد [2] رگ وید کی ایک اور حمد

تھے۔ اس کے دماغ میں سُریلے آبشار گیت گا رہے تھے۔ اس نے اندر کو اپنی بیعت میں کھڑا پایا۔ رُدرا اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ مسرت میں ڈوب کر اس نے بادلوں پر نگاہ ڈالی۔ ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ بوندیں پتّوں میں سے چھن چھن کر اس کے بالوں کو بھگوتی رہیں۔ بارش کے قطرے اس کے خوبصورت اداس چہرے پر جھرنے کی طرح گرا کیے — اُس نے آہستہ آہستہ رُدر کی تقدیس کی۔

رتھ بان کی طرح جو اپنے گھوڑوں کو کوڑے لگاتا ہے۔ وہ بارش کی آمد کی اطلاع دے رہا ہے۔ آسمان پر بادل امنڈ آئے ہیں اور دور سے شیروں کے دھاڑنے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ ہوا تیز ہے اور بجلی چمکتی ہے۔ پودے تیزی سے بڑھ رہے ہیں اور آسمان پر دُھند چھائی ہے۔ زمین پر بیج گرے ہیں اور زرخیز بارش سب کے لیے برسے گی۔ گرج اور دہاڑ۔ دہاڑ اور گرج۔ بیج بو۔ پانی کے زوردار چھینٹے اڑاتے رتھ میں اُڑتا ہُوا، برستا ہُوا آ، تاکہ جل اور تھل ایک ہو جائیں۔

رات بھر بارش ہوتی رہی۔ پھر صبح ہوئی اور بارش تھمی اور روشنی پھیلی۔ کنجوں میں شنکھ پھونکے جا رہے تھے۔ ندیوں کے کنارے برہمن اوشا کی حمد الاپ رہے تھے۔

روشنی پھیل گئی — برہمنوں نے کہا

ان گنت آنے والی صبحوں میں سب سے پہلی، گزری ہوئی صبحوں کے راستے پر چلتی ہوئی اوشا زندہ انسانوں کو اٹھا رہی ہے لیکن وہ جو مر چکا ہے اسے وہ اس کی نیند سے نہیں جگائے گی۔

تو جس کے رتھ میں اودے گھوڑے جتے ہیں۔ یہ وہت اور شاعر تیری تقدیس کرتا ہے — برہمنوں نے کہا۔

دولت مند لڑکی، آج کے دن ہم پر اپنا فضل کر۔ بہادر بیٹے، اور گائیں اور گھوڑے عطا کرنے والی اوشا، شاعر اپنی حمد وثنا سے

سے بلند تر آواز میں ختم کر رہا ہے۔

خداؤں کی ماں، جگمگائے جا اور ہمیں قوموں میں بلند ترین مرتبہ عطا کر — اور ایسا ہو کہ متّرا اور ورونا اور سِندھو اور زمین اور آسمان ہماری حفاظت کریں۔ برہمنوں نے کہا

گوتم ہوا کے نرم جھونکوں کی زد میں چلتا آگے بڑھتا گیا —

خداؤں کی ماں — جگمگائے جا اور ہمیں قوموں میں بلند ترین مرتبہ عطا کر۔

برہمنوں کی آواز اس کے پیچھے دریا پر پھیلتی گئی — وہ مندروں کی قطار کے سامنے سے گزر کر پھر جنگل کے راستے پر آ گیا۔

سامنے ایودھیا تھا۔

تب وہ بھیگی مٹی پہ دو زانو بیٹھ گیا اور اس نے دیکھا کہ چاروں اور خلا ہے اور اس میں ہمیشہ کی طرح وہ تنہا موجود ہے۔ دنیا کا ازلی اور ابدی انسان۔ تھکا ہوا۔ شکست خوردہ۔ بشّاش۔ پُر امید۔ انسان جو خدا میں ہے اور خود خدا ہے اور سامنے ایودھیا کا سنہرا شہر تھا۔ جو بارش کے دھندلکے میں یوں جگمگا رہا تھا۔ مانو سارا کا سارا سونے کا بنا ہو۔ اور اس میں سے جگہ جگہ کرنیں تیز کرنیں نکل رہی تھیں۔

پھر وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کی آواز میں یقین تھا اور شان اور غرور — اس نے اپنے خدا کو للکار کر مخاطب کیا۔ اس نے کہا —

خداوندا — تو جو آگ ہے، تو سُورج ہے، ہوا، چاند، ستاروں والا آسمان، تو برہما ہے۔ پانی ہے، پرجاپتی ہے۔

تو عورت ہے، تو مرد ہے، تو نوجوان ہے۔ تو لڑکی ہے، تو وہ بوڑھا ہے جو اپنی لاٹھی ٹیکتا لڑکھڑاتا ہوا جا رہا ہے، تو اپنے چہرے کا رُخ ہر سمت کیے پیدا ہوتا ہے۔

تو گہری نیلی مکھی ہے، تو سُرخ آنکھوں والا سبز طوطا ہے، تو طوفانی بادل ہے تو سارے موسم ہے، تو سمندر ہے۔

— دو پرند، چہیتے دوست، ایک درخت پر بیٹھے ہیں۔ ایک پھل کھا رہا ہے دوسرا اسے ٹکر ٹکر دیکھتا ہے۔ اسی درخت پر انسان بیٹھا ہے۔ اُداس، اپنی کم طاقتی پر متحیر۔ لیکن وہ جو دوسرے کو مطمئن دیکھتا ہے اور اس کی عظمت پہچانتا ہے۔ اس کا اپنا دُکھ ختم ہو جاتا ہے، جو رگ وید کی اس امٹ ہستی کو نہیں جانتا جس کے اندر خدا رہتے ہیں، رگ وید کا اسے کیا فائدہ ہوا —؟ وہ جو اسے جانتے ہیں مطمئن بیٹھے ہیں۔

وہ جو اسے پہچان گیا جو لطیف سے لطیف تر ہے، جس کے بہت سے روپ ہیں، جو شیو یعنی سرور ہے۔

اور جب روشنی بلند ہوتی ہے تو نہ دن باقی رہتا ہے نہ رات، نہ وجود، نہ عدم وجود۔ صرف شیو باقی ہے۔ وہ ابدی روشنی ساوتری کی ہے، جس روشنی سے عقل پیدا ہوئی۔ اس کا حسن دیکھا نہیں جاتا۔ اس کے جلال اور عظمت کی شبیہہ نہیں بن سکتی۔ وہ دل میں موجود ہے۔

تو جو پیدا نہیں ہوا۔ ان الفاظ کے ساتھ کوئی تھرتھر کانپتا تیرے نزدیک آتا ہے او رُدر میری حفاظت کر۔

وہ دُنیا میں تنہا پرندہ ہے۔ وہ آفتاب کی مانند ہے جو سمندر میں ڈوب چکا ہے انسان جو اسے جان جائے موت پر سے گزر جائے گا۔

کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ سفر کا نہیں۔

پھر اس نے آنکھیں کھولیں۔ اس کا جسم مرتعش تھا جس طرح تان پورے کے تار جھنجھناتے ہیں۔ اس کے قدموں کے نیچے پانی کے بہنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ نہر جو بے نیازی سے رواں تھی۔

پھر اسے لگا جیسے اُسے کوئی دور سے آواز دے رہا ہے۔ بارش کی وجہ سے دریا کا پاٹ بے حد وسیع ہو چکا تھا۔ اُس نے غور سے سُنا۔ لیکن آواز اس کے کانوں تک صاف نہیں آ رہی تھی۔ اس نے بہت غور سے، ماتھے پر ہاتھ کا سایہ کر کے دیکھنے کی کوشش کی اسے کچھ نظر نہ آیا۔ ندی کے دوسرے کنارے پر نارنجی پوشاک میں ملبوس۔

ایک ہیولے سا ڈول رہا تھا۔

تب اُس نے گھاٹ پر بیٹھی ہوئی ایک لڑکی سے پوچھا (اس لڑکی نے کیسری ساری پہن رکھی تھی اور اس کے بالوں میں چمپا کے پھول تھے) اس نے پوچھا "کچھ جانتی ہو۔ ندی کے اس پار کون رہتا ہے؟"

"کچھ بھکشو لوگ ہیں۔" لڑکی نے بے پروائی سے جواب دیا اور پیر دھونے میں مصروف رہی۔ "وہ ان میں سے ایک سامنے کھڑا تو ہے۔"

"تم اسے جانتی ہو؟"

"میں اسے جان کر کیا کروں گی ــــ؟" لڑکی نے حیرت سے پوچھا۔

"اچھا۔ ذرا میں اس سے مل آؤں۔"

"ایسی طوفانی ندی کو پار کرو گے؟ ــــ اس وقت تو یہاں کوئی ناؤ بھی نہیں ہے۔"

"کیا حرج ہے ــــ ندیاں پار کرنے کے لیے ہی تو ہیں۔"

موسم بے حد سہانا ہو چکا تھا۔ مور جھنکار رہے تھے، پپیہے چلّاتے تھے، بھنورے گونج رہے تھے۔ کدم کے بہت سے پھول ڈال سے ٹوٹ کر اس کے قدموں پر آن گرے۔ اس نے جھک کر پھولوں کو اٹھایا اور ندی میں بہا دیا۔ پھر وہ پانی میں کود گیا اور دوسرے کنارے کی طرف پیرنے لگا۔

دوسرے کنارے پر ایک ادھیڑ عمر کا بھکشو نارنجی پوشاک میں ملبوس، دیر سے اس کی راہ تک رہا تھا۔ گوتم کو اپنی اور آتے دیکھ کر اس کا چہرہ انبساط سے جگمگا اٹھا۔

وہ ندی آدھی سے زیادہ عبور کر چکا تھا تب اُس نے بھکشو کی آواز سُنی۔

"بھائی گوتم ــــ"

"ہاں بھائی ہری شنکر ــــ پہنچتا ہوں ــــ ٹھہرے رہو۔" اس نے زیادہ تیزی سے پیرنا شروع کر دیا۔

اتنے میں پانی کا ایک زوردار ریلا آیا جس کے تھپیڑے سے وہ کنارے کے بہت

قریب پہنچ گیا مگر اب پانی کی لہریں اُونچی ہو چکی تھیں۔ اُس نے پوری طاقت سے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے مگر پانی میں اس سے زیادہ طاقت تھی۔ اسی کشمکش میں اسے ایک چٹان ایسی نظر آئی جو پانی کے اُوپر جھکی ہوئی تھی۔ یہ چنڈی کے شکستہ مندر کا ایک حصہ تھا جو باہر کو جھک آیا تھا۔ اُس نے جلدی سے اس کی ایک کگر کو پکڑ لیا۔ اب وہ بہت تھک چکا تھا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ پتھر کو پکڑ کر اس نے ذرا کی ذرا آنکھیں بند کیں۔ وقت کا ریلا پانی کو بہائے لیے جاتا تھا۔ چاروں اور وسعت تھی لیکن پتھر کو اپنی گرفت میں لے کر اسے ایک لحظے کے لیے اپنی حفاظت کا احساس ہوا کیونکہ پتھر جس کا ماضی سے تعلق ہے۔ آنے والے زمانوں میں بھی ایسا ہی رہے گا۔

لیکن اس کے ہاتھوں کی انگلیاں کٹی ہوئی تھیں اور وہ پل بھر سے زیادہ پتھر کو اپنی گرفت میں نہ رکھ سکا۔

سرجو کی موجیں گوتم نیلمبر کے اوپر سے گزرتی چلی گئیں۔ ابوالمنصور کمال الدین نے کنارے پر پہنچ کر اپنا شیام کرن گھوڑا برگد کے درخت کے نیچے باندھا اور چاروں اور نظر ڈالی۔ اُس کی تھکی ہوئی آنکھوں کو یہ جگہ بڑی سہانی معلوم ہوئی۔ سامنے ندی بہہ رہی تھی۔ دور جھونپڑے بنے تھے۔ شوالوں میں سے گھنٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ برگد کے درخت کے نیچے کسی پیر کا مزار تھا۔ گاؤں کی عورتیں گھونگٹ کاڑھے آتیں اور مزار پر پھل پھول چڑھا کر آگے چلی جاتیں۔ اُس نے جھک کر پانی میں انگلیاں ڈبوئیں اور پانی کی خنکی اسے بہت اچھی لگی۔ پتھروں کے نیچے جہاں لہروں کا بھنور سا بنا تھا اس میں اسے اپنا چہرہ نظر آیا اور ایک لحظے کے لیے وہ متعجب سا ہو گیا۔ وہ یہاں آخر کیا کر رہا ہے جیسا اب تک نہ آئی تھی۔ اس نے دوبارہ ندی کی طرف دیکھا۔ شاید کشتی میں آتی ہو۔ مگر کشتی میں چند دیہاتی بھجن گاتے اپنی دھن میں مگن ایک سمت کو چلے جا رہے تھے۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر ایک جھاڑی پر پھیلی ہوئی امربیل کا ایک پتہ توڑا۔ کدم کی ٹہنی پھولوں سے لدی تھی چند پھول ٹپ ٹپ اس کے سر پر آ گرے۔ اُس نے پگڑی اتار کر ان پھولوں پر ہاتھ پھیرا اور اپنی تلوار کے منقش قبضے کو چھُوا۔ پھولوں کے

اس ہجوم میں تلوار بہت اسے بے تکی معلوم ہوئی۔ اس نے آہستہ سے تلوار کمر سے علیحدہ کر کے گھاس پر رکھ دی۔

جب پانی میں پیرتی ہوئی چمپا گھاٹ پر آ گئی۔

"ہم تو سمجھے تھے تم کہیں اور مارنے مرنے کے لیے چل دیئے —" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ابھی تک تو نہیں۔ پر اب شاید چلا جاؤں۔ کچھ عرصے بعد۔"

"کہاں۔" لڑکی نے گھبرا کر پوچھا

"بہار — اور اس سے بھی آگے۔ بنگال —"

"وہاں جا کر کیا کرو گے۔ یہیں رہو۔"

"وہاں میرے بھائی بند ہیں۔"

"جھوٹ مت بولو۔ تمہارے بھائی بند کہیں پہاڑوں میں لوٹ مار مچاتے ہوں گے۔ گوڑ کے دربار میں ان کا کیا کام۔"

"تم میرے بھائی بندوں سے بہت خفا ہو اور دوسری بات یہ کہ وہ لوٹ مار نہیں مچاتے۔ یہ ترکوں اور افغانوں کا مشغلہ ہے۔ میں عرب ہوں۔ میرا کام فلسفہ دانی ہے اور —" اس نے ذرا رک کر کہا "میری ماں ایرانی تھی اور ایران والے۔ او بیوقوف لڑکی، شعر کے پرستار ہیں، خون نہیں بہاتے۔"

وہ اسی طرح ہنستی رہی۔ اب وہ گھاٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھی اپنے بال سکھا رہی تھی۔

"ہنستی رہو — ایک روز زبردستی اڑا کر لے جاؤں گا۔ پھر بعد میں جو چاہنا کہنا۔"

"ہے ہے۔ ایسا اندھیر نہ کرنا۔ شکر کرو یہ گاؤں ہے جہاں تم سے بات کر لیتے ہیں تو کوئی بُرا نہیں مانتا۔ جونپور میں اگر اس طرح تم گھنٹوں ہم سے باتیں کرتے تو

دیکھتے اپنا حشر۔"

"جونپور میں تو میں تم کو قطعی بھگا لے جاتا۔ لے جا کر سیدھا اپنی حویلی میں بند کر دیتا۔"

"رام رام — کیسی باتیں کرتے ہو۔ جونپور میں ہمارا ایسا مہاتما سمان بادشاہ رہتا ہے۔ مجال ہے جو تم ایسی حرکت کرتے۔"

"اجی دیکھے ہیں تمہارے مہاتما سمان بادشاہ۔"

"کیوں۔ ایسے ایسے گیت بناتا ہے جو انسان اتنا بڑا سنگیت کار ہو وہ دیوتا نہیں تو اور کیا ہو گا۔ ایک روز بھیّن نے مجھے ایک بڑا پیارا گیت حسینی کانڑا میں سنایا تھا۔ بھیّن کہتے تھے کہ یہ سلطان کی سنگیت ہے۔ اسے خیال کہتے ہیں۔"

"اب تم موسیقی پر تقریر کرو۔ اور کل تم اپنے برآمدے میں بیٹھی کس کو حسینی کانڑہ سنا رہی تھیں؟ تم کتنے آدمیوں سے ملتی ہو—؟"

"تم کو اس سے مطلب۔ کمل جی تم اپنا رعب مجھ پر مت جھاڑو۔ صوبیدار ہو گے اپنی فوج کے ہو گے مجھ پر کاہے کی دھونس ہے۔"

"میں صوبیدار نہیں ہوں لاحول ولاقوۃ — ویسے سپاہی کا پیشہ ہی مرد کو سجتا ہے۔"

"قاتل کا پیشہ۔"

"پھر تم نے کمینی باتیں شروع کیں۔"

"اچھا اب نہیں کہنے کے۔ مگر ہو تم قاتل ضرور۔ جانے کتنی ماؤں کے بیٹوں کو اس تلوار سے مارا ہو گا۔ ہائے ہائے۔"

"پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ کتنی بار سمجھایا ہے کہ میں فوجی نہیں ہوں۔ سلطان کے کتب خانے کا نگراں ہوں۔"

"وہ کیا ہوتا ہے۔"

"اس میں کتابیں لکھی جاتی ہیں سنسکیں جنہیں سمجھدار لوگ پڑھتے ہیں۔ یہ جو ٹیڑھی میڑھی لکیریں تمہارا بھائی صبح سے شام تک چوکی پر بیٹھا بائیں سے دائیں طرف کھینچا کرتا ہے"

ان کی کتابیں بنتی ہیں سمجھیں۔"

"جانتی ہوں۔ مگر پھر یہ تلوار کیوں باندھتے ہو — یہ بڑی خوفناک چیز ہے —"

"چمپا رانی اسے مردوں کا زیور کہتے ہیں۔ اس کے اور پگڑی کے بغیر لباس مکمل نہیں ہوتا۔ تم اودھ والوں نے افسوس کہ چتوڑ اور قنوج اور مالوے اور بندھیل کھنڈ کے راجپوت نہیں دیکھے۔ دیکھے ہیں کبھی!۔ ایک میرا یار ہے اودے سنگھ راٹھور — قنوج کا راجپوت ہے۔ کیا بانکا آدمی ہے۔ آج کل جانے کہاں ہوگا۔ سنا تھا گوالیر کے کرت سنگھ کی فوج میں ہے۔ پتہ نہیں شاید مالوے میں کہیں لڑ بھڑ رہا ہوگا —" کمال الدین چند لمحوں کے لیے اپنے میدانِ جنگ کے ساتھیوں کی یاد میں ڈوب گیا۔" تم پورب والوں کا اس کے سوا اور کوئی مشغلہ نہیں کہ بس گائیں بجائیں گے پوجا پاٹ میں لگے رہیں گے ارے لڑکی زندگی کا اصل لطف تو میدانِ جنگ میں آتا ہے۔"

"ابھی تو تم کہتے تھے کہ مارنا مرنا خالی افغانوں کا کام ہے۔ تم کویتا لکھتے ہو —"

وہ جھنجھلا گیا۔ "تم عورتوں سے بحث کون کرے — اس نے امربیل کا ایک پتہ اور توڑا۔

"دیکھو۔" لڑکی گھاٹ پر سے اٹھی اور اپنے سیاہ لمبے بالوں میں سے پانی جھٹک کر ان کا جوڑا بناتے ہوئے بولی —" جنگ کی باتیں مت کیا کرو۔ میں جب تم کو دیکھتی ہوں اور یہ تلوار دیکھتی ہوں تو مجھے بڑا وہم آتا ہے۔"

"وہم — وہ کیا چیز ہے۔؟"

"تم کو سمجھانا بیکار ہے —" وہ پھر سیڑھی پر بیٹھ گئی۔

کمال الدین نے درختوں کے سائے کی اور دیکھا جو ڈھلتے جا رہے تھے۔

"اچھا چمپاوتی تم کو خدا کے حوالے کیا۔" وہ اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا۔

"ایو دھیا سے تم ابھی چلے جاؤ گے؟"

قریب سے درویشوں کی ایک ٹولی گزری — ان میں سے ایک نوجوان نے چمپا اور کمال کو دیکھا اور پھر نظریں نیچی کر لیں اور سر جھکائے آگے چلا گیا۔

"یہ بھی کیا مسخرے لوگ ہیں۔" کمال نے اظہارِ خیال کیا۔
"مسخرے نہیں ہیں۔ بڑے پیارے لوگ ہیں ان کا مذاق مت اڑانا۔" چمپا نے یکلخت غصے سے کہا۔ "ایک روز یہی لوگ تمھارا ساتھ دیں گے۔"
"تمھارے بھائی نے تم کو اچھی خاصی پنڈتائین بنا رکھا ہے۔ میں کسی روز اس سے مناظرہ کروں گا۔"
"وہ کیا ہوتا ہے۔"
"اس میں یہ ہوتا ہے کہ —" کمال الدین نے جاتے جاتے مڑ کر رکاب میں سے پیر نکال کر اسے سمجھانا شروع کیا کہ جیسے دو مذہب ہیں نا — ایک تمھارا — ایک میرا۔"
"میرا اور تمھارا کوئی الگ الگ مذہب ہے —؟ میں تو ایک ہی سمجھتی ہوں" پھر تم نے خرقہ پوشوں والی باتیں شروع کر دیں — "تو مطلب یہ" — اس نے پھر سمجھانا شروع کیا — "کہ دو فریق اپنے اپنے مذہب کی سچائی ثابت کرنے کی کوشش کریں اسے مناظرہ کہتے ہیں۔"
"سچائی ثابت کرنے والے ہم اور تم کون — وہ تو ستّیہ پیر ہے جو سب جھوٹ سچ کا فیصلہ کرتا ہے۔ کہے کبیر اک رام جپو ری۔ ہندو ترک نہ کوئی —"
"پھر تم نے تقریر شروع کی۔ تم کاشی جا کر اپنے کبیر کی چیلی کیوں نہیں بن جاتیں مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے میں اپنا وقت کیوں خراب کرتی ہو۔"
"کاشی تم کو بھی ساتھ لے جائیں گے۔ مگر اس سے پہلے تم کو اپنی تلوار اتارنا پڑے گی —"
"یہی شرط ہے —؟"
"بالکل یہی شرط ہے —!"
"تم کو تو جونپور کا قاضی ہونا چاہیے تھا۔ اچھا خدا حافظ —"
وہ دریا کی طرف بڑھا۔ "اس پار وہ ٹوٹے پتھروں کا اونچا ڈھیر ایسا کیا ہے —؟"

"وہ — ارے وہ تو بہت پرانے مندر کے کھنڈر ہیں — سینکڑوں ہزاروں برس پرانے —"

"اور اس کے ادھر وہ جھونپڑیاں ایسی ہیں ان میں کون رہتا ہے۔"

"ان میں بھی صوفی لوگ رہتے ہیں — بھگت —"

"تب تو تمھارا وقت بہت اچھا کٹتا ہوگا — صوفیوں کی سنگت — مسلے مسائل ذکر اذکار — ایک اٹھارہ سالہ لڑکی کے لیے کس قدر دلچسپ مشغلے ہیں۔"

"اور کیا کریں — تمھارے جونپور کی شہزادیوں کی طرح محلسرا میں بیٹھ کر شطرنج کھیلا کریں —"

"بالکل — لیکن میری محلسرا میں شطرنج کے علاوہ کتابیں بھی ہیں سینکڑوں — اور تم اس قدر عالم فاضل پہلے ہی سے ہو۔ میں تم کو عربی فارسی بھی پڑھا دوں گا —" وہ دفعتاً جھینپ کر سرخ ہو گئی۔ کمال نے اسے تبسم کے ساتھ غور سے دیکھا۔ "مگر تم عربی بولتی عجیب مسخری لگو گی — نہیں بھائی — تم چمپا وتی ہی رہو — تمھارے روپ میں میں نے عورت کا حسین ترین روپ دیکھا ہے — اچھا خدا حافظ۔" وہ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا۔

لڑکی کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ "تمھارا پڑاؤ یہاں ختم ہوا — اب کہاں جاتے ہو۔" اس نے آہستہ سے پوچھا

"بہرائچ — وہاں جانے کتنے دن لگ جائیں۔"

"بارشیں شروع ہونے والی ہیں۔ اپنا خیال رکھنا۔"

"ہاں۔ میں اپنا خیال رکھوں گا۔ خدا حافظ و ناصر بیوقوف لڑکی۔!"

وہ اسے بیوقوف لڑکی کہا کرتا تھا اور اس خطاب میں کتنا اتھاہ پیار چھپا تھا۔ وہ آنسو پی کر مسکرائی۔ کمال الدین نے گھوڑے کی باگیں موڑیں اور سڑک پر پہنچ کر غبار میں غائب ہو گیا۔

لڑکی گھاٹ پر سے اٹھ کر اپنے مکان کی طرف روانہ ہو گئی جس کی کھپریل پر نیلے پھولوں

کی بیلیں چڑھی تھیں اور جس کے سبز رنگ کے کواڑوں پر دیوی دیوتاؤں کی رنگ برنگی تصویریں منقش تھیں۔ برآمدے میں اُس کا بڑا بھائی چٹائی پر بیٹھا کبیر کی نئی بانی کاغذ پر نقل کر رہا تھا۔ اس کے قریب دو تین دوست اور بیٹھے تھے۔ دروازے کے طاق پر بھوانی کی چھوٹی سی مورتی رکھی تھی جس کے سامنے رکھی ہوئی دھوپ کی سپتلی سی لکیر لہراتی ہوئی اوپر اٹھ رہی تھی۔ چمپا نے دروازے کے قریب کھڑے ہو کر اس پُرسکون منظر کو دیکھا اور اپنے آنسوؤں کو خشک کرتی اندر چلی گئی۔

۱۸

بہرائچ کی چھوٹی سی آبادی میں پیلے رنگ کے کچے مکان ادھر اُدھر بکھرے تھے۔ خاک آلود راستوں پر سے بیل گاڑیاں گزر رہی تھیں اور اداسی کی بے رنگ، بے نام کیفیت سارے میں طاری تھی۔ سنا تھا کہ کسی زمانے میں یہاں ایک بے حد عظیم الشان شہر آباد تھا جسے شراوستی کہتے تھے۔ اس کے سوم ونشی بادشاہ بڑے جاہ و جلال والے تھے اور نجومیوں نے شراوستی کے سوہل دیو سے کہا تھا کہ ایک وقت آنے والا ہے جب اُتر سے دیوزاد و بلند و بالا ترک آ کر تمہارا خاتمہ کر دیں گے اور غزنی کے محمود کا ایک سپہ سالار ادھر آیا جس کا نام مسعود غازی تھا اور اس مسعود غازی نے سوہل دیو کا خاتمہ کر دیا۔ اور دلّی میں قطب الدین ایبک آیا اور اس کے سپہ سالار احمد بختیار نے کوشل دیس اور مگدھ اور بنگال کے سارے بت پرست بادشاہوں کا خاتمہ کر دیا۔

اور شراوستی اور نالندہ اور وکرم شلا کے سارے برہمچاری اور بھکشو اپنے اپنے پوتھی پترے وہیں چھوڑ کر ادھر اُدھر بھاگ گئے یا مر کھپ گئے یا نیپال اور تبت کی اور نکل گئے۔

لیکن جس طرح شاکیہ منی پچھلے دو ہزار سال میں وشنو کے اوتار بنا دئے گئے تھے اور مہایان بدھ مت کے مندروں میں ہزاروں دیوی دیوتا آباد ہو چکے تھے اور سارا بنگالہ اور سارا بہار تانترک منتروں اور دیبی تارا کے بھجنوں کی سُریلی آوازوں سے

گونج رہا تھا۔ اسی طرح بت شکن سالار مسعود غازی پچھلی دو صدیوں میں بالے میاں کے روپ میں کوشل دیس کے نواسیوں کے لیے ایک اور دیوتا بن چکے تھے۔ ان کے مزار پہ گھی کے چراغ جلائے جاتے۔ ان کے جھنڈے اٹھائے جاتے۔ ہر سال دھوم دھام سے ان کی بارات نکلتی۔

یہ کیسی عجیب باتیں تھیں۔

ابوالمنصور کمال الدین جو پہلی دفعہ بہرائچ آیا تھا، سالار مسعود کی زیارت گاہ کی دیوار سے لگ کر درخت کے سائے میں بیٹھ گیا اور اچنبھے سے عورتوں کی ایک ٹولی کو دیکھنے لگا جو ہاتھوں میں پیتل کی تھالیاں سنبھالے سامنے مزار پر چڑھاوا چڑھانے کے لیے آ رہی تھیں۔ یہ ہندو عورتیں تھیں۔

اور گو نالندہ اور وکرم شلا اور اجین اور امراوتی کے عظیم الشان بین الاقوامی دارالعلوم اب اجڑ چکے تھے اور شراوستی کے پرانے آشرم سنسان پڑے تھے اور ان پوتھی پتروں کو سمجھنے والا اب کوئی نہ تھا جو عجیب و غریب زبانوں میں لکھے گئے تھے اور عجیب و غریب باتیں ان میں لکھی تھیں۔ ناقابلِ فہم فلسفے اور عقل سے بالاتر الٰہیات۔

مگر کچھ لوگوں کو پیدائشی سنک ہوتی ہے اور کشمیر کے زین العابدین اور گوڑ کے علاؤالدین حسین شاہ کی طرح جونپور کا حسین شرقی بھی انہی سنکی لوگوں میں سے تھا۔ ان بادشاہوں نے مزید بت شکنی کے بجائے ان پوتھی پتروں میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔

حسین شرقی کو جب بھی دلی کے سلطان بہلول اور سلطان سکندر سے جنگ کرنے سے فرصت ملتی۔ وہ اپنا تان پورہ لے کر بیٹھ جاتا۔ راگوں کی دنیا کی نئی نئی سیاحتیں کرتا یا قدیم نسخوں کی ورق گردانی میں مصروف رہتا۔ پچھلے دنوں اسے ایودھیا کے چند پنڈتوں سے معلوم ہوا تھا کہ بہرائچ کے کسی مٹھ میں ڈیڑھ پونے دو ہزار سال پرانے سنسکرت کے کچھ تانبے پتر موجود ہیں۔ اس نے اپنے کتب خانے کے جواں سال نگران ابوالمنصور کمال الدین کو ان پنڈتوں سے ملنے کے لیے ایودھیا بھیجا۔

کمال الدین ایودھیا چند دنوں کے لیے گیا تھا لیکن اس کا وہاں اتنا جی لگ گیا کہ

اسے تقریباً یاد ہی نہ رہا تھا کہ اسے وہاں سے آگے ترائی کی طرف بھی سفر کرنا ہے۔ کیونکہ ایودھیا میں اسے انہی پنڈتوں میں سے ایک کی بہن نظر آئی جو چمپاوتی کہلاتی تھی۔

اپنے ویدانتی فلسفیوں کو چھوڑ کر سلطان کے حکم کے مطابق جن کی تلاش میں کمال ان کے پاس گیا تھا، سرجو کے کنارے رہنے والے یہ پنڈت لوگ ایک نئے "چکر" میں پڑے ہوئے تھے۔ اس "چکر" کا نام انھوں نے بھگتی رکھ چھوڑا تھا وہ لوگ دن رات نرگن رام، نرگن رام جیو رے بھائی کی رٹ لگایا کرتے۔ ان ہی کے یہاں کمال الدین شنکر اچاریہ اور ولبھ اور راما نند کے ناموں سے آشنا ہوا۔ اور اب وہ سب کے سب کاشی کے بھگت کبیر کے پیچھے دیوانے ہوئے جا رہے تھے لیکن کمال کو بھگت کبیر یا کسی اور بھگت یا سنت یا اچاریہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنے آپ کو فلسفی نہیں سمجھتا تھا۔ وہ مؤرخ بننا چاہتا تھا۔ اسے دُنیا کی قوموں کی تاریخ بڑی عجیب لگتی۔ سلطان نے اسے مختلف مبہم قسم کی تاریخیں لکھنے پر مامور کر رکھا تھا اور اس کا وقت بہت اچھا کٹ رہا تھا۔ لیکن اب سلطان کا حکم تھا کہ پنڈتوں کی مدد سے سنسکرت اور پالی اور پراکرت اور اردھ مگدھی میں لکھی ہوئی ان بے تکی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرے۔ یہ کام بھی زیادہ غیر دلچسپ نہ تھا۔ گو وہ جلد از جلد جونپور واپس پہنچنا چاہتا تھا۔ جہاں شاہی محل میں سلطان کی بھانجی رہتی تھی جس کے لیے اس نے بہت سی نظمیں لکھی تھیں اور جس کے تصور میں اس نے بہت سی چاندنی راتیں کتب خانے کی برجیوں میں بیٹھ کر جاگتے ہوئے گزار دی تھیں۔

لیکن ایودھیا میں اسے ایک برہمن زادی ملی جو اس سے ہر وقت کبیر کی باتیں کیا کرتی۔ اس سے اُلٹی سیدھی بحثیں کرتی اور کچھ عرصے کے لیے وہ جونپور کی شہزادی کو بھول گیا۔

اب وہ چمپاوتی ہی کے خیال میں کھویا رہتا۔ کیونکہ وہ بڑی انوکھی، بڑی نئی سی چیز تھی۔ ناجیہ اور ام رباب اور شہزادی سلیمہ بانو بیگم سے بالکل مختلف۔

مرد ہمیشہ تنوّع پسند کرتا ہے۔

پُرانی کتابوں کی جستجو میں وہ سارے مٹھوں میں گیا جو پانچ چھ سو سال قبل یہاں شنکر آچاریہ کے چیلوں نے قائم کیے تھے۔ شراوستی کے کھنڈروں میں گھوما جو بہرائچ کی بستی کے نزدیک سہت مہت کے علاقے میں پڑے سائیں سائیں کر رہے تھے اور جہاں دن میں الو بولتے تھے۔ اور رات میں چمگادڑیں اپنے پر پھیلاتی تھیں۔ ایک روز اسے انہی کھنڈروں میں پتھروں اور شہتیروں کا ایک بہت بڑا انبار نظر آیا جس کے چاروں طرف گلیاں تھیں۔ یہاں کبھی شاندار بازار رہا ہو گا اور اُونچی اُونچی حویلیاں بنی ہوں گی۔ وہ حیرت اور اشتیاق کے ساتھ اس عمارت کے اندر گیا۔ اس کے سارے کمروں میں گھوما۔ گودام، نشست کے ایوان جن کی دیواروں میں آتشدان بنے تھے۔ کوٹھڑیاں، غسل خانے، آنگنوں میں بنے ہوئے کنوئیں اور تالاب۔ مکان کے شمالی مشرقی حصے میں چھوٹا سا مندر تھا۔ جنوبی مشرقی کونے میں باورچی خانہ تھا۔ پندرہ سولہ کمرے سارے میں پھیلے تھے۔ چاروں طرف برآمدے تھے، اوپر کی منزل میں جھروکے بنے تھے۔ وسط میں آنگن کے گرداگرد جو برآمدہ تھا اس کے ستون ٹوٹے پھوٹے بکھرے پڑے تھے۔ ان ستونوں کے اختتام پر ہاتھی کے سر ترشے ہوئے تھے۔ یہ جانے کس کا مکان رہا ہو گا۔ کمال نے سوچا۔ پھر اس نے ایک دیہاتی کو آواز دی جو گھاس کا گٹھا سر پہ اٹھائے سامنے کی شکستہ گلی میں سے گزر رہا تھا۔ دیہاتی رک گیا اور اسے پُراسرار، سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ کمال کو ایک پھریری سی آئی۔ اس نے ہمّت کر کے حلق صاف کیا اور بولا ”اے بھائی — جانتے ہو یہ کس کا مکان ہے؟ یہاں کے راجا کا تو نہیں —“

”راجا کا —“ دیہاتی کھلکھلا کر ہنسا گویا بہت بڑا لطیفہ اس نے سنا ہے۔ ”ارے راجا کا مکنوا اتنا چھوٹا —؟ راجا کے محلوا پر تو ہل چل گیئن — ای تو ہجاروں برس پُرانی حویلی ہوئے — پرکھن سے سنے ہن ای ما کوؤ بابھن پروہت رہت رہے۔ ان کا لڑکوا ہو بڑا ودوان رہا —“

"اس لڑکے کا نام جانتے ہو۔؟"

"ہم کا جانی — ہم پنچ نام ناہیں یاد رکھت ہن۔ نام مٹ جات ہیں۔ کھالی کُھدائے[1] کا نام امر ہو —" اتنا کہہ کر وہ اپنا گٹھا سنبھال آگے بڑھ گیا۔

کمال کو بڑی جھنجلاہٹ محسوس ہوئی۔ سلطان کا فرمان ہے اس ملک کی تاریخ لکھو۔ ایسے ابدیت پرست لوگوں کی تاریخ کس طرح لکھی جا سکتی ہے جو اپنے نام یاد رکھنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے —

پھر اس نے مٹھ میں جا کر ایک پنڈت سے پوچھا — "کھنڈروں میں جو سب سے بڑا کھنڈر ہے وہ کس کا ہے —"

اس نے بھی کمال کو بڑی پر اسرار نظروں سے دیکھا۔ گویا یہ غیر ملکی عالم کیسا فضول سوال کر رہا ہے — "یہاں ان گنت چکرورتی راجہ ہو کر گزر گئے ہیں۔ چندر گپت موریہ اشوک پریہ درشن سمدر گپت۔ چندر گپت موریہ سے قبل یہاں بڑے بڑے چتر کار رہتے تھے اور سنگتراش اور لیکھک لیکن ان کے نام ہم کو معلوم نہیں۔ نام مٹ جاتے ہیں انسان زندہ رہتا ہے۔"

"لاحول ولاقوہ۔" کمال نے دل میں کہا۔ تاریخ لکھنا ناممکن ہے۔ ان تانبے پتروں کے مصنفوں کا نام بھی موجود نہیں تھا جن کا ترجمہ کروانے کے لیے وہ یہاں آیا تھا۔ وہ گھوم پھر کر اسی کھنڈر میں واپس گیا اور ایک ٹوٹے ہوئے ستون پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ اب کیا کرے۔

یکلخت اسے بغداد اور نیشاپور کی یاد نے بے طرح ستانا شروع کر دیا۔

۱۹

کمال اس ملک میں تازہ وارد تھا۔ اسے جونپور میں رہتے صرف چند سال گزرے تھے بائیس سال کی عمر تک اُس نے بغداد کے مدرسے میں بہت ساری کتابیں پڑھ ڈالی تھیں

[1] خُدا

بہت سے نظریوں پر غور و فکر کیا تھا۔ وہ بخارا کے ابن سینا، الفارابی اور ایران کے فخر الدین رازی اور اندلس کے ابن رشد اور ابن العربی کا مفصل مطالعہ کر چکا تھا۔ ابن خلدون کو وہ اپنا گرو سمجھتا تھا اور ارادہ کر رہا تھا کہ عرب اقوام کی تاریخ لکھنا شروع کرے ابن خلدون کے مکتب سے تعلق رکھنے والے چند مفکروں سے ملنے کی غرض سے وہ مغرب کی طرف روانہ ہونے والا تھا۔ جب قاہرہ میں اسے اطلاع ملی کہ اس کا باپ کا انتقال ہو گیا ہے۔ واپس لوٹا اور وہاں سے ایران چلا گیا۔ نیشاپور میں اس نے اپنے ایک دوست سے سنا کہ اہلِ سیف کے ساتھ ساتھ اہلِ علم بھی اب ایک نئے ملک کا رخ کر رہے ہیں جس کا نام ہند ہے۔ کمال نے اپنی محبوب کتابیں اپنے ساتھ لیں اور وسط ایشیا، کشمیر اور لاہور سے ہوتا ہوا تغلق آباد پہنچا۔

دنیا عجیب ہنگاموں کے دور سے گزر رہی تھی بلکہ کمال کو تو یاد تھا کہ تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں آیا جب بیچارے انسان پر کوئی نہ کوئی قیامت نہ گزری ہو۔ پچھلی صدیوں میں تاتاریوں کی یلغار نے ملکوں کو تہ و بالا کر دیا۔ عیسائی نسطوریوں اور ایران کے آتش پرستوں اور اندلس کے یہودیوں اور عرب کے مسلمانوں نے مل جل کر علم کا جو دھوم دھام سے چراغاں منایا تھا۔ وہ صحرائے گوبی سے اٹھنے والی زرد آندھیوں نے سارا کا سارا بجھا کر رکھ دیا۔ بنو امیہ کا دمشق، بنو عباس کا بغداد، عبدالرحمٰن کا اشبیلیہ —— آنکھوں کے سامنے کیسی کیسی تصویریں کھنچی تھیں۔ اس قیامت کے بعد بچا کھچا علم جو باقی رہا تھا وہ مسلمان اقوام کی آپس کی تفرقہ اندازیوں اور تنازعوں کی نذر ہوا۔ خیالات کا اتھنز جسے دوبارہ آباد کیا گیا تھا۔ بغداد کے ساتھ ساتھ اجڑا۔ اسکندریہ کی خانقاہیں سنسان ہو گئیں۔ صرف ایک خیال باقی رہا۔ دنیا ناپائدار ہے۔ دنیا فانی ہے۔ دنیا قابلِ نفرت ہے۔ فلسفہ اب محض شیعوں کا پیشہ سمجھا جاتا تھا اور شیعہ ہمیشہ بڑی گڑبڑ پھیلاتے تھے۔ ہر قسم کی نظریاتی اور سیاسی فتنہ پردازی ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ وہی لوگ اپنی بدعتوں اور تصوف اور آواگون کی ایسی خرافات میں لگے تھے اب سلجوق ترکوں کا دور دورہ تھا۔ ان جانبازوں کو نت نئے ملک تسخیر کرنے سے ہی

کہاں فرصت تھی کہ وہ فلسفے کی ریشہ دوانیوں میں اپنا سر کھپاتے۔ اور بہر حال وہ بھی راسخ العقیدہ کٹر سُنّی مسلمان تھے۔ عجمی شیعوں کی طرح بدعتی تھوڑا ہی تھے۔

عربوں کا ذہن، ایرانیوں کے فنونِ لطیفہ، تاتاریوں کے حملے سے سب کا خاتمہ بالخیر ہو چکا تھا مگر اس کے ایک سو سال بعد سمرقند اور ہرات میں پھر روشنی ہوئی۔ مصوّری میں چین اور ایران کے نقوش ہم آہنگ ہوئے۔ یہ تخریب پسند تاتاری، مغرب میں مسلمان ہوئے۔ مشرق میں انھوں نے بدھ مذہب اختیار کیا۔ سبکتگین کے دور میں کابل کے ہندو ترکی شاہیہ بادشاہ مسلمان ترکوں میں تبدیل ہوئے۔

گو انسان کو اب بھی چین نصیب نہیں تھا۔ محمود کے متعلق البیرونی نے کہا کہ ہندو اس کے حملے سے ریت کے ذرّوں کی طرح بکھر گئے۔ ان کی کہانی داستانِ پارینہ میں شامل ہو چکی ہے جو باقی ہیں وہ مسلمانوں سے شدید نفرت کرتے ہیں۔

جس طرح بغداد اور اسکندریہ تباہ ہوا تھا اسی طرح متھرا اجڑا اور نالندہ، قنوج اور اجین۔ یہ سب انسانوں کی بستیاں تھیں جن میں عام مرد اور عورتیں رہتے تھے اور جنھوں نے ان کو ختم کیا وہ بھی عام انسان تھے۔

مگر اس افراتفری، اس قتل و غارت، ان جنگوں اور معرکوں کے گرد و غبار کے پیچھے علم کے چراغ ٹمٹماتے رہے۔ کتابیں لکھی جاتی رہیں۔ درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ انسانیت کا چراغ کبھی نہ بجھ سکا۔

اور اسی خونریز دور میں جنوب کے پُرسکون ساحلوں پر خوبصورت کلیسا تعمیر کیے جا رہے تھے اور یہودیوں اور عیسائیوں کی شاداب بستیوں میں پھولوں کے تہوار منائے جاتے تھے اور عرب تاجروں کی آبادیوں میں ——— رات کے وقت قانون، عود، نے اور نفیر کی آوازیں بلند ہوتی تھیں۔ اور مہابلی پورم کے مندروں میں رقص ہوتا تھا۔

یہ لوگ بھی عام انسان تھے مگر امن سے رہنا جانتے تھے۔

انتشار اور بدامنی کے اس دور میں صوفیوں کی خانقاہوں میں علم محفوظ رہا اور

خرقہ پوش قلندر اب ایک ایک کر کے اس نئے ملک کی طرف آ چکے تھے اور آ رہے تھے جسے محمود نے تسخیر کیا تھا۔ ان قلندروں نے بنگال، بہار، اودھ، راجستھان، دکن اور گجرات سندھ اور پنجاب میں نئے دیہار آباد کیے۔

کیونکہ گو نالندہ اُجڑ چکا لیکن محمود یہ نہ جانتا تھا کہ خیالات کے صنم خانے ہمیشہ آباد رہیں گے۔

دنیا کا نقشہ بدل چکا تھا۔ قرطبہ کی مسجد میں عیسےٰ ابن مریم کے مجسمے سجا دیے گئے تھے۔ قسطنطنیہ کے کلیسائے صوفیہ کے میناروں سے اذان کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ تیمور چنگیز کا پوتا، ترچھی آنکھوں اور پیلی رنگت والا چغتائی ترک دلّی کو تہس نہس کر کے سمرقند واپس جا چکا تھا۔

شرقیہ سلطنت ہند میں تہذیب کا عظیم الشان مرکز بنی ہوئی تھی۔ جونپور شیرازِ ہند کہلا رہا تھا۔

اس سلطنت کو قائم ہوئے ابھی فقط ستّر سال گزرے تھے۔ صاحبقراں کے حملے کے بعد کی گڑبڑ سے فائدہ اٹھا کر ملک الشرق خواجہ جہاں نے اس کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس کے سلاطین اپنے آپ کو غیر ملکی نہیں گردانتے تھے۔ دکن کی بادشاہتوں کی مانند ان کی حکومت بھی خالص ہندی حکومت تھی۔ انھوں نے خوبصورت عمارتیں بنائی تھیں، گلاب کے باغ لگائے تھے۔ دور دور سے اہلِ علم آ کر جونپور میں جمع ہو رہے تھے۔

ابوالمنصور کمال الدین نے بھی دلّی میں چند روز ٹھہرنے کے بعد جونپور آ کر دم لیا۔

اس کے سامنے ایک بالکل نئی عجیب و غریب دنیا پھیلی ہوئی تھی۔ جونپور، کاشی، اجودھیا اور بہرائچ اور ان سب جگہوں کے مسلمان اس سے بالکل مختلف تھے۔ یہ لوگ جو بت پرستوں کے طریقے سے رہتے سہتے تھے۔ پشمینہ پوشوں اور جوگیوں کے ساتھ درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر گیت گاتے اور جھومتے تھے۔ ان کی عورتیں عبائیں پہننے کے بجائے عجیب طویل سی سفید یا رنگین چادر جسم سے لپیٹ لیتی تھیں اور ان کی آنکھوں میں

پچھلے چند سال سے اس کی زندگی سلطان حسین شاہ کے ساتھ یا میدان جنگ میں کٹتی تھی یا محفل چنگ و رباب میں۔ کتابیں اس کا اوڑھنا بچھونا تھیں لیکن حال و قال سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے امام غزالی اور ابن رشد دونوں کو اپنے اپنے حال پر چھوڑ دیا تھا اور مسلسل خانہ جنگیوں، بغاوتوں، سیاسی شورشوں اور بدامنیوں کے باوجود کہ یہ ہنگامے زندگی کا لازمی جزو تھے، وہ ناامید نہیں تھا۔ وہ ہر شے کو استعجاب سے دیکھتا۔ وہ بہت سے ملک گھوم چکا تھا۔ ہند میں آکر بھی اس نے اپنے سیاہ گھوڑے پر بڑی دور دور تک سیاحت کی تھی، ناموں میں، جگہوں میں، انسانوں میں جو اسرار تھا۔ اس نے اس کو ہمیشہ بہت مسحور رکھا۔ شیراز اور بدخشاں کے لالہ زار کاشغر، یا رقند اور بخارا کی گلیاں جن کی دیواروں پر چنبیلی گلابوں کی بیلیں جھکی ہوئی تھیں اور جہاں ترچھی آنکھوں اور لمبی لمبی چوٹیوں والی لڑکیاں رقص کرتی تھیں اور دریائے جیحون کا ساحل اور سنہرے بالوں والے ترکمانوں کی خیمہ گاہیں — شمال مغرب کے کوہستان جہاں یونانیوں، سیستانیوں، ترکوں، چینیوں اور ایرانیوں نے مل جل کر سنگتراشی کی ایک نئی دنیا آباد کی تھی اور پھر ہند کے جنوب میں مہاندی کے سرسبز کنارے اور آندھرا دیس، اور کیرالا، تامل ناڈ اور کورومنڈل کی ہری گھاٹیاں اور سلطنت وزیانگرم کے خوبصورت باغات اور لرزہ خیز مندر جن کے آنگنوں میں تاڑ کے درختوں کے نیچے بادامی آنکھوں والی دیوداسیاں ہیرے کی لونگیں پہنے بھارت ناٹیم ناچتی تھیں۔

خداوندا۔ کیسے کیسے لوگ تھے۔ کیسی کیسی قومیں، دنیا کتنی عجیب، کتنی دلکش، کتنی خوفناک، کتنی قابلِ قدر چیز تھی۔

ہند کتنا حسین ملک تھا۔

لیکن یہ بہر حال اس کا وطن نہیں تھا۔

اور گو اس کے بہت سے حصوں پہ مسلمانوں کی حکومتیں قائم تھیں لیکن بہر حال یہ مجموعی طور پر دار الحرب تھا۔ کیونکہ کافروں کی یہ بڑی زبردست آماجگاہ تھی۔

اور اگر یہ دار الحرب نہ بھی ہوتا تب بھی اس کا وطن نہیں تھا۔ یہ سامنے لہریں مارتی ہوئی

سرجو، بھلا دجلے کا کیا مقابلہ کر سکتی تھی۔ آم کے سائے میں وہ سکون میسر نہیں جو کسی نخلستان میں چشمے کے کنارے کھجور کے تلے بیٹھ کر الفارابی کے نظریات پڑھنے میں حاصل ہوتا تھا۔

گو آم بھی اپنی جگہ پر خوب درخت ہے۔

غریب الوطنی کے احساس نے اسے بہت رنجیدہ کیا۔ اُس نے کھنڈر کے ستون سے سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں۔ میں یہاں سے آخر واپس کیوں نہیں چلا جاتا۔ اس نے طے کیا کہ وہ جونپور واپس جا کر سلطان سے معذرت چاہے گا اور دمشق لوٹ جائے گا — دمشق — ؟ اسے یکلخت یہ نام بھی بے حد اجنبی سا لگا — وہ دمشق جا کر کیا کرے گا — نیشاپور میں اس کا کیا رکھا ہے۔ بغداد کو اس سے اب کیا واسطہ۔ یہ سوچ کر بھی اسے بڑا دکھ ہوا۔

اور کس قدر بے تکے لوگوں سے اس کا سابقہ پڑا ہے۔ اس نے ایک آنکھ کھول کر اس کسان کو دیکھا جو انگوچھا سر پر لپیٹے زور زور سے بارہ ماسا الاپتا بستی کی اور لپکا جا رہا تھا۔

وہ جس کے پس منظر میں سارا عبرانی تمدن تھا اور کلدانیوں اور فنیقیوں اور اسوریوں کی روایات۔ اور یونان تھا اور روم، اور مقدس سلطنت روم کی مشرقی مملکت جسے ورثے میں ملی تھی۔ اور عجم کے گلستان، اور نیل کے ساحل اور مغرب کے لامحدود پہاڑی سلسلے۔ وہ ایک بالکل مختلف کائنات تھی اور اس کائنات سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا جس میں سنا تھا کہ جوگی ہواؤں میں اڑتے تھے اور جہاں کامروپ کی ساحرائیں آدمیوں کو بکرا بنا دیتی تھیں اور جہاں بنگال اور بہار کے تانترک معبدوں میں لرزہ خیز جادو ٹونے ہوتے تھے اور جہاں گورکھ ناتھ کے چیلوں کے گورکھ دھندے عقل کو چکرا دیتے تھے۔

لیکن ابوریحان البیرونی نے اس ملک کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے تھے اور ضیاء الدین برنی کی تاریخ کمال نے پڑھ رکھی تھی جو فیروز شاہ کے زمانے میں لکھی گئی تھی۔ غزنی اور ہرات میں یہاں کی دولت کے متعلق کیسی کیسی حکایات مشہور تھیں

اور کتنی عجیب بات تھی کہ فلک کی گردش نے اسے واقعی اس بے تکے ملک میں لا ڈالا تھا جہاں یہ سارے روایتی ہیرے جواہرات وہ دن رات اپنی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔ اس نے بیجاپور اور گولکنڈہ کے درباروں کی جگمگاہٹ کا نظارہ کیا تھا۔ اس نے اس دیس کی حسین مہ جبیں عورتوں کو دیکھا تھا جو چلتی تھیں تو ان کے پاؤں کے زیور چھن چھن بولتے تھے۔ اس نے یہاں کی عجیب مدہوش کن موسیقی سنی تھی۔ غیر ملکی سیاحوں نے یہاں سے لوٹ کر بغداد میں اس سے تذکرہ کیا تھا کہ یہاں کے مرد شراب نہیں پیتے اور عورتیں وفادار ہوتی ہیں —

عورتوں کی وفاداری سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جس دنیا سے نکل کر وہ آیا تھا، جس دنیا میں وہ رہتا تھا۔ اس میں عورت اسی وقت داخل ہو سکتی تھی جب خود اسے عورت کی رفاقت کی ضرورت محسوس ہو۔ عورت کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ اس سے کسی قسم کی رفاقت کا مطالبہ کر سکے۔ عورت کی اپنی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

کمال نے عورت کو ہر روپ میں دیکھا تھا۔ سمرقند اور قاہرہ کے بازاروں میں بکنے والی کنیزیں، مالِ غنیمت کے طور پر حاصل کی ہوئی لڑکیاں، سلاطین کی حرم سراؤں میں مقید مہ جبینیں۔ عورت جو ہمیشہ ہر حالت میں مرد کی جائداد تھی۔ اس کے رحم و کرم پہ زندہ تھی۔ اس کی خوشنودی کے لیے جس کی تخلیق کی گئی تھی۔ اس کی اپنی کوئی رائے نہ تھی۔ کوئی تمنا نہیں۔ کوئی زندگی۔

مگر بہرحال خداوند تعالیٰ کی یہ مخلوق بہت دلچسپ چیز تھی۔ ایک حد تک زندگی میں اس کی اہمیت بھی تھی۔ مگر اس کے آگے اور بہت سی دنیائیں تھیں جن میں پہنچ کر عورت کا ساتھ چھوٹ جاتا تھا۔ مثال کے طور پہ ذہن کی دنیا۔ روح کی دنیا گو جذبات کی دنیا میں ایک حد تک کمال اسے شریک کرنے کے لیے تیار تھا مگر کسی گہرے جذباتی تجربے میں کسی عورت نے اب تک اس کی رفاقت نہیں کی تھی۔ کیونکہ دراصل یہ محض اس کا حق تھا کہ وہ مختلف عورتوں کو پسند کرے۔ وقتاً فوقتاً ان سے محبت کرتا رہے اس کی محبوبہ کو یہ حق کہاں سے پہنچتا تھا کہ وہ بھی اس سے وفا کا مطالبہ کرے۔ اس کا تو صرف یہی کام

تھا کہ گڑیا کی طرح سجی بنی بیٹھی پوجتی رہے۔ کمال جس زبان میں شاعری کرتا تھا۔ اس کی روایت تھی کہ شجاعت سورما اپنی محبوبہ کے لیے جان پر کھیل جاتے تھے۔ یہ بڑا اولا‌ؤریز تصور تھا۔ غزالی آنکھوں والی شہزادی سرخ گلاب کا پھول ہاتھ میں لیے الکبیر کے کنارے محل کے جھروکے میں بیٹھی ہے۔ جھروکے کے نیچے سورما شاعر رباب بجا بجا کر اسے اپنے خطرناک عشق کے نغمے سنا رہا ہے — یہ نغمے جو چاندنی راتوں میں وادیوں، اور پہاڑی راستوں پر گونجتے تھے اور جن کی گونج فرانس اور الپس کے اس پار تک پھیل چکی تھی — سورما شاعر محبوبہ کو اونچے سے ستون پر بٹھا کر اس کی پرستش کرتا تھا اور جب چاہتا تھا اسے اس ستون پر سے اتار دیتا تھا۔

اس اجنبی سے نئے ملک میں آن کر اس نے خدا کی خوبصورت بے زبان مخلوق کو ایک نئے روپ میں دیکھا۔ وہ تو خود ہاتھ میں رباب لیے محبت کے نغمے الاپ رہی تھی۔ رادھا بن کر کرشن کی پرستش کرتی تھی۔ لیکن یہ پرستش اتنی عظیم چیز تھی کہ اس کے قابل بننے کے لیے کرشن کو خدا کا درجہ حاصل کرنا پڑا تھا۔ وہ ہنستے ہنستے آگ کے شعلوں میں بھی کود جاتی تھی۔ اس کی وفاشعاری کی قسمیں بڑے بڑے ولی اللہ کھاتے تھے۔

کمال چپ چاپ کھنڈر کی سیڑھیوں پر بیٹھا سامنے کی اور دیکھتا رہا۔ اسے وہ ملہارسے نغمے یاد آئے جو چند روز پہلے اجودھیا میں چمپا نے اسے سنائے تھے۔ یہ نغمے بھجن کہلاتے تھے اور کرشن اور رام کی بھگتی کا ان میں تذکرہ تھا اور ان سے زیادہ سرشاری کی کیفیت اس نے پہلے کبھی کسی زبان کی شاعری میں نہیں دیکھی تھی۔ پچھلے تین سال میں اس نے جونپور کے شاہی کتب خانے میں رہ کر اس ملک کی مختلف بولیاں سیکھی تھیں۔ اسے اپنے ہفت زبان ہونے پر بڑا ناز تھا مگر وہ ان لوگوں کے دل کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ یہ بڑے عجیب لوگ تھے۔ بڑے انوکھے مرد اور عورتیں تھیں۔ ان کی تاریخ، ان کی روایات ان کے فلسفۂ کائنات کو سمجھنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

وہ اجنبی۔ اس پرانے دیس میں، سرد غیر مانوس پتھروں پر بیٹھا رات کے سایوں کو دیکھا کیا۔

۲۰

مدھم سی روشنی سارے میں پھیل گئی۔

پورنیما کا چاند کھنڈر کی ٹوٹی ہوئی چھت میں سے نیچے جھانک رہا تھا اور اس کی کرنوں نے سنگِ سرخ کے شکستہ فرش پر عجیب عجیب زاویے بنا دیے تھے۔ فرش پر طرح طرح کے مبہم نقش و نگار بنے تھے جن کو سینکڑوں برساتوں نے مٹا کر بعید مدھم کر دیا تھا — یہ ترشول، اور زندگی کا درخت، اور زمین کا کنول اور کائنات کا پہیا اور کنول کا سنگھاسن، اور آگ کا ستون — جانے ان انوکھی علامتوں کا کیا مطلب ان لوگوں کے ذہن میں رہا ہوگا — معنی کیا ہوتے ہیں۔ کمال حیرت سے ان نقوش کو دیکھ کر سوچتا رہا۔ باہر مہوے کے باغ پر ہولناک، ہلاکت خیز سناٹا منڈلا رہا تھا۔

اور پھر اس سناٹے میں عجیب و غریب آوازیں بلند ہونا شروع ہوئیں۔ ایسا لگا جیسے تاریک ویران گلیوں سے بھاری بھاری رتھ گزر رہے ہیں اور ان رتھوں پر زرتار چھتروں کے نیچے، کانوں میں سونے کے کنڈل پہنے اور دوشالے اوڑھے اجنبی انسان بیٹھے اسے جھانک رہے ہیں۔ اندھیرے میں ان کی آنکھیں فاسفورس کی طرح چمک رہی تھیں اور وہ بڑے خوفناک طریقے سے ہنستے تھے۔ اس کا منہ چڑاتے ہوئے گویا کہتے ہوں۔ دیکھو جس طرح ہم ختم ہوئے ہیں تم بھی نیست و نابود کر دیے جاؤ گے۔ اس کے سامنے ٹوٹے ہوئے دروازے میں چندرگپت نرلی چندر کھڑا تھا۔ انسانوں کا چاند — ہند کا سمراٹ۔ مگر وہ یہاں کہاں سے آیا۔ کمال نے لاحول پڑھی۔ وہ تو عیسیٰ کے پیدا ہونے سے تین سو سال پہلے ہی جہنم واصل ہوا تھا۔ کم بخت نے آخر دنوں میں جین سنیاسی بن کر اپنے آپ کو فاقے دے دے کر مار ڈالا۔ مگر وہ تو وہاں موجود کھڑا مسکرا رہا تھا۔ پھر اس کے پیچھے سے ایک اور آدمی نے اپنا سر نکالا — اور بندر کی طرح کود کر اس کے سامنے آگیا اور اس نے بڑے رسان سے اسے مخاطب کیا — دیکھو میرا نام اشوک ہے۔ اشوک پریہ درشن۔ میں سارے بھارت ورش کا شہنشاہ تھا اور جب میں مرا تو صرف ڈیڑھ آنولے

کا مالک تھا۔ اس نے مٹھی کھول کے آدھا آنولہ نکال کر اس کے سامنے پھینک دیا۔
اس کے بعد ان پلید روحوں کی یلغار شروع ہو گئی۔ وہ رتھوں پر سے اتر اتر کر سامنے میں پھیل گئے بندروں کی طرح شہتیروں سے لٹک گئے ستونوں پر جا چڑھے آنگن کے خشک حوض میں قلابازیاں کھانے لگے۔ ان سب نے مل کر باریک آوازیں کوؤں کی طرح کائیں کائیں شروع کر دی۔ وہ سب کمال کے چاروں طرف ناچ ناچ کر ایک ساتھ چلا رہے تھے۔
میں بھرت منی ہوں۔ میں نے رقص اور تمثیل کے قوانین بنائے تھے۔
میں تکشِلا کا وشنو گپتا ہوں میں نے ارتھ شاستر لکھی تھی۔
میں راجہ بھوج ہوں۔
میں محض گنگو اتیلی ہوں۔
اندھیرے آسمان پر بادل گرج رہے ہیں۔ میں کالی داس ہوں۔
میں قنوج کا راج شیکھر ہوں۔
مجھے بھبھوتی کہتے ہیں۔ میں کانیا کبج میں رہتا تھا۔ میں نے مالتی مادھو لکھا تھا۔
میں بھرتری ہری ہوں۔ میں نے کہا تھا کہ دنیا محض ایک رنگ بھومی ہے اور ہم سب اداکار ہیں۔ تم نٹ ہو۔ میں نٹ ہوں۔ ہم سب نٹ ہیں۔
مٹی کی گاڑی ہانکتا ہوا شدرک صحن سے باہر چلا گیا۔
پھر چھن چھن کرتی بہت سی چھل پائیاں ایک قطار میں آن کر کھڑی ہو گئیں اور اٹھلانے لگیں۔
ہم کشمیر، اڑیسہ اور آندھرا دیش کی رانیاں ہیں جو بڑی شان سے خود حکومت کرتے تھے۔
میں قنہر جادی راجیشری ہوں۔ میں نے اپنی بحثوں سے چین کے عالموں کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔
میں کمار دیوی ہوں۔

میرا نام پربھاوتی تھا۔ ہائے تم مجھ کو بھی نہیں جانتے؟
میرا نام ہرش نے رتناولی رکھا تھا۔ بے چارہ ہرش ــــــ

اپنا ذکر سن کر ہرش وردھن نے جو کان میں قلم اڑسے اب تک مراقبے میں محو تھا زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ ہم سری پرتھوی ولبھ کہلاتے تھے۔ اُس نے مقرر کی طرح ہاتھ ہوا میں بلند کر کے کہا۔ ۔

ہم جو گو یا دھن اور دھرتی کی دیویوں کے چہیتے تھے اور ہم سب کو ملیچھ ترکوں نے آکر ٹھکانے لگا دیا۔ ٹھکانے لگا دیا۔ ٹھکانے لگا دیا۔

اب بڑے زور سے تلواروں کی جھنکار گونجی اور ان کی چمک سے نیم تاریکی میں اجالا سا ہو گیا اور سر کٹ کٹ کر چاروں طرف گرنے لگے۔ ہم چندیلے راجپوت ہیں ہم بگھیلے ہیں۔ ہم پرمار سورما ہیں۔ ہم راٹھور ہیں۔ ہم چوہان ہیں۔ ہم آلہا ہیں۔ ہم اودل ہیں۔

سب نے مل کر ایک ٹانگ پر کود کود کر ناچنا شروع کر دیا۔ وہ سب چیخ چیخ کر آلہا اودل گا رہے تھے۔ اس قدر غل مچا کہ ابوالمنصور کمال الدین کا دماغ چکرا گیا وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اُفق پر صبح کی سپیدی نمودار ہو چکی تھی اور باہر مہوے کے باغ میں چند کسان آلہا اودل گاتے ہل کندھوں پر اٹھائے کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔

اُس نے گھبرا کر چاروں اور دیکھا اور اسے یاد نہ آیا کہ وہ کہاں ہے۔

یہ بہرائچ تھا اور وہ بت پرستوں کے زمانے کے ایک کھنڈر میں لیٹا ہوا تھا۔ اس کا شام کرن گھوڑا باہر ایک ستون سے بندھا ہنہنا رہا تھا اور بارش تھمی کھڑی تھی اور بڑی سہانی ہوا چل رہی تھی۔

اس نے دوبارہ لاحول پڑھی اور انگڑائی لے کر اٹھا اور فجر کی نماز پڑھنے کے ارادے سے آہستہ آہستہ قدم رکھتا ندی کی اور چل دیا۔

۲۱

دن بھر پنڈتوں کے ساتھ تانبے پتروں پر سر کھپانے کے بعد کمال مٹھ کے باہر گھاس پر

بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کل صبح سویرے وہ ایودھیا کی طرف واپس لوٹ جائے گا۔ معاً بارش کا قطرہ اس کے چہرے پر آن گرا۔ اُس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ افق پر گھنگھور گھٹائیں امنڈ کر اُٹھی تھیں۔ بہت جلد ندیاں نالے چڑھ جائیں گے۔ بند ٹوٹ جائیں گے جل تھل ایک ہو گا۔ کمال نے ایک چھپر کے نیچے جا کر بقچہ کھولا اور کچے فرش پر لیٹ گیا پھر اُس نے ایک زوردار انگڑائی لی۔ مدتوں بعد یہ پہلا موقعہ تھا جب کمال کو لگاتار تین چار مہینے بعد اطمینان کا سانس لینا نصیب ہوا تھا۔ شرقی سلاطین کی دلّی کے بادشاہوں سے مستقل جنگیں چھڑی رہتی تھیں۔ کمال کو کوئی دن ایسا یاد نہ تھا جب کسی نہ کسی نئے معرکے کی وجہ سے اس کے کتب خانے کے کام میں خلل نہ پڑتا ہو۔ پہلے سلطان محمد شاہ اور اس کے بھائی شاہزادہ حسین میں جنگ ہوئی۔ پھر شہزادہ حسین نے جونپور کا سلطان بن کر خود دلّی پر چڑھائی کر دی۔ ان معرکوں میں کمال سلطان کے ساتھ کالپی اور اٹاوے اور سنبھل میں مارا مارا پھرتا۔ مہینوں اُس نے بدایوں، کوئل، مارہرہ، شمس آباد اور برن کی خاک چھانی

برکھا شروع ہو چکی تھی۔ ندیوں اور جھیلوں پر بارش کی بوندوں کی ہلکی ہلکی دھند چھا رہی تھی۔ بہرائچ کے پورب میں راپتی بہتی تھی۔ پچھم میں سرجو رواں تھی۔ یہ دونوں ندیاں بڑی دور نیپال دیش سے نکل کر آئی تھیں اور کس بے پروائی سے اپنی منزل کی طرف رواں تھیں۔ یہ سامنے والی سرجو جو بت پرستوں کی نظروں میں بڑی متقدس تھی (یہ دریاؤں کا متقدس ہونا کمال کی سمجھ میں نہ آیا) اسی طرح گاتی گنگناتی کچھ آگے جا کر گھاگھرا سے مل جاتی تھی اور گھاگرا کے کنارے ایودھیا آباد تھا۔

جہاں چمپاوتی رہتی تھی اور بارش ہو رہی تھی اور اس وقت وہ اسی سرجو ندی کے کنارے کہیں کسی درخت میں جھولا جھولتی اور ساون گاتی ہو گی۔

کیونکہ کمال کو اچانک خیال آیا کہ لو ساون کا مہینہ آن پہنچا۔ یہ موسموں کا سحر ہر مہینے کے نام کے ساتھ اس کی اپنی کیفیت تھی۔ اپنے مناظر، اپنے رنگ، اپنے راگ۔ چند ماہ قبل ویساکھ تھی۔ سارے میں بسنت رُت چھائی تھی۔ پھر جیٹھ اور اساڑھ کا مہینہ آیا جب

ممواکے باغ میں لوئیں چلتی تھیں اور بیل درختوں سے ٹپ ٹپ گرتے تھے۔ پھر بھادوں آئے گا۔ پھر کوار اور کاتک۔ جب اداس چاندنی خنک زرد رنگ سارے میں گھول دے گی۔

یہ اس کا وطن نہیں مگر وہ کم از کم موسموں کے سحر سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔

اس نے پگڑی سر کے نیچے رکھ کر کروٹ بدلی اور معاً چمٹا بجنے کی آواز اس کے کان میں آئی۔ اُس نے کاہلی سے آنکھ کھول کر دیکھا ایک سادھو بارش سے بچنے کی خاطر چھپر میں آن بیٹھا تھا اور بڑے اطمینان سے دھونی رمانے میں مشغول تھا۔ کمال کی موجودگی کی اس نے کوئی پرواہ نہیں کی اور اپنی کھٹر پٹر میں لگا رہا۔ کمال اٹھ بیٹھا اور دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا۔

یہ موسم کا اثر تھا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ ساری دنیا کو، ان عجیب سادھوؤں کو، ان موروں اور گلہریوں کو ان چرواہوں کو جو جلدی جلدی قدم اٹھاتے جنگل میں سے گزر رہے تھے۔ ان سب کو گلے سے لگالے۔ خوب چلا چلا کر راون گائے۔ دنیا کتنی پُرسکون، کتنی آرام دہ تھی۔ وہ طوطے، یہ سادھو، وہ کسان جو مینہ سے پناہ لینے کے لئے بھاگے بھاگے چھپر کی اور آ رہے تھے۔ یہ سب اس کے دوست تھے، اس کے بھائی تھے۔ وہ ان سے علیحدہ کب تھا۔ ”جے رام جی کی —“ اس نے آہستہ سے کہا۔ اسے اپنی آواز سُن کر، اپنی زبان سے یہ الفاظ نکلتے پا کر خود بڑا تعجب ہوا۔

سادھو نے مسکرا کر آنکھیں اُوپر اٹھائیں۔ ”جے رام جی کی۔“ اس نے جواب دیا ”کہو سپاہی — کہاں سے آنا ہوا —“

”میں — سپاہی نہیں ہوں۔“

”سلطان کے آدمی تو ہو —“

”ہاں — مگر میں کتابیں لکھتا ہوں۔“

”اچھا۔“ سادھو نے اسی اطمینان سے جواب دیا اور پھر چمٹا اٹھا کر رام نام کا وِرد شروع کر دیا۔ گویا کمال کے ساتھ اس کا یہ مکالمہ بالکل ضمنی تھا۔

"بابا۔ تم یہیں رہتے ہو۔" کمال نے پھر بات شروع کی۔

"نہیں ۔ ہم تو جونپور کے رہنے والے ہیں "

"ارے"۔ کمال نے بے اختیار ہو کر خوشی سے کہا۔ "تب تو تم میرے ہم وطن ہو۔"

دوسرے لمحے اسے اپنے اس انجانے جذبۂ مسرت پر بڑا تعجب ہوا۔ ہم وطن؟ — مگر جونپور اس کا وطن کہاں تھا۔ وہ تو بغداد کا باشندہ تھا — اسے سخت جھنجلاہٹ محسوس ہوئی۔

نرگن رام — نرگن رام جپو رے بھائی — سادھو آنکھ بند کیے یکسانیت کے ساتھ بڑبڑا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے کمال کو خود ہی مخاطب کیا۔ "آج کچھ قلندر بالے میاں کے مزار کے لیے جھنڈے لے کر آپڑے سے ادھر آئے ہیں۔"

"اچھا۔"

"وہ کہتے تھے کہ ہمارے سلطان میں اور دلّی والے میں پھر ٹھن گئی — اب کی دفعہ ہمارا سلطان بچتا نظر نہیں آتا — مقابلہ بڑا کٹھن ہے — نرگن رام — نرگن رام۔" — اس نے پھر بڑبڑانا شروع کر دیا۔

کمال چونک کر اٹھ کھڑا ہوا اور سادھو کے قریب گیا۔

"کیا کہہ رہے ہو؟ — بابا پھر سے بتانا۔"

چھپر میں سات آٹھ کسان جمع ہو چکے تھے اور ان سب نے مل کر سادھو کے ساتھ رام نام کی رٹ لگانا شروع کر دی تھی۔ کمال کے سوال کا کسی نے جواب نہ دیا۔

وہ جلدی سے پٹکا کمر سے باندھ کر برستی بارش میں باہر نکلا اور سرائے کی طرف روانہ ہو گیا۔

سرائے کے برآمدے میں اودے سنگھ راٹھور اس کا منتظر تھا۔

"تم — تم یہاں کہاں —" کمال نے بھونچکا ہو کر اسے دیکھا۔ "تم تو گوالیر میں تھے"

"میں گوالیر ہی سے آرہا ہوں۔ میرے ساتھ چلو —— عالم پناہ نے تمہاری کھوج میں مجھے بھیجا ہے۔"

"مجھے کھوجنے اتنی دور آئے ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا ——"

"عالم پناہ بھی یہیں بہرائچ میں موجود ہیں اس وقت ——" اودے سنگھ نے کہا "تم یہاں گیان دھیان میں لگے ہو، اُدھر دنیا بدل چکی ہے —— سلطان بہلول نے تمہارے مالک پر راپڑی میں حملہ کر دیا۔ آؤ، یہاں بیٹھ جائیں تو میں تم کو سارا ماجرا سناتا ہوں" وہ بڑے اطمینان سے کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ جب اس پر حملہ ہوا تب وہ جمناجی پار کر کے ہمارے راجا سے مدد لینے کے لئے گوالیر آیا۔ ہمارے راجا نے اسے کمک پہنچائی میں اس کی فوجوں کو لے کر کالپی کی اور بڑھا —— گھمسان کا رن پڑا۔" اودے سنگھ نے خالص فوجیوں والی تفصیل سے سنانا شروع کیا۔ پھر وہ جھک کر تنکے سے برآمدے کے کچے فرش پر نقشہ بنا کر کمال کو سمجھانے میں منہمک ہو گیا —— "یہ دیکھو —— ادھر بہلول کی فوجیں ہیں ادھر ہم ہیں۔ بیچ میں جمنا میا ہیں۔ اب نہ ہم ندی پار کر سکتے ہیں نہ وہ —— سمے بیتتا جاتا ہے۔ تب ایک دن کیا ہوتا ہے کہ ترلوک چند سلطان بہلول کو ندی پار کروا دیتا ہے ——" پھر وہ ٹھٹھک گیا —— "ترلوک چند کو جانتے ہو؟"

"نہیں ——"

"بکسر کا حاکم ہے —— بکسر گئے ہو؟"

"نہیں ——" کمال جھلا گیا —— "اصل واقعہ بیان کرو۔"

"ہوتا کیا —— دلّی کی فوجیں برابر ہمارا پیچھا کرتی رہیں۔ ہم جونپور کی طرف لوٹے۔ ہاں بھی دلّی والوں نے ہمارا مقابلہ کیا۔ ہم جونپور کو خدا حافظ کہہ کر بہرائچ آ گئے —— تمہارا جونپور اب سنسان پڑا ہے۔ اس میں دن کے وقت اُلّو بولتے ہیں —— چلو میرے ساتھ۔" وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ "عالم پناہ نے کہا تھا۔ تم کئی مہینے سے یہاں ہو —— صبح سے تم کو ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔ مٹھ کے پنڈتوں سے تمہارا ٹھکانہ معلوم ہوا ——"

کمال نے تلوار کمر سے باندھی اور اُودے سنگھ کے ہمراہ لشکر کی سمت روانہ ہو گیا۔

جو راپتی کے کنارے ٹھہرا ہوا تھا۔
ادھر جدھر جیت وِن تھا۔

۲۲

بہرائچ سے وہ لوگ قنوج گئے جو کالندی اور گنگا کے سنگم پر آباد تھا وہاں بھی انھیں بہلول لودھی سے شکست کھانا پڑی اور بالآخر سلطان حسین تھکا ہارا بہار میں پناہ گزین ہوا۔

بہار —— یہ ایک نیا علاقہ تھا۔ ہرا بھرا۔ خوبصورت، جہاں سون ندی بہتی تھی جہاں چاندنی راتوں میں نالندہ کے دارالعلوم کے کھنڈروں میں عجیب دہشت پیدا کرتے تھے۔ یہاں ابوالمنصور کمال الدین سلطان حسین کے دوسرے وفادار امرا اور افسروں کے ساتھ بیٹھ کر منصوبے بناتا تھا کہ جونپور کی سلطنت دوبارہ کس طرح حاصل کی جائے۔
جونپور میں اب دلّی کا ایک شاہزادہ تخت پر بیٹھا تھا۔ سلطنتِ شرقیہ کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ شیرازِ ہند اُجڑ چکا تھا۔

ابوالمنصور کمال الدین، قاضی شہاب الدین جونپوری کا جانشین، مؤرخ، محقق، اب سیاسی سازشوں کا بھی ماہر ہو گیا۔ دن رات وہ سلطان کے ساتھ سر جوڑے بیٹھا رہتا کہیں سوچا کرتا۔ دلّی کے سلطان کو کس طرح زیر کیا جائے۔

اب سلطان بہلول مر چکا تھا اور اس کا خوبصورت اور شاندار بیٹا سکندر ہند کا بادشاہ تھا جس کی ماں کا نام ہما دتی تھا جو شرعِ محمدی کا بڑا پابند تھا جو اپنے باپ سے بھی زیادہ طاقتور بادشاہ تھا۔

بہار کے ان پناہ گزینوں نے سر دھڑ کی بازی لگا کر بساطِ جنگ پر ایک بار پھر پانسہ پھینکا۔

کیونکہ لڑنا مرنا ہار جیت ہی مردوں کے مشاغل ہیں ——
سلطان حسین اپنی جوڑ توڑ کے ذریعے کئی بار جونپور میں باربک شاہ کے خلاف بغاوت

کروا چکا تھا۔ اب کی مرتبہ اس نے جوکا سے مل کر ایک بڑی بغاوت کا منصوبہ بنایا کمال اس کا سفیر خاص تھا۔ دن رات وہ اپنے شیام کرن گھوڑے پر سوار ادھر سے ادھر سازشیں کرتا پھرتا۔

ایک رات منزلیں مارتا وہ جوکا کے گاؤں پہنچا۔ گڑھی پر جا کر اس نے آواز دی۔ جوکا اس وقت اندر پوجا میں مصروف تھا۔ اس کا جوان بیٹا چراغ ہاتھ میں اٹھائے باہر آیا۔

"کون ہو تم —" اس نے تشکک سے پوچھا۔ باربک شاہ خود کمزور تھا لیکن جب سے اس کا بڑا بھائی سلطان سکندر دلی کے تخت پر بیٹھا تھا پرجا اپنی جان کی خیر مناتی تھی۔

"میں سلطان کے پاس سے آیا ہوں۔"

"کون سے سلطان کے پاس سے۔"

"تمھارا سلطان! حسین شاہ —"

"آجاؤ — اندر آجاؤ بھائی —" نوجوان کا رنگ تبدیل ہو گیا — چراغ کی روشنی میں کمال نے اسے دیکھا۔ وہ اسی کا ہم عمر رہا ہوگا۔ وہ سیڑھیاں اتر کر تہ خانے میں اسے لے جاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ میرا نام ہری شنکر ہے۔ میں جوکا کا بیٹا ہوں۔ میں سلطان کے لیے اپنی جان لڑا دوں گا۔" وہ ایک زمین دوز کمرے میں داخل ہوئے جہاں بھوانی کی مورتی کے آگے مدھم سا دیوٹ جل رہا تھا اور دیواروں پر ڈھالیں اور تلواریں آراستہ تھیں۔

بھوانی کی مورتی اسے بڑی ڈراؤنی معلوم ہوئی لیکن اسے اس وقت یہ احساس تھا کہ وہ بھی اب اس دیس، اس ماحول کے اسرار میں مکمل طور پر شامل ہو چکا ہے۔

"اچھا سنو —" اس نے تخت پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا "تمھارے پاس کتنے ہاتھی ہیں۔ کدھر سے حملہ کرو گے۔"

دوسرے لمحے وہ دونوں نہایت تندہی سے جنگ کا نقشہ سوچنے میں منہمک ہو گئے ان میں سے ایک ہندو تھا۔ دوسرا عرب اور یہ دونوں افغانوں سے لڑنے جا رہے

تھے۔ ان کے درمیان قدرِ مشترک صرف ایک شے تھی۔ وہ دھاری خون آشام تلوار اور ایک دوسرے فریق کو ختم کر دینا ان کا واحد مقصدِ حیات تھا۔

چند روز بعد انھوں نے بغاوت کا علم بلند کیا اور سلطان سکندر ان کی سرزنش کے لیے جونپور پہنچا اور حسین شرقی کو دوبارہ شکست ہوئی اور سنگیت کا بادشاہ جس کی آدھی عمر راگ تخلیق کرنے کے بجائے میدانِ کارزار میں لڑتے بھڑتے کٹی۔ ایک مرتبہ پھر بہار کی طرف واپس لوٹا۔

اب کمال کا جی اچاٹ ہو گیا۔

اُس نے اس قدر خونریزی دیکھی تھی۔ اُس نے اتنے انسانوں کو قتل کیا تھا۔ اس نے اتنی بے بس عورتوں کو روتے دیکھا تھا۔ اُس نے سلطان حسین کے دربار کے امراء کو اس حالت میں سلطان سکندر کے سامنے جاتے دیکھا تھا کہ عمامے ان کی گردنوں میں رسیّوں کی طرح بندھے تھے اور وہ پا پیادہ قیدیوں کی مانند فاتح کے سامنے پیش کیے جا رہے تھے۔ یہ لوگ جو عالم، شاعر اور اہلِ قلم تھے اور ان کا فاتح بھی علم دوست اور شاعر تھا۔ لیکن کتابیں بے کار تھیں۔ علم فضول تھا۔ فلسفے بے معنی تھے۔

کیونکہ انسان کا خون ان سب چیزوں کے باوجود بہتا تھا۔ خداوندا! —— انسانیت کس طرح ساری کی ساری خون کے سمندر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ تاریخ سے اس کو جس قدر دلچسپی تھی، اب اتنی ہی نفرت ہو گئی۔ اس نے سلاطین کے نسب ناموں اور ان کے ادوار اور ان کی سلطنتوں کے واقعات کو بھول جانا چاہا۔

اس نے یہ بھی فراموش کرنا چاہا کہ سلطان کی بھانجی جنگی قیدی کی حیثیت سے اب دلّی میں تھی اور سلطان سکندر کے حرم میں داخل کی جا چکی ہو گی۔ اس کے دوست اودے سنگھ راٹھور نے اسے غیرت دلائی۔

"کیسے بے شرم ہو۔ تمھاری شہزادی دلّی میں ہے اور تم بہار میں چین سے بیٹھے ہو۔ سے چھڑا کر لاؤ۔ جا کر سلطان سکندر کو قتل کر دیا —— مجھے اجازت دو۔ میں اس کا

کام تمام کر دوں۔ شہزادی کو واپس لے آؤں۔" کمال یہ باتیں سنتا اور خاموش رہتا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب کون سا راستہ اختیار کرے۔

بہار سے غریب الوطن سلطان حسین نے بنگال کا رُخ کیا۔ کمال اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ گوڑ کے سلطان حسین شاہ نے جونپور کے شکست خوردہ بادشاہ کو اپنے یہاں پناہ دی۔ جس کے سارے پرانے ساتھی بچھڑ چکے تھے جس کا کتب خانہ تباہ ہو گیا تھا۔ خالی تان پورہ اب جس کا رفیق تھا۔ تان پورہ اس سے کبھی دغا نہیں کرے گا۔

اب میری روح کو کا ہے کی تلاش ہے۔ گوڑ کے شاہی باغات میں بے مقصد اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے کمال خود سے سوال کرتا۔ بنگالے کی لڑکیاں بے حد دلکش تھیں۔ یہاں کے مناظر بہت خوبصورت تھے۔ یہاں کی موسیقی بہت دلنواز تھی۔ اسے جونپور کی شاہزادی یاد نہیں آئی اُسے چمپاوتی کا خیال بھی کبھی نہ آیا۔ اسے خدا کی تلاش نہیں تھی۔ حد تو یہ تھی کہ اسے عورت کی تلاش بھی نہیں تھی۔ اس کا سارا وجود اس دہشت ناک خلا میں ڈول رہا تھا جہاں محض عمیق سناٹا ہوتا ہے۔

اس سناٹے میں صرف ایک سوچ بار بار گونجا کرتی —— میں جب تک اس چکّر میں رہوں گا مجھے دوسروں کو مارنا پڑے گا۔ دوسرے مجھے مارنے کے درپے رہیں گے انسان دراصل انسان نہیں ہیں خونخوار بھیڑیئے ہیں۔ انسان مجھے کہاں ملے گا۔؟

طرح طرح کی آوازوں نے اس سناٹے میں بہت سے بھنور پیدا کر دیئے۔ میں اس سامنے والے انسان کو مار ڈالوں کیونکہ اُس نے سر پہ چوٹی رکھی ہے اور گئے کو پوجتا ہے اور اگر میں نے اس کو قتل کرنے میں سبقت نہیں کی تو وہ میرا کام تمام کر دے گا۔ کیونکہ میرے سر پہ چوٹی نہیں ہے —— ؟

خوبصورت شیو پوری[1] کی اس لیے مجھے اینٹ سے اینٹ بجا دینا چاہیے کیونکہ وہاں لاکھوں کروڑوں مورتیاں مندروں میں سجی ہیں لیکن وہ مورتیاں میرا کیا بگاڑتی ہیں؟

---

[1] بنارس

اگر ان مورتیوں کو میں گوارا کرتا ہوں تو کیا میں مسلمان نہیں رہا۔؟

اسلام کیا ہے۔؟

ان سوالات نے اسے دیوانہ کر دیا۔

ان سے بچنے کے لیے اس نے شراب میں پناہ لی۔ اس نے ملک کے سارے خطوں کی عورتیں دیکھی تھیں — خوبصورت مضبوط جسموں والی مراٹھنیں۔ گجرات اور کاٹھیاواڑ کی نازک اندام لڑکیاں جن کے چہروں کی رنگت گندمی تھی۔ بیجاپور کی خوش آواز طوائفیں۔ بنگالے کی جادوگرنیاں جن کی آنکھوں میں جادو تھا اور باتوں میں ٹونا۔ جن کے لیے مشہور تھا کہ راتوں رات درختوں پر بیٹھ کر آسام کی سمت اڑ جاتی ہیں — اور بندرابن کی شوخ و شنگ گجریاں متھرا کی اہیریں پورب کی سانولی سلونی کہارنیں۔ قنوج کے باغوں کی وہ مالینیں جس نے اسے ایک بار بیلے کے گجرے بنا کر دیے تھے۔

موسم بدلتے رہے۔ وہ دل کی ویرانی سے گھبرا کر راگ رنگ کی محفلوں میں شریک ہوا۔ لیکن سارنگی کی تانت میں اسے موت کی ہچکیاں سنائی دیں۔ اس نے لکھنؤ کی پاتروں کو ناچتے دیکھا مگر حسین رقاصاؤں کے بجائے اسے مردہ عورتیں دانت نکوستی نظر آئیں۔

طرح طرح کی آوازیں عجیب و غریب گیتوں کے بول مردہ زبانوں کے جملے اس کے دماغ میں ہر وقت شور مچاتے وہ اس اندرونی شورش سے عاجز آ گیا۔ سناٹا اس قدر پر شور ہو سکتا ہے یہ اسے معلوم نہ تھا وہ جو ہفت زبان تھا اس نے کوشش کی کہ ساری بولیاں سارے الفاظ کسی طرح بھول جائے۔ حافظہ کس قدر اذیت دہ شے تھی۔

ایک روز کسی نے چپکے سے اس کے کان میں کہا۔ ہیرا جنم امول تھا۔ کوڑی بدلے جائے۔ ہیرا جنم امول تھا۔ ہیرا جنم امول تھا۔ وہ جھنجلا کر کسی دوسری رقاصہ کے یہاں جا پہنچتا۔ اس سے کہتا۔ ٹھمری چھیڑو — مدھوما دھوی سناؤ — للت الاپو— وہ تان پورہ اٹھاتی وہ وہاں سے بھی بھاگ نکلتا۔ مغنیہ کے گیتوں کے بجائے کوئی دوسرے الفاظ اس کا تعاقب کرتے — سانس نقارہ کوچ کا۔ سانس نقارہ کوچ کا۔

۔ باجت ہے دن رین ۔ دن رین ۔ دن رین ۔ آخر اس نے لکھنوتی، گوڑ اور سنار گاؤں کی چہل پہل چھوڑ کر دیہات کا رخ کیا۔ جہاں صرف گہرے رنگوں کی راجدھانی تھی اور تالابوں میں کنول کے سرخ پھول جگمگاتے تھے اور جہاں برڈ بل اور مولسری کی چھاؤں میں وشنو پجاری اور پجارنیں رادھا اور کرشن کی محبت کے گیت گاتے تھے۔ ویرانوں میں اسے اگلے وقتوں کے ونگا پتی[1] اور گوڑ ایشور[2] بادشاہوں کے سنسان محل نظر آئے جن میں گھاس اگی ہوئی تھی۔ ان کی دیواروں پر اس نے رقاصاؤں کے مجسمے دیکھے ترچھی آنکھوں والی لڑکیاں جو یہاں سے مور پنکھی جہازوں پر بیٹھ کر جاوا کے شیلندر دربار میں رامائن کا سنگیت ناٹک دکھانے کے لیے جاتی تھیں۔ اس وقت ان کے خوبصورت بازوؤں اور طویل آنکھوں پر چھپکلیاں چل رہی تھیں۔ پال اور سین بادشاہوں کے محلات کے کھنڈروں کے سائے میں کوئی قدیم قبرستان تھا جس کی شکستہ دیوار کے نیچے ایک بوڑھا ہانپتا کانپتا بیٹھا کھانس رہا تھا۔ برابر کے کھیت میں ہل چلایا جا رہا تھا سامنے مہانندا دریا بل کھاتا بہہ رہا تھا۔ تب اچانک اس کے دماغ کا شور تھوڑا سا مدھم ہوا۔ اس بانی کا مطلب اس کی سمجھ میں تارے کی طرح روشن ہونا شروع ہوا۔ جو مدتیں گذریں ایودھیا میں اسے کسی نے سنائی تھی۔ اس سے کسی نے کہا تھا۔ آج کال کے بیچ میں جنگل ہوگا باس۔ اورے اورے ہل چلیں گے۔ ڈھور چریں گے گھاس۔ ڈھور چریں گے گھاس ۔ ڈھور چریں گے ــــــــ

آخر جب دل کی وحشت نے زیادہ زور باندھا تو اس نے بنگال سے نکل بھاگنے کا ارادہ کیا۔ حسین شرقی کو گوڑ میں اس طرح تنہا چھوڑ کر بھاگتے ہوئے اسے اپنے آپ سے بڑی شرم آئی۔

مگر جذبے سب اضافی ہوتے ہیں اس نے اپنے آپ سے کہا اور ایک روز خاموشی سے شاہی محلات سے نکل کھڑا ہوا گنگا کے گھاٹ پر پہنچ کر وہ ایک جہاز پر بیٹھ گیا اسے

---

[1]، [2] مشرقی اور مغربی بنگال کے پال بادشاہ

معلوم نہیں تھا کہ جہاز کس طرف جا رہا ہے۔

دریا پر روشنیاں جگمگا اٹھیں لنگر اٹھایا گیا۔ ملاح بشاش آوازوں میں گا رہے تھے کمال ایک کونے میں بیٹھا رہا۔ وہ جہاز پریاگ جا رہا تھا۔ پریاگ جو کاشی سے آگے تھا۔ عظیم گنگا بہت دور سے بہتی ہوئی آ رہی تھی اس کے آگے بے پایاں سمندر تھا۔ کمال نے آنکھیں بند کر لیں۔ دن گزرتے گئے۔ کشتی گنگا کی سطح پر آگے بڑھتی رہی۔ مسافروں سے بھری ہوئی کشتی میں بڑی چہل پہل تھی۔ بھاگل پور کے قریب ایک گاؤں سے براتی دولہن کا سرخ ڈولا لے کر کشتی میں سوار ہوئے۔ دولہا نے زرد جوڑا پہن رکھا تھا۔ دولہن لمبا سا گھونگھٹ کاڑھے تھی۔ اس کے پیروں میں چاندی کے بچھوے تھے اور اس کے مہندی سے رچے ہاتھوں میں چوڑیاں اور ہاتھی دانت کے کڑے کھن کھن بولتے تھے اور وہ پھکو پھکو رو رہی تھی۔ براتی ہلڑ مچا رہے تھے۔

کمال کشتی کی دیوار کے سہارے بیٹھا خالی آنکھوں سے یہ سب دیکھتا رہا۔

"سنو چمپاوتی مجھ سے بیاہ کر لو۔"

"ہوں۔"

"ہوں کیا — میں کہتا ہوں مسلمان ہو جاؤ۔ عاقبت سدھر جائے گی اور اس زندگی میں مجھ ایسا دلچسپ آدمی ملے گا —"

"رام رام — کیسی باتیں کرتے ہو! میں کیوں ہونے لگی مسلمان۔ مجھے تو تمھارے مولویوں کی داڑھیوں سے ہی ڈر لگتا ہے۔ جونپور کے قاضی بن کر تم بھی یہ لمبی سی داڑھی رکھ لو گے — !"

"اب بھی وقت ہے چمپا رانی۔ دیکھنا کسی دن کسی سر گھٹے پنڈے کے پلے باندھ دی جاؤ گی جو عمر بھر ٹہل کروائے گا اور جب مرے گا تو اس کے پیچھے پیچھے چتا میں دھکیل دی جاؤ گی — کبھی اپنے اس خوفناک مستقبل پر غور کیا ہے —؟"

"میں تو تمھارے ساتھ بھی مرنے کے لیے تیار ہوں تم مر کے تو دیکھو!"

"سنو چمپا — سچ مچ — مجھ سے بیاہ کر لو۔"

پکا ہے اپنی ذات بگاڑتے ہو۔ تم سیدزادے ٹھہرے"

"تم بھی برہمن ہو۔ اور ویسے تمھاری ذات اور اونچی ہو جائے گی۔ سیدانی کہلاؤگی! مجھ سے بیاہ کرلو نا بھئی۔"

"مگر ہم تو تم کو یُونہی اپناپتی مانتے ہیں۔"

وہ یہ سن کر چکرا گیا۔ "وہ کیسے — میرا تم سے بیاہ کہاں ہُوا ہے۔ یعنی کہ — میں — تم — میرا مطلب ہے کہ —"

"اس سے کیا ہوتا ہے —" وہ ہنستی رہی۔ "ہم تو تم کو اپنا مالک خیال کرتے ہیں۔ یہ بات تم نہیں سمجھ سکتے!" — وہ اسی طرح بے فکری سے ہنسا کی۔ "ہم تو صرف ایک آدمی کو اپناپتی سمجھیں گے اور وہ آدمی تم ہو۔ ہمارا تمھارا تو جنم جنم کا ساتھ ہے۔"

"جنم جنم کا ساتھ۔ کیا خرافات ہے۔" کمال نے بھنا کر کہا۔ "پھر تم نے جادوگری کی باتیں شروع کیں۔"

"اس میں جادو کیا ہے۔" چمپا نے حیرت سے پُوچھا۔ "کیا کوئی لڑکی کسی آدمی کو خود سے پسند نہیں کرسکتی۔ ہم نے تمھیں چُنا ہے اور ہم تمھارے آگے جھکتے ہیں۔"

"کیا کفر بکتی ہو۔ میں نعوذ باللہ کوئی خدا ہوں۔"

"ہو تو سہی۔ دل ہی تو خدا کو جنم دیتا ہے۔" وہ پھر زور سے ہنسی۔

اور پھر اس نے کہا تھا۔ "اچھا یہ بتاؤ تم ہم سے بڑی محبت کرتے ہو نا۔"

"کرتا کیوں نہیں ہوں۔"

"تو پھر اتنی گھبراہٹ کاہے کی کبیرا یہ گھر ہے پریم کا خالہ کا گھر نا نہہ۔ کبیرا یہ گھر ہے پریم کا۔ کبیرا یہ گھر ہے پریم کا۔" اور وہ زور سے قہقہہ لگا کر غائب ہو گئی۔

یہ ایودھیا کا کنج نہیں تھا۔ گنگا کی سطح تھی۔ اس کا جہاز سکون سے لہروں کو چیرتا آگے بڑھ رہا تھا اور براتی دھمار سی گا رہے تھے اور لڑکیاں ہنس رہی تھیں اور دُلھن رو رہی تھی۔ دُلھن جو گوری رنگت کی دُبلی پتلی بہاری لڑکی تھی۔ جانے کس دیس کو جاتی تھی کس زندگی کی طرف کس موت کی طرف اس کا رُخ تھا۔ جہاز مونگیر پہنچا۔ براتی اسی کا ڈولا

لے کر کنارے اتر گئے۔ گھاٹ کے ہجوم میں سُرخ رنگ کا ڈولا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

جہاز نے دوبارہ لنگر اُٹھایا۔ گنگا کے دونوں طرف سرسبز کھیت تھے اور گاؤں اور بارونق شہر۔ اور دنیا اپنے حال میں مگن تھی۔

پٹنے کے گھاٹ پر بہت سے مسافر اُترے۔ بہت سے سوار ہوئے۔ نئے مسافروں میں چند امیرزادے تھے۔ ایک جوگیوں کا گروہ تھا۔ ایک نارنجی لباس والا بھکشو تھا جو سب سے الگ تھلگ رہتا۔

پٹنے کے امیرزادے دن بھر چوسر کھیلنے میں مصروف رہتے۔ کاٹھیا واڑ کے دو تاجر جو اپنا سامان لے کر دلی جا رہے تھے۔ اپنے ہی کھاتے میں لگے تھے۔ جوگی رام دُھن میں منہمک تھے۔ کمال کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ بھکشو نے اس کا امیرانہ لباس دیکھا اور چپ چاپ جا کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد ان جوگیوں میں سے ایک کمال کے قریب سے گزرا وہ وضع قطع سے ہندو نہیں معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس کے سر پر چوٹی نہیں تھی۔

"بھائی۔ تم مسلمان ہو۔" کمال نے ہمت کر کے اس سے پوچھا۔

"انسان ہوں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"میں — میں بھی انسان ہوں۔" کمال نے لڑکھڑاتے ہوئے گویا اپنا تعارف کرایا۔

"کیا چاہتے ہو۔"

"یہ پتہ نہیں —"

"اگر اپنے دل کا بھید خود نہیں جانتے تو ہمارے پاس تمھارا کیا کام —— ادھر جا کر بیٹھو۔"

اُس نے امیرزادوں کی طرف اشارہ کیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے جوگی اسے پہچان گیا تھا۔

"تم کہاں جانے ہو۔"

"کاشی۔"

"وہاں کیا ..."

"وہاں کیا نہیں ہے۔ وہ شیوپوری ہے۔ وہاں مسرت ملتی ہے وہاں میرا مرشد رہتا ہے۔ میرا شیخ۔ وہ جو گرو ہے میرا۔ لیکن افسوس کہ تم نے اتنی عمر گنوا دی اور اس کو نہ جانا۔" وہ ٹھٹھک گیا۔ "تم جونپور کے کمال الدین ہو نا۔"

کمال مبہوت ہو کر اُسے دیکھ رہا تھا۔

"میں سلطان سکندر کا سپہ سالار تھا۔ میں چنار کے معرکے میں تم سے لڑا تھا بلکہ تم نے اپنی تلوار سے مجھے زخمی بھی کیا تھا۔ یہ دیکھو۔" اس نے اپنا داہنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ جس کی تین انگلیاں کٹی ہوئی تھیں۔ اپنا چکارہ جسے وہ بائیں ہاتھ سے بجا رہا تھا۔ فرش پر رکھ کر وہ کمال کے پاس بیٹھ گیا۔ "تم کو اور بتاؤں۔ جب تم گوڑ کے دربار میں رنگ رلیاں منا رہے تھے وہ جنگلوں میں تمھارے انتظار میں روتی پھرتی تھی لیکن کوئی راج ہنس اس کا پیغام تم تک نہ پہنچا سکا۔"

کمال کا دل دھڑکنے لگا۔ یہ جوگی کیا کیا کہہ رہا تھا۔ کیا یہ غیب کا علم جانتا تھا۔

"میں اپنی فوج لے کر اجودھیا سے گزرا تھا۔ راپتری میں جو جنگ ہوئی تھی۔ اس میں اس کا بھائی مارا گیا وہی جو چھتر ویدی پنڈت تھا اور وہ جنگلوں میں روتی پھرتی تھی ہر سپاہی کو دیکھ کر وہ سمجھتی تھی کہ شاید تم ہی آگئے۔ کیونکہ تم نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے پاس ضرور واپس لوٹ کر آؤ گے۔ مجھے سپاہی دیکھ کر تمھارا پتہ پوچھتی وہ میرے پاس آئی تھی۔ میں تو اُسے تمھارے متعلق کچھ نہیں بتا سکا۔ پھر معلوم نہیں وہ کہاں گئی۔"

کمال کا دل دھڑکتا رہا۔ سناٹا اتنے زور سے گونجا کہ اُسے محسوس ہوا جیسے اس کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "دنیا بہت بڑی ہے۔" جوگی کہہ رہا تھا۔ "تم اس کو ڈھونڈ نہیں سکتے۔ وہ تم کو تلاش نہیں کر پائے گی۔ زندگی میں دو انسان صرف ایک مرتبہ ملتے ہیں۔ اگر بچھڑ جائیں تو ان کا دوبارہ ملنا ناممکن ہے۔ ملنے اور بچھڑنے کا مطلب جانتے ہو۔۔؟" اتنا کہہ کر جوگی نے پھر اپنا چکارہ اٹھا لیا اور اپنے ساتھیوں کی طرف چلا گیا۔

گنگا بہتی رہی۔ چاندی کی وسیع چادر پر مسافروں سے بھری ہوئی کشتیاں چلا کیں۔

شاہی بجرے۔ تجارتی جہاز۔ مچھیروں کی ڈونگیاں۔ ان کے بادبان شام کو ڈوبتے سورج کے مقابل میں ہوا سے پھول کر یوں پھڑپھڑاتے گویا بے شمار راج ہنس مانسرور کی سمت اُڑنے کے لئے پر تولتے ہوں۔ کشتیوں میں سے گگنے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ جوگیوں کے سمرن۔ فقیروں کے ذکر۔ وشنو پجاریوں کے بھجن۔ تاجروں کے جہاز ملک کی منڈیوں کی طرف جا رہے تھے۔ گجرات اور بنگال کے سوتی کپڑے۔ بنارس کا ریشم۔ دکن کے ہیرے۔ دور دراز کے ملکوں کے انسان ان کشتیوں میں سوار تھے۔ چین کے عالم۔ تبت اور کشمیر کے بھکشو۔ عرب سیاح۔ ایران کے نقاش۔ جاوا کے رقاص۔ ملک میں امن قائم تھا۔ دلی میں سلطان سکندر حکومت کرتا تھا۔ زندگی میں بڑی گہما گہمی تھی۔

"خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنھیں دل کا چین نصیب ہے۔ بھائی مجھے شانتی چاہیئے" کمال نے آہستہ سے کہا۔

بھکشو نے آنکھیں اٹھا کر اُسے دیکھا اس کے چہرے پر کامل سکون تھا اور لازوال مسرت۔ آج ویساکھ پورنیما تھی۔ آج کی رات دو ہزار سال ادھر، اسی گنگا کے اس پار ترائی کی ایک بستی میں شاکیہ منی پیدا ہوئے تھے۔ آج ہی ویساکھ پورنیما کے روز انھیں گیان حاصل ہوا تھا۔ چودھویں کا چاند دریا کی لہروں پر ادھر اُدھر تیرا کیا۔ اس کی تیز اور ٹھنڈی کرنیں کمال کے اور بھکشو کے چہروں پر پڑ رہی تھیں دریا پر مکمل سناٹا طاری تھا۔

"مجھے میرے خیالوں سے نجات دلاؤ۔۔" کمال نے کہا۔

بھکشو اپنی پُر اسرار آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ "خیال ۔۔ خیال خود کو نہیں جان سکتا۔ خیال اپنے آپ سے باہر نہیں جا سکتا۔ کائنات سے باہر کوئی خدا نہیں ہے۔ اور خدا سے باہر کوئی کائنات نہیں ہے ۔۔ حق و باطل میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن ان سب سے بالاتر ذاتِ مطلق ہے جو سناٹا ہے ۔" اس نے گہری آواز میں کہا۔

"مجھے اس سناٹے سے بڑا ڈر لگتا ہے۔" کمال نے کہا۔

"شُونیا ۔۔ سناٹا ۔۔ شونیتا ۔۔ جو ذاتِ مطلق ہے ۔۔ جو صفر کا تصور ہے ۔"

"مجھے اس تصور سے وحشت ہوتی ہے" کمال نے کہا: ۔۔۔ اس سناٹے میں

میں اکیلا کدھر جاؤں گا۔ تم بھی میرا ساتھ نہیں دے سکتے۔" اس نے مہایان مذہب کے بھکشو کو شک و شبہے کی نظروں سے دیکھا۔

جہاز ایک گاؤں کے کنارے ٹھہرا۔ ساحل پر چاندنی رات میں وسنت کے دیوتا تہوار منایا جا رہا تھا۔ کمال گھاٹ پر پہنچ کر چاروں طرف دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کدھر کا رُخ کرے۔ دفعتاً اسے ویشنو پجاریوں کی ایک ٹولی نظر آئی جو اس کے جہاز سے اُتری تھی۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ کسی نے اس پر نظر نہ ڈالی۔

بہت دن تک وہ اسی طرح ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا

گاؤں گاؤں گھومتا وہ ایک بڑے جنگل میں پہنچا۔ اسے اس جگہ کا نام معلوم نہیں تھا۔ قریب جولاہوں کی بستی تھی۔ صندل سے معطر ہوائیں درختوں میں اُمنڈ رہی تھیں۔ سبزے کی شدت سے آسمان کا رنگ ہرا نظر آ رہا تھا۔ ساون کا مہینہ شروع ہونے والا تھا۔ جنوروں کی ایسی کالی جامنیں ہری گھاس پر ٹپ ٹپ گرتی تھیں۔ کسم رنگ کی ساریاں اور لہنگے پہنے لڑکیوں نے آم کی ڈال میں جھولے ڈالے تھے۔ چاروں اور گھن بیلی اور روپ منجری اور سدرشن اور مالتی کھلی تھی۔

گلے میں تلسی مالائیں پہنے ویشنو جوگنیں کٹھل کے درخت کے نیچے بیٹھی کھڑتال بجاتی تھیں۔ گلابی آنکھوں والے ملے شاخوں پر بیٹھے تھے۔ تُرئی بجاتے کمنڈل ہاتھ میں لیے جوگی اپنی یاتراؤں پر جا رہے تھے۔ جھاڑیوں میں جنگلی تیتر بول رہے تھے۔

تالاب کے کنارے رس بلی مہک رہی تھی۔ ہوا کے جھنڈ میں سے گیتوں کے خوبصورت سُر بلند ہو رہے تھے۔ کمال ایک کھنڈ کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر جنگل اور ساون کی ان صداؤں کو سُنتا رہا۔

تب اُس کو معلوم ہوا ـــ وہ سناٹے میں تھا۔ یہ سناٹے کے مختلف پرتو تھے۔ وہ عالمِ حیرت میں تھا۔ یہ سناٹا ذاتِ مطلق تھا۔ بھکشو کی بات اس کی سمجھ میں آگئی۔

پھر اُس نے غور سے سُنا۔ ہوا کے جھنڈ میں ویشنو پجارنیں جو گیت گا رہی تھیں اس کے

الفاظ اب اسے صاف سنائی دے رہے تھے۔ یہ تو بردوان کے جے دیو گوسوامی کی آواز تھی۔

اس نے ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ دھیان سے سنا۔ پجارنیں گا رہی تھیں۔

ملایا کے گرم جنگلوں پر سے بہتی ہوئی ہوا اپنے ساتھ مہک لا رہی ہے۔ جہاں الائچی کی جھاڑیوں سے چرائی ہوئی خوشبو پھیلی ہے جہاں شہد کی مکھیاں بھنبھناتی ہیں۔

'ان کنجوں سے یہ پُرمائی آ رہی ہے جہاں وہ ناچتا ہے۔ یہ بہار کا مہینہ ہے اور اس مہینے میں تنہائی بہت کھلتی ہے۔

'کیتکی کی کلیاں اور زرد پھول کام دیو کے بان کی مانند جگمگاتے ہیں۔ پاٹل کے شگوفوں پر بھنورے سوتے ہیں۔ مادھوی ہوا میں جھوم رہی ہے اور ریشمی موگرے۔ اور اس سمے وہ کنجوں میں ناچتا ہے۔ یہ بہار کا مہینہ ہے اور اس مہینے میں تنہائی بہت کھلتی ہے۔

'جیسے گرم ہونٹ بند آنکھوں کو چھو لیں اسی طرح سورج کی کرنیں آم کی کیریوں پر پڑ رہی ہیں اور وہ پُرسکون جمنا کے کنارے رقصاں ہے۔ موسم گل میں وہ تو تنہا نہیں ہے۔

'وہ گوپیوں کے ساتھ ناچ ناچ کر یونہی اپنا سمے گنوا دے گا۔ جبکہ رادھا اس کی منتظر ہے؟'

پجارنوں نے گیت کا دوسرا انترہ اٹھایا۔

'جیسے دور جانے والے مسافر کو کوئل کی آواز سن کر اپنے دیس کی ندی کنارے آموں پر گنگناتے بھنوروں کی یاد آ جائے اس طرح یک بیک اسے رادھا کا خیال آیا۔

اور رادھا نے دیکھا زریں لباس پہنے، بالوں کو خود رو پھولوں سے سجائے اپنے سرخ ہونٹوں کے رنگ کے یاقوت سے مزین، وہ گوپیوں کے ساتھ رقصاں ہے۔'

کمال کھنڈ کی سیڑھیوں پر بیٹھا سنتا رہا۔

پجارنوں نے گایا۔

'کوئل کی آواز سے راہی کو تکلیف پہنچتی ہے۔
ان مسرّتوں کا رنج جو حاصل نہ ہوئیں۔
ان سیاحتوں کا رنج جو کی نہ جا سکیں۔
ان محنتوں کا رنج جن کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔
اور مسرّتوں کے باوجود
مسرّت میں کرب چھپا ہے کیونکہ کرب پیہم ہے۔'

کمال اُٹھ کھڑا ہوا۔ پجاریوں کی آواز، جے دیو کے الفاظ رفتہ رفتہ دور ہوتے گئے۔

اور جے دیو نے کہا تھا۔ میں منتظر ہوں۔ محبت تو وہ بھی کرتا ہے جس نے محبت دیر میں شروع کی۔

مہری اور گوریا چڑیوں کی سنگت میں وہ جنگل کے سایہ دار راستوں پر ادھر اُدھر بھٹکتا پھرا۔ اور تب دفعتاً درختوں کے جھرمٹ میں اسے گنگا کا پانی جھلملاتا نظر آ گیا۔

اسے معلوم نہ تھا کہ وہ اس طرح گھومتا پھرتا بنارس پہنچ چکا ہے سامنے دوسرے کنارے پر شہر پوری تھی جس کے شوالوں کے کلس دھوپ میں چمک رہے تھے اور سینکڑوں ہزاروں گھنٹے ایک ساتھ بج رہے تھے اور ہوا میں عود کی مہک تھی اور گلیوں میں جاوتری کے پھول بکھرے پڑے تھے اور گھاٹ کی لاتعداد سیڑھیوں پر لوگ نہا رہے تھے۔ کاشی ازلی اور ابدی شہر۔

وہ درختوں کی چھاؤں میں دن بھر بے مقصد پھرتا رہا۔ اب اس کے پیروں میں سکت باقی نہیں تھی اور وہ بے طرح تھک چکا تھا۔ جنگل کے اختتام پر جولاہوں کی بستی تھی۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے اس کی چوپال کی طرف بڑھا۔

ایک اہیر نے اُسے سر جھکائے جاتا دیکھ کر اس سے کہا "بھیا۔ لگت ہے تم بہوت دُور سے آئے رہے ہو۔ تہرے پیرن ما مائی کتنی لاگی ہے۔"

"ہاں" اُس نے جواب دیا "میں نے بہت لمبا سفر طے کیا ہے۔"

"آؤ — بیٹھو۔ ستو کھاؤ۔" اہیر نے کہا اور اسے ایک سائبان میں لے گیا۔ "کپڑوں سے تو بڑے دھنوان دکھلائی پڑت ہو۔ اس اجرج میں کاہے پھرت ہو۔ سلطان کے منشی[۱] ہو ——؟"

"میں کسی سلطان کا منشی نہیں ہوں۔"

"تو آرام سے بیٹھو۔ یہاں چھاؤں ہے۔" وہ جوتے اتار کر سائبان میں بیٹھ گیا۔ اور چاروں اور دیکھنے لگا۔ سامنے آم اور جامنوں کا گھنا باغ تھا جس میں وہ دن بھر گھومتا رہا تھا۔ مہوے کے جھنڈ میں سے اب بھی وشنو مغنیوں کے گانے کی مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ پگڈنڈی کے دونوں طرف دوپہری کھِلی تھی۔

تو بھئی چمپاوتی۔ اُس نے دل میں کہا۔ تمھاری شرط پوری ہوئی۔ تم نے کہا تھا کہ میں اپنی تلوار اتار پھینکوں تو تم مجھے اپنے ساتھ کاشی لے چلو گی۔ میں نے اپنی تلوار ندیا کی لہروں کے سپرد کر دی ہے اور میں کاشی پہنچ گیا ہوں۔

لیکن تم کہاں ہو۔

سامنے سے قلندروں کی ایک ٹولی گزری۔ بہت سے سنیاسی کنڈل پہنے ترسول ہاتھ میں لئے گھاٹ کی اور جا رہے تھے۔ جولاہوں، اہیروں اور مفلسوں کا ایک ہجوم کھڑتالیں سنبھالے بھجن گاتا ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

چمپا نے کہا تھا۔ ان لوگوں کا مذاق نہ اُڑانا۔ یہ بہت پیارے لوگ ہیں۔ ایک روز یہی تمھارے کام آئیں گے۔

وہ آہستہ سے سائبان سے نکلا اور اس ہجوم کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

وہ لوگ اپنے مُرشد کے پاس جا رہے تھے۔ وہ جو لہرتارا تالاب میں سے نکلا تھا۔

وہ اسی جگہ پر رہتا تھا۔ جہاں مولسری کے پیڑ تھے اور جہاں رس بیلی جھکتی تھی۔

---

[۱] آدمی

۲۳

میاں کبیر صبح کے وقت کرگھے پر بیٹھ کر کپڑا بنتے، کپڑوں کا گٹھڑ بنا کر پیٹھ پر لادتے بنارس کی گلیوں میں جا کر پھیری لگاتے۔ شام کو ان کے مکان کے سامنے مولسری کے جھنڈ میں مجمع لگتا۔ چکارے سنبھالے جاتے۔ کھڑتالیں بجتیں۔ بھجن گائے جاتے۔ یہ نقشہ برسوں سے قائم تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اسی دنیا میں جنگیں ہوتی ہیں۔ انسان ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔ اسی دنیا میں آتما بھوت وانت نکوسے دلوں کے تعاقب میں ہیں۔

سارے دیس میں میاں کبیر کی شہرت پھیلی تھی۔ ان کی بانیاں کسانوں اور جاہلوں کی زبان پر تھیں دور دراز کے خطوں سے لوگ ان کی اور کھنچے آتے تھے

کاشی کے پانڈوں کو اور دلی کے مولاناؤں کو اور سلطان سکندر کو جو بڑا کٹر مسلمان تھا۔ یہ — خرافات پسند نہ تھیں لیکن وہ سب کیا کر سکتے تھے۔ سارا دیس ایک نئے رنگ میں رنگا جا چکا تھا۔ پچھلے تین سو سال سے اس بھگتی مارگ پر ایک بڑا خوبصورت قافلہ رواں تھا۔ اس قافلے میں کیسے کیسے لوگ شامل تھے۔ اجمیر کے معین الدین اور ایٹے کے امیر خسرو اور دلی کے نظام الدین اور گجرات کے نرسنگھ مہتا اور بنگال کے بیربھوم کا چنڈی داس اور بہار کی متھلا پوری کے ودیاپتی اور مہاراشٹر کا درزی نام دیو، پریاگ کے رامانند اور جنوب کے مادھو اور ولبھ۔ اور بادشاہو اور چھترپتی راجاؤں کے درباروں اور امراء، وزراء اور سپہ سالاروں کی دنیا سے نکل کر کمال نے دیکھا کہ اس دوسری دنیا میں مزدور اور نائی، اور موچی اور کسان اور غریب کاریگر آباد تھے۔ یہ جمہوری ہندوستان تھا اور اس ہندوستان پر ان خرقہ پوشوں کی حکومت تھی کاریگروں کی منڈلیاں ان سے وابستہ تھیں۔ اسلام کی مساوات۔ ان ہندو بھگتوں کو متاثر

کر رہی تھی۔ اسلام تو امن پسند صوفی اس دیس میں پھیلا رہے تھے۔ یہاں تلوار کا ذکر کہاں تھا۔ ہزاروں برس کے ستائے ہوئے اچھوت ان سنتوں کے پاس بیٹھ کر رام کا نام لے رہے تھے اونچی ذاتوں کے برہمنوں کا یہاں کون دخل تھا۔ یہ بڑی نرالی دنیا تھی۔ اس میں ہندو مسلمان کا سوال نہیں تھا۔ یہاں محبت کا راج تھا اور کمال جو انسان کی تلاش میں سرگرداں تھا اُس نے دیکھا کہ دنیا میں بھیڑیوں کے علاوہ انسان بھی بستے ہیں۔ یہ اہیر جس نے چوپال میں بٹھلا کر ستو حاضر کیا تھا۔ اس کی جان لینا نہیں چاہتا کیونکہ اسے کسی سلطنت کو حاصل کرنے کی تمنا نہیں۔ اسے تو دونوں وقت باجرے کی روٹی مل جاتی ہے اور وہ خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔ اسے ملکوں کی سیاست سے کیا مطلب یہ کسان جو اس کے سامنے خوش خوش منڈیر پر بیٹھا اپنی چھوٹی سی بچی کو بیر کھلا رہا ہے اسے کیا پرواہ کے دلّی میں آئندہ کون حکومت کرے گا۔ سلطان حسین حاکم ہو تب بھی وہ اسی طرح ہل چلائے گا اور لگان ادا کرے گا اور سلطان سکندر بادشاہ ہو تب بھی۔ ان "ترکوں" سے پہلے جب پرتھوی راج تھا تب بھی اس کے باپ دادا یونہی جیٹھ کی دھوپ میں ہلکان ہوتے تھے۔ ساون میں گاتے تھے۔ قحط پڑتا تھا تو خاموشی سے مر جاتے تھے۔

تب کمال نے سوچا — کہ گو مذہب کی حیثیت زندگی میں اہم سمجھی جاتی ہے لیکن محبت ظاہری مذہب سے برتر شے ہے۔

محبت اصل شے ہے۔

دور دور سے لوگ کاشی آکر کبیر کے قدموں میں بیٹھ رہے تھے۔ کمال ان سب کی باتیں شوق سے سنتا اُن کی سیوا کرتا۔

کاشی میں ایک روز کوچین کا ایک اندھا برہمن وارد ہوا۔ وہ کبیر کا نام سن کر سینکڑوں میل کی مسافت طے کرنے کے بعد یہاں پہنچا تھا۔ اس کا ایک بازو لڑائی میں کٹ چکا تھا لیکن وہ ایک ہی ہاتھ سے رام دھن پر کھڑتال بجاتا تھا۔ اسے دیکھ کر کمال کو احساس ہوا کہ وہ جنگوں اور تباہ کاریوں سے پناہ لینے کے لیے یہاں بھاگ آیا ہے مگر

باہر کی دنیا میں لڑائیاں اسی طرح جاری تھیں۔

"بھائی تمھاری جان کس نے لینی چاہی تھی۔" کمال نے ——— اس سے پوچھا۔

"فرنگیوں نے۔"

"فرنگی —؟"

"ہاں — عیسائی — بہت دُور پچھم سے آئے ہیں ———" اُس نے مختصر جواب دیا۔

——— اتنی مدت ہند میں رہ کر وہ نصاریٰ کے وجود کو بالکل بھول چکا تھا جو مسلمانوں کے جانی دشمن تھے اور بیت المقدس میں مسلمانوں سے کٹتے مرتے تھے تاریخ میں اس کی دلچسپی پھر عود کر آئی وہ کھسک کر مالابار کے برہمن کے پاس بیٹھ گیا۔

"یہ عیسائی کدھر سے آئے ہیں۔" اس نے سوال کیا صلیبی جنگوں کے سارے واقعات اسے ازبر تھے۔

"پرتگال۔ کوئی دیس ہے۔"

اس نام سے تو وہ واقف تھا۔ دوسرے عربوں کی طرح علم جغرافیہ کا وہ بھی ماہر رہ چکا تھا۔

پرتگال اندلس کے پاس تھا۔ اندلس ـــ اس کے دل پر ایک برچھی سی لگی۔ چنانچہ وہ لوگ وہاں مسلمانوں کا خاتمہ کرنے کے بعد اب یہاں بھی آن پہنچے۔ کمال کو یہ معلوم نہ تھا کہ پرتگالیوں کو ان کے بادشاہ نے اور پاپائے روم نے حکم دیا تھا کہ جس طرح مسلمان ہسپانیہ سے نکالے گئے اسی طرح ساری دُنیا میں جہاں جہاں ملیں چن چن کر ان کا قلع قمع کرو۔ ایک بھی زندہ نہ بچنے پائے۔

"انھوں نے گوا کی ساری مسجدیں ڈھا دیں۔ مندروں کو توڑ پھوڑ کر برابر کر دیا۔" اندھا برہمن کہتا رہا۔ "گوا کے ایک ایک مسلمان کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ میں ہندو تھا اس لیے بچ گیا۔"

نوجوان برہمن جو اپنی نور سے عاری آنکھوں سے اسے تکتے ہوئے دو تارے پر انگلیاں پھیر رہا تھا۔ یہ کالی کٹ کے راجہ کے بحریہ کا افسر تھا اور راجہ کے امیرالبحر قاسم اور میر حسن کے ساتھ جی توڑ کر پرتگالیوں سے لڑا تھا اور اپنی آنکھیں اُن کی بارود کی نذر کر کے اور ایک بازو کٹا کر یہاں پہنچا تھا۔ کمال کو ——— سلطان سکندر کا وہ سپہ سالار یاد آیا جو اسی طرح جوگی کا روپ دھارے اسے جہاز پر ملا تھا۔

"ہماری ہار ہوئی یا جیت ـ،، کمال نے آہستہ سے سوال کیا۔

"——— ہم نے ترکی کے راجہ سے مدد مانگی تھی۔ ترکی کا جنگی بیڑا مصر دیس سے ہماری سہائتا کے لیے آیا مگر پرتگالی بڑے زبردست ہیں" ——— اس نے اپنی بے نور آنکھیں بند کر لیں اور دو تارہ بجانے میں مصروف ہو گیا

اب شام ہو رہی تھی اور لوگ کیرتن کے لیے جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ کمال اٹھا اور کوچین کے اس اندھے کا ہاتھ تھام کر اسے راستہ بتلاتا ہوا لوگوں کے گروہ میں مل گیا۔

بغداد اور جونپور کا ابوالمنصور کمال الدین، مورخ، محقق، سیاست دان، سپاہی جسے تصوف اور معرفت سے کبھی کوئی سروکار نہ تھا۔ بالآخر کاشی کے پنچ گنگا گھاٹ پر پہنچ چکا تھا۔

۲۴

لیکن بہت سے بنیادی سوال سوچنے والے ذہن کے لیے ابھی باقی تھے۔ کبیر نے اس سے کہا۔ سنو بھائی سادھو۔ ہری سے پریم کرو۔ تمہارے دُکھ آپ سے آپ مٹ جائیں گے۔ دکھ ستیہ۔ دُکھ کی حقیقت اس کو جہاز پر اس تانترک بدھ نے بھی سمجھانا چاہی تھی۔ لیکن ہری کون تھا۔ یہ سوال بڑا اہم تھا۔ اسی سوال پر ایتھنز میں اور اسکندریہ میں اور بغداد میں بڑی لمبی بحثیں کی جا چکی تھیں ہزاروں برس قبل اسی گنگا کے کنارے کپل نے اور جیمنی نے اور شہزادہ سدھارتھ نے اس پر سوچ بچار کیا تھا اور سات سوال

گذرے مہاندی کے اس پار کیرالا میں ایک بہت بڑا عالم پیدا ہوا تھا اس کا نام شنکراچاریہ تھا ۔ کمال نے عہدِ عتیق کے کپل کا مطالعہ شروع کیا اور کتاب بند کر کے سوچا نو فلاطونیوں کی عقلِ فاعل پُرُش ہے جو عقلِ ہیولانی ۔ پراکرتی پر اثر انداز ہوتی ہے؟ انسان کا خدا سے اتصال نروان ہے ۔۔؟ طریقت اور مارگ دونوں حرم تک پہنچتے ہیں جو رام ہے ۔۔؟

گوتم سدھارتھ کے سنہرے راستے پر صدیوں تک مسافروں کے قافلے گزرا کیے جنھوں نے دنیا میں اپنے چند روزہ قیام کے دوران میں بنارس اور سانچی اور امراوتی اور اجنتا اور باغ کے نگارستان سجا ڈالے مگر زمانے نے ایک بار پھر پلٹا کھایا اور مالوہ اور قنوج اور مگدھ اور گوڑ میں پھر ہری کی بھگتی کا چرچا ہوا کیدار ناتھ سے لے کر دوارکا تک شنبو کے عظیم الشان مندر تعمیر ہوتے چلے گئے ۔ شاکیہ منی کا راستہ مہایان مذہب اور تانترک اسرار میں تبدیل ہو گیا اور شاکیہ منی وشنو کے اوتار بن کر انہی مندروں میں براجنے لگے ۔ نارنجی لباس والے وہ بھکشو جو موروں کے نشان والے بادشاہ چندر گپت تری چندر کے وقت سے بھی پہلے جنگلوں میں نمودار ہوئے تھے ۔ ایک ہزار سال کی الٹ پھیر کے بعد سدھ کہلاتے تھے اور بنگال اور بہار کے معبدوں میں جادو ٹونے کرتے تھے ۔ مہایان مذہب کا مہا سکھ کا تصوّر عذاب میں تبدیل ہو چکا تھا ۔

کہ ہر بڑا آدرش آخر میں یونہی تباہ کیا جاتا ہے ۔

لیکن آدرش کیا شے ہے ؟

یکلخت کمال کو محسوس ہوا کہ وہ بھی بال کی کھال کھینچنے کی عادت اختیار کر چکا ہے جس طرح اس نے آس پاس کی درس گاہوں میں لمبی لمبی چوٹیاں رکھائے برہمن طالب علموں کو چھیوں فلسفوں کے مسائل کی مین میخ نکالتے سنا تھا ۔

قرب وجوار کے گاؤں میں بنارس اور جھونسی اور مگہر میں اسے بے شمار فقرا ملے ۔

جن کی خانقاہوں میں جا کر اس نے تصوف کی باتیں سنیں۔ قصبوں اور شہروں میں عظیم الشان مدرسے تھے۔ جہاں ایک سے ایک جید عالم تیار کیا جا رہا تھا۔ بڑے بڑے عمامے پہنے شیخ الجامعہ جب اس کے سامنے پالکی میں بیٹھے ہوئے نکلتے تو اُسے بغداد کی یاد آجاتی۔ نیم تاریک مٹھوں میں پنڈت اپنے پوتھی پتروں سے سر کھپا رہے تھے۔ گنگا کے کنارے کنج میں کبیر اور ان کے چیلے پریم پریم کی رٹ لگائے جا رہے تھے مگر وہ ہمیشہ کا ضدی خود پسند عرب، اُس نے تہہ تک پہنچنے کا تہیہ کیا اور جس طرح وہ سلطان حسین کے مستعد سپاہی کی حیثیت سے نئے نئے مہم کے سر کرنے کے لیے اپنا برق رفتار رہوار پر بیٹھا بیٹھا پُرشور ندیوں میں کود پڑتا تھا، اسی طرح اب اُس نے اس اندھیرے سمندر کو لبیک کہا جس میں اس سے پہلے ہزاروں لاکھوں روحیں ڈبکیاں لگا رہی تھیں۔ بہت سے لہروں کے خلاف ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ بہت سے کشتی کا بادبان اتار کر قناعت سے ایک طرف کو ہو بیٹھے تھے اور خود کو ہواؤں کے حوالے کر دیا تھا۔ بہت سے اپنے ٹوٹے پھوٹے جہاز کے تختوں پر بہتے چلے جا رہے تھے۔ بہت سے ایسے بھی تھے جو کب کے ڈوب چکے تھے۔ ساحل تک کوئی نہ پہنچا تھا۔ کیونکہ ساحل نظر نہیں آتا تھا۔ سمندر بہت وسیع تھا اور اتھاہ اور چاروں طرف گھپ اندھیرا سارے میں چھایا تھا ——— بہت سوں کا خیال تھا کہ انھوں نے روشنی کے مینار تعمیر کر لیے ہیں۔ بہت سے سمجھتے تھے کہ جو چراغ انھوں نے اپنی اپنی کشتیوں میں جلائے تھے اُن کی روشنی میں وہ اس سمندر کو عبور کر لیں گے مگر یہ بھی ان کی خوش فہمی تھی۔ ساحل نظر نہیں آتا تھا۔

کنارہ کہاں ہے۔ وہاں پہنچ کر کیا ملے گا۔ صحیح عقیدہ کیا ہے اور خدا کا تصور۔ محبت۔ ویراگ میں کیا حاصل ہوتا ہے۔ نجات کیا ہے؟

پنڈتوں سے اُس نے ان کے خدا کے متعلق پوچھ گچھ شروع کی۔ گو کبیر نے اس سے کہا تھا۔ کاشی کے پانڈے تم کو اور باتیں بتائیں گے۔ میں کاشی کا جولاہا ہوں تم کو میرا گیان بوجھو ——— مگر اس نے اس بات کی سنی ان سنی کر دی۔ اور ان تاریک مٹھوں

اور پُر اسرار معبدوں کو اُس نے باہر سے جھانک کر دیکھا جن کے اندر اسے قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ عود و لوبان کا دبیز دھواں۔ دیوی دیوتاؤں کے عجیب و غریب بت مندروں کے اندھیرے پختہ آنگن پیچ در پیچ گلیاں اور چبوترے اور موکھے جن کے اندر رکھی ہوئی کسی دہشت ناک مورتی کی جھلک اُسے نظر آ جاتی۔ منتروں کا جاپ۔ پھولوں اور مٹھائیوں کے انبار۔ بیلوں اور گایوں اور بندروں اور طوطوں کی یلغار۔ سیڑھیوں پر جمع پجاریوں کی بھنبھناہٹ۔ گھنٹوں کی آواز۔ کیا ان لوگوں کے ذہن، ان کے الٰہیات کے مسائل بھی ان ہی تنگ و تاریک ان گنت برجیوں، گلیوں اور کوٹھڑیوں والے مندروں کی طرح پیچ در پیچ، گنجلک اور ناقابلِ فہم ہیں؟ یہ کون جناتوں کی قوم ہے جسے وہ نہیں سمجھ سکتا؟ اس کو تو اپنے ذہن پر بہت ناز تھا۔ کیا وہ مدرسہ نظامیہ کا زمانہ بھول گیا؟

یہ صحیح تھا کہ ہندو فلسفے اور الٰہیات کے چھ کے چھ مدرسے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ادق تھے اور اسے خود کبھی فلسفے اور مابعد الطبیعات سے لگاؤ نہیں رہا تھا۔ لیکن وہ سارے بنیادی مسائل کی طرف سے آنکھ موند کر محض ہری پریم کی رٹ نہیں لگائے گا۔ ہری کون ہے۔ ہری کون ہے۔ یا رام یا رحیم۔ وہ خدا کو کس نام سے پوجے۔ کیا نام ضروری ہے؟ اور خدا کون سا ہے اور کیا وہ بھی ضروری ہے۔ دنیا بھر میں اہلِ بدعت اور شک پرستوں اور دہریوں کی کمی نہیں ہے لیکن اس کے اسلام اس کے ایمان میں خلل آ چکا تھا؟

اس نے ایک روز چپکے سے کبیر کے کنج سے نکل کر دریا پار کیا اور ایک زبردست جٹا دھاری پنڈت کے پاس جا پہنچا جن کے علم و فضل کا دُور دُور شہرہ تھا۔ اس نے ان سے کہا کہ وہ مناظرے کے لیے نہیں آیا ہے۔ وہ علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔

مگر علم اس قدر وسیع تھا۔ اسے اپنے غیر اہم ہونے کا شدت سے احساس ہوا اور وہ کہاں سے شروع کرے۔ زمانے کتنے پھیلے ہوئے تھے اور صدیوں کے دائرے ملک اتنا وسیع تھا۔ وہ اس کے محض ایک حصے میں اس وقت موجود تھا۔ ابھی اس کو بنگال اور دکھن اور مہا گجرات اور تامل ناڈ کی بھی خبر نہیں تھی۔ وہاں کے علما، وہاں کے گیت کار،

وہاں کی خانقھوں اور فقیہوں کا اسے رتّی بھر بھی پتہ نہ تھا۔

وہ کون سے مدرسۂ فکر کا مطالعہ پہلے شروع کرے۔ عمل اور علم اور محبت تینوں راستے اس کے سامنے کھلے تھے وہ کس پر پہلے چلنا شروع کرے۔

عمل کے راستے کا بیان قدیم ویدوں میں تھا اور کلپ شاستروں اور دھرم شاستروں اور مہابھارت اور پرانوں میں اس کا مذکور تھا۔ مہابھارت میں کرشن نے ارجن کو عمل کی راہ دکھائی تھی۔ ویدک خداؤں کا ملک پر ہزاروں برس سے راج تھا جو رفتہ رفتہ فلسفے کی علامتوں کے بجائے عوام کے ذہن میں دیوی دیوتاؤں کی حیثیت سے براج رہے تھے۔

اس کرم مارگ کے متعلق اُس نے پڑھا کہ یہ علّت و معلول کا رشتہ ہے جس کے ذریعے انسان اور کائنات ایک دوسرے سے بندھے ہیں اور بندش ہمیشہ تکلیف دہ ہوتی ہے اور نجات کرم کے چکر سے آزاد ہو کر ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

دوسرا راستہ علم کا تھا۔ ویدک عہد کے بعد کے حکما نے طے کیا تھا کہ محض عمل سے نجات ممکن نہیں خود عمل کی ماہیت کیا ہے۔ یہ جاننا چاہیئے یہ کھوج لگانے کا راستہ بہت طویل تھا۔ اپنشدوں میں کسی ایسے طریقے کی تحقیق شروع کی گئی تھی جس سے علّت و معلول کا چکر ٹوٹ سکے۔ اس تحقیق نے چھ مختلف مدرسہ ہائے فکر کو جنم دیا تھا۔ منطق کے اُصول وضع کیے گئے۔ کپل نے کہا۔ پرش اور پراکرتی، روح اور مادہ ازل سے اکٹھے موجود ہیں۔ مادہ حرکت کرتا ہے اور تبدیل ہوتا ہے۔ روح خالص شعور ہے مگر وہ تبدیل نہیں ہوتی۔ اس کی موجودگی کی وجہ سے مادہ حرکت میں آتا ہے۔ رُوح کائنات سے علیحدہ ہے۔ کائنات کا اس کے بغیر بھی ارتقا ہوتا ہے۔ کیونکہ ذہن، شخصیت، خودی رُوح میں شامل نہیں لیکن پھر بھی رُوح مادے میں گھل مل جاتی ہے اور اس کی مکتی اُسی وقت ہے جب مادے سے وہ خود کو جدا کر دے۔ مادے میں مبتلا رہنے کا نتیجہ دُکھ ہے۔ اگر اسے اپنے اور پراکرتی کے فرق کا علم ہو جائے تو وہ آزاد ہو سکتی ہے۔ کپل دہریہ تھا اس کے نزدیک تخلیق اور ارتقا خُدائی کارنامہ نہیں بلکہ مادّے کی فطرت تھی۔

پھر کمال نے پتن جلی کے یوگا سُتر پڑھے۔ اس کا ایشور خالق کائنات نہیں بلکہ رُوح

ازلی تھی جو مادے میں مبتلا نہیں ہوئی۔ ویدانت والے وحدت الوجود کے قائل تھے۔

عہدِ عتیق کے برہمن قانون ساز گوتم کے فلسفۂ علم میں اس نے وجود اور عدم وجود بھاؤ اور ابھاؤ کی تفصیلات پڑھیں۔ گوتم نے ادراک منطق اور استنباط کے ذریعے چیزوں کا کھوج لگانے کی سعی کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا خلا میں سے پیدا ہونے کے بجائے ابدی ذرات، زمان و مکان اور ذہن و دماغ نے تخلیق کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ مٹی اور پانی کی طرح ساری مرکب اشیا کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور رہا ہوگا کیونکہ وہ نتیجے کی حیثیت میں موجود ہیں۔ زمان و مکان اور ذرے لامحدود ہیں۔ کسی سبب کا نتیجہ نہیں لہٰذا مرکب اشیا کا سبب کوئی ذہین محرک ہے۔ ورنہ مرکب جوہر کے مادی اسباب یعنی ذروں میں وہ ضابطہ و تنظیم نہیں ہو سکتی جس کے ذریعے ان نتائج کی تخلیق ہوتی ہے۔ اس ذہین محرک کو مادی اسباب کا براہِ راست علم ہوگا اور نتائج کی کارفرمائی کی طاقت بھی۔ کوئی انسان اس علم اور طاقت کا حامل نہیں۔ لہٰذا برہمن قانون ساز گوتم نے کہا تھا کہ اس مرکب اشیاء کی دنیا کا مسبب الاسباب خدا ہے۔

وقت کے متعلق اس نے پڑھا کہ زمان و مکان اضافی ہیں اور محض ایسا خلا نہیں جس میں حقیقت وقوع پذیر ہوتی ہے۔ وقت کے مسئلے پر کمال بہت گڑبڑایا۔ یہ مسئلہ بھی سامی نظریۂ کائنات سے یکسر جداگانہ تھا جس میں ابتدائے آفرینش سے روزِ قیامت تک ایک مخصوص باضابطہ وقفہ تھا جس کے بعد ابدیت ہی ابدیت ہوگی لیکن یہاں تو ابتدائے آفرینش کے بعد پھر ابتدائے آفرینش تھی اور کوئی ایسا مخصوص نقطہ نہ تھا جہاں سے وقت شروع ہوا ہو۔ یہ حکما کہتے تھے کہ وقت کا لمحہ مختلف انسانوں کے لیے مختلف ہے۔ انسانی وقت دیوتاؤں کے وقت کا سوواں اور برہما کے وقت کا دس لاکھواں حصہ ہے۔ لہٰذا چھونے اور محسوس کرنے کی دنیا ہی وجود کی ساری ممکنات سلب نہیں کر لیتی۔ اس نے پڑھا "زمان و مکان حقیقت کی جہت ہیں اور حقیقت وجود میں آنے کی کیفیت کا دوسرا نام ہے اور ابدی ارتقا اور انحطاط اور ہستیوں کے پُرپیچ نمود اور دنیاؤں کے تسلسل کا ایک ایسا چکر ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا۔"

پھر ایک گروہ کا کہنا تھا کہ پہلے خلا تھا اور اس میں کائنات کا ظہور ہوا۔ یہ وحی اور اورالہام کے قائل خدا پرستوں کا گروہ تھا۔ حقیقت پرستوں کا نظریہ تھا کہ فطرت خدا کے ساتھ ابد سے موجود ہے اور آزاد ہے۔ خدا محض صانع اور آفریدگار ہے۔ عینیت پرستوں کے نزدیک خدا کے علاوہ اور کوئی شے حقیقی نہیں تھی۔ پنج راتریوں کا عقیدہ تھا کہ وشنو ذاتِ حقیقی ہے اور لکشمی بحیثیت کریہ شکتی، مشیت ایزدی اور بحیثیت بھوت شکتی کائنات کی ماں ہے۔ بدھ مت والوں کا قول تھا کہ خدا اور روح دونوں کا وجود نہیں۔

وہ کون سے مدرسۂ فکر کا مطالعہ پہلے شروع کرے ——؟

ویدانت نے اسے اپنی طرف کھینچا اور وہ شنکر اچاریہ کے مطالعے میں پھر جٹ گیا۔

پانچویں صدی عیسوی کے بعد سے ملک میں بدھ مت کو زوال آ چکا تھا۔ گندھارا اور کاشمیر اور وادی سوات اور مکران اور بلوچستان اور مدھیہ پردیش ہر جگہ دوبارہ مہیشور کی عبادت شروع ہو چکی تھی۔ ملایا اور سیام دیش اور چمپا کے دور دراز ملکوں میں نیل کنٹھ شیو کی آرتی اتاری جا رہی تھی۔ جس نے ساری کائنات کا زہر پی کر اپنے گلے کو نیلا کیا تھا۔

یہ تصورات بے حد لرزہ خیز تھے۔ مہا بھیرو، آفاق کا خوفناک جوگی جو اپنے ہاتھوں میں برہما کی کھوپڑی کا کشکول لیے ڈمرو بجاتا، تین ڈگ بھر کے تینوں دنیاؤں کو عبور کر لیتا تھا اور فقیروں کی طرح اپنے بیل پر بیٹھا کائنات میں مارا مارا پھرتا تھا۔ مہاکال —— برہما وشنو مہیش کا تیسرا، تباہ کن روپ —— شیو نٹ راج ——

مدھیہ پردیش اور دکھن میں لنگم کے معبد تعمیر کر لیے گئے تھے۔ گپتا عہد میں اب شیو مہاراج کی عملداری تھی۔ عرب سیاح اپنے سفرناموں میں اس عجیب و غریب مذہب کا تذکرہ کر رہے تھے۔ خداؤں کی فوج کی فوج تھی جو ہر طرف کوڑی چاندنی پھر رہی تھی۔ خوفناک عفریت نما دس ہاتھ والی سیاہ فام ڈائنیں۔ پریوں کی ایسی نرم و نازک دیبیاں، چاند

اور سورج۔ آگ اور بادل۔ ہاتھی کی شکل والا اور بندر کی شکل والا۔ ناگ اور کچھوے اور تیرتھ اور میلے اور یاترائیں اور تہواروں کا غل غپاڑہ اور خونی قربانیاں اور جادو منتر اور ٹونے ٹوٹکے ایک ہنگامہ بپا تھا۔ سمندر پار کمبوج دیش اور یاوا دویپ اور سماٹرا میں نئی برہمن شاہنشاہیت کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔ شیو کی ڈمرو سارے میں گونج رہی تھی۔

ہندو مذہب کی تجدید اور نئی تنظیم میں اس اکیلے نوجوان کا کتنا بڑا حصہ تھا۔ جو آٹھویں صدی عیسوی میں مالابار کے ساحل پر آلور ندی کے کنارے ختوگرو برہمن کے یہاں پیدا ہوا۔ علم کے راستے پر چل کر ایک طرف جس نے اپنشدوں اور گیتا اور برہم سُتر کی تفسیریں لکھیں اور دوسری طرف مذہب کو فلسفہ طرازیوں سے بے نیاز کر کے عوامی بنایا جو سارے ملک میں مٹھ قائم کرتا اور مذہب کا پرچار کرتا پھرا اور تیس سال کی عمر میں مر گیا۔

ہندوستان کا عظیم ترین مفکر۔ شنکر آچاریہ!! اس کے فلسفے کا مرکز خدا کی وحدانیت تھی۔ خدا جو خالص ذہن اور خالص وجود تھا۔ نرگن اور دنیا جو مایا تھی۔

لیکن جس طرح دُنیائیں دو طرح کی تھیں۔ ایک حقیقی اور ایک غیر حقیقی۔ اسی طرح علم دو طرح کے تھے۔ اعلیٰ اور ادنیٰ! ۔ برہما اور ایشور۔ چنانچہ عوام جو شنکر اچاریہ کے ذہن کی بلندیوں کو نہیں پہنچ سکتے تھے ان کو اس نے پروہتوں کے حوالے کر کے برہمن عملداری کی جڑیں مضبوط کر دیں۔

—— نیتی —— نیتی —— یہ نہیں ہے۔ یہ بھی نہیں ہے۔ یعنی برہما کا تجربہ نہیں کیا جا سکتا —— اُپنشدوں میں لکھا تھا۔ شنکر آچاریہ نے اس کی تشریح کی۔ نیتی نیتی کا مطلب عدم وجود نہیں۔ ذات حقیقی مکمل بھرپور وجود ہے۔ اور ستھ؛ وجود، چت، شعور جو کائنات کو منور کرتا ہے برہما ہے اور ابدی ہے۔ ست چت اور آنند برہما کی صفات ہیں بلکہ خود اس کی ذات ہے۔ علم برہما کا جوہر ہے۔ ساگن برہما یا ایشور زندہ خُدا ہے۔ پراکرتی اور مایا کے ساتھ برہما ساگن بن جاتا ہے۔ وہ بیک وقت ایشور بھی ہے اور جیو یعنی شخصی خودی بھی۔ شنکر اچاریہ وحدت الوجود کا قائل تھا۔

فلسفی مادھو آچاریہ نے دوئی کے نظریے کا پرچار کیا۔ اُس کے نزدیک برہما اور جیو کے علاوہ تیسری ہستی مادی دنیا کی تھی۔ رامانج نے کہا۔ برہما اور مایا الگ الگ نہیں بلکہ سب برہما ہے —— برہم مایا —

کمال پنڈتوں سے برہم سُتر کی تفسیر پڑھتا رہا۔ شنکر آچاریہ نے کہا تھا کہ حقیقت کو دو مختلف معیاروں سے جانچا جا سکتا ہے۔ ایک راستہ یہ علم کا تھا جس پر کمال خود گرتا پڑتا لشٹم پشٹم چلا آ رہا تھا۔ تیسرا راستہ ابھی باقی تھا۔ جانے اس میں اتنی ہمت باقی رہ جائے گی کہ وہ اس راستے کو بھی آزما دیکھے۔

مدرسوں میں جزا و سزا اور خیر و شر کے مسئلے پر طویل بحثیں جاری تھیں۔ مسلمانوں کے بہتر کے بہتر فرقے بزعمِ خود صحیح راستہ پر تھے۔ صوفی اور درویش اپنے اپنے حلقے پھیلائے بیٹھے تھے اور خدا کی محبت میں آہیں بھر رہے تھے۔ اُس نے معتزلیوں سے مباحثے کیے جو مذہب کو عقل سے پہچاننے کے مدعی تھے۔ شیعوں نے اسے اپنی جانب بُلایا۔ جن کا غلو اور حلول اور تناسخ کا فلسفہ اہلِ ہنود کے فلسفوں سے ملتا جلتا تھا۔ راسخ العقیدہ سنّیوں نے اسے بتلایا کہ بعد کے صوفی شیعہ تصوّرات اور ویدانت کے ہمہ اوست کے مسئلے کو اپنے مسلک میں شامل کر کے اچھے خاصے ہندو بن گئے ہیں۔ ملامتیوں کے قصّے بھی اُس نے سُن رکھے تھے۔ گنگا کے کنارے کنارے آم کے درختوں میں چھپی ہوئی خانقاہوں میں اُس نے ان اللہ کے بندوں کو دیکھا جو لاہوت سے ناسوت تک سارے فاصلے طے کر چکے تھے یا جو تصوّرِ شیخ میں گم بیٹھے تھے۔ نروان اور فنا کی تلاش میں اُس نے یوگیوں اور صوفیوں دونوں کو مراقبے اور سمادھی میں کھوئے ہوئے دیکھا۔ علم کا راستہ وہ طے کر رہا تھا مگر اس کا دماغ چکرا رہا تھا۔ یہ راستہ بل کھاتا جانے کتنی دور تک جاتا تھا۔ ابھی تو وہ پہاڑ کے دامن ہی میں پہنچا تھا۔ صُوفیوں نے اسے اپنی اور بلایا۔ انھوں نے کہا "آخری حقیقت روشنی ہے۔ نُور —— نُور —— نُور —— جو نُور نہیں۔ اس کا وجود نہیں۔ جنید اور درویشوں نے اسے بتایا۔ آخری حقیقت خیال ہے۔ خدا کے جلال و جمال اور کمال کے ذکر کی گونج اُس نے ان کُنجوں میں سُنی۔ کیونکہ یہ ہندوستان

تھا۔ یہ فرید الدین عطارؒ اور ہجویریؒ اور شیخ جلال الدین تبریزیؒ اور بہاؤالدین ذکریاؒ اور جلال الدین سرخپوشؒ اور معین الدین چشتیؒ اور قطب الدین بختیار کاکیؒ کا ملک تھا اور کون بدقسمت ہوگا جو اس ملک میں آکر بھی وہ نہ پا سکے جس کی اُسے تلاش تھی۔

مگر ابھی تو وہ کپل اور شنکر اچاریہ کے پہلے ابواب بھی نہ پڑھ پایا تھا۔ کیا وہ یُونہی خالی الذہن خالی دماغ لے کر ان سنتوں اور صوفیوں کے پاس چلا جائے — ؟ دل میں شبہے رکھے اور ان معصوم لوگوں کو دھوکا دے؟

ایک رات وہ گھنٹوں بیٹھا مٹھ کی دیوار کے نیچے سوچا کیا۔ اندر روشنی ہو رہی تھی۔ پنڈت اشلوک پڑھ رہے تھے۔ وہ اندر نہ جا سکتا تھا۔ اسے یہ اشلوک بہت اجنبی تھے۔ سارے جونپور کے علماء اور کاشی کے پانڈے اسے حلقہ باندھے دانت نکوستے نظر آئے۔ وہ ان سے علیحدہ نیچے موجود تھا۔ کوئی اُس کی بات ہی نہ سُنتا تھا۔ وہ دیوار کے نیچے بیٹھا رہا۔

صاجو مہربان — صاجو مہربان — اس نے پلٹ کر دیکھا۔

رات کی ہوا میں خنکی آچلی تھی۔ قریب سیڑھیوں پر چند پہاڑی آن بیٹھے تھے اور وہ اکتارے پر الاپ رہے تھے — صاجو مہربان — صاجو مہربان — صاجو —

اُس نے انگڑائی لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کمال الدین — اس نے اپنے آپ سے کہا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کبیر کا صاحب تمھیں واپس بُلا رہا ہے۔ وہ جو بہت مہربان ہے۔ دونوں راستے تم نے دیکھ لیے۔ لیکن ابھی محبت کا راستہ باقی ہے۔ اس پر چل کر شاید تم اس تک پہنچ سکو۔ ہاں۔ ابھی محبت کا راستہ باقی ہے۔

اس نے دوبارہ گھاٹ کا رُخ کیا اور گنگا عبور کر کے کبیر کے کنج میں واپس جا پہنچا۔

اب تو لگتا تھا جیسے عمر بھر سے وہ انھیں فضاؤں میں سانس لیتا آیا تھا۔ جہاں ڈھاک کے جنگلوں سے قرنے کی صدائیں بلند ہوتیں۔ جہاں گورکھ ناتھ کے جوگی شیر کی کھالیں اوڑھے کانوں میں کنڈل ڈالے سینگی اور نرسنگھے بجاتے جسم پر بھبھوت ملے ان جنگلوں میں گھومتے تھے جہاں ڈھاک پھولتی تھی۔ یہ کیسی انوکھی فضا تھی نظیں جہاں نو سو ننانوے قسم کے ناتھ اور چوراسی قسم کے سدھ پہاڑوں کی گپھاؤں اور نیم تاریک مٹھوں اور لرزہ خیز معبدوں میں اپنے اپنے دائرے پھیلائے بیٹھے تھے اور کپالک اور کالا مکھ بدن پر راکھ ملے کھوپڑیوں کے ہار پہنے کڑا بجاتے چاروں اور گھومتے تھے۔ ایک سے ایک پرم ہنس اور یوگی ندیوں کے کنارے کٹیوں میں بیٹھا تھا۔

یہ سکون بخش ماحول جہاں گیت تھے اور ڈھول اور مجیرے کی صدائیں۔ بسنت رت آتی تو سارے میں زرد اور دھانی رنگ پھیل جاتے۔ گریشم رت میں درختوں سے مہوہ ٹپکتا اور آم کے درخت بور سے لد جاتے۔ رنگیلی برکھا رت میں چندریاں ہوا میں لہراتیں۔ لاؤنیاں گائی جاتیں۔ لڑکیاں پکوان بناتیں۔

بھادوں کے مہینے میں گنگا مائی کا جوش اور غصہ دیکھنے والا ہوتا۔ شرد کے موسم میں پیلی چاندنی سارے میں پھیلتی اور اداس سہاگنیں اپنے پردیسی شوہروں کی یاد میں برہا الاپتیں چرخہ کاتتیں اور ساس نندوں سے لڑتیں۔

ہیمنت رت آتی اگہن اور پوس کی سرد ہوائیں چلاتیں۔ الاؤ جلتے۔ آلھا اودل گایا جاتا۔ ماگھ اور پھاگن کے مہینوں میں کھیتوں پر پالا برستا۔ چنے اور ارہر کے پودوں پر اوس کے قطرے جگمگاتے۔ کسانوں کے جھونپڑوں سے چکی کی گھر گھر کی صدائیں بلند ہوتیں۔

آوازوں اور رنگوں کی اس دنیا میں وہ مکمل طور پر رس بس چکا تھا۔

یہ سب تھا مگر چمپا نہیں تھی اسے کون زمین نگل گئی۔ کون آسمان کھا گیا۔ کون چتا کے شعلوں کی وہ نذر ہوئی۔ کس ندی کی لہروں نے اسے اپنی اور کھینچا۔

یہ کون بتا سکتا تھا؟ ان گنت تہوار آئے اور نکل گئے۔ رکشا بندھن اور بھیا دوج۔ اور جنم اشٹمی اور ہولی اور دیوالی اور محرم اور رام لیلا۔ کسی ہنگامے کسی میلے کسی گاؤں کسی بستی میں وہ نظر نہ آئی۔ وہ سارے میں مارا مارا پھرا۔ ایک دو بار وہ ایودھیا گیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ عمر الخیں سبزہ زاروں، سرجو اور گنگا کے ان ہی ساحلوں پر گزار دے۔

چمپا کی یاد اب ایک عجیب حیثیت سے اس کے دل میں رہتی تھی۔ بھگتی مارگ میں اس نے دیکھا تھا کہ وشنو، انتریامی ایسا خُدا ہے۔ جو دلوں کے اندر رہتا ہے۔ وہ باپ ہے۔ شوہر ہے۔ ماں ہے۔ دوست ہے۔ رادھا کے لیے کرشن ہے۔ کرشن کے لیے رادھا ہے۔ اُس نے سوچا کہ عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کا فاصلہ تو بہت سے طے کرتے ہیں مگر چمپا اُن گنت اندھیروں میں میرے لیے اُجالا کرتی جاتی ہے۔ جب وہ ساون کی راتوں میں لڑکیوں کے گیت سُنتا تو دُنیا بالکل ایک نئی شکل میں اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتی۔ کیونکہ اب اسے معلوم تھا کہ الفاظ کے معنی کیا ہیں۔ ویراگن جو پیا کی تلاش میں اندھیری رات میں نکل کھڑی ہوئی، برہا کی رات فراق تھی۔ جوگن، گوری سہاگن خدا کا بندہ تھا، پتی، پیا، منوہر، گردھر گوپال، خدا تھا جس کی کھوج میں گوری راج پاٹ چھوڑ بنوں میں ماری ماری پھر رہی تھی۔ عرب و عجم کی شاعری کی تصوّراتی کائنات سے جو اس کا رشتہ اب تک رہا تھا۔ وہ اس رشتے سے بالکل مختلف تھا۔ جو اُس نے ان الفاظ، ان سُروں، مدھم رنگوں سے قائم کیا۔

خدا ساقی نہیں تھا۔ خدا پیتم تھا۔ ہری۔ شیام۔ کنہیا اور رام ــــ موہے رام سے کوئی ملا دے۔ موہے رام سے ــــ کوئی کہے وہ بسے اودھ میں کوئی کہے بندرابن میں ــــ کوئی کہے وہ بسے اودھ میں ــــ

وہ مہینوں یونہی ادھر اُدھر پھرا کیا۔ ایک بار وہ ایودھیا سے کئی مہینے تک واپس نہ آیا۔ کاشی میں اس کی ڈھنڈیا مچی۔ لااُبالی سیلانی آدمی ہے۔

بغداد لوٹ گیا ہوگا۔ کسی نے کہا مگر اسے بغداد سے کیا مطلب۔ وہ تو گھاگرا کے کنارے کنارے گھومتا پھرتا تھا۔ جب وہ لوٹ کر آیا اسے جولاہوں کی بستی واپس جاتے ہوئے ڈر سا لگا۔ گرو اسے ڈانٹیں گے تو نہیں کہ تم اب تک کس چکر میں مبتلا ہو۔ لیکن میاں کبیر اسے دیکھ کر مسکرا دیے تال سوکھ کر پتھر بھیو۔ ہنس کہیں نہ جائے۔ پچھلی پیت کے کارنے کنکر چُن چُن کھائے۔ انھوں نے کچھ دیر سوچ میں ڈوبنے کے بعد کپڑے کا تانا تیار کرتے ہوئے کہا۔

کمال وہیں مٹی سے لپے ہوئے فرش پر بیٹھ گیا اور کرگھے کی آواز سننے لگا۔ ہنس کہیں نہ جائے۔ ہنس کہیں نہ جائے۔ وہ یہاں سے کہاں جا سکتا تھا۔ پچھلی پریت کا ناطہ تو بہت گہرا ہوتا ہے۔ وفا کا مطلب اس کی سمجھ میں آیا۔ وفا کا راستہ تو اسے چمپا ہی نے بجھایا تھا۔ وہ کبیر کے ساتھ ساتھ ایسے رہتا جیسے گنگا کے جلو میں جمنا جی بہتی ہیں۔ اور چمپا اس کے ساتھ ساتھ اس طرح بہتی جیسے سنگم کے ساتھ سرسوتی جو مادی آنکھوں کو نظر نہیں آتی۔

مگر یہ ساتھ بھی چند روزہ تھا۔ کاشی کے پنڈتوں اور مولویوں نے سلطان سکندر سے فریاد کی یہ بدعتی جولاہا عوام کو گمراہ کر رہا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر لوگوں نے گنگا میں ڈبو دیا مگر وہ مفتری جولاہا 'جل تھل راکھت ہیں رگھو ناتھ' کا نعرہ لگاتا پانی سے باہر نکل آیا۔

دِلّی کا سلطان بڑا دیالو اور دین دار مسلمان تھا۔ اس نے میاں کبیر سے کہلوایا کہ وہ شر سے محفوظ رہنے کے لیے کاشی سے کہیں دور چلے جائیں۔

۲۵

میاں کبیر بنارس سے جلاوطن ہوئے۔ شو پوری کا جنگل اجڑ گیا۔ جہاں مولسری مہکتی تھی اور سدرشن کے پھول کھلے تھے۔ میاں کبیر کا کرگھا سنسان پڑا تھا۔ ان کے مکان پر خاموشی چھائی تھی۔ کمالی ان کی چھوٹی سی بچی بستی کی گلیوں میں روتی پھرتی تھی۔ کاشی نواسیوں

کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ کمال نے ایک بار پھر اپنا رختِ سفر باندھا اور گنگا کے گھاٹ پر پہنچ کر بنگال جانے والے جہاز پر سوار ہو گیا۔ اس کے ایک طرف یہاں سے سینکڑوں میل دور گوڑ تھا۔ جہاں وہ آج سے کئی سال اُدھر اپنے سلطان کو تنہا چھوڑ کر چلا آیا تھا۔

چند ہفتوں بعد جہاز پٹنہ پہنچا۔ پٹنے میں اسے معلوم ہوا کہ سلطان حسین شرقی گوڑ سے بھاگل پور آ گیا تھا اور یہاں چند سال گزرے اسی جلاوطنی کے عالم میں خدا کو پیارا ہوا۔

سلطان حسین شرقی جس نے موسیقی کی دنیا میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا تھا۔ وہ جنگوں میں لڑا بھڑا جنگلوں میں مارا مارا پھرتا رہا اور ختم ہو گیا۔

لیکن حسینی پیا جس کی سلطنت چند روزہ تھی اور جسے زندگی میں امن نصیب نہ تھا سُر میں ڈوب کر زندہ رہا۔

سُر کی لہروں پر بہتے ہوئے اب کمال نے نئی نئی دنیاؤں کی سیر شروع کی۔ نغمہ جو سب سے پہلے پیدا ہوا نغمۂ حق جسے کبیر انہد ناد کہتا تھا۔ باجت انہد ڈھول رے۔ تجھے ہری ملیں گے۔ تجھے ہری ملیں گے۔ تجھے ہری ملیں گے۔

موسیقی کی یہ ساری دنیا اس کی اپنی تھی۔ جے دیو اور ودیاپتی اور چنڈی داس کے بھجن۔ ماہی گیروں اور کسانوں کے گیت۔ کوچہ گرد فقیروں کے لحن۔ اس دنیا میں حملوں اور شب خونوں اور فوجوں کی یلغار، سیاسی تلاطموں، جلاوطنی اور موت کا کھٹکا نہ تھا۔ موسیقی کی وحدت خدا کی وحدت تھی۔

بنگال پہنچ کر وہ گنگا کے کنارے ایک ایسے گھاٹ پر اُترا جس کا نام اس کو معلوم نہ تھا۔ یہاں پان کی بیلیں پھیلی تھیں اور دھان کے کھیت تھے اور جھیلوں میں نیلے پھول کھلے تھے۔ برگد کے درخت کے نیچے کسی مرشد کی خانقاہ تھی۔ اس نے وہیں رہنا شروع کر دیا۔ بنگال جو سُریلی آوازوں کا وسیع بھنور تھا۔ باؤل گانے والوں کی ٹولیاں اکتارہ بجاتی گلی گلی گھومتیں داستان گو گا گا کر روپ کتھائیں سناتے مانجھی اور سپیرے اور

ہاتھی پکڑنے والے ہر سمے گاتے رہتے۔ کرشن اور رادھا کی محبت میں ہر انسان سرشار نئے نئے راگ الاپتا پھرتا تھا۔ اس سحر انگیز سرزمین کے باسیوں کی رگ رگ میں موسیقی رچی تھی۔ کمال ان گوجر گرد شاعروں کے ساتھ سارے میں گھومتا پھرا۔ پورب میں دریاؤں کی لہروں پر اپنی ناؤ کھیتا وہ چاٹگام کی پہاڑیوں اور اراکان تک جا پہنچا۔ یاتریوں کے ساتھ وہ سیتا کنڈ گیا جہاں اونچی پہاڑی پر جس کے دونوں طرف گہرے کھڈ تھے اور جن میں باگھ گھومتے تھے، سیتا مہارانی کا مندر تھا۔ پہاڑی کے گھنے پُر خطر جنگلوں میں صدیوں پرانے مٹھ تھے اور پہاڑی کے دامن میں سنگِ سُرخ کے تالاب کے کنارے معبد بنے تھے اور برگد کے درختوں کے نیچے لڑکیوں کی ٹولیاں بیٹھی کیرتن گاتی تھیں۔

چاٹگام کا علاقہ دلفریب تھا۔ بل کھاتے تندرو عظیم دریا، خطرناک بن۔ خوشبودار پھول اور پھل سرسبز پہاڑی راستے بانس کے گھنے جھنڈ جن کے اندر عمیق تاریکیوں میں خانقاہیں تھیں۔

ایک روز وہ ان جنگلوں میں سے گزر رہا تھا اسے ایک تالاب کے کنارے چند لوگ اکتارہ بجا کر گاتے دکھلائی دیئے۔ وہ ان کے قریب پہنچا۔ یہ نظام ڈاکو کا گیت تھا جو وہ لوگ لہک لہک کر انتہائی عقیدت کے ساتھ گا رہے تھے۔ اس کی دھن کیرتن کی ایسی تھی۔ ایسی نعت کمال نے آج تک نہ سُنی تھی۔ وہ دلچسپی سے کان لگا کر سننے لگا۔ اس گیت کا مصنف ان علاقوں کا بہت بڑا ڈاکو تھا جو سو سال گزرے یہاں لوٹ مار مچایا کرتا تھا اور پھر صوفیوں کی سنگت میں پڑ کر خود بھی بہت بڑا ولی اللہ بن گیا تھا۔

"اگر محمدؐ اوتار جنم نہ لیتے — " کیرتن منڈلی نے گایا۔

"تو اللہ کی حکومت ترلوک میں قائم نہ ہوتی۔

نمو نمو ہے عبداللہ اور آمنہ

تجھے ہو مکہ نگری کی اور سارے اولیاء کی اور بی بی فاطمہؑ کی جو سارے جگ کی ماتا ہیں۔

جَے ہو اُتر میں ہمالیہ کی جس کے قدموں میں ساری کائنات پھیلی ہے۔
جَے ہو پورب سے نکلتے سوریہ کی
اب میں وندرا بن کے سامنے جھکتا ہوں۔
بھگوان کرشن اور شری رادھے کو اور چاروں کھونٹ ندیوں اور ساگروں کو
میرا پرنام

جَے ہو مسلمانوں کے فرقوں کی
جَے ہو دھرتی ماتا اور پوتر گنگا ندی کی
پانڈوا کی مسجد کو میرا پرنام
کیونکہ وہ بڑا پیر ایک بار ان خطوں سے گزرا تھا۔
اب میں آگے بڑھ کر سیتا گھاٹ پہنچتا ہوں۔ آدرش استری سیتا دیوی اور ان کے
مہاراج رگھوناتھ کو میرا پرنام۔

جَے ہو۔ جَے ہو۔ جَے ہو۔"

کمال حیرت زدہ بیٹھا یہ عجیب وغریب نعت سنتا رہا اور پھر گانے والوں کی آواز میں آواز ملا کر خود بھی گانے میں شامل ہو گیا۔ اب وہ بغداد سے ہزاروں لاکھوں میل دور نکل آیا تھا ——— مذہب اپنے گرد و پیش، اپنے ماحول اور پس منظر سے کس طرح متاثر ہوتا ہے۔ کس طرح اس کی جڑیں ایک اجنبی سرزمین میں پھیلتی ہیں۔ کمال گاتا رہا۔ جے ہو۔ جَے ہو۔ جَے ہو ———

اب وہ ایک نئی زبان سیکھ رہا تھا۔ یہ بنگالی زبان تھی جو اودھ اور بہار کی بولیوں سے زیادہ مختلف نہ تھی اور سنسکرت سے قریب تر تھی اور ملک کی دوسری جدید زبانوں کی طرح تیزی سے اس کی نشوونما ہو رہی تھی۔

یہ بڑی میٹھی زبان تھی۔ اب وہ اسے اپنی زبان سمجھنے لگا۔ اسی میں بات چیت کرتا اسی میں سوچتا اسی میں لکھتا۔

ایک زمانہ وہ بھی تھا جب وہ دربار جونپور کے ایک امیر کی حیثیت سے یہاں آیا

تھا۔ گو وہ دربار اس وقت لُٹ چکا تھا لیکن — حسین شرقی اور اس کے ساتھیوں کی شان و شوکت بہرحال باقی تھی لیکن دُنیا تو اب مدتیں ہوئیں جونپور کے ابوالمنصور کمال الدین کو بھول چکی تھی کسی کو کیا معلوم کہ یہ خوبصورت نوجوان جس کے سر کے بال کنپٹیوں پر سے تھوڑے تھوڑے سفید ہو چلے ہیں اور جو چمپا کے درخت کے نیچے بیٹھا ایک باؤل سے کنجن مالا کی کہانی سُن رہا ہے۔ یا ایک تارہ بجا بجا کر کبیر داس کی کوئی بانی الاپ رہا ہے یا کاغذ قلم لیے بنگالی زبان میں کوئی لوک کہانی قلمبند کرنے میں مصروف ہے۔ یہ کون ہے۔

گاؤں کی ناونوں اور باؤل گانے والوں سے گیتی کتھائیں سنتے سنتے اس سرزمین کے بہت سے مناظر اس کی نظروں کے سامنے سے گزرے پال بادشاہوں کا بنگال جب گوتم بدھ کے پجاری یہاں موتی رولتے تھے۔ جب پدما اور بھاگیرتی اور مدھومتی پر میورپنکھی جہازوں کے بجرے تیرتے تھے۔ جب ان سایہ دار راستوں پر سے پھولوں سے ڈھکے پشپ رتھ گزرتے تھے جن میں بیٹھی چترنی ناریاں مدھر مدھر ہنستی تھیں۔ جگمگاتے محلوں میں رہنے والی ملکہ مینامتی زرنگار چتر ڈولوں کے سُرخ پردوں سے جھانکتی دلہنیں — وہ سب کہاں گئیں؟ — وہ شان و شوکت کا زمانہ کیسے ختم ہوا؟ بدھ بنگال جو ہیرے جواہرات اور سونا اور موتی رولتا تھا۔ وہ سب کیا ہوا۔ اب تو سین بادشاہوں کے محلوں میں بھی اُلّو بولتے تھے۔ گوتم بدھ اور دیبی تارا اور اَوَلوکیتشور کے پجاری دھڑا دھڑ مسلمان ہوتے جا رہے تھے۔ تاریخ کے نقشے کس طرح بدلتے ہیں۔ کمال آنکھیں بند کر کے سوچتا۔

کئی سال تک وہ اسی طرح کہانیاں اور گیت لکھتا رہا۔ وہ مورخ، محقق، سیاستدان سپاہی، صوفی، کبیر کا چیلا اب گیت کار بن چکا تھا۔

اسی طرح گھومتے پھرتے وہ بھونار گاؤں پہنچا اور وہاں اس نے شادی کر لی۔ اس لڑکی کا نام شُنیلا تھا۔ وہ ذات کی شودر تھی۔ کمال ایک روز جب وہ تالاب کے کنارے گاگر لے کر آئی تھی۔ اس کے لمبے بال اور سیاہ پلکوں پر عاشق ہو گیا۔ یہ عمر اور یہ ذہنی پختگی عشق

لوگ سوار تھے اور کیسے کیسے ارادے اور تمنائیں لیے اس اندھیرے میں ایک منزل کی سمت رواں تھے۔ ان سب کا کیا حشر ہو گا۔ کمپنی کے تاجر۔ کلکتہ کونسل کے وہ ممبر جو رخصت کے بعد واپس جا رہے تھے۔ مدراس کا چیف جسٹس۔ اعلیٰ خاندانوں کی چند بن بیاہی لڑکیاں جو حسبِ معمول اس امید میں ہندوستان جا رہی تھیں کہ وہاں ان کی شادیاں ہو جائیں گی۔ جہاز کا کپتان حیدر علی کے معرکے کے قصے سنا رہا تھا۔ پٹنے اور ڈھاکے کے نیل کے تاجر ہر وقت اپنی کاروباری باتوں میں مگن رہتے اور سب کے سب متواتر مڈیرا پیتے۔ کوئنز کالج کیمبرج کے خاموش کواڈرینگل سے نکلنے کے بعد سرل نے دیکھا دنیا دراصل یہ تھی۔

پھر جہاز جنوبی افریقہ کے ساحلوں کے پاس سے گزرتا ہندوستان کے قریب تر ہوتا گیا۔ راسِ امید تک پہنچتے پہنچتے سرل نے اندازہ لگایا کہ ایک بن بیاہی اعلیٰ خاندان کی لڑکی اس پر ڈورے ڈال رہی ہے۔ وہ ان سب میں معمولی شکل کی تھی اور کسی فوجی کپتان سے شادی کرنے جا رہی تھی جو فورٹ جارج میں تعینات تھا مگر وہ سرل کی صورت پر ریجھ گئی۔ پھر اس نے جہاز کے کپتان اور دوسرے ساتھیوں سے سرل کے مالی حالات کا پتہ لگایا تو اُسے معلوم ہوا کہ ابھی وہ بہت غریب ہے اور کمپنی میں فیکٹر کی حیثیت سے ملازم ہو کر جا رہا ہے اور لڑکیوں کے بجائے فی الحال کتابوں میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔ اس کے بعد مس اراَبلا نے شوربے کے ایک موٹے تاجر سے عشق لڑانا شروع کر دیا۔ جہاز کی اس چھوٹی سی دنیا میں یہ سب نہ ہوتا تو یہ مہینوں کا سفر اجیرن ہو جاتا۔

دُنیا بدلتی جا رہی تھی۔ وہ سکون جس میں ڈوبا ہوا انگلستان وہ اپنے پیچھے چھوڑ کر آ رہا تھا۔ زیادہ دن اس حالت میں نہیں رہے گا تئے نئے کارخانوں سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں نے اس کے ملک کے پھولوں کی رنگت بدل دی تھی۔

پھول۔ بہاریں۔ پیرس۔ ہائے پیرس۔ وائے —— سرل نے ایک گہری سانس لی۔ پیرس بھی تو ابھی ابھی خون میں نہایا تھا۔ انقلاب ——؟

روسو۔ والٹیر۔ آزادی —؟

امریکہ کی جنگِ آزادی —؟

جہاز اب مڈغاسکر کے پاس سے گزر رہا تھا۔ یہ مشرق تھا۔ حبشی غلاموں کا وطن اور مشرق سرل کا منتظر تھا۔ چین اور ہندوستان اور ایران اور مصر سب چلّا چلّا کر اسے پکار رہے تھے۔ او بھائی سرل آؤ ہم نے تمہارے سواگت کے لیے ساری تیاریاں کر رکھی ہیں۔ انجیلیں لے کر اور بندوقیں اور تلواریں لے کر آؤ اور آ کر ہماری کھال تک اتار لو۔ کانپور اور ڈھاکے کے پُرانے پاپیوں نے اسے بتانا شروع کیا۔ سمجھ سے کام لو تو چند سال میں لکھ پتی بن جاؤ گے۔

"یہ سراج الدولہ کون تھا۔" سرل نے پیٹر جیکسن سے پوچھا۔

"سراج الدولہ۔" پیٹر نے ناک بھوں چڑھائی "میں تم کو اس کا سارا واقعہ تفصیل سے سناؤں گا۔ میں قاسم بازار میں رہ چکا ہوں۔ بڑا سخت بیہودہ تھا۔ ظالم مکار۔ مگر ہمارے وفادار دوست بھی ہیں۔ مثلاً اودھ کا موجودہ نواب۔"

"وہ کون ہے؟"

پیٹر جیکسن نے سرل کو فیض آباد اور لکھنؤ کی الف لیلوی داستانیں سنانا شروع کیں۔ پھر میسور والوں کا اور ارکاٹ کا تذکرہ کیا۔ بمبئی پہنچتے پہنچتے سرل پچھلے دو سو سال کے واقعات سے واقف اور ہندوستان کی پوری تاریخ کا ماہر ہو چکا تھا۔ ہندوؤں کی بربریت۔ ایک سُرخ زبان والی مورتی کو پوجتے ہیں۔ بیواؤں کو آگ میں زندہ جلاتے ہیں ننگے پیر گھومتے ہیں۔ گائے اور بندر اور سانپ کو خدا سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں کے مظالم۔ عورتوں کو پردے میں گھونٹ کر رکھتے ہیں۔ پندرہ پندرہ شادیاں کرتے ہیں۔ غرضیکہ پیٹر جیکسن نے جو کچھ اسے بتایا وہ خاصا پریشان کُن تھا مگر بہرحال حقائق سے کون چشم پوشی کر سکتا ہے اور یہ سب تاریخی حقائق تھے جن پر پیٹر جیکسن نے روشنی ڈالی تھی۔ یہ طے شدہ بات تھی کہ نیٹو بلحاظ نسل کمتر تھے۔ ایشیائی سارے اور ہندوستانی بالخصوص گھٹیا درجے کے انسان تھے۔ عثمانی ترکوں سے بھی بدتر

کیونکہ عثمانی ترک کم از کم سفید فام تو تھے۔ نیٹو چونکہ نسلاً گھٹیا ہیں۔ لہٰذا ان کے دماغ بھی بے حد پست ہیں۔ بنگال میں ایک رائل ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی گئی ہے جو کھود کھود کر جانے کس زمانے کی بکواس نکال رہی ہے۔ سنسکرت اور خلا اور ڈھما کا۔ مردہ زبانیں جن میں جادو ٹونے کے نسخے لکھے ہیں۔ اس پر ہمارے چند محققوں نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ ہندوستانی بھی ایک زمانے میں مہذب تھے۔"

پیٹر نے بات ختم کی۔

سامنے بمبئی کا ساحل نظر آرہا تھا۔

ہندوستان — !!

جہاز بندرگاہ میں لنگر انداز ہوا۔ مسافر اتر کر ساحل پر آگئے۔ ڈیڑھ سو سال قبل تک سورت کی بندرگاہ پر مغل کسٹم افسر یوروپینوں کا ناطقہ بند کر دیا کرتے تھے۔ مگر اب اپنی حکومت تھی۔ سرل کے سارے ساتھی ٹھاٹھ سے سیٹی بجاتے جہاز سے اترے اور بہت سے سیاہ فام انسانوں نے آکر ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور دوڑ دوڑ کر ان کا اسباب اتارنے میں مشغول ہو گئے۔ پریڈنسی مجسٹریٹ کی پالکی پیٹر کے استقبال کے لیے آئی ہوئی تھی۔ سرل اس کے ساتھ پالکی میں بیٹھ کر مالابار ہل کی طرف چلا۔

سڑک کے دونوں طرف دولت مند پارسیوں کے مکان تھے۔ جن کی عورتیں لکڑی کی بالکنیوں میں سے جھانک رہی تھیں اور نیچے بچے کھیل رہے تھے۔ مضبوط جسموں والی مراٹھی عورتیں تیز رنگوں کی ساریاں پہنے ساحل کی ریت پر چل رہی تھیں۔ مالابار ہل پر پھول کھلے تھے۔ بارش ابھی ہو کر تھمی تھی۔ انگریزوں کی کوٹھیوں کی کھپریل کی چھتوں پر رنگ برنگے پھولوں کی بیلیں پھیلی تھیں اور کیلے اور ناریل کے پتوں سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ پیٹر اور سرل کا میزبان پھاٹک تک ان کا استقبال کرنے کے لیے آیا۔ پھر انھوں نے لکڑی کے ستونوں والے برآمدے میں بیٹھ کر چائے پی۔ گوانیز خانساماں جو اپنے آپ کو پرتگالی کہتا تھا لپک لپک کر مہمانوں کی خاطریں کرتا رہا۔ پھر بے ہنگم سا سایہ پہنے میری باہر آئی جو صاحب خانہ کے بچوں کی کھلائی تھی۔

بمبئی پہلی پورتگیز لڑکی تھی جو سرل نے دیکھی۔ سرل اپنے کمرے کے دریچے میں کھڑے ہو کر سمندر کا نظارہ کرتا رہا۔ کمرے میں حبشی غلام لڑکا لپا جھپ اس کے جوتوں پر پالش کر رہا تھا۔ یہ لڑکا دوسرے غلاموں کے ساتھ مڈغاسکر سے درآمد کیا گیا تھا اور جتنی دیر وہ کمرے میں رہا۔ سرل کو بڑی وحشت محسوس ہوتی رہی مگر بہرحال یہ مشرق تھا۔ شام کو وہ سب ہوا خوری کے لیے نکلے۔ اردشیر صاحب خانہ کے پارسی کوچمین نے جھک کر مؤدبانہ لہجے میں پوچھا۔ "کس طرف؟"

"چرچ گیٹ چلو" — پھر میزبان نے سرل سے کہا "نوجوان لڑکے ہمارا شہر تمھارے شاندار کلکتے کا تو مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جہاں تم جا رہے ہو مگر بمبئی کی بھی کیا بات ہے۔" اپالو سے لے کر چرچ گیٹ تک گھاس کے سرسبز قطعے تھے اور ناریل کے گھنے جھرمٹوں کے درمیان پانی کی جھیلیں جگمگا رہی تھیں۔ دور کولابا کے لائٹ ہاؤس میں روشنی چمک رہی تھی۔ بندرگاہ میں کئی جہاز کھڑے تھے۔ بڑی گہما گہمی تھی۔ اس رات میزبان کے یہاں کھانے پر سرل کو دو پارسیوں سے ملوایا گیا۔ یہ دونوں جہاز سازی کے کارخانے کے مالک تھے اور فر فر انگریزی بول رہے تھے۔ کس قدر بھانت بھانت کے باشندے اس ملک میں ہیں۔ سرل نے حیرت سے سوچا۔

چند روز بعد وہ پیٹر جیکسن کے ساتھ فیکٹری دیکھنے کے لیے سورت گیا۔ مغربی گھاٹ کا خوبصورت علاقہ اور کلیان اور ناسک کا حسن اور سرسبز پہاڑی راستے جن پر نیلا کہرہ چھایا ہوتا اور تاپتی کے کنارے۔ تھا گجرات دیش کے سبزہ زاروں پر سورت بسا ہوا تھا سورت — مغلوں کی بندرگاہ سو سال پہلے جس کی آبادی لندن اور پیرس سے زیادہ تھی اور جس کے باغوں میں فوارے چل رہے تھے اور جہاں رنگین چنریاں اوڑھے لڑکیاں لکشمی کے آگے دیئے جلانے کے بعد گربا ناچتی تھیں۔

بمبئی لوٹ کر آنے کے بعد سرل دوسرے جہاز کا منتظر رہا جو اسے مدراس اور کلکتے لے جائے۔ پیٹر جیکسن فی الحال یہیں ٹھہر رہا تھا۔ اب سرل کو تنہا سفر کرنا تھا۔ وہ ہندوستان کا ایک حد تک عادی ہو چکا تھا۔

جہاز نے لنگر اٹھایا اور کورومنڈل کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اب نئی نئی دُنیائیں اس کی نظروں کے سامنے جھلملا رہی تھیں۔ ناریل کے جھنڈوں میں چھپی ہوئی مسجدیں اور مندر۔ برہمنوں اور مسلمانوں کی آبادیاں۔ سنہرا شہر گوآ ولندیزوں کا سرنگاپٹم چرچ کی عمارتوں کو دیکھ کر اسے ایک لمحے کے لیے ایمسٹرڈیم کی یاد آئی اور اس کا دل بیٹھ گیا۔ یوروپ ـــ یوروپ۔ کس قدر دور رہ گیا تھا۔ پانڈی چری میں کئی فرانسیسی جہاز پر آئے وہ دوسرے جہاز سے فرانس جا رہے تھے۔ ان میں تین راہبات تھیں اور ایک سوربون کا طالب علم ـــ وہ فوراً سِرل سے گھل مل گیا۔ وہ ماں باپ سے ملنے آیا ہوا تھا اور اب واپس جا رہا تھا۔ وہ جلدی جلدی کندھے اُچکا کر اس سے باتیں کرنے لگا۔ پیرس کی باتیں۔ یونیورسٹی کی اور انقلاب کی باتیں آزادی مساوات اور اخوت زندہ باد انقلاب زندہ باد۔ فرانس زندہ باد ـــ وہ اسی طرح جوش سے بچوں کی طرح نعرے لگاتا اتر کر کشتی میں بیٹھ گیا۔ اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ جانے اس کا کیا نام تھا اور اس میدان رستاخیز میں اس کا کیا حشر ہو گا۔ ہر طرف خونریزی تھی۔ اور جنگیں۔ بنگال میں جنوب میں یوروپ میں نپولین نے اودھم مچا رکھی تھی۔ سارا یوروپ جل رہا ہے اور کئی برس اور جلے گا اور اس ہنگامے میں کیمبرج اور سوربون کے طالب علم آندھی کے پتوں کی طرح کھو کر رہ جائیں گے اور ایسا ہمیشہ ہوتا رہے گا۔

اور وہ، سِرل ہاورڈ ایشلے خلیج بنگال کے پانیوں پر محوِ سفر ہے اور ہر طرف موت دانت نکوسے کھڑی ہے۔ سامنے میسوری ہیں اور مرہٹے۔ شمال میں چڑھتی ہوئی داڑھیوں اور گھیر دار شلواروں والے افغان اور سکھ تلواریں چمکا رہے ہیں اور چاروں کھونٹ وحشت ہے اور تباہی اور دلی میں دُکھ ہے۔ فیض آباد میں دُکھ ہے۔ مرشد آباد میں دکھ ہے۔ یہ سب سرل کو نہیں معلوم۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ دلی میں شاہ عالمگیر ثانی اس وقت چندا بائی کا رقص دیکھنے کے بعد استاد تان رس خان سے خیال چندر کونس بلمپت میں سننے میں مصروف ہیں۔ پھر مدراس نظر آیا۔ فورٹ سینٹ جارج۔ اور شہر کے مکانات جو دھوپ میں چمک رہے تھے۔ بندرگاہ میں پر سکون شکلوں والے ہندو سوداگر جہاز پر آئے۔ دوباشوں

نے اسے گھیر لیا سب مصر تھے کہ وہ انھیں کو اپنا گماشتہ بنائے۔ لندن اور بمبئی میں دوستوں نے مدراس کے گورنر اور اعلیٰ طبقے کے افراد سے ملنے کے لیے جو تعارفی خط دے دیئے تھے ان کو جیب میں ٹٹولنے کے بعد ذرا گھبراہٹ کے ساتھ سرل جہاز سے اترا۔ یہاں لیمپیز ہیکیسن اس کی رہنمائی کے لیے موجود نہ تھا۔

مدراس میں جہاز پانچ چھ دن ٹھہرا۔ اس نے والاجاہ نواب ارکاٹ کا محل دیکھا۔ مندروں اور قلعوں کی سیر کی۔ سینٹ طامس روڈ کی انگریزی دوکانوں پر نظر ڈالی۔ ایک روز وہ ٹہلتا ٹہلتا یوریشین آبادی کی سمت نکل گیا۔

جہاں اسے ایک مکان کی سیڑھیوں پر ایک لڑکی کھڑی نظر آئی۔ دوغلی نسل کی حسین لڑکی۔ وہ اسے دیکھ کر ادا سے مسکرائی اور اندر چلی گئی۔ ایک سیاہ فام عورت گود میں بچہ اٹھائے باہر نکلی اور دہلیز پر بیٹھ کر دال چاول بیننے لگی۔ سرل کو دیکھ کر تین چار بچے باہر آ گئے۔ پھر ان کا باپ برآمد ہوا جو ایک بے حد مفلس یوریشین معلوم ہوتا تھا۔ سرل ان کو دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ اندر آؤ گے۔ ایک بچے نے پوچھا۔ وہ سب متحیر تھے۔ کہ انگریز صاحب ان کے محلے کی طرف کیسے آن نکلا۔ سرل کی قوم انگلستان میں طبقاتی کاسٹ سسٹم کی شدت سے قائل تھی۔ ہند میں انھوں نے سیاہ اور سفید کی نسلی تفریق کی بنیاد ڈالی تھی۔ مدراس بلیک ٹاؤن، یوریشین ٹاؤن اور وائٹ ٹاؤن میں بٹا ہوا تھا۔ سرل نے کیمبرج میں رہ کر اٹھارویں صدی کی لبرل ازم کا بڑا پرچار کیا تھا مگر کالے اور گورے کی تقسیم اس کی سمجھ میں آتی تھی۔ اب اس نے دیکھا کہ ہند میں رہنے والے گورے کالوں کی چھوت لگ جانے کے بعد اپنے درجے سے گر چکے تھے۔ یہ یوریشین وائٹ ٹاؤن کے قریب نہ پھٹک سکتے تھے۔ وہ ٹہلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اتنے میں وہ لڑکی اسے دوبارہ نظر آئی وہ اپنے گھر کی باڑ پھلانگ کر آگے آگے جا رہی تھی۔ ایک بار اس نے سرل کو پلٹ کر دیکھا اور مسکرا دی۔ بخدا یہ یوریشین لڑکی بے حد حسین تھی۔ ان بھورے بالوں والی سفید فام انگریز امیرزادیوں سے کہیں زیادہ دلکش جو گورنمنٹ ہاؤس میں شام کو پولکا ناچتی تھیں۔ اس لڑکی کی آنکھیں مرہٹہ اور گجراتی اور مالابادی عورتوں کی ایسی

تھیں۔ سیاہ اور باحیا اور رسیلی اور خوفزدہ سی اسے یہ لڑکی بے حد اچھی لگی۔ ذرا بات سُننا۔ اُس نے جلدی جلدی قدم بڑھا کر اسے جا لیا "تم یہیں رہتی ہو۔" اُس نے بیوقوفوں کی طرح سوال کیا ــــ

"ہاں تم نے ابھی میرا مکان دیکھا تو ہے۔ تم کلکتے سے آئے ہو ــ ؟"

"نہیں کلکتے جا رہا ہوں۔ لندن سے چلا تھا۔ یہاں بمبئی سے آ رہا ہوں۔"

"بہت سفر کرتے ہو۔"

"ہاں۔ اور ابھی بہت سفر کرنا ہے۔ تم یہاں کب سے رہتی ہو۔"

"ہمیشہ سے ــ"

"ہمیشہ سے ــ ؟

مگر تم تو عیسائی ہو۔"

"ہاں۔ کیا ہندوستانی عیسائی نہیں ہو سکتے۔" پھر وہ ذرا ٹھٹکی "میرا دادا انگریز تھا۔ بالکل تمہاری طرح کا۔ میری ماں ہندوستانی ہے۔"

وہ گڑبڑا گیا۔ مسٹر جیکسن نے اسے جہاز پر نصیحت کی تھی کہ یوریشین قوم سے میل جول بالکل نہ بڑھانا۔ پچھلی صدی میں ہمارے ہم وطنوں نے یہاں آن کر کالی عورتوں سے اتنی شادیاں کیں اور تعلقات قائم کیے کہ لے کے پوری نسل کو سیاہ فام بنا دیا۔

"تمہارا باپ زندہ ہے۔ کیا کرتا ہے۔" سرل نے پوچھا۔

"وہ کیا بیٹھا ہے سیڑھیوں پر تم نے دیکھا نہیں۔ شراب کی دوکان کرتا ہے۔"

"آؤ یہاں بیٹھ جائیں۔" سرل نے ہمت کر کے ایک بنچ کی طرف اشارہ کیا۔ لڑکی ذرا جھجکی اور پھر سر پہ اپنا سیاہ جالی کا رومال ٹھیک کر کے بنچ کی طرف بڑھی جو سڑک کے کنارے پڑی تھی۔ یہ راستہ گرجا کو جاتا تھا۔ اس کی کلائیوں میں سبک سے تسبیح لپٹی ہوئی تھی۔

"تم کیتھولک ہو۔" سرل نے ایسے تجسس سے پہلے کسی سے سوالات نہ کیے تھے۔

"ہاں۔"

وہ بڑے باوقار انداز میں اس کے سامنے کھڑا رہا۔ لڑکی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

پھر دفعتاً" جانے کیا ہوا کہ سرل بغیر جانے ہوئے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اسے مخاطب کر کے بولا۔ "تم ــ تم مجھے بہت اچھی معلوم ہوتی ہو۔ میرے ساتھ کلکتہ چلو ــ"

لڑکی نے اسے اچنبھے سے دیکھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" اس نے کہا

"کیوں نہیں۔"

"میرا باپ مجھے مار نہیں ڈالے گا۔ تم کیتھولک نہیں ہو ــ اور اونچے طبقے کے انگریز ہو اور ــ اور آج کے بعد شاید تم مجھ سے بات بھی کرنا پسند نہ کرو۔ تمہاری طرح کے بہت سے سیّاح مدراس آتے ہیں۔" اس نے اداسی سے درخت کا پتہ توڑا۔

سرل کو احساس ہوا کہ وہ شدّت سے اس لڑکی کے عشق میں مبتلا ہے۔ "سنو" اس نے بڑے جذبے سے کہا "سنو" مگر وہ پھر ہڑبڑا گیا۔ اس نے اب تک اس کا نام بھی معلوم نہیں کیا تھا۔

"مجھے ماریا ٹیریزا کہتے ہیں۔"

"ماریا ٹیریزا مجھے تم سے عشق ہے۔"

اس رات وہ گورنمنٹ ہاؤس کی بال میں جانے کے بجائے چپکے سے یوریشین ٹاؤن بھاگ آیا اور اس کی اگلی رات ــ اور اس کی اگلی رات۔ چوتھے روز صبح جہاز کلکتہ کے لیے لنگر اٹھا رہا تھا۔

سفر کی تیاری کرتے کرتے اسے معلوم ہوا کہ یہ کیا زبردست حماقت تھی۔ وہ اس لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا۔ اب تک اس نے ماریا سے شادی کے لیے کہا بھی نہیں تھا۔ مگر وہ بیوقوف لڑکی خالص ہندوستانی عورتوں کی مانند شاید دل میں اسے اپنا

دیوتا تصور کرنے لگی تھی۔ جب وہ اسے خدا حافظ کہنے گرجا کے باغ میں پہنچا تو یہ دیکھ کر اس کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی کہ وہ ایک گٹھڑی کپڑوں کی ہاتھ میں سنبھالے اس کے ہمراہ کلکتہ چلنے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔

اپنی ساری قابلیت اور شاعرانہ اندازِ بیان اور ڈرامے کی صلاحیت بروئے کار لاتے ہوئے اُس نے ماریا تھریزا کو یقین دلایا کہ ابھی اس کا ساتھ لے جانا ممکن نہیں وہ جلدی ہی اُسے بلوا بھیجے گا اور یہ الفاظ کہتے ہوئے اُس نے اپنے آپ کو انتہائی ذلیل اور کمینہ محسوس کیا۔

اس چھوٹے سے جذباتی ایڈونچر کے بعد سیرل پھر اپنی منزلِ مقصود کی سمت روانہ ہوا۔ خلیج بنگال کی نیلگوں وسعت میں داخل ہوتے ہوتے وہ اس لڑکی کو تقریباً بھول چکا تھا۔

جہاز اب کلکتے کے قریب پہنچ رہا تھا۔ ڈائمنڈ ہاربر میں داخل ہو کر جہاز نے لنگر ڈالا اور پائلٹ کے انتظار میں مصروف ہو گیا۔ مسافر عرشے پر نکل آئے۔ سامنے بنگال کا ساحل تھا۔ پائلٹ کے ساتھ جہاز فلٹا روانہ ہوا۔ وہاں مسافر اتر کر کشتیوں میں بیٹھے۔ اعلیٰ افسروں کو لینے کے لیے ان کے ذاتی بجرے آئے ہوئے تھے۔ سیرل اس ہنگامے میں کسی کو نہ جانتا تھا۔ وہ جلدی سے کود کر ایک کرائے کی کشتی میں بیٹھ گیا۔ مانجھیوں کی ایک پوری پلٹن نے چپو چلانے شروع کر دیے اور تھوڑی دیر بعد بندرگاہ کے شور و غل سے نکل کر کشتی پرسکون کھلے پانیوں پر آ گئی۔ آس پاس مسافروں سے بھری دوسری کشتیاں چل رہی تھیں۔ پانی کے دونوں طرف درخت جھکے ہوئے تھے۔ دور گھنے جنگلوں میں سے کبھی کبھی شیروں کے گرجنے کی آواز اور گیدڑوں کی صدائیں سنائی دی جاتی تھیں۔ کشتی میں مچھروں نے بھنبھنانا شروع کر دیا تھا۔ کلکتہ ابھی بہت دور تھا۔ سیرل نے تھک کر آنکھیں بند کر لیں اور کلکتے کا تصور کرنا چاہا۔ جہاں وہ بالآخر اب پہنچنے والا تھا۔ محلات کا شہر۔ سونے اور چاندی کی بستی۔ مشرق کا لندن۔ اب رات ہو رہی تھی۔ بنگال کا سحر انگیز چاند پانی کی سطح پر کشتی کے ساتھ ساتھ تیرتا جاتا تھا۔ مانجھی اپنی

زبان میں گا رہے تھے۔ ان کی آواز سرل کو غیر معمولی طور پر سریلی معلوم ہوئی۔

پھر منظر تبدیل ہونا شروع ہوا۔ کشتی گارڈن ریچ پہنچ رہی تھی۔ ساحل پر دونوں طرف شاندار مکانات بنے تھے۔ دریا کے دائیں کنارے پر کلکتہ چاندنی میں جگمگا رہا تھا کلکتہ جواب دُنیا کے بہترین شہروں میں شمار کیا جا رہا تھا۔ بالآخر اس کے سامنے موجود تھا۔ گھاٹ پر بنگالی بنئے مسافروں کی گھات میں موجود تھے۔ اعلیٰ افسروں کو لینے کے لیے ان کے دوست احباب آتے ہوئے تھے۔ جن نوواردوں کے دوست یہاں موجود نہ تھے۔ اپنا سامان قلیوں کے سروں پر رکھوا کر پرتگالی مسافر خانوں کا رُخ کر رہے تھے۔ گھاٹ کے اس رنگارنگ مجمع سے باہر نکل کر سرل بھی ایک پالکی میں بیٹھا اور شہر کی گنجان آبادی سے باہر نکل کر پالکی بردار بارک پور کی طرف بڑھنے لگے جہاں سرل کو فی الحال قیام کرنا تھا۔

بارک پور میں انگریزوں کے شان دار کنٹری ہاؤس تھے۔ ولندیزیوں کے سیرام پور اور فرانسیسیوں کے چندر نگر تک ان مکانات کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ قلعے کے آس پاس سرکاری عمارات تھیں۔ شان دار گورنمنٹ ہاؤس۔ جہاں چند سال پہلے کارنوالس دھوم دھام سے براجتا تھا اور اب جہاں سرجان شور فورٹ ولیم کا گورنر جنرل بنا ہوا تھا۔ پھر رائیٹرز بلڈنگ جس میں سرل کا دفتر تھا۔ چرچ کی عظیم الشان عمارت۔ آس پاس بلیک ٹاؤن تھا جس میں ہندوستانی، پرتگالی، ارمنی، یوریشین اور مفلوک الحال یورپین بستے تھے۔

چورنگی روڈ پر عالی شان کلاسیکل طرز کی عمارتیں تھیں۔ بڑے بڑے ہال۔ پیل پائے والے برآمدے۔ چوڑے زینے۔ جھلملیوں والے دروازے اور اونچے دریچے۔ دریا کے کنارے کنارے انگریز امرائ کے گارڈن ہاؤس تھے۔ جن کے باغیچوں میں ہندو اور چینی مالی کام میں مصروف تھے۔ کوٹھیوں کے عقب میں شاگرد پیشے تھے جہاں مرغیاں اور بطخیں گھوم رہی تھیں۔ تالاب تھے جن میں واٹر للی کھلی تھی اور مچھلیاں پلی تھیں۔

چھ مہینے بعد سرل نے اپنے باپ کو خط لکھا کہ اب میں سیٹل ہو چکا ہوں۔ اور خدا کی عنایات کا شکر گزار ہوں۔ میرا بنگالی گماشتہ اشوتوش ڈے جو فراٹے سے انگریزی بولتا ہے میرے سارے معاملات کا نگران ہے۔ میرے عہدے میں بھی ترقی ہونے والی ہے اور میں مفصل میں نیل کی تجارت شروع کر رہا ہوں۔ میں نے ایک مسلمان منشی نوکر رکھا ہے جس کا نام ابوالمکارم ہے۔ وہ مجھے فارسی اور بنگالی پڑھاتا ہے۔ اور میں اپنی زندگی سے بہت خوش ہوں۔

کئی سال گزر گئے۔ سرل اب کلکتہ کی اعلیٰ سوسائٹی میں رل مل چکا تھا اور اسی اسٹائل سے رہتا تھا۔ جو اس سوسائٹی کی خاصیت تھی۔ اس کے پالکی بردار ہر وقت سرخ وردی میں ملبوس رہتے۔ سونٹا بردار چاندی کے موٹھ کی چھڑیاں لے کر چلتے۔ رات کو مشعلچی اس کی فینس کے آگے آگے دوڑتے۔ خانساماں اور خدمت گار اس کے مطبخ اور کھانے کے کمرے کے نگران تھے۔ حقہ بردار اس کا پیچوان بھرتا تھا۔ دفتر میں اس کا کلرک یوریشین تھا جس کا نام رالف تھا۔ سرل کو اس کی موجودگی میں بڑی بے آرامی سی محسوس ہوتی۔ رالف بلیک ٹاؤن کا باسی، بڑی وفاداری سے سرل کی خوشامد میں لگا رہتا۔ دفتر کے انتظام کے لیے بنگالی سرکار موجود تھا اور ان گنت ہرکارے اور پیادے اور چپراسی ایک تن تنہا سرل ایشلے اور اس کے ذاتی عملے میں چالیس پچاس آدمی شامل تھے ان کے علاوہ اس کا مالی تھا اور گراس کٹ۔ اور سائیس اور چابک سوار۔ اور بہشتی۔ دربان چوکیدار۔ پھر اس کا بجرہ تھا جس کے مانجھی اس کے ملازم تھے۔ درزی۔ دھوبی اور نائی ان سب سے علیحدہ۔ اس سلطنت کا جو اس کی سفید رنگ کی کوٹھی میں قائم تھی۔ سرل ایشلے بلا شرکت غیرے مالک و مختار تھا۔ وہ چاہتا تو ان سب کو الٹا لٹکا کر پٹوا سکتا تھا اور ایسا اس نے اکثر کیا۔ یہی سرل جو کچھ عرصہ قبل کیمبرج کی گلیوں میں ولیم بلیک کی کتابیں لیے مشق سخن کرتا پھرتا تھا اور کسی پب میں جا کر چند پنس کے آلو کھاتا تھا جو مڈل ٹمپل کے پھاٹک سے نکل کر دریا کے کنارے ڈون اور گرے کی نظموں پر سر دھنتا سنسان سڑکوں پر ٹہلا کرتا اور رات کو کسی طالب علم ساتھی کے یہاں جا کر سو رہتا تھا۔

صبح سات بجے دربان اس کی کوٹھی کے ہال کا دروازہ کھولتا۔ دھوپ جھلملیوں میں سے چھن چھن کر اندر آنے لگتی تو سرل اپنی مسہری سے اُٹھتا۔ اس کے سرکار اور چپراسی کاغذات لے کر فرشی سلام کرتے بیڈ روم میں داخل ہوتے۔ حجام اس کا خط بناتا، وگ سر پر جمانے کے بعد واسکٹ پہنتا ہوا وہ کھانے کے کمرے کی طرف بڑھتا۔ جہاں وہ چائے پیتا جاتا اور پیچوان کے کش لگاتا۔ کاروبار اور سرکاری کام کے سلسلے میں جتنے غرض مند صبح صبح سلام کرنے آتے وہ سب میز سے کچھ فاصلے پر مودبانہ کھڑے رہتے سرل بے نیازی سے احکام صادر کرتا۔ دس بجے کے قریب یہ سارا جلوس پالکی کی طرف بڑھتا۔ اور پالکی اس کے دفتر کی طرف روانہ ہوتی۔ چار بجے واپس آکر سرل کلکتے کے قاعدے کے مطابق شام کے سات آٹھ بجے تک سویا کرتا۔ اس کے بعد لباس تبدیل کر کے اور بن سنور کے خواتین سے ملنے کے لیے نکل جاتا۔ سوشل کالز کرتا۔ کورس میں ہواخوری کرتا یا کہیں ڈنر پر چلا جاتا۔ کس قدر مکمل اور فرصت کی زندگی تھی اور اسی آرام اور آسائش کے ساتھ اس کا بنک بیلنس بڑھتا جا رہا تھا۔ تجارت میں اسے بے اندازہ منافع ہو رہا تھا۔ گورنر جنرل اس سے بے حد خوش تھا۔ افواہ تھی کہ اسے شاید دوامی بندوبست کے انتظام کے سلسلے میں کسی اہم عہدے پر مفصّل میں یا لکھنؤ ریذیڈنسی بھیج دیا جائے۔ کلکتے میں وہ ماؤں کے لیے ایک مستقل موضوع گفتگو بن چکا تھا۔ بال روم میں اس کے ساتھ رقص کرتے ہوئے بن بیاہی امیر زادیاں اکثر سوچتیں وہ کون خوش قسمت لڑکی ہوگی جس سے امیر اور ہینڈسم سرل ایشلے بیاہ کرے گا۔

مگر لیڈی پمیلا یا لیڈی سنیتا کے ساتھ شادی کرنے کے بجائے اس غیر معمولی ذہن اور دماغ کے مالک سرل ایشلے نے ایک بڑی ہی معمولی اور عامیانہ حرکت کی یعنی ایسی حرکت جو عام طور پر سبھی دولت مند انگریز کرتے تھے اور جو ہندوستان کے انگریز "نوابین" کا عام دستور تھا۔

یعنی سرل ایشلے نے بھی ایک نیٹو عورت کو اپنے گھر میں رکھ لیا۔

انگریز "نوابوں" کا انگلستان میں خوب مذاق اڑایا جاتا۔ وہاں کا جاگیردار طبقہ ان کو

اپنے ہم پلہ سمجھنے سے منکر تھا۔ کل کی بات تھی کہ یہ لوگ سٹی میں معمولی تاجر یا گرگے تھے۔ اور نو دولتے تاجر سے پشتینی زمیندار کی ہمیشہ سے ٹھنی رہی ہے مگر ہندوستان میں ان لوگوں نے اپنے لیے ایک الف لیلوی دنیا تخلیق کر رکھی تھی۔ پٹنہ، ڈھاکہ، قاسم بازار، بالاسور اور ہگلی کے تاجر، مرشد آباد، لکھنؤ، بنارس، گوالیر، اور دلی کے درباروں میں سفارت کے فرائض انجام دینے والے ڈپلومیٹ۔ کلکٹر، جو بنگال، بہار اور اڑیسہ کے ضلعوں میں تعینات تھے۔ فوجی افسر جنھوں نے اودھ میں چھاؤنیاں چھائی تھیں۔ فوجی ایڈونچرز جو ہندوستانی حکمرانوں کی افواج میں اونچی بنے وندنا رہے تھے۔ یہ سب اب سرل کے ساتھی تھے۔ سرل ان کا نقطۂ نظر خوب سمجھتا تھا۔ پلاسی کے بعد سے لکشمی نے ہندوستانیوں سے روٹھ کر فرنگی کا گھر دیکھ لیا تھا۔ انگریز کے یہاں دھن برس رہا تھا۔ شہر کی چورنگھی میں ان کے ٹاؤن ہاؤس تھے۔ شہر سے باہر بڑے بڑے باغات میں انھوں نے بنگلے بنوا رکھے تھے۔ اودھ اور مرشد آباد کی ریذیڈنسی میں رہنے والے انگریزوں کے یہاں دولت کی ریل پیل تھی۔ شورے اور نیل کے تاجر کروڑپتی ہو چکے تھے۔ نوابوں کی طرح زندگی گزارنا ان کا آدرش تھا —— حرم، حقّہ، شعر و شاعری، ناچ رنگ، مرغ بازی۔ یہی سب مشاغل ان فرنگیوں کے تھے۔ ہندوستانی نوابوں اور انگریز اونچے طبقے نے آپس میں سمجھوتہ کر کے ایک انتہائی مہذّب فضا کی بنیاد ڈالی تھی۔ دیوانی ملنے کے بعد انگریز سویلین بنگال میں منظر عام پر آیا۔ یہ لوگ بے حد کم عمر میں انگلستان سے یہاں آتے اور بہت جلد ساری ہندوستانی خصلتیں اختیار کر لیتے۔ کلکٹر کی حیثیت سے اضلاع میں تعینات ہونے کے بعد اپنا وقت وہاں کے راجاؤں اور نوابوں اور زمینداروں کی صحبت میں گزارتے۔ بنگال کی جاگیردارانہ تہذیب میں فرنگی افسر بھی گھل مل چکا تھا۔ پلاسی کے بعد کمپنی کا فیکٹر فقط دولت جمع کر کے وطن واپس جانے کے بجائے اب نواب کہلانے کے خواب دیکھتا تھا اور اردو، ادب میں دلچسپی لیتا تھا۔ اور حرم میں دس دس دیسی عورتیں رکھتا تھا۔

سرل بھی شنیلا کو اپنی کوٹھی میں داخل کر کے گویا باقاعدہ نواب بن گیا۔

سیاہ لمبے بالوں اور نشیلی آنکھوں والی شنیلا ڈھاکے کی قریب کے گاؤں کی رہنے والی تھی۔ انگریز نواب اور ہندوستانی نواب نے آپس میں جو سمجھوتہ کر لیا تھا۔ اس سے تہذیب تمدن وغیرہ کو تو خوب ترقی ہو رہی تھی مگر شنیلا دیبی کا باپ اسی طرح فاقے کر رہا تھا بلکہ اب اس کے فاقوں میں زیادتی ہو گئی تھی کیونکہ ڈھاکے پر اقتصادی تباہی کے بادل منڈلا رہے تھے۔ شنیلا کی سات بہنیں تھیں جن میں تین بال ودھوا تھیں اور چار کی ابھی شادی ہی نہیں ہو سکی تھی۔ اس کا ایک بھائی تھا جسے کلکتہ کے ایک گودام میں ملازمت مل گئی تو اُس نے اپنی بہنوں کو ڈھاکے سے بلا بھیجا۔ اس گودام کے مالک کا نام سرل صاحب تھا۔

سرل صاحب ابھی لڑکا ہی سا تھا۔ مگر کلکتے میں اس کا طوطی بول رہا تھا۔ ایک روز شنیلا پوجا کے لئے کالی گھاٹ جا رہی تھی کہ سرل صاحب نے کہیں اسے دیکھ پایا۔ سرل صاحب کے متعلق یہ بھی مشہور تھا کہ کافی دل پھینک واقع ہوئے ہیں۔ گو کلکتے کی مسی بابا لوگ اس سے خفا رہتی تھیں کہ وہ ان میں سے کسی ایک کو اپنی میم کیوں نہیں بنا لیتا۔ شنیلا کا بھائی اپنی مفلسی سے تنگ آ کر سوچ رہا تھا کہ سیرام پور جا کر عیسائی ہو جائے۔ سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ اس کو اپنی بہنوں کے بوجھ سے نجات ملے گی مشن والے آپ ہی ان کے شادی بیاہ کی فکر کریں گے۔ مگر اسی روز سرل صاحب کے سرکار نے آ کر اس سے کہا۔ صاحب نے تمھیں یاد کیا ہے اور اُس کے اگلے دن شنیلا سرل صاحب کی کوٹھی پر پہنچا دی گئی اور اس طرح اس کے خاندان کو افلاس سے نجات ملی۔

ہر معاشرے کی اپنی اقدار بن جاتی ہیں۔ یہ اس وقت کا عام دستور تھا۔ نسلی تعصب ابھی زیادہ نہیں بڑھا تھا۔ بہت سے انگریزوں نے اونچے مسلمان گھرانوں میں شادیاں کی تھیں۔ شاہ عالم ثانی کی منہ بولی بیٹی اور کمبے کی شہزادی ظہور النساء بیگم کی شادی ایک انگریز میجر سے ہوئی تھی۔ کلکتے کے جوب چارنوک کی بیوی بھی ہندوستانی تھی۔

سرل صاحب نے شنیلا سے بیاہ نہیں کیا۔ مگر شنیلا ناخوش نہیں تھی۔ وہ شان سے کوٹھی میں رہتی تھی اور نوکروں پر حکومت کرتی تھی۔ اس کی مانند اور بہت سی دیسی عورتیں اعلیٰ

طبقے کے انگریزوں کے زنان خانوں میں براجتی تھیں۔ ان کے بچے پڑھنے کے لئے ولایت بھیجے جاتے تھے اور جب تک ان بچوں کے باپ زندہ رہتے تھے کم از کم اس وقت تک ان کا خاندان آرام سے گزر کرتا تھا۔

مگر سرل کو معلوم تھا کہ اس کی اور شنیلا کی اولاد کا مستقبل کیا ہوگا۔ وہ مدراس یا کلکتہ کے یتیم خانے میں داخل کر دئے جائیں گے۔ بڑے ہو کر ان کو اعلیٰ نوکریاں نہیں ملیں گی وہ رالف کی طرح کلرکی کریں گے یا کسی رجمنٹ میں شامل ہو کر بینڈ بجاتے مرہٹوں سے لڑنے جایا کریں گے۔ اس کی لڑکی کو کسی انگریز نواب زادی کی آیا بننا پڑے گا یا کسی فوجی افسر کی داشتہ۔ تب اُسے اندازہ ہوا کہ یوریشین طبقہ کس قدر زبردست ٹریجاڈی کا حامل ہے۔ تب اسے خوبصورت ماریا ٹیریزا یاد آئی جسے وہ مدراس میں ایسے کمینے پن سے چھوڑ آیا تھا۔

یوریشین طبقے کی بنیاد پرتگالیوں کی آمد کے زمانے سے پڑی تھی۔ پھر فرنچ اور ولندیزیوں نے آکر اچھوتوں کو عیسائی کیا۔ جو شخص بوٹ اور ہیٹ پہن کر بگڑی ہوئی پرتگالی بول لے وہ یوریشین سمجھا جاتا تھا۔ فرانسیسیوں میں نسلی تعصب نہیں تھا ان کی آمد سے اس طبقہ کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ یوریشین بڑے قابل رحم لوگ تھے۔ بے چارے "کرانی" جو انگریز برہمنوں کے مقابلے میں شودر اور چنڈال کی حیثیت رکھتے تھے۔ سرل کو یہ سب سوچ کر جھرجھری سی آئی۔ تو کیا اسے لیڈی سنتھیا سے شادی کر لینا چاہیے۔ پھر شنیلا اپنی رسیلی آواز میں اسے پکارتی اور وہ ہڑبڑا جاتا اور پالکی میں بیٹھ کر کورٹس کی طرف نکل جاتا۔ اس کی زندگی بڑی مصروف اور بڑی ہنگامہ خیز گزر رہی تھی۔ گورنر جنرل کے بال اور پبلک بریکفاسٹ ہیسٹنگ اسٹریٹ اور علی پور کے کانسرٹ اور رقص۔ گارڈن ریچ کے جشن اور تقریبات پھر مفصل کے سفر۔ ڈھاکہ۔ چاٹگام۔ مرشد آباد۔ چوبیس پرگنہ مونگیر۔ سارا بنگال اور سارا بہار اس کے قدموں میں بکھرا پڑا تھا۔ بنگال کے سارے آبی راستے اس کے لئے کھلے تھے۔ نیل کے ان گنت کاشتکاروں کی زندگیوں اور قسمتوں کا وہ مالک تھا۔ دھالیشری اور ہری منگل اور کرنافلی اور مدھومتی اور شوبنسری کی لہروں پر اس کی کشتیاں نیل کی باربرداری

کر رہی تھیں۔ ڈھاکے کے مغلوں کا عظیم الشان ناؤ واڑہ اب اس کے ہاتھ میں تھا۔

اس نے زور سے اپنی نقرئی موٹھ کی چھڑی بڑھا کر بوڑھے کی کمر میں چبھوئی۔ "ابو المنصور۔ اگر تم چاہتے ہو کہ اسی ہنٹر سے میں تمھاری کھال نہ اُدھیڑ دوں تو ذرا زیادہ طاقت سے پتوار چلاؤ!" اس نے کہا۔

بوڑھا زیادہ کوشش سے پتوار پر جھک گیا۔ سرل اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ کس قدر سخت جان لوگ ہیں۔ اس نے سوچا۔ ابھی چند سال ہوئے کیسا ہولناک قحط صوبے میں پڑا تھا۔ دریاؤں میں اتنے طوفان آتے ہیں۔ وبائیں پھیلتی ہیں مگر یہ لوگ اسی بے حیائی سے جیے جاتے ہیں۔ حد ہے واقعی۔ اُس نے گھڑی دیکھی۔ اب رات کا نو بج رہا تھا۔ اسے آج ہی رات کو راجہ گریش چندر رائے کی زمینداری پر پہنچنا تھا۔ کلکتے میں حکومت میں بہت سی تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ ایک، دو دن بعد جان شور جانے والے تھے اور نیا گورنر جنرل آرہا تھا۔ یہاں سے لوٹ کر اسے گورنمنٹ ہاؤس بھی جانا تھا۔ آج کیا تاریخ ہے۔ اُس نے پیٹر سے پوچھا۔ پیٹر خراٹے لے رہا تھا۔ سرل نے لالٹین اٹھا کر بنگال گزٹ پر نظر ڈالی۔ کل کا اخبار تھا۔

آٹھ جون ۱۷۹۸ء۔ سرل یک بیک چونک اٹھا۔ اسے ہندوستان آئے آج پورے پانچ سال ہو گئے تھے۔ ان پانچ سالوں میں وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا نیل کی تجارت دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی تھی۔ گجرات کی نیل کی صنعت دم توڑ چکی تھی۔ اس کی جگہ کمپنی کے انگریز پلانٹرز دلی سے بنگال تک پھیل چکے تھے۔ بنگال کا کسان انگریز پلانٹرز سے قرض لے کر نیل بوتا تھا۔ اور پھر مختلف طریقوں سے اس پر ظلم توڑے جاتے تھے۔ عدالتوں میں اس کی شنوائی نہیں ہوتی تھی۔ انصاف کرنے والے خود ان پلانٹرز کے بھائی بند تھے۔

بنگال کا کسان ابو المنصور کمال الدین جو دن بھر نیل کے کھیتوں میں مشقت کرتا تھا اس وقت اپنے نئے آقا سرل ہاورڈ ایشلے کو نوکے میں بٹھلا کر اس پار لیے جا رہا تھا۔ اور چاند پدما کے پانیوں پر اتر آیا تھا اور ہوا میں خنکی آچکی تھی اور اناس اور کیلے کے جھنڈ میں گیدڑ بول رہے تھے۔

کیونکہ رات بہت ہولناک تھی

۲۷

کنارے پر آ کر رادھے چرن نے لالٹین اونچی کی اور اس کی روشنی کو پانی پر چمکایا۔ دور اُفق پر سے ایک کشتی سبک روی سے تیرتی ہوئی گھاٹ کی اور جا رہی تھی۔ انھوں نے لالٹین زمین پر رکھ دی اور چادر لپیٹ کر وہیں اکڑوں بیٹھ گئے۔ قریب باشا کا جھونپڑا تھا جس میں گاؤں کے لوگ جمع تھے۔ بانس کے جھنڈ کے نیچے ان کا اپنا چھوٹا سا مکان تھا جس کے دروازے پر چراغ جل رہا تھا۔ سارے میں ایک ہیبت ناک سناٹا طاری تھا۔ جس میں صرف راجہ گریش چندر رائے کے محل کی طرف سے سازوں کی مدھم آوازیں سنائی دے جاتی تھیں۔ سنا تھا وہاں پٹنے اور لکھنؤ تک کی طوائفیں آئی تھیں۔ راجہ صاحب کو لاٹ صاحب نے خلعت عطا کی تھی۔ اس کی خوشی میں جشن منایا جا رہا تھا۔ کلکتہ سے صاحب لوگ اس میں شرکت کے لئے آ رہے تھے۔ چوپال میں عجب طرح کی خاموشی طاری تھی۔

"کچھ بات کرو دادا۔" پرمود نے چلم کی راکھ کریدتے ہوئے اُداس آواز میں رادھے چرن سے کہا۔

رادھے چرن خاموشی سے گھاٹ کی اور دیکھتے رہے۔ ہوائیں بانس کے جھنڈ میں سائیں سائیں کر رہی تھیں۔

ایسی ہی راتوں میں گھنگریالے بالوں والے ستیہ پیر ستیہ نرائن[1] ماتھے پر صندل کا ٹیکا لگائے ہاتھ میں بانسری لئے نارنجی لباس پہنے اپنی کمر کی زنجیریں جھنجھناتے پدما کے کنارے کنارے جاتے نظر آ جاتے ہیں۔ اگر مجھے کبھی ستیہ نرائن مل جائیں تو میں ان سے پوچھوں۔ تو میں ان سے کیا پوچھوں ۔۔؟ رادھے چرن اکڑوں بیٹھے سوچا کئے۔

---

[1] گوڑ کے سلطان علاؤالدین حسین شاہ کا صوفی نواسا جو بنگال کے مسلمانوں کے لئے ستیہ پیر اور ہندوؤں کے لئے وشنو کا اوتار ستیہ نرائن بن گیا۔

بہت سی زنجیروں کے جھنجھنانے کی آواز نے سناٹے کو توڑا۔ رادھے چرن نے چونک کر دیکھا۔ سامنے ستیہ پیر تو نہیں ان کے چند فقیر موجود تھے۔ بانسوں کے جھنڈ سے نمودار ہو کر وہ رادھے چرن کے مکان کی طرف مڑ گئے تھے اور دروازے پر کھڑے حسبِ معمول صدائیں لگا رہے تھے۔

رادھے چرن نے بڑی کوفت کے ساتھ ان کو دیکھا ستیہ نرائن کے بھکاری ان کے دوار پر کھڑے تھے اور ان کے پاس دینے کو کچھ نہ تھا۔ اچھی فصل کی دیبی لکشمی کے بھجن گانے والے یہ مسلمان فقیر گاؤں گاؤں گھوما کرتے تھے۔ صدیوں سے یہ فقیر اسی طرح گاتے بجاتے آئے تھے۔ گاؤں کی ہندو عورتیں ان کی جھولی میں آٹا اور چاول ڈالتی تھیں اور ان سے دعائیں لیتی تھیں — ان کو اچھے شگون کی باتیں بتاتے، سانپ کے کاٹے کا اپنے منتروں سے علاج کرتے۔ ان کے بغیر زندگی مکمل نہیں تھی۔ پچھلے سال انھوں نے شنیلا کے لئے کہا تھا جب وہ دکھشنا دینے باہر آئی تھی کہ یہ بیٹی پدمنی ہے۔ پھر انھوں نے پدمنی کی ساری نشانیاں شنیلا کی ماں کو بتلائی تھیں۔ پدمنی جو چڑیوں کے جگنے سے پہلے جگتی ہے۔ شام پڑے گھر میں چراغ جلاتی ہے۔ اپنے شوہر کو کھانا کھلانے کے بعد خود کھاتی ہے۔ بیٹی بڑے نصیبوں والی ہے۔ انھوں نے بشارت دی تھی۔

ان کی آواز سن کر شنیلا کی ماں دہلیز پر آئی۔ اس کے مٹکے خالی پڑے تھے۔ فقیروں کو دینے کے لئے اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ یہ ستیہ پیر اور مانک پیر اور لکشمی اور چنڈی ان سب دیبی دیوتاؤں کی قوم پر اسے بڑا غصہ آیا۔ یہ سب دھوکے باز ہیں۔ سارے دیبی دیوتا۔ اس نے ساری کے آنچل سے آنسو خشک کرنا چاہے اور چپ چاپ کھڑی ان کو دیکھتی رہی۔ وہ حسبِ معمول شنیلا اور چنڈی اور تشیو کا جاپ کیا کئے "یہ شنیلا کہاں ہے۔" بالآخر ان میں سے ایک نے پوچھا۔

"کلکتے۔" رادھے چرن کی بی بی نے کہا

"وہاں کیا کر رہی ہے۔"

"اس کا — اس کا — بیاہ ہو گیا —" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ اس نے یہ نہیں

بتایا کہ شنیلا کو پردے سے نکلنا پڑا اور وہ ایک فرنگی کی کوٹھی میں رہ رہی ہے۔ مسلمان فقیروں نے آشیرباد دی۔ "میں نے اس کا ماتھا دیکھ کر بتایا تھا۔ سبھاگن لکشمی ہے۔ پدمنی۔ ہمارا داماد کیا کرتا ہے۔؟"

"کلکتے میں کام کرتا ہے۔"

"اچھا۔" فقیروں نے اطمینان سے مزید دعائیں دیں اور واپس مڑنے لگے۔ اب ان کو ہر گھر سے یہی سننے کو ملتا تھا۔ ہمارے پاس دان کے لئے کچھ نہیں۔ ان کو اس قحط سالی کی عادت پڑ گئی تھی۔ بڑے کال کو پڑے تقریباً تیس سال گزر چکے تھے جب سنا تھا کہ فرنگیوں کی راجدھانی کلکتے کی سڑکیں فاقے سے مرتے ہوئے انسانوں کی لاشوں سے پٹ گئی تھیں مگر اب کلکتے کی سڑکیں دور دور تک پھیل چکی تھیں۔ اب گاؤں گاؤں لوگ مر رہے تھے۔

"ٹھہرو۔" شنیلا کی ماں نے کہا "میں نے پرفلا کو ہاٹ بھیجا تھا شاید وہ کچھ لے آیا ہو۔"

مگر فقیر دعاؤں کی بوچھار کرتے اداس قدم اٹھاتے آگے بڑھ گئے۔ شنیلا کی ماں اپنے بھانجے کا انتظار کرتی رہی۔

مگر وہ ہاٹ سے گھر لوٹنے کے بجائے سامنے چوپال میں جا بیٹھا تھا۔ اس کے سارے ساتھی منہ لٹکائے بیٹھے تھے۔ وہ تین دن سے تیل کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا تیل سونے کے بھاؤ بک رہا تھا۔ نمک عنقا تھا۔ چاول کی وہ صورت کو ترس گیا تھا۔ چھالیا اور تمباکو اور چاول، ورنمک اور ہر شے کی تجارت پر کمپنی بہادر کے فرنگیوں نے قبضہ جما لیا تھا۔ دریاؤں پہ ان کی کشتیاں مال سے لدی ہوئی چل رہی تھیں مگر بازار میں قیمتیں آسمان تک پہنچ چکی تھیں۔ چوپال میں سات آٹھ آدمی اور آن کر بیٹھ گئے۔ آہستہ آہستہ باتیں شروع ہوئیں۔

"او جیت دادا تم بھی ڈھاکے سے آ رہے ہو۔" پرمودھر نے پوچھا "ہاں۔ میں بھی اور دیپ بھی اور سب۔ اب وہاں کھانے کو نہیں ملتا سارے کرگھے ٹوٹ گئے۔۔۔ اب ہم بھی بل چلائیں گے۔ تمہارے راجہ صاحب ہمیں زمین جوتنے دیں گے۔؟" او جیت نے کہا۔

"پتہ نہیں۔" پرتو دنے اُکتا کر جواب دیا۔ وہ یہ سب سوچتے سوچتے عاجز آ گیا تھا مگر اس کا دماغ اب کام نہ کرتا تھا۔ لوگ جوق در جوق دیہات کا رُخ کر رہے تھے زرعی زمین پر آبادی کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ ہندوستان جو دُنیا کا سب سے بڑا صنعتی ملک تھا۔ اب خالص زراعتی ملک میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ جہاں پیداوار کم تھی۔ لگان زیادہ اور روز قحط پڑتے تھے۔ ان آنکھوں نے کیا کیا زمانے پلٹتے دیکھے۔ رادھے چرن نے چوپال کے ہجوم پر نظر ڈال کر سوچا۔ کارنوالس کے نئے قانون نے بالکل ہی کمر توڑ دی تھی۔ تین چار نوجوان لڑکے ان کے قریب آن کر بیٹھ گئے۔

"دادا تمھاری نوابی میں بھی ایسا ہوتا تھا" اشو توش نے سوال کیا۔

"کیا؟" رادھے چرن نے بے دھیانی سے پوچھا۔

"یہی سب۔ مہنگائی۔ اور کال۔ دنگا فساد۔"

لمبی سفید بکرے کی ایسی داڑھیوں والے دو ہندو بوڑھے ناریل گُڑیڈ کر لڑکوں کو دھندلی آنکھوں سے دیکھا کئے۔ یہ دونوں بکسر میں لڑے تھے۔ گاؤں ان پُرانے وقتوں کے بڈھوں ٹھڈوں سے بھرا پڑا تھا جو مغلوں اور نوابوں کے زمانوں کے گُن گاتے تھے اور روتے تھے۔

"وہ زمانہ آنے والا ہے۔ جب ہماری عورتوں کو پردے سے نکلنا پڑے گا۔ ہمارے بچے گلیوں میں بھوکے مریں گے۔ ہمارے بادشاہ کا تاج گر پڑے گا۔" مہابھارت میں لکھا ہے۔" بوڑھے پھونس دھن گوپال مزمدار نے کہنا شروع کیا۔

"ارے مہابھارت کو چھوڑو دادا۔" پرپھلا نے جل کر اس کی بات کاٹی۔ یہی تو ان بوڑھوں میں ایک عیب تھا۔ بات بے بات سراج الدولہ کو یاد کر کے روتے تھے۔ یہ دھن گوپال دادا ابھی ابھی کچھ داستان شروع کرنے والے تھے۔ پرپھلا نے ان کو پہلے پر ہی ٹوک دیا۔ "کیا گزرے زمانوں کی باتیں کرتے ہو۔" اُس نے کہا۔ "کلکتے چلو۔ جہاں شیام دا گئے ہیں۔ (شیام رادھے چرن کا لڑکا تھا جو سرل صاحب کے گودام میں ملازمت کرتا تھا) اور لاٹ صاحب کی چاکری کرو۔ سراج کے زمانے لد گئے دادا۔"

رادھے چرن حیرت سے سنتے رہے۔ یہ لڑکا پرنلا بالکل مارواڑیوں کی ایسی باتیں کر رہا تھا۔ یہ ذہنیت اس میں کہاں سے آگئی۔ اس کو مارواڑیوں سے نفرت تھی۔ رادھے چرن پرانے شرفا کے اس طبقے میں سے تھے جو فارسی پڑھتا تھا، مغلوں کی سرکار کا نظم و نسق سنبھالتا تھا اور باقی وقت پوجا پاٹ میں لگا رہتا تھا۔ مگر اب کلکتے کے مارواڑیوں کا ایک نیا متوسط طبقہ پیدا ہوا تھا جو کمپنی کے ساتھ تجارت کر کے اور مقامی حکمرانوں اور کمپنی کی ریشہ دوانیوں میں حصہ لے کر روپیہ بنا رہا تھا۔ یہ بنگال کے بنئے کا نیا طبقہ تھا۔ جاگیردار اور کسان کے درمیان کا یہ نیا سرمایہ دار طبقہ انگریز کا دوست اور دستِ راست تھا۔ اور انگریز بنگال کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے میں مصروف تھے۔

"لاٹ صاحب کی چاکری۔" دھن گوپال نے کھانسنے کے بعد جوش سے بولنا شروع کیا۔ اس کی داڑھی لالٹین کی روشنی میں ہلتی ہوئی مضحکہ خیز معلوم ہوئی۔ وہ خود بہت مضحکہ خیز معلوم ہو رہا تھا۔ "لاٹ صاحب"۔ اس نے دہرایا۔ "اس سے ہمیں مطلب؟ ہمارا بادشاہ ابھی دلّی میں موجود ہے۔ وہ تمہارے لاٹ صاحب کا دماغ ٹھیک کر دے گا۔"

"تمہارا بادشاہ اندھا کر دیا گیا ہے گوپال دادا۔" پرنلا قہقہہ مار کر ہنسا۔ "تم جانے کس دنیا میں رہتے ہو۔ تمہارے بادشاہ نے پہلے ہی دیوانی کلائیو کے حوالے کیوں کر دی۔ اب دماغ ٹھیک کرے گا۔" پرنلا تلخی سے ہنسا۔ دونوں بوڑھے چپ چاپ گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئے۔ رادھے چرن نے کوفت سے پرنلا پر نظر ڈالی۔ ان لڑکوں کو کچھ سمجھانا بیکار تھا۔ یہ بھی بتانا بیکار تھا کہ بادشاہ نے اپنی مرضی سے دیوانی نہیں دی۔ کلائیو نے زبردستی حاصل کی تھی۔ اس فاقہ زدہ ملک میں پیدا ہونے والے ان نوجوانوں کو کس طرح یقین آ سکتا تھا کہ یہی بنگال دیس کا زرخیز ترین صوبہ تھا۔ یہی بنگال فردوسِ ہند کہلاتا تھا۔ اس وقت اس دیس میں پرائے ملک انگلستان کا زمینداری نظام رائج نہیں کیا گیا تھا۔ اس وقت ملک کی مصنوعات کی برآمد پر محصول نہیں لگے تھے۔ اس وقت لوگ ذاتی جائداد کے تصور سے آشنا نہیں تھے۔ یہ سب رادھے چرن کے دیکھتے دیکھتے ہوا تھا۔ چند روز قبل جب دوامی بندوبست کے سلسلے میں دورہ کرتا ہوا

ڈھلکے کا انگریز کلکٹر یہاں آیا تو اُس نے اپنے دربار میں رادھے چرن کو بُلا کر کہا تھا کہ ہم یہ سب تمہارے فائدے کے لیے کر رہے ہیں۔ مسلمان نوابوں نے تم لوگوں کو اپنی بدانتظامی سے تباہ کر دیا تھا۔

"تم جھوٹ بولتے ہو صاحب۔ ہمارے نوابوں کے یہاں بدانتظامی نہیں تھی۔ میں کایستھ ہوں میرے پرکھ صدیوں سے مرشد آباد میں حکومت کا انتظام کرتے آئے ہیں۔ میں آج بوڑھی گنگا کے کنارے اس جھونپڑی میں رہ رہا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں نے اپنی خوشحالی کے ساتھ ساتھ اپنے ہوش و حواس بھی کھو دئے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم جھوٹ بکتے ہو۔ تم —" اور جب رادھے چرن غصّے سے کانپنے لگے تھے تو ان کو کلکٹر کے چپراسیوں نے کمرے سے باہر دھکیل دیا تھا۔ اس روز اس کمرے میں ایک انگریز مشنری بھی موجود تھا جو اپنا سفرنامہ لکھ رہا تھا اور یہ مکالمہ سُننے کے بعد اُس نے بڑی سچائی سے قلمبند کیا تھا۔ "بنگال کا ہندو مسلمان نوابوں سے نفرت کرتا ہے۔ مسلمان ہندوؤں کے خون کے پیاسے ہیں۔ اس ملک میں کوئی اتحاد نہیں دراصل اسے ایک ملک کہنا ہی نہیں چاہئے۔ یہ بہت سی اقوام کا مجموعہ ہے جن میں ہندو مسلمان ہمیشہ آپس میں دست بگریباں رہتے ہیں۔ یہ دونوں کبھی اکٹھے نہیں ہو سکتے۔"

رادھے چرن دریا کے کنارے گھاس پر بیٹھے رہے۔ کشتی اب ان کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ اس میں ایک بلند و بالا نوجوان فرنگی بیٹھا تھا جس کے وِگ کا پاوڈر اور تلوار کا دستہ چاندنی میں جھلملا رہا تھا۔ مونشور دادا ہانپتے کانپتے نوکے کو کھے رہے تھے۔

رادھے چرن نے آنکھیں بند کرلیں — علی وردی نے مرتے وقت نوجوان سراج سے کہا تھا۔ فرنگیوں نے شہنشاہ کے ملک اور ان کی رعایا کی دولت کے آپس میں حصّے بخرے کر دئے ہیں ان کی طاقت زبردست ہے ان کو قلعے اور فوجیں حاصل نہ کرنے دینا۔ ورنہ ملک ان کا ہو جائے گا۔ اس وقت چوبیس سالہ سراج مُرشد آباد میں تھا۔ فرنگی اس کی توہین کے طور پر اسے قاسم بازار کی تجارتی کوٹھیوں میں داخل نہیں ہونے دیتے تھے۔

اُس نے ملک کے ان تاجروں کا محصول معاف کر دیا تھا مگر خود نواب کے علاقے سے جو سامان آتا انگریز اُس پر زبردست محصول لگا رہے تھے۔ کلکتے کی تسخیر کے بعد بھی شراج نے انگریزوں کے عہد نامے پر اعتبار کرتے ہوئے ان کو معاف کر دیا تھا۔ رادھے چرن کا باپ ان سب معرکوں میں شراج کے ساتھ ساتھ رہا تھا۔ انگریزوں نے ہگلی میں قتل و غارت مچایا تو شراج نے لکھا۔ تم نے میری پرجا کو تاراج کیا ہے تم اپنے آپ کو عیسائی کہتے ہو۔ اگر تم اب بھی محض تاجروں کی طرح رہنے پر اکتفا کرو تو میں تمھاری ساری مراعات واپس کر دوں کیونکہ جنگ تباہ کن ہے۔ تم مجھ سے امن کے معاہدے کرتے ہو اور پھر حملہ کر دیتے ہو۔ شراج نے لکھا۔ مرہٹے جن کو کسی مقدس انجیل کا واسطہ نہیں ہے۔ اپنے معاہدوں پر قائم ہیں اور تم جو خدا اور عیسیٰ کی قسمیں کھاتے ہو اپنے وعدوں کو توڑ ڈالتے ہو۔

اور ایڈمرل واٹسن نے جواب دیا تھا "میں ایسی آگ تمھارے ملک میں لگاؤں گا جسے گنگا کا سارا پانی نہ بجھا سکے گا۔ میں ایسی آگ لگاؤں گا۔ میں ایسی آگ —" یکایک مشعلوں کی روشنی سے اُفق جگمگا اُٹھا۔ بوڑھی گنگا کی موجیں جھلملا رہی تھیں۔ صاحب کی کشتی گھاٹ پر پہنچ چکی تھی۔ راجہ گریش چندر رائے اور ان کے حواری مرالی گھاٹ پر استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ رادھے چرن نے ہڑبڑا کر سر اٹھایا اور اس روشنی میں ان کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ چادر لپیٹ کر آہستہ سے اُٹھے اور اپنے نیم تاریک مکان کی طرف مڑ گئے۔

چوپال میں بیٹھے ہوئے سارے آدمی سہم کر ایک ایک کر کے اُٹھ کھڑے ہوئے کیونکہ راجہ صاحب کے پیادے رات کی دعوت کے لئے بیگار پکڑنے کی غرض سے چوپال کی اور آ رہے تھے۔

۲۸

پچیس سال گزر گئے۔

ڈھاکے کے کارخانوں میں اُلّو بول رہے تھے۔ سارے ملک میں لوہے کی بھٹیاں

مدتیں گزریں سرد ہو چکی تھیں۔ انگلستان کی ملوں سے ایسا دھواں اٹھا تھا جس نے ساری دنیا کو تاریک کر دیا اور اس تاریکی میں ہندوستانی جولاہوں کی ہڈیاں ہندوستان کے میدانوں کی دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ ہندوستان سے لوٹی ہوئی دولت کی بنیاد پر انگلستان میں صنعتی انقلاب اور نئی سرمایہ داری کی نیو اٹھائی جا چکی تھی۔ اب باضابطہ شہنشاہیت کا دور تھا۔ مرشد آباد جو کبھی کلائیو کو لندن سے عظیم تر دکھلائی دیا تھا اب سنسان پڑا تھا۔ کلکتہ گنجان شہر بن چکا تھا۔ اسی کلکتے میں علی پور روڈ پر سرل ہاورڈ ایشلے کے عظیم الشان عمارات کھڑی تھیں۔ سرل ہاورڈ ایشلے پچاس سالہ، دنیا دار کامیاب جہاندیدہ پرانا پاپی۔ گھاگ۔ جان کمپنی کا اہم ستون۔ نئی اردو نثر کا مربی اور سرپرست۔ اودھ کے بادشاہ کا لنگوٹیا یار۔ اس سمے اپنے شکاری کتوں سے ہلو ہلو کرنے کے بعد اب بوچے میں سوار ہونے کا ارادہ کر رہا تھا تاکہ حسب معمول ہوا خوری کے لیے نکلے۔ اس کے فزیشین نے اسے تاکید کی تھی کہ وہ اپنی صحت کا زیادہ خیال رکھے۔ محنت کم کرے۔ غم کم کھائے۔ شراب اس سے بھی کم پیئے۔ روز باقاعدہ ہوا خوری کرے۔ ورنہ مر جائے گا۔ فزیشین کی ان نصیحتوں پر اسے ہنسی آئی تھی۔ اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ واقعی بے حد گھٹیا ہے۔ گھٹیا کامیاب دولت مند اوسط قسم کا انسان جو پچاس سال کی عمر تک پہنچتا ہے تو اس کے طبیب اس کے آگے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں۔ سارے گورنروں اعلیٰ حکام اور دوسرے بڑے آدمیوں کے طبیب بھی ان سے یہی کہتے تھے۔

وہ کس قدر گھٹیا آدمی تھا۔ سرل نے کوفت کے ساتھ اپنے شاندار محل پر نظر ڈالی۔ جس کے باغ میں فوارے چل رہے تھے اور کالے ملازمین کی پلٹن کام میں مصروف تھی۔ خداوندا ـــ مجھے تو نے اتنا ذلیل کیوں بنایا۔ پھر اس نے چند ابل کا ماپنی اور آتے دیکھے اور وہ جلدی سے اپنا بڑے صاحب والا انداز چہرے پر طاری کر کے بوچے میں جا بیٹھا۔ قاصد گورنمنٹ ہاؤس سے آئے تھے۔ اپنے کلرک کے ذریعہ چند کاغذات اسے لکھنؤ کے ریزیڈنٹ کے پاس بھجوانے تھے۔ بنگال کے حالات مخدوش تھے۔ اضلاع کے مسلمان کسانوں نے اودھ کے چند باغی مولویوں کی سرکردگی میں سر اٹھایا تھا اور فتنہ فساد پھیلانے پھر

رہے تھے۔ دریائی اور خشکی کے راستے محفوظ نہ تھے۔ گورنمنٹ ہاؤس میں پریشانی تھی۔ اودھ کے بادشاہ کے پاس ان کاغذات کا پہنچنا ضروری تھا۔ اُسے مفسدوں کا سر کچلنے کے لئے ندیا کے ضلع بھی جانا تھا (ندیا کے ضلع میں پلاسی باغ تھا جس میں آم کے گھنے کنج تھے۔ اور موسم گرما کے عروج پر جب آم میں بور آ رہے تھے وہاں کرنل کلائیو، سراج سے لڑا تھا) ندیا — گورنمنٹ ہاؤس سے آئے ہوئے اس سرکاری خط میں اس نام کو پڑھ کر اور بہت سی باتیں ذہن میں آگئیں۔ ناموں اور لفظوں کے ساتھ یہ کیا مصیبت تھی۔ ہر چیز کا کسی نہ کسی شے سے تعلق تھا۔ ساری دُنیا ساری کائنات اسے کوئی نہ کوئی افسانہ سُنانے کے لئے تُلی بیٹھی تھی۔ اپنا افسانہ وہ کس کو سُنائے گا —؟

خط پر دستخط کر کے قاصدوں کو رخصت کرنے کے بعد وہ پھر چلنے کے لئے تیار ہُوا۔ آسمان پر بادل گھر آئے تھے۔ سامنے سڑک پر چند کالے مرگلے آدمی ایک ارتھی اٹھائے ہری بول ہری بول کے ہولناک نعرے لگاتے جلدی جلدی قدم اُٹھاتے مرگھٹ کی طرف جا رہے تھے۔ سرل کو ایک جھرجھری سی آئی اور اس نے جُھک کر ایک سوگوار سے پُوچھا "کس کی ارتھی لئے جاتے ہو —"

"ڈھاکیشوری کے رادھے چرن بابو —"

سرل چونکا۔ رادھے چرن تو شُنیلا کے باپ کا نام تھا۔

شُنیلا کون تھی —؟

دُنیا میں ہزاروں رادھے چرن ہوں گے اور اُس نے شُنیلا کے باپ کو کبھی دیکھا بھی نہ تھا جو سُنا تھا کہ کبھی کبھی اپنے بیٹے سے ملنے گاؤں سے آجایا کرتا تھا اور کافی خبطی اور بد دماغ بُڈھا تھا۔

سرل ٹوپی اُتار کر سڑک کے کنارے ایک طرف کو کھڑا ہو گیا۔ ارتھی والوں نے بڑی حیرت سے اُس کو دیکھا۔ انگریز حاکم جو زندہ بنگالیوں کے ساتھ جُوتے لات سے بات کرتا تھا۔ مرے ہوئے بنگالی کی یہ تکریم کیوں کر رہا تھا۔

بے چارے رادھے چرن بابو۔ کاش تم چند لمحوں کے لئے زندہ ہو کر اپنی یہ

عزت افزائی دیکھ لیتے۔

جلوس آگے نکل گیا۔ ہری بول ہری بول کی آوازیں مدھم ہو کر غائب ہو گئیں۔ کہاروں نے ادب سے پوچھا "صاحب کدھر جائیے گا؟"

سرل پھر بوچے میں جا بیٹھا۔ "جہاں چاہو چلو—"

اس نے زندگی کی ہنگامہ خیزیاں دیکھی تھیں۔ موت کی گرم بازاری کا نظارہ کیا تھا۔ اُس نے دُنیا کے ہر رنگ کو ہر پہلو سے پرکھا تھا۔ انسان کس طرح جیتے تھے۔ کس طرح مرتے تھے۔ یہ گورکھ دھندا کیوں جاری تھا۔ گہری ندیا اگم جل زور بہت ہے دھار۔ کھیوٹ سے پہلے ملو جو اترا چاہو پار۔ کھیوٹ کہاں تھا اور اس سے ملنے کی فرصت کسے تھی۔ مگر رُوح کا یہ غم کیسا تھا جو مدتوں سے کھائے جا رہا تھا۔ کسی دور کسی حال میں اُس کا پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ زندگی سے اسے جتنی توقعات تھیں ان سے کہیں زیادہ مہربانی سے زندگی اس سے پیش آئی تھی مگر زندگی کو اُس نے اپنی طرف سے کیا دیا تھا—؟ اُس نے گھبرا کر چاروں اور دیکھا یہ پُررونق خوبصورت شہر۔ اس کی دولت۔ اس کی آبادی سب اس کے قدموں میں بکھری تھی۔ اسے چاروں طرف کے انسان اپنا منہ چڑاتے نظر آئے۔ چوراہے پر پہنچ کر کہاروں نے کندھا بدلنے کے لئے بوچہ زمین پر رکھا۔ سامنے ایک پرتگالی شراب خانہ تھا۔ ہگلی کے برطانوی اور اطالوی ملاح دروازے پر کھڑے ہوئے تھے۔ اندر کوئی زور زور سے ہارپ بجا رہا تھا۔ ایک عورت سر پر سیاہ جالی کا رومال اوڑھے تیز تیز نظروں سے اسے گھورتی شراب خانے کے دروازے میں داخل ہو گئی۔

"ٹھہرو۔ یہیں رکو۔" سرل نے چلا کر کہاروں سے کہا۔ انھوں نے بوچہ دوبارہ زمین پر دھر دیا۔ سرل کود کر اس عورت کے پیچھے پیچھے دوڑا۔ وہ یہ قطعی بھول گیا کہ اس کو کلکتے کے اس گھٹیا یوروپین شراب خانے میں گھستا دیکھ کر لوگ کیا کہیں گے۔

کاؤنٹر کے پیچھے ایک پیلی رنگت اور بجھی بجھی آنکھوں والا یوروپین بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ سرل کو دیکھ کر وہ ہڑبڑا گیا اور فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور مارے رعب کے اُس کی زبان ہکلا گئی "سر— سر—" اس کے آگے اُس کی آواز حلق میں ڈوب کر رہ گئی۔

سرل خاموشی سے اسے دیکھا کیا۔ ساری دُنیا کے شراب خانوں کے کاؤنٹرز کے پیچھے بیٹھے ہوئے یہ ان کے مالک کس قدر پُراسرار لگتے تھے۔ ان سب کی بڑی خاموش برادری تھی یہ آوارہ گردوں چوروں، اچکوں، بدمعاشوں اور طوائفوں کی اپنی مخصوص اداس دُنیا تھی۔

اتنے میں وہی عورت تیز تیز آواز میں بولتی تیزی سے قدم رکھتی ایک لکڑی کے زینے پر سے اُتری۔ نیم تاریکی میں اس کے سفید دانت جھلملائے۔ اب دو برطانوی ملاح غُل مچاتے اندر آ چکے تھے اور ان کے ساتھ دو بے حد حسین یوریشین لڑکیاں تھیں۔ ان میں سے ایک لڑکی بہت زور زور سے قہقہے لگا رہی تھی۔

اس لڑکی کے چہرے پر سرل کو اپنی آنکھیں نظر آئیں۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھا "کدھر جاتے ہو سرل صاحب۔" اس عورت نے جس کے پیچھے وہ اندر آیا تھا۔ یکلخت اس کے سامنے آ کر دروازہ میں اس کا راستہ روکتے ہوئے استہزائیہ کہا۔ اس کے کانوں کے بُندے جھکولے کھا رہے تھے اور وہ خاصی بے تکی نظر آ رہی تھی۔ دروازے کی چوکھٹ سے لگ کر اس نے بڑے اطمینان سے سرل کو گھورنا شروع کیا۔ "سرل صاحب۔ اپنی لڑکی سے ملتے جاؤ۔ تم نے مجھے کلکتے بُلایا تھا۔ میں پچیس سال سے تمہاری منتظر ہوں میں اسے چار سال کا گود میں اُٹھا کر یہاں لائی تھی۔ مگر تمہارے چوبداروں نے مجھے آج تک تمہاری کوٹھی میں گھسنے ہی نہیں دیا۔ میں کیا کرتی۔ تم نے تو میرے کسی خط کا بھی جواب نہیں دیا۔ تم جاننا چاہتے تھے کہ ہم لوگوں کی زندگیاں کیسے گزرتی ہیں۔ دیکھ لو۔ اس طرح گزرتی ہیں۔

"سرل صاحب، تم تو بنگال گورنمنٹ کے بہت بڑے افسر ہو۔ کچھ میرے لئے روپیوں کا بندوبست کر دو سُنا ہے نیٹو عورتوں نے تم سے بہت فیض حاصل کیا ہے۔ میں تو پھر ایک حد تک تمہاری ہم قوم ہوں۔"

سرل پسینہ پسینہ ہو رہا تھا ——— اسے محسوس ہُوا ابھی اسے دل کا

دورہ پڑے گا اور وہیں کھڑے کھڑے ختم ہو جائے گا۔ اسی وقت سامنے سے ایک گھوڑا گاڑی گزری جس میں کلکتہ کرانیکل کے چند صحافی بیٹھے تھے۔ ان کو دیکھ کر سرل کی جان ہی نکل گئی۔ اگر کسی طرح اُن کو اس معاملے کی خبر ہو گئی تو کل تک یہ سارا واقعہ کلکتے بھر کی سوسائٹی میں مشتہر ہو گا۔ ولایت تک بات پہنچے گی۔ اُس کے چہرے کا رنگ بدلتا دیکھ کر اس کا چوبدار بھاگ کے اس کے پاس آیا۔ "صاحب، آپ کا جی ماندہ ہے چلیئے۔" وہ پھر بوچے میں جا بیٹھا۔

عورت کمر پر ہاتھ رکھے دروازے میں کھڑی اُسے دیکھتی رہی اور پھر اندر چلی گئی۔

"حضور گھر چلیئے گا؟" کہاروں نے پوچھا۔

گھر؟ — اس کا گھر کہاں تھا۔ "نہیں باغ والے بنگلے چلو۔" اُس نے غصے سے کہا۔ اپنے باغ میں پہنچ کر وہ سوچے گا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔

بوچہ آگے بڑھتا گیا۔

جلدی اور جلدی۔ اس نے کہاروں کو ڈانٹا۔ زندگی کا سارا نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرتا جا رہا تھا۔ یہ زندگی کا فانوس تھا اور وہ خود تنہا اس میں مقید تھا اور اس کے چاروں طرف رنگا رنگ تصویریں بنی تھیں اور اسے ان تصویروں سے ڈر لگ رہا تھا۔ گورنمنٹ ہاؤس کے رفقائے کار، کالج کے منشی اور نثار، ایشیاٹک سوسائٹی کے محقق، اودھ کے شعراء اور فن کار، حتیٰ کہ لکھنؤ کی چمپا بائی یہ سب مل کر اُس کی رُوح کے غم کو نہیں مٹا سکتے تھے۔

اس کی روح کے غم کیا تھے؟ — عورتیں —؟

ہرگز نہیں۔ عورتوں کے مسئلے نے اُسے کبھی پریشان نہیں کیا۔ کامیاب، مطمئن انسانوں کی زندگیوں میں ایک خاص خانہ ہوتا ہے جو صنفِ لطیف کے لئے وقف رہتا ہے۔ ان کی محبتیں۔ ناکامیاں رومان ازدواجی زندگی کی مسرتیں یا بے کیفیاں۔ یہ سب چیزیں اس لیبل کے تحت آتی ہیں جس پر "عورتیں" لکھا ہے۔ سرل ایشلے جس نے شاعر

کی نظروں سے دُنیا کو پہلی بار دیکھا تھا۔ اب شاعر کے بجائے ایک کامیاب انسان بن چکا تھا۔ اس کی رُوح کا دُکھ یہ تھا کہ وہ کسی سے محبت نہ کر سکا۔ اس ملک سے جس نے اپنی ساری جمع پُونجی اس کے قدموں میں ڈال دی۔ ان عورتوں سے جنھوں نے وقت کے مختلف حصوں میں اسے چاہا۔ مدراس کی ماریا ٹیریزا ڈھاکہ کی کشوری کی شُنیلا۔ اور بہت سی عورتیں جو اس کے غیر معمولی حُسن سے متاثر ہو کر اس پر نچھاور ہوئیں۔ سرل ایشلے نے دُنیا سے سب کچھ حاصل کر لیا۔ لیکن اس کے بدلے میں دُنیا کو کچھ دیا نہیں۔ یہ بڑی بدنصیبی کی بات تھی۔ اگر اس کے عہد میں مذہب کا چرچا ہوتا تو شاید وہ خدا میں پناہ ڈھونڈھتا۔ لیکن دُنیا عقلیت پرستی اور سائنس اور مادیت کی طرف جا رہی تھی۔ بنک آف انگلینڈ۔ چرچ آف انگلینڈ سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ زندگی کے معنی تھے اور زیادہ سرمایہ اور زیادہ تجارت۔ حکومت۔ اور زیادہ ترقی اور اقتدار۔ اپنے گارڈن ہاؤس میں پہنچ کر اُس نے اس ہفتے کی ڈاک دیکھی۔ کچھ دیر سویا۔ پھر حقہ پیچوان کے کش لگانے کے بعد وہ دفتر جانے کے لئے تیار ہُوا۔ دل کی ویرانیاں بھی تھیں مگر فرض اور انصاف اور قانون کے تقاضے بھی تھے۔ جو ذاتی دُکھوں پر حسبِ معمول حاوی ہوئے۔ فرض اسے پکار رہا تھا کہ ندیا کے ضلع میں جا کر باغی کسانوں کی سرزنش کرے۔ قانون اور انصاف کا تقاضا تھا کہ ان باغیوں کو سخت ترین سزائیں دی جائیں۔ گو دل کی ویرانی کہتی تھی۔ لکھنؤ چلو۔ وہاں دربار کی رنگینیوں میں سارے غم دُھل جائیں گے ــــ

کوٹ پہن کر وہ پھر بوچے پر سوار ہُوا اور چورنگھی کی طرف لوٹا، جدھر اس کا دفتر تھا۔

۲۹

نوجوان بنگالی کلرک نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ اب تک فائلوں پر جھکا ہُوا تھا۔ گھنگھریالے بال اس کے ماتھے پر آن گرے تھے۔ میز پر چاروں طرف مٹیالے کاغذات کا انبار تھا۔ باہر برآمدے میں اُڑیہ قلی لڑکا اونگھتا جاتا تھا۔ اور پنکھے کی ڈور کھینچ رہا تھا۔ سرل کو دفتر میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہو بیٹھا اور پنکھا زیادہ تیزی سے کھینچنے لگا۔

"گڈ آفٹر نون سر ـــ" نوجوان نے کرسی پر سے اُٹھتے ہوئے بڑے رسان سے کہا۔

"گڈ آفٹر نون ـــ تمہارا کیا نام ہے۔"

"گوتم نیلمبر دت۔ سر۔"

"میں نے تمھیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"میں کل ہی پریذیڈنسی مجسٹریٹ کے دفتر سے یہاں ٹرانسفر کیا گیا ہوں۔"

"کب سے کام کر رہے ہو ـــ؟ ابھی تو لڑکے ہی سے معلوم ہوتے ہو۔" سیرل نے دلچسپی سے پوچھا۔ اس کا نیٹو لوگوں سے یہ دوستانہ انداز ایک زمانے میں کارنوالس کو بہت کھلا کرتا تھا۔ کیونکہ جب سے جان کمپنی کو سیاسی اقتدار ملا تھا۔ کارنوالس نے پالیسی تبدیل کر دی تھی۔ اب انگریز حاکم تھے اور ہندوستانی محکوم۔ انھیں کسی حالت میں بھی نیٹو لوگوں سے برابری کا برتاؤ نہ کرنا چاہیے تھا۔ ہسٹنگز[۱] بہادر کے زمانے خواب وخیال ہو چکے تھے۔ کارنوالس کے عہد سے انگریز اور نیٹو کے درمیان سماجی خلیج وسیع ہوتی جا رہی تھی مگر سیرل اولڈ اسکول کا 'نواب' تھا۔ اسی طرح شاعروں سے ملتا۔ مجرے سنتا۔ اودھ ریذیڈنسی میں رہ کر اس پر ہندوستانیت کا رنگ اور بھی گہرا ہو چکا تھا۔ اسے کارنوالس یاد آیا۔ گڈ اولڈ کارنوالس؟ جو غازی پور پہنچ کر ہیضے کا شکار ہو گیا! اب تو اس کی ہڈیاں بھی قبر میں گل گئی ہوں گی۔ اسے موت کے احساس نے پھر گھبرا دیا۔ اُس نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں اور پھر بنگالی کلرک پر نظر ڈالی۔ "تم نے کہاں پڑھا ہے۔"

"سنسکرت کالج بنارس اور یہاں۔" اس نے جواب دیا۔ "کلکتہ کالج میں ایف اے تک پڑھا ہے۔ اب بی اے کرنا چاہتا ہوں۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے۔" سیرل نے واقعتاً خوش ہو کر کہا۔ "دفتر کے بعد بھی مجھ سے

---

۱ وارن ہسٹنگز۔

ملتے رہا کرو۔" پھر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔
کچھ دیر بعد اس نے پیلمبر دت کو پھر بلایا۔
"سفر کرنا پسند ہے؟"
"جی ہاں۔"
"کبھی شاہ اودھ کی عملداری میں گئے ہو—؟"
"میں بنارس سے آگے کبھی نہیں گیا۔"
"اب جاؤ گے—؟ چند ضروری کاغذات ہیں۔ تمہارے ساتھ مسلح دستہ جائے گا۔ میں خود نہیں جا سکتا کیونکہ مجھے اضلاع کا دورہ کرنا ہے۔ گھر جا کر سامان باندھو۔ اکلیش سے کہو جہاز میں تمہارے لئے کیبن کا بندوبست کر دے۔"
"یس سر۔ تھینک یو سر۔" وہ اُلٹے قدموں اپنے کمرے میں واپس آیا اور پھر کاغذات پر جھک گیا۔ سرل اسے بڑی محبت سے دیکھا کیا۔ انسانوں کو پہچاننے کی روح کے اندر جھانکنے کی اس نے اس سے پہلے کوشش کیوں نہیں کی تھی؟
جہاز نے جو کلکتے سے بنارس جاتا تھا ابھی لنگر نہیں اُٹھایا تھا۔ بارشوں کا موسم آ چکا تھا اور مونگیر اور پٹنہ تک گنگا کی موجیں ہلاکت خیز تھیں۔ گوتم پیلمبر سامان سفر درست کرنے کے بعد اب بادلوں کے چھٹنے کا انتظار کر رہا تھا۔ مانک تلہ میں اس کا چھوٹا سا مکان تھا جہاں وہ اکیلا رہتا تھا۔ اس کے ماں باپ بہن بھائی سب راج شاہی میں رہتے تھے اور کھیتی کرتے تھے۔
اس سمے شام ہو چکی تھی۔ آنگن کے کونوں میں جھینگر بول رہے تھے گلیوں میں بارش کا پانی بھرا ہوا تھا۔ ہوا بند تھی۔ وہ اپنے کمرے کے برآمدے میں جس کی سیڑھیاں گلی میں اُترتی تھیں چٹائی بچھائے لالٹین جلائے ایک موٹی سی انگریزی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا اور بار بار ڈکشنری دیکھتا جاتا تھا —————— اتنے میں آہٹ ہوئی اور اس نے سفید ساری میں لپٹی ایک چالیس سالہ عورت سامنے کھڑی دیکھی۔ وہ جلدی سے اُٹھا اور نمسکار کرنے کے بعد اس سے پوچھا "کیا بات ہے ماں—؟ کس سمے

ملنا چاہتی ہو — ؟"
"تم ہی سے۔"
"مجھ سے — ؟"
"ہاں۔ تم سرل صاحب کے کلرک نہیں ہو — ؟"
"ہاں ہوں تو —"
"میں شُنیلا ہوں —"
"شُنیلا — ماں — ؟" اس کے پلّے کچھ نہ پڑا۔ "تمھاری کیا سیوا کروں ؟"
"میں — میں سرل صاحب کی بیوی ہوں۔"
"اچھا — ؟" اُسے یاد آیا دفتر میں اُسے کسی نے بتایا تھا کہ ————
———— سرل صاحب کے زنانخانے میں برسوں سے ایک ہندو عورت رہتی تھی۔ جس کو کچھ عرصے سے اُنھوں نے علیحدہ کر دیا تھا اور اس کے لئے ایک دوسرا مکان لے رکھا تھا۔
"تم کو صاحب بہت مانتے ہیں۔ میرا ایک کام کرو گے۔ تم لکھنؤ جا رہے ہو نا۔ ؟"
"ہاں — ماں —"
"تم نے چمپا بائی کا نام سُنا ہے ؟"
"چمپا بائی — وہ کون ہے — ؟"
"لکھنؤ کی بڑی مشہور طوائف ہے۔ ————
———— صاحب جب بھی لکھنؤ جاتے ہیں اس پر ہزاروں روپے خرچتے ہیں۔ میری اب بات بھی نہیں پوچھتے۔ میرا اب دُنیا میں کوئی نہیں ہے ایک بوڑھا باپ تھا وہ بھی مر گیا بھائی اپنے کاروبار میں لگے ہیں۔ بھاوج اُٹھتے بیٹھتے طعنے دیتی ہے جاؤ اپنے فرنگی کے پاس۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "میری ایک لڑکی بھی ہے۔ وہ دس سال کی ہوئی تو اسے صاحب نے اپنی بہن کے پاس بھیج دیا۔ وہ ولایت سے لوٹ کر آئی ہے تو مجھے پہچانتی بھی نہیں۔ اسے لوگوں کو بتاتے شرم آتی ہے کہ اس کی ماں کالی عورت ہے۔"

نیلمبر کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ صاحب کی ایک لڑکی بھی ہے۔ "تمہاری بیٹی کا کیا نام ہے؟"

"مارگریٹ اجابل۔ پر میں اسے بیلا کہہ کر بلاتی تھی۔"

"تم عیسائی ہو گئی ہو — ؟"

"نہیں۔ مگر بیلا ہمارے دھرم کو بہت برا سمجھتی ہے۔ تم چمپا سے کہو وہ صاحب کا خیال چھوڑ دے — تم لکھنؤ سے آکر مجھ سے ملو گے نا۔ تم مجھے بتاؤ گے تم نے چمپا سے کیا کہا؟"

"میں تم سے ضرور ملوں گا ماں۔" گوتم نیلمبر نے کہا۔ پھر وہ اسے پہنچانے کے لئے گلی میں اتر آیا "تمہاری پالکی کدھر ہے؟"

"میں پیدل آئی تھی۔ تم میری فکر نہ کرو۔" گلی کے اندھیارے میں اس کی سفید ساری کچھ دیر تک جھلملاتی رہی۔ پھر موڑ پر پہنچ کر وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ گوتم نیلمبر برآمدے میں واپس آکر دوبارہ اپنی ڈکشنری پر جھک گیا۔

۳۰

لکھنؤ کے رومی دروازے میں پہر دن چڑھے کی نوبت بجنے والی تھی۔ بیل گاڑیاں اور شکرمیں چرخ چوں کرتی دیہات کی طرف سے شہر کے ناکوں میں داخل ہو رہی تھیں۔ ان بیل گاڑیوں پر ترکاریاں اور پھل لدے تھے اور مسافر سوار تھے۔ چوک اور نخاس میں چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ امراء کے محلات کے پائیں باغ صاف کئے جا رہے تھے۔ ملازمین باسی پھولوں کے گلدستے اور گجرے سمیٹ رہے تھے۔ مہریاں خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ سڑکوں کے کنارے ساقنوں اور تنبولنوں نے اپنی اپنی دوکانوں کی آرائش شروع کر دی تھی۔ لوگ آتے تھے دو گھڑی ہنس بول کر، زردہ کھا کر یا حقے کے دو کش لگا کر اپنے اپنے کاروبار میں مصروف آگے بڑھ جاتے تھے۔ میدان میں نجیبوں کی پلٹنیں قواعد کر رہی تھیں۔ تلنگے، جھلنگے، حبشی سپاہی، راجپوت عہدے دار،

محلاتِ شاہی کے پہرے پر مستعد کھڑے تھے۔ رمنا کے جنگلوں میں چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ گومتی کے کنارے کشتیاں بندھی کھڑی تھیں۔ ابھی بجروں کے چلنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ ساحلِ دریا پر بنی ہوئی کوٹھیوں کا عکس شفاف پانی میں جھلملا رہا تھا۔ ساون کے اودے بادلوں اور آس پاس کے سبزے کی وجہ سے گومتی بھی سبز رنگ ہو رہی تھی۔ حیات بخش، ٹیڑھی کوٹھی، کنکر والی کوٹھی، سنگھاڑے والی کوٹھی، خورشید منزل، سب جگہوں پر بادل جھک آئے تھے۔ باغوں میں ٹپکا لگ گیا تھا۔ کنجوں میں جھولے پڑ گئے تھے۔ لکھنؤ ساون منانے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔

پھر دوپہر کی نوبت بجی۔ طعام خانوں کی رونق دوبالا ہوئی۔ بھٹیارنیں مصروف ہوئیں۔ لوگ اپنے اپنے کارخانوں سے کھانا کھانے کے لئے نکلے۔ دیوان خانوں میں دسترخوان بچھے۔ بیگمات نے خس کی ٹٹیوں کے پیچھے چوسر کی بساطیں بچھائیں۔ مہریاں اور خواصیں پاندان کھول کر بیٹھیں۔ لڑکیاں بالیاں چنریاں رنگنے میں مصروف ہوئیں۔ کڑھائیاں چڑھائی گئیں۔ سہ پہر کی نوبت بجی، دن ڈھلنا شروع ہوا۔ دلفریب باغات میں درختوں کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ رمنا میں پلے ہوئے جنگلی جانور چنگھاڑتے پھرے اور ہرن کلیلیں بھرا کئے۔ چڑیا جھیل پر بادل جھک آئے تھے۔ موتی محل پہ بارش کی ہلکی ہلکی بوندیں برس گئیں۔

پھر چوتھا پہر آیا۔ سورج ڈوبنے لگا۔ ہواؤں میں خوشبوئیں امنڈ آئیں۔ شامِ اودھ اپنی پوری آب و تاب سے بزم آرا ہوئی۔ سارے شہر کو رنگا رنگ کی خوشبوؤں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چھڑکاؤ کی ہوئی مٹی کی سوندھی خوشبو۔ گندھیوں کی دکانوں کی مہک۔ قنوج کے بیلے اور جونپور کے گلابوں کی خوشبو۔ مندروں میں سے اٹھتے ہوئے عود کی لپٹ۔ بادشاہ کے محل میں بہتی ہوئی عطر کی نہر کی خوشبو۔ پھر گلی کوچوں کی کھڑکیاں اور دروازے کھلے۔ لوگ گلیوں اور سڑکوں پر آ گئے۔ انھوں نے باغوں کا رخ کیا۔ گلی کوچوں میں سے نغمے کی آوازیں بلند ہونا شروع ہوئیں۔ خوش شکل اور خوش لباس کنجڑنیں، تیز و طرار تنبولنیں، حسین اور حاضر جواب بھٹیارنیں ساون اور لاونیاں گاتی پھر رہی تھیں۔ گلی کے لڑکے بیت بازی

کرتے جاتے تھے اور گولیاں کھیلتے تھے۔ غریبوں اور امیروں کے مکانوں سے ستار اور جل ترنگ اور تان پورے کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ ندی کنارے بیٹھے ہوئے جوگی ترئی بجاتے تھے۔ نئی بیاہی لڑکیاں اپنے گھروں میں بیٹھی سڑک کی اور دیکھتی تھیں کہ ساون منانے کے لیے ان کا بھائی میکے سے ڈولی کب بھیجے گا۔ حلوائی پوریاں چھان رہے تھے۔ بچیاں پکوان بنا رہی تھیں۔ ہر شخص مسرور تھا

لوگو۔ خوش ہو لو۔ کہ دُنیا فانی ہے۔ جانے کتنے دن کا چین تمھارے نصیبوں میں لکھا ہے۔ آپس میں ہنس بول لو۔ غنیمت جان لو کہ یہاں دو چار ہم جنس مل بیٹھے ہیں۔ کل کیا جانئے کیا ہو۔ کوچ نگارا سانس کا باجت ہے دن رین۔ باقی صرف خدا رہے گا جو کہیں بہت دُور بیٹھا اس لیلا کا تماشا کرتا ہے۔ وہ خدا جو صوفیوں کا ہے اور فرنگی محل کے مولویوں کا۔ اور بالا ناتھ کے جوگیوں کا۔ اور وہ کسی سے بھی اپنی انگلی اٹھا کر کہہ سکتا ہے۔ بس۔ اب ختم کیا جائے۔

اے حقیر اور بے بس اور مضحکہ خیز انسانو   تم سب ایک مکڑی کے غیر مرئی جال میں گرفتار ہو چکے ہو۔ مکڑی کو تم پہچانتے نہیں ہو۔ کیونکہ تمھارا جال غیر مرئی ہے۔

کب تک تمھاری یہ مسرت رہے گی بے چارے لوگو مسرت بڑی عظیم چیز ہے دُوسروں سے اُن کی مسرت نہ چھیننا۔

یہ لوگ جوان سڑکوں پر چل رہے ہیں۔ گا رہے ہیں۔ خوش ہیں۔ جنھوں نے جینے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے۔ یہ باوقار با نفاست باوضع پُر امن زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ جوان باغوں میں جمع ہیں۔ بڑے اہم لوگ ہیں۔ کیونکہ یہ ایک بڑی تہذیب کے نمائندے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے فرانس کی مانند اُنھوں نے جینے کے فن کو اعلیٰ ترین بلندی پر پہنچا دیا ہے۔ یہ نام یہ صورتیں بڑی اہم ہیں۔ جب کوئی ان کا نام لیتا ہے تو دل پر چوٹ لگتی ہے۔ شجاع الدولہ۔ بہو بیگم۔ بینی بہادر۔ ٹکیت رائے۔ اودھ کے یہ مرنجان مرنج باشندے جو ہزاروں سال سے گھاگرا اور گومتی کے کنارے رہتے آئے ہیں۔ رام چندر کے زمانے میں بھی یہی لوگ تھے۔ شجاع الدولہ کے زمانے میں

بھی یہ لوگ زندہ تھے۔ یہ کسان اور جوگی۔ دریا کے کنارے وہ ننگا گوسائیں دھونی رمائے بیٹھا ہے۔ یہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ شجاع الدولہ کی فوج میں شامل ہو کر بکسر میں انگریزوں سے لڑا تھا۔ یہ پُرامن کسان اپنا ملک بچانے کے لئے نواب کے سپاہیوں کی حیثیت سے مرہٹوں سے ٹکر لیتے تھے۔ یہ مرنجان مرنج ہلوا ہے اور گوالے عظیم آباد تک پہنچ کر انگریزوں سے بھڑ گئے تھے۔ امن نہیں تھا۔ سندھیا کی فوج نے گنگا پار کا علاقہ تباہ کر رکھا تھا۔ الہ آباد میں کلائیو ڈنر ٹیبل پر شاہ عالم کا تخت بنا چکا تھا۔

انگریزوں نے شجاع الدولہ کی زبردست فوج سے گھبرا کر عہد نامہ کیا تھا کہ پینتیس ہزار سے زیادہ فوج نہ رکھیں گے مگر حسبِ معمول وہ اس وعدے سے پھر چکے تھے اور جب فیض آباد کا شجاع الدولہ مرا۔ اس کو صدمہ تھا کہ انگریزوں کو ملک سے نہ نکال سکا

شجاع الدولہ جو مہاجی سندھیا کا پگڑی بدل بھائی بنا تھا۔ یہ نام اس داستان کے ہیں، داستان صبح ہوتے ہوتے ختم ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے فن داستان گوئی کو اپنے عروج پر پہنچا دیا ہے کہ خود بھی یہ قصہ سناتے سناتے قصے میں تبدیل ہو جائیں گے

ان کا قصہ مضحکہ خیز ہے—؟

لکھنؤ پریوں کے شہر کی طرح جگمگا رہا ہے۔ یہ مانوس گلیاں۔ سڑکیں۔ محلے۔ گنج کٹرے۔ باغ۔ ناکے۔ بارونق۔ آباد بھرے پُرے۔ یہ قلعہ مچھی بھون ہے۔ یہ معالی خاں کی سرائے ہے۔ یہ آصف الدولہ کے جان نثار راجہ جھاؤ لال کا پُل ہے۔

ذرا ٹھہرو۔ آصف الدولہ — یہ کس کا نام لیا کہ دل کے سارے تار جھنجھنا اُٹھے وہی آصف الدولہ جس کا نام لے کر ہندو دکاندار صبح کو اپنی دوکانیں کھولتے ہیں؟ "جس کو نہ دے مولا۔ اس کو دے آصف الدولہ—" جو کہتا تھا "یہ جہاں میں جہاں تک جگہ پایئے۔ عمارت بناتے چلے جایئے۔" جس نے قحط سالی کے زمانے میں رعایا کو روزی مہیا کرنے کے لئے امام باڑہ تعمیر کروایا تھا جہاں رات کو مشعلوں کی روشنی میں کام ہوتا تھا کہ شرفا کو مٹی ڈھوتے اور اینٹیں چنتے شرم نہ آئے۔ دریا لو۔ سخی۔ دیوتا سمان آصف جس نے ہزاروں باغات، بارہ دریاں، شیش محل اور ہاتھی دانت کے بنگلے

بنوا ڈالے جو غریبوں اور اہل کمال کی پرورش اور قدر کے لئے نت نئی تجویزیں دماغ سے اتارتا تھا۔ جری شجاع الدولہ کا سخی بیٹا آصف۔ اس کے فرانسیسی جنرل کلاڈ مارٹن کے قلعے کونسٹینشیا کے باغ میں بہار کے سارے پھول کھلے ہیں۔ فرح بخش کوٹھی کے نیچے سے ندی سبک خرامی سے بہہ رہی ہے۔ طعام خانے کے دریچوں کے نیچے سے کشتیاں گذر رہی ہیں۔ برسات میں کوٹھی کی نچلی منزلیں غرقاب ہو جاتی ہیں تو جنرل اوپر کی منزلوں میں چلا جاتا ہے۔ فرانسیسی معماروں کی بنائی ہوئی کوٹھیوں میں جھاڑ فانوس سجے ہیں۔ پیانو رکھے ہیں۔ ولائتی فرنیچر جھل جھل کر رہا ہے۔

یہ شہر اودھیا اور بنارس کی ہزاروں سال قدیم موسیقی کا محافظ ہے۔ یہاں کی بھیروی سارے ملک میں مشہور ہے۔ یہاں کا بچہ بچہ موسیقی کے فن سے آشنا ہے۔ یہاں محرم کے زمانے میں فضاؤں میں بہاگ اور پیلو اور سوہنی گھل جاتی ہے بیگمات کے محلوں کی چہار دیواری میں بے دار اور گلے باز ڈومنیاں سال بھر جشن موسیقی مناتی رہتی ہیں چوک کے کمرے اور مضافات کے باغ اور بارہ دریاں باکمال ڈیرے دار طوائفوں کی تانوں سے گونجتی ہیں۔ چاندنی راتوں میں کہار اور مزدور منڈیروں پر بیٹھ کر برہا گاتے ہیں۔ برج کے رس دھاری راس لیلا کا سوانگ رچاتے ہیں۔ برہمن رقاص ایک گھنگرو بجا کر ناچ رہے ہیں اور آس پاس سارے میں موت کا گھنگرو بج رہا ہے۔ پچھلے ستر اسی سال سے یہ ناٹک فیض آباد اور لکھنؤ کے رنگ بھوم پر کھیلا جا رہا ہے۔ ان کرداروں کی اہمیت باہر والے نہیں سمجھ سکتے ان سب نے مل کر اس دنیا کی تخلیق کی ہے جو اودھ کے باشندوں ہندو و مسلمانوں کی اپنی دنیا ہے۔ یہ لوگ کبھی رلاتے ہیں کبھی ہنساتے ہیں۔ ——

—— ان جیسے نام اور کہیں نہ ہوں گے

ان کی جیسی زبان۔ مذاق۔ لباس۔ یہ لوگ غریب امیر عورت مرد جو ٹھاکر امام بخش اور لالہ حسین بخش، مرزا مینڈھو اور نواب کمن کہلاتے ہیں اور امامن مہری اور مرزا اجنگی اور سکھ چین لونڈی اور نواب بسنتی بیگم یہ سب روتے ہیں ہنستے ہیں گاتے بجاتے ہیں۔ لڑتے ہیں۔ شجاعت ان کا شیوہ ہے۔ آن پر جان دینا۔ شرافت۔ احسان مندی۔ وفاداری

نیکی، اس کے علاوہ جاگیردارانہ سماج کی جتنی اچھائیاں اور جتنی بُرائیاں ہو سکتی ہیں۔ وہ سب ان میں موجود ہیں۔ اسی لئے یہ لوگ بڑے جذباتی ہیں۔ تاشے اور کوڑی پر ناچنے والے رقاص کشمیری بھانڈ جل ترنگیے۔ بین کار۔ باچیئی برہمن۔ طبلچی۔ شاعر۔ مرثیہ گو۔ داستان گو۔ کالیستھ۔ فوجی۔ بانکے۔ پٹہ باز۔ بھگت باز۔ نقال۔ بہروپیے۔ عالم۔ فاضل۔ کلاونت۔ یہاں رزم و بزم ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ یہ اصل رومانی معاشرہ ہے۔

لکھنؤ سے ستر میل کے فاصلے پر بنگلہ فیض آباد ہے۔ رام کا شہر اجودھیا۔ جسے شجاع الدولہ نے دلّی کا ہم پلہ بنا دیا تھا۔ جہاں گلاب باڑی ہے اور گھاگرا کے گھاٹ اور بڑے مغلوں کے زمانے کی مساجد۔ دلّی میں اب بچارے چھوٹے چھوٹے مغل بیٹھے ہیں۔ یہ مضحکہ خیز چھوٹے مغل بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں۔ ان کو سر چھپانے کو جگہ نہیں ملتی۔

دلّی کا ایک شہزادہ لکھنؤ میں پڑا ہے۔ بنارس میں پناہ گزین ہے۔ اودھ دربار سے اس کو دو لاکھ سالانہ وظیفہ دیا جاتا ہے۔ یہ امیر تیمور صاحبقران کی اولاد ہے۔
اور ایرانی شیعوں کی اولاد اس سمے اودھ پوری میں ڈگ وجے رامچندر کے سنگھاسن پر بیٹھی ہے اور اُس نے اپنی اس زبردست وراثت کا ——— حق ادا کر دیا ہے۔ یہ بادشاہت ہندوؤں کے لئے ان کی قومی ریاست کے مترادف ہے۔ یہاں ہندو اور مسلمان کا اختلاف کوئی نہیں جانتا۔ کیونکہ گڑھی کا ٹھاکر اور محل کا نواب دونوں جاگیردارانہ اقدار کے مضبوط رشتے میں ایک دوسرے سے بندھے ہوتے ہیں اور ان کی بدیہ جانب میں ہندو اور مسلمان کسان دونوں شامل ہیں ان کے سپاہیوں کی لاٹھیوں سے یکساں پٹتی ہیں۔ ان کے دُکھ سُکھ ایک ہیں۔

مذہبی تفریق کو بیجا کا خالص ذاتی معاملہ سمجھا جاتا ہے۔ محرم میں بلوے نہیں ہوتے نہ مسجدوں کے سامنے باجہ بجایا جاتا ہے۔ ہندو تعزیہ داری کرتے ہیں اور مسلمان دیوالی مناتے ہیں۔ کیسا اُلٹا زمانہ ہے۔ نواب بہو بیگم ہر سال ہولی منانے فیض آباد سے اپنے

بیٹے کے پاس لکھنؤ آتی ہیں۔ ساری سلطنت میں اَن گنت ہندو راجاؤں نے مسجدیں اور امام باڑے بنوا رکھے ہیں۔ لکھنؤ سے اسّی میل کے فاصلے پر بہرائچ ہے جسے ہزاروں برس پہلے شراوستی کہتے تھے۔ جہاں سالار مسعود غازی کی درگاہ ہے۔ جنھوں نے شراوستی کے سورج کنڈ کے مندر کو مسمار کیا تھا اور شراوستی کے آخری ہندو راجہ سُہَل دیو کے تیر سے شہید ہوئے تھے۔ ان کی عمر اس سمے صرف اٹھارہ سال کی تھی۔ تب سے اب تک بڑی دھوم دھام سے ہندو مسلمان مل کر ان کی بارات نکالتے ہیں۔ جیٹھ مہینے میں ان کا میلہ لگتا ہے۔ سُرخ نیزے اور جھنڈے اُٹھائے ڈفلی بجاتے ہزاروں ہندو مسلمان دیہاتوں سے ان کے مزار کا رُخ کرتے ہیں۔ بنگال کے مسلمان صوفی ستیہ پیر کی مانند جو ستیہ نرائن بن چکے ہیں۔ بُت شکن سالار مسعود عرف بالے میاں نے (کہ جس وقت وہ شہید ہوئے ان کی عمر صرف اٹھارہ سال کی تھی) اودھ کے ہندوؤں کے لیے بالا ناتھ کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ ان کے مقبرہ کے قریب کا اگن کنڈ بالارکھ کی دھونی کہلاتا ہے۔ درگاہ کی نذر مجاور۔ اور پوجا کے محاصل پنڈے حاصل کرتے ہیں پنڈوں اور مجاوروں میں آپس میں اس آمدنی کی تقسیم کے متعلق معاہدہ ہے۔ سیرل آشلے کے دوست بشپ ہیبر اور اُن کے ساتھی جو آج کل اُس ملک میں چاروں اور گھوم کر اپنے سیاحت نامے قلمبند کر رہے ہیں لکھتے ہیں کہ اس ملک کا ہندو مسلمان ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہے اور ویسٹ منسٹر میں ہماری حکومت کو چاہیئے کہ ان وحشیوں کو اپنے جہالت اور تعصب سے نجات دلانے کے لئے جلد از جلد مزید انجیلیں اور مزید بندوقیں بھیجے۔

لکھنؤ کے باسیوں کو خبر نہیں کہ ان بے چاروں کے لئے بندوقوں سے لدے ہوئے جہاز کلکتے کی اور آ رہے ہیں۔ آغا میر شاہ زمن کے وزیر اعظم ہیں۔ میتا بیگ کوتوال شہر کا حاکم ہے۔ جس نے عہد سعادت علی خاں کے دھومی بیگ کوتوال کی انصاف اور امن پروری کی روایت کو زندہ کر رکھا ہے۔ شہر میں مکمل سکون ہے۔ مشہور ڈاکو محرم منانے کے لئے عارضی طور پر رہا کئے جاتے ہیں اور پھر جیل میں خود واپس آ جاتے ہیں۔

بانکے مفسدوں کی سرزنش کے لئے موجود ہیں۔ ہوا میں اشرفیاں اچھالتے چلے جایئے۔ کوئی نہ پوچھے گا۔ بہو بیٹیوں کی عزتیں محفوظ ہیں۔ ایک کی بیٹی سارے محلے کی بیٹی سمجھی جاتی ہے وضعداری اور شرافت پر جان دینے کا عام رواج ہے۔

یہ ابوالمظفر معزالدین شاہ زمن غازی الدین حیدر کا دارالسلطنت ہے جن کی شادی میں روپیوں یا اشرفیوں کے بجائے ہاتھیوں پر سے ہیرے جواہرات کی بوچھار کی گئی تھی جن کو لوٹ کر غریب غربا دولت مند ہو گئے تھے۔ ان کے حرم سرا میں فرنگی کرنل ایش کی بیٹی مبارک محل براجتی ہے۔ اُن کی بیٹی کی شادی بنگالے کے قاسم علی خاں کے لڑکے سے ہوئی ہے۔

اک ذرا ٹھہرنا ـــ کون قاسم علی خاں ـــ بنگالے کا آخری خود مختار نواب۔ وہ سیدزادہ جو اپنی شکست کے بعد دلی جا کر جلاوطنی کے اس عالم میں مرا کہ اس کی شال فروخت کر کے اس کی تجہیز و تکفین کی گئی ـــ ؟

یہ شاہ زمن کا دارالسلطنت ہے۔ شاہِ زمن نے گومتی کے کنارے امام باڑہ نجف اشرف تعمیر کرایا ہے۔ محرم میں اس میں چراغاں کیا جاتا ہے تو لگتا ہے طلسم ہوشربا کا ایک منظر ہے۔

بازاروں میں کھوے سے کھوا چھل رہا ہے۔ سودے والے اپنی اپنی شاعرانہ صدائیں لگا رہے ہیں۔ دوکانوں میں دُنیا جہان کا مال فروخت ہو رہا ہے۔ سعادت علی خاں کے عہد کی بنی ہوئی عمارتوں میں قہقہے گونج رہے ہیں۔ ان خوبصورت عمارتوں کی آرائش دیکھ کر جی بھر آتا ہے۔ اتنی خوبصورتی اور نفاست پائدار ہو سکتی ہے ؟

حُسن پائدار نہیں ہوتا۔ شاکیہ منی گوتم سدھارتھ نے ایک مرتبہ کاشی کے ہرنوں کے باغ میں کہا تھا۔ ہر شے فنا ہے۔ فنا سے بچو۔ دُکھ سے بچو۔ سائے سے بچو۔ اور وپانت میں لکھا ہے کہ مایا کی مثال ایسی ہے گویا بانجھ عورت کا لڑکا سراب کے پانیوں میں نہانے کے بعد آسمان پر اگے ہوئے پھول پہن کر ہرن کے سینگوں سے بنی کمان ہاتھ میں لئے باہر نکلے۔ مت بھولو کہ رام چندر کے اجودھیا اور پرسن جیت کے شراوستی اور چندر گپت

کے پاٹلی پتر اور کالی داس کے اجین اور حسین شرقی کے جونپور اور علاؤ الدین حسین کے گوڑ میں بھی زندگی کا حسن اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا اور مت بھولو کہ ہر حسن میں موت پوشیدہ ہے۔

سڑک پر سے ایک سکھپال گذر رہی ہے جس کے گنبد پر سنہری کلس سجا ہے، اور شوخ و شنگ مہری جس کا چھٹا کپڑے ساتھ ساتھ بھاگ رہی ہے۔ کہاروں کی وردیاں سرخ رنگ کی ہیں اور اُن کی سرخ پگڑیوں پر مچھلی کے طلائی نشان بنے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں چاندی کی موٹھ والی لاٹھیاں ہیں۔ راہگیروں کی نظریں اس سکھپال پر جمی ہیں۔ یہ اپنے وقت کی حسین ترین لڑکی چمپا کی سکھپال ہے۔

وقت بڑی عجیب چیز ہے۔

وقت اور حسن اور موت ——

باغوں میں میلے ہو رہے ہیں۔ مرغوں اور بٹیروں اور بیدھوں اور ہاتھیوں کی لڑائیاں منعقد کی جا رہی ہیں۔ انگریز ریذیڈنٹ بادشاہ کے ساتھ بریکفاسٹ کھاتا جاتا ہے اور سامنے ہاتھیوں کی لڑائی دیکھتا جاتا ہے۔ برآمدے میں انگریزی بینڈ بج رہا ہے۔ مشاعرے ہو رہے ہیں . . . دربار میں یکتائے روزگار رقاص پرکاش جی کتھک ناچ رہا ہے۔ شوالوں میں بھوانی کی پوجا ہو رہی ہے۔ آم کے کنجوں میں ملہار اڑ رہا ہے۔ شمشان گھاٹ پر وہ جو اس ہنگامے سے نکل گئے ہیں پھونکے جا رہے ہیں۔ نخاس میں انسان طرازوں نے اپنی محفلیں آراستہ کر رکھی ہیں۔ علماء اور حکما کی مجلسوں میں مباحثے جاری ہیں۔ بھنگڑے بسزی گھوٹنے میں محو ہیں۔ سرنگھار اور بینچرے اور پکھاوج کے شور سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ قبرستانوں میں قبریں کھودی جا رہی ہیں

فنا — فنا — ہر شے فنا ہے

وقت فنا میں شامل ہے۔

وقت کو مختلف حصوں میں قید کر لیا گیا ہے مگر وہ پل پل چھن چھن اس قید کو توڑتا ہوا چپ چاپ آگے نکلتا جاتا ہے۔

اب رومی دروازے میں مغرب کی نوبت بجے گی۔

چار پہر دن گزر چکا ہے۔ چار پہر رات گزر جائے گی۔ ہر پہر میں آٹھ گھڑیاں ہیں ہر آٹھویں گھڑی پر گجر بجتا ہے۔ انسانوں کا جلوس اپنی اپنی قبروں میں اتر رہا ہے۔ وقت موت ہے۔

۳۱

عہدِ آصفی کے بنے ہوئے رومی دروازے کی نوبت کی آواز گوتم نیلمبر کے کانوں تک پہنچی۔ اس وقت اس کی شکرم شہر کے ناکے میں داخل ہو رہی تھی۔ ناکے پر اس نے سپاہی کو اپنا پروانہ راہداری دکھلایا۔ بادشاہ اودھ کے سپاہی نے پوچھا "قبلہ کہاں سے تشریف لاتے ہیں۔" اس نے بتایا: "کلکتے سے الہ آباد کے بینی گھاٹ تک جہاز پہ آیا تھا۔ وہاں سے اسٹیج کوچ اور شکرم پہ بیٹھا بارش سے بھیگتا چلا آتا ہوں۔"

"کہاں کا قصد ہے قبلہ۔؟"

"ریذیڈنسی۔"

سپاہی نے ایک لمحے کے لئے اسے غور سے دیکھا" فرنگی سرکار سے جناب کا سلسلہ ہے۔؟"

"ہاں۔" اس نے ذرا جھینپ کر جواب دیا

"ہاں میاں۔" رام دین دوسرے سپاہی نے چلم سلگاتے ہوئے کہا " خدا کسی نہ کسی وسیلے سے رازق ہوتا ہے فرنگی کی سرکار ہی سہی۔"

اس کے بعد رام دین نے پہلے سپاہی کو ایک باموقع شعر سنایا اور گوتم نیلمبر کو داد طلب نگاہوں سے دیکھا۔ گوتم نیلمبر نے بچپن میں فارسی ضرور پڑھی تھی مگر ان لوگوں کی ٹکسالی اردو اس کے پلے نہ پڑی یہ اس نے پہلی بار دیکھا کہ ملک میں ابھی ایسی جگہیں بھی ہیں جہاں نیٹو بادشاہ اب تک حکومت کرتا ہے۔ اسے یہ سوچ کر ایک لمحے کے لیے عجیب سی مسرت کا احساس ہوا۔ شکرم آگے بڑھی۔

یہ شہر کے مضافات تھے۔ سڑک کے کنارے چند اہیر بھوبھل میں بھوری کہار جامن کے نیچے بیٹھے ستو گھولتے تھے۔ چھکڑوں پر منوں آم لدے چلے جاتے تھے ایک پیپل کے نیچے لکڑ سلگ رہا تھا۔ ایک بوڑھا جوگی دھونی رمائے بیٹھا تھا۔ پیچھے بھوانی کا مٹھ تھا۔ نیلمبر نے غیر شعوری طور پر مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ اپنی کالی ماں کو پردیس میں دیکھ کر اسے بڑی تقویت ہوئی۔

ریذیڈنسی نواب آصف الدولہ مرحوم کی ایک اطالوی طرز کی کوٹھی تھی جسے فرنگیوں نے خرید لیا تھا۔ وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ صاحب نواب کمال رضا بہادر کے یہاں دعوت میں گئے ہوئے ہیں۔ اس کی آمد کی اطلاع اودھ سرکار کے سررشتۂ اخبار کو بھجوا دی گئی۔ دوسرا ہرکارہ گولہ گنج میں نواب کمال رضا بہادر کے مکان پر پہنچا۔

نواب ابوالمنصور کمال الدین علی رضا بہادر نصرت جنگ (جو دراصل چوبیس سالہ نواب کمن کا وہ نام تھا جو محض شاہی اور ریذیڈنسی کی تقریبات پر لیا جاتا تھا) کھانے کے بعد ریذیڈنٹ کے ساتھ بیٹھے چوسر کھیلتے تھے۔ یہ شہر کے ایک بہت بڑے گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ مرشد آباد اور لکھنؤ کے شاہی خاندانوں سے ان کی قرابت داری تھی۔ کافی بڑا تعلقہ کلیان پور اور سندیلے میں تھا۔ خوش شکل تھے اور خوش آواز۔ مرثیہ خوانی پوری راگ داری سے کرتے تھے اور میر انیس کے ساتھ ساتھ مجلسیں پڑھتے تھے۔ شہر کی طوائفیں ان پر عاشق تھیں۔ شاعر تھے اور دیوان مرتب کرنے میں مصروف تھے۔ شادی سولہ سال کی عمر میں کر دی گئی تھی۔ اب تک ان گنت خانہ زاد لونڈیوں سے متمتع کر چکے تھے۔ ان دنوں چمپا جان پر لٹو ہو رہے تھے۔ مگر اب معلوم یہ ہوتا تھا کہ کلکتے والے سرل صاحب کی طرح یہ ریذیڈنٹ صاحب بھی اس کے رقیب بننے پر تلے بیٹھے تھے انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں وہ چوسر کی چال بھی سوچ رہے تھے کہ چوبدار نے آکر اطلاع دی کہ ایک بنگالی بابو کلکتہ گورنمنٹ سے کاغذات لے کر آئے ہیں۔ جلو خانے میں باریابی کے منتظر ہیں۔

رنگ میں بھنگ پڑ گیا۔ برآمدے میں جلترنگ بج رہی تھی۔ ابھی چمپا آنے والی تھی۔ ریذیڈنٹ

کو بڑا غصہ آیا۔ جب سے لارڈ ہیسٹنگز کلکتے میں گورنر جنرل ہو کر آیا تھا اس نے اپنے انتظامات اور مستعدی سے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اچھی خاصی ڈاک بٹھا دی تھی۔ ہر دوسرے تیسرے کوئی نہ کوئی پیغامبر کلکتے سے یہاں پہنچتا رہتا تھا۔ دل چمپا کے ناچ میں پڑا تھا مگر برطانوی حکومت کی وفاداری اور فرض کے عظیم تصورات نے چمپا کے خوش آئند ہیولے کو دھندلا دیا۔ ریذیڈنٹ صاحب فوراً اپنی گارد لوٹ گئے۔

"یہاں چمپا بائی کہاں رہتی ہیں۔" دوسرے روز گوتم نیلمبر نے ریذیڈنسی کے ایک منشی سے دریافت کیا۔ ہری شنکر زیرِ لب مسکرایا۔ یہ بنگالی بابو بھی اہلِ دل معلوم پڑتے ہیں۔ بھئی واہ ہم جانتے تھے یہ بیٹھے لکھا پڑھی ہی کرتے رہیں گے۔

"کیا آپ بی چمپا صاحب کے یہاں تشریف لے جائے گا۔؟"

"ہاں۔" اس نے گھبرا کر جواب دیا اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ہری شنکر اس کی گھبراہٹ پر بہت متعجب ہوا کیونکہ ہری شنکر کے اس معاشرے میں طوائف کا درجہ بہت اہم تھا اور بے انتہا باعزت جس کے بغیر مہذب سوسائٹی مکمل نہیں تھی۔ منشی ہری شنکر نے ہرکارے کے ذریعے چمپا کو اطلاع بھجوائی کہ کرنل صاحب کے منشی ملنا چاہتے ہیں۔ چمپا نے کہلوایا زہے نصیب ضرور آویں۔

شام پڑے جب موتیا اور خس کی خوشبو ہوائیں امنڈی اور زمین پر کیوڑے اور گلاب کا چھڑکاؤ کیا گیا چوک روشنیوں سے بقعۂ نور بن گیا تب گوتم نیلمبر دت کا ہوادار چمپا جان کے سبز رنگ کے سہ منزلہ مکان کے سامنے جا کر رکا۔ جس کے رنگ برنگے شیشوں والے دروازے تھے اور پھاٹک پر وردی پوش چوبدار کھڑے تھے۔ گوتم جھجکتا ہوا ہوادار پر سے اترا اور دوشالہ کندھوں سے لپیٹتا زینے پر چڑھا۔

کمرے پر بڑا جماؤ تھا۔ فرش پر سفید چاندنی کھنچی تھی۔ سفید چھت گیری میں جھاڑ آویزاں تھے۔ طاقچوں میں کنول اور گلاس روشن تھے۔ صحنچی جو چوک کے رخ کھلتی تھی۔ اس پر گلاب کی بیل چڑھی تھی۔ دروازوں کے برابر پھولوں کے بڑے بڑے چینی کے گملے رکھے تھے جن سے سارا کمرہ معطر تھا۔ صحنچی میں کسی نے مال گنج بھیڑ رکھا تھا۔ چاروں

طرف قدِ آدم آئینے لگے تھے۔ ان آئینوں میں گوتم نیلمبر کو عجیب عجیب شکلیں نظر آئیں۔ ایسے لوگ جن کو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ کون لوگ تھے۔ کہاں سے آئے تھے کدھر کو جائیں گے۔ یہاں اس معطّر کمرے میں کب تک اُن کا جماؤ رہے گا۔ یہ لوگ جو شربتی کے بچتے ہوئے انگرکھے اور گلبدن اور مشروع کے کلیوں دار پائجامے اور دو پلی اور نکّے دار ٹوپیاں اور مندیلیں پہنے شال رومال اوڑھے اطمینان سے گاؤ تکیوں کے سہارے بیٹھے تھے۔ اُن کی اُنگلیوں میں فیروزے اور عقیق کی انگوٹھیاں تھیں۔ ان میں جوان اور ادھیڑ اور بوڑھے سبھی شامل تھے۔ متین۔ ثقہ۔ سنجیدہ۔ مہذّب۔ نہایت خاموشی اور اہتمام سے یہ لوگ بیٹھے بڑے تکلّف اور اخلاق سے آہستہ آہستہ رُک رُک کر ایک دوسرے سے گفتگو کرتے تھے۔ ایک کونے میں راجہ شیو کمار وفا کے کسی شعر پر بحث ہو رہی تھی۔ دوسری طرف چند حضرات موسیقی کے کسی نکتے پر تبادلہ خیالات کر رہے تھے۔ اصول النغمات الآصفیہ کے کسی باب کا حوالہ دیتے جاتے تھے۔ نیلمبر دت لمحے بھر کے لئے شرمایا سا دروازے کے پاس کھڑا اس منظر کو دیکھتا رہا۔ اُس نے اپنا بہترین چوغہ پہن رکھا تھا اور اس کے سر پر مندیل تھی۔ مگر اس کی شکل و صورت ہی پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ پردیسی ہے۔ حاضرینِ محفل نے اسے دیکھ کر تہذیب کی وجہ سے کسی اچنبھے کا اظہار نہ کیا۔ نواب کمّن نے جو صدر نشین تھے اسے اپنے قریب بلا کر مسند کے قریب جگہ دی اور اس سے خیریت مزاج دریافت کرتے رہے۔

"ہمارا بھی کلکتے جانے کو بہت جی چاہتا ہے مگر معاذ اللہ بہت جوکھم کا سفر ہے۔" انھوں نے کہا۔ وہ گنگا جمنی گڑگڑی پیتے جاتے تھے اور اُن کے خوبصورت چہرے پر فانوس کی روشنی آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ "بنگال کے زمینداروں کا کیا کہنا۔ بڑے بڑے رفیع الشّان رؤسا اس ملک میں ہیں۔ جناب کا تعلقہ بنگالے میں کس طرف ہے۔؟" نواب کمّن کے ایک مصاحب نے پان کی تھالی پیش کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"میرا تعلقہ کہیں نہیں ہے۔ ملازمت کرتا ہوں۔"

"ملازمت ہے۔"

اب نیلمبر کو پھر ذہنی جھنجلاہٹ محسوس ہوئی جس کا اسے ناک کے پرسامنا کرنا پڑا تھا
"میں کمپنی کی سرکار میں ملازم ہوں ۔"
"خوب "۔ نواب کمال رضا نے پہلو بدلا ۔" تب تو جناب انگریزی بھی پڑھے
ہوں گے ۔" کسی اور نے دریافت کیا
"جی ہاں ۔ تھوڑی سی شُد بد ہے ۔"
"اچھا بھلا کتنی ۔ خط پڑھ لیتے ہیں ۔۔۔ ؟"
نیلمبر دت مسکرایا ۔" جی ہاں ۔" اب ذرا اُس نے آرام کا سانس لیا ۔ یہ بڑے
نیک ، طینت اور بھولے لوگ تھے ۔ ان سے خائف ہونے کی کیا ضرورت تھی ۔ گو یہ عجیب
بات تھی کہ یہ بھی اسی دنیا میں رہتے تھے جس میں وہ زندہ تھا ۔
نواب کلن اس سے نواب سعادت علی خاں کا تذکرہ کرتے رہے جن کے انتقال
کو چند سال ہی گزرے تھے اور جنھوں نے لکھنؤ میں کلکتے کے طرز کی عمارتیں بنوا کر شہر کو
یورپین رنگ دے دیا تھا ۔ گوتم نیلمبر ان کو کلکتے کی باتیں بتلاتا رہا ۔
اتنی دیر میں ساز ملائے گئے ۔ ایک سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی نک سک سے درست ۔
چمپئی رنگت ۔ سیاہ بھنورا بال اور سیاہ آنکھیں ۔ ناک میں ہیرے کی لونگ پہنے ۔ اودے
گرنٹ کے فرشی پائجامے میں ملبوس گو ندنی کی طرح زیوروں سے لدی بڑے ٹھسے سے
چلتی ہوئی آکر وسط میں بیٹھ گئی اور بڑے دلفریب انداز میں اس نے جھک کر نیلمبر دت کو
تسلیم کی ۔ پھر اس نے شہانا میں آصف الدولہ کی غزل شروع کی :

بتوں کی گلی میں شب و روز آصف
تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں
تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں
تماشا خدائی . . . . . .

سامعین مسحور ہو کر اس کی آواز سنتے رہے ۔ گوتم نیلمبر اس کی شکل دیکھنے میں محو تھا

کلکتے کا انگریزی داں برہمن کلرک کلکٹوش کے جادو میں گرفتار ہو گیا۔ دن گزرتے گئے۔ بارشوں کی وجہ سے کلکتے تک کے راستے بند تھے۔ جنم اشٹمی کا تہوار آیا۔ بھادوں کا مہینہ آیا اماوس کی راتیں جب چمپا اپنی صحنچی میں بیٹھ کر گوڑ ملہار گاتی۔ جب کنجوں میں کرشن کنہیا کے لئے جھولے ڈالے گئے۔ برج کے رہس دھاریوں نے کرشن لیلا کے سوانگ تیار کئے۔ چمپا رادھا بنی۔ کبھی چمپا کو گوتم نے ہز مجسٹی شاہ زمن غازی الدین حیدر کے دربار میں دیکھا جہاں وہ آعاذ کے شبدے دکھاتی تھی۔ اس نے چمپا کو جمعرات کے روز درگاہ حضرت عباس جاتے دیکھا۔ میلوں اور باغوں میں دیکھا۔ گومتی پر بجرے میں تیرتے دیکھا۔ ہر طرف چمپا تھی۔

وہ کنٹیلا کا جو پیغام اس کے پاس لے کر آیا تھا۔ کب کا بھول چکا تھا۔

اس رات جب وہ چمپا کے یہاں سے لوٹا آدھی رات کا گجر بج چکا تھا۔ نیچے سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ گانا ختم کرنے کے بعد چمپا نے حاضرین سے اجازت چاہی تھی اور کورنش بجالانے کے بعد اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔ چلتے چلتے رک کر اس نے نیلمبر سے کہا تھا۔ آپ ہی بنگلے سے آئے ہیں نا۔ پھر بھی آتے رہئے گا۔ ہم غریبوں کو بھول نہ جایئے گا۔ اس کے بعد محفل برخاست ہوئی تھی۔ اب گلیوں میں سائے پھر رہے تھے۔ سارا شہر سوتا تھا۔ صرف چوک کے بالاخانوں کی روشنیاں جل رہی تھیں مگر اب وہ بھی ایک ایک کر کے بجھتی جا رہی تھیں۔ نواب گمن اور دوسرے معززین اپنے اپنے ہواداروں تامجانوں پالکیوں اور بوچوں پر سوار ہو کر اپنی اپنی محلسراؤں کی طرف جا چکے تھے۔ سوتا ہوا شہر۔

اس سمے گوتم نیلمبر حسب معمول جاگتا تھا۔ وہ تو اکثر اپنی راتیں جاگ کر گذارتا تھا۔ راج شاہی میں جہاں اس کا جھونپڑا دھان کے کھیتوں میں تھا۔ وہ اپنی کوٹھری میں دیا جلا کر رات رات بھر بنگالی پڑھا کرتا تھا۔ بنارس میں رات گئے تک وہ لیمپ کی روشنی میں سنسکرت کا مطالعہ کرتا تو عجیب باتیں اس کے دماغ میں آتیں۔ مابعد الطبیعات۔ یہ جانے کس زمانے کی باتیں تھیں اور کس قدر غیر ضروری مگر کالی داس اور بھرتری ہری اور راج شیکھر پڑھ کر وہ سرو

میں کھو جاتا۔ کیا کبھی ایسا زمانہ بھی تھا جب ہم نیٹو لوگ ایسے قابل ہوتے تھے۔ اسے یقین نہ آتا۔

کلکتے میں وہ رات رات بھر پڑھتا اور پھر کتابوں پر سر رکھ کر سو جاتا۔ آج پہلی مرتبہ رات کو ورڈز ورتھ اور شیلے اور کالی داس کے متعلق سوچنے کے بجائے اس کے دماغ پر چمپا کے تصوّر نے اپنا تسلّط جما لیا۔ اُسے بڑا غصہ آیا۔ کوفت بھی ہوئی۔ عورتوں کے مسئلے پر اُس نے بہت کم سوچا تھا۔ راج شاہی میں جب سترہ سال کی عمر میں اس کے ماں باپ اُس کی شادی کر دینا چاہتے تھے۔ وہ بنارس پہنچ گیا تھا۔ بنارس اور کلکتے کی طالب علمانہ زندگی میں ہزاروں مصروفیتیں تھیں۔ عاشقی کے لئے ابھی بہت وقت پڑا تھا۔ ابھی تو اسے بی۔ اے کرنا تھا۔ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرنا اس کا مقصدِ حیات تھا۔ پھر ممکن ہے وہ انگلستان بھی جا سکے۔

لکھنؤ کی اس ویشیا سے اس سے مطلب ۔۔ ؟ وہ سر جھکائے سڑک پر آگے بڑھتا گیا۔ حتّٰی کہ اُس کے کہاروں نے اسے آواز دی فینس ادھر ہے خداوند — وہ مڑا اور فینس پر سوار ہو کر اپنے جائے قیام کی طرف چل دیا۔ دوسرے روز سے بھادوں کے جھالے شروع ہو گئے۔ دن بھر وہ ریذیڈنسی کے دفتر میں بیٹھا رہتا۔ کبھی کاغذات لے کر آغا میر وزیرِ اعظم کے مکان پر جاتا۔ کئی بار وہ شاہی محل بھی گیا اور ہز میجسٹی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ جو انگریز بادشاہوں کا لباس پہنے (جو گوتم نیلمبر نے ولیم چہارم کی تصویروں میں دیکھا تھا) مرصع کرسی پر بیٹھے تھے اور ریذیڈنٹ جھک کر بڑے ادب سے ان کے کان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ دن اسی طرح مصروفیات اور چہل پہل میں گذر جاتا۔ رات قیامت بن کر آتی۔

رات — جو چمپا کی راجدھانی تھی۔ اس رات میں گوتم نیلمبر دت کا کوئی دخل نہ تھا اس کی زندگی اور دُنیا میں ویشیا کا خیال ہی کراہت انگیز تھا۔ پھر وہ سوچتا۔ عورت جو دیبی ہے۔ لکشمی۔ گوری۔ ادما۔ جو ماں ہے اور بہن اور بی بی اور بیٹی۔ اسے طوائف نہیں ہونا چاہئے۔ یہ بڑی زیادتی ہے۔ پھر اسے خیال آیا۔ کہا جاتا ہے۔ عورت تو محض دُکھ

سہنے کے لئے ہی بنائی گئی ہے۔ اس میں عورت کی عظمت ہے جس کی ساری عمر مرد کی ٹہل کرنے میں بیت جاتی ہے اور پھر بھی مرد اس سے خوش نہیں ہوتے۔ پتی ورتا عورتیں، بال ودھوائیں۔ یتیم لڑکیاں جن کو ورثہ نہیں ملتا۔ عورت جو گائے کی طرح بے زبان ہے جو ستی ہو کر جل مرتی ہے کہ اسی میں اس کی شان ہے مگر اس چمپا کو دیکھو جو خود جل کر مرنے کے بجائے دوسروں کو جلا جلا کر مارتی ہے۔

نا استری سوتنترم۔ منو مہاراج نے لکھا ہے۔ عورت آزاد نہیں ہے۔ بالکل صحیح تھا۔ رامائن کی چھپی کتاب میں تو یہاں تک لکھا تھا کہ خطرے کے وقت۔ شادی کے موقع پر اور عبادت کے لئے عورت باہر آ جائے تو قابلِ اعتراض نہیں اور یہ بھی لکھا تھا کہ عورت کے وید پڑھنے سے بڑا انتشار پھیل سکتا ہے۔

سُنتے ہیں کہ کسی زمانے میں دیس کی عورتیں باکمال ہوتی تھیں۔ پڑھنا لکھنا جانتی تھیں۔ بے پردہ گھومتی تھیں اور جانے کیا کیا اپنے گاؤں کی مسلمان عورتوں سے اس نے بھانومتی اور کنچن مالا اور کسم مالتی مالا اور رانی مینا متی کی جو روپ کتھائیں بچپن میں سُنی تھیں ان سب میں بھی پرانے وقتوں کی عورتوں کی بڑائی کے قصے تھے۔ لیکن یہ سب گپ تھی۔ بھلا ہماری عورتیں جو اس قدر جاہل اور پس ماندہ ہیں کبھی بھی بہتر حالت میں رہی ہوں گی۔ یہ عقل میں نہیں آتا۔ نا استری سوتنترم۔

شہنشاہی اور جاگیردارانہ سماج میں عورت کو آزادی محض اسی وقت میسر ہوتی ہے جب وہ بازار میں آ کر بیٹھ جائے۔ تب اس کو سماجی عزت بھی ملتی ہے۔ دولت بھی۔ پھر اس کے لئے شعر و شاعری کرنا بھی جائز ہے لکھنا پڑھنا بھی۔ ورنہ علیحدہ سے اُس کی کوئی حیثیت نہیں۔ چمپا بائی اسی نظام کی پروردہ تھی۔ اور گوتم اس حیثیت کو سمجھنے سے قاصر تھا کیونکہ وہ خود اس نئے متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا جس نے ابھی ابھی جنم لیا تھا۔ اور جاگیردارانہ ڈھانچے سے ہٹ کر اپنی اقدار الگ بنا رہا تھا اور متوسط طبقہ بڑی شدت سے اخلاق پرست ہوتا ہے۔

منشی ہری شنکر کے ساتھ وہ ایک روز کشتی میں ندی پار کر کے مینڈھوں کی لڑائی دیکھنے

رہتا جا رہا تھا کہ معاً اس کی نظر سامنے پڑی ایک سنہرا بجرا آہستہ آہستہ تیرتا ہوا جا رہا تھا۔

"دُہائی ہے کمپنی بہادر کی!" — اس کی کانوں میں ایک نقرئی آواز آئی۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا یہ چمپا کی آواز تھی جو دوسرے بجرے میں بیٹھی تھی۔ نیلمبر کو گھبرا کر اپنی طرف دیکھتے ہوئے وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اگر وہ اہل لکھنؤ کی صحبت میں ذرا زیادہ رہ لیا ہوتا تو جواباً کہتا کہ حضور یہ فقرے ہم پر تیز کرتی ہیں۔ مگر وہ بالکل ہڑبڑا گیا۔ سامنے سے آغا میر کا بجرا آ رہا تھا۔ چند اور مرصع اور منقش کشتیوں میں امراء و وزراء، صاحبانِ عالیشان اور شہر کی نامی طوائفیں رہتا کی اور جا رہی تھیں دریا پر مچھلی اور گھوڑے کی شکلوں کے بجروں کا میلہ سا لگا تھا۔ اتنے میں چمپا کی کشتی قریب آگئی۔

"ہماری کشتی میں آجائیے۔" اس نے کہا

"تاکہ آپ ان کو بھی لے ڈوبئیے۔" ہری شنکر نے جواب دیا۔ اس کے بعد دونوں میں ضلع جگت شروع ہو گیا۔ ہنستے بولتے یہ سب گھاٹ پہ پہنچے۔ بارہ دری کی طرف جاتے ہوئے ہمت کر کے گوتم نیلمبر نے طے کر ڈالا کہ جو فرض اسے شیلا دیبی نے سونپا تھا اسے ادا کر کے کم از کم اپنے ضمیر کو ہلکا کرے۔ جس وقت چمپا پائینچے اٹھا کر سیڑھیاں چڑھ رہی تھی گوتم نیلمبر نے اس سے پوچھا: "تم سِرِل صاحب کو جانتی ہو۔"

وہ چُپ رہی۔

"چمپا بائی جی میں نے تم سے جو سوال کیا ہے اس کا جواب دو۔"

"اچھا جانتے ہیں۔ پھر تم سے کیا۔"

"ان کی بی بی ہے۔ لکھنے میں [1]" اسے توقع تھی کہ یہ سُن کر چمپا کا رنگ فق ہو جائے گا۔ عرقِ ندامت اس کی پیشانی پر چمکنے لگے گا۔ مگر وہ اطمینان سے بولی: "اچھا تو پھر۔ جتنے لوگ ہم سے ملتے ہیں سب کی بیبیاں ہوتی ہیں۔"

---

[1] انگریزہ

"ان کی ایک لڑکی بھی ہے۔" نیلمبر نے اور زیادہ اہمیت کے ساتھ کہا۔

"سب کی لڑکیاں بھی ہوتی ہیں۔ تم اپنا مقصد بیان کرو۔"

"تم سرل صاحب سے قطع تعلق کر لو۔ یعنی اب کے سمے جب سرل صاحب یہاں آئیں تو اُن سے نہ ملنا۔ وہ ریذیڈنٹ بن کر یہاں آنے والے ہیں اگلے مہینے۔"

چمپا ٹھٹھک گئی اور ایک لمحہ کے لئے اسے بڑی دلچسپی سے دیکھتی رہی۔ "آپ عجب ہونق انسان ہیں۔ حضرت یہ کہئے کہ اب آپ کی ہم پر طبیعت آئی ہے!"

نیلمبر کو چکر سا آگیا۔ حد ہو گئی بیہودگی کی۔ اس کا جی چاہا وہیں سے اُلٹے پاؤں واپس چلا جائے۔ مگر اب لڑائی شروع ہونے والی تھی۔ خلقت جمع ہو چکی تھی۔ بادشاہ سلامت اور اہلِ دربار اپنی کرسیوں پر فروکش ہو رہے تھے۔ بینڈ بجنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ جا کر ایک طرف کو چپکا کھڑا ہو گیا۔

واپسی میں اسے نواب کمن اور ریذیڈنٹ کے ساتھ ساتھ گھاٹ تک آنا پڑا۔ بجرے میں چمپا کا ساتھ ہو گیا۔ اس کشتی میں اور کوئی نہ تھا۔ وہ اسے بڑی محبّت کی نظروں سے دیکھتی رہی۔ "سنو جی۔" اُس نے دفعتاً کہا۔ "ہم سرل صاحب کو ہزار دفعہ چھوڑ دیں گے۔ مگر تم ہم کو چھوڑ کر مت جاؤ —— تم ہمیں بہت زیادہ بھا گئے ہو۔"

وہ خاموش رہا۔

چمپا کی رنگت سُرخ ہو گئی۔ "تم نے سُنا۔ ہم — چمپا جس پر ایک عالم جان دیتا ہے خود بے حیا بن کر تم سے یہ کہہ رہے ہیں — مغرور آدمی۔"

وہ اسی طرح خاموش رہا۔ ڈوبتے سُورج کی کرنیں اس کی آنکھوں میں تیزی سے جھلملانے لگیں۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ بجرا اب چھتر منزل کے پاس پہنچ چکا تھا۔

"ہم نے آج تک کسی سے یہ نہیں کہا۔ بدبخت مغرور آدمی۔ اپنے آپ پر زیادہ ناز نہ ہونا۔ یہ وقت بہت جلد گزر جائے گا۔" اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کشتی گھاٹ تک پہنچ گئی۔

گوتم نیلمبر نے آنکھیں کھول لیں۔ وہ اسے تیوری پر بل ڈالے غور سے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ ہنس پڑی۔ "ہونق آدمی" ۔ اُس نے پیار سے کہا۔ "بات کرنے کی تو تم کو تمیز نہیں اور تم پریم عاشق ہوئے ہیں۔ یہ قدرت کا تماشہ دیکھو!" نیلمبر چپ چاپ بجرے پر سے اُترا۔ چمپا نے اپنی سکھیاں کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "ہمارے یہاں آؤ گے نا۔ دوبارہ ملو گے؟ از برائے خدا ضرور آنا۔ میاں نیلمبر صاحب۔ تم کو کیا کہہ کر پکاروں پنڈت جی مہاراج۔ ورنہ پانڈے جی پچھتائیں گے۔ دال چنے کی کھائیں گے"۔ اس نے اپنے آنسو ہنسی میں چھپانے چاہے۔ نیلمبر دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی اور ہری شنکر کی پالکی اور کہاروں کو ڈھونڈنے میں مصروف تھا۔

"ہم سے ملو گے نا — ؟"

"نہیں —" نیلمبر نے مختصر سا جواب دیا اور جلدی سے جا کر اپنی پالکی میں بیٹھ گیا۔

اس کے بعد وہ تین دن تک نہیں سو سکا۔ اس دوران میں اس کے پاس چمپا کے اَن گنت پیغام آئے۔ اس قدر اچانک اس عورت نے یہ کیسا ناٹک کھیلا تھا مگر عورت کے چرتر آج تک کون سمجھ پایا ہے۔ یہ لڑکی بڑے بڑے دھنوان اور سورماجس کے ناز اُٹھاتے تھے۔ اُسے میری کون سی ادا بھاگئی — منشی ہری شنکر نے فائلوں پر سے سر اُٹھا کر اُس سے کہا۔ "بھائی نیلمبر۔ ہمارے کاشی کے کبیر داس کہہ گئے ہیں ؎

چھوٹی موٹی کامنی سب ہیں بس کی بیل
بیری مارے داؤں سے یہ ماریں ہنس کھیل

مگر تم اس کے یہاں چلے کیوں نہیں جاتے۔ اس میں کیا حرج ہے؟"

نیلمبر اودھ کے اس لالہ بھائی کو نہ سمجھا پایا کہ چمپا کے یہاں جانے میں کیا حرج ہے۔

"بھگوان نے ناری ہمارا جی بہلانے کے لئے تو بنائی ہے۔" ہری شنکر نے پھر کہا نیلمبر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "ناری تو بڑی مقدس چیز ہے۔ اسے تم دل کا بہلاوا سمجھتے ہو۔" اُس نے کہا۔

"ارے میاں۔" ہری شنکر نے حقے کا کش لگا کر ہنس کے جواب دیا۔ "ہم نے اس کوچے میں بڑے بڑے جٹا دھاری برہمن چکر لگاتے دیکھے ہیں۔ تم کس کھیت کی مولی ہو۔"

نیلمبر اُٹھ کر باہر آ گیا اور ریذیڈنسی کے باغ میں بلا مقصد ٹہلنے لگا۔ مالی مولسری کی چھاؤں میں چلم پیتے تھے اور شاگرد پیشے میں کہاروں کی محفل میں کٹورا چل رہا تھا۔ گارڈ ہاؤس کے برآمدے میں منڈیاؤن چھاؤنی سے آئے ہوئے دو گورے شراب کے نشے میں دھت ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ اتنے میں اسے ٹیلے کی ڈھلوان پر زرد رنگ کا دوپٹہ اوڑھے جمنا مہری اوپر چڑھتی نظر آئی۔ جمنا مہری جو چمپا کی پیغامبر تھی وہ خاموشی سے پھر اندر چلا گیا۔

کوار کا مہینہ لگ چکا تھا اور الٰہ آباد میں جہاز کلکتے جانے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ کاغذات کا پلندہ سنبھال کر وہ واپس لوٹنے کے لئے تیار ہوا۔

جب وہ ناکے کی طرف جا رہا تھا۔ یکایک اس نے گاڑی بان سے پوچھا۔ "یہ سڑک کس طرف جاتی ہے۔"

"نخاس — خداوند — "

"ادھر گاڑی موڑ لو۔"

"بہت خوب — خداوند۔"

شکرم چمپا کے مکان کے سامنے جا کر ٹھہر گئی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتا اوپر گیا۔ چمپا صحنچی میں بیٹھی تھی۔ نیلمبر کی آواز سن کر اس کا رنگ سفید پڑ گیا۔

"تم آ گئے — "

"نہیں۔ میں جا رہا ہوں۔"

"دو گھڑی رک جاؤ۔ دودھ کھاؤ گے۔ شربت منگوا دوں۔" اس کا تامل دیکھ کر اس نے کہا۔ "برہمن کی دوکان سے جل پان منگوا دوں۔"

"مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"

"مجھے معلوم ہے تمھیں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"

"نہیں۔ میں صرف تم کو خدا حافظ کہنے آیا تھا۔"

"خدا حافظ۔"

وہ دروازہ میں ٹھٹھکا رہا۔

"ہمارے شہر کا دستور ہے۔ دعا دیتے وقت کہتے ہیں۔ سوا غمِ حسینؓ کے خدا کوئی غم نہ دے۔ یہ دعا میں تم کو نہیں دے سکتی۔ تم حسینؓ کا غم بھی نہیں جانتے تم تو جانتے ہی نہیں غم کہتے کسے ہیں۔"

"سنو۔ چمپا۔" نیلمبر نے رسان سے کہا۔ "تمہاری زندگی اتنی رنگین ہے۔ بہت جلد تم مجھے بھول جاؤ گی۔ کس چکر میں پڑ گئیں۔ میرا اور تمہارا کیا ساتھ ہے۔"

وہ خاموشی سے روتی رہی۔

"ہاں۔ میرا اور تمہارا کیا ساتھ ہے بھلا۔ تم نے آج تک مجھے اپنا ہاتھ بھی نہیں چھونے دیا۔ ہمارے یہاں کے ہندو تو اتنی چھوت چھات نہیں کرتے۔"

"سنو۔" اس نے چمپا کو پھر سمجھانے کی سعی کی۔ "تم کو میں اس لئے پسند ہوں کہ ان سب لوگوں سے مختلف ہوں جو تمہارے ماحول سے تعلق رکھتے ہیں۔ انوکھی چیز ہر ایک کو بھاتی ہے۔"

"کیا تمہارے دیس میں لڑکیاں نہیں ہوتیں۔" اس نے سادگی سے سوال کیا۔

نیلمبر کو ہنسی آ گئی۔ "ہوتی کیوں نہیں مگر تمہاری جیسی نہیں۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔"

"اللہ۔ کس قدر طنطنہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے راجہ بھاؤ لال کے جانشین آپ ہی ہیں۔" چمپا نے ہنسنے کی کوشش کی۔

اندھیرا تیزی سے برسنے لگا۔ شہر میں چاروں طرف پنچبتا نے چڑھائے گئے۔ فانوس جگمگائے۔ قندیلیں جلیں۔ نیچے سڑک پر سے ایک بارات گزر رہی تھی۔ تختِ رواں پر ناچ ہوتا جا رہا تھا۔ ماہی مراتب کی قطاریں لڑکے بالے اور شہدے اچھلتے کودتے چل رہے تھے۔ دوسرے تختِ رواں پہ سوانگ اور کرتب ہو رہے تھے۔ روشن چوکی بج رہی تھی۔ مشعلوں کی روشنی بالاخانے کی کھڑکیوں پر آ کر پڑی۔ اس روشنی میں چمپا کا کامدانی

کا دوپٹہ جھک جھک کرنے لگا۔ نیچے ڈومنیاں سوہا گاتی جا رہی تھیں۔ چمپا کھڑکی میں آکر بارات دیکھنے لگی۔ "جانے کس سہاگن کی بارات ہے۔" اس نے کہا۔ نیلمبر نے پلٹ کر اُسے دیکھا وہ کہہ رہی تھی۔ "اس کی مانگ میں سیندور ہوگا۔ پیروں میں مہندی۔ ناک میں سہاگ کی نتھ۔" اس نے آہستہ سے اپنی مانگ کو چھوا۔ جس میں افشاں چُنی تھی لیکن جو سیندور سے عاری تھی۔ اب یہ پھر ناٹک کھیل رہی ہے۔ گوتم نیلمبر نے پریشان ہو کر سوچا۔

"آدمی اس قدر کا کٹھور ہوتا ہے۔" چمپا نے کہا

"ہمیشہ سے عورت اور مرد ایک دوسرے پر یہ الزام رکھتے آئے ہیں یہ تکرار بھی فضول ہے۔"

"تم ابھی جا رہے ہو —"

"ہاں۔"

"صبح ہوتے ہوتے لکھنؤ سے بہت دُور نکل چکے ہو گے۔"

"ہاں۔"

"یہ دوہا سُنا ہے ؎

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے

بدھنا ایسی رین کرو کی بھور کبھی نہ ہوئے —؟"

نیلمبر کھڑکی میں سے نیچے دیکھنے لگا۔ شہر کا شہر کسی میلے کے لئے ایک سمت کو رواں تھا۔ گلیوں میں سنڈے مونچھوں پر تاؤ دیتے اکڑتے پھر رہے تھے۔ قلماقنیاں۔ حبشنیں۔ ہر طونگیاں۔ چوڑی والیاں۔ قصباتی پاتریں چھن چھن کرتی ٹولیاں بنائے باغ کی طرف جا رہی تھیں۔ بانکے اپنی تلواریں چمکا رہے تھے۔ مدکتے، اچکّے۔ بھنگڑے چنڈو خانوں میں جمع تھے۔ چو طرفہ غل مچا تھا۔ دُنیا کس قدر رنگا رنگ جگہ تھی۔ اسی دُنیا کو بھرتری ہری نے رنگ بھوم کہا تھا۔

اس رنگ بھوم پر ایک بے معنی ناٹک یہ بھی کھیلا جا رہا تھا۔ اندھیرا اچھلنے لگا۔ اس کی شکرم نیچے منتظر کھڑی تھی۔

بھاگو میاں - بھاگو یہاں سے جلدی - کلکتے کا راستہ کھوٹا ہوتا ہے - کلکتے چلو تمہارا ٹھکانہ وہیں ہے - میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے قدم لڑکھڑا رہے ہیں -

پھر وہ جلدی سے اپنا کاغذات کا بقچہ سنبھال کر تیزی سے زینے سے اُترا - اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہ دیکھا اور سیدھا شکرم میں پہنچ کر دم لیا -

گاڑی کے پہیوں نے سڑک کے پختہ فرش پر شور مچانا شروع کیا - بارات کا ہنگامہ ابھی باقی تھا -

بھیڑ میں سے نکلتی شکرم آغا میر کی ڈیوڑھی تک پہنچ گئی - نوعمر کوچبان "ہٹئے گا مہرباں، ذرا بچ کے قبلہ" کی ہانک لگاتا شہر کے باہر نکل آیا - اب وہ حضرت گنج کی مانوس سڑک پر سے گذر رہے تھے جس کے دونوں طرف اُونچی گوتھک وضع کی انگریزی عمارتوں میں کنول جلتے تھے - سڑک پر سواری کی گاڑیاں اور گھوڑے اور ہاتھی اور پالکیاں گزر رہی تھیں -

یہ راستہ نسبتاً سنسان تھا وہ ناکہ پر پہنچ گئے جامن کے نیچے چند بیراگی بیٹھے تھے جنھوں نے پُر اسرار آنکھوں سے نیلمبر کو دیکھا - ان میں سے ایک وہی تھا جسے نیلمبر نے پہلے روز دیکھا تھا جب بھوانی کے مٹھ کے سامنے جو سانگ رہا تھا گاڑی سے اُتر کر وہ دو قدم آگے بڑھا اور اُس نے مُورتی کو غور سے دیکھا - ماتا کو وہ کالی کے روپ میں جانتا تھا - اب وہ شکر گزار ہوا کہ ماتا نے اسے اپنے جوگ مایا؎ کے روپ کے بھی درشن کرا دئیے - ماں - میں نے تمہاری یہ لیلا بھی دیکھ لی - اب واپس جاتا ہوں - اپنی شکتی سے اسی طرح میری حفاظت کرتی رہنا - اس نے ہاتھ جوڑ کر سر جھکاتے ہوئے آہستہ سے کہا -

ایک جوگی جس نے پہلے روز اس سے بات کی تھی اس سے گویا ہوا "بڑی جلدی واپس جاتے ہو -"

"سراب کے ساحل پر تاخیر کرنا عقلمندی نہیں - یہ تمہارا شہر سراب کا شہر ہے -"

؎ جوگ مایا - درگا کا ایک روپ Goddess of Illusion

نیلمبر نے لکھنؤ کی روشنیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ دُور مچھی بھون میں پہر کا گجر بجا۔ چوتھے

براگی نے اسے دھیان سے دیکھا" سراب کی حقیقت اتنی آسانی سے سمجھ میں نہیں آجاتی بچہ —"

"بابا" — نیلمبر نے رُک کر کہا" جوگ مایا نے اپنے دسوں ہاتھوں سے مجھے اپنی اور کھینچنا چاہا۔ لیکن دیکھو میں صحیح و سالم واپس لوٹ رہا ہوں"

"ہم میں سے کوئی صحیح و سالم نہیں ہے۔ ہم سب کمہار کے کھلونے ہیں اور ہر سمے ٹوٹتے پھوٹتے رہتے ہیں۔ اپنی مضبوطی پر نازاں نہ ہونا" پھر اس نے تھوڑی سی مٹی اٹھا کر اسے سونگھا۔

"دیکھو، اس میں کتنی خوشبو ہے۔ اس مٹی کو لے جاؤ۔ گنگ میں جوگ مایا کا مندر ہے۔ اس میں چڑھا دینا۔"

نیلمبر نے ہاتھ بڑھا کر مٹی لینے میں پس وپیش کیا۔ یہ گورکھ ناتھ کا جوگی پھر اپنے گورکھ دھندے دکھا رہا تھا۔

"لے لو — یہ لکھنؤ کی مٹی ہے۔ اسے اپنے ساتھ لے جاؤ کیونکہ اس شہر کا جادو یہ ہے کہ چھُٹ جائے تو بے طرح یاد آتا ہے۔"

جوگی بڑی شستہ زبان بول رہا تھا۔

"بابا — تم براگی کیوں بن گئے —" نیلمبر نے پوچھا

"تم — تم مجھے جانتے ہو —؟" جوگی نے ذرا گھبرا کر پوچھا۔

"نہیں — میں تو کسی کو بھی نہیں جانتا۔"

"ہاں جاننا بہت مشکل ہے اور جاننے والے کو کون جانے گا۔" جوگی نے کہا اور آنکھیں بند کر لیں

نیلمبر نے اپنشد میں یہ جملہ پڑھا تھا۔ براگی بہت پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا۔ نیلمبر کے جذبۂ تجسس میں اضافہ ہو گیا۔

"بابا — میں پوچھ سکتا ہوں تم کون ہو —؟"

"کیوں — کیا تمہارا بھی اس راہ پر چلنے کا ارادہ ہے —"

"ارے — نہیں تو —"

"کیوں جی — فرنگی کی جاسوسی کرتے ہو —؟"

نیلمبر کے دل پر یہ بات موگری کی طرح جا کر پڑی۔ جوگی کے لہجے میں انتہا حقارت تھی۔

"نہیں — میں فرنگی کی جاسوسی نہیں کرتا —" اس نے آزردہ لہجے میں کہا۔

"سچ کہتے ہو —؟" جوگی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"ہاں۔ بالکل سچ۔"

"اچھا تو سنو — میں راجہ بینی بہادر کا بیٹا ہوں۔ راجہ بینی بہادر کا نام سنا ہے؟ — وہ مرزا جلال الدین حیدر نواب شجاع الدولہ کے نائب السلطنت تھے جو جناب عالی[1] اور عالیجاہ[2] کے ساتھ جی توڑ کر تمہارے صاحبان عالی شان کی فوج سے لڑے تھے۔ گنگا کے کنارے ایک طرف میرا بہادر باپ اور بنارس کا راجہ بلونت سنگھ اور گوسائیں ہمت بہادر اور روہیلے تھے۔ دوسری طرف فرنگیوں کا لشکر تھا۔ گوسائیں ہمت بہادر کے ننگے جان ہتھیلی پر رکھ کر لڑ رہے تھے۔ ونادن سمرو کی توپ چلتی تھی مگر فرنگیوں نے میرے باپ کی فوج پر اچانک حملہ کر دیا۔ گولیوں کی باڑھ اور تلنگوں کی یورش میں ہمارے لشکر کے قدم اکھڑ گئے۔ میرا باپ گھوڑے پر سوار ایک ایک کو پکارتا پھرا۔ ارے کم بختو کدھر بھاگ رہے ہو — جناب عالی نے للکار للکار کر سراسیمگی سے کہا — تم مغل کہلاتے ہو اور میدان چھوڑ کر بھاگتے ہو — مگر ہماری فوج — درگاوتی ندی پار کر کے بھاگ کھڑی ہوئی۔ ہزاروں ندی میں ڈوب گئے — ہندوستان پر قیامت گزر گئی —" وہ ذرا کی ذرا دم لینے کے لئے رکا۔ جوش کے مارے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ پھر یہ سرخی اداسی میں تبدیل ہو گئی۔ اس نے آہستہ سے کہا "تمہاری فرنگی سرکار نے اسی وقت دیکھ لیا کہ

---

[1] نواب اودھ [2] نواب بنگال

اس قوم میں سے اتفاق جاتا رہا۔ عالیجاہ اور جناب عالی ہی میں آپس میں پھوٹ پڑ گئی۔ فرنگیوں نے دیکھا کہ یہ سب لوگ دوسرے کی چغلی کھاتے ہیں ایک دوسرے کے خلاف رقعے لکھ کر ایک طرف بادشاہ عالی گہر کو دِلّی بھیجتے ہیں دوسری طرف کلکتے سے شرائط کرنے پر آمادہ ہیں۔ یہ کیسا ذلیل ملک ہے۔ ان سب کا ایک دوسرے پر سے اعتبار اٹھ گیا ہے — میرا باپ جناب عالی کا سب سے زیادہ نمک حلال اور وفادار ملازم تھا۔ دشمنوں کے بہکانے میں آکر جناب عالی نے اس کو نمک حرام تصور فرمایا اور اس کی سزا کے درپے ہوئے۔"

"ارے!" نیلمبر کے مُنہ سے نکلا۔

"جناب عالی نے منڈیاؤں چھاؤنی میں میرے باپ کے خیمے میں قیام فرمایا اور کھانے کے بعد میرے بابا سے کہا۔ راجہ تم بھی اس وقت شکار کو چلو۔ انھوں نے عرض کی — غلام نے بدولت حضور بہت سے شکار دیکھے ہیں۔ فرمایا آج کا شکار بہت عجیب وغریب ہے۔ ایسا کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ جو دم ہے غنیمت ہے۔ وہ بابا کو اپنی خواص میں بٹھا کر اپنے لشکر کی طرف چلے۔ بابا سمجھ گئے کہ یہ میرا دامِ گرفتاری ہے مگر کیا کر سکتے تھے۔ حکم حاکم مقدم تھا۔ عالی جناب کے حکم سے بابا کی دونوں آنکھوں میں نیل کی سلائیاں پھیر دی گئیں۔ ان کا علاقہ ضبط سرکار ہوا۔ تیرہ سو گھوڑوں اٹھارہ ہاتھی اور پورے توپ خانے کے علاوہ ایک وسیع زمینداری کے میرے بابا مالک تھے۔ میں صرف اس مرگ چھالا کا مالک ہوں۔"

جوگی خاموش ہوگیا —

نیلمبر مبہوت بیٹھا قصہ سنتا رہا۔ جوگی نے آگ میں ایک لکڑ اور ڈال دیا اور اکڑوں بیٹھ کر کہنے لگا — "سراب کی حقیقت تو میں نے جانی ہے۔ تم اس کی حقیقت کو کیا جانو تم اسی چکر میں شامل ہو۔ اور رہو گے — مجھے سلطنتوں کے بننے اور بگڑنے، کمپنی کی خوشی اور ناخوشی۔ بادشاہ کے عتاب۔ کسی چیز کی پرواہ نہیں — میرے بابا کو اندھا کر دیا گیا تھا۔ مجھے اندھا کون کر سکتا ہے، سوائے میرے خود کے — جاؤ۔ اب تم کو دیر ہوتی ہے۔ کٹک میں جب جوگ مایا کے مندر میں جاؤ تو دیکھنا کہ اس کے چاروں طرف

برآمدے ہیں اور اَن گنت دروازے اور ایک دروازے کے بعد دوسرا دروازہ کھلتا ہے اس کے بعد تیسرا اس طرح کی بھول بھلیاں اور غلام گردشیں چاروں طرف بنی ہیں جن سے انسان نکل نہیں سکتا۔ تم سمجھتے ہو کہ تم اس بھول بھلیاں سے نکل آئے ہو۔ مگر تم غلطی پر ہو ـــــ جاؤ ـــــ" نیلمبر اٹھا۔ جھک کر اس نے جوگی کے قدموں کے پاس سے مٹی اٹھائی اور بھاری بھاری قدم رکھتا شکرم میں آن بیٹھا۔ گاڑی بان نے باگیں سیتا پور جانے والی سڑک کی طرف موڑ لیں۔

معاً پل کے نزدیک شکرم رکی۔ گاڑی بان نیچے اترا سامنے ایک انگریز فوجی گھوڑے سے اتر کر ایک راہگیر کو کوڑے لگا رہا تھا اور انگریزی میں گالیاں دیتا جاتا تھا۔

یہ منڈیاؤں چھاؤنی تھی۔ چاروں طرف انگریزوں کی کوٹھیاں تھیں اور فوج کا میس اور گرجا اور فوجی ہسپتال۔

گورا راہگیر کو اچھی طرح پیٹنے کے بعد گھوڑے پر سوار ہو کر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

"سالے ـــــ ہمارا ہی کھاتے ہیں۔ ہم ہی پر غرّاتے ہیں۔" گاڑی بان نے جس کا نام گنگا دین تھا۔ غصے سے کہا "شاہِ جمن کے وقت میں یہ اندھیر ـــــ" وہ بڑبڑاتا رہا۔ گوتم نیلمبر پھر اپنے خیالات میں کھو گیا۔ رات گئے وہ راجہ ٹکیت رائے کی بنوائی ہوئی ایک دھرم شالہ میں اترے۔ گنگا دین اب تک بڑبڑا رہا تھا۔ ریذیڈنسی کے سپاہی اور ہرکاروں کو دیکھ کر جو نیلمبر کے ساتھ شکرم سے اترے تھے۔ دھرم شالہ میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ بنگالی بابو ہیں۔ کلکتے جا رہے ہیں۔ انگریزی جانت ہیں۔ ان سے پوچھو ہمری مال گجاری میں کمپنی بہادر کب کمی کرے گی ـــــ سنا ہے نئے قانون لندھن میں بنے ہیں۔ یہاں بھی لاگو ہوں گے ـــــ ان کو بے چارے کو کیا معلوم۔ کیوں نہیں بنگال اور اودھ میں ایکئے قانون لاگو ہوت ہیں۔ اے بابو صاحب۔ مال گجاری میں کمی کروائیے ہمری تو کمریں ٹوٹ گئیں۔ آنگن کے پختہ فرش پر نیلمبر کے چاروں اور مجمع لگ گیا۔ یہ سب آس پاس کے دیہاتوں کے کسان تھے جو اپنے مقدمے اور فریادیں لے کر دارالسلطنت جا رہے تھے۔

ایک بوڑھا پھونس قصباتی زمیندار لاٹھی ٹیکتا نیلمبر کے قریب آن کر بیٹھ گیا۔ "کون جات ہو--؟"
اُس نے چراغ کی روشنی میں نیلمبر کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"برہمن --"

بوڑھے نے نیلمبر کے پیر چھوئے۔ "ٹھاکر میرے گاؤں چلے چلو۔ تو تمہری سیوا کروں۔
میرا مکان یہاں سے کوس بھر ہے۔"

"مجھے صبح سویرے ہی سفر پر روانہ ہونا ہے۔ بابا سیوا تو مجھے تمہاری کرنی چاہیئے
میرے لائق کوئی خدمت بتاؤ۔" نیلمبر نے کہا۔ اُس کا دل بھر آیا۔ یہ لوگ سب کے
سب کتنے معصوم کتنے بھولے تھے۔ اُسے دُکھ ہوا کہ وہ اودھ پوری چھوڑ کر جا رہا
ہے۔

"ٹھاکر۔" بوڑھے نے چاروں طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا۔ "اپنی انگریجی سرکار سے
کہو ہم پر زیادہ جلم نہ توڑے۔"

وہ خاموش ہو گیا۔

"نکھلئو سے آتے ہونا --؟"

"ہاں۔"

"ہُواں، ہمرے بادشاہ کے درشن کیئے؟"

"ہاں۔"

"ہمرے بادشاہ کو کمپنی بہادر نے روپئے کے لئے تنگ کر رکھا ہے۔"

"پتہ نہیں --"

"بولتے کیوں نہیں ٹھاکر -- تم کو معلوم ہے۔" اب بوڑھے نے زیادہ جوش سے
بولنا شروع کیا۔ "کمپنی بہادر نے وچن ہمارے بادشاہوں کو دئیے اور ایک ایک کر کے
سب کو توڑا -- تم کو معلوم ہے بکسر کی ہار کے بعد جنابِ عالی سے --"
اسے بیچئے۔ یہ پھر بکسر اور جنابِ عالی کا قصہ شروع ہو گیا۔" بوڑھے نے نیلمبر
کو لحظہ بھر کے لئے دیکھا --

"تم کو ان قصوں سے دلچسپی نہیں ہوگی۔ لیکن یہ گھاؤ ہمارے دلوں پر لگے ہیں۔ اور ابھی تک تازہ ہیں۔ ہمارا دیس کمپنی بہادر نے تاراج کر کے رکھ دیا ہے۔ تم کو معلوم ہے۔ بکسر کی ہار کے بعد جناب عالی سے انگریزوں نے لکھا پڑھی کی تھی کہ وہ بیچارے پینتیس ہزار سے زیادہ فوج نہیں رکھیں گے۔ اب منڈیاؤں میں عالم دیکھو۔ آصف الدولہ بیکنٹھ باشی نے کلکتے لکھا۔ انگریزی فوج سارے ملک کی آمدنی کھا گئی۔ گھر کے آدمیوں کو کھانے کو نہیں بچتا۔ کھیت اجڑ گئے۔ فرنگی افسر خود کو ملک کا مالک سمجھتے ہیں۔ کب تک میرے گلے پر یہ چھری رہے گی؟ ـــ مگر اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ ہم غریب سے غریب تر ہوتے چلے گئے ـــ ٹھاکر ہم بہت دکھی لوگ ہیں۔ جب مرہٹوں نے حملہ کیا۔ ہمارے سپاہی یا حسینؑ، یا حسینؑ کہہ کر روتے جاتے تھے اور لڑتے تھے۔ اس طرح ہم نے فرنگیوں سے جنگ کی۔ مگر اس کا کچھ فائدہ نہیں۔ مقابلہ کا کوئی فائدہ نہیں۔ پر اب ہمارے پاس کمپنی کے خزانے میں دینے کے لئے اور کچھ باقی نہیں رہ گیا۔" وہ خاموش ہو گیا۔ نیلمبر چپ چاپ بیٹھا چراغ کی لو دیکھتا رہا۔ دوسرے حلقے میں چند کسان بیٹھے نواب سعادت علی خاں مرحوم کی خوش انتظامی کا تذکرہ کر رہے تھے جنھوں نے اپنے دورِ حکومت میں ملک کی بگڑی بنا دی تھی۔ مگر شاہ زمن بیچارے اب کیا کر سکتے ہیں۔ ان کے بس میں کچھ نہیں' ـــ وہ کہہ رہے تھے۔

چراغ کی لو ہوا میں جھلملایا کی۔ نیلمبر دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔ چاندنی رات تھی۔ منڈیر پر بیٹھے چند نوجوانوں نے برہا گانا شروع کر دیا۔

نیلمبر نے دیکھا کہ اس ملک کا بچہ بچہ۔ بوڑھا جوان۔ ہندو مسلمان اپنے بادشاہ پر جان چھڑکتا تھا۔ جوگی جس نے اپنے باپ بینی بہادر کا قصہ اسے سنایا۔ اسے بھی یہاں کے بادشاہ یا اس حکومت سے نفرت نہیں تھی۔ وہ تو غالباً شجاع الدولہ سے بھی خفا نہ تھا۔ جس نے اس کے باپ کو اندھا کروایا۔ اس کا محض یہ خیال تھا کہ دنیا مایا جال ہے اور اس میں یہی کچھ ہوا کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ملک خدا کا تھا اور حکم بادشاہ کا۔ اور بادشاہ کی اطاعت سب کا دھرم تھا۔ یہ سب لوگ اپنے بادشاہوں پر عاشق تھے۔ ہر زبان پر

آصف الدولہ اور سعادت علی خان کے قصے تھے۔ آصف جس نے اپنی سخاوت سے کہاروں کو پالکیوں پر سوار کرا دیا اور سعادت جس نے حسن انتظام سے ملک کے خالی خزانوں کو دوبارہ پُر کر دیا اور یہ سب لوگ اودھ کے یہ سارے باشندے جن سے نیلمبر ملا، فرنگی سے شدید نفرت کرتے تھے۔

۳۲

کلکتہ واپس پہنچ کر وہ پھر اپنی جانی بوجھی مانوس دُنیا میں کھو گیا۔ دفتر۔ کتابیں۔ انگریزی اور بنگالی اخبار۔ لیکچر۔ وہ شتیلا سے ملنے دھرم تلہ گیا۔ مگر وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہُوا کہ وہ مر چکی ہے۔ برسات کے زمانے میں وہ پُوجا کے لیے کالی گھاٹ جا رہی تھی اسے سانپ نے کاٹا اور وہ مر گئی۔ سِرل صاحب مفصّل میں دورے پر گئے ہوئے تھے۔

نیلمبر نے اپنے برآمدے میں لوٹ کر سنتیل پاٹی نکالی اور لیمپ جلا کر پھر ڈکشنری پر جھک گیا۔

مگر اب اس کا دل ملازمت میں نہیں لگ رہا تھا۔ مانک تلہ میں اس کے گھر سے ذرا فاصلے پر ایک بڑا خوبصورت گارڈن ہاؤس تھا۔ اس کے باغ میں بہت سے لیچی کے درخت تھے اور یہاں بہت سے نوجوانوں کا مجمع لگتا تھا۔ اس جگہ پر رام موہن بابو رہتے تھے۔

ایک روز وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ رام موہن بابو کا لیکچر سننے گیا۔ مذہب کے متعلق اس کے ذہن میں جو اُلجھنیں تھیں۔ ان میں اضافہ ہو گیا۔ اب وہ کالی گھاٹ نہ جاتا۔ گھر میں بیٹھا بیٹھا سوچا کرتا۔ کیا سیرام پور والے ٹھیک کہتے ہیں۔ کیا رام موہن بابو صحیح راستہ پر ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کون صحیح ہے کون غلط۔ ان سوالات سے جھنجھلا کر اس نے طے کر لیا کہ جب تک وہ خود بہت اچھی طرح مطالعہ نہ کرے خود کوئی فیصلہ نہیں کرے گا۔ کمپنی بہادر کی ملازمت سے استعفٰی دے کر وہ ہندو کالج میں داخل ہو گیا۔ اسی کالج میں شہر کے ایک رئیس پرنس دوار کا ناتھ ٹیگور کا لڑکا —— دیوندر ناتھ بھی پڑھتا تھا۔ وہ دونوں کلاس کے

بعد اکٹھے بیٹھ کر مغربی فلسفے پر تبادلہ خیالات کرتے۔ خدا اور رُوح کی کھوج لگاتے۔ دیوندر ناتھ میں ہماری صوفیوں والی خاصیتیں تھیں جو سِلبر کو بڑی دلچسپ معلوم ہوتیں۔ شام کو وہ رام موہن رائے کے گھر جا کر اُن کی محفل میں شامل ہوتے اور عالموں فاضلوں کی گفتگو سُنتے۔ یا موحدانہ بھجن گاتے۔ یا سِلبر، دیوندر ناتھ سے حافظ کی غزلیں سُنتا۔

جس سال نیلمبر دت نے بی، اے کیا اسی سال سے وہ رام موہن رائے کے برہمو سماج کا بڑا جوشیلا اور سرگرم کارکن بن چکا تھا۔ جب ہی ایک روز اس نے اخبار میں پڑھا کہ سر سِرل ہاورڈ ایشلے کا فالج گر جانے سے انتقال ہوگیا۔ انتقال کے وقت ان کی بیوی لیڈی ایشلے جن سے انھوں نے صرف تین سال قبل شادی کی تھی۔ مع اپنے دو سالہ لڑکے کے دارجلنگ گئی ہوئی تھیں۔

سِرل کو بہار کے ایک اُداس اور اجنبی ڈاک بنگلے میں موت آئی۔ وہ دورہ کر کے لوٹا تھا اور بوٹ اتار کر آرام کرسی پر لیٹا تھا۔ اسی وقت ہرکارے نے اسے اس کی بدمزاج، مغرور اور خاصی بدصورت بیوی کا خط لا کر دیا تھا جس میں اس نے دارجلنگ کی سوسائٹی کی تازہ خبریں لکھی تھیں اور یہ لکھا تھا کہ ننھا سِرل اب بہت شیطان ہوگیا ہے۔ آج اس نے ایک قلی کو اپنی ننھی سی لکڑی سے خوب پیٹا۔ خط پڑھنے کے بعد سِرل نے اخباروں کے پلندے کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا کہ یکایک اسے محسوس ہوا کہ وہ مرنے والا ہے۔ اُس نے اپنے چوبدار کو آواز دینا چاہی مگر اس کی زبان میں لُکنت آ چکی تھی۔ دوسرے لمحے وہ ختم ہوگیا۔

کلکتے کے اخباروں میں اس کے متعلق مضمون لکھے گئے۔ اس کی سوانح عمری شائع ہوئی برطانیہ اور ہندوستان کی اس نے جو خدمات کی تھیں۔ ان کا مفصل تذکرہ مضامین میں کیا گیا۔ اپنی عمر کے چالیس سال اُس نے بنگال میں گزارے تھے۔ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی نے اس کی یاد میں خاص جلسہ کیا۔ کالجوں میں اس پر تقریریں ہوئیں۔ اس کے پندرہ دن بعد لوگ اس کو بھول گئے۔

لیڈی ایشلے جو مدراس کے چیف جسٹس کی بہن تھی اور شراب بہت پیتی تھی اپنے لڑکے

سرل کو لے کر مع سارے ساز و سامان انگلستان چلی گئی۔ سر سرل مرتے وقت لاکھوں کروڑوں کا آدمی تھا۔ اس کا روپیہ سٹی میں بھی لگا تھا اور کلکتے میں بھی۔ بڑے ہو کر اس کے بیٹے سرل ایڈورن ڈیرک ایشلے نے اپنے باپ کے کمائے ہوئے روپے سے زبردست کاروبار شروع کیا جس کی شاخیں جنوبی امریکہ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ سلطنت برطانیہ اب ساری دُنیا پر چھا چکی تھی۔ برما میں ٹین کی کانیں تھیں۔ ملایا میں ربر کے جنگلات۔ چین میں افیم کی تجارت۔

ہندوستان ۱۸۵۷ء کے بعد اب باضابطہ طور پر وکٹوریہ کی ایمپائر میں شامل ہو چکا تھا۔ سارا مشرق اب مرحوم سر سرل ہاورڈ ایشلے کے بیٹے لارڈ سرل ڈیرک ایڈورن ایشلے کا تھا۔

۳۳

ایک دن پروفیسر گوتم نیلمبر دت بند گھوڑا گاڑی سے اُتر کر اپنے مکان کی برساتی میں داخل ہوئے تو مالی نے ان کو اطلاع دی کہ مٹیا برج والے نواب صاحب آپ سے ملنے آئے تھے۔ بڑی دیر آپ کی راہ دیکھا کیے۔ ابھی ابھی واپس گئے ہیں۔ نیلمبر اُلٹے پاؤں باہر گئے اور سڑک پر آ کر جلدی سے چاروں اور دیکھنے لگے۔ سامنے ایک بوڑھا سفید جامدانی کا انگرکھا پہنے جریب ٹیکتا سڑک کے کنارے کنارے چلا جاتا تھا۔ نیلمبر دت نے لپک کر اسے جا لیا۔

"اخاہ میاں نیلمبر صاحب" بوڑھے نے خوشی سے کھل کر کہا۔ "ہمارا خیال تھا آپ سے ملاقات نہ ہو پائے گی۔"

"کیوں نواب صاحب خیریت تو ہے۔ آپ سے تو یُوں بھی برس گزر جاتے ہیں ملنا نہیں ہو پاتا۔ اب آئیے چل کر دو گھڑی اندر بیٹھئے۔ میری نواسی اسکول کے بورڈنگ ہاؤس سے لوٹ کر آئی ہے۔ آپ نے شاید ابھی تک اسے نہیں دیکھا۔" نواب صاحب کا ہاتھ پکڑ کر وہ ان کو مکان کے اندر لے آئے۔

"اچھا میاں۔" نواب صاحب نے ڈرائنگ روم میں آکر صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تم کو دیکھ لیا۔ تمہارے بچوں کو دیکھ لوں۔ پھر جانے زندہ لوٹنا نصیب ہو نہ ہو۔"

"کیوں۔ کہاں کا قصد ہے۔ لکھنؤ ــــ؟"

"کربلائے معلّےٰ جا رہا ہوں۔ خدا وہیں یہ مٹی عزیز کرے۔ یہاں اب کیا رکھا ہے۔" ان کی آواز بھرا گئی اور اُنھوں نے کانپتے ہاتھوں سے مشہدی رومال نکال کر آنسو خشک کیے۔

نیلمبر دت ان کو محبت سے دیکھتے رہے۔ ملازم چائے لے کر آیا۔ ڈرائنگ روم ہمعصر وکٹورین طرز میں سجا ہوا تھا۔ دیواروں پر اَن گنت تصویریں تھیں۔ مناظر اور فوٹو گراف۔ برتیوں کے پردے دروازوں پر پڑے تھے۔ فرن اور پام کے پودے پیتل کے گملوں میں رکھے تھے۔ برابر کے کمرے میں پیانو بج رہا تھا۔

پیانو کی آواز یکلخت نیلمبر دت کو بڑی اُداس معلوم ہوئی۔ انھوں نے آواز دی۔ "نیلما بیٹی۔ باجہ بند کرو اور یہاں آؤ۔ دیکھو تمھارے میٹابرج والے چاچا آئے ہیں۔"

ایک پندرہ سالہ لڑکی اندر آئی۔ اس نے جُھک کر نواب صاحب کے پاؤں چھوئے۔

"یہ میری نواسی ہے نواب صاحب۔ اس کو آپ نے اب تک نہیں دیکھا تھا۔ اسکول ہی میں رہتی ہے۔"

وہ دُھندلی آنکھوں سے اسے دیکھتے رہے۔ پندرہ سالہ لڑکی جو شادی کر کے گود میں بچّہ کھلانے کے بجائے اسکول میں انگریزی پڑھ رہی تھی اور ارگن باجہ بجاتی تھی۔

نواب کمّن صوفے پر بیٹھے دریچے سے باہر دیکھتے رہے۔ کلکتے کی روشنیاں چاروں طرف جگمگا اُٹھی تھیں۔ شام کا اندھیرا چھا رہا تھا۔ نیلمبر دت ان سے ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے دونوں کے پاس مشترکہ موضوعِ گفتگو کوئی نہیں تھا۔ سوائے ماضی کے۔ مگر ماضی کی یاد کو نیلمبر دت کہاں تک گھسیٹ سکتے تھے۔ ان کے سامنے مستقبل تھا۔ نواب کمّن کے پاس صرف ماضی تھا۔ وضعداری نبھانے کے لئے دونوں بڑے تپاک سے ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ جب لکھنؤ اُجڑا اور کلکتے میں مہاراجہ بردوان کی کوٹھی آباد ہوئی۔ میٹابرج میں دُوسرا

لکھنؤ بسا یا گیا۔ اس وقت نواب کمن نے جو سلطان عالم کے ساتھ یہاں آگئے تھے نیلمبر دت کو ملاقات کے لئے بلوایا۔ وہ اس سمے کلکتہ کا مشہور اخبار نویس بن چکا تھا۔ اس نے انیک کئی کتابیں لکھ ڈالی تھیں اور وہ برہمو سماج کے پلیٹ فارم کا شعلہ بیان مقرر تھا۔ نیلمبر ان سے پابندی سے سال میں دو ایک بار ضرور مل لیتا تھا۔ جب راجہ سر سیندر موہن ٹیگور کے یہاں موسیقی کی تجدید کی بنا ڈالی گئی اور ملک بھر کے موسیقار کلکتے میں جمع ہونا شروع ہوئے اس وقت بھی نیلمبر نے نواب کمن کو یاد رکھا اور نئی سنگیت کی محفلوں میں مدعو کرتا رہا

اب کمروں میں لیمپ روشن کر دئیے گئے تھے باہر گلیوں میں بارش کا پانی جمع ہو گیا تھا۔ جن میں مینڈک ٹراتے تھے۔ نیلمبر دت کے مکان میں اوپر کی منزل میں ان کے بیٹے منورنجن دت کے یونیورسٹی کے ساتھی اور آرٹ اسکول کے لڑکے ایک انگریزی ڈرامے کی ریہرسل میں مصروف تھے۔ کلکتے کے بنگالی تھیٹروں میں ان دنوں چند بہت اچھے اچھے ڈرامے اسٹیج کئے گئے تھے۔ منورنجن کے دوست مائیکل مدھوسودن نے ایک نیا ڈرامہ لکھا تھا۔ اس سمے وہ سب اس کی پریکٹس میں جٹے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے کیمپل میڈیکل اسکول کا ایک لڑکا کھڑکی میں بیٹھا ہارمونیم بجا رہا تھا۔

منورنجن، تورو دتا کی نئی انگریزی نظم پڑھ رہا تھا۔ ہارمونیم کے سُر اور لڑکوں کے قہقہوں اور مکالموں کی آوازیں نیچے ڈرائینگ روم تک پہنچ رہی تھیں۔

نواب صاحب جریب پر انگلیاں پھیرتے رہے۔ یہ ایک دوسرا زمانہ تھا۔ دوسرا عہد۔ یہ ۱۸۷۰ء ادر تھا۔ دُنیا بوڑھی ہو چکی تھی۔ نواب کمال رضا کی دُنیا۔ نیلمبر دت بھی ان ہی کے ہم عمر تھے۔ مگر ان کی دُنیا اب جوان ہو رہی تھی۔ یکلخت نواب کمن کو احساس ہوا کہ اس نئی دُنیا میں ان کی کوئی جگہ نہیں۔ دارالسلطنت کے اس جدید ڈرائینگ روم میں بیٹھے وہ خود کو بے حد مضحکہ خیز نظر آئے۔

"نواب صاحب! منورنجن لکھنؤ کے کیننگ کالج میں قانون کا لیکچرار ہو کر جا رہا ہے"
گوتم نیلمبر دت کی آواز اُن کے کانوں میں آئی۔ یہ آواز بھی کسی دوسرے کرّے سے آ رہی تھی وہ چونک پڑے "اچھا۔ اچھا۔ ماشاء اللہ سے۔۔۔" اُنھوں نے ہڑبڑا کر کہا۔ جائیں

سدھاریں۔ ان کو امام ضامن کی ضامنی میں ــــــ دیا۔" پھر وہ جریب کے سہارے اٹھے اور نیلمبر دت کو خدا حافظ کہہ کر مٹیا برج لوٹ گئے۔

رات گہری ہو چکی تھی۔ نیلمبر دت نواب کمن کے جانے کے بعد تھوڑی دیر ڈرائنگ روم میں ٹہلتے رہے۔ انھوں نے گھومنے والی الماریوں سے ایک کتاب نکال کر اس کی ورق گردانی کی۔ مگر اس میں بھی ان کا دل نہ لگا۔ انھوں نے چاروں طرف دیکھا۔ الماریوں میں ہر طرف کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ اخباروں کے مجلد فائل۔ قانون کے رسالے۔ کمیٹیوں کی رپورٹیں اور قراردادیں۔ ہر طرف مسائل تھے اور مسائل کا حل انھوں نے پا لیا تھا۔

مسائل کا حل انھوں نے پا لیا تھا؟ — نیلمبر دت کا دم گھٹنے سا لگا۔ ہوا بند تھی اور رات گرم تھی۔ باہر سڑکوں پر لیمپ مدھم مدھم ٹمٹما رہے تھے۔ دفعتاً عروس البلاد کلکتہ ان کو بے حد خوفناک معلوم ہوا۔ وہ گھبرا کر باہر برآمدے میں نکل آئے۔ ایسی ہی راتوں میں دکھی روحوں کی پرواز کی سنسناہٹ سنائی دیتی ہے۔ آنگن میں کیلے اور پام کے پتے ساکت کھڑے تھے۔ پختہ حوض کے کنارے ایک کتا دم ٹانگوں میں سمیٹے سو رہا تھا۔ اگر ان کو آواگون میں یقین ہوتا تو شاید وہ سوچتے کہ یہ کتا کسی کی دکھی روح ہے۔ وہ برآمدے سے اتر کر گیندے کے کنارے کنارے ٹہلتے رہے۔ اوپر منورنجن کے کمرے میں خاموشی چھا چکی تھی۔ کیمپل میڈیکل اسکول کا لڑکا ابھی تک دریچے میں بیٹھا تھا۔ وہ بھی ہارمونیم کے پردوں پر سر رکھ کر سو چکا تھا۔ منورنجن کے کمرے سے جو زینہ باغ میں اترتا تھا اس کی آخری سیڑھی پر بیٹھا کوئی تورو دتا کی نئی انگریزی نظم آہستہ آہستہ پڑھ رہا تھا۔ چاند اب دت ہاؤس کے عین اوپر آ چکا تھا۔

برآمدے میں لڑکوں کا ایک گروہ بیٹھا تورو دتا کی نظم پر سر دھن رہا تھا:

"محبت اور روشنی اور نغمے کو تمھاری تلاش ہے
روشنی قرمزی آسمانوں پر موجود ہے
نغمے لارک گا رہا ہے۔
محبت میرے دل میں ہے۔

ایک دوسرے سے جُدا
ہم فطرت کے مقصد کو کھو رہے ہیں۔
اپنی قسمت کو دھوکا دینے کے لئے ہم کیوں کوشاں ہیں۔
میری محبت تمھاری روح کے لئے تخلیق کی گئی ہے
تمھارا حُسن میری آنکھوں کے لئے۔
اب جاگ اُٹھو۔
میں منتظر ہوں اور روتی ہوں
تم کہاں ہو
اس دھرتی پر ایک بے آسرا
بیمار بدصورت اور حقیر
بچے کی طرح میں پیدا ہوئی
پیدائشی بدقسمت لڑکی ——
ہر ایک نے مجھے ٹھکرا دیا ہے۔
پھر میرے ہونٹوں سے ایک نالہ بلند ہوا۔
خُدایا —— !!
اور خُدا نے جواب دیا ——
گائے جا —— بے چاری لڑکی —— گائے جا ——"

نیلمبر دت مبہوت اس نظم کو سُنتے رہے۔ اُنھوں نے آواز پہچانی۔ یہ ان کے بیٹے کی آواز تھی۔ منورنجن —— اور وہ آہستہ آہستہ رو رہا تھا۔ وہ جس نے کلکتہ یونیورسٹی کے فلسفے اور منطق کے امتحانات میں سارے ریکارڈ توڑے تھے جو اگلے ہفتے کیننگ کالج کا پروفیسر ہو کر پردیس جانے والا تھا۔

نیلمبر دت مسکرائے۔ مبارک ہیں وہ لوگ۔ اُنھوں نے اپنے آپ سے کہا۔ جو محبت کر سکے۔ خواہ اس میں انھیں ناکامی ہی ہوئی ہو۔ پھر اُنھوں نے چاند کو دیکھا جو تیرتا تیرپا دت ہاؤس

کے عین مقابل میں آچکا تھا۔ اس کی کرنیں حوض کے پانی میں منعکس تھیں۔ چاند نے ان کو بہت سی کہانیاں سنائیں۔ وہ پورن ماشی کی رات تھی۔

اس رات چیت پور روڈ سے واپس جانے کے بعد نواب ابو المنصور کمال رضا بہادر جب گارڈن ریچ پہنچے جہاں مٹیا برج میں ان کا مکان تھا تو اپنے پلنگ پر لیٹتے ہوئے ان کو خیال آیا کیسی عجیب بات ہے کہ انسان صرف ایک مرتبہ دُنیا میں آتا ہے اور پھر ختم ہو جاتا ہے۔ زندگی صرف ایک ہی دفعہ زندہ رہنے کے لئے ملتی ہے۔ انسان مر جاتا ہے۔ پھر کبھی اس دُنیا کو نہیں دیکھ پاتا۔ جیسے شاہ زمن غازی الدین حیدر مرے تھے اور نصیر الدین حیدر اور محمد علی اور امجد علی۔ ان سب کو مرتے نواب کمّن نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یہ لوگ جو اودھ پوری کے راجہ تھے۔ یہ سب موت آئی تو پٹ سے ختم ہو گئے اور بے چارے سلطان عالم واجد علی جو اس وقت پڑوس کی راودھا منزل میں اندر سبھا منعقد کروا کے خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ابھی قیصر باغ ہی میں موجود ہیں۔ ایک روز وہ بھی ختم ہو جائیں گے۔ تختِ شاہی ہو یا غریب الوطنی۔ انتہائی مسرت ہو یا شدید رنج و غم موت آکر سارا قصہ ہی چکا دیتی ہے۔ جانے مرنے کے بعد کیا حشر ہوتا ہو گا۔ فشارِ قبر اور منکر نکیر اور —— اور —— یہ سب سوچتے سوچتے نواب کمّن کو بے حد ڈر معلوم ہوا۔ اُنھوں نے تکئے پر سے سر اٹھا کر اپنے گھر والوں کو آواز دینا چاہی اُنھوں نے علیؑ اور حسینؑ اور عباسؑ علمدار کو پکارا مگر حلق سے آواز نہ نکلی۔ گرمی کی شدت سے دم گھٹتا جا رہا تھا۔ اُنھوں نے پلنگ سے اُٹھنا چاہا مگر پیچھے کو گر گئے۔

کیونکہ کربلائے معلےٰ کا سفر کرنے کے بجائے نواب کمال رضا سفرِ آخرت اختیار کر چکے تھے۔

۳۴

نواب صفدر جنگ سے لے کر سلطان عالم تک نو حکمرانوں نے اودھ پوری پر راج کیا۔ سلطان عالم کے زمانے میں سلیمن صاحب آیا۔ صفدر جنگ نے اپنی طاقت

کے بل پر اس سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی
جو دلی کے زوال کے بعد ہندوستان کی سب سے شاندار سلطنت تھی۔ جس کے بادشاہ فرانس کے لوئی چہاردہم سے زیادہ جاہ و جلال والے تھے۔ سلیمن صاحب چونکہ ان سب سے طاقتور تھا۔ اُس نے پل کی پل میں ایک اتنی بڑی پھونک ماری کہ یہ ساری دیپ مالا چشم زدن میں بجھ گئی۔ ہیولاک جیتا۔ سلطان عالم ہارا۔ لکھنؤ کی اندر پوری اجڑ گئی۔ نوٹنکی ختم ہو چکی۔ قیصر باغ کی چاندی والی بارہ دری میں سبز پری کا ناچ۔ عیش باغ کے میلے۔ محرم اور رام لیلا کے ہنگامے۔ دلکشا محل اب سنسان پڑا ہے۔ بیلی گارد کو توپوں نے اُڑا دیا۔ حضرت گنج میں انگریزی دوکانیں ہیں۔ امین آباد میں کالج اور اسکول۔ اخبار چھپ رہے ہیں۔ ٹیلیگراف کے تار جھنجھناتے ہیں۔ ایودھیا کے رام چندر کی گدی لُٹ چکی۔ صبح ہوئی اور آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ یہ سب عمر عیار کا طلسم تھا۔ آخری ایکٹ شروع ہونے سے پہلے ہی راجہ اندر کو مع اس کے اکھاڑے کے دیولوک سے شہر بدر کر دیا گیا۔

کلکتے کے پروفیسر نیلمبر دت اپنے بیٹے سے ملنے کی غرض سے لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ ریل گاڑی جب اسٹیشن پر پہنچی اور وہ فٹن پر بیٹھ کر باہر آئے تو انھوں نے دیکھا کہ نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ وہ آج سے اڑتالیس سال قبل ۱۸۲۳ء میں لکھنؤ آئے تھے۔ وہ شاہی کا لکھنؤ تھا۔ یہ انگریزی کا لکھنؤ ہے۔ یہاں دھوتی بیگ کوتوال کے بجائے انگریز ڈپٹی کمشنر کا راج ہے۔ جو سعادت علی خاں کی فرح بخش کوٹھی میں براجتا ہے۔ بیچارے سعادت علی خاں کی حیات بخش کوٹھی اب بنکس ہاؤس کہلاتی ہے اس میں کمشنر رہتا ہے۔ قیصر باغ میں کیننگ کالج ہے۔ جس میں کلکتہ کا منورنجن دت قانون پر لیکچر دیتا ہے۔ شہر کی گلیاں اور محلے وہی ہیں لیکن زمانہ بدل گیا۔ نخاس چوک۔ معالی خاں کی سرائے۔ پاٹا نالہ۔ چوپٹیاں۔ چوکھی۔ گولہ گنج۔ بارود خانہ۔ سعادت گنج۔ ڈالی گنج۔ حسین گنج۔ ساری جگہیں وہی ہیں۔ مکان۔ انسان۔ مگر وقت دوسرا ہے۔ تاریک محلوں، شکستہ مکانوں میں انقلاب کے مارے ہوئے لوگ سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ دولت مند لٹ گئے۔ غریب امیر ہو گئے۔ باغیوں کو پھانسیاں اور وفاداروں کو تعلقے ملے۔ اختر پیا جب سے پردیس سدھارے اب

تو ان کے لئے روتے روتے آنسو بھی خشک ہو گئے۔ یہ اودھ پوری ہے یہاں سے رام کو بھی اسی طرح بن باس ملا تھا۔

فٹن اسٹیشن سے شہر کی طرف چلی۔ کوچبان نے سر پہ انگوچھا لپیٹ کر نیلمبر دت کو دیکھا۔ "بابو صاحب پیچھے سائیس بیٹھا ہے اسے اوپر بلا لوں۔ بڈھئو ہے گر کر مر جائے گا۔"

"ہاں۔ بلالو۔" اُنھوں نے جواب دیا۔ پیچھے سے ایک بوڑھا کود کر کوچ بکس پر آگیا۔ فٹن پھر روانہ ہوئی۔

"بابو صاحب کلکتے سے تشریف لاوت ہیں۔"

"ہاں۔"

"ہم بھی سوچتے ہیں کلکتے چلے جائیں۔ یہاں اب جی نہیں لگتا۔" نوجوان نے کہا۔

"کو ہے۔" بوڑھے سائیس نے نوجوان کے کان کے قریب مُنہ لے جا کر بڑے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

"کلکتے کے بابو۔" نوجوان نے جس کا نام شمبھو تھا چلا کر کہا۔

"کلکتہ — ؟" بوڑھے نے جس کا نام گنگا دین تھا اور جو اونچا سنتا تھا غیر یقینی انداز میں دُہرایا اور پھر مُڑ کر دھندلی آنکھوں سے بنگالی بوڑھے کو دیکھا۔

"ہاں ہاں۔ سمجھ میں نہیں آوا؟" شمبھو نے کہا

"بابو صاحب۔" گنگا دین نے مڑ کر بڑی لجاجت سے نیلمبر دت سے کہا۔ "ہمکا بھی کلکتے پٹھلائے دیو۔"

نیلمبر دت کی سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی۔ نوجوان نے ہنس کر بوڑھے سے کہا "بابو صاحب ٹھیٹری بولی نہیں سمجھتے اُردو میں اپنا مطلب بیان کرو۔"

بوڑھے نے بہت سنبھل کر کہا — "کھداوند۔ ہم کو کلکتے پٹھا دیجیے۔ وہاں ہمرے بادشاہ رہت ہیں۔"

نوجوان ہنس پڑا۔ "حضور بابا کی بات پر دھیان مت دیجیے۔ یہ جو مسافر ریل سے

اُترتا ہے اس سے یہی بات کہتے ہیں۔ میاں مسافر تم کلکتے سے آئے ہو۔ ہم کو بھی وہیں پہنچادو۔ پُوچھو۔ ہمرے بادشاہ خود جو کلم میں ہیں اُوپر سے یہ بھی پہنچ جائیں جیسے بس ان ہی کی کسر ہے۔"

نیلمبر دت خاموش رہے۔ فٹن اب امین آباد کی طرف بڑھ رہی تھی

"سرکار۔ پہلے بھی نکھلؤ تشریف لائے ہیں۔" نوجوان نے پُوچھا

"ہیں۔۔؟" نیلمبر دت نے چونک کر پوچھا۔ "ہاں۔"

"کب۔۔؟"

"بہت زمانہ گزرا جب تم پیدا نہیں ہوئے تھے۔ غازی الدین حیدر کے وقت میں۔"

"بابا۔" کوچوان نے پھر چلّا کر بوڑھے سائیس کے کان میں کہا۔ "بابو صاحب تمہرے گاجی آلدین حیدر کے زمانے میں آئے رہے۔"

پھر کوچوان نیلمبر دت سے مخاطب ہوا۔ "بابا کہا کرت ہیں کی گاجی الدین حیدر کے چوبدار تھے۔ اس سے پہلے شکرم ہانکتے تھے مگر کہتے ہیں کہ محل میں پہنچ کر انھوں نے بڑے اچھے دن دیکھے۔ سارے بادشاہوں کی ڈیوڑھی پر نوکری کی ہے۔ سلطان عالم ان کو بہت مانتے تھے۔"

"کھداوند" گنگادین نے کہا۔ "سلطان عالم کو آپ نے دیکھا ہے۔ کیسے ہیں۔ خیریت سے ہیں۔" پھر وہ بچوں کی طرح رونے لگا۔

نیلمبر دت بہت متاثر ہوئے۔ اُن کی سمجھ میں نہ آیا کہ لوگ اس قدر جذباتی بھی ہو سکتے ہیں۔ مدتوں وہ محض عقل کے پجاری رہے تھے۔ اب آن کر اُنھوں نے دل کی عظمت کو سراہا۔ فٹن اب امین آباد کے چوراہے پر پہنچ چکی تھی۔

دفعتاً کوچوان نے پکارا۔ "ارے سامنے سے ہٹتی نہیں بوڑھا۔ کاہے اپنی جان کی لاگو ہوت ہو۔" اُس نے باگیں کھینچ کر فٹن روک لی۔ ایک بڑھیا دُلائی میں لپٹی ہوئی سامنے آگئی اور اُس نے ہاتھ پھیلا کر میکانکی انداز میں اپنے فقرے دُہرانے شروع کر دیے۔

جناب امیرؔ کا صدقہ۔ خدا انھیں سوا غم حسینؑ کے اور کوئی غم نہ دے۔

نیلمبر دت فٹن کے کشنوں سے پیٹھ لگائے بیٹھے سوچ رہے تھے۔ لکھنؤ کیا بوڑھو کا شہر ہے۔ یہاں کے جوان کہاں چلے گئے۔ ان کو معلوم نہ تھا کہ یہاں کے جوان ملکہ حضرت محل کے لئے لڑتے ہوئے مارے گئے تھے اور جو باقی تھے قبل از وقت عمر رسیدہ ہو چکے تھے۔ مگر زندگی کا ہنگامہ بدستور جاری تھا۔ امین آباد روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ پھول بیچنے والے صدائیں لگا رہے تھے۔ لوگوں کا جم غفیر چاروں طرف موجود ہوتا تھا۔ شامِ اودھ بدستور بزم آرا تھی۔ فقیرنی اسی طرح آنکھیں بند کئے کھڑی دُہراتی رہی۔ "خدا سوا غم حسینؑ کے اور کوئی غم نہ دے۔ ایک ٹکا۔ خالی ایک ٹکا۔"

نیلمبر دت چونک پڑے۔

یہ آواز جانی پہچانی تھی۔ یہ آواز سینکڑوں ہزاروں برس کا سفر طے کرتی ان کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ اس آواز نے بڑی خوبصورت باتیں کی تھیں۔ راگ سنائے تھے۔ قہقہے لگائے تھے۔

اُنھوں نے ہڑبڑا کر عینک درست کی اور فٹن سے باہر جھانکا۔ مگر سڑک کے کنارے تو وہی فقیرنی کھڑی تھی جس نے اودے رنگ کی بوسیدہ دُلائی اوڑھ رکھی تھی۔

"اسے کچھ مت دیجئے گا خداوند۔" شمبھو نے کوچ بکس پر سے جھک کر آہستہ سے مودبانہ انداز میں کہا۔ "اسے کوکین کی لت ہے۔ جو ملتا ہے اس کی کوکین کھا جاتی ہے نیک بخت۔"

نیلمبر دت نے اپنے رعشہ دار ہاتھوں سے ایک روپیہ جیب سے نکال کر فقیرنی کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پہ رکھ دیا۔

فقیرنی نے اپنی چندھی چندھی آنکھوں سے اس بنگالی بوڑھے کو دیکھا جس کی لمبی سفید داڑھی تھی اور جو سفید براق دھوتی پہنے اگری شال میں لپٹا ٹانگ پر ٹانگ رکھے فٹن میں بیٹھا تھا۔

بڑھیا کو نیلمبر دت نے پہچانا۔۔۔

بڑھیا چمپا تھی۔

روپیہ مٹھی میں مضبوطی سے بند کرنے کے بعد ایک لمحے کے لئے اُسے بڑی حیرت ہُوئی۔ یہ کیسا دیالو رئیس ہے جو ٹکا مانگو تو چاندی کا روپیہ دیتا ہے۔ سکّے کو اپنی گرفت میں لے کر فقیرنی نے پھر رٹے ہوئے انداز میں دُہرانا شروع کر دیا "سرکار غریب پرور — آپ کے پوتوں، نواسوں کی خوشیاں دیکھنی نصیب ہوں۔ میں غدر کی ماری ہوں۔ بندہ نواز۔ شاہی میں میرے دروازے پر ہاتھی جھومتا تھا اب کوئی دو روٹی کا سہارا دینے والا نہیں۔ اللہ آپ کو —" شمبھو نے گھوڑے کو چابک لگایا فٹن آگے بڑھ گئی۔ شمبھو جس کی دُنیا کے واقعات پر رائے زنی کرنے کی عادت بہت پختہ ہو چکی تھی۔ ہنس کر کہنے لگا:

"بڑھیا کی باتیں۔ دروجّے پہ ہاتھی جھومتا تھا۔ یہ گدّی کا یار لوگوں کو اچھا بہانہ مل گیا ہے۔ جس سے سُنو یہی کہتا ہے میں غدر سے پہلے یُوں طُرّم جنگ تھا۔ فلانا تھا ڈھمکا تھا۔ . . بابا ہی کو دیکھ لیجئے۔ بابو صاحب۔ گدّی سے پہلے بادشاہ کے خاص چوبدار تھے۔ اب سائیسی کرتے ہیں۔" وہ طنز سے ہنسا اور اسی طرح اظہارِ خیال کرتا ہُوا موتی محل برج کی سمت رواں رہا —

چمپا نے روپے کو شام کے اندھیرے میں کئی بار اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتی ایک تاریک گلی میں مڑ گئی۔ جہاں ایک زمین دوز دوکان میں کوکین فروخت ہوتی تھی اور جہاں بھنگڑیے اور مدکئے گھٹنوں میں سر دئے بیٹھے تھے۔

اندھیرے نے سارے شہر کو اپنے آنچل میں سمیٹ لیا۔ جس وقت فٹن امین آباد کے چوراہے سے آگے بڑھی۔ نیلمبر دت نے ایک بار پیچھے مڑ کر نظر ڈالی۔ چمپا سڑک کے کنارے دلائی میں لپٹی کھڑی ان کا دیا ہُوا روپیہ لیمپ کی روشنی میں اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی جیسے اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا ہو۔ اس کے بال چاندی کی طرح چمک رہے تھے اور اس کے چہرے پر اَن گنت جھریاں تھیں۔ اس کی دُلائی میں جا بجا پیوند لگے تھے۔ کہیں کہیں پر گوکھرو اور بنت لگی رہ گئی تھی جس کے تار نکلے ہوئے تھے۔

اُنھوں نے فٹن کے کشنوں سے پیٹھ لگا کر آنکھیں بند کر لیں ۔
کیونکہ گوتم نیلمبر نے ویشالی کی امبا پالی کو دیکھ لیا تھا۔

گومتی کے اس پار شاہِ نجف کے مقابل میں سنگھاڑے والی کوٹھی تھی جس کو بابو منورنجن دت نے اپنے رہنے کے لئے کرائے پر لے رکھا تھا۔ فٹن موتی محل کے پُل پر سے گزر کر دریا کے کنارے والی کچی سڑک پر مڑ گئی اور کچھ دیر بعد سنگھاڑے والی کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہو گئی۔

اُس رات جب منورنجن اپنے کمرے میں جا کر سو گیا اور مالک مکان کے کمروں میں لیمپ گُل کر دیئے گئے۔ تب نیلمبر دت برآمدے میں آ کر جس کی سیڑھیاں ندی میں اُترتی تھیں بہت دیر تک ندی کے بہتے ہوئے پانی کو دیکھتے رہے۔ رات اب بھیگ چلی تھی لیکن کمرے میں جا کر سونے کے بجائے وہ باہر نکل آئے اور گومتی کے کنارے کنارے سڑک پر چلنے لگے۔ چاروں اور مکمل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ان کے پیچھے پیچھے بھوتوں کا ایک پورا جلوس ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ آگے آگے چھل پیریاں رقصاں تھیں۔ سامنے کچھ دُور پر پُل کے نیچے کشتیاں بندھی تھیں اور چنڈی کا مندر نظر آ رہا تھا۔ درختوں پر سُرخ آنکھوں والے بندر سو رہے تھے۔ یہ بہت جانے پہچانے بھوت تھے جو ان کے پیچھے دانت نکوستے۔ لنگڑاتے اُچھلتے کودتے چلے آ رہے تھے۔

سارے شاہانِ اودھ۔ سعادت علی خاں اور جان بیلی۔ نصیر الدین حیدر اور ان کا یوروپین حجام اور قدسیہ محل اور بوڑھے محمد علی شاہ۔ سرل ہارڈ ایشلے اور تینیلا۔ لارڈ میکالے اور بشپ ہیبر۔ ان انگریز بھوتوں کو بھی وہ خوب جانتا تھا۔ جب زندہ تھے۔ اور مر کر اب جانے کس جہنم میں گئے ہوں گے مگر وہ تو بدستور سر پر سوار تھے۔ دُنیا کا عروج و زوال گوتم نے دیکھ لیا تھا۔ اب اسے کون سا تماشہ دیکھنا باقی تھا۔ ندی رواں تھی۔ کنارے پر مکان بنے تھے۔ ان مکانوں کے نام تھے۔ ان مکانوں میں انسان سو رہے تھے۔ ان انسانوں کے بھی نام تھے۔ مکان پتھر کے بنے تھے۔ ساحل پر پتھر بکھرے تھے۔ وقت رواں تھا۔ وقت پتھر میں منجمد تھا۔ مرگھٹ میں شعلے بلند ہو رہے تھے۔ آج کی رات جانے

کون کون مرا ہوگا۔

نیلمبر دت آگے بڑھتے رہے۔

سامنے مرگھٹ تھا۔ مرگھٹ میں کالی ناچ رہی تھی۔ کالی جو ساری کائنات کو اس کے خاتمے پر اپنے میں سمیٹ لیتی ہے۔ صرف وہی انسان اس سے خوفزدہ ہوئے بغیر اس کی عبادت کر سکتا ہے جو اپنی خواہشوں کو ختم کر کے اس کی ذات میں فنا ہو سکے۔

مرگھٹ۔ یہاں ساری خواہشیں جل کر بھسم ہو جاتی ہیں۔ اور کالی جو ذہن اور گویائی سے ماوراء ساری جاندار کائنات کو نفی میں تبدیل کر دیتی ہے۔ وہ جو شونیا کو پورن بناتی ہے۔ پورن جو روشنی اور سکون ہے۔

کالی جس کا لباس سماوی ہے۔ وہ وسعت ہے کیونکہ لامحدود ہے۔ عظیم طاقت ہے۔ مایا سے بلند تر ہے۔ کیونکہ خود مایا بن کر دنیا کی تخلیق کرتی ہے۔

مرگھٹ میں کالی، شیو کے سفید جسم پر کھڑی ہے۔

شیو جو سفید ہے کیونکہ سروپ ہے۔ روشنی بخشتا ہے۔ اور مایا اور خود پرستی کے عفریتوں کو تباہ کرتا ہے۔ وہ ساکت ہے کیونکہ تبدیلی سے ماوراء ہے۔ کالی اس کی تبدیلی کی مظہر ہے۔

شیو جو تبدیل نہیں ہوتا لیکن ہر تغیر میں موجود ہے۔ شعلوں کے دھوئیں میں کالی رقصاں ہے۔ وہ کالی ہے۔ تارا۔ دھوم وتی۔ وہ شانت رس کا ناچ ناچ رہی ہے اور کائنات جے جے کے نعرے لگا رہی ہے۔

نیلمبر دت جس نے کالی، کونتی اور گوری اور جوگ مایا کے روپ میں دیکھا تھا انھوں نے مرگھٹ پر نظر ڈالی اور اسے پہچانا۔

کیونکہ مرگھٹ حیات کی اصلیت تھی۔

وہ کچھ دیر پل پر کھڑے مدھم شعلوں کو دیکھتے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سنگھار دیے والی کوٹھی کی طرف واپس لوٹ آئے۔

صبح کے چار بجے تو گھر کی بی بی بستر سے اٹھیں اور انھوں نے جا کر مہری کو جگایا جو

ایک طرف کو فرش پر چٹائی بچھائے سو رہی تھی ''چائے کا پانی رکھ دیو۔ جھنگی کا اسکول آج چھ بجے سے لگیہے''۔ مہری آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھی۔ اور بالوں کا جوڑا لپیٹتی پانی کے نل کی سمت چلی۔ اب وہ غسل خانوں میں جگمگاتی پیتل کی بالٹیاں پانی سے بھر کر رکھے گی۔ بڑے صاحب اور بھتیّن صاحب کے شیو کا پانی پیالیوں میں لگائے گی۔ پھر چائے کا انتظام کرے گی۔

نیچے باغ میں مولسری کے درختوں پر چڑیوں نے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ دُور کچی سڑک پر سے ایک بیل گاڑی چرخ چوں کرتی گزر رہی تھی۔ دودھ والا المونیم کی بالٹیاں سائیکل کے ہینڈل سے لٹکائے لپکا ہوا بستی کی اور چلا جاتا تھا۔ گھر کی بی بی پوجا کے لئے ٹھاکر دوارے میں چلی گئیں۔ ٹھاکر دوارہ دوسری منزل پر مشرق کے رُخ کی بُرجی میں تھا۔ کمرے میں حبس تھا اور برسات کی گرمی۔ دروازہ کھُلا تو اندر کے اندھیرے میں گوپی ناتھ ٹھاکر حسبِ معمول اپنی خالی خالی آنکھوں سے سامنے کی اور خلا میں دیکھتے نظر آئے۔ ان کی کیسری پوشاک پر بھوٹا گوٹا لگا تھا اور ان کے مکٹ میں مور کا ایک ہی پر تھا جو ذرا ٹیڑھا ہو رہا تھا اور وہ اسی طرح ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ رکھے بانسری اُٹھائے پیتل کے چھوٹے سے مندر میں ٹھُنسے کھڑے تھے۔ ساکت منجمد۔ لاتعلق۔ ان کے چہرے پر بڑی بھیانک سی مسکراہٹ تھی۔ کمرے میں مچھر بھنبھنا رہے تھے۔ اس برجی کے مقابل میں برآمدے کے سرے پر دوسری بُرجی تھی۔ برآمدے میں دونوں لڑکیاں سو رہی تھیں۔ برآمدے کی چھت میں سیاہ رنگ کے شہتیر تھے۔ فرش جگہ جگہ سے ٹوٹا ہُوا تھا

پُرانی وضع کی مسہریاں اور تخت چاروں طرف پڑے تھے۔ تلسی کا منقش گملہ عین وسط میں رکھا تھا۔ سامنے کی دیوار پر کسی موٹے سر منڈے مہنت کی تصویر آویزاں تھی۔ برآمدے کے سرے پر دوسری بُرجی جو چھتر منزل کے رُخ پر تھی۔ اس میں لڑکیوں کا بھائی سوتا تھا وہ مزے سے ہلکی دُلائی تانے کھڑکی کے قریب سنا رہا تھا۔ قریب ٹیبل فین گھوں گھوں کر رہا تھا۔ بُرجی کے آٹھوں دروازے چوپٹ کھُلے ہوئے تھے اور بڑی ٹھنڈی ہوا اندر آ رہی تھی۔ کمرہ کافی وسیع تھا۔ الماریوں میں ڈھیروں کتابیں رکھی تھیں۔ فارسی، اُردو اور انگریزی کی کتابیں۔ پلنگ کے نزدیک والی میز پر دیوانِ غالب رکھا تھا اور کبیر کی گرنتھاولی

اور ایلیٹ کا ویسٹ لینڈ۔ ایک طرف کو اُردو کے نئے ترقی پسند رسالوں کے انبار لگے تھے اور پانیر اور لیڈر کے پرچے۔ اور انگریزی کے ادبی رسالے جو کلکتے اور بمبئی سے نکلتے تھے۔ اور وشوا بھارتی میگزین۔ دیواروں پر نند لال بوس اور ابنیندر ناتھ ٹیگور اور ختیگر اور ایل ایم سین اور روی ورما کے آرٹ کلرز کے پرنٹ تھے۔ کمرے میں سخت بے ترتیبی تھی۔ ٹینس کے ریکٹ پر ٹائیاں پڑی تھیں۔ گیند کے ڈبوں میں موزے ٹھنسے تھے۔ مسہری کے سرہانے دیوار پر جواہر لال نہرو کی تصویر تھی جس میں وہ نینی جیل سے باہر نکل رہے تھے۔ ایک تصویر کملا نہرو کی تھی ——— آٹھوں دروازوں کے درمیان جو جگہ خالی بچی تھی۔ اس پر یونیورسٹی کے گروپ فریم میں آویزاں تھے ۱۹۳۷ء ۱۹۳۸ء ۱۹۳۹ء آل انڈیا مباحثوں میں جو ٹرافیاں جیتی گئی تھیں ان کے گروپ۔ یونین کے عہدے داروں کی تصویریں ہسٹری سوسائٹی اور انگلش ڈیپارٹمنٹ کے گروہ جس میں لڑکے اپنے پروفیسروں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ پروفیسر سدھانت۔ ڈاکٹر راؤ۔ مسٹر سی۔ جی رائے ایک کونے میں آتشدان کے اُوپر ایک گروپ تھا جو اب بالکل پیلا پڑ چکا تھا۔ اس تصویر پر ۱۸۹۷ء لکھا تھا۔ یہ گروپ بھی کیننگ کالج کا تھا۔ یہ تصویر اس لڑکے کے باپ کے زمانۂ طالب علمی کی تھی۔ اس میں اس لڑکے کا باپ گول کالی ٹوپی اور بند کا لمبا کوٹ پہنے بڑی مستعدی سے فیکلٹی آف آرٹ کے چیئرمین ڈاکٹر منور نجن دت مرحوم کے پیچھے کھڑا تھا۔ ڈاکٹر دت کی ٹیگور کی ایسی یہ لمبی سفید داڑھی تھی۔ (یہ دوسری بات ہے کہ ہر داڑھی والا بنگالی ٹیگور کا ایسا نظر آتا ہے جس طرح ہر داڑھی والا انگریز کنگ جارج پنجم معلوم ہوتا ہے) اور وہ اپنی چھڑی پر دونوں ہاتھ رکھے کیمرے کو بہت گھور کر دیکھ رہے تھے۔

اسی طرح گھر کے سارے کمروں میں ان گنت تصویریں آویزاں تھیں۔ کانگریس کے اجلاس۔ میوزک کانفرنسوں کے گروپ جس میں پٹنہ۔ مہاراشٹرا۔ گوالیر اور اندور کے استاد لوگ بڑے بڑے پگڑ باندھے بیٹھے تھے۔ چیمبر آف پرنسز کے گروپ نچلی منزل میں ڈرائینگ روم تھا جس میں آتشدان کے اوپر ایک روغنی تصویر لگی تھی جس میں ایک دقیانوسی بوڑھا سبز گوٹ

کلجامہ اور چناہوا پائجامہ پہنے سر پر مندیل اوڑھے منقش کرسی پر بیٹھا تھا۔ یہ تصویر شاہی کے زمانے میں انگریز مصور نے بنائی تھی اور اس کے نیچے اُردو میں لکھا تھا : رائے زادہ بخشی مہتاب چند۔" چند تصویریں پرانے وقتوں کی دلھنوں کی تھیں اور ایسی بیبیاں جو اونچی ساڑھیاں باندھے انگریزی جوتے پہنے ایک ہاتھ میز پر ٹکائے کھڑی تھیں۔ میز پر موٹی موٹی کتابیں یا گلدان رکھے تھے۔ اس کوٹھی میں تین برجیاں تھیں۔ تیسری برجی میں لکڑی کا فرش تھا۔ یہاں ساز رکھے تھے اور لڑکیاں شام کو جب سُورج بخش صاحب آتے تھے تو ان سے گانا اور ناچ سیکھتی تھیں۔

یہ کوٹھی اس کے مکینوں کے لئے مرکزِ کائنات تھی۔ (ہر گھر اپنے مکینوں کے لئے مرکزِ کائنات ہوتا ہے)

یہاں سے اپنے پیاروں کی ارتھیاں نکلیں۔ دولھنوں کے ڈولے آئے۔ برائیں چڑھیں۔ بیٹیاں وداع ہوئیں۔ بڑے بڑے تہوار منائے گئے۔ رام نومی اور جنم اشٹمی اور دیوالی اور شوراتری۔ یہاں بچے پیدا ہوئے لڑائیاں جھگڑے ہوئے۔ لوگ ہنسے اور روئے۔ ہر گھر میں یہ سب ہوتا ہے۔ گھر خاموشی سے یہ سب دیکھتا رہتا ہے۔ اس کی داستان پر کوئی کان نہیں دھرتا۔ اس کی وقت سے ہمیشہ ٹھنی رہتی ہے۔ دیکھتا ہوں تم میرا ساتھ کب تک دیتے ہو۔ تم میری نشان دہی کب تک کرتے رہو گے۔ وقت کہتا ہے۔ گھر پھر بھی خاموش رہتا ہے۔ برس گزرتے ہیں۔ صدیاں بدلتی ہیں۔ موسم پلٹ پلٹ کر آتے ہیں۔ گھر وقت کی ندی میں چھوٹے سے جہاز کی طرح لنگر انداز رہتا ہے۔ کبھی کبھی لہریں اسے بہالے جاتی ہیں۔ پھر اس کا نام ونشان بھی نہیں ملتا۔

یہ کوٹھی نواب سعادت علی خاں کے عہد میں ان کے مقربِ خاص اور اودھ کے وزیر مالیات رائے زادہ بخشی مہتاب چند نے بنوائی تھی۔ اس وقت ان کے پڑپوتے اس میں براجمان تھے۔ جو اوسط درجے کے بیرسٹر تھے۔ ان کا ایک لڑکا تھا اور دو لڑکیاں تینوں ابھی طالب علم تھے۔ بیرسٹر صاحب کا سارا وقت کانگریس کے چکر میں نکل جاتا۔ یا وہ بیٹھ کر زمانہ اور نگار میں اُردو شاعری پر مضمون لکھتے پھر پریکٹس کی طرف توجہ کون دے۔ مگر گھر کی زمینداری تھی۔

اس لئے آسائش سے بسر ہو رہی تھی۔ دونوں لڑکیوں کے جہیز تیار تھے۔ لڑکے کو وہ کیمبرج بھیجنے کی سوچ میں تھے۔ جہاں اُنھوں نے خود پڑھا تھا۔ اس سمے وہ برساتی کے اُوپر جو کُھلی چھت تھی۔ اس پر مچھر دانی لگائے پڑے سو رہے تھے۔ بی بی کی کھٹر پٹر کی آواز نے ان کو جگا دیا۔ بی بی میں یہی تو ایک بُری عادت تھی کہ صُبح صُبح اپنی کھڑاؤں کی آواز سے سارے گھر کو جگا دیتی تھیں۔ کبھی گودام کا دروازہ کھول رہی ہیں کبھی نعمت خانے کی الماری بند کر رہی ہیں۔ کبھی اس کمرے میں جا رہی ہیں کبھی اس کمرے میں اس کے بعد وہ پُوجا کرنے بیٹھ جاتی تھیں اور زور زور سے رامائن پڑھتی تھیں۔

بڑی سُہانی ہوا چل رہی تھی۔ سامنے ندی پر ابھی دھند لکا چھایا تھا۔ مکمل سکون سارے میں طاری تھا۔ مقابل میں ندی کے دوسرے کنارے پر چھتر منزل اور شاہ نجف اور موتی محل کے گنبد اودے رنگ کے کہرے میں چھپے تھے۔ موتی محل برج پر ابھی سناٹا تھا۔ پل کے نیچے مندر میں گھنٹے بجنا شروع ہو گئے تھے۔

پھر نیچے کی منزل کے دروازے کھلے۔ ترلوچن نے جھاڑو لگانے پر کمر باندھی بستر لپیٹے گئے۔ صراحیاں اٹھا کر اندر رکھی گئیں۔ "اٹھو بٹیا جلدی کرو۔ تمہرا اسکول آج سے سبیرے کا ہوئے گوا ہے۔" جمنا مہری نے آن کر چھوٹی لڑکی سے کہا۔ لڑکی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی جلدی سے اس نے تکیہ کے نیچے سے گھڑی نکال کر دیکھی۔ پانچ بج گئے۔ ارے رام رے۔ آج سے اسکول کُھل رہا تھا۔ وہ پلنگ پر سے کُود کر تیزی سے غسل خانے کی طرف بھاگی۔

بڑی لڑکی نے کاہلی سے کروٹ بدل کر آنکھیں کھولیں اور ندی کی اور دیکھتی رہی۔ وہ سترہ اٹھارہ سال کی رہی ہو گی۔ وہ کالج میں پڑھتی تھی اور اس کا کالج چودہ جولائی کو کھلتا تھا۔ جلد اس کی شادی ہونے والی تھی اور اسے کالج والج کی چنداں پرواہ نہیں تھی۔ وہ اطمینان سے لیٹی ندی کو دیکھتی رہی۔

برجی والے کمرے میں سے نکل کر اس کا بھائی چپل گھسیٹتا اپنی پھپھو کی طرح باہر آیا اور وہ بھی برآمدے کے ایک ستون کے پاس ٹک کر کاہلی سے ندی کو دیکھنے لگا۔ جدھر پل تھا۔

اُس نے ایک زوردار انگڑائی لی اور تولیہ کاندھے پر ڈال کر بے سُری آواز میں گاتا غسل خانہ میں گھس گیا۔

"اسکول میں اپنی گوئیاں سے کہدینا۔ شام کو آکر بڑکی کے لہنگے کی گوٹ ختم کر ڈالیں"

گھر کی بی بی نے ٹھاکر دوارے سے باہر نکل کر چھوٹی لڑکی کو آواز دی۔ جو بالوں کی دو چوٹیاں گوندھے ہلکا نیلا ٹیونک پہنے جس کی پٹی سُرخ رنگ کی تھی۔ کتابیں اُٹھائے زینے کی طرف بھاگ رہی تھی۔ نیچے برساتی میں لا مارٹینز کی بس نے ہارن بجایا۔ "اچھا۔ اچھا۔ کہدوں گی۔" اُس نے سیڑھیاں اُترتے ہوئے مڑکر جواب دیا۔

گھر کی بی بی خالص پوربی تھیں۔ شادی ہوکر لکھنؤ آئے ان کو پچیس سال گزر چکے تھے مگر اپنے لب و لہجے پر اُنھوں نے لکھنؤ کی اور اپنی سُسرال کی ٹکسالی اُردو کا ذرا اثر نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ بڑی بیٹی کو بڑکی کہتی تھیں۔ چھوٹی کو چھٹکی۔ جیٹھ بڑکئو کہلاتے تھے۔ ماں مہتاری۔ میاں منئی۔ بیرسٹر صاحب ان کو بمبئی کلکتہ کشمیر سب جگہ گھما لائے تھے۔ ہر سال نینی تال اور مسوری جاتی تھیں مگر کیا مجال جو اُن کی وضع میں فرق آیا ہو۔

اتنے میں بڑی لڑکی نے برآمدے سے نیچے جھانکا۔ نیچے باغ کی سڑک پر اسکول کی بس کھڑی تھی جس میں چند ہندوستانی لڑکیوں کے علاوہ ساری انگریز لڑکیاں بیٹھی تھیں ہندوستانی لڑکیوں میں سے ایک نے کھڑکی میں سے سر نکال کر ہاتھ ہلایا۔ ہم لوگ شام کو آئیں گے۔ میرس کالج سے لوٹ کر۔

"اچھا" بڑی لڑکی نے جواب دیا۔

بس پھاٹک سے باہر نکل گئی۔

اس کے بعد لڑکا سیٹی بجاتا نیچے اُترا۔ برساتی میں اس کی سائیکل کھڑی تھی۔ اُس نے ایک نوٹ بک بڑے اسٹائل سے سائیکل کے ہینڈل میں اٹکائی اور بے فکری سے پیڈل چلاتا کچی سڑک پر آکر یونیورسٹی کی طرف روانہ ہو گیا جس کی سنگِ سُرخ کی بُرجیاں دُور دُھندلکے میں نظر آرہی تھیں۔

سورج نکل آیا۔ اب دُنیا اپنے کاروبار میں مصروف ہوئی۔ عدالتیں۔ دوکانیں۔ کالج

سرکاری دفاتر۔ اخبار کے پریس۔ ریڈیو اسٹیشن۔ کونسل چیمبر۔ کارخانے۔ جیل۔ خلقت زندہ رہنے میں مصروف رہی۔

پھر شام ہوئی۔ روشنیاں جگمگائیں۔ بازار۔ محلے۔ کوٹھیاں۔ سینما ہاؤس۔ کلب۔ بال روم۔ محلسرائیں۔ جھونپڑیاں۔

ندی کے کنارے اس کوٹھی کے برآمدے میں سے لڑکیوں کے قہقہوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ یہ چار پانچ نوعمر لڑکیاں برآمدے کے جنگلے پر بیٹھی اس طرح ہنستی تھیں جیسے رنج سے ناآشنا ہیں — شاید وہ رنج سے ناآشنا تھیں۔

چھتر منزل کے پیچھے سورج ڈوبا۔ ندی کے کنارے کنارے ڈونگیوں میں چراغ جلے۔ ندی نے اپنا سفر جاری رکھا۔

۳۵

سورج جس سمے جامنوں کے پیچھے پہنچتا۔ تب مس ٹھ مورس کالج سے لوٹ کر اپنی پنی تلی رفتار سے چلتی ندی کے پل پر آ جاتی تھی۔ یہ وقت عموماً جھٹ پٹے سے ذرا بعد کا ہوتا تھا۔ ندی کے پل سے اتر کر ایک سیدھی شفاف سڑک یونیورسٹی روڈ کہلاتی تھی اور اس کے دونوں طرف دریا کے کنارے کنارے دو کچے راستے جاتے تھے۔ ایک راستہ پل سے اتر کر یونیورسٹی بوٹ کلب۔ آرٹ اسکول اور ندوۃ العلماء کی طرف جاتا تھا۔ دوسرا کچا راستہ کاٹھ کے پل کی سمت جاتا تھا۔ یہاں سے ندی کے کنارے کنارے چاندباغ تک نئی کوٹھیاں بنی تھیں۔ یہ علاقہ ٹرانس گومتی سول لائینز اور حیدرآباد کہلاتا تھا۔ یہاں بے شمار نئے سیمنٹ کے مکان تھے۔ بہادر شاہ کا دو منزلہ محل چند پرانی کوٹھیاں بھی تھیں جیسے کالا کنکر ہاؤس۔ اور سنگھاڑے والی کوٹھی اور آگے بڑھ کر نشاط گنج کی بستی تھی۔ رائے بہاری لال روڈ جس کا ایک سرا یونیورسٹی روڈ پر تھا بل کھاتی اس علاقہ سے گزرتی فیض آباد روڈ پر جا پہنچتی تھی جہاں ازابلا تھوبرن کالج تھا۔ یہ بڑا خاموش اور پرسکون علاقہ تھا۔ کبھی کبھار کوئی موٹر نکل جاتی یا سائیکل سوار کالج کا لڑکا یا لڑکی۔ مضافات یا ڈالی گنج کی اور

جانے والے اکّے فیض آباد روڈ پر سے گزرتے رہتے اور آگے مسلم گرلز کالج تھا۔ اس کے آگے ارہر اور گنّے کے کھیت تھے اور ریلوے لائن اور ماہ نگر اور بادشاہ نگر کے چھوٹے چھوٹے اسٹیشن اور شفاف تالاب اور امرودوں کے جھنڈ اس کے بعد انگریزوں کا قبرستان تھا اور پیپر مل۔ جس کی آواز وقت کی یکسانیت کو متواتر منتشر کرتی رہتی تھی۔ اسی طرف کاٹھ کا پل بھی تھا۔ ادھر سے راستہ چڑیا جھیل اور بھینسا کنڈ جاتا تھا۔ ادھر سے اور آگے سکندر باغ اور بنارسی باغ اور وہ سارا علاقہ تھا جہاں گورنمنٹ ہاؤس تھا۔ جس کے پیچھے غازی الدین حیدر کی نہر تھی اور حضرت گنج اور لامارٹنر کالج اور لامارٹینر روڈ ہرے بھرے کنجوں سے نکلتی دلکشا پیلیس کی طرف جاتی تھی جس کے آگے وسیع سبز چھاؤنی تھی۔

موتی محل برج سے آگے بڑھ کر میرس کالج تھا اور قیصر باغ کی بارہ دری۔ اور قیصر باغ۔ اس کے آگے امین آباد پارک، تھا اور امیر الدولہ پارک۔ اور شہر۔ اور جھاؤ لال کا پل اور پھر سڑکیں نخاس اور چوک کی طرف جاتی تھیں۔ جہاں میڈیکل کالج تھا اور ہسپتال۔ شاہ مینا کی درگاہ اور امام باڑہ آصف الدولہ۔ مچھی بھون اور امام باڑہ حسین آباد وہیں اکبری دروازہ تھا۔ اور گول دروازہ یہ سارا علاقہ پرانا لکھنؤ تھا۔ یہ نئے لکھنؤ سے بہت دور تھا مگر نئے لکھنؤ میں بھی پرانا شہر ہر جگہ موجود تھا۔ شاہی کی ایک کوٹھی کی جگہ گورنمنٹ ہاؤس کھڑا تھا۔ ندی کے کنارے موتی محل میں امپیریل بنک تھا۔ حضرت گنج کے عین وسط میں بیگم کوٹھی تھی۔ چھتر منزل میں کلب تھا۔ یہ بڑا وضعدار شہر تھا۔ یہاں کی چیزیں نئی ہو کر بھی قدیم تھیں۔ نو دولتے پن کا اظہار یہاں کی کسی عمارت سے نہیں ہوتا تھا۔ اس شہر میں وقت نے بڑی گمبھیرتا اور ٹھہراؤ کے ساتھ گزرنا سیکھا تھا۔

اس اطمینان اور آسائش کے ساتھ فٹن شام کی کاسنی گلابی نارنجی روشنی میں خراماں خراماں چلتی موتی محل برج تک پہنچی۔ یونیورسٹی روڈ پر اس وقت کاروں اور سائیکلوں کا ہجوم ہوتا۔ پل سے اتر کر اس سڑک پر جانے کے بجائے اکثر ایسا ہوتا کہ فٹن بائیں ہاتھ

والی کچی سڑک پر اُتر آتی۔ جہاں آراستہ بڑے بڑے سفید پھولوں کی جھاڑیوں سے گھر گیا تھا اور جدھر پرانے وقتوں کی چند کوٹھیاں تھیں۔

گنگا دین کوچ بکس پر بیٹھا مزے میں سر جھکائے چلا جاتا۔ "بیٹیا سنگھاڑے والی کوٹھی نہیں چلے گا۔۔۔ ہے ہہ" وہ جھک کر دریافت کرتا۔

"یہ کہانی اب یہاں سے میں سنا رہی ہوں (طلعت نے کہا) داستان گوئی کے مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ میری سمجھ میں ایک طریقہ بھی نہیں آ رہا۔ کون کردار زیادہ اہم ہیں۔ قصہ شروع کہاں سے ہوا۔ جی ہاں۔ قصہ شروع کہاں سے ہوا۔ کلائمکس کہاں تھی۔ ہیروئن کون تھی اور اس کا انجام کیسا ہونا چاہئے تھا۔ ہیرو کون تھا۔ اس داستان کو سننے والا کون ہے۔ اور سنانے والا کون۔ میرا بڑا بھائی کمال ایک زمانے میں کہا کرتا تھا کہ ایک دن بیٹھ کر وہ یہ سب طے کرے گا۔ کمال اب تک کچھ بھی طے نہیں کر پایا۔ پھر چمپا باجی سے پوچھنے بھلا کون جائے۔ ہاں چلیں گے۔ میں گنگا دین کو جواب دیتی۔ فٹن آہستہ آہستہ کچی سڑک پہ رواں رہتی۔ یہاں ہُو کا عالم تھا۔ مکمل ابدی سناٹا۔ اسی راستے پر بہت آگے جا کر شمشان گھاٹ تھا۔ ندی کے پانی میں موتی محل کی روپہلی عمارت کے سائے لرزاں رہتے اور چھتر منزل کا سنہرا گنبد اور نجف اشرف کا امام باڑہ۔ ندی ان عمارتوں کی سیڑھیوں کے نیچے مؤدبانہ انداز میں بہتی رہتی۔ درختوں کی گھنی جھاڑوں میں پانی کی موجیں گہری سبز دکھلائی پڑتیں۔ کبھی کبھی اس ہریالی میں سے تیرتی ہوئی کوئی ڈونگی نکل جاتی۔ رنگ سرخ کے شاندار موتی محل برج کے نیچے مندر کے چبوترے پر بندروں کا اکھاڑہ جمع رہتا۔ سنگھاڑے والی کوٹھی کی سیڑھیاں بھی پانی میں اُترتی تھیں۔ یہ دو منزلہ عمارت تھی اور اپنی تین ہشت گوشہ برجیوں کی مناسبت سے سنگھاڑے والی کوٹھی کہلاتی تھی۔ یہ برجیاں کائی کی وجہ سے گہرے ہرے رنگ کی ہو چکی تھیں۔ برسات کے مہینوں میں یہ کائی اور ندی کا پانی اور آسمان، درختوں اور گھاس کا سبزہ یہ سب مل کر ایک معلوم ہوتا۔ جاڑوں میں یہاں ہلکے پیلے رنگ کی روشنی پھیلی رہتی۔ کہر آلود درختوں کے پیچھے سے سورج نکلتا۔ اور اس کی زرد لکیریں سارے میں تیرتی پھرتیں۔ جن میں آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کر

دیکھو تو رنگ برنگے ذرے اڑتے نظر آتے۔ چاند باغ جاتے ہوئے اور کوٹھوں میں ناکیں چھپائے لڑکیاں جلدی جلدی صنوبر کے جھنڈ کی اور بڑھتیں اور گھاس پر شبنم کے بڑے بڑے قطرے پیروں میں آکر ادھر ادھر لڑھک جاتے۔ جاڑوں میں شام کو سورج بہت جلد غروب ہو جاتا۔ چنانچہ فٹن بڑھتی ہوئی مدھم خنکی میں چھ سات بجے پل پر آجاتی۔ "بٹیا۔ — نرملا بٹیا کے یہاں نہیں چلیئے گا —؟" گنگا دین کوچ بکس پر بیٹھے بیٹھے کاہلی سے پوچھتا۔

اور پھر فٹن سڑک کے نشیب میں اتر کر ایک دریچے کے ساتھ سنگھاڑے والی کوٹھی میں داخل ہو جاتی۔

"یہ لو بھین تمہارا آمدنامہ دے گئے ہیں —" لاج برساتی کی چھت پر سے آواز لگاتی۔

بھین یعنی شنکر سریواستوا یونیورسٹی میں تھا اور فارسی میں ایم۔ اے کر رہا تھا۔ نرملا برجی میں کتھک کا کوئی نیا توڑا شروع کر دیتی۔ "اے — ذرا آکر جھپ تال تو بجا دینا۔" وہ برجی کے کسی دروازے میں سے منہ نکال کر کہتی۔

ان کی اماں ٹھاکر دوارے میں چراغ جلانے کے بعد دوسری برجی میں سے آواز دیتیں —

"اری باؤلیو — پہلے کھانا تو ٹھونس لیو —"

نرملا کی بڑی بہن لاج اطمینان سے آلتی پالتی مار کر برآمدے میں ندی کے رخ بیٹھ جاتی: "اب یہ بتلاؤ کہ گیان نے کسم کو کیا جواب دیا۔"

پیرس کالج کی سیاست شروع ہو جاتی۔ لاج وہاں سے ففتھ ایر پاس کر چکی تھی اور اب بی۔ اے کرنے کے بعد اس کا بیاہ ہو جائے گا۔

"راجکماری رسولپوری لاہور جا رہی ہیں —"

"لاہور —؟ ارے باپ رے باپ۔"

لاہور بہت دور تھا۔ بالکل دوسرا کرہ کہئے۔ ایسا ہی تھا جیسے کہہ دیجئے راجکماری

سنگاپور جا رہی ہیں۔

"افوہ —" گھنگرو باندھے باہر آ کر نرملا اظہارِ خیال کرتی۔ پہلے وہ بھی میرے ساتھ میرس کالج میں تھی۔ لیکن پچھلے سال جب وہ بیمار پڑی تو ڈاکٹروں نے کہا کہ اسکول اور میرس کالج کی دوہری محنت اس سے نہ کروائی جائے۔ اب ہماری دوست مالتی کے بڑے بھائی سورج بخش سری واستوا جو نابینا تھے اور میرس کالج کے اسٹاف پر تھے، شام کو آ کر اسے ایک گھنٹہ ریاض کرا دیتے تھے اور شمبھو مہاراج کے گھرانے کے ایک کتھک سے وہ ناچ سیکھ رہی تھی۔ لا مارٹینیر میں نرملا میری ہم جماعت تھی۔ ہم دونوں دو سال بعد سینئر کیمبرج کریں گے۔

"کتنی عجیب بات — یعنی ہم میں سے ایک لاہور جا رہا ہے — اسے داہ:" — اُس نے سوچتے ہوئے کہا "میرا بھی بڑا جی چاہتا ہے کہ انوکھی جگہیں دیکھوں" اُس نے گویا اپنے خطرناک ارادوں کا اظہار کیا۔

"پنجاب ہے نا — وہاں ان کی ایک یونیورسٹی بھی ہے۔ اس میں وہ ہونے والا ہے۔ وہ کیا ہوتا ہے۔ ارے بھئی اس میں سنا ہے میوزک کی کلاسیں کھلنے والی ہیں۔ اس میں راجکماری اپنے پڑھایا کریں گی مگر ابھی تو وہ اندرجیت کی شادی میں شرکت کرنے جا رہی ہیں۔"

اندرجیت کور دہرہ دون کی ایک سکھ لڑکی تھی اور کچھ دنوں کے لئے اس نے میرس کالج میں پڑھا تھا۔

ویسے یونیورسٹی صرف ایک تھی۔ بھکنڈے یونیورسٹی۔ باقی یہ جو انورسٹی یعنی کیننگ کالج تھا جس میں ہم سب کے بڑے بھائی اور بہنیں پڑھتے تھے وہ تو ایک قسم کا اندرلوک تھا۔ جہاں اپنا دماغ ہی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ الجبرا پر سے سر اُٹھا کر اکثر ہم لوگ حساب لگاتے ایک دو تین چار پانچ — پورے پانچ سال بعد ہم اس اندرلوک میں پہنچ سکیں گے۔ ابھی تو ہم نے ہائی اسکول بھی نہیں کیا تھا۔

"بڑے آغا صاحب نے آج گایتری بیگم کو پھر ڈانٹ پلائی۔"

"بھوری کی کلاس کے لئے لیلا دیدی آئی تھیں۔"

"سُنا ہے اب کے سے تھرڈ ایر کے ایکسٹرنل ایگزامنر وناٹک راؤ پٹوردھن ہوں گے۔"

"ارے ہائے — وہ بڑے سخت آدمی ہیں — وائیوا میں انھوں نے میرا بیڑا غرق کر دیا تھا۔" لاج کہتی۔

سارے ہندوستان میں میرس کالج کی طرح کا کوئی اور ادارہ نہ تھا۔ پانچ سال کلاس کا کورس تھا۔ ایم۔بی۔بی۔ایس کی طرح سخت۔ اس کے بعد کہیں جا کر بیچلر آف میوزک کی ڈگری ملتی تھی۔ اب اسے یونیورسٹی کا درجہ مل گیا تھا۔ اور یہ بھٹکنڈے یونیورسٹی آف ہندوستانی میوزک کہلاتا تھا۔ گیان، راج، لیلا، راجکماری، یہ سب لڑکیاں اب اسٹاف پر تھیں۔ تین سال قبل ریڈیو اسٹیشن کھلا تھا۔ یہ سب لوگ وہاں جاتے۔ کلاسیکل موسیقی اور ڈراموں کے لئے ریڈیو اسٹیشن سارے ملک میں مشہور تھا۔ گوہر سلطان ایک نئی دریافت تھی۔ یہ ایک پیاری سی نازک اندام قصباتی لڑکی تھی جو کوئل کی ایسی آواز میں گاتی۔ پھر نیاز فتحپوری کے داماد مجید نیازی تھے۔ طلعت محمود سے ابھی کوئی واقف نہ ہوا تھا۔ ارچنا لہری تھی۔ اور بہت سی بنگالی لڑکیاں۔ سورج بخش سری واستو تھے۔ پرنسپل رتن جھنکر۔ الیاس خاں اور جانے کون کون — ایک سے ایک پائے کا کلاکار پڑا تھا۔

"پر راجکماری ہم سب سے الگ اتنی دور جا کر بڑھیں ہو جائیں گی —؟" نرملا نے فکرمند ہو کر پوچھا۔

جب بھیّن اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جلسے کے لئے کراچی گئے تھے تو مجھے بھی سنگ لے گئے تھے — یاد ہے — ؟ لاہور تو اتنا دور بھی نہیں ہے —" لاج کہتی۔

"مجھے بھی دنیا گھومنے کا شوق ہے —" میں فوراً اپنے سمندری سفروں کا حوالہ دیتی۔ مگر کراچی کی سیاحت کی بات ہی اور تھی۔ میں رشک کے ساتھ لاج کو دیکھتی۔ "تم کو کیا پتہ اونٹ گاڑی کیسی ہوتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے۔" لاج رعب سے مطلع کرتی۔

ندی میں ڈوبتے سورج کی کرنیں اب رنگ برنگی لہروں پر چھم چھم کرتیں۔ ساری دنیا، کائنات، زندگی کے پیش منظر کا جو دھندلا سا اٹکل پچو خاکہ ہمارے ذہنوں میں تھا وہ ہمارے سامنے ان لہروں پر ناچا کرتا۔ شاہی کے زمانے کی عمارتیں (ہم خود شاہی کے زمانے کی ایک عمارت میں موجود تھے) دور سنگ سرخ کا پل، بوٹ کلب کی ڈونگیاں، سنگھاڑے والی کوٹھی کی محفوظ کائی آلود سیڑھیاں، جغرافیہ کے ماہرین کی طرح ہم دماغ پر زور ڈال کر سوچتے اس کے آگے کیا ہے — اور کیا کیا ہوتا ہے

"اپی بڑا ہو کر کہاں جائیں گی"— اکثر زملا کچھ سوچتے سوچتے عجیب سے سوال کر بیٹھتی۔

"وہیں جائیں گی جہاں بھیّا صاحب لے جائیں گے — اور کہاں جائیں گی۔" میں جھنجھلا کر جواب دیتی۔

"بھیّا صاحب کہاں جائیں گے —"

"کیا معلوم —" میں بست پٹا جاتی۔

(اب کمال اپنے کونے میں سے اُٹھ کر باہر آیا اور بالکنی کے ایک ستون سے ٹک گیا۔ گویا طلعت کی بات ختم کرنے کا انتظار کرتا ہو۔ اس کے بعد اس نے گویا کیو لے کر کہنا شروع کیا)

"بھیّا صاحب جو میرے چچا زاد بھائی تھے میرے بہنوئی بھی ہو سکتے تھے۔ بچپن سے میں یہی سنتا چلا آیا تھا۔ بھیّا صاحب جب جوان ہو کر لکھ پڑھ کر بڑے آدمی بن جائیں گے۔ تب اپی کو بیاہ کر لے جائیں گے۔ میرا کوئی سگا بھائی نہ تھا۔ میں بچپن سے

بھیا صاحب پر عاشق تھا۔ وہ میرے ہیرو تھے میرے لئے گیری کوپر اور اشوک کمار سے اونچا درجہ رکھتے تھے۔ بھیا صاحب نے مجھے سینئر کیمبرج کے امتحان کے لئے مار مار کر ریاضی پڑھائی تھی۔ ان کی دل سے اتری ہوئی ٹائیاں میں بڑے چاؤ سے خود پہن لیتا تھا بھیا صاحب جو کتابیں پڑھتے وہی میں پڑھتا۔ ان کو بیٹی ڈیوس سے نفرت تھی۔ میں نے بھی بیٹی ڈیوس کے فلم دیکھنے سے توبہ کر لی۔ پہلے وہ فارورڈ بلاک ہیں تھے۔ مجھے نیتاجی کا فلسفہ سمجھایا کرتے —————— میں بھی ان کے ساتھ جلسے جلوسوں سے واپس آ کر رات کو سوتے میں انقلاب زندہ باد کے نعرے لگایا کرتا۔ پھر جب بھیا صاحب نے مقابلے کے امتحانوں میں بیٹھنا شروع کیا میں نے اس کا اہتمام کیا کہ ان کی پڑھائی میں خلل نہ ہو۔ ان کے کمرے کی طرف کوئی نہ جائے۔ وہ عموماً لان پر بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔ سیمل کے درخت کے نیچے۔

بھیا صاحب برسوں سے ہمارے یہاں رہتے آئے تھے۔ دراصل کسی کو اس کا احساس نہ تھا کہ 'ہمارے یہاں'، 'ان کے یہاں' سے مختلف کوئی چیز ہے۔ جب چچا ابا کا سوئٹزرلینڈ میں اچانک انتقال ہو گیا۔ وہ بھیا صاحب سے ملنے وہاں گئے ہوئے تھے۔ اس وقت بھیا صاحب لوزان کے ایک اسکول میں پڑھتے تھے ان کو سوئٹزرلینڈ سے واپس بلا لیا گیا۔ بھیا بمبئی سے سیدھے ہمارے یہاں الموڑے پہنچے تھے۔ ابا میاں ان دنوں الموڑے میں تعینات تھے۔ برساتی میں وہ فل بوٹ پہنے کھڑے تھے۔ اپنے سوئس اسکول کے سبز اور سیاہ دھاریوں والے مفلر میں ان کا چہرہ تقریباً چھپا ہوا تھا۔ ان کی آنکھوں کے پپوٹے روتے روتے سوج گئے تھے اور ان کی ناک سرخ ہو رہی تھی اپنے امنڈتے ہوئے آنسوؤں کو روک کر انھوں نے مجھے اور آپی کو اپنے قریب بلایا اور ہم دونوں کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ طلعت اس وقت بہت چھوٹی تھی اور گھر کے دوسرے بچوں کے ساتھ الائچی کے درخت پر چڑھی ہوم ورک کر رہی تھی۔

الائچی کا درخت ہم لوگوں کی زندگیوں میں خاص اہمیت رکھتا تھا۔ یہ میپلو کے برآمدے کے

قریب تھا اس کے عین سامنے لان تھا۔ اس درخت پر بیٹھ کر ہم اسکول کا کام کرتے۔ اکثر کھانا بھی وہیں کھاتے۔ جاڑوں میں اسی کے نیچے اسنو مین بنایا جاتا۔

اس کے بعد سے بھیا صاحب مستقلاً ہمارے یہاں رہنے لگے۔ بابا ان کو دیکھ کر جیتے تھے۔ ممی ان پر عاشق تھیں۔ اُن کی امی کا انتقال بہت پہلے ہو چکا تھا......
سارا کنبہ، ساری برادری، سارا قصبہ ان کے نام کی مالا جپتا۔

بھیا صاحب چچا ابا مرحوم کی اکلوتی اولاد تھے۔ ہمارے آبائی قصبے کلیان پور میں جو گھاگرا کے کنارے آباد تھا۔ تالاب کے کنارے ایک پھونس کا بنگلہ تھا جس میں چچا ابا کبھی کبھی آکر رہا کرتے تھے۔ بھیا صاحب بھی یورپ سے لوٹ کر جب قصبے پہلی بار گئے تو اس بنگلے میں جا کر رہے۔ یہ بنگلہ چھوٹی بارہ دری کہلاتا تھا اور اس کے برآمدے میں بیٹھ کر بھیا صاحب موٹی موٹی کتابیں پڑھا کرتے۔ خاندان کو ان سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ یہ بھی اپنے مرحوم بابا کی طرح نام پیدا کریں گے۔ بڑے آدمی کہلائیں گے۔

گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد بھیا صاحب لا مارٹینز کالج میں داخل کر دیئے گئے۔

جو ڈیڑھ سو سال قبل نواب آصف الدولہ کے مقرب خاص جنرل کلاڈ مارٹن فرانسیسی کے روپے سے یوروپین لڑکوں کے لئے قائم کیا گیا تھا۔

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس داستان کے ہیرو کیا بھیا صاحب ہیں — ؟ میں کہانی سنانے بیٹھا ہوں تو کرداروں کے متعلق بھی تو طے کرتا چلوں۔ سوچتا ہوں۔ بھیا صاحب میں ہیرو والی ساری خصوصیات موجود تھیں۔ اب تک جو کچھ میں نے تمہیں بتلایا ہے تم سمجھ دار ہو خود ہی تم نے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ ایسا رومانی پس منظر ہیرو کے علاوہ اور کس کا ہو سکتا ہے۔ لازمی بات ہے کہ ہیرو لوگ چارلس بوائیر ہوتے ہیں۔ اگر تم قدامت پسند تماشائی نہیں ہو تو تم کو یہ جان کر بڑی جھنجلاہٹ ہو گی کہ بھیا صاحب بھی بہت خوبصورت

تھے۔ مجھے ڈرتے ڈرتے نہایت افسوس کے ساتھ اطلاع دینی پڑتی ہے کہ بھیا صاحب عین مین چارلس بوایر تھے۔ فرانس اور سوئیٹزرلینڈ کے اسکولوں میں پڑھنے کی وجہ سے شروع شروع میں ان کا لب ولہجہ بھی بالکل فرانسیسی تھا جب وہ 'ت' اور 'د' کے تلفظ کے ساتھ رُک رُک کر انگریزی بولتے تو مت پوچھو کہ کس طرح ازابلا تھوبرن کالج کی لڑکیوں کے دلوں پر چھریاں چلتیں۔

"رہیں اپّی۔ تو وہ اس افسانوی قسم کی عم زاد بہن قطعی نہیں تھیں جو اپنے اس طرح کے کزن لوگوں کے لئے پکوان بناتیں۔ پاپڑ اور رنگتیں وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے مشغلے میں نے اردو افسانوں میں پڑھا ہے کہ مسلمان عم زاد بہنوں کے ہوتے ہیں۔ اپّی لامارٹینز گرلز ہائی اسکول میں پڑھتی تھیں جو نجف اشرف کے قریب ندی کے دوسرے کنارے پر خورشید منزل میں تھا۔ پہاڑی کی ڈھلوان پر خورشید منزل کی اونچی عمارت جو نواب سعادت علی خاں نے ڈیڑھ سو سال گزرے اپنی بیگم خورشید زادی کے لئے بنوائی تھی۔ اس کے چاروں اور خندق تھی اور یوروپین وضع کے کنگورے سال کے بارہ مہینے پھولوں اور درختوں کی ہریالی میں چھپے رہتے۔ گہرے نیلے آسمان کے مقابل میں اس کے اونچے کنگورے اور برجیاں دور سے بڑی واضح نظر آتیں اور ایسا جان پڑتا جیسے اٹھارویں صدی کے کسی لینڈ اسکیپ مصوّر کی مدھم خوشگوار شفاف رنگوں والی بڑی سی پینٹنگ منقش چوکھٹے میں جڑی سامنے دھری ہے۔ اکثر جب بنارسی باغ کی اور جاتے ہوئے پل سے اتر کر اس اسکول کے سامنے کی خاموش سایہ دار سڑک پر سے گزرتا تو اپّی مجھے قلعے کے کسی دریچے میں کھڑی کسی لڑکی سے باتیں کرتی نظر آتیں۔ اس منظر میں بڑا ناقابلِ بیان سکون رچا تھا۔

بھیّا صاحب ہرے بھرے کنجوں، طویل بل کھاتی شفاف سڑکوں اور باغات کے اس سلسلے کے دوسری طرف لڑکوں کے لا مارٹینز کالج میں پڑھتے تھے۔ کالج کے وسیع تالاب کے کنارے وہ اپنے انگریز ہم جماعتوں کے ساتھ کوئی کتاب ہاتھ میں لئے آہستہ آہستہ فرانسیسی لہجے میں باتیں کرتے ٹہلتے یا کبھی کبھی کسی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑتے اُن کی

طبیعت میں جو دھیما پن جو کھوئی کھوئی اداسی تھی۔ اُس نے ان کو اور زیادہ رومینٹک بنا دیا تھا۔ دیکھیے۔ میں عرض کروں۔ مجھے اس لفظ رومینٹک سے دلی نفرت ہے۔ یہ میں کوئی خواتین کے رسالے کے لیے بالاقساط ناول نہیں لکھ رہا ہوں جس میں سوا چاندنی رات اور گلاب کے شگوفوں اور رومانس کی موسیقی کے اور کچھ نہیں ہوتا اور جن کا ہیرو اچھا خاصا ہسپانوی بُل فائیٹر نظر آتا ہے۔ اسے حسنِ اتفاق کہئے اور بحیثیت قصہ گو میری بدقسمتی کہ بھیا صاحب فرانسیسی لہجے میں بات کرتے تھے اور لامارٹینر میں پڑھتے تھے اور دھیمی دھیمی آواز میں ہنستے تھے۔

سینئر کیمبرج کے بعد بھیا صاحب انٹرمیڈیٹ کے لئے کالون تعلقہ دارز کالج میں آگئے۔ جو ہمارا خاندانی کالج تھا اور جہاں ہمارے گھرانے کے افراد کئی پشتوں سے پڑھتے چلے آرہے تھے۔ میرے اور ہری شنکر کے باپ دادا سب نے یہیں پڑھا تھا۔ یہاں بھیا صاحب دوسرے ڈکیڈنٹ رئیس زادوں کے ہمراہ شہسواری کرتے اور ستار بجاتے سال بھر بعد وہ سڑک عبور کر کے کیننگ کالج میں داخل ہوگئے اور کئی برس تک یونیورسٹی کے ورنداون کے کنہیا بنے رہے۔

اپی اور بھیا صاحب ایک دوسرے کے معاملات میں دخل نہیں دیتے تھے۔ ان دونوں کی الگ الگ ٹیمیں تھیں۔ اپی بھیا صاحب کے دوستوں میں کیڑے ڈالتیں۔ یہ اپی کی سہیلیوں کی نقلیں اُتارتے۔ ان دونوں میں ہمیشہ تلے اُوپر کے بہن بھائیوں کی طرح لڑائی ہوا کرتی۔ لاج وتی سریواستوا، اپی کی سب سے پیاری گوئیاں تھیں۔ یہ میرے جیتے جان کے ٹکڑے دوست ہری شنکر کی بہن تھی۔ جانے کیوں۔ پر اکثر ایسا ہوا کہ کہ چمپا باجی کا ذکر سنتے ہی لاج ایک دم چُپ ہو جاتی۔ اپی بے پروائی سے بیٹھی ہنستی رہتیں ہری شنکر بے وقوفوں کی طرح سگریٹ سلگانا شروع کر دیتا۔ چمپا باجی ہم میں سے کسی کی ٹیم میں شامل نہ تھیں۔ یہ سب سے الگ تھیں۔ ہمارے لئے کافی اجنبی تھیں۔ ہم سب جنم جنم سے ایک دوسرے سے منسلک تھے۔ ایک ہی پس منظر اور ایک ہی طبقے سے تعلق رکھتے تھے چمپا باجی کے پس منظر سے ہمیں واقفیت نہیں تھی۔ مجھے اکثر یہ قوی شبہ ہوا کہ چمپا باجی مڈل

کلاس ہیں۔

جب بھیا صاحب لا کر رہے تھے اس وقت چمپا باجی نے بنارس سے آکر ازابلا تھوبرن کالج میں داخلہ لیا۔

یہ سن انیس سو اکتالیس عیسوی تھا۔

اپی لا مارٹینز اسکول سے ازابلا تھوبرن کالج آچکی تھیں۔ بھیا صاحب ایک کے بعد معرکے سر کرتے رہے۔ یونیورسٹی کی محفلیں۔ سوسائٹی کے ڈرائینگ روم ہر میدان میں ان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی میں ان کے اے ڈی سی کی طرح ساتھ ساتھ لگا رہتا نہایت عقیدت سے ان کی ہاں میں ہاں ملاتا

جس سال اپی نے تعلیم ختم کی اسی سال بھیا صاحب اور اپی کی شادی کی بات ٹوٹی۔

اب میں من میں ایک بات سوچ رہا ہوں۔ وہ بات یہ ہے کہ جس طرح جس تفصیل اور وضاحت سے میں اس زمانے کی یہ کہانی دہرانا چاہتا ہوں۔ اس میں کامیاب نہ ہو سکوں گا بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں — بادشاہ باغ کا شاہی کے وقت کا پھاٹک جس میں یونیورسٹی پوسٹ آفس تھا۔ پھولوں کے تختے۔ سڑک پر سے گزرنے والی کہاریں۔ وہ بوڑھیا جو سرخ لنگا پہنے دوپہر کو سنسان سڑک پر املیاں چنا کرتی تھی اور جو ایک روز ٹرین کے نیچے آکر مر گئی۔

ان سب چیزوں کی میرے لیے بے اندازہ اہمیت ہے۔ تم کو یہ تفصیلات بے معنی اور شاید مضحکہ خیز بھی معلوم ہوں گی چھی تو کہانی سنانا کوئی آسان کام نہیں۔ پلاٹ کا توازن، مکالمات کی برجستگی۔ غیر ضروری جزویات سے احتراز۔ یہی سب تو فن افسانہ نگاری کی تکنیک کہلاتا ہے اور کیا تکنیک میں کوئی ہاتھی گھوڑے لگے ہوتے ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ کوئی ایسا طریقہ ہو کہ جس سے اس فضا، اس ماحول اور اس وقت کا سارا تاثر، ساری تاب آگیں کیفیت دوبارہ لوٹ آئے کسی طرح تمھارے ذہن میں منتقل ہو جائے۔ یہ کمیونی کیشن کہلاتا ہے اور بڑی مشکل چیز ہے۔ میں آرٹسٹ نہیں ہوں

کمیونی کیٹ نہیں کر سکتا۔ طلعت شاید اب کر سکے۔

بہرحال تفصیلات ملاحظہ ہوں:

یہ دیکھئے۔ یہ بینٹ ہال ہے۔ میں اس کی ایک اونچی شہ نشین میں بیٹھا ہوں اور ریڈیو کے لیے کانووکیشن کی کومنٹری سنا رہا ہوں۔ نیچے وسیع و عریض کواڈرینگل میں سیاہ کیپ اور سیاہ گاؤن میں مخلوق ادھر ادھر چل پھر رہی ہے۔ سرسبز گھاس کے قطعے اور سرخ اور زرد کینا اور لالہ کے تختے۔ سنگ سرخ کی فلک بوس عمارات کے سائے سارا یلیں اور سیاہ چغوں اور فیکلٹی کے زرتار منقش لبادوں کے سارے رنگ آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ وقت تیزی سے اڑتا جا رہا ہے۔ اس کی پرواز کی سنسناہٹ میرے کانوں میں آ رہی ہے۔ نیچے گھاس پر بہت سارے لوگ جمع ہیں اور موٹروں کی قطاریں کھڑی ہیں۔ بھیا صاحب نیچے سرخ قالینوں والے طویل راستہ کے کنارے کنارے چمپا باجی کے ساتھ ساتھ چلتے دوسرے کواڈرینگل کی طرف جا رہے ہیں۔ جدھر ایٹ ہوم کے لیے سینکڑوں سفید میزیں بچھی ہیں لاؤڈ اسپیکر پر جینٹ میوتھیٹرز کا نیا ریکارڈ لگا دیا گیا ہے۔

"یہ کوچ کے وقت کیسی آواز" پہاڑی سانیال کی آواز سائے میں گونجتی جا رہی ہے۔ پہاڑی سانیال بادامی ریشمیں کرتا پہنے دھوتی کا لمبا پلو ہاتھ میں سنبھالے میرٹن کالج والوں کے ساتھ کرسیوں کی ایک قطار میں بیٹھے ہیں اور ہنس ہنس کر کسی بنگالی لڑکے سے باتیں کر رہے ہیں۔ دوسری طرف ازابلا تھوبرن کالج کی لڑکیوں کا پرا اپنے امریکن اسٹاف کے ساتھ گھاس پر سے گزر رہا ہے۔ سامنے سے وائس چانسلر حبیب اللہ آ رہے ہیں۔ ان کے ساتھ بہت سے جغادری پروفیسر اپنی اپنی قبائیں پہنے راستے پر رواں ہیں۔ ایک دن ایسا ہوگا جب ان انسانوں میں سے ایک باقی نہ بچے گا۔

اب میں مائیکروفون اپنے پوچھنے منتر ہری شنکر کے ہاتھ میں دیتا ہوں۔ ہلو— میری آواز آ رہی ہے — ہلو—

ہلو— ہاں —

ہری شنکر نے جو لیمپ کے پیچھے اندھیرے میں چھپا بیٹھا تھا۔ جواب دیا۔ اور اپنا

معلوم ہُوا جیسے اسٹیج کے باہر سے اس کی آواز مائیک پر گونجتی ہوئی آ رہی ہو ۔ وہ خود نظر نہیں آ رہا تھا)

" ہلو ۔ ہلو ۔ میں ہری شنکر، اب آپ سے بات کر رہا ہوں ۔ میں ہری شنکر سریواستو کمال کا ہمزاد ۔ لاج اور نرملا کا اکلوتا بڑا بھائی ۔ چمپا باجی کا رفیق ۔۔۔ میرا کردار بھی خاصا اہم ہے ۔ میرے کردار کے بہت سے پہلو ہیں ۔ میں کہانی میں اتنے سارے مختلف رول ادا کر رہا ہوں ۔ میں بات کس طرح شروع کروں ۔ اسٹیج پر کیسے داخل ہوں ۔ یہ بڑا گھپلا ہے ۔

سامنے وسیع سبزہ زار ہے ۔ ہزاروں لاکھوں پھول گھاس پر کھلے ہیں ۔ گلاب ۔ لالہ ۔ سویٹ پی ۔ درختوں کی ہری اور نارنجی پتیاں جاڑوں کی سنہری دھوپ میں جھلملا رہی ہیں ۔ اپی اپنا گاؤن پہنے اپنے ساتھ کی لڑکیوں کے ساتھ اگلی قطار میں جا بیٹھی ہیں ۔ بھیا صاحب اور چمپا باجی آم کے درخت کے نیچے کھڑے بڑی مصروفیت سے کسی دوست سے گفتگو میں محو ہیں ۔ کیننگ کالج کے وسیع کواڈرینگل میں چاروں اور قالین بچھے ہیں اور صوفے اور سرخ قالینوں والے راستے ایک عمارت سے دوسری عمارت تک جا رہے ہیں ۔ اب مجمع کم ہو گا ۔ شام کو لڑکیوں کے غول اپنی تصویریں کھنچوانے حضرت گنج جائیں گے لڑکے قہوہ خانے میں اکٹھے ہوں گے ۔ یہ یہاں کی پرانی ریت ہے ۔ ہر سال یہی سب ہوتا ہے ۔ پھر ان موقعوں کے گروپ فریم کر کے دیواروں سے لٹکا دئیے جاتے ہیں اور وقت گزرتا ہے اور اُن کے کاغذ پیلے پڑ جاتے ہیں ۔

کمال نے شاید آپ کو بتایا ہو گا ۔ میں اس کا بڑا چہیتا دوست ہوں ۔ اس کی بہن تہمینہ سے جسے گھر میں اپی کہا جاتا ہے ۔ مجھے اتنی ہی محبت ہے جتنی لاج اور نرمل سے ۔ لیکن میرا اور کمال کا اپی کے لئے دوڑ بھاگ کرتے کرتے ناک میں دم آ جاتا ہے ۔ اللہ ہری شنکر ہمارے لئے باٹا سے یہ جوتوں کی جوڑی بدلواتے لانا ۔ اے میاں ذری آج امین آباد جاؤ تو حاجی صاحب سے کہنا ہمری ساری کب تلک رنگ کر دیں گے ۔۔۔ اے جناب حضرت گنج جاتے ہیں ؟ ذرا ہمارے اور لاج کے لئے ماری واٹو سکا کے دو ٹکٹ خرید لائیے گا ۔

"خدا کے لئے اپی آخر تمھاری وہ سائیکل کس مرض کی دوا ہے۔ ایسی کاہلی بھی کس کام کی۔" میں بعض دفعہ جھنجھلا کر کہتا اور اتنی بڑی جہازی موٹر جو گیراج میں پڑی جھک مارتی ہے وہ کس دن کام آئے گی۔ اتنی گھام میں ایسی ایسی بیگار کروا کے ہم مزدوروں کا خون پسینہ ایک کرواتی ہو۔"

"اے بھیّن — میرس کالج جا کر گیان سے ملنا اور اس سے کہنا کہ نیڈل ورک کا وہ والا نمبر بھجوا دے جس میں —" لاج کھڑکی میں سے سر نکال کر حکم چلاتی۔

"لاحول ولا قوۃ۔" غصے کے مارے دل چاہتا کہ ان دونوں چڑیلوں کی چٹیا پکڑ کر گھسیٹتا ہوا ندی تک لے جاؤں اور پانی میں ڈبو دوں۔

اگر مر گئیں تب بھی دونوں کے بھوت آ کر نیڈل ورک کے رسالوں اور سینما کے ٹکٹوں کی فرمائش کیا کریں گے۔

میں ایک پیر سائیکل پہ رکھتے ہوئے دوسرا برساتی کی سیڑھی پہ ٹکا کر سگریٹ جلاتا اور اداسی سے دونوں کو دیکھتا رہتا۔

"میرا لائبریری کارڈ ہی کہیں گم ہو گیا۔ شنکر میاں، ٹیگور لائبریری تک جا کر —" اپی اطمینان سے گھاس پہ بیٹھے بیٹھے آواز دیتیں۔ اب وہ یونیورسٹی میں پہنچ چکی تھیں اور ہماری مصیبتوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔

"بھیّن، آج شام کو پکچر نہیں دکھلاؤ گے —" لاج اپی کی شہ پا کر بولتی۔

"چپ رہ چڑیل۔" میں غراتا۔

"اچھا ہے۔ ڈانٹ لو غریب کو۔ بچاری چار دن کے لئے نیہر میں مہمان ہے" اپی بڑی رقت خیز آواز میں کہتیں۔

"اور کیا — کر لو کمینہ پن۔ —" لاج حوض کی منڈیر پہ بیٹھ کر پیر ہلاتے ہوئے سوں سوں کرتی۔

"ہم کوئی چمپا باجی ہیں جو ہم کو کافی ہاؤس لے جا کر آئس کریم کھلاؤ۔ ہم تو بچاری لاج اور اپی ہیں —"

"چمپا باجی۔ — ان کا کیا ذکر ہے۔" میں ہڑبڑا کر کہتا اور پیڈل پر زور سے پیر مار کر زناٹے کے ساتھ برساتی کے باہر نکل آتا۔

اکثر شام کو اپّی اور کمال کی چھوٹی بہن طلعت میرس کالج سے لوٹتے میں میرے گھر پر رک جاتی۔ میں اپنی برجی کی کھڑکی میں سے نٹن کو اپنی کوٹھی کی طرف بڑھتے دیکھتا۔ سڑک پر عمیق سناٹا طاری ہوتا اور اداسی۔ اور موسم کے سارے پھولوں کی مہک۔ ندی کے پانی کی پُرسکون لرزہ خیز موسیقی میرے کانوں میں پہنچتی اور جانے کاہے سے میرا دل دھڑک اٹھتا میرا ہمزاد کمال کہتا تھا کہ کبھی کبھی وہ بھی چونک پڑتا ہے۔ اسے بھی بہت ڈر لگتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ہمارے دماغوں کی ایک ایک چول ذرا ڈھیلی تھی۔"

"جب ہم دونوں کسی سفر سے لوٹتے تو صبح صبح ہلکے خنک دھندلکے میں سندیلے کا چھوٹا سا اسٹیشن آتا تھا (کمال نے کہنا شروع کیا) "یہاں لڈو ہوتے ہیں!"

شنکر نے خیال ظاہر کیا۔ عین اسی وقت لڈو سندیلے والے کی صدا سنائی دی۔ سُرخ بجری والے پلیٹ فارم پر نستعلیق قصباتی شرفاء انگرکھے، دو پلی ٹوپیاں سفید ڈھیلے ڈھالے پاجامے اُجلی دھوتیاں پہنے دوسری ٹرین کے انتظار میں اطمینان سے ٹہلتے تھے۔ پلیٹ فارم کے کنارے چند باکیاں رکھی تھیں۔ سُرخ بجری اور سفید پھولوں سے گھرا ہوا اسٹیشن جس کے عقب میں آم کے باغات تھے۔ باریک سُرخ کاغذ میں لپٹی ہانڈیوں میں رکھے ہوئے لڈو بیچنے والوں کی صدائیں۔ دور سُرخ چادر اوڑھے کوئی لڑکی بدا ہو کر چھکو چھکو روتی اسٹیشن کے پھاٹک کی اور جا رہی تھی۔ اُس کے آگے آگے تین چار دیہاتی چل رہے تھے۔ دولہا نے ہلدی کے رنگ کا جوڑا پہن رکھا تھا۔

میں نے برتھ پر لیٹے لیٹے ذرا سر اونچا کر کے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ پھر گھڑی پر نظر ڈالی۔ اوپر کی برتھ پر سے شنکر نے آواز لگائی —

"میں ذرا بھیرو کا ریاض کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم بُرا نہ مانو —"

"میاں تم کو کون منع کر سکتا ہے۔ تم بھیرو چھوڑو —"

"آ — آ — رے — رے — دھاپا — گا — اوہو — ہو — جاگو

— جاگو — ارے بھائی جاگو موہن —" اُس نے دہاڑنا شروع کیا۔

"لاحول ولا — کس قدر ایلی منٹری بھیرو — یہ والا بھجن تو فرسٹ ایر میں سکھلایا جاتا ہے۔" میں نے کروٹ بدل لی۔" اور دوسری بات یہ کہ میں ذرا چند لڈو کھانا چاہتا ہوں۔" میں نے اظہارِ خیال کیا۔" اے میاں — اے بھائی — جہنم میں جائے تمہارا ریاض۔ تم خود کسی دن مجھ سے یہی چیز دُرت میں سُننا — اے بھائی —" میں نے آدھی بات شنکر سے کہنے کے بعد پھر لڈو والے کو آواز دی۔

"کہئے مہربان —" لڈو والے نے کھڑکی میں سے اندر جھانک کر نہایت شائستگی سے دریافت کیا۔

"جاگو — ہی ہی — ارے کیا مُرکیاں لیتا ہوں۔" شنکر چنگھاڑتا رہا۔

"ذرا دماغ پر زور ڈالو اور تصوّر کرو کہ برابر والے ڈبّے سے ایک مدھر تان بلند ہو — ہو گوال بال سب گئین چراوت —"

اُس نے انترہ اُٹھایا

"تمہرے درس کو بھُوکے ٹھاڑے —" میں نے غصّے کے ساتھ گرج کر آواز ملائی۔

"میاں شنکر یہ باتیں محض افسانوں میں ہوتی ہیں۔ تم نے کانن کا وہ نیا فلم دیکھا ہے۔ "جوانی کی ریت"۔ کہ ع

موہے ان بن یہ جلسہ سہائے نہ"۔

"کہاں دیکھا۔ ہم تو مرزا پور میں بیٹھے جھینک رہے تھے۔"

"کیوں گپ مارتا ہے بے — مرزا پور میں جھینک رہے تھے۔

تم مجھے نہ بھیجو وہاں جھینکنے کے لئے —" میں نے غصّے سے کہا۔

"چلا جا بھائی بلّلہ تو ہی چلا جا — اور میری جان بخشی کر —" اُس نے ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔

یہ مجھے معلوم تھا کہ گپ ہانکنا ہے نامعقول۔ خود ہی خود بر دکھوے کے لئے وہاں پہنچ گیا تھا اور مجھ پر رعب جھاڑ رہا تھا۔ میں ساری چھٹیاں اکیلا مسوری میں بور ہوتا

رہا۔ اور ہری شنکر سریواستوا نفٹے کہ مرزا پور میں بیٹھے کجریاں الاپ رہے تھے۔ اب پچھلے ہفتے اماں بیگم کا خط پہنچا کہ فوراً لوٹو۔ کلیان پور سے اپّی بھی لوٹ کر آ رہی تھیں۔ یونیورسٹی کھلنے میں ابھی ایک ہفتہ باقی تھا مگر گھر میں ایک کرائسس درپیش تھا۔ اماں بیگم نے لکھا تھا کہ خدا خدا کر کے بھیّا نے بیاہ کے لئے ہاں کر دی تھی۔ سب کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے کہ بھیّا نے ہاں کی تو لڑکی ندارد۔ اطلاع ملی کہ اپّی نے انکار کر دیا ہے اب گھر پر ہائی کمانڈ کا اجلاس ہونے والا تھا۔ شنکر بھی مرزا پور سے لوٹ آیا تھا اور لاج کے میاں سے ملنے کے لئے دلّی پہنچا ہوا تھا۔ میں نے مسوری سے اس کو تار دیا۔ مُراد آباد کے اسٹیشن پر وہ مجھ سے آن ملا۔

"بھیّا کی شادی کا کیا ہوگا۔"

"پتہ نہیں۔ لاج نرمل سے پوچھنا کوئی لونڈیا ہے ان کی نظر میں۔ یہ اس قدر لڑکیاں دُنیا بھر میں بھری ہُوئی ہیں مگر وقت پر کوئی نہیں ملتی۔"

"چمپا باجی بھی لکھنؤ پہنچ گئی ہونگی۔ کیلاش ہوسٹل ہی میں رہیں گی نا۔" شنکر نے یکلخت بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"پتہ نہیں۔" میں چُپ ہو گیا۔ "لاؤ ایک بیڑی دیو۔" میں نے کچھ دیر بعد خالص بکنے والوں کے لہجے میں اس سے کہا۔ اس نے خاموشی سے سگریٹ کیس اُوپر سے پھینک دیا۔ میں پھر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔ اب ہم تیزی سے شہر کی اور آ رہے تھے عالم باغ شروع ہو چکا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میرا دماغ دراصل ایک قسم کا بھانمتی کا پٹارا تھا۔ میں بہت سی باتوں کو الگ الگ کر کے ان پر غور کرنا چاہتا تھا مگر وہ پھر گڈمڈ ہو جاتی تھیں۔

چمپا باجی اس میں ایک ڈسٹرب کرنے والے عنصر کی حیثّیت سے شامل ہوتی تھیں۔ میں ان کو نظر انداز کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اس سمے کسی چیز کی ضرورت نہ تھی بجز ایک سندیلے کے لڈو کے۔ میں نے شنکر سے کہا یہ لڈّو دیکھو۔

"سمایت ہوئے ۔" اُس نے اطمینان سے مُنہ چلاتے ہوئے کہا۔" کیا چمپا باجی نے منگوائے تھے ۔؟"

"وہ مجھ سے کون سی چیزیں منگواتی ہیں۔ میں کوئی بھیّا صاحب ہوں ۔"

"ہاں یہ بھی ٹھیک کہتے ہو ۔" شنکر نے عقلمندی سے کہا۔" تم بھیّا صاحب نہیں ہو میں کمال رضا نہیں ہوں۔ اپی چمپا باجی نہیں ہیں۔ ہم سب الگ الگ ہستیاں ہیں۔ ہم اپنے اپنے دائروں میں زندہ رہیں گے ۔"

"یہ ویدانت کا ریکٹ مت چلاؤ سویرے سویرے ۔" میں نے غصّے سے کہا

"اچھا ۔ لڈّو لیو ۔"

"تمھاری تو بڑی خاطریں ہوئی ہوں گی مرجا پور میں ۔" میں نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا ۔

"ہاں آں ۔ ہوئی تھیں ۔" اُس نے بے تعلقی سے جواب دیا۔" مگر خاطریں تو ہماری گورکھپور میں ہوئی تھیں پچھلے سال ۔"

یہ شنکر کا باقاعدہ کریر بنتا جا رہا تھا۔ ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں کہیں نہ کہیں بر دکھوے کے لئے بلایا جاتا تھا۔ ٹھاٹھ تھے بھائی کے ۔

"اب تو لاج کو بدا کرکے بندہ چین کی بنسی بجائے گا۔" اس نے آرام سے لیٹتے ہوئے اظہارِ خیال کیا۔

"کمینے ۔ بہن کو بدا کرتے سے بجائے اس کے کہ روؤ، بیٹھے خوش ہو رہے ہیں کہ اب فرصت ہے لونڈیوں میں گھومنے کی۔ یہ تمھارا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا ریکٹ فراڈ ہے سارا کا سارا ۔ اس ہیرا وتی پانڈے کا کیا ہوا ۔"

"اور میں تم سے سوال کر سکتا ہوں کہ لاہور میں جو آپ وہاں کی ترقی پسند لڑکیوں سے بھائی چارہ کر رہے تھے پچھلے سال اور وہ الٰہ آباد میں جو تھی رشو لیلا بہادری ۔ اور ۔"

"میاں کیوں دل کو جلاتے ہو صبح صبح ۔"

"اور کلکتے میں جو ہے وہ — کیا نام ہے اس کا — مدھر لیکھا موجو مودودر"
— شنکر نے ہونٹوں کی مخروطی شکل بنا کر بنگالی لہجے میں کہا۔
"جبھی تو لاج اور راپتی کہتی ہیں کہ ہم لوگ سخت چڑچڑ قناتی ہیں —"
میں نے اعتراف کیا —
شنکر دفعتہً بڑا اداس ہو گیا "— دیکھو بہنیں ہیں —" اس نے کہا —" اور وہ جدا ہو جاتی ہیں —"
ہاں۔ میں چُپ ہو گیا۔
لاج نے مجھ سے کہا تھا۔ کمال بھیا — چمپا باجی، ایسی لڑکی ہیں مجھے لگتا ہے۔ جیسے ان کی وجہ سے بہت سے لوگ بہت دُکھی ہوں گے۔ لاج میں یہ پتا جس جانے کہاں سے آ گیا تھا۔ لڑکیوں کی تھاہ کون پا سکتا ہے بھلا —
"شنکر —"
"ہاں یار —"
"ہفتے کے روز — ریڈیو پر یونیورسٹی کا پروگرام ہے —"
"ہوا پور یونیورسٹی کا کانوکیشن —"
"ہاں یار —"
"تزئین دریافت کریں گی اسکرپٹ مکمل کیا یا نہیں"
"اسکرپٹ چمپا باجی کے پاس ہے — چلے جانا کیلاش ہوسٹل۔ کیا رکھا ہے —"
جو بات میں ختم کرنا چاہتا۔ شنکر معاً اسی نقطے پر پہنچ گیا۔
"ہاں — نہیں — پتہ نہیں —"
یہ چار الفاظ ہم سب کی زندگیوں کا گویا مکمل عنوان تھے۔
ہاں — نہیں — پتہ نہیں —
ضرور جاؤں گا کیلاش ہوسٹل۔ واقعی اس میں رکھا کیا ہے آخر — وہ میرا کر ہی کیا کر سکتی ہیں وہ پیلی رنگت والی دُبلی پتلی لڑکی — متوحش آنکھوں والی۔ یونین میں

تقریر کرنے کھڑی ہوتی ہیں تو گھبرا جاتی ہیں۔ ابھی تک یہی طے نہیں کر پائیں کہ مسلم لیگی رہیں یا کانگریس میں شامل ہو جائیں۔ ہر قسم کی عقل سے معذور۔ ایک ہزار بار سمجھایا ہوائی جہاز ایسے اڑتا ہے۔ ریڈیو ایسے بجتا ہے۔ گراموفون میں آواز اس طرح بھری جاتی ہے۔ مگر ہر دفعہ مرغے کی وہی ایک ٹانگ کہ میرے پلے تمہارا سائنس نہیں پڑتا۔ واہ کیا ادا ہے جی ہاں میں ان سے کوئی ڈرتا ہوں — مطلق نہیں ڈرتا ہوں ان سے۔ مجھ سے عمر میں ایک ہی آدھ سال بڑی ہوں گی مگر بزرگی پر اس قدر اصرار ہے کہ اگر بھولے سے باجی نہ کہا تو خفا ہو جاتی ہیں۔ میں بہت معمولی ہوں انھوں نے بھیا سے کہا تھا۔ بھیا کون آئن اسٹائن تھے۔ میں کون مارشل فوش ہوں۔ پر بھیا صاحب چمپا باجی سے عشق فرما رہے تھے تو لگتا تھا۔ ہری پورہ کانگریس کا اجلاس ہو رہا ہے یا ہاؤس آف لارڈز میں بحث کی جا رہی ہے یا سدھانت صاحب اٹھارھویں صدی کی نثر پر لیکچر دے رہے ہیں

اپی نے ایسا کیوں کیا — میرا مطلب ہے — شادی سے انکار — شنکر نے دفعتاً سوال کیا — میں نے غصے سے دانت پیسے۔ میں اس شنکر سریواستوا سے عاجز تھا۔ جو بات میں سوچتا تھا وہ بے تار برقی کی لہر کی طرح سے اس کے دماغ میں پہنچ جاتی تھی — یا پہلے سے ہوتی تھی — ہمزاد کی طرح کہیں اس سے مفر نہ تھی۔ اگر میں اس سے باتیں نہ بھی کرتا تھا تو بیکار تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا یہ ایسا پہنچا ہوا برہمن بن چکا ہے کہ اسے زبانی گفتگو کی ضرورت ہی نہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے بھگوان کرشن اور ارجن کا درجہ رکھتے تھے۔ اکثر یہ درجے اولتے بدلتے رہتے تھے

جب سے چمپا باجی نے بنارس سے آن کر لکھنؤ میں داخلہ لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میں ان کے عشق حقیقی میں مبتلا ہوں۔ نہایت ڈھٹائی سے وہ بھیا صاحب سے کہتا۔ "چمپا باجی آپ کو بہت پسند کرتی ہیں — ویسے آپ ہیں ہی پسند کے لائق — مگر یہ کہ — "

اور چونکہ اپی سے بھیا صاحب کی منگنی ہو چکی تھی اور اپی بھیا صاحب کو عام ہندوستانی لڑکیوں کی طرح اپنا دیوتا تصور کرتی تھیں اور بھیا صاحب چمپا باجی پر دم دیے رہے

تھے۔ لہٰذا یہ سچویشن بے انتہا گنجلک ہو گئی تھی اور یہ ٹنگر کا بچہ نہایت خوبصورتی سے بھیا صاحب کو سمجھاتا رہتا تھا کہ وہ سخت غلطی پر ہیں اور چمپا باجی کی ایسی لڑکیاں تو ہر سال یونیورسٹی میں آتی ہیں۔ اپی کا اور ان کا کیا مقابلہ —— پھر اسے بھیا صاحب کے اس چیپ ٹفاقی پن پر سخت غصہ آتا۔ کیونکہ لاج کی مانند اپی کو بھی وہ اپنی ذمے داری سمجھتا تھا۔

دراصل ہم لوگوں کی اوریجنل غلطی یہی تھی کہ ہم سب ایک دوسرے کو اپنی ذمے داری سمجھتے تھے اور زندگی کے متعلق نہایت سنجیدہ اور بھاری بھرکم تصورات لئے بیٹھے تھے۔

"اپی کیا کریں گی —————— ابھی تو وہ ولایت بھی نہیں جا سکتیں"۔ اُس نے فکرمندی سے کہا۔

"ولایت جانا ہی تو سارے دکھوں کا علاج نہیں ہے —" میں نے کہا۔ پھر مجھے ایک وحشت خیز خیال آیا — اپی — کیا لاج کی طرح میں ان کو بدا نہیں کر سکوں گا۔ اپی کی شادی کس سے ہو گی۔ ان کی زندگی میں خوشی کس طرح داخل ہو گی۔ بھیا صاحب کس قدر کمینے ذلیل انسان ہیں۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مگر بھیا صاحب تو شادی کرنا چاہتے تھے۔ اپی ہی نے انکار کر دیا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ کس قدر خوددار ہیں۔ عزتِ نفس۔ خودداری — وغیرہ یہ الفاظ اس عمر میں مجھے ہم سب کو بے حد اہم اور زوردار لگتے۔ ان الفاظ کے معنی بھی بدلتے رہتے ہیں۔ یہ ہمیں معلوم نہ تھا۔ نہ مجھے نہ اپی کو —

نہ غالباً چمپا باجی کو ——

کیونکہ ہم ابھی بہت کم عمر تھے۔

ٹرین اب مضافات میں داخل ہو رہی تھی۔ کھڑکی میں سے ہوا کا جھونکا کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ اس میں آم کے پتوں کی مہک تھی۔ اب میلوں دور تک عالم باغ کا سلسلہ پھیلتا آ رہا تھا۔ بارش میں بھیگی ان گنت ریل کی پٹریاں۔ ریلوے ورکشاپ کنارے کنارے پھولوں میں چھپے ہوئے بنگلے جن کے سامنے اینگلو انڈین بچے کھیل رہے تھے۔ پھر ٹرین آہستہ آہستہ عالم باغ کو چھوڑتی ہوئی چارباغ جنکشن میں داخل ہوئی۔ اسٹیشن کی سنگِ سرخ کی راجپوت مُغل طرز کی سینکڑوں فلک بوس برجیوں، گنبدوں، میناروں اور

شہ نشینوں والی بے تحاشا طویل و عریض عمارات کا سلسلہ جب ایک دم آنکھوں کے سامنے آگیا تو دل ڈوب سا گیا۔ ہم لکھنؤ پہنچ گئے — میں نے دل میں کہا — گھر آگیا — گھر —

پلیٹ فارم کے شفاف سرمئی فرش پر لوگ نرم روی سے ادھر اُدھر چلتے پھرتے تھے۔ چیخ پکار تھی۔ لیکن اس شور و شغب میں تیرتے ہوئے جو جملے اور فقرے کانوں میں آتے تھے۔ وہ سرشار نے اپنے ناولوں میں لکھے تھے۔

ہم لکھنؤ پہنچ چکے تھے۔

اسٹیشن کی برساتی میں موٹر داخل ہوئی — جسے تدیر چلا رہے تھے۔

موٹر میں بیٹھ کر ہم نے ٹرانس گومتی سول لائنز کا رُخ کیا۔ شنکر کو سنگھاڑے والی کوٹھی اتارتے ہوئے میں گھر پہنچ گیا —"

(اب خاموشی چھا گئی اور مکمل اندھیرا۔ جیسے یہ سب کچھ یاد کرتے ہوں اور یاد نہ آتا ہو۔ پھر یہ ذہنی بلیک آؤٹ ختم ہوا اور کمال نے دوبارہ کہنا شروع کیا:)

"تیسرے پہر کا وقت تھا۔ اسٹیشن سے جب میں گھر پہنچا۔ اپّی اپنے کمرے میں بیٹھی اکنامکس کے نوٹس بنا رہی تھیں۔ اماں بیگم اور خالہ تختوں والے کمرے میں بیٹھی تھیں۔ نذر کی بی بی بڑی مصروفیت سے پان بنا رہی تھیں۔ میں کوٹھی کے خاموش کمروں میں ادھر اُدھر گھومتا رہا۔ پھر میں نے اکتا کر شنکر کو فون کیا۔ معلوم ہوا۔ اسٹیشن سے لوٹ کر نہانے اور کپڑے بدلنے کے بعد فوراً پھر باہر چلا گیا ہے۔

آخر میں نے سائیکل اٹھائی اور کیلاش ہوسٹل پہنچا۔ وہاں مسز وانچو سے معلوم ہوا کہ چمپا باجی ابھی وہاں نہیں آئی ہیں وہ اپنے ماموں میاں کے یہاں وزیر حسن روڈ ہی پر ہیں۔ میں بھینسا کنڈ کی طرف روانہ ہوا۔

چمپا باجی کے ماموں میاں کے مکان میں لان پر ہمیشہ دھوپ کی سُرخ اور سفید دھاریوں والی چھتریاں لگی رہتی تھیں۔ میں اندر گیا۔ وہ ایک چھتری کے نیچے بیٹھی تھیں۔ وہ بھی بڑی مصروفیت سے اکنامکس کے نوٹس بنا رہی تھیں۔

دوسری کرسی پر بھیّا صاحب بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے۔ اے لیجئے وہ تو یہاں موجود

تھے۔ مجھے آتا دیکھ کر وہ اُٹھے اور "ہلو کمال مسوری سے لوٹ آئے ۔" کہتے ہوئے برساتی کی طرف بڑھے۔ جدھر اُن کی سائیکل کھڑی تھی اور دوسرے لمحے وہ پھاٹک سے باہر جا چکے تھے۔

مجھے بڑا عجیب سا لگا۔

آخر میں ایک ڈک چیر سائے میں گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"بڑی گھام ہے ۔" چمپا باجی نے بے دھیانی سے درختوں کی اور دیکھتے ہوئے کہا

"بھیا اتنی جلدی اُٹھ کر کیوں چلے گئے ۔" میں نے کوشش کر کے ریڈیو کے اسکرپٹ پر دھیان دیتے ہوئے کہا۔ جو میں ساتھ لیتا آیا تھا۔ ہوا پور یونیورسٹی کا کانوکیشن —— میں نے بیدلی سے دیکھا ۔

"اللہ بہتر جانتا ہے ۔ یا تم —— تم ان کے کزن ہو —"

"بھیا ۔ یہ اپنا پارٹ لیجئے —— "

"تمھارے گھر میں —" اُنھوں نے کاغذات اُٹھا کر کہا ۔" میں نے سُنا ہے کہ ایک کرائسس آگئی ہے ۔"

"بھیا —— یہ دوسرا اسکرپٹ کملا کو دے دیجئے گا ۔"

"تمھارا ہمزاد ہری شنکر —— تم نے اسے کہاں روانہ کر دیا ۔ آیا نہیں تمھارے ساتھ ۔"

"پتہ نہیں کہاں ہے اس وقت —— دن بھر تو وہ بھیا صاحب کے ساتھ ہی گھومتا رہتا ہے ۔"

"تم لوگ —— کس قدر ڈرمیٹک ہو ۔" چمپا نے کہا

میں نے ان کو غور سے دیکھا۔ وہ میز کے کنارے انگلیاں رکھے یوں بیٹھی تھیں۔ جیسے وہ ان کا ہاتھ نہیں تھا کہیں اور سے وہاں آ گیا تھا۔

"کہاں گئے ہیں تمھارے بھیا صاحب —— "

دیدی —— کیا اُداس تھی۔ ہم سب سے خفا تھی۔

اندر ریڈیو سے گیان وتی بھٹناگر کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ دنیا میں حفاظت کا احساس تھا اور سکون۔ اور شدید اضطراب۔ اور جولائی کی دھوپ۔"

(پھر طلعت نے کہنا شروع کیا) "فنش موڑ پر سے اُترتی سڑک کے گڑھوں پر سے گذر کر ایک دھچکے کے ساتھ سنگھاڑے والی کوٹھی میں داخل ہو گئی۔ یہ اس سال کی بات ہے۔ جب اپی کی منگنی ٹوٹی۔

لاج اندر سے نکل کر آئی۔ اُس نے زعفرانی ساری باندھی ہے۔ اس کی شادی ہو چکی ہے۔ اس کے پاؤں میں بچھوے ہیں۔ اپی اس کے ساتھ ساتھ برساتی میں آ گئیں۔ اپی نے ابھی بچھوے نہیں پہنے۔ خالی وہ لڑکیاں جن کا بیاہ ہو جاتا ہے یہ زیور پہن سکتی ہیں۔ جب اپی کا بیاہ ہو گا اور یہ بچھوے پہنیں گی تو ان کے چھوٹے چھوٹے پاؤں کتنے خوبصورت لگیں گے۔ برآمدوں کے ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں ساری کا پلّو آگے ڈالے کنجیوں کا گچھا کمر میں اُڑسائے، وہ مصروفیت تمکنت اور گمبھیرتا کے ساتھ اِدھر اُدھر کام میں مشغول نظر آئیں گی۔

مگر بیاہ کی تو آج قدیرہ کی بی بی کہہ رہی تھی کہ اُنھوں نے مناہی کر دی ہے۔۔۔

میں گاڑی سے کود کر اندر بھاگی۔

"اپی آپ یہاں کب سے آئی ہوئی ہیں۔ اسٹیشن سے آ کر کمال بھیا آپ کو پوچھ رہے تھے۔ ابھی جب میں شکیلہ کو اتارنے کے لئے بھینسا کنڈ کی طرف سے گذری تو وہاں چمپا باجی کے لان پر دونوں کو میں نے بیٹھا دیکھا۔"

"کون دونوں۔۔۔"

"بھیا صاحب اور کمن بھیا —— چھتریوں کے نیچے۔ وہ املتاس کا درخت نہیں ہے چمپا باجی کے ناموں کے گھر میں۔ وہیں، ہماری فلٹن سڑک پہ سے گزرتی دیکھ کر انھوں نے بڑے زور سے ہاتھ ہلایا۔ اور مسکرائیں —— بے حد خوبصورت لگ رہی تھیں"۔ میں نے مستعدی سے ایک سانس میں سب بتا دیا

اپّی اور لاج خاموشی سے روش پر سے گزرتی پرساتی کی اور بڑھ گئیں جیسے انھوں نے میری بات ہی نہیں سنی

میں چنبیلی کی جھاڑی پھلانگ کے نرملا کی اور چل دی۔ وہ اور مالتی رائے زادہ اوپر میوزک روم کی برجی میں بیٹھی تھیں۔

"بھیّن تو مرزا پور اور دلی گئے تھے نا"۔ مالتی نے پوچھا

"ہاں۔ صبح ہی آئے ہیں مگر آتے کے ساتھ ہی سیدھے پہنچے چمپا باجی کے یہاں۔ اس سمے وہیں ڈٹے ہوں گے۔"

"چمپا باجی کو اس روز میں نے گائیتری کے گھر پہ دیکھا تھا۔ لال ہری لہریئے کی ساری پہنے اتنی سندر لگ رہی تھیں کہ کیا بتاؤں"۔ مالتی نے کہا۔

"بھیّن تو ہمارے لئے بھی اس قدر پیاری بے پوری چُنری لائے تھے کہ بس جب کمال بھیا کے ساتھ راجپوتانہ گئے تھے —— تب ——" نرملا نے رعب ڈالا۔

"چُنریاں پہننا میں تو چھوڑ چکی ہوں۔ میرا جی اوبھ گیا ہے۔" مالتی نے لاج اور اپّی کے لہجے کی تقلید کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے ایسا سندر لہنگا بنوایا ہے دیوالی کے لئے۔ سیر بھر تو اس پہ گوکھرو ہی ہوگی

للو لال جگل کشور کے یہاں سے —" نرملا نے اطلاع دی

یہ گوکھرو اور بنت والے جوڑے سال کے سال ہی نصیب ہوتے تھے۔ دیوالی عید بقرعید۔ اور بس۔ اپّی وغیرہ کے ٹھاٹھ تھے کہ روز پارٹیوں کے لئے ایک سے ایک بڑھیا ساریاں اور ڈھیلے پائجامے اپنی الماریوں میں سے نکالتی تھیں۔ اپنی حالت تو یہ تھی کہ صبح کو نیلا ٹیونک لادا اور پڑھنے چلے گئے۔ شام کو واپس آکر دوسرا کوئی منحوس فراک پہنا اور تان پورہ سنبھالے میرس کالج چلے جا رہے ہیں کتوں کی طرح جیب سے جگ پھیری تھی اور پٹرول راشننگ ہوتی تھی۔ فٹن ہی اپنی قسمت میں لکھی تھی۔ موٹر صرف والدین کی سواری کے لئے مخصوص تھی۔ عید بقرعید اس زبوں حالی پر ترس کھا کر جوڑا بنوا دیا جاتا۔ اب اسے لادے ہاتھوں میں ڈھیروں چھاچم کرتی بنارس کی نگوں والی چوڑیاں پہنے، بیگماتوں کی طرح ٹھسّے سے تخت پر چڑھے بیٹھے ہیں۔ کوئی نوٹس نہیں لیتا۔ یہ کیا فینسی ڈریس کیا ہے۔ کمال دہاڑتا — سُنا ہے آج بریلی کی ساری کاجل کی دو کانوں میں ڈاکہ پڑ گیا — بھیّا صاحب فرماتے — یہ کاجل کی لکیر کے ایکسٹنشن کا کیا مقصد ہے — اگر ڈھیلا پائجامہ پہنا ہے تو فرینے سے بیٹھو درختوں پر کیوں چڑھ رہی ہو۔ نیک بخت۔ خالہ بیگم کہتیں۔ تیج تہوار کا دن یوں فضیحتے میں کٹتا۔ پھر نرملا کی اجار[1] اور ہمارا ڈھیلا پائجامہ اگلے تہوار کے لئے اٹھا کر رکھ دیئے جاتے دوسرے دن سے پھر وہی موچی کے موچی۔

نرملا اور مالتی جب جیزیوں کا ذکر ختم کر چکیں تو اب نرملا نے گہنوں کا قصّہ نکالا۔ اس بجات پہ تبصرہ کیا گیا۔ جو وہ جے ماما لاج کے لئے لانے والے تھے۔ اس میں زمرّد کا جگنو کس قدر خوبصورت تھا ہمارے ممّاں بھی جو بجات لے کر آئیں گے۔ اس میں زمرّد کا جگنو ہوگا۔ پھر اپّی کو زبردستی سارے گہنے پہننے ہوں گے۔ بھیّا صاحب ہاتھی پر بیٹھ کر آئیں گے۔ جیسے نرملا کی کزن رامیشوری کا دولہا آیا تھا۔ اپّی کے چہرے پر

---

[1] ازار۔ یو پی کی غیر شادی شدہ کائستھ لڑکیوں کا پائجامہ جو غرارے کی وضع کا ہوتا تھا۔

وہ سفید سفید بندکیوں والے نقش ونگار کتنے خوبصورت لگیں گے اور افشاں اور سیندور۔

پھر چھاج میں سات قسم کا اناج رکھ کر اس میں دیا جلایا جائے گا اور اپی کے ہاتھوں میں

چاندی کا کنگنا باندھا جائے گا اور امام باندی منگل گائے گی اور بھیّا صاحب دولھا

بن کر کیسے لگیں گے ـــــ

مگر اسی وقت مجھے قدیرہ کی بی بی کی بات یاد آئی۔ جب میں کالج سے لوٹ کر

چائے کی میز پر بیٹھی تھی تو قدیرہ کی بی بی نے مکھن دانی سامنے رکھتے ہوئے بڑے پُراسرار

انداز سے مُنہ لٹکا کر کہا تھا ـــــ بڑی بٹیا نے بیاہ کے لئے مناہی کر دی ـــــ

اپی کے بیاہ میں پہننے کے لئے میں تو بڑی بڑھیا ساری بنواؤں گی ـــــ کار

چوبی ـــــ نرملا کہہ رہی تھی۔"

(پھر دفعتاً" طلعت خاموش ہو گئی۔ دیکھو۔ اس نے کمال سے کہا۔ میں نے محسوس

کیا ہے کہ میرا ماضی صرف میرے لئے اہمیّت رکھتا ہے۔ دوسروں کے لئے، دُنیا

کے لئے اس کے کوئی معنی نہیں ہیں ـــ ان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔

'میرا ماضی محض میرا ہے۔' کمال نے طلعت کی بات دُہرائی

اور دُنیا کو صرف حال سے دلچسپی ہے۔" ہری شنکر کی آواز گونجی

لیکن ماضی حال ہے۔ حال ماضی میں شامل ہے اور مستقبل میں بھی۔ وقت کی اس

شعبدہ بازی نے مجھے بڑا حیران کر رکھا ہے" ـــ طلعت نے اداسی سے کہا۔ میں

وقت کے ہاتھوں عاجز آ چکی ہوں۔ تم میں سے کوئی میری مدد نہیں کرتا۔"

"تمہاری مدد طلعت بیگم شاید آئن سٹائن بھی نہیں کر سکتا۔" ہری شنکر نے کہا۔
"میرے ماضی سے دوسروں کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے —" کمال نے پھر ضد سے دہرایا
"وقت برابر موجود ہے۔ وقت مسلسل حال ہے۔" طلعت نے کہا۔
یہ لوگ جو لندن کے ایک فلیٹ میں بیٹھے ۱۹۵۴ء میں یہ باتیں کر رہے تھے ان کے سائے کھڑکیوں کے شیشوں پر منعکس رہے — باہر تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ موٹریں آ جا رہی تھیں۔ ریڈیو میں سے وی آنا کے کسی کانسرٹ کی آواز آ رہی تھی

وقت کے اسی اندھیرے میں طلعت ۱۹۴۰ء کی جولائی میں سنگھاڑے والی کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھی نرملا اور مالتی سے باتیں کر رہی تھی، ۔ اس طلعت میں اور اس لڑکی میں کوئی فرق نہ تھا۔ مگر دونوں مختلف ہستیاں تھیں۔ مہاتما بدھ شاکیہ منی نے کہا تھا، کہ انسان ہر لحظہ بدلتا رہتا ہے۔ انسان بچپن میں کچھ اور ہوتا ہے اور جوانی اور بڑھاپے میں کچھ اور۔ تم اس لمحے سے پہلے نہیں تھے۔ صرف تسلسل باقی رہتا ہے۔ پہاڑوں پر گلیشیر ٹوٹ ٹوٹ کر بہہ رہے تھے۔ ہوائیں۔ اندھیرا۔
وقت جو سیال تھا۔ وقت جو برف میں منجمد تھا۔
"ہم اپنا قصہ دہرا کر اپنا اطمینان کرنا چاہتے ہیں۔" ہری شنکر نے کہا۔ "کیونکہ ہم بہت خوفزدہ ہیں۔"
"ہم وقت سے اور اندھیرے سے خوفزدہ ہیں۔ کیونکہ وقت ایک روز ہمیں مار ڈالے گا۔ اور اندھیرا ہماری آخری جائے پناہ ہو گا —" طلعت نے کہا —
"اور گوتم نیلمبر کا ذکر یہاں نہ کرنا — تم اصل موضوع سے بہت دور ہٹ رہے ہو — طے یہ کرنا ہے کہ زندگی میں اصل موضوع کیا ہے —" کمال نے کہا۔
"میں چودہ سال قبل بھی موجود تھا اور اگر زندہ رہا تو چودہ سال بعد ہری شنکر ہی کہلاؤں گا۔ اور جب وقت کے سارے تجربے یہ اپنے اوپر کر لیں گے تو یہ جو

چھوٹے چھوٹے گنی پگ ہیں۔ تب یہ تینوں مر جائیں گے اور ان کے علاوہ اور سب بھی جن کا اس کہانی میں ذکر ہے۔" ہری شنکر نے کہا۔

وقت کے پیٹرن میں طلعت جہاں بیٹھی تھی۔ وہی طلعت اسی پیٹرن میں ایک جگہ اور موجود تھی۔ اور دونوں نقطوں کے درمیان برسوں کا فاصلہ تھا اور اس فاصلہ پر انسان صرف آگے کی سمت چل سکتا تھا۔ آگے۔ اور آگے — پیچھے جانا ناممکن تھا۔ گو ہزاروں طلعتیں ان گنت ٹکڑوں میں منتشر ان گنت جگہوں پر موجود تھیں جیسے آئینے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں میں ایک ہی چہرے کے مختلف عکس نظر آتے ہیں۔)

۳۶

لکھنؤ۔ سنہ ۱۹۴۰ء

اب چراغ سارے میں روشن ہو چکے تھے۔ ندی کے کنارے ڈونگیوں میں دیے جلے۔ ندی نے اپنا سفر جاری رکھا۔ برآمدے میں لیمپ روشن کر دیئے گئے تھے۔ شیڈ پر برساتی پروانے چکر کاٹ رہے تھے۔

لڑکیاں برآمدے میں بیٹھی رہیں۔

سینتل پاٹی پر اودے رنگ کا کمخواب کا لہنگا پھیلا دیا گیا جس کی گوٹ بڑے اہتمام سے طلعت تراش رہی تھی۔ گوٹ کاٹنے میں طلعت بڑی ماہر فن سمجھی جاتی تھی۔ لاج ایک طرف کو ذرا بے نیازی سے بیٹھی یہ منظر دیکھتی رہیں۔ قریب ہی مالتی رائے زادہ بیٹھی تھی۔

پھر جب رات زیادہ ہو گئی تو نیچے سے گنگا دین نے جو اب تک حوض کی منڈیر پر بیٹھا جمنا کہری سے باتیں کر رہا تھا۔ آواز لگائی — بٹیا اب چلیئے —

مالتی کو شہر جانا تھا۔ وہ بارود خانے میں رہتی تھی۔

"بھیّن آ جائیں تو موٹر سے تم کو پہنچا آئیں گے۔" لاج نے اس سے کہا۔

طلعت ان سب کو شب بخیر کہہ کر نیچے اتری اور اب مالتی نے رائے بہاری لال روڈ کی طرف چلنا شروع کیا۔

چند فرلانگ چلنے کے بعد فٹن ایک بڑی سی سیمنٹ کی کوٹھی میں داخل ہوئی جس کے پائیں باغ میں رات کی رانی مہک رہی تھی۔ گھر کے سب لوگ پچھلے چبوترے پر بیٹھے تھے۔ کرسیاں بچھی تھیں۔ پلنگ کے قریب ٹیبل فین رکھا تھا۔ صراحیاں گھڑونچی پر دھری تھیں جن پر چنبیلی کے گجرے لپٹے ہوئے تھے۔ چبوترے کے سرے پر چھت والا راستہ تھا جو کھانے کے کمرے سے سیدھا باورچی خانے کی طرف جاتا تھا۔ ادھر سے بگھار کی خوشبو آ رہی تھی۔ برآمدے میں نماز کی چوکی بچھی تھی۔ نیچے بہت سے بڑے لوٹے ایک قطار میں رکھے جگمگاتے تھے۔

"دیکھو۔ گوٹ تراش آئیں۔" اماں بیگم نے نماز کی چوکی پر سے پائنچے سمیٹ کر چپلوں میں پیر ڈالتے ہوئے کہا۔

"اللہ رحم کرے —— لاج بے چاری کے جہیز کے کپڑے ہیں۔ ان کو اپنا تختۂ مشق نہ بناؤ —— بے چارے رائے زادہ صاحب کے یہاں اتنے اللے تللے نہیں ہیں کہ تم لاج کے کپڑے کاٹ پیٹ کر برابر کر دو تو نئے بنوا دئے جائیں۔" کمال نے کتاب پر سے سر اٹھا کر آواز لگائی۔ وہ برآمدے میں در کے قریب ٹیبل لیمپ لگائے پڑھ رہا تھا۔ اپی کھانے کے کمرے میں کچھ ہٹر پٹر کر رہی تھیں۔ ہاتھ میں ایک ڈش لئے جب وہ باورچی خانے کی طرف جاتی نظر آئیں تو طلعت نے اُن کو آواز دی ——

"اپی! کل لاج نے تم کو بُلایا ہے۔"

"اچھا ——" وہ باورچی خانے میں داخل ہو گئیں۔

"لاج باہر نہیں نکلتی —— کیا ابھی سے مایوں بیٹھ گئی ہے؟" خالہ بیگم نے پُوچھا۔

"جانے ابھی سے اس کا بیاہ کر دینے کی کیا تُک ہے۔" کمال بڑبڑایا۔

"گونا تو اس کا بی اے کے بعد ہو گا۔ کیا حرج ہے۔ میں تو کہتی ہوں بڑی بٹیا کا بھی اسی طرح بیاہ کر دینا چاہیئے۔ نکاح ہو جائے۔ رخصتی اپنے جب دل میں آئے

ہوتی رہے گی۔" خالہ بیگم نے کہا۔

اپّی کے بیاہ کا شاید پھر سے چھڑ گیا۔ طلعت گنگناتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

یہ مکان "گلفشاں" کہلاتا تھا۔ سامنے رائے بہاری لال روڈ بڑی خاموش سڑک تھی دونوں طرف جو کوٹھیاں تھیں۔ ان کے پھاٹکوں پر ناموں کی تختیاں خاموشی سے اپنی واقعیت کا اعلان کرتی رہتیں۔ نام۔ لوگ۔ خاندان۔ وجود کے تانے بانے۔ جھمیلے۔ گلفشاں کے پھاٹک کے اندر ایک حوض تھا اور سیمنٹ کی ایک نالی جو ستونوں پر بنی تھی باغ کی سڑک کے ساتھ ساتھ پیچھے کے بڑے حوض تک جاتی تھی۔ جس پر امرود کا ایک درخت جھکا ہوا تھا۔ اس حوض کے اوپر پانی کی موٹر لگی تھی۔ نالی کے ساتھ ساتھ چلو تو راستے میں کھانے کے کمرے کی فریج کھڑکی پڑتی تھی جس میں اسٹینڈ پر آفتابہ رکھا رہتا تھا۔ اس میں روز تازہ پتے ڈالے جاتے تھے۔ اس فریج دریچے میں سے جھانکو تو اندر کھانا کمرہ نظر آتا اور اس کے آگے گول کمرہ جس میں شیشے کے لمبے لمبے دریچے تھے۔ گول کمرے کے تین طرف برآمدہ تھا۔ اس میں بھی شیشے کی کھڑکیاں لگی تھیں۔ اس میں بید کا صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ برآمدے کے ایک سرے پر بھیا صاحب کا کمرہ تھا۔ برآمدہ ساری کوٹھی کا چکر لگا کر پہلو کے چبوترے پر ختم ہوتا تھا۔ جہاں برساتی تھی۔ اس کے آگے موٹر خانے کی طرف سڑک جاتی تھی۔ پھر عقبی حصے میں لان تھے۔ ان کے بعد شہتوت کے درخت اور اس کے پیچھے سیمنٹ کا شاگرد پیشہ جو بڑی سی کاٹیج کی وضع کا تھا۔ یہاں سرکنڈے لگا کر ملازموں نے اپنے اپنے لئے آنگن بنا لئے تھے۔ گلفشاں کے ایک طرف کھلا میدان تھا جس کے اختتام پر دھوبیوں کی جھونپڑیاں تھیں اور پان والے کی گمٹی۔ ایک مرتبہ گلابی جاڑوں میں کیا ہوا کہ نشاط گنج کی بستی کے لوگوں نے اس میدان میں آکر والی بال کے دو کھمبے نصب کر لئے اور ایک شکستہ جالی ان کھمبوں سے باندھ دی۔ اب شام پڑے یہ غریب غربا آکر والی بال کھیلا کرتے اور جھٹ پٹے میں ان کی آوازیں گونجا کرتیں طلعت پچھلے برآمدے میں تخت پر بیٹھی ان کی آوازیں سنا کرتی اور ہوم ورک کرتی جاتی عقبی لان کے وسط میں چوڑی سی روش

تھی۔ رام اوتار مالی گھنٹوں کھرپی لئے بے مقصد ادھر ادھر گھومتا کبھی کسی درخت کے تنے میں کھرپی کھونس کر آسمان کو دیکھا کرتا اور طوطوں کو آم کے درختوں سے اڑانے کے لئے عجیب و غریب آوازیں حلق سے نکالتا۔

نچلے طبقے کے لوگوں نے مہینہ بھر ہی والی بال کھیلا ہوگا کہ کوٹھیوں کے رہنے والوں نے میدان کے مالک سے شکایت کی ان کی وجہ سے ماحول میں فرق آتا ہے۔ اس کے بعد سے والی بال کھیلنے والوں کا آنا بند ہوگیا اور میدان میں پھر سناٹا چھا گیا۔

احاطے کے پیچھے ایک مندر بھی تھا صبح کو جس کے گھنٹے ٹن ٹن بجا کرتے۔ مندر کے قریب دھوبیوں کے چودھری کا پختہ دو منزلہ مکان تھا۔ اتوار کے روز صبح صبح ازابلا تھوبرن کالج کی عیسائی لڑکیاں دھوبیوں کی بستی میں تبلیغ کے لئے آتیں اردو بھجن گائے جاتے اور مٹھائی تقسیم ہوتی۔

برابر کی کوٹھی میں چکرورتی صاحب تھے جو سپرنٹنڈنگ انجینئر تھے۔ ان کے لڑکے کا نام اونیل تھا۔ لڑکی کا ریکھا۔ جو سونے کے بنگالی وضع کے ٹوپ پہنتی تھی جس میں جھالر لگی ہوتی ہے۔ یہ لوگ ڈھاکے کے رہنے والے تھے

اونیل کالج میں اپنے حسن کے لئے بہت مشہور تھا اور سنا گیا تھا کہ سجاتا سے اس کا بیاہ ہوگا۔ سجاتا اور نندبالا دو بہنیں تھیں جن کے باپ یونیورسٹی کے کسی اہم شعبے کے صدر اور بہت مشہور سائنس دان تھے۔ سجاتا گلفشاں سے چوتھی کوٹھی میں رہتی تھی۔ اس کے آگے ارچنا اور پرناتی رہتی تھیں۔ یہ توام بہنیں تھیں اور ان کے باپ یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ کے صدر تھے۔ ان کے گھر میں پلنگوں کے بجائے تخت بچھے تھے اور ہر کمرے میں رام کرشنا کی تصویریں تھیں جو بنگال کے بڑے بھاری ویشنو سنت گزرے ہیں۔ اس کے آگے بڑھ کر جیپالز کی کوٹھی تھی جن کی لڑکیاں یونیورسٹی میں پڑھتی تھیں اور حسن و ذہانت کے لئے بے حد مشہور تھیں۔ اسی طرح اور بہت سی کوٹھیاں تھیں۔ ان میں ایک ہی طرح کے لوگ رہتے تھے۔ ان سب کے یہاں موٹریں تھیں اور ٹیلیفون لگے تھے اور صبح ہوتے ہی تو ان کی لڑکیاں سائیکلوں پر اپنے اپنے پھاٹکوں سے نکل کر ازابلا تھوبرن کالج

یا یونیورسٹی کا رُخ کرتی تھیں۔ یہ بڑا مستحکم اور مضبوط معاشرہ تھا۔ یہ بڑے شریف لوگ تھے باوضع اور خوشحال اور باعزت۔ ان کے یہاں کے دستور بھی ایک سے تھے۔ رنج اور خوشیاں مسائل یکساں تھے۔ ان کے فرنیچر، ان کے باغوں کے پودے، ان کی کتابیں، ملبوس، سب چیزیں ایک سی تھیں۔ ان کے ملازم۔ ان کے نام۔ ان کی دلچسپیاں۔

طلعت کے یہاں کا خانساماں بھی اسی قسم کا تھا جیسے اور سب کوٹھیوں کے خانساماں تھے۔ اس کا نام حسینی تھا۔

سارے باورچیوں کے نام حسینی، حسین بخش یا مدار بخش ہوتے ہیں۔ سارے دھوبی نتھو کہلاتے ہیں۔ سب کوچوان گنگا دین ہیں۔ ساری نوکرانیوں کے نام ملاقن، رسولیا، اور حمیدن کی ماں اور منجو را لنساء ہوتے ہیں۔ سارے بیرے عبدل کہلاتے ہیں۔ جس طرح طعام خانوں میں وائلن نواز اودا کر ٹونی ہوتا ہے۔ سارے باپوں کا نام خان بہادر تقی رضا بہادر ہوتا ہے۔

ناولوں والے باپوں کا نام بھی یہی ہوتا ہے۔ اصلیت والے باپوں کا بھی۔ جبھی تو کہا جاتا ہے کہ ناول حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں۔ ویسے ادھر ادھر کی ہانکنے کی دوسری بات ہے۔

حسینی کو اماں بیگم نے طلعت کا ایک پرانا اوور کوٹ دے دیا تھا جس کے کالر پہ فر لگی تھی۔ اب فر کا فیشن ختم ہو چکا تھا۔ لہٰذا طلعت اسے کہاں پہنتی اور حسینی صبح صبح باورچی خانے کی سمت جاتے ہوئے چھت والے راستے میں سوں سوں کرتا گزرتا اور سودے کے پیسے لینے کے لئے اماں بیگم کے کمرے میں آتا تو صرف ایک لوئی اوڑھے ہوتا تھا۔ لوئی بہت پتلی تھی۔ اماں بیگم نے اسے فرکوٹ دے دیا۔ اب وہ فاختئی رنگ کا فرکوٹ پہنے کام کرتا اس قدر مسخرہ معلوم ہوتا کہ جس کی حد نہیں۔ قدیر اس پر خوشدلی سے ہنستا۔ میم صاحب آوت ہیں۔ ہٹ جاؤ راستے سے۔۔

قدیر موٹر ڈرائیور جب طلعت چار سال کی تھی۔ کمال آٹھ سال کا اور بھیا صاحب ابھی سوئیٹزرلینڈ میں تھے۔ تب آن کر ان کے یہاں نوکر ہوا تھا۔ قدیر مرزا پور کا رہنے والا

تھا اور بے حد دلچسپ۔ اُس کی بیوی کا نام قمر النساء تھا اور بچے کا پھدّن۔ جب طلعت کے بڑے ابّا اٹاوے میں تعیّنات تھے، تو ایک مرتبہ پھدّن کو ضلع کے بے بی شو میں لے جایا گیا اور اسے پہلا انعام ملا۔ اب پوچھیے کیا انعام ملا۔ ایک گاڑھے کی چھپی ہوئی چھوٹی لڑکیوں کے پہننے کی ساری۔ اور ایک جھنجھنا۔ قدیر کے یہاں اُس روز عید ہو گئی۔ پھر ایک روز قدیر کو کیا سوجھی کہ کیمرہ لوں گا۔ انگریزی رسالے گھر میں سب کو دکھاتے پھرے۔ اے بٹیا —— اے بیگم صاحب —— یہ کیمرہ کتنے کا ہے۔ پوچھو میاں قدیر تم کیمرہ کیا کرو گے بیگم صاحب، پھوٹو کھینچا کروں گا —— خدائے سے مجھے پھوٹوگرافی کا بہوتے شوق ہے —— پھر قدیر نے اپنی تنخواہ میں سے پیسہ بچا بچا کر ڈیڑھ سو روپے کا کیمرہ منگوایا اور تین ٹانگوں والا اسٹینڈ۔ اور مور اور محل والے پردے۔ اب دونوں میاں بی بی نے شاگرد پیشے کے آگے سرکنڈے کھڑے کر کے باقاعدہ اسٹوڈیو بنایا اور گھر بھر کی تصویریں کھینچنی شروع کر دیں۔ ہائی پو۔ اور یہ اور وہ جانے کون کون لوازمات منگوائے گئے۔ انھوں نے اپنی اور بھیا صاحب اور طلعت اور کمال اور سب کی سینکڑوں تصویریں کھینچ ڈالیں تصویروں کے لئے قدیر کا بڑا زوردار تخیّل تھا۔ اپی بیٹھی ستار بجا رہی ہیں۔ پیچھے پردے پر مور ناچ رہا ہے محل کے اوپر چاند نکلا ہے۔ حوض پر پریاں کھڑی ہیں۔ اپی قلم ہاتھ میں لئے مفکرانہ انداز میں بیٹھی ہیں۔ کمال اپنے سارے کپ اور ٹرافیاں سنبھالے کھڑے ہیں۔ بھیا صاحب ٹینس کا ریکٹ ہاتھ میں لئے مسکراتے ہیں۔ خالہ بیگم اور اماں بیگم انتہائی سنجیدگی سے ہاتھ گھٹنوں پر رکھے بیٹھی سامنے کی اور دیکھ رہی ہیں۔ نرمل اور لاج، رادھا اور کرشنا کے لباس میں کھڑی ہیں۔ نرملا کے ہاتھ میں بانسری ہے اور وہ تخت ٹیکل والا کرشنا کا پوز۔ ہری شنکر کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ تصویروں کے پوز کے متعلق قدیر کی اپنی اٹل تھیوریز تھیں۔

اور اس معاملے میں وہ کسی کی رائے برداشت نہیں کر سکتے تھے اپنی من مانی کرتے تھے لہٰذا ان کے ماڈلز کو بلا چون و چرا کئے ان کا حکم ماننا پڑتا تھا۔ اب فرصت کے وقت میں میاں بی بی بیٹھے تصویریں دھو رہے ہیں۔ نکھار رہے ہیں۔ آٹھ آٹھ آنے کی لاگت میں ایک پوسٹ کارڈ

سائز تصویر بنتی تھی۔

اپنا اپنا شوق ہوتا ہے۔

گرمیوں کی دوپہروں میں جب سارا گھر سوجاتا تو نوکروں کے کوارٹر سے قدیر کے الہا گانے کی آواز بلند ہوتی۔ کبھی جا کر دیکھو تو میاں قدیر دہلیز پہ اکڑوں بیٹھے پٹرول کا خالی ٹین بجا رہے ہیں۔ قمرن ایک طرف کو بیٹھی کروشیا سے جالی بنا رہی ہیں۔ آپ کو آتے دیکھا فوراً پتیل کی پن ڈبیا کھینچ کر پان بنانا شروع کر دیا۔ قمرن پورب کی ساری عورتوں کی طرح بے حد سانولی، سلونی اور سبک بی بی تھیں۔ ہم وطن ہونے کی وجہ سے لاج اور نرملا کی والدہ سے ان کا بڑا یارانہ تھا۔ اکثر سنگھاڑے والی کوٹھی بلوائی جاتیں۔ یا جب مسز رائے زادہ گلفشاں آتیں تو فوراً قمرن کی طلبی ہوتی۔ رنگین کنارے والی گاڑھے کی دھوتی باندھے جس کا پلو سامنے پڑا ہوتا، گھونگٹ نکالے وہ روش پر سے گزرتی چبوترے پر پہنچتیں اور ان کے پیروں کے جھانجن اطلاع دیتے کہ بہن قمرن رنسا آن پہنچیں۔

ایک ریشمی ساری بھی تھی بہن قمرن کے پاس جو پورے اٹھارہ روپے میں خریدی گئی تھی اور وہ بھی کلکتے میں۔ جس روز کوٹھی میں کوئی تقریب ہوتی وہ ریشمی ساری اور اپنے سارے چاندی کے زیور پہن کر گھونگٹ نکالے آن کر خاموشی سے کام میں مصروف ہو جاتیں مہمان بیبیوں کا استقبال کرتیں ان کو سلیقے سے بٹھاتیں۔

قمرن اور قدیر دونوں کسانوں کی اولاد تھے۔ ڈرائیور بننے سے پہلے قدیر اپنے ضلع کی کسان سبھا میں شامل تھے اور چرخے کا پرچار کرتے پھرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب موتی لال کا ولایت پلٹ بیٹا زمینداری کی بیخ کنی کرنے کے درپے تھا گاؤں گاؤں گھومتا تھا کسانوں کی جھونپڑیوں میں رہتا تھا اور اودھ کے کسانوں کا لیڈر بنا ہوا تھا۔ تعلقہ داری سسٹم نے کسانوں کی جو درگت بنا رکھی تھی۔ اس سے قدیر سے بہتر واقف کون ہو سکتا تھا۔ اسی لئے جب گلفشاں کے لان پر کمال کے دوست احباب سوشلزم پر لمبی چوڑی بحثیں کرتے تو قدیر بھی کسی نہ کسی بہانے سے جا کھڑے ہوتے اور ان کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے۔ ان کو تو صرف یہ معلوم تھا کہ ان کے گاؤں کے زمیندار ٹھاکر صاحب کے سپاہیوں نے ایک روز

جب لگان ادا نہ ہونے پر ان کے باپ کو ڈنڈوں سے اس قدر مارا کہ وہ ختم ہو گئے تو قدیر کو کلکتے جا کر کلینری کرنی پڑی تھی اور ان کے گھر میں اب بھی روٹیوں کے لالے پڑے تھے۔ ان دنوں یعنی ۱۹۳۱ء کے لگ بھگ کانگریس نے تحریک چلا رکھی تھی کہ حکومت کو ٹیکس مت ادا کرو۔ گاؤں گاؤں یہ تحریک چل رہی تھی۔ حکومت اور زمیندار ایک طرف تھے۔ کسان اور کانگریس دوسری طرف۔ قدیر کے گھر ایک زمانے میں قالین بھی بُنے جاتے تھے مگر سرکاری پالیسی اور مشینی مال کی درآمد کی وجہ سے گھریلو صنعتیں تباہ ہو چکی تھیں۔ زمین پر بوجھ بڑھ گیا تھا اور زمیندار کو لگان ادا کرنا برحق تھا۔ انہی حالات نے قدیر کے باپ کی جان لی۔ مگر اب جو کچھ لکھنؤ شہر میں ہو رہا تھا وہ قدیر کی عقل میں نہیں آتا تھا۔ بے اطمینانی اور انتشار کی اصل وجہ اقتصادی تھی۔ زمیندار اور کسان کا تصادم تھا۔ برطانوی حکومت اس بے اطمینانی کو فرقہ وارانہ رنگ دے رہی تھی تاکہ عوام کا ذہن دوسری طرف متوجہ ہو جائے۔

شہر میں رہ کر کمرن کو اپنے مرجاپور کے گاؤں کی یاد بہت ستاتی اور سال دو سال بعد چھٹی لے کر دونوں اپنے گاؤں ہو آتے۔ دونوں میاں بی بی میں بہت محبت تھی۔ رام سیتا کی جوڑی ایسی۔

قمرن ابھی دس برس ہی کی تھیں کہ ان کا بیاہ گونا سب ہو گیا تھا۔ یہ شاردا ایکٹ کے زمانے میں بھی غریب غربا گورنمنٹ کی آنکھ میں کس طرح خاک جھونکتے ہیں بی کمرن اب مربھر کر پچیس سال کی ہوئی تھیں۔ قدیر ان سے دس بارہ سال بڑے تھے۔ ان دونوں کی محبت کو مثال کے طور پر دوسرے ملازموں بلکہ رشتے داروں تک کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ ویسے بی کمرن دوسرے ملازموں کی بیبیوں سے میل جول نہیں رکھتی تھیں کیونکہ موٹر ڈرائیور کی اہلیہ ہونے کی حیثیت سے ان کا سماجی رتبہ شاگرد پیشے کی سوسائٹی میں بہت اونچا تھا۔ ان کا قاعدہ تھا کہ دوپہر کو کھانے پکانے جھاڑو بہارو سے فارغ ہو کر بدھن کو گود میں لئے کوٹھی میں آجاتیں اور اماں بیگم کے بیڈ روم میں محفل جمتی۔ اماں بیگم تخت پر لیٹی رسالہ نیرنگ خیال یا عصمت پڑھ رہی ہیں۔ خالہ بیگم نماز کی چوکی پر آڑی آڑی لیٹی ہیں۔ کوئی مہمان بی بی آئی ہوئی ہیں تو وہ بھی کسی مسہری پر نیم دراز ہیں۔ پاندان سامنے دھرا ہے۔

"آ گئیں قدیرکی بی بی — آؤ — بیٹھو۔"

قمرن بڑی نزاکت سے سب کو آداب تسلیم کر کے قالین پر بیٹھ گئیں۔ پھدن کو ایک طرف سلا دیا۔ باجی اماں نے پان بنا کر بڑھایا۔

"کہو بی، آج کیا پکایا تھا۔" خالہ بیگم پوچھتیں۔

"ارہر کی دال بھات اور منگوچیاں بیگم صاحب —"

اس کے بعد کھانوں پر تبصرہ ہوتا۔ ترکاریوں کے بھاؤ اور گھی کے نرخ پر تبادلہ خیالات کرنے کے بعد گفتگو اپنے محبوب موضوع پر آجاتی۔ شادی بیاہ کے قصے۔ کنبے کی سیاسیات۔ کس کی شادی کس سے ہو رہی ہے — وغیرہ وغیرہ۔ قمرن ساری گفتگو میں پورا پورا حصہ لیتیں اور ان کی رائے کی قدر بھی کی جاتی۔ کبھی خالہ بیگم تخت پر بیٹھے بیٹھے کجریاں گنگنانا شروع کر دیتیں۔ بھری نگری موری ڈھرکائی شام — تو بی کمرن ان کے ساتھ ساتھ نیچی آواز میں گاتیں۔ ان کی آواز زیادہ اچھی نہ تھی۔ پر سنگت میں گا لیتیں۔

گانے میں میاں قدیر استاد تھے۔ نوٹنکی کے گانے۔ تھیٹر کی غزلیں — (میں فیش سے پوزیشن سے کھاؤں ٹن چاپ) کجریاں، بارہ ماسے، وادرے، ٹھمریاں، برہا، آلہا اودل ہر چیز کے بادشاہ تھے۔ ان کی پسندیدہ غزلیں مندرجہ ذیل تھیں:

اٹھاؤ نہ کھنجرٹا مرڑے گی کلائی
گلا کاٹو ناجک بدن دھیرے دھیرے

اور یہ

شب غم کی آہیں بسر ہو رہی ہیں
مناتے مناتے سحر ہو رہی ہے

گانے میں قدیر اشعار کی صحت کا خیال رکھنے کا قائل نہ تھے۔ ان کے پٹرول کے ٹین پہ آکر سارے اشعار اور الفاظ ایک نیا روپ اختیار کر لیتے تھے۔ جو صرف ان کا فن تھا۔ ان کے چند پسندیدہ اشعار بھی تھے جو وہ شاگرد پیشے کی ادبی محفلوں میں پڑھا کرتے — ایک تھا یہ

عطر غلاب خوشبو لونڈر نے چھین لی
جنتری کی تمام کھبریں کلنڈر نے چھین لی

قدیر کلکتہ پلٹ تھے لہٰذا ان کا درجہ ویسے بھی بہت بلند تھا۔ جس نے کلکتہ دیکھا جانو لندن پیرس ساری دنیا دیکھ لی۔ کمال اور طلعت وغیرہ کے بچپن میں وہ اکثر اپنی وسیع معلومات سے ان لوگوں کو مستفید کیا کرتے اور بچے نہایت عقیدت سے ان کی باتیں گرہ میں باندھتے جاتے۔ مثلاً ایک روز بنارس کی ایک تارکول کی سڑک پر قدیر بچوں کو موٹر میں بٹھلائے کہیں لیے جاتے تھے۔ طلعت نے نہایت مفکرانہ انداز میں ناخن کترتے ہوئے کہا۔ "یہ پالش کی ہوئی سڑکیں تو بہت مہنگی بنتی ہوں گی — ہیں نا قدیر —"

"جی ہاں۔ بٹیا۔" قدیر نے گلا صاف کر کے اسی مفکرانہ انداز میں پیچھے مڑتے ہوئے جواب دیا تھا — "ایک روپیہ بھر جگہ مطلب سوا انچی سڑک پر پالش کرنے کا ایک ہی پیسہ خرچ بیٹھتا ہے —"

"اوہ —" پچھلی سیٹ پر سے حیرت و استعجاب کا کورس ہوا

"وہ کیسے قدیر —" طلعت نے پوچھا۔ وہ ہمیشہ کی بیوقوف تھی۔

"اب یہ دیکھ لیجئے —" قدیر نے بڑی متانت سے جواب دیا۔ "جیسے ایک ایک روپیہ کر کے سڑک پر بچھاتی چلی جایئے۔ اتنے ہی روپے خرچ ہوتے ہیں" اور وہ کھنکار کر غور و فکر میں ڈوبے موٹر چلاتے رہے۔

ایک بار انھوں نے بتلایا کہ کلکتہ میں صاحب لوگوں نے یہ ڈونٹا پا یٹی کہ جو ڈریبر موٹر سے مرغی مار دے اسے پچیس روپیہ انعام۔ بڑے بڑے دریبر آئے۔ مہاراجہ بردوان کا دریبر۔ اور بنگال کے لاٹ صاحب کا دریبر۔ مرغی سڑک پر چھوڑی گئی۔ کوئی نہ مار پایا۔"

"تم نے مار دی ہوگی —" طلعت نے اشتیاق اور عقیدت سے پوچھا۔

"جی ہاں۔ بٹیا —" انھوں نے جواب دیا

"انعام کا کیا کیا —" کمال نے پوچھا

"دریبر کی بی بی کے لئے سونے کے بندے بنوا دیے۔"

کر لیا تھا لیکن اصلیت میں بڑے سخت ہندوستانی تھے۔ ان لوگوں نے ایک بہت بڑے دوراہے پر اپنے مکان بنا رکھے تھے۔ یہ برطانوی نوآبادیاتی سماج تھا جو جاگیردارانہ نظام کے تعاون سے بدلتے ہوئے ہندوستان میں پرانی بنیادوں پر کھڑا کیا گیا تھا۔ اس طرح کا معاشرہ مصر اور ترکی کے پاشاؤں کے یہاں بھی موجود تھا۔ رضا شاہ اور مصطفےٰ کمال کے لائے ہوئے انقلاب کے بعد ان ممالک میں سماج بالکل مغربیت زدہ ہو گیا تھا۔ اسی طرح کا دوغلا ماحول ملایا اور انڈونیزیا کے اوپری طبقے میں موجود تھا۔ شنگھائی اور ہانگ کانگ اور کلکتہ اور بمبئی ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں تھیں مگر ہندوستان کے معاشرے میں یہ خصوصیت ابھی باقی تھی کہ یہاں کی اپنی دیسی تہذیب کی اقدار اس قدر پائیدار تھیں اور ان کی کشش اتنی شدید تھی کہ یہ لوگ ترکوں یا مصریوں یا ایرانیوں کی مانند یوروپ کی مکمل نقالی کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ انیسویں صدی میں جو سیاسی شعور یہاں پیدا ہوا تھا اس کی وجہ سے ہندوستانی تہذیب کی تجدید کی زبردست تحریک یہاں چلی تھی۔ اب ہندوستانی موسیقی اور ہندوستانی آرٹ اور ہندوستانی طرزِ معاشرت پر زیادہ زور دیا جا رہا تھا۔ اب مغرب زدہ کالے صاحب لوگ کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ کانگریس کی تحریک نے اس تجدید کی رَو کو زبردست تقویت پہنچائی تھی۔ لیکن فرقہ پرست عناصر ہندو پراچین سنسکرتی اور اسلامی عہدِ زریں کا ذکر کر رہے تھے۔ متحدہ قومیت اور خالص ہندوستانی تہذیب کے تصور میں رخنہ پڑ چکا تھا۔ اب یہ سوال سامنے آ رہا تھا کہ ہندوستانیت دراصل ہے کیا چیز۔ ایک سیاسی پارٹی کا کہنا تھا کہ مسلمان علیحدہ قوم ہیں۔ ان کی روایات کے ڈانڈے مشرقِ وسطیٰ سے ملتے ہیں۔ ہندوستان سے انھیں کوئی مطلب نہیں دوسری سیاسی پارٹی کا کہنا تھا کہ اس ملک کی اصل قوم ہندو ہیں مسلمان غیر ملکی ہیں "گلفشاں" کے شاگرد پیشے میں رہنے والی مرزاپور کی قمر النساء اور رام دیا سے اس مسئلے پر کسی نے رائے نہ لی کہ ہندوستان کے اصل باشندے تو تم لوگ ہو تمہاری اس سلسلے میں کیا رائے ہے۔

بہرحال طلعت اور تریلا اسی اوپری طبقے کی پروردہ لڑکیاں تھیں جن کو مغرب اور مشرق کے ملے جلے ماحول نے پروان چڑھایا تھا چنانچہ جب یہ دونوں لا مارٹینئر سے

ان کی دوستی نہ ہو سکا۔ حسینی کی بی بی کو اپنے خاص الخاص لکھنؤا ہونے پر ناز تھا۔ ان کے دلوا پڑدادا نوابی عہد میں شاہی رکاب دار تھے۔ قمرن بے چاری تو قصباتی بھی نہیں خالص دیہاتن تھیں لیکن قمرن کی سماجی حیثیت (جس کا ذکر پچھلے صفحے پر ہو چکا ہے) حسینی کی بی بی سے بلند تھی۔ انھوں نے بھی مؤخر الذکر خاتون کا کبھی نوٹس نہ لیا۔ ان کی تو نرملا اور لاج کی والدہ مسز رائے زادہ کے علاوہ ایک گوئیاں اور تھیں۔ اس کا نام رم دیا تھا۔ ہم وطنی کا ناطہ بڑی چیز ہوتا ہے۔

کہاں رم دیا ذات کی اہیرن۔ رام اوتار مالی کی بی بی۔ صبح شام اس کا آدمی اس کو پیٹے۔ نہ وہ طلعت کی آیا سوسن کی طرح فلمی گانے گا سکے نہ حسینی کی بی بی کی طرح گھر سواں پائجامہ پہن کر ٹھمک ٹھمک چلنا اسے آئے۔ مگر وہی ہم وطنی۔ پردیس کی اس اجنبی دنیا میں رم دیا ہی قمرن کا دکھ سکھ سمجھ سکتی تھی۔ شاگرد پیشے کی سوسائٹی میں مالی کا رتبہ بہت نیچے پہنچتا تھا مگر بہن کمرن النساء کی ہمجولی تھی تو رم دیا۔ رم دیا گورکھپور کی رہنے والی تھی۔ قمرن کی طرح نو دس برس کی عمر میں اس کا بھی بیاہ گونا سب ہو گیا تھا۔ رام اوتار اس سے صرف تیس سال بڑا تھا۔ آج سے کئی سال قبل قمرن کے یہاں آنے کے کچھ عرصے بعد ایک روز رام اوتار اسے اکے پر بٹھلا کر اسٹیشن سے لائے تھے۔ وہ رام بانس کی سرخ ساری پہنے ہچکو ہچکو روتی اتریں۔ پہلے انھیں کوٹھی میں سلام کروانے کے لئے پیش کیا گیا اس کے بعد شاگرد پیشے میں وہ دوسرے ملازمین کی بیبیوں کے لئے موضوع گفتگو اور لڑکے بالوں کے لئے تماشا بنیں۔ چھوٹی سی دس سالہ دلہن۔ سب سے آخر میں قمرن نے ان کے قریب جا کر ان سے باتیں شروع کیں۔ معلوم ہوا یہ تو اپنے دیس کی ہیں۔ ان کی بڑی بہن مسماۃ ہر دیا مرزا پور ہی میں قمرن کے گاؤں میں بیاہی گئی تھیں۔ اے لیجئے یہ تو بی رم دیا سے سمدھیانے کا رشتہ نکل آیا۔ بس اس دن سے رم دیا اور قمرن گوئیاں تھیں۔ چھوت چھات کے باوجود آپس میں لین دین بھی رہتا۔ قمرن رم دیا کی ہتھیلی پر چائے کی پتیاں اوپر سے رکھ دیتیں۔ لیو — کوٹھریا ما جائے کے چاہ بنا کے پی لیو — اسی طرح پھل پھلاری امرود گنے سنگھاڑے سے ایک دوسرے کی تواضع ہوتی۔ جاڑوں میں گھنٹوں شاگرد پیشے کے پچھواڑے پھلواری میں قمرن اور رم دیا کھاٹ پر بیٹھی باتیں کیا کرتیں۔ ساریاں ہر سنگھار میں رنگ کر منڈیر پر سکھائی جاتیں۔ چاول

بینے جاتے۔ قمرن رم دیا کو کروشیا سکھلاتیں۔ کبھی کبھی حسینی کی بی بی جو ہی خانم ادھر آنکلتیں اور دیکھتیں کہ دونوں پورنیں بیٹھی چاول صاف کر رہی ہیں یا چادر پہ منگوچیاں سکھا رہی ہیں تو حسینی کی بی بی ناک بھوں چڑھا کر سوتن یا زمرد سے کہتیں — دریبر کی بی بی نے بھی کیا اہیرن سے بہناپا گانٹھ رکھا ہے —

پھر جب نگار فلم نئی نئی آئی اور اس کا ریکارڈ کوٹھی میں آئے تو ایک گانا قمرن کو بےحد پسند آیا — دھوبیوں کا گانا جس میں مرزاپور کا نام آتا تھا — مرجا پور ہیں اورن ٹھورن کاشی ہمارو گھاٹ — قمرن طلعت کے کمرے کی دہلیز پر اکڑوں بیٹھ جاتیں اور فرمائش کرتیں ربٹیا وہ دھوبین والا توا پھر بجا دیجے — اس کے علاوہ کنگن فلم میں قمرن کو ایک اور گیت پسند آیا تھا — ارے رے کبیر سن رے کبیر — رمیا کی جورو نے لوٹا بجار — اس میں رمیا کی بی بی کے بجاتے قمرن حسینی کی بی بی گاتیں اور بہت خوش ہوتیں۔ جواباً حسینی کی بی بی کسی دوہے میں قمرن کا نام چپکا دیتیں اور اسی طرح مزے مزے نوک جھونک چلا کرتی۔

گنگا دین سائیس ابھی بچلر تھا۔ لہٰذا کوٹھی سے لے کر شاگرد پیشے تک ساری خواتین کو اس کے رشتے کی بڑی فکر تھی۔ خالہ بیگم نے ان گنت کہاریوں سے اس کی بات لگائی۔ رام اوتار تو اسے اپنا ہم زلف بنانے پر ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ اس کی ایک چھ سالہ سالی گورکھپور میں موجود تھی۔ رم دیا بھی اس کی بہت خاطریں کرتی۔ رم دیا کی بہن چھ سال کی تھی تو کیا ہوا دو تین برس میں بڑی ہو جائے گی۔ مگر مصیبت یہ ہوئی کہ گنگا دین ضرورت سے زیادہ پڑھ لکھ گیا تھا اور شادی پر تیار ہی نہ ہوتا تھا۔

اس کے پڑھ لکھ جانے کی وجہ یہ ہوئی کہ گلفشاں میں اکثر مختلف النوع مشغلوں کی ہوا چلا کرتی تھی۔ ایک زمانے میں فی شخص نے میوزک سیکھنا شروع کی۔ بھیا صاحب برآمدے میں بیٹھے سورج بخش سرلیواستوا سے فیض حاصل کر رہے ہیں۔ صبح صبح بھیرویں اڑ رہی ہے دھن دھن مورت کرشن مراری۔ تیسرے پہر کو چائے کی میز پر گانا ہو رہا ہے۔ سب آوازیں ملا رہے ہیں۔ طلعت تو باقاعدہ میرس کالج میں داخل تھی لیکن کمال اور اپنی سارے کزن لوگ پانچویں سواروں میں شامل تھے۔ خالہ بیگم ڈھولک کے گیت بہت اچھے گاتی تھیں۔

امام باندی میراسن مع اپنے خاندان کے تقریبوں کے موقعے پر آکر ہفتوں گلفشاں میں رہتی تھی سوسن اور زمرد دادرے گاتی تھیں۔ قصہ مختصر بچہ بچہ رتن جھنکہ بنا ہوا تھا۔ پھر جب قدیر نے پھوٹوگرافی شروع کی تو دیکھا کس طرح کیمرے ہاتھ میں لئے گھوم رہا ہے بلی کتوں کی تصویریں کھینچی جا رہی ہیں۔ اس کا شوق بھی جلد ختم ہو گیا۔ اسی طرح گرام سدھار کا سلسلہ کچھ عرصے چلا۔ تعلیم بالغاں کی تحریک ازابلا تھوبرن میں شروع کی گئی تھی۔ ہر لڑکی پر ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ کم از کم دو ان پڑھ لوگوں کو زیورِ علم سے آراستہ کرے۔ خالی گھنٹوں میں لڑکیاں کیمپس پر کالج کے ملازموں کو پڑھاتی نظر آتیں۔ شام کو آس پاس سے غریب غربا آکر گلفشاں کی برساتی کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتے۔ برساتی کے بلب اور باغ کے لیمپ کی روشنی میں الفاظ کی ہجے کرتے۔ گھر کی لڑکیاں اور لڑکے ان کو اردو اور ہندی سے فیض یاب کرتے۔ برساتی کا بلب اور باغ کا لیمپ بہت مدھم تھا مگر غریب غربا نہایت ذوق و شوق سے رات گئے تک پڑھتے۔ قدیر سخت کند ذہن ثابت ہوئے۔ ویسے بھی وہ بہت بُڈھے تھے ان خرافات میں کیا پڑتے۔ گنگادین البتہ انگوچھا سر پر لپیٹا سب سے پہلے تعلیم بالغاں کی طرف لپکا۔ امین آباد کے پستک بھنڈار سے ہندی کا قاعدہ خرید لایا اور سب سے زیادہ ہونہار شاگرد ثابت ہوا۔ اب تو خیر وہ بہت بڑھ گیا تھا۔ فرفر ہندی ناولوں کا مطالعہ کرتا تھا اور ارادہ کر رہا تھا کہ ہندی مڈل کا امتحان پاس کر ڈالے۔

چنانچہ گنگادین چھ سالہ بچی سے بیاہ کرنے کی دقیانوسی تجویزیں سنی ان سنی کر دیتا۔ اور دوں کی طرح اس نے بھی بھیا صاحب کو اپنا آئیڈیل بنا رکھا تھا۔ جب بھیا صاحب ابھی بیاہ نہیں کرتے ہیں تو ہم کا ہے کری۔ اسے طلعت نے یہ بھی بتا رکھا تھا کہ انگریزوں کے کوی رڈیارڈ کپلنگ نے اس کا ذکر کیا تھا اور اس کے متعلق ایک فلم بھی انگریزی میں بن چکی ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ گنگادین نہایت روشن دماغ ہستی تھی اور بھیا صاحب کا اصل جان نثار خادم۔ لڑکپن میں وہ سائیس کی حیثیت سے آیا تھا۔ شمبھو کے مرنے کے بعد اسے کوچبین کا عہدہ مل گیا تھا۔ اسے اپنی فٹن سے بے حد محبت تھی اور اس کے مقابلے میں وہ قدیر کی شیورلے کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔

یہ فیٹن بڑے ابّا مرحوم کی تھی یعنی بھیّا صاحب کے والد کی۔ ان کے انتقال کے بعد جب بھیّا صاحب گلفشاں میں رہنے کے لئے آئے اور سارے ساز و سامان کے ساتھ فٹن مع گنگادین یہاں منتقل کر دی گئی۔ پٹرول راشننگ شروع ہوئی تو دفعتاً گنگادین کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ اب وہ قدیر کو طعنے دیا کرتے۔ اب چلاؤ نا اپنی موٹریا۔ ہیں دیکھو۔ ہٹلر کا کھٹکا نہ کچھ نہ کچھ۔ مزے سے دندناتے ہیں۔

گنگادین بھیا صاحب کا رفیق خاص تھا۔ ان سے اس کی وفاداری اس لئے زیادہ تھی کیونکہ وہ بہرحال ان کے مرحوم والد کا ملازم تھا اور ان کے گھر سے یہاں آیا تھا۔ اکثر بڑے سرکار کو یاد کر کے روتا۔ اپّی اور بھیّا صاحب کے بیاہ کے سلسلے میں بھی وہ اپنی رائے محفوظ رکھتا۔ کیونکہ گوئنبا کا کہنا تھا کہ یہ رشتہ ضرور ہونا چاہئے لیکن بھیّا صاحب نے اپنی رائے محفوظ رکھی ہوئی تھی۔

بیرے کا نام امیر خاں تھا۔ یہ بے حد نیک اور مرنجان مرنج فلسفی قسم کے انسان تھے خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہتے۔ انتہائی مفصل سوالات کا صرف جی ہاں یا جی نہیں میں جواب دیتے۔ یہ بھی بے حد وضعدار آدمی تھے۔ بلّی تک کا ذکر بڑے احترام سے کرتے۔ آ گئیں۔ چلی گئیں۔ جی ہاں بیگم صاحب، دودھ ابھی انھوں نے پیا ہے۔ ابھی کھڑکی میں سے کود کر بھاگ گئیں۔

۳۷

سن چالیس کے دسمبر میں طلعت کو جونیر کیمبرج کا امتحان دینا تھا۔ اسی سال ستمبر کے مہینے میں اسے ڈبل نمونیہ ہو گیا۔ روتے روتے اس نے بُرا حال کر لیا۔ ہمارا ایک سال برباد گیا۔ ہمارا ایک سال برباد گیا کی رٹ لگائے رکھتی۔ سارا گھر اس کی دلجوئی میں لگا رہتا کمال اس کے لئے کہیں سے ایک ریڈیو جیکسر اٹھا لایا۔ وہ نوابوں کی طرح تکیے کے سہارے بیٹھ جاتی اور دس سال پہلے کی خاموش فلمیں ملاحظہ کرتی جو جانے کہاں سے حاصل کی گئی تھیں۔ دیوار پر گزرے ہوئے وقتوں کے سائے ڈولتے بڑے عجیب سے لگتے۔ روڈولف ویلنٹو۔

ڈگلس فیربینکس، گلوریا سوانسن۔ دو دس سال پرانی ہندوستانی فلمیں بھی تھیں جن میں سلوچنا گھوڑے کی سواری کرتی اور ای بلی موریہ تلوار چلاتا۔ اتوار کے دن اپی کی سہیلیاں ٹہلتی ہوئی آجاتیں اور اس کے پاس بیٹھ کر گپیں ہانکا کرتیں۔ یہ بڑی اسمارٹ، باوقار، اور سنجیدہ لڑکیاں تھیں۔

دن بھر طلعت پلنگ پر لیٹی رہتی یا گنگا دین کو مزید ہندی پڑھاتی۔ اس نے کمال، ہری شنکر، بھیا صاحب اور آپی کی مہیا کی ہوئی ساری دلچسپ کتابیں پڑھ ڈالیں مگر اس غم کا مداوا کس کے پاس تھا کہ نومبر میں سالانہ امتحان تھے اور وہ بیمار پڑی تھی۔

ایک دن صبح صبح ہری شنکر اس کے کمرے میں آیا: "طلعت — ایتینت مورکھ کنیا ستی" اس نے بڑے ڈرامائی انداز میں سنسکرت بولی

"کیوں۔"

"مت روہے نر بدھی — مت رو۔"

"کیوں نہ روؤں۔"

"اس لئے نہ رو کہ تیرے کلیان کی ہم نے ویوستھا کر لی ہے — ہم تیرا داخلہ ٹرولا سے اسکول میں کروا رہے ہیں۔ تو اپریل میں ہائی اسکول کا امتحان دینا اور مزے سے اگلے سال لا مارٹینیر کے نویں اسٹینڈرڈ میں گھس گھس کرنے کے بجائے آئی ٹی کالج میں وندنا نا۔"

"رگھبیر باما کے اسکول میں —؟" طلعت نے سانس روک کر پوچھا۔

"ہاں۔" ہری شنکر نے جواب دیا اور اسی ڈرامائی انداز سے دوسرے دروازے سے غائب ہوگیا۔

نرملا کو جب معلوم ہوا کہ طلعت ہائی اسکول کا امتحان دے کر آئی ٹی پہنچا ہی چاہتی ہے تو اس نے مہنا متھ مچادی۔ لہٰذا لا مارٹینیر چھوڑ کر طلعت کے ساتھ وہ بھی نئے اسکول میں بھیج دی گئی۔

ٹرولا اسکول اپنی جگہ ایک تاریخی اہمیت کا مالک تھا۔ لال باغ میں بنز و روڈ پر ایک پرانی عمارت تھی جس میں شاہی کے وقتوں کا بڑا پھاٹک، برجیاں، شہ نشین، غلام گردشیں

اب تک موجود تھیں۔ اس کے آگے بڑا لان تھا۔ عمارت کے گرداگرد چٹائی کی دیواریں کھڑی کر دی گئی تھیں جن پر نیلے پھولوں کی بیلیں چڑھی تھیں۔ یہ رگھو ماما کا اسکول تھا۔ بنارس یونیورسٹی سے منسلک تھا اور رنگی چنگی لڑکیاں اس میں پڑھتی تھیں۔ بالکل گھر کا سا ماحول تھا۔ برابر کے مکان میں رگھو ماما مع اپنے خاندان کے رہتے تھے۔ یہ بے حد فرشتہ صفت انسان تھے
پرانے مدرسہ نگر کی کائستھ لڑکیاں، شہر کے چیدہ چیدہ خاندانوں کی سُپتریاں موٹروں میں بیٹھ کر آتیں اور یہاں زیورِ علم سے آراستہ ہوتیں۔ یہاں اسٹاف اور لڑکیاں سب کا ایک دوسرے سے کوئی نہ کوئی ناطہ تھا۔ یہ رشتے خون کے نہیں بلکہ وضعداریوں کی وجہ سے قائم تھے۔ یعنی ماما۔ باجی۔ آپا۔ دیدی۔ بھیا۔ اسی طرح حفظِ مراتب کا خیال رکھا جاتا۔

بعض لڑکیاں بے حد دلچسپ تھیں۔ مثلاً حمیدہ بانو۔ جو وسط شہر کی ایک زبردست محلسرا میں رہتی تھی۔ شاعری کرتی تھی اور سخت رومینٹک روح تھی۔ بینا ماتھر کتھک کی ماہر تھی اور ہر سال آل انڈیا میوزک کانفرنسوں سے بڑے بڑے کپ اٹھا لاتی تھی۔ مہر آرا ایک ایسی نواب زادی تھیں جن کی خواصیں ان کا خاصدان لئے ساتھ ساتھ رہتی اور پیچھے کھڑے ہو کر انہیں پنکھا جھلتی رہتی۔ یہ سب لڑکیاں ایک دوسرے کے خاندانوں کی سو پشت سے واقف تھیں۔ سب ایک طرح کے ماحول کی پروردہ تھیں۔ ان سب کی اس شہر اور اس طبقے کی ساری سوسائٹی کی اس طرح جتھہ بندی تھی جیسی چوروں کے یہاں ہوتی ہے۔

میوزک کلاس پھاٹک کے اوپر والے کمرے میں تھی۔ فرش پر نیلی دھاریوں والی دری بچھی تھی۔ اس کے برابر کی برجی میں تنگ و تاریک زینہ تھا۔ برجی کے موکھوں میں سے ہلکی ہلکی روشنی اندر آتی۔ چھٹی کے گھنٹے میں لڑکیاں ان سیڑھیوں پہ بیٹھ جاتیں اور حمیدہ بانو جس کے یہاں ڈرامے کا احساس بے حد شدید تھا اپنا سر ہلا کر بڑے پُراسرار انداز میں کہتی "شاہِ زمن غازی الدین حیدر کی انگریز سالی اشرف النساء بیگم یہاں رہتی تھیں۔ ان کی بہری کو بادشاہ کے آدمیوں نے اسی زینے پہ قتل کیا تھا۔"

"کیوں گپ مارتی ہو —" کُسم بحث کرتی "کون اشرف النساء بیگم۔ وہ جان ہاپکنز والٹرز کی لڑکی — ؟"

"ہاں وہی۔"

"وہ تو بیگم کوٹھی میں رہتی تھیں۔"

"اپنی ماں سے لڑکر یہاں چلی آئی تھیں — مجھے معلوم ہے۔"

حمید بانو سے لکھنؤ کی تاریخ کے متعلق کوئی زیادہ بحث نہ کرسکتا تھا۔ اسے دیکھ کر خواہ مخواہ یہ خیال آتا کہ یہ خود سو سال پہلے کے لکھنؤ کا کردار ہے جو اس پرانی برجی میں سے جھانک کے ہم سے باتیں کر رہا ہے۔ ابھی زینے کا دروازہ بند ہوگا اور یہ غائب ہوجائے گی۔ طلعت کو یقین تھا کہ بڑی ہوکر حمید بانو، بیگم عبدالقادر اور حجاب امتیاز علی کی طرز کے افسانے لکھا کرے گی۔

ہر گھنٹہ بجتا اور رگھو ماما کی بی بی اپنے رسوئی گھر سے نکل کر کمر پر ہاتھ رکھ کر چلاتیں — اری لڑکیو — چلو باٹنی پڑھنے — یہ کانتی دیدی تھیں اور ان کو دیکھ کر کسی کے سان وگمان میں یہ بات نہ آسکتی تھی کہ یہ بی الہ آباد یونیورسٹی کی ایم۔ایس۔سی ہیں اور اوپر سے گولڈ میڈلسٹ الگ۔ بوٹنی پڑھانے کے بعد وہ لپک کے پھر رسوئی گھر میں جا گھستیں اور رگھو ماما کے لئے کھانا بنانا شروع کردیتیں۔

ایک مرتبہ کیا ہوا کہ اردو فارسی والے مولوی صاحب جو ایک بہت بوڑھے کشمیری پنڈت تھے، بیمار پڑگئے۔ رگھو ماما نے نرملا سے کہا "ذری ہری شنکر سے کہہ دینا اپنے اردو فارسی پڑھا جایا کرے۔" چنانچہ اگلے روز ہری شنکر بہت رعب داب سے کھنکھارتے ہوئے کلاس میں آئے۔ اور نہایت سنجیدگی سے اردو پڑھانے میں مصروف ہوگئے۔ بنارس یونیورسٹی کے مولوی مہیش پرشاد کا انتخاب اور ہری شنکر جیسے سخت گیر استاد کی پڑھائی۔ لڑکیوں کی جان نکل کر رہ گئی۔ اردو کے گھنٹے میں بسنتی جھری باغ میں آکر لڑکیوں کو مطلع کرتی۔

"بٹیا چلیے — چھوٹے مولی صاحب آئے گئے۔"

لہٰذا ایک ماہ تک جب تک انھوں نے اس جامعہ میں درس دیا۔ یہ اسپیشل طور پر مولوی ہری شنکر کہلاتے رہے اور اپنی سخت گیری اور بدمزاجی کی دھاک بٹھا کر واپس لوٹے۔

صورتِ حال یہ تھی کہ کانتی دیدی بوٹنی پڑھاتی تھیں۔ ان کی خالہ زاد بہن جوگیشوری دیدی سنسکرت کی اُستاد تھیں۔ مالتی رائے زادہ کے بھائی سورج بخش شعبہ موسیقی کے صدر تھے۔ ہری شنکر تو اُردو فارسی پڑھا ہی رہے تھے حالات قابو سے باہر اس وقت ہوئے جب مس موناداس کی شادی لال باغ کے میتھوڈسٹ چرچ کے آرگنسٹ مسٹر جان فضل مسیح سے قرار پائی اور اُنھوں نے ایک مہینے کی چھٹی لی تو رگھبیر ماما نے طلعت کو حکم دیا کہ وہ جغرافیہ کی کلاس لیا کرے کس واسطے کہ وہ جغرافیہ میں بے انتہا ہوشیار تھی۔ یہ کلاس اس قدر پُرلطف ثابت ہوئی کہ جب مسز فضل مسیح تنگ آستینوں والا نیا گرم کوٹ اور کانوں میں چھوٹے چھوٹے سونے کے بُندے پہنے واپس آگئیں تو لڑکیوں کو بڑا رنج ہوا۔ اور اُنھوں نے گھڑونچوں کے پاس ٹھنڈی زمین پر بیٹھ کر طلعت کو الوداعی پارٹی دی جس کے لئے رگھو ماما کی رسوئی میں پھلکیاں تیار کی گئی تھیں۔ اس موقع پر باقاعدہ تقاریر ہوئیں جن میں طلعت کی استادانہ صلاحیتوں پر روشنی ڈالی گئی۔

وہ دن بھی ایک تاریخی اہمیت رکھتا تھا جب مسز فضل مسیح نے اپنے نئے گھر میں لڑکیوں کی دعوت کی اور جب طلعت اپنی اکلوتی نیلی کارچوبی ساری پہن کر مقبرہ کمپاؤنڈ گئی۔ کیونکہ اس روز سے پہلے طلعت نے ساری کبھی نہیں پہنی تھی۔ آج اسے احساس ہوا کہ وہ واقعی بڑی ہوگئی ہے

حضرت گنج میں انگریزی دوکانوں کے درمیان ایک بڑا سا شاہی کے زمانے کا پھاٹک ہے۔ جس کے اندر وسیع احاطہ میں سامنے ہی اودھ کے دسویں حکمران امجد علی شاہ بادشاہ کا مقبرہ اور امام باڑہ نظر آتا ہے۔ اس عمارت پر قیامت کی ویرانی اور نحوست برستی ہے اس کے چاروں طرف احاطے کے کنارے کنارے جو کوٹھریاں بنی ہیں ان میں اب نچلے متوسط طبقے کے عیسائی رہتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے چھوٹے چھوٹے کمروں کے آگے صاف ستھرے بل غیچے لگا رکھے ہیں۔ ان کمروں میں ننھے منے ڈرائینگ روم ہیں جن میں کاٹیج پیانو رکھے ہیں۔ اور کھڑکیوں میں جالی کے پردے پڑے ہیں عیسائی عورتیں نیچے نیچے فراک یا انگی ساڑیاں پہنے اپنے باغیچوں میں کھڑی ہو کر اپنی اولاد کو کھیلتا کودتا دیکھتی ہیں۔

یہ بڑے خاموش طبیعت اور شریف لوگ تھے اور ان کا اس قسم کی زندگی سے واسطہ نہیں تھا جس کے ساتھ عام طور پر اس فرقے کے افراد کو منسوب کیا جاتا ہے۔ مثلاً ان کی نوجوان لڑکیاں آوارہ نہیں تھیں اور ان کے لڑکے جینز پہن کر ناچتے نہیں تھے۔ اس وقت امریکہ لاکھوں میل دُور تھا۔

سبطین آباد کا مقبرہ سال بھر اُجاڑ پڑا بھائیں بھائیں کرتا رہتا۔ خالی محرم کے زمانے میں اس میں چہل پہل ہوتی۔ تب یہاں بڑی زبردست زنانی اور مردانی مجالس ہوتی تھیں۔ امام باڑے کے چبوترے کے نیچے کوٹھریوں اور تہ خانوں میں عیسائی فقیرنیاں رہتی تھیں۔ بعض مرتبہ تو ایسا محسوس ہوتا کہ بے چارے امجد علی شاہ بادشاہ خود بھی ہندوستانی عیسائی تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب جنرل اوٹرم نے لکھنؤ پر قبضہ کیا تو اس امام باڑے میں انگریزی چرچ بنایا گیا تھا اور لارڈ کیننگ اس میں عبادت کرنے کے لئے تشریف لائے تھے۔

یہاں سابق مس مونا داس اور موجودہ مسز فضل مسیح نے چھوٹے سے انتہائی نفاست سے سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں اپنی طالبات کو چائے پلائی اور لڑکیوں نے ان کی شادی کا تحفہ جو وہ راستے میں امین آباد سے خریدتی لائی تھیں ان کو پیش کیا۔ اور سب نے مل کر انگریزی گانے گائے۔

لا مارٹینیئر کے خالص یوروپین ماحول کے بعد ٹنڈوالا اسکول بالکل ایک دوسری دنیا تھی طلعت اور نرملا اپنے طبقے کے دوسرے افراد کی طرح دورنگی فضاؤں کی پروردہ تھیں جسے انڈو یوروپین تہذیب کہا جا سکتا ہے۔ اس طبقے میں بچے (bilingual) پیدا ہوتے تھے۔ انگریز گورنسوں کے ساتھ ساتھ قصباتی کھلائیاں اور انائیں ان کی پرورش کرتی تھیں۔ لڑکیوں کو کانونٹ اسکولوں میں پڑھایا جاتا تھا اور جب ان کی شادی ہوتی تھی تو وہ ہفتوں کے لئے مائیوں بٹھائی جاتی تھیں اور پرانے زمانے کی دلہنوں کی طرح شرماتی تھیں اکثر ان کی شادیاں ان کی خلاف مرضی بھی کر دی جاتی تھیں۔ یہ لوگ موڈرن ہو چکے تھے لیکن الٹرا موڈرن نہیں بنے تھے۔ اخلاقی اقدار کے لحاظ سے یہ لوگ وکٹورین تھے اور اپنی میتھو روایات کے بھی بڑی شد و مد سے پابند۔ ظاہری طور پر انھوں نے مغربیت کا رنگ قبول

قمرن چونکہ سارے میں ڈرائیور کی بی بی کہلاتی تھیں۔ تقدیر بھی اسی نام سے مخاطب کرتے۔ تیسرے پہر کو کمال اور اپّی اور طلعت اور بھیّا صاحب اپنے اپنے کالجوں سے لوٹتے گھر میں ایک دم چہل پہل شروع ہو جاتی۔ کھانے کے کمرے میں برتن کھنکھناتے۔ چائے کی کشتیاں تیار ہو کر مختلف کمروں میں بھیجی جاتیں یا سب اماں بیگم کے کمرے میں جمع ہو جاتے۔ ایک پیالی چائے قمرن کو بنا کر دی جاتی۔ اپّی اور طلعت ان سے کچھ تبادلۂ خیالات کرتیں۔ اتنے میں موٹر برساتی میں داخل ہوتی۔ تقدیر خان بہادر صاحب کو عدالت سے واپس لاتے۔ موٹر کی آواز سن کر قمرن گھونگٹ کاڑھ لیتیں اور بچھّن کو گود میں اٹھا کر پھر اپنے کاٹیج کی طرف روانہ ہو جاتیں۔

وہ بے حد وضعدار آدمی تھیں۔ برسوں اودھ میں رہ لیں۔ لیکن اپنی خو بو نہ چھوڑی۔ ایک مرتبہ حسینی خانساماں کی بی بی نے ان سے کہا۔ اے بہنی — کبھی کھڑے پائنچے بھی تو پہن کر دیکھو — اور قمرن نے ہونٹ بچکا کر جواب دیا تھا —— ہم کوئی پتریا ہوں — جو ای پہناوا پہنی — لہٰذا بہن قمرالنساء اپنی گاڑھے کی سفید دھوتی ہی پہنا کیں اور اسی طرح گھونگٹ کاڑھے گھومتی رہیں جیسے آج ہی بیاہ کر آئی ہوں۔ نہ کبھی شہر کی مہریوں کی طرح انھوں نے آتی ہوں جاتی ہوں والی زبان سیکھی۔ جب انھوں نے پہلی مرتبہ لکھنؤ کی لڑکیوں کی گفتگو سنی — بڑی بٹیا اپنی کسی سہیلی سے کہہ رہی تھیں —— "اللہ آپ کہاں جاتی ہیں حضور جائے آپ کا دین ایمان۔ یہ اپنی ادائیں تو رکھئے چھپر پر۔ میں کہے دیتی ہوں۔ زری میرے دماغ میں بھی خنّاس ہے" —— اور کوٹھی کی صاحبزادیوں ہی پر کیا موقوف تھا۔ مہریاں اور مامائیں تک ایک سے ایک فقرے باز پڑی تھیں —— تو قمرن حیران پریشان کھڑی سنا کیں۔ شاگرد پیشے میں واپس آکر قمرن خوب ہنسیں۔ تقدیر جب باہر سے کام نمٹا کر آئے تو ان سے ماجرا بیان کیا۔ شہر کی بیٹیاں پتریں ایسی ہوت ہیں۔ سارا پہناوا بھی پتریں ایسا بلٹے۔ تقدیر ان کے اس بھولپن پر بہت ہنسے اور ان کو دنیا کے حالات سے آگاہ کیا کہ یہ پتریں کی بولی نہیں۔ یہ ٹکسالی اور بیگماتی زبان کہلاتی ہے۔ تم بھی اب اسی طرح بولا کرو۔ آتی ہوں۔ جاتی ہوں۔ اب تو خیر ان کو لکھنؤ میں رہتے دس سال ہونے آئے تھے مگر اس کے باوجود حسینی کی بی بی سے

مکمل کر رگھو ماما کے یہاں گئیں تو وہاں بھی اسی طرح گھل مل گئیں جس طرح وہ لا مارٹینیر کی یوروپین فضاؤں میں گھلی ملی ہوئی تھیں۔

ہر تہوار کے روز رگھو ماما کے آنگن میں ساری لڑکیاں جمع ہوتیں۔ کڑھائی چڑھائی جاتی چٹائیوں پر بیٹھ کر چھپی ہوئی ساریوں میں لپکا ٹانکا جاتا۔ ڈھولک پر بجے اسے گوری تیا گایا جاتا کیرتن اور قوالی ہوتی۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا کہ دروازے پر بارات آنے والی ہے۔ اس خوش باش خاندان میں پچیس ہندو لڑکیاں تھیں۔ اتنی ہی مسلمان۔ اور دو لڑکیاں عیسائی تھیں جن میں سے ایک لال باغ کے پادری صاحب کی بیٹی تھی اور فراک پر دوپٹہ اوڑھ کر آتی تھی۔ اس بشاش گھریلو ماحول کے ساتھ ساتھ رگھبیر ماما کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نگاہ کے نظریے میں یقین رکھتے تھے۔ پرانے مدرسۂ فکر کے کائستھ تھے اور خود ان کو مکتب میں مولوی صاحب نے قمچیاں مار مار کر پڑھایا تھا۔ لہٰذا وہ بھی پڑھاتے پڑھاتے لڑکیوں کو ادھ موا کر دیتے بہت سخت قوم پرست تھے۔ ترکِ موالات کے زمانے میں جیل کاٹ چکے تھے۔ اب منتظر بیٹھے تھے کہ کب مہاتما گاندھی حکم دیں اور کب وہ ستیہ گرہ شروع کریں۔ جنگ چھڑے ایک سال ہو چکا تھا۔ کانگریس کی حکومت مستعفی ہو چکی تھی۔ سیاسی حالات بد سے بد تر ہوتے جا رہے تھے۔

مارچ کا مہینہ آیا اور لڑکیاں امتحان کے لئے بنارس جانے کو تیار ہوئیں۔ کمال اور ہری شنکر، نرملا اور طلعت کو اسٹیشن پہنچانے کے لئے آئے۔ ”چلو، ہمارے پرچے ختم ہو جائیں تو ہم بھی آتے ہیں پیچھے پیچھے۔ بہت دنوں سے رام نگر کے آم نہیں کھائے۔“ طلعت نے کہا۔ یہ ان دونوں کا پرانا وطیرہ تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں آتی نہیں اور دونوں نے نکل گھر سے راہ جنگل کی لی۔ سارے ملک کی خاک چھانتے پھرتے تھے۔ جانے کہاں کہاں جلسے اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا جلسہ ہے۔ حیدر آباد دکن جا رہے ہیں۔ اندرا نہرو نے میٹنگ بلائی ہے۔ الٰہ آباد کا قصد ہے۔ فلاں دوست کلکتے میں اکیلا بور ہو رہا ہے ذرا وہاں تک ہو آئیں۔

”بنارس سے کہاں جاؤ گے۔“ نرملا نے پوچھا

"ارے ہم سنیاسی آدمی۔ ہمارا کیا پوچھتی ہو جدھر منہ اُٹھا یا نکل گئے۔" کمال نے منہ لٹکا کر کہا۔ لڑکیاں پلیٹ فارم پر اپنے سوٹ کیسوں کے پاس کھڑی باتیں کررہی تھیں رگھو ماما سفر کا انتظام کرتے بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔

"ایسے بڑے سنیاسی ہی تو ہو۔ بگلہ بھگت کہیں کے۔" نرملا نے ہنس کر کہا۔

"کاشی کی پاٹھ شالاؤں میں بڑی منوہر کنیائیں پڑھتی ہیں۔" ہری شنکر نے آنکھ بند کرکے کہا۔

"شرم کرو بھتیجو۔" طلعت نے کہا "یہ سامنے تمہاری اسٹوڈنٹ لوگ کھڑی ہیں، کیا کہیں گی کہ مولوی صاحب ایسی افسوسناک باتیں کرتے ہیں۔"

ہری شنکر فوراً پلٹ کر بڑی سنجیدگی سے حمیدہ بانو کے پاس گیا۔ اور نہایت رعب اور وقار کے ساتھ اس کو سمجھانے لگا کہ امتحان کے لئے غالب کی کون کون سی غزلیں پڑھے۔

ٹرین آئی اور یہ دلچسپ قافلہ بنارس کی طرف روانہ ہو گیا۔

۳۸

چمپا احمد نے بیسنٹ کالج کے کلاس روم کے دریچے میں آکر نیچے نظر ڈالی۔ لو چل رہی تھی۔ دور سڑک پر ایک بگولہ اڑتا ہوا جارہا تھا۔ سارے میں املتاس کے زرد پتے تیرتے پھر رہے تھے۔ نیچے کالج کا وسیع بے رونق میدان گرمی کی سہ پہر میں پڑا تپتا تھا۔ جانے بارش کب ہوگی۔ چمپا نے سوچا۔ سفید کھادی کی ساریاں پہنے لڑکیوں کی ایک ٹولی کالج کی دوسری عمارت کی طرف جارہی تھی۔ کلاس روم کے ڈائس کے اوپر سے مسز اینی بیسنٹ کی بڑی رنگین تصویر مسکرا رہی تھی۔ یہ مسکراہٹ بھی چمپا کو بہت اداس معلوم ہوئی۔ گھنٹہ بجا اور لڑکیاں برابر کے کمرے سے نکل کر باہر آئیں۔ لیلا بھارگوا کے ہمراہ اس نے زینہ طے کرنا شروع کیا قریب کے ایک برآمدے میں ہائی سکول کے امتحان کا کوئی پرچہ کیا جارہا تھا۔ چھتری سنبھال کر وہ اور لیلا سڑک پر نکل آئیں۔ ابھی انھیں کسی پروفیسر سے ملنے یونیورسٹی جانا تھا۔ تانگے پر بیٹھ کر وہ یونیورسٹی کی طرف روانہ ہوئیں۔

یہ چمپا کی زندگی کا معمول تھا۔ بسنت کالج۔ یونیورسٹی۔ گھر۔ جاڑے۔ گرمیاں۔ برسات پھر جاڑے۔ بنارس کا شہر۔ اپنا مکان۔ محلّہ۔ رشتے دار۔ کتابیں۔ وہ اٹھارہ سال کی تھی لیکن بوڑھوں کی طرح سوچتی تھی۔ شاعروں کی طرح محسوس کرتی تھی۔ بچّوں کی طرح ہنستی یا رنجیدہ ہوتی تھی۔ کائنات کا سارا بوجھ اس کے کندھوں پر تھا۔ اس کے والد متوسط طبقے کے ایک شریف آدمی تھے۔ ماں بھی متوسط طبقے کی ایک شریف خاتون تھیں۔ ان کے یہاں کوئی گلیمر نہ تھا۔ کوئی افسانے نہیں تھے۔ نہ کوئی روائتیں۔ سیدھے سادے لوگ تھے جس طرح کے سیدھے سادے لوگ ہندوستان کے شہروں میں بستے ہیں۔ چمپا کے والد وکالت کرتے تھے۔ مرادآباد کے رہنے والے تھے۔ چمپا کی ننھیال بنارس میں تھی۔ وہیں چمپا کے والد پریکٹس کرتے تھے۔ اوسط درجے کی آمدنی تھی۔ ان کے یہاں ٹیلیفون نہیں تھا۔ نہ موٹر کار۔ نہ فریجڈیر۔ اور وہ لوگ کوٹھی میں نہیں رہتے تھے۔ چمپا اپنے ماں باپ کی اکلوتی لڑکی تھی۔ اس کا سارا جہیز تیار رکھا تھا۔ دھڑا دھڑ پیغام آرہے تھے۔ گھر والوں کا خیال تھا کہ چمپا بی اے پاس کرلے تو اس کا بیاہ کردیں گے۔ چمپا نے کسی کانونٹ اسکول میں نہیں پڑھا تھا۔ نہ وہ گرمیوں میں مسوری جاکر رولر اسکیٹنگ کرتی تھی۔ اس کی ننھیال زیادہ خوشحال تھی۔ گو وہ بھی مڈل کلاس ملازمت پیشہ لوگ تھے۔ چمپا کے ایک ماموں بہت زیادہ خوشحال تھے اور لکھنؤ میں رہتے تھے جہاں ملا ئرحسی روڈ پر ان کی کوٹھی تھی۔ چمپا کے والد سیاست میں ہلکی پھلکی دلچسپی رکھتے تھے۔ اس کے ایک چچا مرادآباد سٹی مسلم لیگ کے صدر تھے۔ ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ میں جب دھوم دھام کا مسلم لیگ کا اجلاس ہوا تو اس میں بھی چمپا کے والد اور چچا دونوں شرکت کے لئے گئے تھے۔ راجہ صاحب محمودآباد جب بھی بنارس آتے چمپا کے والد اُن کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتے اور پاکستان کے مطالبے پر تبادلۂ خیالات کرتے۔ پاکستان بنا تو مرادآباد تک کا علاقہ تو اس میں ضرور شامل ہوگا۔ کیا وجہ کہ مغربی اضلاع میں مسلمان زیادہ طاقتور ہیں۔ چمپا کے والد اظہارِ خیال کرتے۔

"لے واہ۔ مرادآباد پاکستان میں شامل ہوجائے اور ہم کاشی والے کہاں جائیں۔" چمپا کی والدہ چمک کر کہتیں۔

"اجی تم پوربیوں کا کیا ہے۔ چلو تم کو بھی وہیں بلالیں گے۔" ان کے والد حقے کا کش لگا کر مذاقاً جواب دیتے۔ ان مبہم اور جذباتی بنیادوں پر یہ لوگ سیاست سے کھیل رہے تھے۔

ویسے بھی بنارس میں روز کوئی نہ کوئی آل انڈیا قسم کا ہنگامہ رہتا۔ یہ شہر ہندو مہاسبھا کا گڑھ تھا۔ اور ہندی انضوا ہندوستانی کی تحریک کا بھی یہی صدر مقام تھا۔

اسی بنارس میں پنچ گنگا گھاٹ تھا جہاں کبیر رہے تھے اور یہیں سارناتھ تھا۔ جہاں شاکیہ منی گوتم نے دھرم کا چکر چلایا تھا اور یہیں وشویشور کا مندر تھا۔ یہ شوپوری تھی۔ شو، خدائے مسرت کا شہر۔

چمپا، بسنت کالج جو بسنت کالج کہلاتا تھا سیکنڈ ایئر میں تھی۔ اس سال اس نے انٹر کا امتحان دیا تھا اور اب اُسے ازابلا تھوبرن کالج جانا تھا۔ کیونکہ اس ادارے میں تعلیم حاصل کرنے سے لڑکیوں کی سماجی حیثیت یکلخت بے انتہا بلند ہو جاتی تھی۔ چمپا کے والد ایک اچھے مسلم لیگی کی حیثیت سے اسے علی گڑھ بھیجنا چاہتے تھے مگر اماں نے کہا۔ نہ۔ یہ ہرگز نہیں ہونے کا۔ بٹیا تو آئی۔ ٹی میں پڑھیں گی جیسے رانی پھول کنور اور رانی صاحب بلارنی کی بیٹیاں آئی۔ ٹی میں پڑھت ہیں۔ چمپا کی اماں کو یہ بھی معلوم تھا کہ آئی ٹی میں پڑھنے والی لڑکیوں سے آئی۔ سی۔ ایس لوگ شادی کرتے ہیں اور پھر ان کے بڑے بھائی لکھنؤ میں رہتے تھے اور وہاں کے سارے بڑے بڑے لوگوں سے واقف تھے۔

چمپا کالج سے لوٹ کر آتی تو اپنے پچھلے کمرے میں بیٹھ کر جو چھت پر تھا افق تک پھیلے ہوئے شوالوں کے کلسوں کو دیکھا کرتی یا انگریزی کے ناول پڑھتی۔ وہ جین آسٹین پر عاشق تھی اور قرونِ وسطیٰ پر، اور انیسویں صدی کے کیٹس اور روزیٹی وغیرہ پر۔ جب وہ یونیورسٹی لائبریری میں ابنیندر ناتھ ٹیگور اور نند لال بوس کی تصاویر دیکھتی تو اُسے بے حد اچھا لگتا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ چمپا احمد بھی ایک رومینٹک روح تھی۔

لیلا جارلوا کے ساتھ وہ یونیورسٹی پہنچی۔ یہاں بھی امتحان کا ماحول ہر طرف طاری تھا گہما گہمی چہل پہل۔ کچھ چہروں پر پریشانی تھی کچھ پر اطمینان۔ یہ سب جانے پہچانے چہرے تھے۔ یہ لڑکے

اور لڑکیاں سب اسی کی دُنیا کے باسی تھے۔ مجمع میں چمپا کو تقویت محسوس ہوتی۔ ہجوم اس کے ساتھ ہے۔ ہجوم اُس کی حفاظت کرے گا۔ یہ لوگ سارے اس کے بھائی بند تھے۔ یونیورسٹی کے مختلف کالجوں کی طالبات۔ لیکچرر لڑکیاں۔ مدراسی اور بنگالی بوڑھے پروفیسر مہاراشٹر کی سائنس داں خواتین۔ سنسکرت اور فارسی کے عالم فاضل۔ یہ سب جو تیزی سے اور مصروفیت سے ادھر اُدھر آجا رہے تھے۔ یونیورسٹی علم کا گھر ہے۔ علم میں تعصب کس طرح داخل ہوتا ہے۔ یہ اسے معلوم نہ تھا۔ تعصب اور نفرت اور تنگ نظری، شکوک اور ہٹ دھرمی، ان بھوتوں سے وہ ابھی روشناس نہ ہوئی تھی۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کے آس پاس کی دُنیا میں بڑا زبردست شور مچ رہا ہے اور یہ شور اس کے دل کی اندرونی خاموشی میں مخل ہوتا ہے تو بڑی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

سامنے ایک بڑے چبوترے پر شامیانے کے نیچے ہائی اسکول کا میوزک کا پرچہ ہو رہا تھا۔ چاروں طرف سے لڑکیوں کے ہلکے ہلکے گنگنانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ انھیں لڑکیوں میں تیز وطرار اور بشاش چھوکریوں کا وہ گروہ شامل تھا جو لکھنؤ سے آیا تھا۔ چمپا اور لیلا مسز چٹرجی سے باتیں کرنے میں مصروف رہیں جو ان کی ہسٹری کی اُستاد تھیں۔ سامنے سرسوتی کا مرمریں مندر تھا۔ لڑکے اور لڑکیاں، فاؤنٹین پن اور کتابیں سنبھالے آتے۔ دیوی کے سامنے سر جھکا کر دُعا مانگتے اور اپنی اپنی امتحان گاہ کی طرف روانہ ہو جاتے۔

اتنے میں گھنٹہ بجا۔ شامیانے کے نیچے سے لڑکیوں نے نکلنا شروع کیا۔ دو لڑکیاں بچوں کی طرح اُچھلتی کودتی سیڑھیوں پر سے اُتریں اور بھاگ کے ایک اور گروہ سے جا ملیں جس کے وسط میں ایک سُورداس جی کھڑے تھے اور سب لڑکیاں جلدی جلدی اُن کو بتلا رہی تھیں کہ بھیوری کے پرچے میں اُنھوں نے کیا لکھا۔ یہ دونوں لڑکیاں فراک پہنے تھیں اور باقی کی ساری لڑکیوں کے مقابلے میں بہت کم عمر تھیں۔

اتنے میں دو نوجوان لڑکے جو شکل وصورت سے ان دونوں بچیوں کے بھائی معلوم ہوتے تھے مجمع میں کہیں سے نمودار ہوئے۔ رام نگر اسٹیٹ کی ایک کار رکی اور یہ چاروں اس میں جا بیٹھے۔ دوسرے لمحے کار دھول اُڑاتی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

لکھنؤ سے آئی ہوئی لڑکیوں میں ایک لیلا بھارگوا کو پہچانتی تھی۔ اُس نے قریب آن کر کہا۔" نمستے۔ لیلا دیدی۔ ہم لوگ امتحان کے بعد اپنے یہاں ایک پارٹی کر رہے ہیں۔ آپ ضرور آئیے گا۔"

"نمستے بینا ۔ یہ چمپا ہیں۔"

اُس نے دوبارہ نمستے کیا۔" آپ بھی آئیے گا چمپا دیدی۔"

"ضرور۔"

"تم لوگ تو میرس کالج والے ہو۔ تم سب کے ناچ گانے کی اتنی دھوم سُنی ہے۔ خالی پارٹی دے رہی ہو۔ تمہارا ناچ نہیں دیکھیں گے۔۔۔؟" چمپا نے پُوچھا

"چمپا دیدی کاشی اور لکھنؤ کا مقابلہ کروانا چاہتی ہیں ۔۔۔؟" ایک اور لڑکی نے قریب آکر کہا۔

"اچھا یہ بات ہے۔" بینا ماتھر نے جواب دیا۔" تو پھر ہو جائے فیصلہ۔ کہاں کی بھیرویں بہتر ہے۔ کہاں کا دادرا۔ کہاں کا کتھک۔ چلئے آیئے میدان میں۔"

"ربی ۔؟"

"ربی۔"

اب ان کے آس پاس لڑکیوں کا ہجوم لگ گیا۔ بنارس کی لڑکیاں لکھنؤ والیوں پر چوٹیں کر رہی تھیں۔ مگر لکھنؤ والیوں سے باتوں میں کون جیت سکتا تھا۔ وہیں طے کیا گیا کہ بسنت کالج میں ان لوگوں کو بنارس کا کتھک دکھایا جائے گا مگر اس سے پہلے وہ سب لکھنؤ کی لڑکیوں کے ہوسٹل پر دھاوا کریں گی۔

ان سب خوشدلی کی باتوں کے بعد چمپا اور لیلا پھر تانگے پر بیٹھیں اور اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو گئیں۔

۳۹

بنارس پہنچ کر طلعت اور زملا اور ساری لڑکیاں جس جگہ پر ٹھہری تھیں۔ وہ ایسی عجیب و غریب

جگہ تھی جس کا ذکر آج سے دس سال بعد حمیدہ بانو اپنے افسانوں میں کیا کرے گی (اگر اس نے افسانے لکھے) یہاں پر یقیناً اس کی ہیروئن رہے گی یا ہیرو اس کی چھت پر سے کود کر گھوڑے پر سوار ہوگا۔ وغیرہ۔ اور اس جگہ پر ایک ایسی ناقابلِ بیان دنیا آباد ہوگئی تھی جس کی طرح ناقابلِ بیان دنیا وسیع سیاہ سمندر میں گھرے ہوئے جہاز پر متضاد راستوں کی سمت جانے والے مسافروں کے اکٹھے ہونے سے آباد ہو جاتی ہے۔

یہ ایک بے حد وسیع احاطے کے وسط میں بنا ہوا ایک بہت بڑا سنگ سرخ کا رعنا محل تھا جس کی مالکہ ایک لاولد بیوہ برہمن رئیس زادی تھیں جو کانگریس ورکر تھیں اور مستقل یاتراؤں پہ جاتی رہتی تھیں۔ محل اسی طرز کا تھا۔ جس طرز کے عام ہندوستانی محل ہوتے ہیں۔ وسط میں ایک زبردست آنگن تھا جس کے چاروں طرف دالان در دالان اور کمرے تھے اور بے شمار گلیارے اور کوٹھریاں اور صحنچیاں اور رتھ خانے اور شہ نشین۔ اور ان گنت لاکھوں کروڑوں طاق اور طاقچے۔ مالکہ مکان نے جن کو سب پنڈتائن صاحب کہتے تھے فخریہ بتلایا کہ جب سلطان عالم قید فرنگ کے عالم میں لکھنؤ سے کلکتہ لے جائے جا رہے تھے تو مہاراجہ بنارس نے ان کو اسی مکان میں بصد تکریم ٹھہرایا تھا۔ یہ بات سن کر حمیدہ بانو بہت متاثر ہوئی اور اس نے پنڈتائن کو سلطان عالم کے عہد سے تعلق رکھنے والی چند مستند حکایات سے مستفید کیا۔ پنڈتائن سے حمیدہ بانو کی خوب گھٹی۔ وہ خود بھی بزبانِ ہندی افسانے لکھتی تھیں مگر لڑکیوں کی آمد کے تیسرے روز ہی وہ ایک اور یاترا کے لئے جگن ناتھ پوری چل دیں اور جاتے جاتے اپنی رہائش کے کمروں کی کنجیاں بھی لڑکیوں کے حوالے کر تی گئیں۔ اپنی قیمتی بنارسی ساریاں انھوں نے لڑکیوں کو زبردستی تحفے میں دیں۔ صبح سے شام تک اس قدر خاطر داری میں لگی رہیں کہ اگر ان کا بس چلتا تو لڑکیوں کی طرف سے پرچے بھی خود ہی کر آتیں۔ پنڈتائن اگر ایسی عجیب و غریب نہ ہوتیں تو بات نہ بنتی۔ اس افسانوی محل کی مالکہ کو بھی اتنا ہی غیر حقیقی ہونا چاہئے تھا۔

دن بھر محل میں ایسا ہنگامہ رہتا گویا بہت سی باراتیں ٹھہری ہوئی ہیں (محل کا نام—"چندن نواس" تھا) ہر طرف لڑکیوں کی ٹولیاں نظر آتیں۔ آنگن میں ٹہل ٹہل کر پڑھا جا رہا ہے کسی شہ نشین میں الٹا لیٹ کر مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ باغ کے ایک کونے میں ایک شکستہ مندر

تھا۔ اُس کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر امتحان کی تیاری ہو رہی ہے۔ موسیقی کے پرچوں کے زمانے میں ہر کونے کھدرے سے گنگنانے کی آوازیں آتیں۔ رگھو ماما ذمّے داری کے شدید احساس کے ساتھ اِدھر اُدھر انتظامات کرتے پھرتے یا لڑکیوں کو ڈانٹتے پھٹکارتے۔ پھر ہر طرف نگے پن بیس لگ گئیں جاپئے پڑھتے ــــ کھانے کے لئے دسترخوان بچھتا تو برہمن رسوئیا جو بے انتہا موٹا تھا ہنکار ابھرتا اندر آتا اس کے پیچھے پیچھے اس کا اسسٹنٹ رسوئیا دہی کی بالٹی اُٹھائے ہوتا۔ پیتل کی ایک بڑی سی ڈوئی میں دہی بھر بھر کر چیف رسوئیا لڑکیوں کی پلیٹوں پر بہت بلندی سے دہی ٹپکاتا۔ پھر تھالیوں اور کٹوریوں میں کھانا پروسا جاتا۔ رات کو آنگن میں تاروں بھرے آسمان کے نیچے محفل جمتی۔ جب امتحان شروع ہوئے تو ہر روز پرچے کرنے جاتے وقت جب لڑکیاں محل کے صدر دروازے سے نکلتیں وہاں کانتی دیدی دہی اور ماش تیل لئے کھڑی ملتیں اور وہ ہر لڑکی کو باری باری دہی مچھلی کا شگون کرواتیں۔

موسیقی کا امتحان بہت کڑا تھا۔ اس سے لڑکیاں تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ حالانکہ ہر س کالج کا سیکنڈ ایر کا نصاب یہاں بھی تھا مگر بہرحال یہ دوسری یونیورسٹی تھی اور ممتحن حضرات میں نارائن راؤ ویاس شامل تھے۔ جن کا نام سُن کر ہی ڈر کے مارے جان نکلتی تھی۔

(جس روز امتحان تھا تیز دھوپ پڑ رہی تھی۔ ایک سُرخ رنگ کی اداس عمارت کی چھت پر دو کمرے بنے تھے ایک میں نارائن راؤ ویاس بیٹھے تھے۔ لڑکیاں چھت کی منڈیر کے سائے میں کھڑی جلدی جلدی مشکل راگوں کو نیچی آواز میں دُہرا رہی تھیں۔ کمرے میں بیٹھے ہوئے ایک ممتحن اس قدر خفا معلوم ہوتے تھے۔ گویا ابھی سب کو کچّا چبا جائیں گے۔ کیم سکینہ گھبرا گھبرا کر بتول کے سنترے کھا رہی تھی کہ حلق خشک نہ ہو۔ منڈیر پر ایک چیل آنکھیں نیم وا کئے غنودگی کے عالم میں یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی جیسے سوچتی ہو ان سب باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے پھر وہ چیل سارناتھ کی طرف اُڑ گئی)

تھیوری آف میوزک کے پرچے کے روز کمال اور ہری شنکر آن دھمکے۔ طلعت اور نرملا پرچہ کر کے شامیانے سے باہر نکلیں تو انھوں نے سرسوتی کے مندر کے نیچے دو لڑکیوں کو مسز ویکر سے باتیں کرتے دیکھا۔ ان لڑکیوں کے قریب ہی سے کہیں سے کمال اور ہری شنکر

نمودار ہوئے۔ ان لڑکیوں میں سے ایک کی بہت پیاری شکل تھی اور اس کا رنگ دھوپ میں کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ دونوں لڑکے رام نگر کے دیوان صاحب کے یہاں ٹھہرے تھے۔ جن سے طلعت کا رشتہ ہوتا تھا۔ پھر تیز دھوپ میں دریا پار کر کے وہ چاروں رام نگر پہنچے اور "پالش کی ہوئی سڑکوں" پر سے گزرتے ہوئے طلعت کو ایک دم قدیر کا خیال آیا جو بچپن میں ان کو مختلف قسم کی معلومات سے مستفید کرتا رہتا تھا۔

"مجھے کرن کے لئے ساری اور چوڑیاں خریدنی ہیں۔" طلعت نے بآوازِ بلند کہا

"ابھی تمہاری خریداری کی مہم شروع نہیں ہوئی۔" کمال نے پیچھے مڑ کر پوچھا۔

"نہیں۔ پیسے لاؤ۔"

اب دونوں لڑکوں نے غرّا کر دونوں لڑکیوں کو دیکھا

"تمہارا خیال ہے۔ ہم مہاجن ہیں۔ کوٹھی چلتی ہے ہماری؟" کمال نے غصے سے کہا۔

"ہم تو دو مفلس قلاش برہمچاری ودیارتھی ہیں۔ خود ان پن پر گزر کرتے ہیں۔" ہری شنکر نے کہا۔

"لیکن اس کے باوجود ہم دل بادشاہوں کا رکھتے ہیں۔" کمال نے کہا۔

"صحیح کہتے ہو۔" ہری شنکر نے گلا صاف کر کے صاد کیا۔

"اور اگر تم ہم کو بتلا دو کہ وہ مہا سندر روپ وتی کون ہے جو سرسوتی کے مندر کے سائے میں کھڑی تھی تو بنارس کی ساری چوڑیاں تم کو خرید دیں گے۔" کمال نے کہا۔

"کون مہا سندر روپ وتی۔" طلعت اور رخشندہ نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"تم نہیں جانتیں اس دیوی کو جو دیوی کے استھان کے پاس کھڑی مسکراتی تھی؟" کمال نے مایوسی سے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔ مگر پیسے لاؤ۔"

"اگر تم اس کا پتہ چلا دو۔" ہری شنکر نے کہا۔

"بھئین تمہارے لئے تو لڑکیوں کے پتے چلاتے چلاتے ناک میں دم آ گیا ہے۔"

زملا نے جو عمر میں بڑی اور نسبتاً سمجھ دار تھی۔ چڑ کر جواب دیا۔

اسی طرح جھگڑا کرتے وہ رتنم نگر پہنچے۔ اور دن بھر خس کی ٹٹیوں کے پیچھے بیٹھ کر انھوں نے دن گزارا اور آم کھائے اور رشتے داروں سے گپیں ہانکیں اور دیوان صاحب کی بیگم صاحب نے فوراً کاشی کی بہت سی رئیس زادیوں سے ہری شنکر کی بات طے کر دی اور سب بہت بشاش ہوئے۔

جب امتحان ختم ہوئے تو لڑکیوں نے گھومنے پر کمر باندھی۔ ماما اور کانتی دیدی کی قیادت میں ان کے غول کے غول گلی کوچوں میں گھستے پھرے۔ چوڑیوں کے دوکانوں کے سامنے یہ لوگ دھرنا دے کر بیٹھ رہیں۔ انھوں نے ان گنت چوڑیاں خرید ڈالیں۔ شام پڑے کشتیوں میں بیٹھ کر جب وہ گنگا کے دھارے پر دنیا بھر کے گانے گاتیں۔ حمید بانو موقع محل کی مناسبت سے پاٹ دار آواز میں — اے آبِ رودِ گنگا — والی نظم شروع کر دیتی سب لڑکیاں مل کر اسے اٹھاتیں۔ انھوں نے شہر میں جا کر تازہ ترین فلم دیکھا جس کا نام "خزانچی" تھا۔ پھر ایک روز بھری دوپہریا میں وہ سب سارناتھ پہنچے۔ جہاں کے ایک معبد کے مرمریں فرش پر دیوٹوں کی روشنی رقصاں تھی اور ایوان میں چھوٹے بڑے ان گنت سنہری مجسمے پرنس گوتم سدھارتھ کے رکھے تھے اور ماحول کے تقدس سے مرعوب ہو کر سب لڑکیوں نے دوپٹوں اور ساری کے آنچلوں سے سر ڈھانپ لیئے اور سب نے بدھ کی موجودگی میں اپنے آپ کو بے انتہا پاکیزہ محسوس کیا۔

"یہاں کس قدر سکون ہے۔" طلعت نے کہا۔ وہ سب ہال میں دیوار سے ٹیک لگائے چپ چاپ بیٹھی تھیں۔

"ہاں آں۔" حمید بانو نے سر ہلایا۔ پھر وہ بڑے پُر اسرار طریقے سے مسکرائی۔ گویا اب کسی زبردست حقیقت کا انکشاف کرنے والی ہے۔

"بات یہ ہے۔" اُس نے کہا۔ "کہ ہم سب اتنی گھام میں مارے مارے پھرنے کے بعد یہاں آ کر بیٹھے ہیں۔ اس لیئے خواہ مخواہ سکون محسوس ہو رہا ہے۔" طلعت کو حمید بانو کی حقیقت پسندی بہت کھلی۔

"مگر یہ واقعہ ہے کہ مہاتما بدھ کے چہرے کو دیکھ کر سکون ملتا ہے۔" طلعت نے سوچ کر کہا۔

"اجی تم کیا جانو یہ باتیں۔" حمیدہ بانو نے بزرگی سے کہا۔ "دراصل ہم مسلمانوں کو یہ سب نہیں سوچنا چاہئے۔" پھر وہ سر جھکا کر غور و خوض میں محو ہو گئی۔ وہ پانچوں وقت کی نماز پڑھتی تھی اور بڑی رومان پرست تھی مگر اس ذہنی کشمکش کا حل تلاش کرنے کی اس کی عمر نہ تھی، کہ جب وہ کلمہ گو ہے تو اسے بتوں سے بھی الفت کس واسطے ہے۔ دیر و حرم کے مسئلے پر وہ کچھ دیر اور غور کرتی مگر اتنے میں معاً طلعت اٹھی اور اس نے بڑے مجسمے کے سامنے جا کر رقص کرنا شروع کر دیا۔ پھر بینا ماتھر بھی اس رقص میں شامل ہو گئی۔ چند لمحوں بعد سب لڑکیاں گھیرا باندھے ناچ رہی تھیں اور ان سب میں حمیدہ بانو پیش پیش تھی۔ وہ جاپانی بھکشو جو ایک ستون کے پاس وزیٹرز رجسٹر کھولے بیٹھے تھے ذرا اچنبھے سے یہ منظر دیکھتے رہے۔

باہر عمارت کے سائے میں کھڑے کھڑے ہری شنکر مہایان بدھ ازم کی تاریخ پر کمال کو ایک لیکچر دے رہا تھا اور کمال نے قریب کے ایک ستوپ کے پتھروں پر ہاتھ رکھ کر سوچا۔ میں اس لمس کے ذریعے اس دوسرے وقت میں موجود ہوں۔ وہ وقت جو گزر چکا لیکن اب بھی ہے۔ اسے یہ سوچ کر ایک لمحے کے لئے چکر سا آ گیا۔ پھر اس نے آنکھیں کھول کر ہری شنکر کو دیکھا جو بڑی اہمیت کے ساتھ ایک جاپانی بھکشو سے کچھ انٹ سنٹ اڑا رہا تھا اور جاپانی بھکشو ہری شنکر کی علمیت سے بہت مرعوب نظر آتا تھا۔ چاروں طرف ٹمر خار ریت پھیلی ہوئی تھی اور دھوپ میں استوپ کھڑے تپ رہے تھے ——— اور ایک راستہ چکر کاٹتا نیچے سے اوپر جاتا تھا اور ستوپ کے چاروں طرف گھوم کر وہ راستہ پھر نیچے لوٹ آتا تھا۔ کمال نے ہری شنکر کے ساتھ ساتھ اس پر چلنا شروع کیا۔ اب لڑکیاں باہر آ چکی تھیں اور حمیدہ بانو قریب سے کانتی دیدی سے کہتی ہوئی گزر رہی تھی۔ میں خواب میں یہاں کئی بار آ چکی ہوں۔ مجھے لگتا ہے میں اس جگہ سے واقف ہوں۔ پہلے بھی یہاں آ چکی ہوں۔ میں نے یہ سرخ ریت والا تپتا ہوا راستہ پہلے بھی دیکھا ہے ———

"گڈ لارڈ، حمیدہ بانو ——— کمال نے مسکرا کر دل میں کہا۔ یہ لڑکی بڑی ہو کر ضرور

افسانہ نگار بن جائے گی اور روحانیات میں دلچسپی لے گی اور شاید تھیوسوفیکل سوسائٹی میں شامل ہو جائے۔"

"حمیدہ بانو۔ ظہر کا وقت ہے۔ چلو نماز پڑھ لیں۔" رفیعہ باجی نے ستوپ کی سیڑھیوں سے اُترتے ہوئے آواز دی اور حمیدہ بانو ہڑبڑا کر سُرخ ربت والے راستے پر سے اُتری اور ایک آم کے درخت کی طرف چلی گئی جہاں چند لڑکیاں پہلے سے سستانے کے لئے جا بیٹھی تھیں۔

کمال نے اس منظر کو دیکھا۔

ستوپ اور میوزیم کی عمارت اور بڑا مندر جس کا عظیم الشان سنہرا گنبد دُور سے نظر آرہا تھا اور لوگ چاروں اور پھر رہے تھے اور ان کے سائے زمین پر لرزاں تھے۔

سائے قائم رہتے ہیں۔ انسان ختم ہو جاتا ہے۔ سائے میں بڑی طاقت ہے۔ ہم عمر بھر مختلف سایوں کا تعاقب کرتے ہیں مگر سایہ ہاتھ نہیں آتا۔ وہ اپنی جگہ امٹ ہے۔ سائے کی اور وقت کی آپس میں سازش ہے۔

"چار بج رہے ہوں گے" ___ رگھبیر ماما نے پھاٹک کے سائے کو زمین پر دیکھ کر وقت کا اندازہ لگاتے ہوئے اظہارِ خیال کیا۔ "اب واپس چلنا چاہئے۔"

"چلو لڑکیو" کانتی دیدی نے آواز لگائی۔

لکھنؤ واپس جانے کے دن قریب آئے۔ اور روانگی سے ایک روز قبل چندن نواس کے آنگن میں صدر دالان کے نزدیک اسٹیج بنا اور اسے کیلے کے پتوں سے سجایا گیا۔ محل کے وسیع لق و دق اینٹوں کے فرش والے صحن میں چھڑکاؤ ہوا تھا اور بڑی سی چاندنی بچھائی گئی تھی اور پچھلے دالان میں گرین روم تھا اور اگلے دالان میں جاجم ٹانگ کر پردہ بنایا گیا تھا جس کے نیچے ساز رکھے تھے اور بینا ماتھر میوزک ڈائریکٹر بنی بیٹھی تھی اور سورج بخش سریو"ا جلدی جلدی سب بابوں کے میک اپ کروا رہے تھے۔ باقاعدہ ڈرامہ کرنے کی کسے فرصت تھی۔ وقت کے وقت طے کیا گیا تھا کہ راج رانی میرا ہو گا۔ یہ اس لئے کہ اس میں زیادہ ڈائیلاگ وغیرہ کی ضرورت نہ تھی۔ سارا کام میرا کے بھجنوں کے ذریعے چل سکتا تھا اور لڑکیاں ایسی ماہرِ فن تھیں کہ اسٹیج پر

اکبر فی البدیہہ مکالمے ادا کرتی تھیں۔ ساجدہ کو رانا بنایا گیا مگر بار بار اُس کی مونچھیں گر پڑتی تھیں کُسم اکبر بادشاہ تھی۔ مگر اس کی بے موقع ہنسی نے سارا کام چوپٹ کر دیا۔ گیان وتی بھٹناگر کیونکہ ماہر موسیقار تھی اس لئے وہ میرا بنی۔ وہ تو ریڈیو کی اتنی مشہور فنکار تھی۔ اس کے لئے میرا کا پارٹ بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ سارے وقت وہ تان پورہ ہاتھ میں اُٹھائے آنکھ بند کئے اسٹیج پر ادھر سے اُدھر چلتی رہی۔ طلعت جنرل مرول ادا کر رہی تھی۔ جہاں ایکٹروں کی کمی پڑی وہاں یہ جھٹ سے موجود۔ ایک سین میں وہ اکبر اعظم کی وزیر بنی۔ دوسرے میں میرا کی سہیلی۔ تیسرے میں جہاں میرا سے رانا کی شادی ہوتی ہے۔ وہاں جلدی سے اکبر اعظم کی مونچھیں مستعار لے کر وہ پنڈت بن گئی اور منڈپ میں جا کر اٹنگ بٹنگ اوم سواہا کہہ کر اُس نے میرا بائی کی شادی کرا دی۔

پھر بہت سی لڑکیاں راس لیلا کے ناچ کے لئے چھن چھن کرتی آئیں۔ انھوں نے دنیا بھر کے زیور پہن رکھے تھے۔ حد یہ کہ رفیعہ باجی جیسی موٹی خاتون بھی ماتھے پر نقرئی بور سجا کر متھرا کی گوالن بنی تھیں۔ حمیدہ بانو نقلی موتیوں اور بندوں کا مکٹ پہنے بڑے اسٹائل سے بانسری اُٹھائے کھڑی رہی۔ نرملا ستار سنبھالے دالان کے پیچھے سے گویا بیک گراؤنڈ میوزک دے رہی تھیں۔

سامنے آڈینس تھا۔ کھلے آسمان کے نیچے جگمگاتے تاروں کی چھاؤں میں بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ جانے کون کون۔ بسنت کالج اور یونیورسٹی کی لڑکیاں، لیکچرار اور پروفیسر صاحبان بہت سے لڑکے۔ ان ہی میں اگلی قطار کے سرے پر چمپا احمد اور لیلا بہار گوا بیٹھی تھیں ہری شنکر اور کمال چاندنی کے فرش پر براجمان تھے۔ رگھو ماما ٹک کر ڈرامہ دیکھنے کے بجائے خوش خوش گھبرائے گھبرائے پھر رہے تھے۔

چمپا اور کمال اور ہری شنکر تینوں اس سمے الگ الگ آنکھوں سے سامنے کا تماشہ دیکھا کئے۔

لڑکیاں اس سمے دنیا و مافیہا سے بے خبر صرف اس اسٹیج پر موجود تھیں اور بے حد خوش تھیں۔

لڑکیاں سوانگ رچنے کے بے حد شوقین ہوتی ہیں۔ بچپن میں وہ پلنگ کھڑے کرکے ان پر پلنگ پوش کے پردے لگاکر گھر گھر کھیلتی ہیں۔ گھروندا سجاکر تصور کرتی ہیں یہ سچ مچ کا مکان ہے۔ ہنڈکلیا ان کے نزدیک بڑا اہم دعوتی کھانا ہوتا ہے۔ گڑیاں گڈے ان کے لئے جاندار انسان ہیں۔ جب ذرا بڑی ہوجاتی ہیں تو اپنا بناؤ سنگھار کرکے کس قدر مسرور ہوتی ہیں۔ باہر جانے سے پہلے گھنٹہ بھر آئینے کے سامنے صرف کریں گی۔ جوتوں اور کپڑوں کا انتخاب ان کے لئے آفاقی اہمیت کا حامل ہے۔ سجنا، بہروپ بھرنا ان کے لئے بے حد ضروری ہے۔ رادھا اور کرشن کا ناچ ناچتی ہیں تو تصور کرتی ہیں کہ وہ واقعی ورندابن میں موجود ہیں۔ ساری عمر ان کی اپنی ایک نازک سی دنیا بسانے میں گزرتی ہے اور یہ دنیا بساکر وہ بڑے اطمینان سے اس میں اپنے آپ کو پجارن یا کنیز کا درجہ تفویض کر دیتی ہیں۔ اول دن سے ان کے بہت سے چھوٹے بڑے دیوتا ہوتے ہیں۔ جو ان کی لنگ بھوم کے سنگھاسن پر اطمینان سے آلتی پالتی مارے بیٹھے رہتے ہیں۔ باپ۔ بھائی۔ شوہر۔ خدا۔ بھگوان۔ کرشن۔ بیٹے۔ پرستش کرنا اور خدمت کرنا ان کے مقدر میں لکھا ہے۔ جب رنگ بھوم کا ڈائرکٹر ان سے کہتا ہے کہ تم مہارانی ہو۔ دل کی ملکہ ہو۔ دنیا کی حسین ترین لڑکی ہو —— روپ وتی ہو۔ تو یہ بےچاریاں بہت خوش ہوتی ہیں۔

لڑکیاں بے حد مضحکہ خیز ہوتی ہیں۔ ڈرامے کرتی ہیں۔

یہ کس مسخرے نے کہا ہے کہ عورت کا کام دلوں کو توڑنا اور دنیا پر حکومت کرنا ہے سب جھوٹ ہے۔ گپ۔ بکواس۔ یہ تو کہیں سے کہیں پہنچ جائیں۔ کتنی ہی وِدوان بن جائیں کتنی ہی بڑی سلطنت کا تاج ان کے سر پر ہو۔ ان کی اوقات وہی رہے گی۔ پجارن۔ کنیز۔

لاحول ولاقوۃ۔

کمال راس لیلا دیکھتا رہا۔ سامنے گوپیاں اب کرشن کی آرتی اتار رہی تھیں۔ دالان میں نرملا اور بینا ماتھر زور زور سے گاتی رہیں۔

'موہن سنا دے میٹھی تان۔ مدھر رس بھری۔ رسیلی پیاری پریم کی تان ـ'

واہ —— کیا بات ہے۔

اری مورکھ لڑکیو تم کو خبر بھی ہے ۔ پریم کی تان کتنی بڑی مصیبت کا گھر ہے ۔ کبیر یہ گھر ہے پریم کا خالہ کا گھر نا نہہ ۔۔۔ کمال کو کبیر داس کا ایک دوہا یاد آیا ۔ اس نے پہلو بدل کر سگریٹ سلگا لیا ۔

۴۰

بیساکھ کا مہینہ گزرا ۔ جیٹھ کا ۔ اساڑھ میں رزلٹ نکلا ۔ چمپا احمد پاس ہو گئی تھیں اور حسبِ توقع فرسٹ ڈویژن انھوں نے حاصل کیا تھا ۔ اب ان کے سفر کی تیاریاں شروع ہوئیں ۔ ساریاں خریدی گئیں ۔ ہاؤس کوٹ تیار ہوئے ۔ لکھنؤ ماموں میاں کو خط لکھا گیا ۔ جولائی میں چمپا بیگم آ رہی ہیں ۔

ایک روز شام کو وہ لیلا بھارگوا کے ہمراہ بازار سے گھر جاتے ہوئے چندن نواس کے سامنے سے گزری ۔ اس کے قدم آپ سے آپ رک گئے ۔ باغ پر ہولناک سناٹا طاری تھا ۔ محل سنسان پڑا تھا ۔ تیسری منزل کے ایک کمرے میں روشنی ہو رہی تھی ۔ شاید پنڈتائن اپنی یاترا سے لوٹ آئی ہوں گی ۔ باقی ساری عمارت اندھیرے اور خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی ۔ جب وہ وہاں سے آگے بڑھی تو اسے لگا جیسے بہت سی آوازیں اس کا پیچھا کر رہی ہیں ۔ لڑکیوں کے قہقہے ۔ گھنگروؤں کی جھنکار ۔ تان پورے کی گونج اور سب سے بڑی سناٹے کی آواز ۔

اسے وقت کے بھوت نے ستانا شروع کر دیا تھا ۔

لیلا کو اس کے گھر پر اتارنے کے بعد وہ حسبِ معمول اپنے مکان کی سمت بڑھی ۔ مہری نے تانگے سے اتر کر چھوٹا سا پھاٹک کھولا ۔ وہ اندر داخل ہوئی اور آنگن میں جا بیٹھی ۔ باہر گلی بھی سنسان پڑی تھی ۔ برابر کے تین چار مکانوں میں کئی ریڈیو اکٹھے بج رہے تھے ۔ لکھنؤ سے خبریں سنائی جا رہی تھیں ۔ چمپا کے والد بیٹھک میں کسی مؤکل کے ساتھ مصروفِ گفتگو تھے ۔

" ڈاک میں تمہارا یہ لفافہ آیا رہا ۔" اس کی ماں نے ایک نیلے رنگ کا چپٹا سا لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور باورچی خانے کی سمت چلی گئیں ۔

شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں اس نے خط کھولا ۔ پھر برآمدے کی بتی جلا کر اسے

پڑھنا شروع کیا۔ اجنبی زنانہ لکھائی تھی اور کسی اجنبی کا خط تھا۔ مسوری سے آیا تھا اور انگریزی میں تھا اور مائی ڈیر چمپا کہہ کر اسے بڑی بے تکلفی اور اپنائیت سے مخاطب کیا گیا تھا۔ اس میں لکھا تھا۔ مجھے یہ معلوم کر کے بے حد خوشی ہوئی کہ تم اس سال ہمارے کالج آرہی ہو۔ اس کے بعد اس کالج کے متعلق مختلف تفصیلات سے اسے مطلع کیا گیا تھا۔ اگر وہ فلاں فلاں چیزوں میں دلچسپی رکھتی ہے تو اسے فلاں فلاں کلب خوش آمدید کہیں گے۔ اگر وہ آؤٹ ڈور لڑکی ہے تو اسپورٹس کی ڈائرکٹر جے مالا اپا سوامی سے اسے ملنا چاہئے۔ ٹینس کی سیکرٹری لیلا شری ناگیش بھی اس کی مدد کر کے بے حد خوش ہو گی۔ اگر وہ مغربی موسیقی کی شوقین ہے تو میوزک ورکشاپ اس کی منتظر ہے۔ ڈرامہ گلڈ اس کی اداکارانہ صلاحیتوں سے بہرہ ور ہونے کی خواہش مند ہے (اگر اسے اسٹیج سے دلچسپی ہے) وغیرہ وغیرہ۔ پھر اسے سارے ہوسٹلوں کے متعلق انفارمیشن دی گئی تھی اور فیکلٹی کے متعلق۔ اخیر میں لکھا تھا کہ نئی لڑکی کی حیثیت سے مکتوب الیہ کو اس کے چارج میں دیا گیا ہے اور مکتوب الیہ کی وہ فیشل ایڈوائزر ہے۔ لہٰذا سولہ تاریخ کو جب وہ کالج پہنچے تو اسے راقم الحروف فلورنس نکلس ہال کی سیڑھیوں پر ملے گی اور اس کے سارے پرابلمز کا حل تلاش کرے گی۔

نیچے راقم الحروف کا نام لکھا تھا۔ تہمینہ رضا۔ تارا ہال۔ مسوری

چمپا ہکا بکا کھڑی سوچتی رہی کہ یہ تہمینہ رضا کون ہے اور اسے میرا پتہ کس طرح معلوم ہوا۔ اور اس قدر دوستی کا خط اس نے کیوں لکھا ہے۔ یہ خط اسے بڑا افسانوی معلوم ہوا یعنی اس طرح کی باتیں محض ناولوں میں ہوتی تھیں۔ اسے لگا وہ اب بڑی انوکھی فضاؤں اور بڑی عجیب و غریب دنیا کی طرف سفر کرنے والی ہے۔

اس کا یہ خیال غلط نہ تھا۔

۴۱

بنارس سے لوٹ کر ساری لڑکیاں اپنے گھروں کو چلی گئیں اور ایک ہفتے بعد سب آخری بار ملنے کے لئے اسکول میں جمع ہوئیں۔ بڑا کلاس روم کھلوایا گیا۔ لاڈو مہری سب کی خاطریں کرتی

آگے پیچھے دوڑتی رہی ۔۔ لڑکیاں ڈیسکوں پر چڑھ کر بیٹھ گئیں اور دفعتاً سب خاموش ہو گئیں جیسے بولنا جانتی ہی نہ ہوں ۔ ان میں سے بڑی لڑکیاں سوچ رہی تھیں ۔ اب جانے ہمارا کیا حشر ہو گا ۔ ان میں سے اکثر کی شادی ہونے والی تھی ۔ چند کو ابھی کالج میں پڑھنا تھا ۔ دفعتاً حمیدہ بانو نے جو بے حد ڈرامیٹک واقع ہوئی تھی ۔ مس پرنسپال کی نئی نظم کا گانا شروع کر دیا ۔ ہنس لے جی بھر بھر کر ہنس لے ۔ جانے کون کہاں بچھڑ جائے ۔۔ اس کے بعد دوسرا تازہ فلمی گانا گایا گیا ۔ رک نہ سکو تو جاؤ تم جاؤ ۔۔ اور اس کے بعد تیسرا ۔۔ او جینے والے ہنستے ہنستے جینا ۔ سورج کبھی نہ ڈوبے تیرا ۔۔۔ وغیرہ ۔ یہ سب گانے کی وجہ سے خوب رقت طاری ہوئی اور سب کی سب خوب پھکو پھکو روئیں ۔

واقعی لڑکیوں کی کس قدر بیوقوف قوم ہے ۔

مگر کتنی عجیب بات تھی کہ ان میں سے دو تین لڑکیوں کے علاوہ باقی ساری لڑکیوں کو طلعت نے عمر بھر نہ دیکھا ۔ وہ سب جانے کہاں غائب ہو گئیں ۔ جو اتنی اچھی ہمجولیاں تھیں ۔

یہ ہمیشہ ہوتا ہے ۔ جب ہم سب اکٹھے ہوتے ہیں تو کبھی خیال بھی نہیں آتا کہ الگ الگ ہو جائیں گے اور جب بچھڑ جاتے ہیں تو لگتا ہے جیسے کبھی ملے ہی نہ تھے ۔

۴۲

ہندوستان کا بہترین گرلز کالج ۔۔!

ازابلا تھوبرن ۔۔ !!

چاند باغ ۔ !!!

لکھنؤ کی فیض آباد روڈ پر ایک بہت بڑا پھاٹک ہے اور بہت دور ہی سے ایک بے حد طویل و عریض دو منزلہ عمارت نظر آجاتی ہے جس کے یونانی طرز کے بلند و بالا پورٹیکو کے ستون دور سے دکھائی پڑتے ہیں ۔ اس پورٹیکو کا فرش مرمریں ہے ۔ سامنے لان پر پام کے درخت لگے ہیں ۔ اس عمارت میں چمکتے ہوئے شفاف شیشوں والے طویل اور بڑے بڑے دریچے ہیں اور

جھلملاتے ہوئے فرش اور چوڑے مرمریں زینے۔ اونچی چھتوں میں جھاڑ فانوس آویزاں ہیں۔ اس کا "براوزنگ روم" جہاں لڑکیاں بیٹھ کر فرصت کے وقت میں علم چرتی چگتی ہیں اپنی آرائش کی وجہ سے کسی برطانوی لارڈ کا ڈرائینگ روم معلوم ہوتا ہے۔ اس میں بیش قیمت نوادر سجے ہیں اور نایاب کتابیں رکھی ہیں اور مشہور پینٹنگز سے اس کی دیواریں مزین ہیں۔ ساری عمارت میں جگہ جگہ ایرانی قالین بچھے ہیں۔ یہ عمارت ایڈمنسٹریشن بلڈنگ کہلاتی ہے۔ اس کے عقب میں وسیع کیمپس پر دور دور فاصلے پر اتنی ہی بڑی چار عمارتیں اور بکھری ہوئی ہیں یہ سب عمارتیں ایک دوسرے سے شفاف فرش والے کوریڈورز سے ملحق ہیں جن کے اوپر پھولوں کی خوبصورت بیلیں پھیلی ہیں۔ یہ کوریڈور کئی فرلانگ لمبے ہیں۔ ان عمارتوں میں سے تین میں ہوسٹل ہیں جو نشاط محل، نونہال منزل اور منیری بھون کہلاتے ہیں۔ یہ بھی اس قدر شاندار ہیں گویا کسی بڑی ہندوستانی ریاست کے گیسٹ ہاؤس ہوں۔ چوتھی عمارت فیکلٹی کی ہے۔ جنھوں نے اپنے کمرے اور سٹنگ روم دلہن کی طرح سجا رکھے ہیں کیمپس کے وسط میں ڈائننگ ہال کی عمارات ہیں اور ایک سرے پر ہسپتال ہے جس کی انچارج ایک نیگرو نرس ہے۔ پہلو میں کالج کا مشہور عبادت خانہ ہے جو موڈرن طرز میں تعمیر کیا گیا ہے جس طرح کے عبادت خانے سویڈن اور کیلیفورنیا میں بنائے گئے ہیں۔ یہ بےانتہا اسٹریم لائینڈ جگہ ہے اور اس میں بیٹھ کر خدا سے لو لگاتے وقت خواہ مخواہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ یسوع مسیح بھی کسی امریکن یونیورسٹی کے پریذیڈنٹ یا نیو انگلینڈ کے رحمدل اور خلیق پروفیسر ہیں۔ اس کالج کی عمارات کا طرز تعمیر اسی قسم کا ہے جیسا امریکن یونیورسٹیوں کا ہوتا ہے۔ بیروت کی امریکن یونیورسٹی کے بعد یہ مشرق میں امریکنوں کی بنائی ہوئی سب سے عظیم الشان درس گاہ ہے۔

چاند باغ —— !!

پورنماشی کی راتوں میں جب چاندنی کیمپس پر برستی ہے تو لگتا ہے یہ سارا سماں بے حد غیر حقیقی ہے۔ ہرے سبزہ زار۔ پھولوں کے کنج۔ سفیدے کے جھنڈ۔ عمارتوں کے روشن دریچے اس وقت کیمپس کے مختلف گوشوں سے موسیقی کے سر بلند ہوتے ہیں۔ بیتھوون۔ شوپاں۔ ویبر۔ جارج گرشون۔ یا کسی کوریڈور میں سے کوئی لڑکی سائے کی طرح گزر جاتی ہے۔ نیگرو نرس ہسپتال کے شیشوں والے برآمدے کی کھڑکی کھول کر آسمان کو دیکھتی ہے جس پر بیت لحم کا اکیلا

ستارہ کہرے میں چھپا جھلملا رہا ہے۔ چیپل میں سے برقی آرگن کی گہری گونجتی ہوئی آواز اُوپر اُٹھتی ہے۔ اندر قربان گاہ کے اُوپر منقش لیمپ جلتا رہتا ہے۔ سنّاٹے کے سائے پر تو قوس قزح کے رنگوں کی طرح سارے میں پھیل جاتے ہیں۔ سوا سو سال اُدھر یہاں رمنا تھا۔ یہاں کے باغات میں ہرن کلیلیں بھرتے پھرتے تھے اور بارہ سنگھے اور نیل گائیں۔ اور اودھ پوری کے حکمرانوں کے بجرے ندی کے اس کنارے پر آن کر لگتے تھے اور شہر کی اُونچی سوسائٹی یہاں آن کر مینڈھوں اور ہاتھیوں کی لڑائی کا نظارہ کرتی تھی۔ وہ پرانا برگد کا درخت جو کیمپس کے اس کونے میں کھڑا ہے۔ اس کی پتیاں اُس سے بھی پچھلے پہر کی ہوا میں اسی طرح سرسراتی ہوں گی۔

اسّی سال سے یہ درس گاہ قائم ہے۔ ۱۸۶۲ء میں جو خوش باش نوجوان لڑکیاں ململ آستینوں کے بلاؤز پہنے اور گاؤن کی وضع سے ساریاں باندھے یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلی تھیں ان کی قبروں پر نئے قبرستان بن چکے۔ جو لڑکیاں کل یہاں آنکھوں میں خواب لے کر گاتی گنگناتی آئی تھیں۔ آج وہ نانیاں دادیاں ہیں یا دُنیا کے بہت سے دُکھ اُنھوں نے اٹھائے ہیں یا بڑی معمولی، عام زندگیاں گزار رہی ہیں۔

اس لئے بے چاری لڑکیو، تم جو ہال میں گھسی یوجین اونیل کی ریہرسل کر رہی ہو خوش ہو لو کیونکہ کل تم بھی مر چکی ہو گی۔ چونکہ زندگی کی جس جنگ میں حصّہ لینے کے لئے تم یہاں سے نکلوگی اس کے محاذ پر کام آنے والوں کے لئے کوئی پیتل کی تختیاں دیواروں پر نہیں لگائی جاتیں۔

اس چیپل کی سفید سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر سوچو۔ کون کہتا ہے کہ سامی مذاہب کا نظریۂ کائنات غلط ہے۔ صراطِ مستقیم صرف ایک ہے۔ سیدھی اور تنگ۔ ایک پیدائش سے ایک موت کی طرف جانے والی۔ جس کے بعد کوئی واپسی نہیں۔ اس لئے بے چاری لڑکیو، تم جو پھولوں کے کنج میں گربا ناچ رہی ہو، چاہے تم کسی خدا کی عبادت کرتی ہو (اور چونکہ تم عورت ہو لہٰذا ملحد مشکل ہی سے بنوگی) یاد رکھو کہ جب تم چاندنی کی اس دُنیا سے باہر چلی جاؤگی تو پھر کبھی لوٹ کر نہ آؤگی۔ دوسرے تمھاری جگہ لے لیں گے۔ ان سب جگہوں پر وہی سب ہو گا جو تمھارے وقت میں ہوتا تھا۔ لیکن دُنیا بدل چکی ہوگی۔ دُنیا لحظہ بہ لحظہ بدلتی رہتی ہے۔

تم بدل جاؤ گی۔

'کیا تم کو معلوم ہے کہ وہ تمہاری سوشیولوجی کی چہیتی پروفیسر بنگلے کے ایسے سفید بالوں والی کمرخمیدہ بڑھیا جو کھٹ کھٹ کرتی سکراتی گیلری میں سے گزر رہی ہے۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں تم سے زیادہ حسین تھی اور 'فلاڈلفیا کا گلاب' کہلاتی تھی؟

یہ سارے جشن، یہ ساری تقریبات، رسوم، تہوار، کارنیول، مورس ڈانسنگ کے مقابلے، اسپورٹس کے ہنگامے، یہ سب تم سے پہلے ہو چکا ہے اور تمہارے بعد بھی ہوتا رہے گا۔

یہ کیمپس اس کارگہ شیشہ گری کا جسے دُنیا کہتے ہیں ایک بے حد چھوٹا سا موڈل ہے۔

نشاط محل کے پیچھے ڈچ وضع کے باغ کے برابر سے ایک سایہ دار راستہ سوئمنگ پول کی طرف جاتا ہے جو آم کے جھنڈ میں گھرا ہوا ہے۔ یہ جولائی کا مہینہ ہے اور بھانت بھانت کی لڑکیاں سارے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ مرہٹی، گجراتی، بنگالی، مدراسی، اڑیہ، نیپالی، پنجابی، پٹھان، یوروپین، امریکن، برمی، سنگھالی۔ ملک کا کوئی خطہ نہیں جہاں کی زبان یہاں نہ سنی جاتی ہو۔ مذہباً یہ لڑکیاں ہندو ہیں، اور مسلمان ہیں اور سکھ ہیں اور عیسائی ہیں اور بدھ اور یہودی۔ دُنیا کا کوئی عقیدہ نہیں جس کا پیرو یہاں موجود نہ ہو۔

اس کالج کی طالبات اپنی سادگی کے لیے مشہور ہیں۔ عام طور پر یہ لوگ سفید ساریاں پہنتی ہیں اور جس طرح کے فیشن یہ کرتی ہیں سارے صوبے میں ان کی نقل کی جاتی ہے۔

اس شدید ارسٹوکریٹک کالج میں سیاسیات کا تذکرہ بالکل نہیں ہوتا۔ محض دنیا میں گریس فل اور متوازن طریقے سے زندگی بسر کرنے کے فن پر توجہ دی جاتی ہے۔ "ہم دینے کے لیے لیتے ہیں۔" یہاں کا موٹو ہے۔

پہلے یہاں مغربیت کا بہت زور تھا لیکن قوم پرستی کی تحریک کے زیر اثر وہ زور اب کم ہوتا جا رہا ہے۔ اب یہاں ٹیگور جینتی منائی جاتی ہے اور عید اور دیوالی کا مشترکہ تہوار بہت دھوم سے منعقد ہوتا ہے جب مسلمان لڑکیاں سارے میں چراغاں کرتی ہیں اور ہندو لڑکیاں غرارے پہن کر اتراتی پھرتی ہیں۔

اس کالج کی بہت قدیم روایات ہیں اور رسوم اور ان کے اپنے گانے ہیں۔ ان کی ایک ایسی پُراسرار دُنیا ہے جس میں کوئی باہر والا داخل نہیں ہو سکتا۔

۴۳

حسبِ وعدہ سولہ تاریخ کو تہمینہ رضا، چمپا احمد کو فلورنس نکلس ہال کی سیڑھیوں پر ملی۔ چمپا ذرا پریشانی سے چاروں اور دیکھ رہی تھی کہ اس کی ہم عمر ایک لڑکی نے آگے بڑھ کر پُوچھا "تم چمپا احمد ہو۔؟"

"ہاں۔"

"آؤ، میرے ساتھ چلو۔"

اور دوسرے لمحے چمپا چاند باغ کی دُنیا میں شامل ہو گئی۔ اس رات ہال میں نئی لڑکیوں کو کالج کی روایات کے متعلق ایک لیکچر دیا گیا۔ انھیں یہاں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کرایا گیا۔ شروع کے چند ہفتے چمپا کو 'بریک ان' ہونے میں لگے۔ جبھی اس کو اس قاعدے کا علم ہوا کہ ہر سال کالج کے دفتر کی طرف سے نئی لڑکیوں کے پتے سینیئر طالبات کو بھیج دیئے جاتے ہیں اور مؤخر الذکر ان کی ایڈوائزر مقرر کی جاتی ہیں۔ کالج میں داخل ہونے والی ساری لڑکیوں کو چند خاص خاص سینیئر طالبات کی طرف سے اس طرح کے خط ملے ہوں گے جیسا چمپا کو ملا تھا۔

تہمینہ کی بہن طلعت آرا، جو فرسٹ ایئر میں داخل ہوئی تھی بڑی بے تکلفی سے اس سے کہنے لگی — "ارے چمپا باجی ہم نے تو آپ کو بنارس میں بھی دیکھا تھا۔"

اور نرملا سریواستوا نے سوچا کہ اب کمّن بھیا اور بھیّن صاحب کی تو پانچوں گھی میں اور سر کڑھائی میں۔ ان کی دیبی تو یہیں آن پہنچی۔

چمپا دوسری لڑکیوں کے ساتھ گلفشاں ہو گئی۔

یہاں سب اس سے بڑی اپنائیت سے ملے۔ تہمینہ کے بھائی کمال رضا نے جو یونیورسٹی میں پڑھتا تھا بے حد اخلاق اور مؤدبانہ طریقے سے اس سے گفتگو کی اور

طلعت کی تقلید میں اسے چمپا باجی کہہ کر مخاطب کیا۔ سنگھاڑے والی کوٹھی نے بھی اسے خوش آمدید کہا۔ شنکر سرتو استوا اس کے لیے خود چائے کی کشتی اٹھا کر لایا۔

ایک اتوار کو تیسرے پہر وہ گلفشاں پہنچی۔ تہمینہ اور طلعت پچھلے برآمدے کے سائڈ روم میں کھڑکی کے پاس تخت پر چڑھی بیٹھی تھیں۔ پیاز اور مرچوں کا ٹوکرا نیچے رکھا تھا۔ نرملا آلو چھیل رہی تھی۔ غالباً شام کو ان کے یہاں کوئی دعوت تھی۔

چمپا بھی تخت کے کنارے بیٹھ کر آلو چھیلنے میں مصروف ہو گئی۔

اسی وقت بھیا صاحب اندر آئے۔ وہ بھی روائتی ہیروؤں والی شان سے ٹینس ریکٹ ہاتھ میں لیے بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ بھیا صاحب عموماً گھر میں نہیں آتے تھے۔ خصوصاً جب تہمینہ کی سہیلیاں موجود ہوں۔ کیونکہ تہمینہ کے کراوڈ سے ان کی کوئی خاص نہیں بنتی تھی۔ تہمینہ کے اصل کامریڈ تو کمال اور ہری شنکر تھے۔

مگر بھیا صاحب بہرحال بھیا صاحب تھے۔

چمپا بیٹھی آلو چھیلتی رہی۔ اُس نے اپنی انگلیاں نہیں کاٹیں۔

بھیا صاحب شام کے ڈنر کے متعلق تہمینہ سے کچھ پوچھنے آئے تھے اس سے بات کر کے وہ الٹے پاؤں واپس چلے گئے۔

مگر اپنے کمرے میں جا کر اُنھوں نے گنگادین کو بلایا "یہ نئی بٹیا کون ہیں جو اندر بیٹھی ہیں —"

"پتہ نہیں سرکار۔" گنگادین ہڑبڑا گیا۔ بھیا صاحب نے آج تک لڑکیوں کے متعلق کوئی استفسار اس سے نہیں کیا تھا۔ آخر بڑی بٹیا سے ان کا بیاہ ہونے والا تھا۔ "بڑی بٹیا کے پاس چاند باگ کی بیسیوں بابا لوگ آوت ہیں۔"

"اچھا جاؤ۔"

کمال آیا۔ اس سے کیا پوچھتے۔ طلعت کی طبیعت کی تیزی سے وہ ذرا خائف رہتے تھے۔ اگر اس سے اشارۃً بھی معلوم کرنا چاہا تو وہ سارے میں ڈھنڈورہ پیٹتی پھرے گی کیا مصیبت تھی کہ چونکہ وہ تہمینہ سے افیشیل طور پر منسوب تھے۔ لہذا دنیا جہان کی کسی اور لڑکی

کو نظر بھر کر دیکھنا ان پر حرام تھا۔ یہ کیسی قید تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ وہ بے حد تنہا تھے۔

بھیا صاحب اپنی ذات کے رومانس میں آپ محصور ہو کر رہ گئے تھے۔

چمپا کو سجاتا نے بتایا "یہ مہاشے تہمینہ کے فیانسے ہیں مگر تہمینہ ان کو مستقل لفٹ ڈو کئے رکھتی ہے۔"

اوہ — کس قدر ٹپیکل صورت حال تھی۔ وہ کزن جو ایک دوسرے سے منسوب تھے "گلفشاں" کی قسم کے ناموں والی کوٹھیوں کے باسیوں کے متعلق جتنے افسانے اس نے پڑھے تھے ان میں یہی ہوتا تھا۔

مگر یہ انسانے قریب سے دیکھو تو ان میں کچھ بھی نہیں رکھا تھا۔ جو دوسروں کی زندگی کو افسانہ سمجھتا ہے وہ در اصل خود بھی تو ایک کہانی ہے جسے دوسرے پڑھ رہے ہیں۔ یہ بات چمپا کو اس وقت معلوم نہ تھی۔

۴۴

برسات نکلی۔ کاتک پورنماشی آئی۔ پھر ماگھ پوس کی ہوائیں چلیں۔ کمروں میں آتش دان جلے۔ باغوں پر کہرہ چھایا۔ رات کے پھولوں پر شبنم کے قطرے جمے۔ چاند باغ میں کرسمس کے تہوار کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ امیروں نے اس سال کے فیشن کے اوور کوٹ سلوائے۔ غریب غربا پالے میں ٹھٹھر کر جاں بحق تسلیم ہوئے۔ بڑے لوگوں نے شکار کے دورے کالپی اور ترائی کا رخ کیا۔ کلکتے کی رونق دوبالا ہوئی۔ جاڑے نکلے۔ بسنت آئی۔ سرسوں پھولی کونپلیں پھوٹیں۔ بہار کی خوشبوؤں سے فضائیں مہکیں۔ انڈر گریجویٹ شعراء نے انگریزی میں جدید طرز کی نظمیں لکھیں۔ گرمیاں آئیں۔ تہ خانے آباد ہوئے۔ خس کی ٹٹیاں لگیں۔ اضلاع کے کمپنی باغ چنبیلی کے پھولوں سے مہکے۔ لیچیوں کی کھانچیاں اتریں۔ لو چلی۔ گومتی کی ریت میں خربوزے پکے۔ ساون آیا — امریوں میں جھولے پڑے۔ اسے بھی ایک سال نکل گیا عزیزو۔ یہ کا ایک برس ختم ہوا۔ اب دیوالی آ رہی ہے۔ کھانڈ کے کھلونوں کی

ٹوکریاں برآمدے میں لاکر رکھی گئی ہیں۔ نرملا اپنے گھر کے آنگن میں رنگوں سے نقش و نگار بنانے میں جٹی ہے۔

طلعت پچھلے برآمدے کی سب سے نچلی سیڑھی پر لوٹ لگاتی رہی۔ یہاں سے باغ کا منظر بہت خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ آسمان کی تیز نیلاہٹ سے آنکھیں چندھیا گئیں۔ نیلاہٹ جو دور نیچے جاکر درختوں کی ہریالی میں کھو گئی تھی اور شفاف سناٹا سارے میں پھیلا تھا۔ برابر کی کوٹھی میں مسز ٹیگور کے یہاں طبلہ بج رہا تھا۔ اندر شاید بھیا صاحب وائلن بجا رہے تھے۔ اس نے زمین پر کان رکھ دیا۔ یاجوج ماجوج کی طرح میں زمین پر کان بچھائے لیٹی ہوں۔ ٹھنڈک۔ سکون (جو سارناتھ کے مندر میں بھی ملا تھا) یاجوج ماجوج تھے۔ یا کون تھے؟ بہرحال۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے کھٹ مِٹھی پتیا گھاس توڑی اور آرام سے اسے چباتی رہی۔ گملے جو سیندوری رنگ میں رنگے گئے تھے۔ ان میں صبح پانی پڑا تھا اور اس کی وجہ سے ان کا رنگ بہہ کر نیچے آ گیا تھا۔

ایک سال نکل گیا۔ بھیا صاحب یونیورسٹی چھوڑ چکے تھے اور اب مقابلوں کی تیاری کر رہے تھے۔ کمال اور ہری شنکر ایم اے فائنل میں آ گئے تھے۔ اپّی نے بی اے کر لیا تھا۔ طلعت اور نرملا خود اب سیکنڈ ایر میں تھیں۔ بھیا صاحب کچھ سڑی ہو گئے تھے کیا۔ یہ چمپا باجی سے عشق کر رہے تھے اور وہ بھی ان کو پسند کرتی تھیں۔ چمپا باجی پر تو ساری دنیا ہی جان دے رہی تھی۔ کمال اور ہری شنکر کا ان کی تعریفیں کرتے منہ نہ تھکتا۔ وہ لوگ طلعت سے کہتے جب تم بڑی ہو جاؤ گی تو تم کو احساس ہو گا کہ چمپا کیسی عجیب و غریب ہستی ہیں۔ اچھا بھائی ہوں گی۔

اپّی کی ان سے اب بھی ویسی ہی ملاقات تھی۔ اپّی بڑی وضعدار آدمی تھیں۔ بہت خندہ پیشانی سے ملتیں۔ ان کا بہت بڑا دل تھا۔ زیادہ عجیب و غریب اور قابل قدر ہستی کون تھا۔ اپّی یا چمپا باجی۔؟ مگر یہ ان لوگوں کو کون بتانے جائے۔ میں نے یہ حساب لگایا ہے طلعت نے سوچا کہ آدمی لوگ خالی صورت کو پسند کرتے ہیں۔ چمپا باجی خوبصورت ہیں، نہیں ہیں۔ بس یہ ہے ساری بات۔ یہ سوچ کر اسے بڑا دکھ ہوا۔ گویا حسن کی ا

لوگوں نے لگا رکھی ہے۔ افسوس کے ساتھ اس نے اور کھٹ مٹھا گھاس توڑی اور اسے چبانے میں مصروف رہی۔

کمال دہرہ دون کی ایک سڑک پر منہ لٹکائے چلا گیا۔ وہ حسبِ معمول دیوالی کی چھٹیوں میں یہ چکر پر نکلا ہوا تھا۔ اس کے پرانے لا مارٹینز کالج کا ایک جواں سال انگریز پروفیسر جو چند سال قبل اوکسفرڈ سے آیا تھا۔ سادھو ہو کر گھر سے نکل بھاگا تھا۔ اسے پکڑنے کے لئے کمال کو بھیجا گیا تھا۔ کیونکہ کمال اس کا پسندیدہ شاگرد رہ چکا تھا۔ اس نے ہری شنکر کے ساتھ ہردوار کی ساری گپھائیں چھان ماریں چکر آتا اور رشی کیش اور ہر کی پوڑی کے مندر، ہمالیہ کی پہاڑیوں کو خوب کھوجا۔ تب ایک روز جوگ مایا کے ایک مندر کے پاس پروفیسر صاحب اسے مل گئے اور انھوں نے ہاتھ جوڑ کر اس سے التجا کی کہ بھائی اب کہ میں جنجال سے نکل آیا ہوں مجھے واپس مت لے جاؤ۔ مجھ پر رحم کرو میاں۔ میں بہت مزے میں ہوں۔

اور کمال نے کہا۔ "لکھنؤ میں افواہ ہے کہ یہ پبلسٹی حاصل کرنے کا ایک رکیٹ چلایا ہے آپ نے۔"

"بھائی۔" وہ ہاتھ جوڑے مصر رہے۔ "خدا کے لئے چلے جاؤ بھائی۔" اور اس کے بعد برہمنوں کی طرح زور سے کھنکھارتے ہوئے اپنا گیروا لباس سنبھالتے ایک چشمے کو، چھلانگ کر جنگل میں غائب ہو گئے تھے۔ اب کمال منہ لٹکائے موہنی روڈ پر چل رہا تھا۔ ہری شنکر حسبِ معمول اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ سامنے رسپنا بہہ رہی تھی۔

"یار! ہری شنکر۔" کمال نے کہا۔

"ہاں یار۔"

"یار یہ پروفیسر — ہملٹ ٹھیک تو کہتا تھا۔ ہم لوگ کس جنجال میں گرفتار ہیں خدا کی قسم۔"

اس روز انھوں نے تیاگ کے مسئلے پر کافی غور و خوض کیا اور سخت فلسفیانہ موڈ ان پر طاری رہا۔

"آؤ کوٹھیوں کے نام پڑھیں۔ ناموں کے انتخاب سے مکینوں کی سائیکولوجی آشکار ہوتی

ہے۔" چلتے چلتے رُک کر ایک پھاٹک کے قریب جاتے ہوئے ہری شنکر نے کہا۔
"ہم کبھی مکان بنا کر نہیں رہیں گے ع کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ۔" کمال نے کہا۔
"ٹھیک کہتے ہو۔ دیکھو بورژوازی کس قدر افسوسناک طور پر Sloppy ہے۔ ذرا یہ نام پڑھنا۔"
"خوابستان' —— لاحول ولا قوۃ۔"
"مگر تم خود بھی 'گلفشاں' اور 'خیابان' میں رہتے ہو۔"
"جانتا ہوں۔"
"یار کمال۔"
"ہاں یار۔"
"ذرا سوچو۔ لوگوں نے مکان بنا رکھے ہیں۔ یہاں سے وہاں تک۔ ایک سے ایک خوبصورت۔ ساری دُنیا میں مکان بنے ہوئے ہیں۔"
"ہاں یار۔ بڑی عجیب بات ہے۔"
وہ دونوں ایک پھاٹک کی پُلیا پر بیٹھ گئے اور پھر اس مسئلے پر غور و خوض کرنے لگے
دراصل ان کو پروفیسر کے دُنیا تج دینے نے بے حد مضطرب کر دیا تھا۔ ایک صحیح الدماغ انسان، سائنس دان اور سے کر چل دیا جنگل کو۔ حد ہے۔
"اس کا مطلب کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا۔"
اندھیرا پڑے تک وہ ڈالن والا کی خاموش معطر سڑکوں پر مکانوں کے نام پڑھتے پھرے۔ "نسترن"۔ "دولت خانہ"۔ "شیم روک"۔ "آشیانہ"۔ "راج محل"۔ کمال کے والد کا مکان خیابان بھی سامنے موجود تھا۔
ان مکانوں کے باغوں میں لگے ہوئے پہاڑی پھلوں کے درختوں کی مہک سارے میں اُڑ رہی تھی اور وہ دُنیا بڑی حسین جگہ تھی۔
وہ دونوں مُنہ لٹکا کر ایک پھاٹک کی پُلیا پر بیٹھ گئے اور نہر کے پانی کو دیکھتے رہے جو سڑک کے کنارے کنارے بہہ رہی تھی۔ پانی میں ایک ٹوٹا پھوٹا جوتا دھارے کے

زور سے اچھلتا کودتا بہتا چلا جا رہا تھا۔

چمپا احمد نے نشاط محل ہوسٹل کے وسیع ڈرائینگ روم میں آ کر روشنی جلائی اور کتاب کھول کر اسٹینڈرڈ لیمپ کے نیچے بیٹھ گئی۔

تہمینہ رضا گلفشاں کی برساتی کی سیڑھیوں پہ بیٹھی رام اوتار کو ہندی پڑھاتی رہی۔

انگریز سادھو اطمینان سے ٹانگیں پھیلائے ہماوت کے جنگل میں ایک چٹان پر پڑا سو رہا تھا۔

۴۵

دو سال اور نکل گئے۔ اگست ۴۲ء کا اندولن بھی پرانی بات ہو چکی۔ پنڈت جی اور مولانا اور سارے نیتا قلعہ احمد نگر میں قید تھے۔ سارے میں برطانوی اور امریکن سپاہی گھومتے نظر آتے تھے۔ حضرت گنج میں اینگلو انڈین ویک آئی لڑکیوں کے پرے ٹہلتے۔ دنیا کا رنگ تیزی سے بدل رہا تھا۔ دیواروں پہ سے 'کوئٹ انڈیا' کے الفاظ مٹتے جا رہے تھے سوسائٹی میں ہر طرف فوجی نظر آتے۔

گلفشاں کے سید عامر رضا نے بھی امپیریل سروس کے مقابلوں میں ناکام ہونے کے بعد نیوی میں کمیشن لے لیا۔ تہمینہ ایم۔ اے فائنل میں آ چکی تھی۔ چمپا ایم۔ اے پریویس میں تھی اور کیلاش ہوسٹل میں رہتی تھی۔ طلعت اور نرملا بڑی دھوم دھام کی انڈر گریجویٹ طالبات تھیں۔ چمپا بھی اب عرصے سے اس ہجوم میں موجود تھی جو شہر کا فیشن ایبل اسمارٹ انٹلکچوئیل سٹ کہلاتا تھا۔ اس ہجوم میں غفران منزل کی رخشندہ اور کنور پی چچہ اور گنگی کول اور کرن بہادر کا بچہ اور ہری کرم و ملیشور اور فیض آباد روڈ کی میرا نا آگنی راجونش اور ارجن راجونش اور فواد اور راحیل بلگرامی اور علی اور ایئر ریکٹنگ بھی شامل تھے۔ پھر گلفشاں اور سنگھاڑے والی کوٹھی کے افراد۔ چاند باغ اور یونیورسٹی۔ اتنے بہت سے نام۔ اتنے بہت سے چہرے۔ ان سب لوگوں کی بہت بڑی جتھہ بندی تھی۔ چہروں کا ذہنی باورچی خانہ۔ بلینک، سفید چہروں کا سمندر چاروں اور ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ان سب کے درمیان ان سب سے گھری ہوئی وہ تنہا کھڑی تھی۔ کیونکہ

آخری تجربے میں معلوم ہوتا ہے کہ انسان بالکل، قطعاً تنہا ہے۔ اس کے باوجود ہم چاروں طرف انسانوں سے مختلف قسم کے ایکویژن قائم کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

جب یہ ایکویژن غلط ہونے شروع ہو جاتے ہیں تو یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہم بے حد معمولی ہیں۔

یہی بات چمپا نے دفعتاً سید عامر رضا سے جو بھیا صاحب کہلاتے تھے، کہی۔

اس روز، بھیا صاحب مدراس کے لئے روانہ ہونے والے تھے۔ وہ اس سے ملنے کیلاش گئے۔ وہ اس وقت لائبریری جا رہی تھی۔ اپنی سائیکل ہاتھ میں لے کر وہ ان کے ساتھ ساتھ سڑک پر نکل آئی۔ بھیا صاحب نے اس سے کہا "میں یہاں سے بھاگنا چاہتا ہوں۔ اور شکر ہے کہ مجھے فرار کا موقع مل گیا۔ میرا تبادلہ مدراس کا ہو گیا ہے — تم — تم مجھ سے شادی کر کے میرے ہمراہ چلنے کو تیار ہو —؟"

بھیا صاحب ایک تو یوں بے حد حسین و جمیل تھے۔ نیوی میں شمولیت نے اور سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ گویا چارلس بوائر کو یونیفارم پہنا دیجئے

چمپا کا چہرہ کسی نامعلوم جذبے کے تحت سرخ ہو گیا۔ یہ ایک بہت اہم بات تھی جو اس نے سنی۔ ایک آدمی، اسے اپنی زندگی میں شامل ہونے کے لئے مدعو کر رہا تھا اور وہ اس آدمی کو بے حد پسند کرتی تھی۔

مگر اس نے کہا "کمال ہے۔ آپ کو یہ کہتے ہوئے شرم تو نہ آئی ہوگی۔"

"پھر تم نے مجھے باغ کے راستے پر کیوں چلایا تھا۔" انھوں نے غصے سے کہا

"میں نے آپ کو کسی باغ کے راستے پر نہیں چلایا۔"

"تم ایمانداری سے کہہ سکتی ہو کہ تم نے مجھ میں دلچسپی نہیں لی — یہ جانتے ہوئے کہ تمہاری دوست تہمینہ سے میری شادی ہونے والی ہے۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ یہ بالکل صحیح تھا۔ تب اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا اس میں بڑی خامیاں ہیں۔ اصول اور بلند خیالات اور فلسفے علیحدہ چیز ہیں اور ہم اصل زندگی میں اپنے خیالات سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ خالص فلسفے اور اخلاق کے اصولوں کا جذبات اور امپلسز سے

کوئی ایکوزیشن نہیں - ہم درحقیقت بے حد کمزور ہیں۔
بھیّا صاحب نے گویا اس کے خیالات پڑھ لئے "تم بھی بے حد معمولی نکلیں" انھوں نے کہا۔

"میں نے غیر معمولی ہونے کا کس روز دعوےٰ کیا تھا۔" اب وہ بادشاہ باغ کے پھاٹک تک پہنچ چکے تھے جس میں یونیورسٹی پوسٹ آفس تھا۔ "ٹھہرئیے آپ میرے ساتھ ساتھ کیوں چلے آرہے ہیں۔ مجھے اپنے کام سے جانا ہے۔ آپ گھر تشریف لے جائیے"
"میرا کوئی گھر نہیں ہے۔"
گھر تو ہم میں سے کسی کا بھی کہیں نہیں ہے۔" چمپا نے اکتا کر کہا۔ اب میں اس سے آپ سے فلسفہ نہیں چھانٹنا چاہتی۔ آپ کا مکان موجود ہے۔ جو گلفشاں کہلاتا ہے لاسول ولا۔ کس قدر بوگس نام ہے ___ اور وہاں تہمینہ موجود ہے۔ واپس جائیے۔"
"تم بے حد معمولی ہو۔ اور عام عورتوں کی طرح مجھ سے لڑ رہی ہو۔ تمہارے سارے ردِ عمل بہت معمولی ہیں۔ تم بھی بالآخر ٹائپ پر لوٹ گئیں ___ تمہارے جیسی ہزاروں لڑکیاں دنیا میں موجود ہیں۔ تم نے پہلے مجھ سے فلرٹ کیا اور اب آگے ساتھ دینے کی ہمت نہیں۔ حد ہے ___"
"عام مردوں کی طرح آپ بھی مجھ سے جھگڑ رہے ہیں!" اس نے مسکرا کر کہا۔ لہٰذا یہ نظریہ ثابت ہو گیا کہ ہم میں سے کوئی دیوی دیوتا کا درجہ نہیں رکھتا۔ خدا حافظ" وہ سائیکل پر بیٹھ کر تیزی سے ٹیگور لائبریری کی سمت روانہ ہو گئی۔
گلفشاں پہنچ کر بھیّا صاحب تندہی سے پیکنگ میں مصروف ہو گئے۔ اسی روز تہمینہ ایم اے کا آخری پرچہ کر کے یونیورسٹی سے لوٹی تھی۔ سارے دن گھر میں پھلجھڑیاں چھٹتی رہی تھیں۔ بڑی بٹیا نے تعلیم ختم کر لی۔ بھیّا صاحب نیوی کے افسر بن گئے۔ اب تو سنگاپور جا رہے ہیں۔ اب آخر بیاہ میں کیا دیر ہے۔ لوگو یہ بڑا اندھیر ہے۔ خالہ بیگم نے کہا۔ کہ لڑکی اور لڑکا گھر میں موجود۔ ٹھیکرے کی مانگ۔ اور شادی کا کوئی نام نہیں لیتا۔ اسی کو کل جگ کہتے ہیں۔

رات کو بھیّا صاحب خاموشی سے موٹر میں بیٹھ کر اسٹیشن چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد گنگا دین بھی نظروں سے اتر گیا۔ نوکر چاکر اسے غصّے سے دیکھتے۔ بے مروّت تھے دونوں کے دونوں —— حسینی کی بی بی نے زردہ پھانکتے ہوئے سوسن سے کہا۔ اور اپنی لڑکی کی چٹیاں گوندھنے لگیں (اری کمبخت نچلی بیٹھ۔ انھوں نے لڑکی کو ایک چانٹا رسید کیا۔ لڑکی زور زور سے رونے لگی)

سارے گھر میں بدمزاجی کا دورہ پڑ گیا۔ نواب تقی رضا بہادر نے اپنی بی بی سے کہا — اور بناؤ صاحبزادے کو اپنا بیٹا۔ اور کرو لاڈ۔ زمانے کا خون سفید ہو گیا ہے۔ دنیا یہی کہے گی کہ لڑکی ہی میں کوئی خامی رہی ہوگی جب بچپنے کے منگیتر نے چھوڑ دیا۔

کمال اور ہری شنکر، تہمینہ کے سامنے جاتے ہوئے کتراتے۔ گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہو چکی تھیں۔ چمپا بنارس لوٹ گئی۔ اب حسبِ معمول پہاڑ پر جانے کا پروگرام بنا۔ سارے گھر والے نینی تال کے لئے روانہ ہو گئے۔ ہری شنکر کو اپنے بڑھے کے ساتھ مرزاپور جانا تھا۔ اس کے آج کل دھڑا دھڑ پیغام آ رہے تھے۔ کمال اپنی پھوپھی کی دعوت پر مسوری چلا گیا۔

جولائی میں پھر سب لوگ پہاڑوں سے اترنا شروع ہوئے۔ "گلفشاں" کے دروازے کھلے۔ پروائی میں باغ کے پودے سرسرائے کہ ایک روز اچانک بھیّا صاحب آن پہنچے۔ تین دن وہ گلفشاں میں ٹھہرے اور تینوں دن اپنے کمرے میں بیٹھے رہے۔ روانگی سے ایک روز قبل وہ امّاں بیگم کے کمرے میں گئے۔

"مبارک ہو۔ آپ کی بیٹیا ایم اے پاس ہو گئیں۔" انھوں نے تخت کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے بڑی پُرسکون آواز میں کہا۔

امّاں بیگم خاموش رہیں۔

"میرا خیال ہے اب آپ کو ان کی شادی کر دینی چاہئے۔"

"کس سے؟" امّاں بیگم نے ذرا تلخی سے پوچھا۔

"مجھ سے اور کس سے۔" انھوں نے بھی اسی تلخی سے جواب دیا۔

"تم کو میاں شرم تو نہ آتی ہوگی اب یہ کہتے۔ چچا کی بیٹی کو چھوڑ کر غیر لڑکی کے چکر میں پڑ گئے۔ ہم جدھر جاتے ہیں۔ انگلیاں اُٹھتی ہیں۔"

"یہ آپ نے کس طرح طے کر لیا کہ میں اپنے فرض سے غافل ہوں۔ میں پال پوس کر اس گھر میں اسی لئے پروان چڑھایا گیا ہوں کہ تہمینہ بیگم کا شوہر کہلاؤں۔ اب میں اتنا احسان فراموش بھی نہیں کہ آپ کی بٹیا کو جل دے جاؤں گا۔" اتنا کہہ کر وہ باہر چلے گئے۔

سوسن نے جا کر تہمینہ سے کہا "بٹیا — ہم تو امام باندی کو بلانے جا رہے ہیں گانے کے لئے۔ کچھ سنا نہیں آپ نے آپ کا بیاہ ہو رہا ہے۔"

"سوسن — تم جا کر سب لوگوں سے کہہ دو کہ چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے میں ہرگز ہرگز بھیا صاحب سے بیاہ نہ کروں گی۔"

اتنا کہہ کر تہمینہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سوسن ہکا بکا رہ گئی۔

پھر سارے گھر میں ایمرجنسی کا اعلان کر دیا گیا۔ چاروں طرف فون اور ٹرنک کال ہوئے کمال کو مسوری تار دیا گیا کہ وہ بہن کو آکر سمجھائے۔ ہر شخص نے اپنے بھر تہمینہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ تم لڑکی ہو۔ ایم۔ اے پاس ہو تو کیا ہوا اور بڑے گھر کی بٹیا ہو تو کیا ہوا ہو تو لڑکی۔ شادی کر لو۔ اس کے بغیر گزر نہیں۔ رشتے ناطے کے معاملات میں ایسی اونچ نیچ ہوتی ہی رہتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

مگر تہمینہ نے ایک نہ کے بعد ہاں کر کے ہی نہ دی۔ گو خالص لڑکیوں والے انداز میں وہ رات رات بھر رویا کرتی۔

چمپا بھی واپس آ چکی تھی۔ یہ اس کا کیٹنگ کالج میں آخری سال تھا۔

کمال نے مسوری سے آکر گھر کا یہ نقشہ دیکھا۔ پھر وہ چمپا سے ملنے کیلاش گیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ چمپا ابھی اپنے ماموں کے یہاں ہے اگلے ہفتے ہوسٹل آئے گی۔ چمپا کے یہاں بھیا تو وہاں بھیا صاحب سے اس کی مڈ بھیڑ ہوئی۔ پتہ نہیں وہ چمپا سے اب کیا کہنے گئے تھے۔ وہ اسی وقت اُٹھ کر چلے گئے۔ اسی روز وہ مدراس کے لئے روانہ ہوئے۔

رفتہ رفتہ حالات پھر نارمل پر آ گئے۔ تہمینہ کے سامنے بڑا مسئلہ تھا کہ اپنے وقت کا

کیا کرتے۔ لڑکیوں کے لئے ملازمت کی کوئی راہیں نہیں تھیں۔ سوائے ایک محکمہ تعلیم کے تنگ آکر اُس نے پھر یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور قانون پڑھنے لگی۔ چمپا اسی طرح اس کے گروہ میں شامل رہی۔ ان دونوں لڑکیوں نے نہایت رکھ رکھاؤ اور سلیقے کے ساتھ ایک دوسرے سے اپنی دوستی نبھائی۔ کبھی بھولے سے بھی بھیا صاحب کا ذکر نہیں کیا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ یہ سمجھتی رہیں کہ بہت سنجیدہ اور باوقار خواتین ہیں۔ کوئی کل کی لونڈیاں ہیں کہ جذبات کے چھچھورے پن میں مبتلا ہوں۔

اور یہ واقعہ بھی ہے کہ وقتی طور پر جو باتیں ہم کو قیامت معلوم ہوتی ہیں۔ وقت گزر جانے کے بعد خیال آتا ہے ہم کس قدر بیوقوف تھے کہ یوں مضطرب ہوئے۔

۴۶

قحط کی ریلیف ورک کے سلسلے میں کمال کلکتہ جانے والا تھا کہ اسے جی جاجی کا خط ملا۔ لاج کی شادی کو ایک سال ہو چکا تھا وہ اپنے شوہر کے ساتھ نئی دلی میں تھی جہاں جیجاجی گورنمنٹ آف انڈیا کے کسی محکمے میں انڈر سکریٹری تھے۔ اب نرملا کی شادی کی فکر کی جا رہی تھیں جی جاجی نے لکھا تھا۔ تم کلکتہ جا رہے ہو۔ سردیپ نرائن کا لڑکا گوتم سی آج کل وہیں ہے۔ اس کے لئے ہمارا ارادہ ہے کہ نرمل کی بات بھیجی جائے۔ وہ بھی تمھارے بنگال ریلیف اور اپٹا دیٹا کے چکر ہی میں وہاں گیا ہوا ہے۔ یا شاید وشوا بھارتی میں کچھ کر رہا ہے۔ بہرحال تم ذرا اس سے ملنا اور معلومات حاصل کرنا کہ کس قماش کا لڑکا ہے۔ کچھ سنجیدگی بھی ہے مزاج میں یا تم سب کی طرح خالی بوہیمین ہی ہے۔

کمال نے خط جیب میں رکھ لیا۔ کمال کے آدمی ہیں جیجا جی بھی انسان: بس ہیں مکھیوں کی طرح مر رہے ہیں۔ ملک تباہی کی اور جا رہا ہے۔ یہ شادی بیاہ کے قصے لے کر بیٹھے ہیں (وہ بڑا جوشیلا اسٹوڈنٹ ورکر تھا اور تہمینہ اور بھیا صاحب کے قصے کے بعد سے شادی کے مسئلے سے شدت سے بیزار ہو چکا تھا) میں کلکتے میں قحط زدہ انسانوں کی لاشیں اٹھاؤں گا یا نرمل حسنی کے لئے دولہا تلاش کرتا پھروں گا۔ اس نے جھنجھلا کر طلعت سے کہا۔ مگر بہرحال فرض کے

طور پر اس نے ان صاحبزادے کا پتہ نوٹ کر لیا جو چچا جی نے خط میں لکھا تھا اور سفر پر روانہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ یونیورسٹی کے اور بہت سے لڑکے لڑکیاں تھے۔ راستہ بھر یہ لوگ ٹیگور اور نذر الاسلام کے ولولہ انگیز گانے گاتے گئے۔ ٹرین کی کھڑکی میں سے وہ وطن کے لہلہاتے کھیت دیکھتا رہا اور سوچا کیا ـــ یہ میرا ملک ہے ـــ یہ میرا ملک ہے ـــ وطنیت اور انقلابیت اور قومی جوش اور برطانوی حکومت کے خلاف غم و غصہ کے جذبات نے اس کے دل میں ایک عجیب و غریب کیفیت پیدا کر دی۔ اسی روز کے اخبار میں ایک بنگالی آرٹسٹ زین العابدین کے بنائے ہوئے قحط کے مناظر کے اسکیچ چھپے تھے۔ ایکھا نے اخبار اس کی طرف بڑھا دیا۔ کمال نے نظریں اٹھا کر ایکھا کو دیکھا۔ وہ رو رہی تھی۔ سب نے مل کر پھر گانا شروع کر دیا۔ یہ جنگ ہے جنگِ آزادی ـــ آزادی کے پرچم کے تلے ـــ ہم ہند کے رہنے والوں کی ـــ ہم ہند کے رہنے والوں کی ـــ ریل کی چھک چھک گویا گیت کی ہم آہنگ معلوم ہوتی۔ دوسرے کمرے میں چند لڑکے زور زور سے بحث کر رہے تھے۔

کمال نے آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کی۔ اس کے رفقا اسی طرح بحثیں کرتے رہے ـــ ٹرین بہار کے سرسبز علاقوں سے گزرتی بنگال میں داخل ہو گئی ـــ گنگا کے کنارے ایک چھوٹے سے خوبصورت ضلع کے اسٹیشن پر ٹرین رکی۔ لڑکوں نے کھڑکی کے باہر دیکھنا شروع کیا۔ چاول اور تالاب تھے۔ اور سبزہ زار۔ اور بانس کے جھنڈ اور سورج گنگا کی لہروں میں غروب ہو رہا تھا۔ اسٹیشن پر دو پالکیاں کھڑی تھیں۔ پلیٹ فارم پر دیہاتیوں کا مجمع تھا جو چاول کی تلاش میں کلکتہ جانے کے لئے ٹرین پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ پلیٹ فارم کی دوسری طرف مقابل میں فوجیوں کی ٹرین کھڑی تھی۔ سکھ اور پنجابی سپاہی جو برما جا رہے تھے۔ اردو کے فلمی رسالے ہاتھ میں لئے ادھر ادھر ٹہلتے پھر رہے تھے۔ ایک ہندوستانی میجر صاحب اپنی بیگم صاحب اور دو بل ٹیریر کتوں کے ساتھ فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کے سامنے کھڑے ایک انگریز کرنل سے مصروف گفتگو تھے۔

"جب تک یہ فوجی ٹرین نہ چلی جائے۔ آپ کی گاڑی روانہ نہیں ہو گی۔" ایک گارڈ نے کمال کو بتایا۔

"اس کا مطلب ہے ——"

"جی ہاں۔ کوئی چار پانچ گھنٹے لیٹ ہو گی آپ کی یہ ٹرین۔ یہ وار ٹائم ہے جناب۔"

لڑکے اور لڑکیاں پلیٹ فارم پہ اُتر آئے۔

اردھو گو گو نے بوجے مادل —— اُنھوں نے نذرالاسلام کا ایک اور گیت شروع کر دیا۔

میجر صاحب کی بیگم صاحبہ دلچسپی سے ان لوگوں کو دیکھنے لگیں۔

"یہ کون لوگ ہیں۔ کتنی پیاری آواز ہے سب کی ——"

"کمیونسٹ ہیں سالے ——" میجر صاحب نے منہ پھیر کر جواب دیا "چلو۔ کرنل ہمیں ریسٹوراں کار میں مدعو کر گیا ہے۔"

وہ دونوں ٹہلتے ہوئے ریسٹوراں کار کی سمت چلے گئے۔

کمال اور اس کے ساتھی اب گاتے گاتے بھی تھک گئے۔ ٹرین چلنے کا نام نہ لیتی تھی یکایک ریکھا چیخ کر ایک طرف کو دوڑی۔ اس کے ساتھی بھی اس کے پیچھے پیچھے لپکے۔ پلیٹ فارم کے سرے پر کسانوں کا ایک چھوٹا سا کنبہ سہما اور سکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ ایک نوجوان جس کی چھوٹی سی چھدری سیاہ داڑھی تھی مرا ہوا پڑا تھا۔ اس کی بیوی ایک سانولی سلونی دبلی پتلی لڑکی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ اس کے دونوں بچے جن میں سے لڑکے کی عمر نو سال کی تھی ساتھ ساتھ چلا رہے تھے۔

"کمال ——" نریندر نے آواز دی —— "ادھر آؤ —— ہمارا لاشیں اُٹھانے کا کام تو میاں یہیں سے شروع ہو گیا ——"

سسکیوں کے درمیان اس نے بنگالی میں بتایا کہ وہ اور اس کا میاں ابوالمونشور رزق ڈھونڈنے کلکتے جا رہے تھے۔ انھوں نے ایک ہفتے سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ آمنہ بی بی نے بھی ایک ہفتے سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ فوجیوں کے ٹرین میں سے پھینکے ہوئے دو بسکٹ اور

توس کے چند ٹکڑے جو اس نے جمع کئے تھے۔ وہ اپنے بچوں کو کھلا چکی تھی۔ اتنا کہہ کر وہ بھی پلیٹ فارم پر لیٹ گئی اور ان سب کے سامنے اُس نے بھی دم توڑ دیا۔

اینگلو انڈین اسٹیشن ماسٹر ان کی طرف آیا۔ "آپ لوگ ادھر کیا گڑبڑ مچاتا ہے۔ آج کل روز سو پچاس آدمی اسی پلیٹ فارم پر مرتا ہے۔ ہم کس کس کا فکر کرے۔ یہ ریلوے اسٹیشن ہے اسپتال نہیں۔ یہ بنگالی ہمیشہ کا بھوکا ہے — بھوکا بنگالی —! آپ کیوں فکر کرتا ہے —"

"یہاں قبرستان کدھر ہے —" نریندر نے غصے سے ہونٹ چباتے ہوئے پوچھا۔

"ہم کو معلوم نہیں — کیوں کیا آپ ان لوگ کا کبر کھودے گا۔ ویٹ از ویری فنی — ہا ہا!"

لڑکیوں نے دھاڑیں مارتے ہوئے بچوں کو ساتھ لیا اور بازار کی طرف چل دیں — لڑکے قبرستان اور کسی مسلمان مولوی کی تلاش میں آبادی کی طرف روانہ ہوئے۔

کمال لاشوں کے پاس بیٹھ گیا۔ اتنے میں فوجیوں کی ٹرین مہیب آوازیں نکالتی دھواں چھوڑتی روانہ ہوئی۔ فرسٹ کلاس کا ڈبہ پاس سے گزرا جس میں سکھ میجر اور اس کی دلہن بیٹھے تھے۔ ان دونوں کو لاشیں نظر نہیں آئیں کیونکہ انھوں نے کھڑکیوں کی جھلملیاں چڑھا دی تھیں۔ فوجی ٹرین کے جانے کے چند منٹ بعد اس ٹرین کو بھی جنبش ہوئی۔ جس میں کمال اور اس کے ساتھی سفر کر رہے تھے۔ گارڈ کمال کے پاس آیا۔ "ٹرین جاتا ہے۔ آپ لوگ ادھر کیا کرنے لگا۔ آپ کا فرینڈ لوگ کدھر گیا۔"

"ہم اب کل صبح ہی جا سکیں گے۔" کمال نے جواب دیا اور تھرڈ کلاس کے ڈبے میں جا کر سارا سامان نکال کر پلیٹ فارم پر رکھنے کے بعد لاشوں کے پاس آن بیٹھا۔

یہ ٹرین بھی چلی گئی۔ اسٹیشن دفعتاً بالکل سنسان ہو گیا۔

پلیٹ فارم کے سرے پر اندھیرا تھا۔ گارڈ بہت نیکدل انسان معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے ایک لالٹین لا کر کمال کے پاس رکھ دی اور پھر اپنے دفتر کی طرف چلا گیا۔

کمال لاشوں کے پاس بیٹھا رہا۔ ہوائیں بانس کے جھنڈ میں سائیں سائیں کرتی رہیں۔

کمال نے اپنے ہولڈال میں سے ایک چادر نکال کر لاشوں پر اڑھا دی۔ آمنہ بی بی جس نے سرخ ساری پہن رکھی تھی اور ابوالمنصور جس کی نیلی چارخانہ دار تہمد میں بہت سے پیوند لگے تھے۔ دونوں اس چادر میں چھپ گئے۔

کمال اٹیشیمین اٹھا کر لالٹین کی روشنی میں زین العابدین کے اسکیچ دیکھنے لگا — اس دنیا کے مصوّر نے کیا اسی جوڑے کی تصویر بنائی تھی۔ چند قدم پر گنگا بہہ رہی تھی۔ اس کی لہروں پر ایک اکیلا لوکا چل رہا تھا۔ جس میں چراغ جلتا تھا اور کوئی بڑی دلدوز آواز میں بھٹیالی گاتا جا رہا تھا جس کے الفاظ کمال کی سمجھ میں اچھی طرح نہیں آئے۔ درختوں کے پرے لارڈ کارنوالس کے عہد کی بنی ہوئی اونچے پیل پایوں اور جھلملیوں کے برآمدے والی ضلع کے کلکٹر کی عظیم الشان کوٹھی تھی۔ اس سے ذرا فاصلے پر ضلع کے سب سے بڑے ہندو زمیندار کا محل تھا جہاں ریڈیو بج رہا تھا۔ رات کے سناٹے میں ہواؤں پر تیرتی ہوئی بی بی سی کے لائٹ پروگرام کی آواز یہاں تک صاف سنائی دے رہی تھی۔ کمال کا دل ڈوبتا چلا گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ رابندر ناتھ اور سروجنی دیوی اور سرت چندر کا دیس تھا ناول نگاروں اور شاعروں کا محبوب موضوع۔

ہم سب مختلف قسم کی کتابوں کا موضوع ہیں۔ تاریخ کے ابواب۔ الفاظ۔ اعداد و شمار۔ رپورٹیں۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کی تقاریر۔ کمیونسٹ پارٹی کے مینی فسٹو۔ پچھلے ہفتے ڈاکٹر اشرف کہہ رہے تھے کہ قوموں کی خود مختاری کا مطالبہ عین لینن کے نظریوں کے مطابق ہے۔ پاکستان —— تو کیا جو مسلمان ہے وہ آٹومیٹک طور پر پاکستانی ہو جائے گا۔ —— یا کیا ہو گا —— لینن۔ اسٹالین۔ گورکی۔ ڈاکٹر اشرف۔ سجاد ظہیر۔ جناح صاحب۔ مہاتما گاندھی۔ پنڈت جی ——

کمال کے دماغ میں واقعات اور ناموں اور شخصیتوں کا جلوس منڈلا آیا۔ لیکن ساری دنیا کا مرکز اس وقت یہ دو لاشیں تھیں۔ سارے واقعات اور نظریوں کے فیصلے کی کڑی اگر اس مرکز پر ٹوٹ جاتی تھی۔ آمنہ بی بی اور ابوالمنصور —— دو لاشیں۔

دوسرے روز صبح وہ سب پھر اپنے سفر پر روانہ ہوئے۔ شام کو ٹرین ہوڑہ پہنچی

لڑکے اور لڑکیاں اپنے اپنے جائے قیام کی طرف روانہ ہوئے۔ پرتو وکمار کا گھرانا سب کا مستقر تھا جہاں ان سب کو دوسرے روز جمع ہونا تھا۔ کمال چیت پور روڈ کی طرف چلا جہاں اس کے ایک ماموں "مٹیا برج والے نواب" رہتے تھے۔

۴۷

چیت پور روڈ کے ایک مکان کے پھاٹک کے سامنے ایک بند گاڑی آن کر رکی۔ اس مکان کا طرزِ تعمیر کمپنی کے عہد کا تھا جس طرح کے مکان جا بجا کلکتے میں نظر آتے ہیں۔ بڑے بڑے پیل پائے۔ چوڑا برآمدہ۔ برآمدے اور دروازوں پر وینشین جھلملیاں۔ اندر کمروں میں مرصع سنہری فریموں میں انگریزی مناظر لگے تھے۔ کشمیری کڑھت کے پردے دروازوں پر پڑے ہوئے تھے۔ پیتل کے گملوں میں پام سجا تھا۔ باہر باغ کی چھوٹی چھوٹی کیاریوں میں بیلا مہک رہا تھا۔

اوپر کی منزل سے لڑکیوں نے آواز لگائی "ارے کمّن بھیا آگئے لکھنؤ سے۔" سارے گھر میں شور مچ گیا۔ نوکرانیاں اور نوکر باہر دوڑے۔ نیچے برآمدے میں فرن کے پتے جھوم رہے تھے۔ نواب صاحب بھانجے کے استقبال کے لئے آرام کرسی سے اُٹھے۔

یہ مکان پچاس پچپن سال قبل دت خاندان سے مٹیا برج والے نواب کمال رضا بہادر کے چھوٹے بہنوئی نے خرید لیا تھا۔ اس مکان میں ایک زمانے میں بڑی دھوم دھام سے برہمو سماج کے جلسے ہوا کرتے۔ اوپر کی منزل کے ایک کمرے میں اب تک دت خاندان کے افراد کی دھندلی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ گروپ فوٹوگراف جس میں مہارشی دیویندر ناتھ ٹیگور وسط میں بیٹھے تھے۔ اس کمرے میں ایک طرف سنگِ مرمر کا چبوترہ تھا۔ یہاں بیٹھ کر سارے مہارشی ہارمونیم پر بھجن گاتے تھے۔ مالک مکان بابو منورنجن دت کے انتقال کے بعد جو کیننگ کالج لکھنؤ میں پروفیسر تھے ان کی اولاد نے یہ مکان فروخت کر کے بالی گنج میں ایک بہت بڑی کوٹھی بنالی تھی۔ ان کے اولاد میں اب میں کئی آئی سی ایس افسر تھے۔ کئی کمیونسٹ لیڈر۔ ان کی لڑکیاں زیادہ تر یوروپ میں تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ بابو منورنجن دت کی ایک پوتی

کی شادی اڑیسہ کے ایک مہاراجہ سے ہوئی تھی۔ موجودہ مالک مکان اور روت خاندان کی کئی پشتوں کی دوستی تھی۔

موجودہ مالک مکان لکھنؤ کے اجڑے ہوئے نواب تھے۔ وثیقہ پاتے تھے اور کلکتے میں رہتے تھے۔ ان لوگوں کا مشغلہ زندہ رہنا تھا۔

نواب کمال رضا بہادر سلطان عالم واجد علی شاہ کے ہمراہ مٹیا برج آئے تھے۔ ان کے خاندان کے بہت سے افراد بھی ان کے ساتھ تھے۔ نواب علی رضا بہادر ان کی سب سے چھوٹی بہن کے میاں اور چچا زاد بھائی تھے۔ انیسویں صدی کے اواخر کا کلکتہ بے حد ماڈرن شہر تھا جس میں ان گنت کالج تھے اور سیاسی اور تہذیبی تحریکیں۔ اور پریس اور اخبار۔ نئے بنگالی ناولوں میں ہندو تہذیب کی تجدید کا پرچار کیا جا رہا تھا۔ راجہ سریندر موہن ٹیگور نے ہندوستانی موسیقی کی احیاء کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ سوامی وویکانند یہاں سے باہر جا کر یورپ اور امریکہ میں ویدانت فلسفے کا پرچار کر رہے تھے۔ ملک میں ہر طرف سیاسی اور تہذیبی تحریکوں کا چرچا ہو رہا تھا۔ کانگریس بدرالدین طیب جی اور دوسرے لیڈروں کی قیادت میں بڑے بڑے اجلاس کر رہی تھی۔ مگر نواب علی رضا بہادر کو ان سب ہنگاموں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ علی گڑھ میں ایم۔ اے۔ او کالج کھل گیا تھا مگر نواب صاحب کو انگریزی تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کے سوشل تعلقات مرشد آباد اور ڈھاکے اور عظیم آباد کے نوابی خاندانوں تک محدود رہے۔ ان کی اولاد اور خاندان والوں کی شادیاں لکھنؤ اور اودھ کے تعلقہ دار گھرانوں میں ہوا کیں۔ لکھنؤ میں یہ لوگ کلکتے والے نواب کہلاتے تھے۔ کلکتے میں انھیں لکھنؤ والے کہا جاتا تھا۔ ان کی زندگی کے مرکز صرف تین تھے۔ کلکتہ، پٹنہ عظیم آباد اور لکھنؤ۔ اس سے آگے کی دنیا کی انھیں خبر نہیں تھی۔ ان کا سارا وقت لکھنؤ، دلی اور عظیم آباد کی ادبی اور شاعرانہ نوک جھونک میں صرف ہوتا تھا۔ وثیقے کی آمدنی کی وجہ سے بے فکری سے گزر ہوتی تھی۔ سریرِ برطانیہ کا سایہ سلامت تھا۔ راوی چین لکھتا تھا۔

تب ان کے خاندان میں پہلی مرتبہ ایک عجیب بات ہوئی۔ نواب علی رضا کے داماد جو لکھنؤ میں رہتے تھے۔ سرسید کی نیچری فوج میں جا شامل ہوئے اور انھوں نے اپنے بڑے لڑکے کو

علی گڑھ بھیج دیا

نواب علی رضا کے دوسرے داماد پٹنے کے رہنے والے تھے۔ وہ بھی بے حد روشن خیال نکلے۔ پٹنے میں قانون کا بہت چرچا تھا۔ اَن گنت ہندو مسلمان قانون پڑھ پڑھ کر بیرسٹر بن رہے تھے اور بڑا نام اس پیشے میں انھوں نے پیدا کیا تھا۔ چنانچہ نواب علی رضا کے پٹنے والے نواسے کو بھی اتنا پڑھایا گیا کہ وہ بہت زیادہ پڑھ گئے اور بیرسٹری کے لئے ولایت چلے گئے یہ اس خاندان کے پہلے فرد تھے جو انیسویں صدی کے آخر میں ولایت گئے۔

نواب علی رضا کے لکھنؤ والے داماد انگریزی تعلیم کے تو قائل ہوئے ہی تھے۔ اب وہ سیاست میں بھی دلچسپی لینے لگے۔ سرسید مسلمانوں کو علیحدہ پلیٹ فارم پر جمع کر کے انگریزوں کا وفادار رکھنا چاہتے تھے۔ اس مسئلے پر ان کا سرسید سے اختلاف ہو گیا۔ وہ کانگریس کے ہم خیال ہو گئے اب ان کے یہاں لکھنؤ کلب گولہ گنج والے مکان میں لالہ بھائیوں کا مجمع رہتا۔ یہ سب لوگ ابھی گورنمنٹ کے وفادار بھی تھے اور صرف سیاسی مراعات اور سوشل ریفارم چاہتے تھے۔ اَن گنت مسلمان اس تحریک میں شامل تھے۔

ہندوستان میں مسلمان کی سیاسی حیثیت کا مسئلہ بہت ٹیڑھا بنتا جا رہا تھا۔ ہندو جو سوا سو سال سے انگریزی تعلیم سے روشناس ہو چکا تھا اپنے کنجلک ما اور الطبیعاتی ذہن اور خالص تجریدی فلسفے کے باوجود پریکٹیکل تھا۔ مسلمانوں کے عہد میں فارسی پڑھ کر حکومت کے نظم و نسق میں حصہ لیا۔ مسلمان حکمران اور صوبے دار صرف فرمانوں پر دستخط کر دیتے تھے۔ دیہی ایڈمنسٹریشن ہندو چلاتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی آئی۔ تب بھی ہندو نے فوراً حالات سے سمجھوتہ کر لیا اور مغلوں کا کائستھ منشی پل کی پل میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کلرک میں تبدیل ہو گیا پچھلے سو سال سے ہندو اپنی ذات پات کے بندھنوں اور اپنے پراچین فلسفے کے باوجود مغربی تعلیم اور سائنٹیفک نظریہ فکر کے قریب تر ہو چکے تھے۔ سب سے پہلے مغرب کے فلسفے کا اثر انھوں نے قبول کیا۔ جب قوم پرستی کی تحریک شروع ہوئی اس کا تدارک کرنے کے لئے انگریزی حکومت نے فوراً ملک کے پس ماندہ طبقوں کو جنھیں ۱۸۵۷ء کے بعد ہر طرح سے کچلا گیا تھا۔ اب اپنی عنایات سے نوازنا شروع کیا۔ ہندوؤں کے یہاں

ایک بورژوازی بھی پیدا ہو چکی تھی جو لیڈرشپ اور لبرل سیاست کے لئے تیار تھی۔ مسلمان ابھی فیوڈل اسٹیج سے آگے نہ نکلے تھے۔ ان کے ذہن میں اب تک شہنشاہیت کے تصوّر موجود تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب ان کی اپنی بادشاہت کا خاتمہ ہوا تو اس کا جذباتی نعم البدل انھوں نے سلطان ترکی سے محبت میں ڈھونڈا۔ وہ ان کا خلیفہ تھا جو قسطنطنیہ میں رہتا تھا۔ پھر حیدرآباد کے نظام سے ان کو عقیدت تھی کیونکہ اس گئے گزرے زمانے میں ایک اتنی بڑی ریاست کا مسلمان فرمانروا تھا۔ ان کی لیڈرشپ کے لئے جب ہز ہائی نس آغا خاں اور دوسرے نوابین آئے تو مسلمان عوام کو بہت اچھا معلوم ہوا۔ کیونکہ نام اور خطابات بہر کیف عہدِ رفتہ کی یاد دلاتے تھے۔

انگریز اور فیوڈل طبقے کا گٹھ جوڑ بہت کامیاب ثابت ہو رہا تھا۔

بنگال میں مسلمانوں کے عہد میں معافی کی زمینوں کی آمدنی سے مدرسے قائم تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان زمینوں پر اپنا قبضہ کر لیا تھا۔ مدرسے بند ہو گئے تھے اور مسلمان پسماندہ رہ گئے۔ ان کے مقابلے میں ہندو انگریزی پڑھ رہے تھے۔ مسلمان جاگیردار ختم ہو چکا تھا۔ مسلمان صنعت کار تباہ کر دیا گیا تھا۔ اس کی جگہ دوامی بندوبست کے نئے ہندو زمینداروں اور ہندو مڈل کلاس نے لی تھی۔ طبقاتی اُلٹ پھیر کے اس پس منظر کے ساتھ بنگال میں سب سے پہلے نشاۃ ثانیہ کی تحریک شروع ہوئی تھی۔ نئی ہندو بورژوازی قیادت کے لئے تیار تھی۔ ملازمتیں حاصل کرنے کی دوڑ میں بھی ہندو مسلمانوں سے آگے نکل گئے تھے۔ مسلمانوں میں خوف کی سائیکولوجی پیدا ہونی شروع ہو گئی تھی۔ اس خوف کو اچھے موقعے پر انگریز نے ہوا دی۔

دفعتاً انگریزی خواں مسلمانوں کا مڈل کلاس بننا شروع ہوا۔ مسلمان جولاہا اور کسان جو ملک کی دھرتی پر محنت کر کے زندہ رہتا تھا اس کے متعلق کسی نے بھی نہ سوچا۔ سب کو یہی

سکیں حتی الامکان اپنے لئے زیادہ سے زیادہ اقتصادی تحفظ اور ملازمتیں حاصل کر لی جائیں۔

پھر جنگ چھڑی اور ڈاکٹر انصاری آئے اور علی برادران اور خلافت تحریک چلی اور گاندھی آئے۔ اور کانگریس نے علی الاعلان سوراج کا مطالبہ کیا۔ اب حالات تیزی سے بدلنا شروع ہوئے۔ کھادی کی تحریک۔ اور قوم پرستی۔ ایک عجیب جوش سارے ملک پر طاری ہو گیا۔

نواب علی رضا بہادر کے داماد تقی رضا بہادر جو تعلقے دار تھے کھلے بندوں قومی تحریکوں میں حصہ نہ لے سکتے تھے۔ اودھ کے تعلقہ داروں نے ۱۸۵۷ء میں اودھ کو بچانے کے لئے جم کر انگریزوں کا مقابلہ کیا تھا مگر بعد میں یہی تعلقہ دار انگریزوں کے جاں نثار ثابت ہوئے کیونکہ ان کا انگریزوں کے گٹھ جوڑ کے ذریعے کسانوں پر ان کا تسلط قائم رہ سکتا تھا۔ یہ لکھنؤ میں نواب، سر ہارکورٹ بٹلر کا زمانہ تھا ——— اُس نے تعلقہ داروں والی عادتیں اختیار کر رکھی تھیں۔ یہ لکھنؤ کے تعلقہ داروں کا سنہرا دور تھا۔ ایک طرف آزادی کی آندھی چل رہی تھی دوسری طرف قیصر باغ کی بارہ دری میں دھوم کے مشاعرے ہوتے تھے جانِ عالم کے عہد کی تجدید ہوئی تھی۔ یہ مہاراجہ محمود آباد اور ٹھاکر نواب علی اور رائے راجیشور بلی کا لکھنؤ تھا۔

اسی زمانے میں ان کے علی گڑھ کے تعلیم یافتہ بیٹے نواب ابوالمکارم تقی رضا بہادر کے یہاں بڑی اللہ آمین سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ جس کا نام اپنی دادی اماں کے ماموں نواب کمال الدین علی رضا بہادر کے نام پر کمال رکھا گیا۔

ان کے یہاں ایک دو سالہ لڑکی پہلے سے موجود تھی۔ جس کا نام تہمینہ بیگم تھا۔ کمال کو اپنے طبقے کے دوسرے بچوں کی طرح پہلے دہرہ دون اسکول بھیجا گیا۔ پھر اس نے لامارٹینیر کالج میں پڑھا۔ جو برطانوی اور فیوڈل روایات کا گڑھ تھا۔

کمال کو اپنے بچپن کا زمانہ بڑے واضح طور پر یاد تھا۔ جب وہ گھر میں بڑوں سے سیاست کے تذکرے سنتا۔ نواب ابوالمکارم کا خاندان اب اگلے وقتوں کا جیسا نہیں تھا اب اس گھر انے کے افراد سرکاری ملازمتیں بھی کر رہے تھے۔ بڑے چچا میاں یعنی بھیا صاحب

کے والد بیرسٹر تھے اور کانگریسی لیڈر۔ مگر ان کا عین جوانی میں انتقال ہوگیا۔ پٹنے والے ماموں بھی کانگریسی تھے اور آئے دن جیل جاتے رہتے تھے۔ کمال کو ترکِ موالات کا زمانہ یاد تھا جب پٹنے والے ماموں اسے اپنے ساتھ جلسوں میں لے جاتے اور وہ بڑے جوش و خروش سے اسٹیج پر کھڑے ہو کر اپنی توتلی زبان میں قومی نظمیں پڑھتا اور پولیس آکر لاٹھی چارج سے جلسے کو منتشر کر دیتی۔ سیاست اب محض اخباروں تک محدود نہیں تھی۔ روزمرہ کی زندگی میں داخل ہو گئی تھی۔

جب ذرا اور بڑا ہوا تو اپنے ہندوستانی ہونے پر اسے ناز سا محسوس ہونے لگا۔ اس ناز میں زیادہ تر اپنے ماضی پر فخر کرنے کا عنصر شامل تھا۔ ہم یوں تھے۔ ہم ووں تھے۔ اسی قسم کی تقریریں لیڈر کر رہے تھے۔ سیلر سوٹ کے بجائے پٹنے والی ممانی نے اس کے لئے کھادی کی شیروانی بنوائی۔ اس کے کزن جامعہ ملیہ میں پڑھتے تھے۔ اس نے بھی ضد کی کہ اسے دلی بھیج دیا جائے مگر اس کی کسی نے نہ سنی۔ بہرحال کرنل براؤنز اور لامارٹینیر کے برطانوی لڑکوں کے مقابلے میں وہ ہندوستانی تھا اور ہندوستان اس کا بہت پیارا وطن تھا۔

یہ ہندوستان کیا تھا۔ اس کا شعوری طور پر اس نے کبھی تجزیہ نہیں کیا۔ بچپن سے وہ اس ہندوستان کا عادی تھا۔ جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ جہاں اس کے پرکھے پچھلے سات آٹھ سو سال سے پیدا ہوتے آئے تھے۔ اس ہندوستان میں سرسوں کے کھیت تھے اور رہٹ۔ اور سیتلا دیوی کے مندر۔ ہندوستان بستی ضلع کا وہ مٹھ تھا جہاں وہ اپنے بابا کے ہمراہ گیا تھا جہاں برآمدے میں تخت پر ایک موٹا بی اے پاس مہنت بیٹھا تھا اور جس کو ممی نے دس کا نوٹ چڑھایا تھا اور جس نے آشیرباد دی تھی۔ ہندوستان اٹاوے کی وہ کائی آلود درگاہ تھی جس کی منڈیروں پر بہت سے قلندر اکڑوں بیٹھے رہتے تھے۔ جن میں سے ایک نے کمال کو بڑل کے سنترے کھلائے تھے۔ ہندوستان قدیر ڈرائیور کی بوڑھی ماں تھی جو پیلے رنگ کی دھوتی پہنے مرزا پور کے اسٹیشن پر کمال کے لئے مٹی کے کھلونے لے کر آئی تھی۔ ہندوستان سول لائنز کی وہ سڑکیں تھیں جن پر صاحب لوگوں کے ڈوگ بوائز شام کو کتوں کو ہوا کھلانے کے لئے نکلتے تھے۔ ہندوستان بوڑھا حاجی بشارت حسین خانساماں تھا جو جب کمال کو

سیتلا نکلی تھی تو اپنی دوپلی ٹوپی اتار کر ایک ٹانگ پر ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا اور گڑگڑا کر بولا تھا —

"ماتا — اب معاف کرو — بھیا کو چھوڑ کر چلی جاؤ — ماتا تمھارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں —"

یہ سیتلا کے سامنے ہاتھ جوڑنے والا مسلمان بوڑھا ہندوستان تھا۔ اس کے علاوہ اس کی اماں اور خالائیں اور گھر کی دوسری بیبیاں بھی ہندوستان تھیں۔ ان کی آپس کی بول چال محاورے۔ گیت۔ رسمیں اور پھر پرانی کہانیاں جو مغلانیاں سناتی تھیں۔ اجودھیا کے راجہ دسرتھ کی دو بیبیاں تھیں۔ ایک کا نام تھا کیکئی، دوسری کا کوشلیا — ہندو پرانوں اور دیومالا کے قصے، مسلمان اولیاء کے قصے، مغل بادشاہوں کے قصے۔ یہ سب کمال کی ذہنی بیک گراؤنڈ تھی۔ ایک غرور اپنے ماضی پر۔ ایک تاسف اپنے حال پر۔ ایک امید اپنے مستقبل کے متعلق۔ ان تین عناصر سے اس کے ذہن کی تشکیل ہوئی تھی۔ گاندھی جو دھوتی باندھے گھومتے تھے اور ملک کے سنتوں کبیر اور تلسی داس اور تکا رام کی روایت پر پورے اترتے تھے۔ اس کسان کے سمبل تھے جو خود بھی دھوتی باندھے ننگا گھومتا تھا۔ نہرو اس ہندوستان کی نئی نسل کے سمبل تھے جس کی دل میں یہ سارے دریا امنڈ رہے تھے۔

اس ہندوستان میں ان گنت اسرار تھے۔ مذہب۔ فلسفہ۔ آرٹ۔ رمزیت۔ تصوف۔ ادب۔ موسیقی۔ کیا کچھ یہاں نہیں تھا۔ ایک طرف یہ زبردست عظیم الشان ورثہ تھا۔ دوسری طرف انگریزی تمدن تھا۔ صاحب لوگوں کا راج تھا۔ اسمبلی کے قانون تھے۔ گورنر کے دربار تھے۔ انگریز لڑکے جو کرنل براؤنز اور لا مارٹینیر میں اس کے ساتھ شہسواری کرتے تھے۔ انگریز افسر جو گلفشاں میں ڈنر کھانے آتے تھے اس کی گولہ گنج والی حویلی کی شہ نشین میں بیٹھ کر محرم کے جلوس کا نظارہ کرتے تھے۔ یہ انگریز، ہیلی برنی کے افسروں کے جانشین جن کو سکھلایا گیا تھا کہ کن ہندوستانیوں کو جب وہ تمھاری کوٹھی پر سلام کے لئے حاضر ہوں تو برآمدے ہی میں بٹھاؤ۔ کن کو ڈرائنگ روم میں بلانے کی عزت بخشو۔ کن کو صرف کھڑے کھڑے ہی ڈالی لے کر واپس کر دو۔ کن کے گھر خود بھی جب وہ مدعو کریں تو چلے جاؤ۔ کمال

اس خوش قسمت طبقے میں پیدا ہوا تھا جسے انگریزوں سے برابری سے ملنے کا فخر حاصل تھا۔ ہندوستان کا فیوڈل طبقہ۔

۳۴ء میں پنڈت نہرو نے یہ خوش آئند امید ظاہر کی تھی کہ گو مسلم سیاست پر فیوڈل عنصر چھایا ہوا ہے۔ ان کا نچلا متوسط طبقہ انڈسٹریل طور پر پس ماندہ ہے لیکن چونکہ ان کے یہاں سماجی رشتوں کا شعور زیادہ پختہ ہے۔ اس لئے یہ لوگ ہندو لوئر مڈل کلاس کے مقابلے میں سوشلسٹ راستے پر زیادہ تیزی سے گامزن ہوں گے۔ پنڈت نہرو یہ بھی کہتے تھے کہ ہمارے سرمایہ دار اور انڈسٹری کے کرتا دھرتا اور مل اونرز شدت سے رجعت پسند ہیں۔ وہ تو ابھی جدید زمانے کے سرمایہ دار بھی نہیں بنے ہیں۔ کانگریس پر ہندو اکثریت کا غلبہ ہے اور ہندو اکثریت فرقہ وارانہ ذہنیت کی حامل ہے۔ ایسے میں مسلمانوں میں خوف کی سائیکولوجی کا پیدا ہونا ناگزیر ہے اور اس صورتِ حال کو برطانوی حکومت خوب اچھی طرح اپنے فائدے کے لئے استعمال کر رہی ہے۔ ملک کا فیوڈل عنصر یہ بھی نہیں چاہتا کہ عوام اقتصادی طور پر آزاد ہوں۔ لہٰذا انھوں نے برطانوی حکومت سے سازش کر رکھی ہے مڈل کلاس کی انٹلجنسیا میں فاشزم کے عناصر بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ ان خطرات کا مقابلہ کرنے میں ہمیں اپنی پوری کوشش صرف کرنا چاہیئے۔ پنڈت نہرو بہت زبردست سوشلسٹ تھے۔ ان کو گاندھی جی کی روحانیت اور بات بے بات خدا کا حوالہ دینا بہت کھلتا تھا۔ کمال اور اس کی ساتھ کی نوجوان نسل کی پنڈت نہرو پوری پوری ترجمانی کر رہے تھے۔

اس نئے باشعور ہندوستان اور برطانوی ہندوستان کے علاوہ ایک اور الف لیلوی دیس اسی ملک میں بستا تھا جس کی جھلک کمال نے حیدرآباد دکن اور ریاست کشمیر اور بھوپال اور رام پور میں دیکھی تھی۔ یہ ریاستی ہندوستان تھا۔ یہاں سیاسی آزادی کے تصور کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ یہ راجے مہاراجے برطانیہ کے فرزندانِ دلبند کہلاتے تھے اور کمپنی سے انیسویں صدی میں جو معاہدے انھوں نے کئے تھے ان کی بنا پر مطلق العنانی سے حکومت کرتے تھے۔ ان ریاستوں میں خصوصاً حیدرآباد دکن مسلمانوں کے لئے خاص جذباتی اہمیت کا حامل تھا۔ ہز اگزالٹڈ ہائی نس حضور نظام کی مملکت۔ تہذیب شعروشاعری، نفاست،

آداب محفل وغیرہ کا سلسلہ چونکہ ایک خاص درباری اور جاگیردارانہ ماحول میں پھلتا پھولتا ہے لہٰذا یہاں پر مسلمانوں کی کلچر ابھی اپنی خالص حالت میں موجود تھی۔

جاگیرداروں، مڈل کلاس لیڈروں، ذہن پرستوں اور یونیورسٹیوں کے جوشیلے طالبعلموں کی دُنیا سے الگ ایک اور دُنیا تھی۔ جو اصل ہندوستان تھا۔ یہ دنیا آسام اور جنوبی ہند کے چاء کے باغات اور کانپور، بمبئی، کلکتہ، احمد آباد اور ٹاٹا نگر کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں اور سارے ملک کے لاکھوں گاؤں میں رہنے والے کسانوں پر مشتمل تھی۔ کانگریس نے عرصے سے زرعی اصلاحات کے لئے ایجی ٹیشن کر رکھا تھا۔ کسانوں کے سلسلے میں برطانوی حکومت نے مختلف صوبوں میں مختلف حکمت عملی اختیار کر رکھی تھی۔ بنگال میں جہاں انھوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی۔ وہاں مسلمانوں کو اقتصادی طور پر بالکل تباہ کر کے ہندوؤں کو ان کی جگہ طاقتور بنایا تھا۔ پنجاب اُنھوں نے سکھوں کے ہاتھوں سے لیا تھا۔ لہٰذا یہاں مسلمانوں کی اُنھوں نے ہمّت افزائی کی۔ جو صوبے سب سے زیادہ عرصے سے انگریزوں کے زیرنگیں تھے وہ سب سے زیادہ تباہ حال تھے — بنگال۔ بہار۔ اُڑیسہ۔ مدراس۔ بنگال میں مستقل قحط پڑتے تھے۔ پنجاب انگریزوں کے ہاتھ میں سب سے آخر میں آیا تھا۔ لہٰذا سب سے زیادہ خوشحال صوبہ یہی تھا۔ یو۔ پی جو ہندوستان کا دل تھا اور ملک کی ساری قرون اولیٰ قرون وسطیٰ کی تہذیبوں کا گہوارہ وہیں کا کسان سب سے زیادہ مفلوک الحال تھا۔ کسان جو کانگریس تحریک کی طرف آ رہا تھا۔ سمجھتا تھا کہ سوراج کا مطلب زرعی اصلاحات ہے۔ جب اسے جنم جنم کے ظلم اور قرضے کے بوجھ سے نجات ملے گی۔

شہروں میں ٹریڈ یونین قائم ہو رہے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں حکومت نے بنگال، بمبئی، پنجاب اور یو۔ پی کے مزدور لیڈروں کو پکڑ لیا۔ جن میں کمیونسٹ بھی شامل تھے۔ میرٹھ ٹرائل شروع ہوا۔ کمیونسٹ — یہ ایک نیا عنصر اب سیاسی منظر پہ ظاہر ہوا۔ یہ زیادہ تر یوروپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھے ہوئے انٹلکچوئل تھے۔ ساری دُنیا میں اقتصادی ڈپریشن چھایا ہوا تھا۔ ایک نئی جدوجہد بڑے پیمانے پہ شروع ہو چکی تھی۔ اس طبقاتی جدوجہد میں امریکہ پیش پیش تھا۔

پھر ۳۷ء میں جب کمال ابھی لا مارٹینئر ہی میں تھا لکھنؤ میں دو اہم واقعات ہوئے
مسلم لیگ کا آل انڈیا سیشن - اور کانگریس حکومت کا قیام

اسے اب تک یاد تھا کہ اسے بیگم شاہنواز کی شخصیت نے بہت متاثر کیا تھا جو بہت چوڑے نقرئی بارڈر کی ساڑی اور لمبے لمبے بندے پہنے ڈائس پر کھڑی تقریر کر رہی تھیں
اسی سال کانگریس نے ۳۵ء کے آئین کے نکات منظور کر کے اپنی وزارت قائم کی۔ یہ ایک نیا انوکھا تجربہ تھا۔ پہلی مرتبہ ملک میں قومی لیڈر حکومت کے نظم و نسق میں شامل ہوئے۔ مسز وجے لکشمی پنڈت لوکل سیلف گورنمنٹ کی وزیر بنیں۔ سفید ساری اور چینی وضع کا بغیر آستین کا بلاؤز پہنے موٹر میں بیٹھی وہ کونسل چیمبر کی طرف جاتی نظر آتیں۔ اگلے سال جب ریڈیو اسٹیشن کھلا تو انھوں نے اس پر افتتاحی تقریر کی۔ اسی زمانے میں گومتی کے کنارے صنعتی نمائش منعقد ہوئی۔ کمال اندھیرا پڑے گلفشاں کی سیڑھیوں پہ بیٹھا ہوتا۔ شام کے سناٹے میں ہواؤں کے ساتھ بہتی ریکارڈوں کی آوازیں اس کے کان میں پہنچتیں۔
ان میں سے ایک فلمی ریکارڈ اکثر بجتا —
کایا ایک گھروندا ہے — کایا ایک گھروندا ہے —
اسی زمانے میں کانگریس نے نیشنل پلاننگ کمیٹی بنائی۔ زراعت، صنعت، تعلیم، بے روزگاری وغیرہ کے لیے دس سالہ منصوبہ تیار کیا گیا۔ تبھی کانگریس نے چین میڈیکل مشن بھیجا۔ پھر جنگ چھڑ گئی اور ہندوستان کی رائے لیے بغیر برطانیہ نے اس ملک کو بھی جنگ کی بھٹی میں جھونک دیا۔ انگریزوں کی خاطر پچھلے سو سال سے ہندوستانی فوج دوسرے ایشیائیوں سے لڑتی تھی۔ ہندوستانی سپاہی افغانوں سے اور چینیوں کو مارنے کے لئے بھیجے گئے۔ عراق میں ترکوں اور عربوں سے لڑے۔ اور اب ان کو پھر یورپین امپریلزم کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ کانگریس حکومت نے استعفیٰ دے دیا۔ اب پھر گورنر کا راج شروع ہوا۔ کانگریس نے عدم تعاون کی تحریک شروع کی۔ زوال فرانس کے بعد جب اتحادیوں کی حالت بے حد خستہ ہو گئی۔ تب کانگریس نے ایک بار پھر پیش کش کی کہ اگر مرکز میں مکمل آزاد

قومی حکومت قائم کر دی جائے تو وہ جنگ میں تعاون کرنے کے لئے تیار ہے۔ یہ پیشکش برطانیہ نے مسترد کی تب مہاتما گاندھی نے انفرادی ستیہ گرہ شروع کر دی۔ تیس ہزار مرد اور عورتیں جیلوں میں بند کئے گئے۔ ہری شنکر اور کمال بھی جیل گئے۔ کچھ عرصے بعد ان کو دوسرے طالب علموں کے ساتھ رہا کر دیا گیا۔

۷ اگست ۱۹۴۲ء کو کوئٹ انڈیا ریزولوشن پاس کیا گیا۔ ملک میں بغاوت شروع ہوئی احمد نگر فورٹ پھر آباد ہوا۔ یونیورسٹی کے طالب علم اس میں پیش پیش تھے۔ دس ہزار ہندوستانی پولیس کی فائرنگ سے مارے گئے۔

اب بنگال میں قیامت کا سامنا تھا۔ چونتیس لاکھ انسان اب تک فاقے سے مر چکے تھے۔

چونتیس لاکھ — انسان —

چونتیس لاکھ آمنہ اور ابوالمنصور —

کمال دوسری صبح جلدی جلدی ناشتہ کرنے کے بعد جیت پور روڈ سے نکلا اور پرمودا کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

۴۸

پارک سرکس میں پرمودا کے گھر پر بہت سے لڑکوں اور لڑکیوں کا مجمع تھا۔ کلکتہ یونیورسٹی کے طالب علم۔ اپٹا کے کارکن۔ پارٹی کے افراد۔ لکھنؤ والے بھی سب پہنچ چکے تھے۔ پرمودا کلکتے کے اسٹوڈنٹ لیڈر تھے۔ اس وقت ان کے مکان کے بڑے ہال میں بڑی سخت گہما گہمی نظر آ رہی تھی۔ ریلیف ورک کا منصوبہ بنایا جا رہا تھا۔ چندہ اکٹھا کرنے کے لئے جو پروگرام اسٹیج کیا جانے والا تھا۔ اس کی ریہرسل کی جا رہی تھی۔ کونے میں ہارمونیم رکھا تھا۔ ایک طرف دو لڑکیاں ٹیگور کی چترانگدا کے گانوں کی مشق کر رہی تھیں۔ ہال کے سرے پر شیشوں والا برآمدہ تھا۔ اس میں پرمودا کی بہن کا اسٹوڈیو تھا جو شانتی نکیتن کی آرٹسٹ تھیں۔ اسٹوڈیو میں ایک لڑکا سفید شال اوڑھے ایزل کے سامنے کھڑا ایک پورٹریٹ پر آخری

پینٹ لگا رہا تھا۔ ڈرامے کے بعد یہ تصویر بھی ریلیف فنڈ کے لیے نیلام کی جانے والی تھی۔
پر موودا کی بہن اور رونا ویدی ایک اور کینوس پر جھکی ہوئی تھیں۔
سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔
برش صاف کر کے ایک طرف کو رکھنے کے بعد ماتھے پر سے بال ہٹاتا ہوا یہ مصور لڑکا ہال کے دروازے میں آ کھڑا ہوا اور ہال کے منظر پر نگاہ ڈالی۔ ان سب کو اس تندہی سے کام میں جُٹے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک اُداس سی مسکراہٹ بکھر گئی۔
"دادا ادھر آؤ —" ایک لڑکی نے اسے آواز دی "دیکھو اب میرے قدم ٹھیک ہیں نا —"
"تمھارے قدم تو کبھی ٹھیک نہیں ہوں گے —" اُس نے لڑکی کی طرف جاتے ہوئے کہا "تم بنگالیوں کی رومان پرستی نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ تم خالص کلاسیکل ڈانس کی آخر کیوں اہل نہیں۔"
"دادا یہ تو خالص بھارت ناٹیم کر رہی ہوں میں۔"
وہ اسے اسی اداسی سے کھڑا دیکھتا رہا۔
یہ لڑکا بھی یو۔پی کا رئیس زادہ تھا۔ فی الحال وشوابھارتی آیا ہوا تھا۔ ایم اے اور لا الہ آباد سے کر چکا تھا۔ ابھی اس کے دماغ میں واضح طور پر نہیں آیا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیئے بہت سے پروگرام تھے۔ جرنلزم۔ سیاست۔ کتابیں لکھا کروں گا نہایت عالمانہ۔ ایسی ایسی تھیوریز پیش کروں گا کہ دُنیا عش عش کر اٹھے گی۔ آرٹ کا نقّاد بنوں گا۔ سیاسی طور پر آپ بہت سخت اشتراکی واقع ہوئے تھے۔ باپ کا کہنا تھا (اور سارے باپوں کی طرح) کہ آئی۔سی۔ایس میں بیٹھو۔ وہ خود حکومت برطانیہ کے نائٹ تھے اور بڑی چوٹی کے بیرسٹر۔ بچپن میں اسے نینی تال پڑھنے کے لئے بھیجا گیا۔ پھر یونیورسٹی کی تعلیم ختم کرنے اور ادھر اُدھر مارے مارے پھرنے کے بعد اس کے جی میں آئی کہ شانتی نکیتن چلو۔ اُس نے باپ سے تجویزا۔ بابا — ہمیں وشوابھارتی بھیج دیجئے۔ باپ نے اسے گھور کر دیکھا۔ کیوں میاں صاحبزادے — آرٹسٹ بنو گے۔ دماغ تو نہیں خراب ہو گیا — یہ دُنیا کے سارے باپ ہی

بات کہتے مگر چونکہ اکلوتا لڑکا تھا۔ اس لئے باپ نے ضد پوری کر دی۔ اب وہ دو سال سے بولپور میں تھا اور وشوابھارتی کے دوسرے طالب علموں کے ہمراہ ریلیف کے کام کے سلسلے میں کلکتہ آیا ہوا تھا۔

"یہ لکھنؤ سے لوگ آئے ہیں۔ ان سے نہیں ملے۔" کسی نے قریب سے گزرتے ہوئے اس سے کہا۔ وہ ہال عبور کر کے اس کونے کی طرف چلا۔ جدھر کمال دوسرے لڑکوں کے ساتھ بیٹھا زور زور سے "پالکی چلے پالکی چلے ہو ہو —" گا رہا تھا۔ یہ بھی ڈرامے کی ریہرسل کا ایک حصہ تھا۔ دوسرا لڑکا اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا اور گانا ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

چاروں طرف زور زور سے بنگالی بولی جا رہی تھی۔

کمال نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا: "نمشکار —"

کمال نے گانا ختم کرنے کے بعد ہارمونیم بند کرتے ہوئے اس سے کہا۔

"آداب عرض — !" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

کمال کی جان میں جان آئی۔ بنگالی بولتے بولتے اس کی حالت تباہ ہو چکی تھی۔

"گوتم نیلمبر —" لڑکے نے اپنا تعارف کرایا۔

"کمال رضا —" اسے اطلاع ملی۔ دونوں نے ہاتھ ملایا۔

دونوں کا ایک ہی حلیہ تھا۔ تنگ پائجامہ۔ کرتا۔ نہرو واسکٹ۔ اور اوپر سے کشمیری شال۔ یہ حلیہ اس گروہ کے تقریباً سبھی نوجوانوں کا تھا۔

"میاں کہاں آ پھنسے۔ ان بنگالیوں نے تو بنگالی بول بول کر ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ آؤ باہر چلیں۔"

دونوں نے باہر ایک ریسٹوران میں جا کر قہوہ پیا۔ اور پھر واپس آ گئے۔

"آؤ تم کو اپنی تصویریں دکھاؤں۔" گوتم نے اروناویدی کے نگار خانے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"یار تم ہری شنکر سے نہیں ملے۔" کمال نے کہا۔

"ہری شنکر کون ہے —" گوتم نے بے خیالی سے پوچھا اور بڑے آرٹسٹوں والے انداز میں سگریٹ ہونٹ میں دبا کر تصویر مکمل کرتا رہا۔

"ہری شنکر — یار ہے میرا۔ بڑا باغ و بہار آدمی ہے۔"

"کہاں ہے۔ بلاؤ —" گوتم نے نوابوں کی طرح کہا۔

"گھاس کھا گئے ہو۔ وہ یہاں نہیں ہے۔ لکھنؤ میں ہے۔ بیمار پڑا ہے بے چارہ۔"

"تم سب لکھنؤ میں کیوں رہتے ہو۔" گوتم نے برش ایک طرف رکھ کر مڑتے ہوئے پوچھا۔

"اور پھر کہاں رہیں —"

"ہاں۔ یہ بھی ٹھیک کہتے ہو۔"

"تم نے اس کی ناک غلط بنائی ہے۔"

"ہونٹ بنانے بہت مشکل ہوتے ہیں۔"

"ماشاءاللہ کیا جواب دیا ہے۔ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔"

"سگریٹ لو۔"

"کیا تم آرٹسٹ ہو۔"

"او، کیا تمہیں گراس کٹ نظر آتا ہوں۔"

"ارے رے۔ تمہارا ہی ذکر چچا جی نے کیا ہے خط میں۔"

"چچا جی — وہ کون بزرگ ہیں۔"

"ہماری لاج کے میاں۔"

"تمہاری لاج کون ہے۔"

"ہمارے ۔ چچا جی تو تم کو جانتے ہیں۔"

"مجھ کو بہت سے لوگ جانتے ہیں۔"

"مغالطہ فائیڈ بھی ہو —؟!"

"ہاں — تم نہیں ہو —؟"

"ہوں تو سہی —"

"ٹھیک ہے —" گوتم تصویر میں لگا رہا۔

"اگر رہ لیے شانتی نکیتن میں چار پانچ سال تو شاید لوٹ پوٹ کر آرٹسٹ بن جاؤ۔ فی الحال تو اس کی کوئی اُمید ہے نہیں۔" کمال نے تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے اظہارِ خیال کیا۔

"خالی آرٹسٹ — ارے میرا ارادہ تو ہے کہ مدراس جا کر رام گوپال سے بھارت ناٹیم بھی سیکھوں گا —" گوتم نے الٹی میٹم دیا۔

"یہ ارادہ تو ایک زمانے میں اس خاکسار کا بھی تھا مگر جب میں نے اس کا اظہار کیا تو میری بہنیں ہنستے ہنستے لوٹ گئیں اور اُنھوں نے بے انتہا میری ہُوٹنگ کی۔ اصل میں لڑکیاں بے حد بوگس ہوتی ہیں — آرٹ کو سمجھنے کی ان میں صلاحیت نہیں۔"

"تمھاری بہنیں بھی ہیں —"

"ہاں — تمھاری نہیں ہیں —"

"نہ —"

"یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ بہنیں ہوں تو زندگی میں بڑے سکون اور نرمی کا احساس رہتا ہے —"

"ہُوں — پھر کیا ہوا —"

"کیا — ہا"

"تم کہہ رہے تھے کہ —"

"یار گوتم تم کو معلوم ہے میں بدھسٹ بھی ہو گیا تھا ایک زمانے میں —"

"واقعی —"

"چند سال گزرے میں سارناتھ گیا تو وہاں مجھے بڑا سخت سکون ملا تو میں نے سوچا کہ یار یہ بدھ ازم میں کچھ نہ کچھ ہو گا ضرور —"

"ہوں —"

"تم پارٹی میں ہو۔"

"پارٹی؟ — نہیں۔ ابھی میں اس قابل نہیں بنا۔ اس کے لئے بڑا پتّہ مارنے کی ضرورت ہے۔"

"ہاں ٹھیک کہتے ہو — ویسے تم کوئی ایسے ریولوشنری دکھلائی بھی نہیں پڑتے۔" کمال نے کہا

گوتم نے غصّے سے اسے دیکھا

"معلوم ہے مہاتما گاندھی نے تمھارے گرودیو سے کیا کہا تھا۔ کہ گھر میں آگ لگی ہے اور آپ بیٹھے چڑیوں کا گانا سنتے ہیں۔" کمال نے کہا۔

گوتم نے برش جھٹک کر رکھا۔ "بے وقوفی کی باتیں مت کرو جی۔ کیا تمھارے ہری شنکر میں بھی تمھارا ہی جتنا بچپنا ہے —؟"

"تم بھیّا صاحب سے بھی ملنا —" کمال نے اس کی بات کی سُنی اَن سُنی کر کے کہا۔

"وہ کون ہیں —"

"میرے چچا زاد بھائی۔"

"وہ بھی بہت قابل ہیں؟"

"ہاں۔"

"لکھنؤ ہی میں رہتے ہیں؟"

"ہاں مگر آج کل محاذ پر گئے ہوئے ہیں۔"

"لکھنؤ میں بڑا بڑا اہلِ کمال پڑا ہوا ہے۔ اس کا مطلب ہے۔"

"اور کیا۔"

"چلو فرتو چل کر چائے پئیں —" گوتم نے اٹھ کر تصویر پر کپڑا ڈالتے ہوئے کہا۔

"فرتو — تم سخت بورژوا معلوم ہوتے ہو —"

"بکو مت۔"

"اچھا ایک بات بتاؤ۔ میں ہر بات کے متعلق بہت واضح تصوّرات رکھنے کا قائل ہوں۔" کمال نے کہا۔

"شوٹ۔"

"کلاس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے —— تم پرولتاریہ کے مستقبل میں یقین رکھتے ہو ——؟"

"ہاں۔"

"ہاتھ ملاؤ۔" اُنھوں نے ہاتھ ملایا۔

"تم سمجھتے ہو فیوڈل سماج اپنی موت آپ مرجائے گا؟"

"ہاں۔"

اُنھوں نے دوبارہ ہاتھ ملایا۔

"تم کو وشواس ہے کہ تم کو فیوڈل سماج سے سچی دلی نفرت ہے اور تم اس کی بیخ کنی ہی کرکے دم لوگے۔"

"مجھے تو خیر وشواس ہے لیکن تم تو خود فیوڈل سماج سے تعلق رکھتے ہو۔"

"تم کو کیسے معلوم —" کمال نے گھبرا کر پوچھا۔ گویا اُس کی کوئی بہت بڑی چوری پکڑی گئی۔

"مجھے اس طرح معلوم ہوا کہ ابھی ابھی ہال میں کوئی ذکر کر رہا تھا کہ تمہاری مٹیا برج والوں سے رشتے داری ہے اور تم چیت پور روڈ والے نواب صاحب ۔"

"ہاں — ہاں — خیر۔" کمال شرم سے پانی پانی ہو گیا —" وہ تو جو ہوا سو ہوا — تاریخ پر میرا کیا بس ہے — مگر اب میں پوری کوشش میں لگا ہوں کہ خود کو مکمل طور پر ڈی کلاسس کر لوں۔"

"تمہارا ہری شنکر بھی فیوڈل ہے؟"

"ہے تو سہی۔ مگر وہ بے چارہ بھی کیا کر سکتا ہے۔"

"خوب۔" گوتم مسکرایا۔ "میں بڑا سخت مڈل کلاس ہوں۔" اس نے اطلاع دی۔

"رنج نہ کرو۔" کمال نے اسے دلاسا دیا۔ "ہم لوگ تو دراصل اس نئے سماج سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو اب جنم لے رہا ہے — جنتا کا سماج —"

اس طرح کی خالص طالب علمانہ گفتگو کے بعد دونوں باہر آئے۔ کمال پر گوتم کا رعب پڑ گیا۔ گوتم میں بڑی گہرائی تھی اور وہ بہت زیادہ سمجھ دار تھا۔ بہرحال سینئر لڑکا تھا اور کمال ابھی متاثر ہونے والی اسٹیج سے نہیں نکلا تھا۔

لکھنؤ واپس پہنچ کر کمال نے چمپا جی کو جو خط لکھا اس میں گوتم نیلمبر کی تعریفوں کے دریا بہا دیئے۔

اسی سال گرمیوں میں گوتم لکھنؤ آیا۔ اپنی جائے قیام سے اس نے 'گلفشاں' فون کیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ سب لوگ ریڈیو اسٹیشن گئے ہوئے ہیں۔ ریڈیو اسٹیشن سے اطلاع ملی کہ ابھی ابھی سب لوگ کملا چپال کے یہاں فیض آباد روڈ گئے ہیں۔ فیض آباد روڈ سے پتہ چلا کہ وہ سب تو سنگھاڑے والی کوٹھی چلے گئے۔

سنگھاڑے والی کوٹھی — کیا بے تکا نام تھا — اب مکانوں کے ایسے نام ہونے لگے — جیسے خربوزے والی حویلی اور تربوز والا قلعہ۔ یا گاجر منزل۔ اور مُولی ہاؤس — اسے بے حد ہنسی آئی۔ شاید یہ لوگ سنگھاڑے بہت کھاتے ہوں گے یا کیا ہوتا ہوگا۔

اس نے سنگھاڑے والی کوٹھی فون کیا تو وہاں چمپا نے رسیور اٹھایا۔

"ہلو۔" چمپا نے کہا

"ہلو — آداب عرض۔ دیکھئے میرا نام گوتم ہے — گوتم نیلمبر — اگر آپ لوگ ابھی وہاں سے کہیں اور تشریف نہ لے جاتے ہوں تو میں حاضر ہوں۔"

"آپ ضرور تشریف لائیے۔" چمپا نے جواب دیا۔ "اور اگر آپ ہوشلسٹ ہیں

تو ذرا تیار ہو کر آیئے گا۔ آج ہم سب تلے بیٹھے ہیں کہ کوئی سوشلسٹ ملے تو اسے کچا چبا جائیں۔"

گوتم نے اس روز کا اخبار ابھی تک نہیں پڑھا تھا۔ مگر اُس نے فوراً جواب دیا "بہت خوب۔ حاضر ہوتا ہوں — آپ لوگ بھی تیار رہئے گا۔"

سنگھاڑے والی کوٹھی میں جب وہ سب لوگ جا کر ندی کے رُخ برآمدے میں بیٹھ گئے تو گوتم نے سوال کیا "طلعت آرا بیگم آپ سب میں سے کون سی خاتون ہیں؟"

"جی میں ہوں۔ فرمایئے۔"

"دیکھئے مس صاحبہ کوئی لکھنے بیٹھ جائے تو اس کا قلم تھوڑا ہی پکڑا جا سکتا ہے مگر یہ کہ آپ اگر ایسا نہ کرتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔"

"آپ نے IPTA کی طرف سے جن تھرڈ بوگس ڈرامے کلکتے میں پروڈیوس کئے ہیں ان کا احوال میں بھی کمال کی زبانی سُن چکی ہوں۔ میں آپ کو مارجن دیتی ہوں کہ پندرہ منٹ تک ہم سب پر اپنا رعب ڈالیے۔ اتنا ہی وقفہ ہم آپ کو مرعوب کرنے میں صرف کریں گے۔ اس کے بعد نارمل ہو جایئے کہ نارمل رہنا ہی بہت مستحسن ہے۔ اچھا اب ڈالیے رعب — شروع کیجئے۔ سُنا ہے آپ وشوا بھارتی کو نواز رہے ہیں — یہاں بھی ایک سے ایک بڑا آرٹسٹ پڑا ہے۔ ہر قسم کا۔ اور یہ سب باری باری فرداً فرداً اور مجموعی طور پر آپ کو امپریس کرنا چاہیں گے — پہلے اپنے پولیٹیکل خیالات سے مطلع کیجئے — ری ایکشنری تو نہیں ہیں؟ یا دوا سبھائی۔

"آپ چیلے بناتے ہیں؟" نرملا نے پوچھا

"جی نہیں۔ کبھی کبھی بنا لیتا ہوں۔"

"گوتم — آپ کا تخلص ہے؟" طلعت نے سوال کیا۔

"جی نہیں۔ ماں باپ نے یہی نام رکھا تھا۔ طلعت بیگم — میں پھر کہوں گا — آپ

ابھی اور پڑھئے۔ اس کے بعد لکھنا شروع کیجئے گا۔ آپ کے علم میں افسوسناک کمی ہے۔"

"بھیا صاحب نہیں پہنچے۔" کمال نے کہا۔ "اُنھوں نے فون کیا تھا کہ چار بجے پہنچیں گے۔"

"بھیا صاحب، اس وقت۔" طلعت نے گھڑی دیکھ کر تندہی سے اعلان کیا۔ "رائیڈنگ کے لئے گئے ہوئے تھے۔ اب سوئمنگ سے واپس آتے ہوں گے۔"

مجمع اپنی جگہ پر ذرا نادم ہوا۔

"خدا کی پناہ — یہ کون صاحب ہیں — کوئی فلم اسٹار ہیں — اشوک کمار وغیرہ —؟" گوتم نے سوال کیا۔

"بھیا صاحب — میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ ان سے ضرور ملنا۔" کمال بولا

"تعلقداران اودھ کے متعلق میری معلومات بہت محدود ہیں۔ کیا آپ سب یہی رائیڈنگ اور سوئمنگ وغیرہ کرتے ہیں — میں دراصل سارے مڈل کلاس لوگوں کی طرح طبقۂ امرا پر عاشق ہوں۔ جنگ سے پہلے ولایت گیا تھا، اپنے بابا کے ہمراہ۔ تو برٹش لارڈوں کو دیکھنے کی تمنا میں گھوما گھوما پھرتا تھا۔ جہاں دُور سے کوئی لارڈ نظر آیا اور میں لپکا اس کی طرف۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہاں کے انڈرٹیکر بھی وہی لارڈوں والا لباس پہنتے ہیں۔"

"ہم لوگ بھی انڈرٹیکرز ہیں۔" کمال نے کہا۔

"اور ماضی کی قبروں کے مجاور۔" ہری شنکر نے اضافہ کیا۔

"لیکن تمھیں ہم کو پسند کرنا پڑے گا۔" کمال نے دوبارہ کہا۔ "کیونکہ ہم لوگ اپنی دلکشی کے سہارے ہی پر زندہ ہیں۔"

"میں تم کو ضرور پسند کروں گا۔ میرے دل میں بڑی وسعت ہے۔" اس نے بڑی تمکنت سے جواب دیا۔

۴۹

چمپا اب گروہ میں شامل تھی۔ اُس نے گروہ کے قوانین سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ گروہ بہرحال ہمدرد تھا۔ کیونکہ خود تنہا تھا۔ ہم کتنے قابلِ رحم طریقے سے سہارے کے متلاشی رہتے ہیں گروہ محض ایک اور کردار تھا جس طرح ماحول ایک کردار تھا۔ تصورات کی مجسم شکل۔ انسانی رشتے بڑے نازک بڑی گنجلک بنیادوں پر قائم ہیں۔ برابر یہ رشتے ٹوٹتے بھی رہتے ہیں اسی لئے میر انیس نے کہا تھا۔ خیالِ خاطرِ احباب چاہئے ہر دم۔ ہر طرف آبگینے تھے۔ جو شیشے کے گھروں میں رکھے تھے۔ یہ ساری کارگہ شیشہ گری تھی۔ کمال نے اس سے کہا۔ چمپا باجی چیزوں کے ذہنی باورچی خانے میں اپنی اٹھک بیٹھک رکھئے۔ آپ ہمارا گھر بکھائیے۔ ہم آپ کا گھر رکھاتے رہیں گے۔ ہم کبھی آپ کو اکیلا نہ چھوڑیں گے۔ اپنے ذہن کو ذرا سا ڈسپلن کیجئے۔ یہی اصل چیز ہے۔ مصیبت ساری یہ ہے کہ آپ رومینٹسسٹ ہیں۔

مگر ڈسپلن کی زندگی میں گنجائش کہاں تھی۔ یہاں ہر طرف اس قدر انتشار تھا کمال نے کہا۔ "اگر آپ آرٹسٹ ہوتیں تو ٹھیک تھا۔ آپ اس افراتفری کو اظہار میں ڈھال لیتیں۔ مگر آپ نہ لکھتی ہیں نہ کسی اور طرح سے اپنا اظہار کرتی ہیں۔ اسی لئے ڈسپلن آپ کے لئے بہت ضروری ہے۔" "یہ لیکھک لوگ بڑے متوازن ہوتے ہیں؟" چمپا نے پوچھا۔

"متوازن نہ ہوں مگر تخلیق کی Process کے دوران میں وہ اپنا آہنگ تلاش کر لیتے ہیں۔ چمپا باجی آپ تصویریں ہی بنایا کیجئے۔"

"تم نے تو مجھے بالکل وکٹورین رومان پرست سمجھ لیا ہے۔ نہیں کمال ٹھیک ہے میں بالکل خیریت سے ہوں۔ میں تم سب کے ساتھ رہوں گی۔ میں تہمینہ کے ساتھ رہوں گی۔"

"مگر ساتھ ہی یہ بھی طے کر لیجئے کہ جذبات اور ذہن کا آپس میں کیا ایکوئیلبریم ہونا چاہئے اگر یہ طے کر لیا تو بس سمجھئے کہ بڑا پا لیا ہے۔"

"پھر وہی نظریے — !"

"اچھا تو آپ تجربے کرنا چاہتی ہیں۔ چمپا باجی از خود تجربے نہ کیجئے گا۔ دنیا آپ کو خود ہی اتنے سبق دے گی کہ ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔"

اسی طرح لان پر بیٹھ کر سڑک پہ ٹہلتے ہوئے یہ لوگ لمبی لمبی بحثیں کرتے۔ چمپا اس یونیورسٹی ماحول میں بے حد خوش تھی۔ کیلاش ہوسٹل جہاں وہ ایم۔ اے کے لئے رہ رہی تھی۔ ایک الگ مخصوص دنیا تھی۔ یہاں ایک بہت بڑے احاطے میں جہاں یوکلپٹس اور مولسری اور سیمل کے پرُ وقار درخت کھڑے تھے ایک پرانی وضع کی پیلے رنگ کی وسیع کوٹھی تھی جس میں سبز و انجو رہتی تھیں۔ اس کے قریب ہی ایک جدید طرز کی سیمنٹ کی عظیم الشان دو منزلہ عمارت تھی۔ اس میں لڑکیاں رہتی تھیں، یہ جگہ چاند باغ سے بہت مختلف تھی۔ یہاں لڑکیاں جو زیادہ تر پوسٹ گریجویٹ طالب علم تھیں۔ بہت ہوشمند اور سینیر ہونے کے احساس کے ساتھ رہتی تھیں۔ چاند باغ میں سیاست کا دخل نہ تھا۔ یہ جگہ دھارے میں شامل تھی۔ چاند باغ میں بھگو دان اور اقبسن کا راج تھا۔ یہاں ہر طرف مہاتما گاندھی اور نہرو اور قائد اعظم جناح اور کارل مارکس کا چرچا تھا۔ امریکہ کے اعلیٰ طبقے کی لڑکیوں کے مخصوص برائن مار اور اسمتھ کالج کی وضع پہ چاند باغ کے ماحول کی تشکیل کی گئی تھی۔ وہاں سے نکل کر لڑکیاں جب یونیورسٹی میں آتیں تو کیلاش میں رہتے ہوئے خود کو ملک کے فضاؤں سے قریب تر محسوس کرتیں۔

اب چمپا اور تہمینہ اور نرملا اور طلعت عموماً اکٹھی وقت گزارتیں۔ ایک روز تہمینہ نے چمپا سے کہا "سنو۔ آؤ Adult سطح پر اس مسئلے کو دیکھیں۔ بھیا صاحب دسمبر میں مدراس سے آرہے ہیں۔ اس سال تم ایم اے کر لوگی۔ روحانی طور پہ اس قدر رحم پسند اور دلاور بننے کا ارادہ ترک کر کے ان سے شادی کر لو۔"

"بکو مت۔"

"بکنے کا اس میں کیا سوال ہے۔"

"تم خود ہی نہ کر لو ان سے شادی۔"

"میں تمھاری پرچھائیں بن کر زندہ نہیں رہنا چاہتی۔"

"بکواس۔" تہمینہ نے جواب دیا۔ پھر کچھ دیر بعد بولی ——

"علاوہ ازیں بھیا صاحب ہی زندگی کا نصب العین نہیں ہونا چاہئیں۔ مرد اس لائق ہی نہیں کہ ان کو اتنا آسمان پر چڑھایا جائے۔"

"ظاہر ہے۔"

"زندگی کا نصب العین پارٹی ہے۔ کہو ہاں۔"

"ہاں —" چمپا نے ذرا توقف کے ساتھ جواب دیا۔

طلعت دوسرے کمرے میں بیٹھی تھی۔ یہ مکالمہ اس کے کانوں میں پڑا تو وہ بہت خوش ہوئی "خدا کا شکر ہے۔ ان دونوں کی سمجھ میں بات آگئی" اس نے نرملا سے فون پر کہا۔ نرملا نے بھی خدا کا شکر ادا کیا۔

لیکن بھیا صاحب دسمبر میں لکھنؤ آئے اور چمپا کے سلوے سنئے نظریے پھر ہوا ہو گئے۔ وہ دن بھر خوش خوش پھرتی رہی۔

"وہ گلفشاں والے گلفام آئے ہوئے ہیں آج کل۔" ہوسٹل میں لڑکیوں نے ایک دوسرے سے کہا۔

اسی اثنا میں گوتم نیلمبر بھی آن پہنچا۔ اس کو زراعت کے محکمے میں ایک بہت عمدہ ملازمت مل گئی (اور لوگوں نے کہا۔ اپنے باپ کی بڑی حیثیت کی وجہ سے دیکھو کیسے ترنت ہی اسے نوکری مل گئی۔ بڑا کمیونسٹ بنا پھرتا تھا)

یہ زمانہ جوان لوگوں نے اکٹھا گزارا۔ ان سب کی زندگیوں کا بہترین دور تھا۔ ایسا دور جو ایک بار چلا جائے تو پھر کبھی واپس نہیں آتا۔

۵۰

شاید یہ بڑی پُرسکون جگہ ہے۔ جھاڑیوں پر کوئلیں بیٹھی ہیں۔ آموں کے باغ ہیں۔ جن کے درمیان سے ایک مالین کرتا ل بجاتی جا رہی ہے۔ بڑے شائستہ ریٹائرڈ کلکٹر دل

اوسط درجے کے زمینداروں اور بیرسٹروں کی کوٹھیاں ہیں۔ گھاٹ پر ڈونگیاں کھڑی رہتی ہیں، سایہ دار راستوں پر سے لمبے لمبے زرد پھول درختوں سے بھٹکتے ہیں۔ باریک نازک ٹہنیوں والے درختوں پر بڑے رنگ پھول پتے کھلے ہیں۔ جن کو دیکھ کر چینی پینٹنگز یاد آتی ہیں، اتوار کی صبح کو لڑکیاں رنگی چھتریاں سنبھالے ایک دوسرے کے گھروں پر جاتی ہیں اور گھاس پر بیٹھ کر نٹنگ کرتی ہیں اور شدید اینگلو انڈین گفتگو ان لوگوں کا دستور ہے۔ زندگی میں ہر طرف سلیقہ ہی سلیقہ ہے اور نفاست۔ برآمدے کے سبز جنگلے پر پھیلی ہوئی بیل۔ ٹھنڈے فرش پر سینل پاٹیاں۔ ایک دیوار کے سہارے غلاف میں ملفوف تان پورہ رکھا ہے۔ کمروں کے اونچے اونچے دہرے دروازے ہیں جن پر جھلملیاں ہیں۔ چوڑی سیڑھیاں اونچی کرسی - بڑے سے گھاس کے سمندر میں یہ مکان ڈوبے ہوئے ہیں چھتیں ڈاٹ کی ہیں۔ چھت کے اوپر چھوٹے چھوٹے اطالوی وضع کے ستونوں کے جنگلے ہیں۔ ایسے مکان سارے صوبے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کس قدر استحکام ان کی بنیادوں میں ہوگا۔ برآمدوں کی سیڑھیوں پر کسی زمانے میں پنکھا قلی اونگھتے ہوں گے۔ بہرائچ میں جہاں میں پیدا ہوا میرا مکان بھی عین مین ایسا ہی تھا۔ میں مکانوں کی کتھا لے کر بیٹھ گیا۔ شانتا میں تفصیلات سے متاثر ہونے اور ان پر دھیان دینے کی عادت سے عاجز آچکا ہوں مگر بتاؤ تو بھلا لوگوں نے مکان بنا رکھے ہیں اور ذرا ان کے نام تو سنو۔

"نام بھی عجیب چیز ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر چمپا بیگم۔ اچھا نام ہے، ہے نا۔ کہو شانتا۔ میری رائے سے اتفاق کرو۔ دیکھو تم اتنی دور ہو۔ تو میرا جی چاہتا ہے کہ ہر چیز میری آنکھوں سے دیکھو۔ میرے ساتھ ساتھ رہو۔ جب میں نئے لوگوں سے ملتا ہوں تو سوچتا ہوں۔ شانتا ہوتی تو فلاں کے لئے یہ کہتی فلاں کو پسند کرتی فلاں کا مذاق اڑاتی شانتا تم نے مجھے ڈانٹا بھی نہیں بہت دنوں سے۔ اب کیا میں تمہارے جذبہ مادری کو اپیل نہیں کرتا۔ بقول تمہارے بڑا ہو گیا ہوں — ؟ شانتا کاش تم یہاں ہوتیں اور ان سب سے ملتیں۔

بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ میں یہاں ایک قسم کے ان ایشیل برد کھوے کے لئے

بلایا گیا تھا۔ نرمل رانی جو ہیں۔ لے فرما رہی ہیں بجائے اس کے کہ روایتی لڑکیوں کی طرح کچھ شرماتیں۔ ہارمونیم پر ان سے گانا سنوایا جاتا۔ انھوں نے مطلق شرما کر نہیں دیا نہ شاید انھیں علم ہے کہ خاندان والے ان سے میرا رشتہ طے کرنا چاہتے ہیں۔ بہرحال۔ انھوں نے مجھ میں کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ ان کو باتوں ہی سے فرصت نہیں۔ ان کے بہت زبردست پروگرام ہیں۔ ڈاکٹریٹ کریں گی۔ نرملا اور طلعت دونوں انتہائی تیز ذہین لڑکیاں ہیں۔ خدا محفوظ رکھے۔ ہر وقت ٹراتی رہتی ہیں۔'

"لکھ لی تقریر ۔۔۔"

نرملا نے برآمدے کے جنگلے کے نیچے سے اُچک کر پوچھا۔

"لکھ رہا ہوں۔"

"دکھلائیے۔"

"اوہ ۔۔۔ بھئی اصل میں تقریر نہیں لکھی۔ ایک ضروری خط لکھنا تھا وہ شروع کر دیا۔"

"یہ خط و کتابت کا کون وقت ہے۔ میں کہتی ہوں ۔۔۔"

نہ وہ چین سے نکلے نہ جاپان سے نکلے ۔۔۔
نہ ایران سے نکلے نہ انگلستان سے نکلے ۔۔۔
محمدؐ مصطفےٰ نکلے تو عربستان سے نکلے
محمدؐ مصطفےٰ ۔۔۔'

کمرے میں سب نے مل کر اپنی پسندیدہ قوالی شروع کر رکھی تھی۔

"چلئے چل کر قوالی گائیے ۔۔۔" نرملا نے دوسرا حکم لگایا۔

گویا بنگھاڑے والی کوٹھی میں آ کر "نہ وہ چین سے نکلے" گانا اس قدر اہم اور ضروری چیز تھی۔ گویا اس کی زندگی کا نصب العین ہی صرف یہ تھا کہ وہ نہ چین سے نکلے گا ئے۔ اس نے نرملا کو اداسی سے دیکھا۔ بیوقوف لڑکی کس قدر خوش ہے۔ "چلو نرمل میں آتا ہوں۔ مگر ایک شرط پر۔"

"وہ کیا۔"

"اپنے بھیا صاحب سے ملواؤ ۔"

عین اسی وقت اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ برساتی کی سیڑھیوں پر بھیا صاحب کھڑے تھے۔ گھبرائے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ ان کا خیر مقدم کرنے کے لئے سب برآمدے میں آ گئے۔

"بڑے نروس طبیعت کے آدمی جان پڑتے ہیں۔" گوتم نے آہستہ سے کہا۔

"لڑکیوں سے گھبرا جاتے ہیں بے چارے۔ بڑے شریف آدمی ہیں۔" نرملا نے جواب دیا۔

"شریف آدمی ہیں تو ہم سب کیا لفنگے ہیں — واہ واہ —" ہری شنکر نے احتجاج کیا۔

"ان کے لاشعور میں کوئی پیچیدگی ہے۔" گوتم نے دوسرا اعلان کیا۔ ہری شنکر نے اسے مکا دکھایا۔

بھیا صاحب مجمع پر نظر ڈال کر چمپا کی طرف چلے گئے۔ چمپا نے کرسی چھوڑ دی۔ اور فرش پر بیٹھ کر ان کے لئے چائے بنانے لگیں۔

"یہ مسئلہ ہی ہے۔" گوتم نے دفعتاً بور ہو کر پہلی بار ذرا سنجیدگی سے کہا۔

"بھیا صاحب ناچتے بہت اچھا ہیں۔" نرملا نے موقع کو سنبھالنا چاہا۔ یہ تینوں باقی مجمع سے الگ برآمدے کی سیڑھیوں پر جا بیٹھے تھے۔

"لوک ناچ یا کلاسیکل ۔" گوتم نے دلچسپی سے پوچھا۔

"اولڈ والز کے استاد ہیں۔" نرملا نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"تب میں ان کو معاف کر سکتا ہوں۔" گوتم نے سر ہلا کر کہا: "میں بہت کچھ معاف کر دیتا ہوں۔ میرا بہت بڑا دل ہے۔" اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

اندر کوئی اور بحث چھڑ گئی تھی۔ ہری شنکر زور زور سے غل مچا رہا تھا۔

"اوہ! تم لوگ کس قدر کی ٹر لگاتے ہو —" گوتم نے ایک آنکھ کھول کر

"زندگی مختلف ادوار میں تقسیم ہے۔" کمال نے گوہر افشانی کی۔

"خوب — یعنی۔؟"

"یہ محض باتوں کا دور ہے۔"

"پھر عمل اور تخلیق کا دور کب آئے گا۔؟"

"میاں جب سے دُنیا بنی ہے، اگر پیغمبروں اور فلسفیوں اور سوچنے والوں نے باتیں نہ کی ہوتیں تو آج دُنیا کی لائبریریوں میں گدھے لوٹ رہے ہوتے۔ شکر کرو کہ ہم باتیں کرتے ہیں تم سُنتے ہو۔ ایک سمے ایسا آنے والا ہے جب تمہارے کان ہماری آواز سُننے کو ترس جائیں گے۔" کمال نے کہا۔

"تم وقت کی ہلاکت خیزی کے قائل ہو؟"

"ہاں۔"

سُورج ندی میں ڈوب رہا تھا اور چھتر منزل کے سنہری گنبد کرنوں میں نارنجی نظر آ رہے تھے۔ سامنے لہروں پر سے ایک کشتی سکون سے گزر گئی۔

"تم علامتوں کی رمزیت کے قائل ہو۔" معاً گوتم نے کمال سے پوچھا

"ہاں۔"

"یہ سامنے جو ناؤ جا رہی ہے۔ یہ بڑی رمزیت کی حامل ہے۔" گوتم معمولی کی بات کو بے حد ڈرامائی اور فلسفیانہ رنگ میں ادا کرتا تھا۔ اور اس کا یہ انداز لوگوں کو بہت اچھا لگتا۔ ہری شنکر بھی اس کے پاس آن بیٹھا۔

وہ سیڑھیوں پہ جا کھڑے ہوئے جو ندی میں اُترتی تھیں۔

دریا بہتا ہوا وقت ہے۔ پتھر (Time-less become) کی علامت ہے پتھر وقت کی منجمد شکل ہیں اور کائنات کا خاتمہ جو ہے کی موت کی طرح یقینی ہے، اور اتنا ہی غیر اہم — ویدانت میں لکھا ہے کہ۔"

"یہ ندی ہماری زندگیوں کا سمبل ہے۔" ہری شنکر نے اپنے آپ سے کہا۔

"مجھے دریاؤں سے عشق ہے۔ تم کو دریاؤں سے عشق ہے؟" اس نے مُڑ کر

کمال سے بے حد سنجیدگی کے ساتھ پوچھا۔

"ہاں۔"

"میں ندی کے پانی میں ڈوب کر مروں گا۔" گوتم نے دوسرا اناؤنسمنٹ کیا۔

"گوتم! تم کیا پٹی بورژوا رومان پرست ہوتے جا رہے ہو۔" ان کے نزدیک آکر اکڑوں بیٹھتے ہوئے طلعت نے تشویش سے دریافت کیا۔

"نہیں۔" وہ چونک اٹھا۔ "یہ وقت کا سحر ہے طلعت آرا بیگم —" اس نے انگلی ہوا میں لہرا کر جواب دیا — "تم وقت کی طاقت نہیں جانتیں۔"

پل کے پار بہت دور سے نوبت بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ شام کے سناٹے میں وہ چپ چاپ یہ آواز سنتے رہے۔

"آؤ بھوتوں کو ڈھونڈیں۔"

"آؤ۔"

وہ چاروں لان پر واپس آئے۔

"چمپا بیگم۔ بھیا صاحب۔ اپّی۔" گوتم نے بڑے اخلاق سے جھک کر ان کو مخاطب کیا۔ "آئیے ہم سب چل کر بھوتوں کو ڈھونڈیں۔"

وہ خاموشی سے موٹر کی طرف بڑھے۔ جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ موٹر اب کاٹھ کے پل پر سے گزر رہی تھی۔

"ایک موڑ ہوتا ہے جہاں سے انسان کبھی واپس نہیں آتا۔"

عامر رضا نے اپنے آپ سے کہا۔

کمال نے موٹر روک لی۔ "آئیے ذرا لہروں کو گنیں —" وہ پل کے اونچے جنگلے پر جھک گئے۔

ان کے نیچے ندی کی لہروں پر رنگ برنگے بجروں کا ایک جلوس گزر رہا تھا۔ ان میں جو لوگ بیٹھے تھے۔ انھوں نے عجیب لباس پہن رکھے تھے۔ مندیلیں، جواہرات مالائیں، آبِ رواں کے دوپٹے، ٹکواں پاجامے۔ جواہرات کی چھوٹ سے ندی کا

پانی جگمگا اُٹھا۔

اُن لوگوں نے ہاتھ اٹھا اُٹھا کر اِن لوگوں کو بلانا شروع کیا۔ اُن کی آوازیں اِن کی سمجھ میں نہ آئیں۔ چڑیوں کی چہکار کی طرح سُریلی، مبہم، سارنگی کی چیخ کی مانند تیز، سُریلی، ڈراؤنی، ساحل پر کتے اور گیدڑ چلّا رہے تھے۔ شمشان گھاٹ کی لکڑیاں چڑچڑا رہی تھیں۔ قبروں کے تابوت کے تختے چیرے جا رہے تھے۔

"یہاں سے بھاگو۔۔۔ چلو آگے چلیں۔" چمپا نے کہا۔ اسے لگا جیسے اس کی اپنی آواز گہرے پانیوں میں سے آ رہی ہے

"ان آوازوں سے بھاگ کر کہاں جاؤ گی۔ یہ آخری آوازیں ہیں۔" گوتم نے جواب دیا۔ لکڑیاں چرچرایا کیں۔

"میرا سر چکرا رہا ہے۔ مجھے بھوتوں سے بچاؤ۔" عامر رضا نے پل کے جنگلے پر سر رکھ دیا۔ چمپا اس کے پاس کھڑی تھی

"خوبصورت آدمی۔ اگر میں تمھارے دل کو جان سکتی۔۔۔"

"تم نہیں جانو گی۔ مجھے کوئی نہیں جانے گا۔" عامر رضا نے جواب دیا۔

موٹر پھر ایک دھچکے سے اسٹارٹ ہوئی۔ کمال نے گانا شروع کر دیا تھا۔ چاندنی کی روشنی ایک دم بہت تیز ہو گئی۔ اس میں ان سب کے چہرے دُھلے ہوئے سفید نظر آ رہے تھے۔

"پل۔۔۔ ہر طرف پل بنا رکھے ہیں۔" گوتم غصے سے بڑبڑایا۔

وہ سکندر باغ کی سڑک پر آ گئے۔ قریب سے ایک مغرق ہاتھی جھومتا ہوا گزرا۔ اس پر شاہ زمن غازی الدین حیدر سوار تھے۔ چمپا نے ان کی شکل کو غور سے دیکھا اور وہ بڑے مسخرے نظر آئے۔ "ان سے ہاؤڈیوڈو ہی کر لو کم از کم۔۔۔"

"یہ تو بڑے انگریز مشہور ہیں۔ دیکھو کیا ولایتی بادشاہوں والا جوڑا پہن رکھا ہے۔" کمال نے کہا۔

شاہ زمن ہودے میں سر جھکائے بیٹھے رہے۔ موٹر پھر آگے نکل گئی۔ سب

چپ چاپ تھے۔ گوتم اپنے پائپ کو ٹھونکتا بجاتا رہا۔ اگر مجھے کوئی یہ بتلا دے کہ یہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں تو میں اس کو یہ بڑا انعام دوں۔ چمپا نے پھر اپنے آپ سے کہا۔ گھنٹوں میں نے ان سے دلیلیں چھانٹیں۔ پر مجھے کبھی معلوم نہ ہوا کہ یہ لوگ چاہتے کیا ہیں — گروہ کی سنگت بیکار ہے۔ تنہائی اصل حقیقت ہے۔

کمال نے دفعتاً کار روک لی۔ سامنے لامارٹینیر کالج تھا

"یہاں اُنھوں نے مجھے کیا کیا نہیں پڑھایا —"

کمال اور عامر رضا اور ہری شنکر نے اُنگلیاں اُٹھا کر یک زبان کہا۔ "تم اتنا پڑھتے کیوں ہو — ؟" اُنھوں نے پلٹ کر گوتم سے سوال کیا۔

"یہ عجب بگڑے دل ہیں۔ ان کو سمجھانا بیکار ہے۔" طلعت نے کہا۔ گوتم چپکا رہا۔

وہ سب اُتر کر عمارت کے قریب گئے اور کھڑکیوں میں سے اندر جھانکنے لگے۔ اندر کمرے اندھیرے اور سنسان پڑے تھے۔ صبح کو ان میں پھر پڑھائی ہوگی۔ چھتوں پر بنے ہوئے اطالوی (Bas relief) کے گلابی سبز اور نیلے رنگ نیم تاریکی میں جھلملا رہے تھے۔ دیوار پر زوفنی کا بنایا ہوا جنرل مارٹن کی ہندوستانی بیگم کا پورٹریٹ آویزاں تھا۔ طلعت کھڑکی کے شیشے سے ناک چپکائے کھڑی رہی۔ باقی لوگ سر جھکائے جھیل کی اور چلے گئے

"آؤ — ادھر آؤ — میرے قریب۔" طلعت نے مڑ کر دیکھا۔ جنرل مارٹن کی ہندوستانی بیگم جھیل کے کنارے کھڑی تھی۔ اس نے اشارہ کر کے ان کو پھر بلایا۔

"مجھ سے باتیں کرو۔" اس نے کہا۔ "مجھ سے کوئی باتیں نہیں کرتا۔ دن بھر یہاں اتنا بڑا ہنگامہ رہتا ہے۔ کتابیں پڑھی جاتی ہیں۔ لیکچر ہوتے ہیں۔ میری طرف کوئی پلٹ کر دیکھتا بھی نہیں" — وہ سُوں سُوں کر کے رونے لگی۔ طلعت بڑی گھبرائی کہ اس کو کس طرح چپ کرایا جائے۔ "سنو میری بات۔" طلعت نے سمجھانے کی سعی کی۔ "تم ابدیت کے نقطے پر دھیان دیا کرو — وقت کے مختلف ٹکڑے

دراصل —"

"وعدہ کرو کہ کبھی نہیں پڑھو گے — ؟" کمال اونچی آواز میں گوتم سے کہہ رہا تھا۔

"یہاں سے ہمارا ایک انگریز پروفیسر کتابیں چھوڑ کر ہمالیہ نکل بھاگا تھا۔ وہ اب بھی وہیں زندہ ہے یا اسے کسی شیر نے کھا لیا۔ یا چڑیوں نے اس کی داڑھی میں گھونسلے بنا لیے ہوں گے اور وہ کسی کھوہ میں بیٹھا نارد منی کی موسیقی سنتا ہوگا —" ہری شنکر نے کہا۔

"اوم — اوم — اوم —" یہ آواز اب سارے میں گونج رہی تھی۔ فضائیں اس آواز سے لرز اٹھیں۔ ہری۔ ہری۔ وہ جھیل کو پیچھے چھوڑ کر سرخ بجری والے راستے پر چلنے لگے۔ چمپا نے ہاتھ بڑھا کر پھولوں کی ایک ٹہنی کو چھوا۔ ایک پتہ ٹوٹ کر راستے پر آن گرا۔

"شنو۔ جو پتے کے گرنے میں نہاں ہے۔ ہری ہری۔" چمپا نے دہرایا۔

تہ خانے میں جنرل مارٹن پڑا سوتا ہے۔ اس کے اوپر سے دنیا گزرتی جا رہی ہے۔

لائبریری کی چھت پر سے ایک اکیلا چنڈول اڑتا ہوا نکل گیا۔ کتابوں کے الفاظ جلوس بنا کر چاروں اور پھیل گئے۔ لاطینی۔ فرانسیسی۔ انگریزی۔ بے معنی الفاظ۔ ان کے معانی اگیا بیتال کی مانند منہ چڑا رہے تھے۔ بہت سے الفاظ ٹیرس پر رکھی ہوئی توپ پر چڑھ کر بیٹھ گئے اور اپنی پتلی پتلی کالی کالی ٹانگیں ہلانے لگے۔ توپ نے گرج کر اطلاع دی "میرا نام 'لارڈ کارنوالس' رکھا گیا تھا اور میں سرنگاپٹم میں استعمال کی گئی تھی۔" ٹیرس پر بیٹھے ہوئے پتھر کے شیر اور اوپر چھت کی منڈیر پر استادہ مجسمے زور زور سے قہقہے لگانے لگے۔ پھر طلعت کسی بات پر کھلکھلا کے ہنسی۔ آؤ دلکشا چل کر پدمنی اچاریہ کے یہاں کافی پئیں۔ سوتی ہوئی معطر سڑکوں پر سے گزر کر وہ دلکشا کی طرف بڑھے۔

کچھ دیر بعد کمال جو راستے میں سے کہیں غائب ہو گیا تھا۔ ان سے آن ملا۔ وہ سب دلکشا کے پھاٹک میں داخل ہوئے۔

"تم کہاں چلے گئے تھے —" گوتم نے غصے سے پوچھا۔

میں نے سنا تھا کہ بادشاہ غازی الدین حیدر کے یہاں بسنت کا تہوار بہت دھوم سے

منایا جاتا ہے۔ اسی کی سیر دیکھنے چلا گیا تھا۔ فرح بخش میں عجب منظر تھا۔ ایک طرف ڈاکٹر مکلوڈ بیٹھے فارسی میں گفتگو کر رہے تھے۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک انگریز تپائی پر بیٹھا بیگ پائپ بجا رہا تھا۔ پھر رجب علی فضل علی قوال نے بسنت کا خیال چھیڑا۔ برآمدے میں انگریزی بینڈ بج رہا تھا۔ پھر لندن کے بادشاہ کا جامِ صحت پیا گیا۔ بادشاہ کو انجنیئرنگ کی دھت ہے۔ دنیا بھر کی مشینیں الم غلم جمع کر رکھی ہیں۔ ایک وہ طامس ڈینہم ان کو فلنٹ چڑھاتا رہتا ہے جبکے ایک اسٹیمر گومتی میں چھوڑ دیا۔ رابرٹ ہوم آرٹسٹ ایک صحنچی میں بیٹھا تصویر بنا رہا تھا۔ بشپ ہیبر بھی موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر چھوٹتے ہی تبلیغ کرنے لگے۔ زینے کے سرے پر کھڑے بادشاہ انگریز مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔

پھر وہ سب کو اپنی پکچر گیلری میں لے گئے۔ کھانا میز پر خالص انگریزی فیشن کا پیش کیا گیا۔ دربار میں بڑی انگریزیت ہے بھئی۔ میرا تو دم بولا گیا — پھر جب میں فرح بخش سے واپس آرہا تھا تو راہ میں صاحب ریذیڈنٹ بہادر جوڑی دار پگڑی لٹزیچ گوشوارے پہلے ہندوستانی جامے میں ملبوس جھالردار پالکی میں بیٹھے چلے جاتے تھے۔ میں نے پوچھا۔ کہاں تشریف لئے جاتے ہیں۔ کہا۔ بادشاہ کا جلوس ہے۔ کورونیشن — میں نے پوچھا۔ کون سے بادشاہ کا۔ ایک کے دربار سے تو میں ابھی آرہا ہوں۔ بولے وہ تو مر گئے۔ ان کے بیٹے نصیر الدین حیدر اب تخت پر بیٹھے ہیں۔ عجب تماشا ہے۔ یار ہری شنکر یہ بادشاہ لوگ مر بھی جاتے ہیں" — وہ خاموش ہو گیا۔

اب وہ سب دلکشا کے باغات میں داخل ہو چکے تھے۔ سارے میں پورنماشی کا اُجالا سائیں سائیں کر رہا تھا۔ دور درختوں میں چھپی ایک پیلے رنگ کی کوٹھی تھی۔ جس میں اندھیرا پڑا تھا۔ لان پر ایک مور سو رہا تھا۔ سامنے برگد کے گھنے درخت کے نیچے بہت سے ڈبے اور کاغذ بکھرے پڑے تھے۔ آج یہاں چاند باغ کی بابا لوگ پکنک منانے آئی تھیں۔ مالی نے کہا۔ انھوں نے کوٹھی کے برآمدے میں جا کر پدمنی کو آواز دی۔ وہ اور اس کا میاں باہر آئے۔ ہلو — انھوں نے مسکرا کر کہا۔

"کافی بناؤ۔" کمال نے حکم چلایا۔

کوٹھی کے پیچھے انگریز فوجیوں کی قبریں تھیں جو سن ستاون میں یہاں کھیت رہے۔ وہاں جھاڑیوں میں گھس کر اُنھوں نے پچیسویں مرتبہ ان کے کتبے پڑھے۔ لفٹنٹ ڈیل فورتھ پنجاب رائفلز۔ نوجوان کیپٹن مک ڈانلڈ ۹۳ ہائی لینڈرز لفٹنٹ چارلی ڈیش وُوڈ۔

"ہلو — ہاؤڈو یوڈو —" ان تینوں نے سامنے آ کر بشاشت سے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھائے۔

"ہلو چارلی — لو پائپ پیو۔" گوتم نے ان کو تمباکو پیش کیا۔

پھر نواب قدسیہ محل نے چنبیلی کی جھاڑی میں سے نکل کر کہا: "اگر کوئی مجھے دل کا چین دلا دے تو میں اسے اپنی پوری سلطنت بخش دوں۔"

"میں نے اکثر سوچا کہ تم نے زہر کیوں کھایا تھا۔" چمپا نے نواب قدسیہ محل سے اس طرح بے تکلفی سے بات کی گویا وہ بھی کالج کی ہم جماعت لڑکی تھی۔ لڑکیاں سب ایک دوسرے کو جانتی ہیں۔ چوبیس سالہ اور خوبصورت ملکہ اودھ نزاکت سے اپنے پائنچے سمیٹ کر ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ باقی سب لوگ ٹہلتے ہوئے دلکشا محل کے عظیم الشان کھنڈر کی طرف چلے گئے۔

"ایک روز یہاں ایک فرانسیسی اپنا غبارہ اڑانے لایا تھا۔ بڑی خلقت جمع ہوئی۔ میرے سُسرے شاہِ زمن بھی تماشا دیکھنے آئے تھے۔ دیکھو اتنا مزا آیا کہ یہ فرانسیسی غبارے میں بیٹھ کر اڑا اور شہر سے بارہ میل باہر کبوتروں کی چوکی پر جا اُترا — تم کبھی غبارے میں اڑی ہو — ؟" ملکہ نے چمپا سے پُوچھا۔

"نہیں۔ مگر تم نے زہر کیوں کھایا تھا ؟" چمپا مُصر رہی۔ صاف ظاہر تھا کہ ملکہ بات ٹال رہی تھی۔ وہ اپنی آرسی کو غور سے دیکھا کی۔

"تم تو بڑی سخی مشہور تھیں۔ تم سے زیادہ فیاض اور نیک دل بیگم لکھنؤ کے تخت پر نہیں بیٹھی۔ لاکھوں رُوپے تم نے غریبوں کو بخش دیے۔ تم مجھے بتاؤ — کہ اس سخاوت اور محبت

کے بدلے میں دُنیا نے تم کو کیا دیا ___ اللہ بتاؤ نا بھئی۔"

"جدھر دیکھتا ہوں اودھر تو ہی تُو ہے ___" ملکہ بے دھیانی سے گنگنا رہی تھی "یہ میرے بادشاہ کا مصرع ہے" ۔ اس نے چمپا کو مخاطب کیا "تم کو شعر پسند ہیں؟"

باغ بسنت کے سارے پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا جیسے گندھیوں نے عطر کی ہزاروں شیشیاں انڈیل دی ہوں۔

"برکھا رت تھی اور تم دلکشا محل میں تفریح کے لئے آئیں اور چونکہ بادشاہ تم سے ناراض تھے۔ تم نے لے کے سنکھیا پھانک لی ___ ذرا بتاؤ تو اس کا کیا مطلب ہے ___ کیا مرد اس لائق ہوتے ہیں کہ ان کے لئے انسان جان پر کھیل جائے۔ ان کی تو اِتی سی بھی پرواہ نہیں کرنا چاہیئے ___ اِتی سی بھی ___" چمپا نے انگلی پر انگلی رکھ کے بتایا۔

قدسیہ محل نے کوئی جواب نہ دیا۔

"اے لو ___ وہ راجہ غالب جنگ چلے آتے ہیں۔ آج پورنماشی ہے نا۔ بادشاہ یہاں تفریح کے لئے آتے ہوں گے۔ مجھے دیکھا تو پھر خفا ہو جائیں گے۔ میں اب چل دوں۔"

"کہاں جاتی ہو ___ ؟" چمپا نے گھبرا کر پوچھا۔

"کہیں نہیں۔ ہم سب یہیں موجود ہیں۔ ہم اور تم الگ الگ کہاں ہیں بلکہ اب تم بھی چلی جاؤ۔ تمہارے اس وقت کے ساتھی تم کو بلاتے ہیں ___"

"چمپا باجی ___ چمپا باجی ___" رات کے سناٹے میں کمال کی آواز سنائی دی۔ وہ پتھر سے اٹھ کر دلکشا محل کی طرف چل پڑی۔ کھنڈر کی سب سے اونچی سیڑھی پر کرنل اچاریہ بیٹھے گٹار بجا رہے تھے۔ سب لوگ آس پاس بیٹھے تھے۔

"لڑکیو، چلو کافی تیار ہے۔" پدمنی نے پکار کر کہا۔ اندر کھنڈر کے ایوانوں میں نصیر الدین حیدر کے حرم کی انگریز بیگمات بڑے بڑے جھالر دار سائے پہنے کہنیوں کے بل بیٹھی بڑی محویت سے گٹار سن رہی تھی۔ پھر ان بیگمات نے مل کر پولکا شروع کر دیا۔ وہ سب سیڑھیاں اُتر کر پدمنی کی کوٹھی کی طرف چلے گئے ___

چمپا پھر تنہا رہ گئی ۔

"مادموزیل ۔۔ وو ذیت تری شارماں ۔۔ مادموزیل ۔۔" اس نے مڑ کر دیکھا بادشاہ نصیر الدین حیدر کا فرنچ حجام سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ بڑے شولرس انداز میں اس نے اپنا جھالردار رومال نکال کر پتھر پر بچھایا اور دوزانو جھک کر اس سے کہا "تشریف رکھیے ۔۔"

چمپا ٹکٹکی باندھے سامنے دیکھتی رہی۔

"مادموزیل ۔۔ اپنے حسن پر جی بھر کے نازاں ہو لیجئے ۔۔ جی بھر کر خوش رہیے۔ غم بیکار ہیں۔ آئیے میں آپ کو مُردہ عورتوں کا گیت سناتا ہوں ۔۔ اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ گٹار بجانا شروع کر دیا جو کرنل اچار یہ وہیں بھول گئے تھے

مردہ عورتوں کا بیلڈ ۔۔

مجھے بتاؤ کہ لیڈی فلورا اور خوبصورت ہائی پیشیا

اور تائیس کہاں چھپ گئیں

جون کہاں گئی جسے انگریزوں نے جلایا تھا

مادرِ خداوند ۔۔ ان سب کا کیا ہوا ۔۔ ؟

لیکن ۔۔ پچھلے برسوں کی برف کس نے دیکھی ہے !!

مادموزیل۔ یاد رکھیے۔ خوبصورت عورتیں دو مرتبہ مرتی ہیں ۔۔۔۔۔۔۔ حسن پر نازاں ہو جیے۔ دولت اور شہرت اور عزت پر نازاں ہو جیئے۔ وقت بہت کم ہے۔ بہت جلد یہ سب آپ کے پاس سے چلا جائے گا۔ میری سنئے۔ میں پیرس کا حجام۔ میں نے بادشاہ کی ایسی حجامت بنائی کہ پُورے چوبیس لاکھ روپے سے اپنا گھر بھر لیا۔ سارے لکھنؤ پر میری حکومت تھی۔ بادشاہ میرے تابع تھے ملک کا اصل حاکم میں تھا اور اب کسی کو میرا نام بھی یاد نہیں ۔۔ اس نے اپنے ساٹن کے جوتوں کو اداسی سے دیکھا۔ اس کے خوبصورت چہرے سے پاؤڈر کی خوشبو آ رہی تھی۔

چمپا سیڑھیاں اترنے لگی ۔۔ "یہ گٹار لیتی جائیے۔ موسیو لا کرنل اسے یہیں چھوڑ گئے

اب میں جا کر کیس اور منڈ لاؤں گا — بون نوئی مادموزیل — اُس نے جھک کر بڑے اسٹائل سے کہا۔

پدمنی کے لان پر بیٹھ کر کافی پینے کے بعد وہ موٹر کی طرف بڑھے۔ دُور کھنڈر پر چمگادڑیں اپنے پَر پھیلا رہی تھیں۔ ذرا فاصلے پر گومتی بہہ رہی تھی جس کے نزدیک مرگھٹ تھا میلوں پھیلے ہوئے باغ کے چاروں طرف چھاؤنی کی خوبصورت کوٹھیاں تھیں۔ ذرا دُور پر دلکشا کلب میں ناچ ہو رہا تھا۔ "آؤ چھتر منزل چل کر ناچیں۔" کمال نے تجویز کیا۔

"آج تم لوگ کیا رت جگا منانے نکلے ہو۔" پدمنی نے ہنس کر کہا۔

"ہاں۔ ایسی خوبصورت رات کو سو کر برباد کیا جائے؟" ہری شنکر نے جواب دیا "تم بھی چلو —"

وہ پھاٹک سے نکل کر کالسنز روڈ پر آ گئے۔ کنگ غازی الدین حیدر کی نہر پر سے گزرتے وہ حضرت گنج میں داخل ہوئے۔ پھر قیصر باغ کی طرف مڑ گئے۔

سامنے چاندی والی بارہ دری روشنی سے جھک جھک کر رہی تھی۔

"ارے آج تو یہاں بسنت کا میلہ ہے —" طلعت نے خوش ہو کر کہا۔

"آج معلوم ہوتا ہے سلطان عالم اوپیرا بھی کر رہے ہیں —" نرملا نے کہا "چلیں اندر — ؟"

"کیسے چلیں۔ ہمیں مدعو تو کیا نہیں گیا ہے۔" کمال نے تذبذب کے ساتھ کہا۔

"چلے چلو۔ چوبداروں کے پیچھے چھپ کر کھڑے ہو جائیں گے —" شنکر نے جواب دیا۔

وہ چپکے سے عمارت میں داخل ہو گئے۔ اندر بارہ دری کا چاندی کا فرش جھل جھل کر رہا تھا۔ اسٹیج پر راجہ اندر کے دربار کے ستونوں پر چاندی چڑھی ہوئی تھی۔ ہر طرف آئینے جھلملا رہے تھے — پکھراج پری گا رہی تھی —

رت آئی بسنت بہار کھلے جرد پھول برن کے ہار
ہر کے دوار مالی کا چھورا گرد اڈا رت گیندن کے ہار

وہ سب پنجوں کے بل چلتے اسٹیج کے پیچھے آن کھڑے ہوئے۔ طلعت نے چپکے چپکے ساتھ ساتھ گنگنانا شروع کر دیا —

پھر دھن بدلی — اب پکھراج پری نے اپنی غزل شروع کی۔

ہے جلوہ تن سے در و دیوار بسنتی
پوشاک جو پہنے ہے مرا یار بسنتی
کیا فصلِ بہاری نے شگوفے ہیں کھلائے
معشوق ہیں پھرتے سرِ بازار بسنتی

ہال میں واہ واہ کے ڈونگرے برسنے لگے۔ یہ سب چپکے سے ادھر سے نکل کر ایک دروازے میں آ گئے۔ سامنے علی نقی وزیر اعظم بیٹھے تھے — انھوں نے ان سب کو دیکھا نہیں۔

پکھراج پری گائے جا رہی تھی —

موتی کانوں میں نہیں یار کی زلفوں کے قریں
جھالے بھادوں کے وہ ہیں اور یہ گھٹا ساون کی

اوپیرا ہوتا رہا — یہ لوگ مجمع میں رل مل کر اُدھر اُدھر گھومتے رہے۔ ان سب کو روشندان میں سے جھانکتا دیکھ کر سبز پری نے جو سنگھار کمرے میں کھڑی اسٹیج پر جانے کی تیاری کر رہی تھی گھبرا کر کالے دیو سے کہا — "اُدھر نظر ڈالو — آنے والے وقتوں کے بھوت ہمیں گھور رہے ہیں —"

کالا دیو زور سے ہنسا — "کیا کچھ واہی ہوئی ہو — کیسے بھوت — میں اب پردے کے باہر جاتا ہوں —"

کمال نے ایک چوبدار سے پوچھا "سبز پری کون ہے —"

"ارے اس کو نہیں جانتے خداوند — چمپا بائی۔ شاہِ زمن غازی الدین حیدر کے زمانہ سے ان کی کمان چڑھی ہوئی ہے۔ چالیس کے پیٹے میں آ گئیں مگر وہی آن بان وہی شان ہے۔ کیا قیامت کی چھب ہے کہ صلِ علیٰ — ان سے بہتر سبز پری کا

سوانگ اور کوئی نہیں بھر سکتا۔ اللہ نے گلے میں نور اتار دیا ہے۔ کیا گاتی ہیں۔ کیا آپ لکھنؤ کے باشندے نہیں ۔۔؟" کمال جلدی سے وہاں سے ہٹ گیا۔

اتنے میں کالے دیو کی گرجدار آواز آئی ۔۔

لایا شہزادے کو میں جا کر ہندوستان
تو اپنے معشوق کو سبز پری پہچان
تو اپنے معشوق کو ــــــــــــ

اب شہزادہ گلفام اسٹیج پر آ چکا تھا۔ اس نے لہک کر گایا :

محلوں میں رہتا ہوں عیش ہے میرا کام
شہزادہ ہوں ہند کا نام مرا گلفام

پھر اس نے بڑی دلدوز آواز میں کہا :

صبح ہوتی ہے مری جان کوئی آن کے بیچ
بھیرویں مجھ کو سنا چل کے پرستان کے بیچ

وہ لوگ بارہ دری سے باہر آ گئے ۔ اندر سے شاہزادے کی آواز آ رہی تھی۔

اڑ کے تو جائے گی اک پل میں پرستان کے بیچ
ہاتھ پھیلا کے میں رہ جاؤں گا ارمان کے بیچ

باہر جل پریوں کا پھاٹک، چینی باغ، جلو خانہ، سب جگہیں روشنی سے بقعۂ نور بنی ہوئی تھیں۔ کنج میں سری کرشن کا رہس ہو رہا تھا۔ جان عالم گیروا کپڑے پہنے دھوتی رمائے ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ میلے والے، شہر کے باشندے سب گیروا جوڑے پہنے تھے۔ درگا پرشاد کتھک مولسری کے سائے میں پھول کی تھالی کے کنارے پر ناچ ناچ کر بھاؤ بتا رہا تھا۔ فواروں سے معطر پانی ابل رہا تھا۔ باغ کی نشستیں سنہرے اور نقرئی روغن سے چمک رہی تھیں۔ ہر طرف پھول ہی پھول تھے۔

بارہ دری سے جوگن کی بھیرویں کی تانیں بلند ہو رہی تھیں

تار کشی دوپٹہ تو اوڑھے کرن جو ٹانک کے
ہو شبِ ماہتاب میں کیا ہی صنم جھلا جھلی
آئی بہار ساقیا جامِ شراب دے پلا
پھول کھلے پھلے شجر ابر اٹھا ہوا چلی
بہکے زمینِ شعر میں پاؤں امانت اپنا گیا
جب ہوئی لغزش اک ذرا نکلا زباں سے یا علیؑ

جوگن کی آواز رفتہ رفتہ چاندنی میں ڈوبتی گئی۔

یہ لوگ میلے والوں کے ہجوم سے نکل کر پھر سڑک پر آ گئے۔ موٹر میں بیٹھ کر نواب سعادت علی خاں کے مقبرے سے آگے نکلے۔ جدھر روشن آلدولہ کی سُرخ رنگ کی کوٹھی کی عمارات تھیں۔ سڑک کے اس پار چھتر منزل کے محلات نیم تاریکی میں استادہ تھے اندر سے والتس کی آوازیں آ رہی تھیں۔ موٹروں کی قطاریں کھڑی تھیں۔ پھاٹک کے اندر جا کر انھوں نے کار روکی۔ لکھنؤ کا اعلیٰ فیشن ایبل طبقہ سیٹر ڈے نائٹ منا رہا تھا۔

"آج شاید گورنر بھی آیا ہوا ہے ۔۔ ابھی ایک اے ڈی سی کو میں نے اندر جاتے دیکھا۔" ہری شنکر نے اظہارِ خیال کیا۔

"کون والا اے ڈی سی ۔۔ وہی سسی جو اطالوی جگ لو معلوم ہوتا ہے۔" طلعت نے بے دھیانی سے پوچھا۔

"بکو مت ۔۔ تم ہر ایک پر اعتراض کرنے کو تیار ۔ سسی ہے تو ہوا کرے تم سے مطلب ۔" کمال نے ڈانٹا۔

وہ اندر جا کر لاؤنج میں بیٹھ گئے۔ عامر رضا نے مشروبات کا آرڈر دیا۔ مس ایڈن نے لکھا تھا۔ "الف لیلیٰ کی زبیدہ نے اپنا نشاط باغ کو خلیفہ کے تصویر خانے سے ہارنے کی شرط بدی تھی۔ وہ نشاط باغ مجھے یقین ہے یہی رہا ہو گا ۔۔" کمال اکتاہٹ کے ساتھ ستونوں کے نارنجی نقش و نگار دیکھتا رہا

فلور پر مشہور نام تیر رہے تھے جو اودھ گزٹ میں چھپتے تھے اور گرمیوں میں

مسوری، نینی تال، شملہ اور دارجلنگ میں جگمگاتے تھے۔

"ان کا بھی ایک زمانہ ہے —" گوتم نے آہستہ سے کہا۔

باہر سیڑھیوں کے نیچے گومتی آہستہ خرامی سے رواں تھی۔ وہ سب اٹھ کر باہر آگئے ٹیرس سنسان تھا۔ سیڑھیوں پر نصیر الدین حیدر شاہ بادشاہ ننگے پاؤں بیٹھے تھے۔ انھوں نے اپنا ایک جوتا لہروں میں پھینک دیا تھا۔ جب وہ ذرا بہتا ہوا دور نکل جاتا تو یہ تالی بجاتے تاکہ چوبدار آئے۔ جب کوئی چوبدار نہ آتا اور محض بال روم کے قہقہوں کی آواز سنائی دیتی رہتی تو خود اٹھ کر پانی پر جھکتے اور جوتا نکال لیتے۔ تھوڑی دیر بعد دوسرا جوتا پانی میں پھینک دیتے۔ اسی طرح وہ بیٹھے اپنا دل بہلا رہے تھے۔ دیر تک یہی تماشا ہوتا رہا۔ آخر گوتم نے آگے بڑھ کر ان کو بھی سگریٹ پیش کیا۔

"نہیں — ہم مشکبو گڑگڑی پیتے ہیں — کوئی ہے —"

"معاف کیجئے گا — ہم لوگ ہیں —" گوتم نے گھبرا کر کہا۔

"تم لوگ کون —" انھوں نے بے دماغ ہو کر پوچھا۔

"بس ہم ہی لوگ —" وہ خاموش ہو گئے۔

"ان کو یہیں چھوڑ دو — کیا کریں گے ہم ان کا — آؤ چلو۔ یہاں سے —" کمال نے چپکے سے گوتم سے کہا۔

نصیر الدین حیدر بادشاہ کو پانی کے کنارے تنہا اپنے جوتوں سے کھیلتا چھوڑ کر وہ پھر سڑک پر آئے اور پرانے شہر کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ یہاں کہار نیں اور پالکی بردار اور مہریاں اور یکے والے گھوم رہے تھے۔ سبزی فروش۔ خوانچے والے۔ کہاں شہر کی اصل آبادی۔ اصل اہلِ زبان۔ وہ میڈیکل کالج کے سامنے سے گزرے جس کے اندر انسان مر رہے تھے اور پیدا ہو رہے تھے۔ اس کے آگے گنجان پُراسرار شہر تھا۔ حویلیاں۔ پھاٹک۔ احاطے۔ چھتے۔ پیچ در پیچ تنگ و تاریک گلیاں۔ جن کے اندر ایک دنیا آباد تھی۔ آصف الدولہ کا چوک۔ نخاس۔ اکبری دروازہ۔ سبزی منڈی۔ حسین آباد۔ گول دروازہ۔ وکٹوریہ پارک۔ بڑا امام باڑہ۔ مچھی بھون۔ رومی دروازہ۔

آصف الدولہ کا لکھنؤ۔ لکھنؤ کا دل۔ سڑکیں اور گلیاں اب سنسان پڑی تھیں۔ یکلخت بارش کی پھوار شروع ہو گئی۔ بہار کی بارش جو چند منٹ برس کر کھل گئی۔ آسمان پر سے اندر کے ایراوت ہاتھی کی طرح ایک بادل جھومتا ہوا نکل گیا۔ سامنے ایک بالاخانے پر روشنی ہو رہی تھی۔

"میرا ہمیشہ جی چاہا ہے کہ اوپر جا کر کمرہ دیکھوں۔" طلعت نے کہا۔

"ارے یہ تو تنویرہ کا مکان ہے جو ریڈیو اسٹیشن آتی ہے۔" نرملا نے کہا۔ نیچے اس کی اسٹوڈی بیکر کھڑی تھی "اس کے پاس چلیں بڑی پیاری لڑکی ہے۔ بے چاری۔ سرمایہ دارانہ نظام کی شکار۔ چلو اس کے پاس چلیں۔" طلعت مصر رہی۔

"بکو مت۔" چمپا نے ڈانٹا۔

"ارے بجیا ——— آپ کو تو اس طبقے کو سوشیولوجیکل نقطۂ نظر سے۔"

"بحث مت کرو۔ خاموش رہنا سیکھو۔" گوتم اور کمال موٹر سے باہر اترے کھڑے تھے اور رات کی تازہ ہوا ناک میں داخل کر رہے تھے۔

دو کانوں کے برآمدے میں سے ایک بوڑھا ہندو حلوائی کا انگرکھا پہنے لکڑی ٹیکتا گزرا۔ ان نوجوان لڑکوں کو ایک بالاخانے کے نیچے موٹر روکے کھڑا دیکھ کر اس نے آہستہ سے لاحول ولاقوۃ کہا اور آگے بڑھ گیا۔ پھر وہ ——— لوہے کے پل پر سے گزرتے ڈالی گنج ہوتے فیض آباد روڈ پہنچے۔ سامنے چاند باغ تھا۔ دوسری طرف بادشاہ باغ۔

"آؤ پروفیسر بنرجی کے پاس چلیں۔" انھوں نے نعرہ لگایا۔

وہ بادشاہ باغ کے شاہی پھاٹک میں داخل ہوئے جو کیلاش ہوسٹل کے پہلو میں کھلتا تھا۔ باغات یہاں بھی معطر تھے۔ نہر کے سرے پر سرخ بارہ دری چاندنی میں نہائی کھڑی تھی۔ ٹیگور لائبریری کی عظیم الشان جدید وضع کی عمارت پر سکوت پر جلال نظر آ رہی تھی۔ الفاظ میں بڑی طاقت ہے۔ عمارت نے کہا۔ میرے اندر آؤ۔ میں تمھارے دکھ بھلا دوں گی۔

"الفاظ دکھ بھلاتے نہیں۔ دکھ اور گہرا کرتے ہیں۔" گوتم نے جواب دیا۔

ہری شنکر نے کہا۔

"خاموشی کی زبان جتنی تکلیف دہ ہے اس کا تم کو کیا اندازہ۔ سناٹا مار ڈالتا ہے۔"

کمال نے ہری شنکر سے کہا۔

وہ نہر کے پل پر جا کر بیٹھ گئے۔ یونیورسٹی کی عمارات پر چاندنی برسا کی۔ نصیر الدین حیدر کا بادشاہ باغ۔

بے چارے نصیر الدین حیدر۔

پھر انھوں نے پروفیسروں کی کوٹھیوں کی طرف چلنا شروع کیا۔ دور درختوں میں چھپے ہوئے اپنے لان پر پروفیسر بنرجی خاموشی سے ٹہل رہے تھے۔

"یہ جانے مسائل کا حل کس طرح سوچ لیتے ہیں ــ" کمال نے منہ لٹکا کر کہا۔

"شب بخیر پروفیسر ــ" انھوں نے سڑک پر کھڑے ہو کر آہستہ سے کہا۔ اور واپس آ گئے ــ یونیورسٹی کا سارا فاصلہ طے کرتے کو اوڑ بنگل میں سے گزرتے وہ اس سڑک پر پہنچ گئے جو یونیورسٹی روڈ کے متوازن چلتی ہوئی موتی محل برج پر جا نکلتی تھی۔ اس کے سرے پر رجسٹرار آفس تھا۔ سامنے کبوتر والی کوٹھی تھی جس میں وائس چانسلر رہتا تھا۔ برج پر آن کر انھوں نے ایک بار چاروں اور نظر ڈالی اور پھر کچے راستے پر اتر گئے جو سنگھاڑے والی کوٹھی کی طرف جاتا تھا۔

آدھی رات کا گجر بجا۔ گوتم نے ایک آنکھ کھول کر ندی کے بہتے پانی کو دیکھا ــ وہ سنگھاڑے والی کوٹھی کی سیڑھیوں پر برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا ــ چمپا، طلعت، نرملا اور تہمینہ دوسری سیڑھی پر بیٹھی تھیں۔ کمال اور ہری شنکر اور عامر رضا پانی میں ٹانگیں لٹکائے ہوئے تھے۔ ندی بہہ رہی تھی۔ ندی کے سامنے دوسرے کنارے پر نجف اشرف اور موتی محل اور چھتر منزل خاموش کھڑے تھے۔ کشتی سامنے سے گزر گئی۔

وقت کا سحر زائل ہو چکا تھا۔

صبح ہوتی ہے میری جان کوئی آن کے بیچ

بھیرویں مجھ کو سنا چل کے پرستان کے بیچ

گوتم نے آہستہ سے دہرایا۔

" اُفوہ ۔۔ گوتم بھائی ۔۔ تم تو اندر سبھا کے شعروں پر اُتر آئے ۔ کس قدر ڈیکیڈنٹ ہو ۔۔ !" طلعت کہہ رہی تھی۔

وہ انگڑائی لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو یار اب محفل برخاست کی جائے ۔ ساری رات یہیں بیٹھے بیٹھے گزار دی ۔۔ " کمال کی آواز آئی۔

وہ سب منتشر ہو کر اپنی اپنی نیندوں کی طرف روانہ ہو گئے ۔

میں شانتا کا خط بھی مکمل نہ کر سکا ۔ گوتم نے اپنے جائے قیام کی طرف جاتے ہوئے اُداسی سے سوچا ۔

۵۱

پروفیسر بنرجی بین الاقوامی شہرت کے مالک ماہر اقتصادیات تھے ۔ ان کی کوٹھی پر بھی بڑی اُداسی چھائی رہتی اور مکمل سکون ۔ ان کا گھر سچ مچ علم کا مسکن تھا ۔ پُر امن خوبصورت اور خاموش ۔ سہ پہر کو اکثر لڑکے اور لڑکیاں سائیکلیں لیے ان کے گھر پہنچتے ۔ پروفیسر ان کو سیمل کے درخت کے نیچے کرسی بچھائے بیٹھے نظر آجاتے ۔ یا اندر چائے کی میز پر بیٹھے ہوتے ۔ اور کھانے کمرے کے خنک اندھیرے میں سائیڈ بورڈ پر رکھے چاندی کے برتن جھلملایا کرتے ۔ اس وقت وہ اپنے شاگردوں سے بڑی اداس آواز میں باتیں کرتے ۔ پروفیسر کے یہاں کی مجلسوں میں گوتم نیلمبر خاص اہمیت حاصل کر چکا تھا ۔ اس کے بغیر اب محفل مکمل نہ سمجھی جاتی ۔ جاڑوں میں لان پر دھوپ میں اور گرمیوں میں درختوں کے نیچے بیٹھ کر گھنٹوں باتیں ہوتیں ۔ مذہب ۔ فلسفہ ۔ سیاست ۔ عمرانیات ۔ آرٹ ۔ ادب ۔ ذہن کی دُنیا وسیع تھی ۔ بڑی کشش ، بڑی تکلیف دہ اور انتہائی پُر خطر ۔

" پروفیسر ۔۔ " ایک روز چمپا نے پوچھا " ذہن اور جذبات کی کشمکش سے کس طرح نجات ملے گی ۔۔ چاروں اور یہ سائے پھیلے ہیں ۔ جس طرح جنگل میں جھکڑ چلتا ہے تو وہ دھول

کے سائے آپس میں گتھم گتھا ہو جاتے ہیں۔ یہ کش مکش ہر سطح پر جاری ہے۔ قومیں۔ مختلف انسان۔ فرقے۔ ہر طرف یہ سب ایک دوسرے سے اُلجھے ہوئے ہیں۔ میرے آس پاس چاروں کھونٹ خوف کی عملداری ہے اور بے اطمینانی۔ نفرت۔ کھنچاؤ۔ دہشت۔ وفاداریوں کی کش مکش۔ اندھیرے جنگل میں چھپے ہوئے اگیا بھتال اپنے چراغ دکھاتے ہیں اور جب ان کی طرف دوڑو تو پلک جھپکتے میں غائب۔ مجھے بڑی شدید ذہنی کش مکش کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

"جب میں بنارس میں پڑھتی تھی میں نے دو قوموں کے نظریے پر کبھی غور نہ کیا۔ کاشی کی گلیاں اور شوالے اور گھاٹ میرے بھی اتنے ہی تھے جتنے میری دوست لیلا بھارگوا کے۔ پھر یہ کیا ہوا کہ جب میں بڑی تو مجھے پتہ چلا کہ ان شوالوں پر میرا کوئی حق نہیں کیونکہ میں ماتھے پر بندی نہیں لگاتی اور تپلیشور کی آرتی اتارنے کے بجائے میری اماں نماز پڑھتی ہیں۔ لہٰذا میری تہذیب دوسری ہے۔ میری وفاداریاں دوسری ہیں۔ میں نے بسنت کالج میں ترنگے کے نیچے کھڑے ہو کر جن گن من گایا ہے لیکن مجھے وہاں پر اکثر ایسا محسوس ہوا کہ مجھے اس ترنگے کے سائے میں اجنبی سمجھا جاتا ہے —— میں تو اسی ملک کی باسی ہوں۔ اپنے لئے دوسرا ملک کہاں سے لاؤں۔ ہجرت کا فلسفہ میری سمجھ میں نہ آیا۔ یہودیوں کو دیکھو کہ ان کا کوئی وطن نہیں ہے۔ وفاداریوں کی کش مکش کا سامنا کرتے ان کو ہزاروں سال بیت گئے۔ وہ جرمن ہوں تب بھی یہودی ہیں۔ امریکن ہوں تب بھی۔ جب یورپ میں جنگ چھڑی ایک نیا مسئلہ میرے سامنے آیا۔ غاصب قومیں ایک ملک کے باشندوں کو نکال باہر کرتی ہیں اور وہ لوگ سیاسی پناہ گزینوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور دنیا بھر میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ ان پر ترس کھایا جاتا ہے۔ چندے جمع ہوتے ہیں ان کو حقیر سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کا کوئی گھر نہیں۔ دو طرح کے پناہ گزیں تھے ایک وہ جنھوں نے اپنی مرضی سے ترکِ وطن کیا —— دوسرے وہ جن کو مجبوراً نکلنا پڑا۔ تب مسلم سیاست میں ایک نئی آواز سنائی دی۔ میں نے دیکھا کہ میرے ہم مذہب مسلمان بخوشی اور بڑے ارمان کے ساتھ ترکِ وطن پر آمادہ ہیں اور ایک نیا ملک بسانا

چاہ رہے ہیں۔ مجھے اکثر یہ تصوّر بہت بھایا۔ کیونکہ رومان اور عینیت انسان کی فطرت میں داخل ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو دُنیا میں کسی نئے خیال پر عمل نہ کیا جاتا نہ خواب دیکھے جاتے مگر اس خواب کا دوسروں کے خوابوں سے تصادم ہو گیا۔ کشمکش اور تصادم کا مجھے پھر سامنا کرنا پڑا۔

"امن اور جنگ کا مسئلہ بہت کٹھن ہے۔ میں نے ٹالسٹائی پڑھا اور گاندھی اور وڈرو ولسن۔ لیکن اس کے کیا معنی ہیں۔ وفاداریوں کے معنی طے کرنے والا کون ہے سیاست میں مہاتما گاندھی کی روحانیت کا کہاں تک دخل ہونا چاہیئے اور قائد اعظم جناح کے اسلام کا کہاں تک۔ مجھے معلوم ہے کہ فرقہ پرستی ہلاکت خیز ہے۔ اب ایک دفعہ ہم بچھڑے تو کبھی نہ مل سکیں گے۔ مگر میرے کچھ ساتھی کہتے ہیں کہ ہم کبھی ایک نہ تھے یہ سب کانگریس کا فراڈ ہے۔ وہ مسلمانوں کو غلام بنانا چاہتی ہے۔"

"تم نے کبھی غور کیا۔" پروفیسر نے اُوپر درخت کی شاخ پر بیٹھی ہوئی ایک گوریا کو دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ "تم ہسٹری کی طالب علم ہو — کہ انگریزوں سے پہلے اس ملک میں ہندو مسلم فساد نہیں ہوتے تھے جنگیں ہوتی تھیں۔ مگر وہ سیاسی تھیں۔ ہندو حکمرانوں کی فوج میں مسلمان جنرل اور سپاہی ہوتے تھے۔ مسلمانوں کی طرف سے ہندو لڑتے تھے۔ سیاسی گروہ بندیاں تھیں۔ پھر انگریزوں نے دُنیا پر یہ نیا نظریہ آشکار کیا کہ اس ملک میں ہزاروں زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ہزاروں قومیں بستی ہیں۔ ہندو مسلمان ایک دوسرے سے متنفر ہیں۔ یہ ملک ایک ملک نہیں ہے محض جغرافیہ کی ایک اصطلاح ہے۔ ان کی لکھی ہوئی تاریخ کی کتابوں کے ذریعے نفرت کا بیج بو یا گیا۔ مثال کے طور پر ایک کرنل ٹاڈ کی تاریخ راجستھان ہی دیکھ لو۔ یا انیسویں صدی کے سفر نامے۔ لیکن تم کو ۵۷ء یاد ہے۔ جب اسی لکھنؤ میں ہندو امراء اور رعایا نے برجیس قدر کی حکومت کو جو بہر حال مسلمان حکومت تھی بچانے کے لئے اپنی جانیں لڑا دیں مگر ہمارا موجودہ مذہبی جنون —"

"مذہب آپ کے نزدیک بیکار ہے —؟ آپ تو خود بڑے پکّے وشنو ہیں —"

"وشنو بھگتی کا مذہب ہے۔ اس کی بنیاد خالص محبت ہے۔"

"پروفیسر ہر مذہب کی بنیاد خالص محبت ہے۔ یہ کوئی بات نہ ہوئی۔"

"ہاں۔ لیکن اصل چیز یہ ہے کہ میں دوسرے مذہب کو حقیر نہ سمجھوں۔"

"اب ہر ایک تو آپ کی طرح صوفی نہیں ہو سکتا۔"

"تم بڑی تلخ باتیں کرنے لگی ہو۔۔۔ ایسا نہ کرو۔"

"پروفیسر یہاں چاروں طرف تلخی ہے اور نفرت ۔ میں کیا کر سکتی ہوں۔ کل رات میں وہابی تحریک کا تذکرہ پڑھ رہی تھی۔ اس میں جو لوگ شامل تھے ان کو مذہبی دیوانے کہا جاتا ہے مگر اپنے نقطہ نظر سے وہ حق بجانب تھے وہ اسلام کی تجدید کرنا چاہتے تھے ان کے نزدیک دُنیا دو فرقوں میں بٹی تھی۔ کفر اور اسلام۔ اُنھوں نے کفر کے خلاف جہاد کیا۔ آخر کون یہ بتانے جائے گا کہ دوسرا انسان حق بجانب ہے یا نہیں۔ سب اپنے اپنے نقطہ نظر سے حق بجانب ہوتے ہیں۔ یہی تو سب سے بڑی مصیبت ہے۔ پروفیسر کل رات ہم لوگ نرملا کے یہاں رات گئے تک بیٹھے رہے تھے۔ وہاں ہم ماضی کے متعلق سوچ رہے تھے اور وقت کے گورکھ دھندے کے متعلق گھر واپس جا کر میں دیر تک جگا کی۔ یہاں تک کہ سویرا ہو گیا۔ اس وقت میں سوچ رہی تھی۔ ہمارا اور تاریخ کا آخر آپس میں کیا رشتہ ہے اور کیا ہونا چاہیے۔ ہم مسلسل جرم و سزا کے مسئلے کا سامنا کرتے رہتے ہیں۔ ماضی کی پراشچت ہم کو کرنا پڑتی ہے۔ میری قوم نے جو جُرم کئے ہیں یا کر رہی ہے بحیثیت فرد کے مجھے اُن کی سزا بھگتنا ہو گی۔ بحیثیت فرد میں جو جرم کروں گی۔ اس کا خمیازہ میری قوم کو اٹھانا ہو گا۔ کیونکہ خیال میں بڑی طاقت ہے اور میں پروپگنڈے کی مشینری کے ذریعے اپنے خیالات کا پرچار کر کے بہت کچھ کر سکتی ہوں۔ جو کچھ آج اس لمحے تک ہوا اس کا اثر مجھ پر پڑا ہے جو کچھ میں سوچ رہی ہوں اس کا کفارہ آنے والی نسلیں ادا کریں گی۔ میری وجہ سے یا دنیا تباہ ہو گی یا پُر مسرت۔ تاریخ میں نفرت اور تعصب کے مسائل پر میں جتنا غور کرتی ہوں اتنی ہی مجھے وحشت ہوتی ہے۔ مجھے آپ سے ذاتی طور پر نفرت نہیں مگر کمیونٹی کا اثر ہوتا ہے

مجھے آپ سے نفرت کروا رہا ہے۔ سوشیولوجی کی طالب علم کی حیثیت سے میں نے اسٹریو ٹائپ کے نفرت اور تعصب کے تصورات کا بھی بہت تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے میں تاریخ کی بات کر رہی تھی۔ پروفیسر کل میں نے نرملا کے گھر سے لوٹ کر کتابوں کی الماری کھولی اور ایک پرانی کتاب میرے ہاتھ میں آگئی جس میں انیسویں صدی کے مولویوں کے جہاد کا تذکرہ تھا۔ اس میں ایک نظم بھی درج ہے۔ فیض آباد کا ماجرا ہے جو اجودھیا کہلاتا ہے۔ لکھا ہے کہ مغل بادشاہوں اور ان کے صوبیداروں نے رام گھاٹ اور دوسری جگہوں پر مسجدیں بنائیں۔ جب مندر گرے تب بھی ایک ہندو جوگی املی کے درخت کے نیچے جھنڈی گاڑے بیٹھا رہا۔ واجد علی شاہ کے عہد میں ہندوؤں نے پھر اس جگہ پر ٹھاکردوارا بنانے کی کوشش کی۔ بڑا فساد رہا۔ فوج کشی ہوئی۔ فرنگی محل کے علماء نے جہاد کا فتوےٰ دے دیا۔ مجاہدوں کے لشکر پہنچے۔ بڑا خون خرابا ہوا۔ مولویوں نے لشکر کشی سے پہلے سلطان عالم کو عرضی بھیجی جو نظم کی صورت میں تھی۔ میں نے وہ نظم نقل کر لی تھی۔ آپ کو سناتی ہوں۔

اُس نے بیگ کھول کر ایک کاغذ نکالا اور گھاس پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے اور پروفیسر کو سنانا شروع کیا۔

مجاہدین کی عرضداشت بادشاہِ اودھ کی خدمت میں

قریب دیر مہابیر واجب التعزیر
بنا تھی مسجدِ اسلام ہم چو بدرِ منیر
لگے بنانے بڑھا کر یہ کافرِ مقہور
سوادِ مسجدِ اقدس میں خانۂ لنگور
امید ہے کہ شہنشاہ قبلۂ عالم
ابوالمظفر و منصور و خسروِ اعظم
شہپر رفعت و قدسی صفات و الاجاہ

خدیو کشورِ ہندوستاں فلک درگاہ
زباں فیضِ مبارک سے یُوں کریں ارشاد
کہ کافرانِ اودھ پر شتاب ہوئے جہاد
روانہ ہوگا شنبے کو لشکرِ اسلام
برائے غارت و تاراج شہر لچھمن و رام

یہ مذہب کا تعصب ہے اپنی خالص ہیئت میں۔ گو یہ ایک علیٰحدہ بات ہے کہ سلطان عالم واجد علی شاہ نے بجائے اس کے کہ وہ عرض داشت پر کان دھرتے انھوں نے اُلٹی مجاہدین کی سرکوبی کے لئے شاہی فوج فیض آباد بھیجی اور مجاہدین لڑتے ہوئے سرکاری سپاہیوں کے ہاتھوں مارے گئے یا شہید ہوئے اور ایودھیا میں امن قائم ہوا۔ یہ واقعہ انتزاعِ سلطنت سے صرف ایک سال قبل ۱۸۵۵ء کا ہے۔ یہ بھی ایک علیٰحدہ بات ہے کہ سلطان عالم کو انگریزوں نے اس لئے تخت سے اتارا کہ وہ سلطنت کا انتظام اچھی طرح نہیں کرتے تھے۔ پروفیسر بتاؤ۔ میں کس کس سے نفرت کروں؟ — انگریزوں سے جنھوں نے میرے بے قصور بادشاہ کو معزول کیا۔ یا اس کلمہ گو بادشاہ سے نفرت کروں جو ہندو دیومالا کا عاشق تھا کرشن اور راجہ اندر کا سوانگ بھرتا تھا اور مسلمان مجاہدین کا قتل کرواتا تھا۔ ان مجاہدین سے متنفر ہوں جو لچھمن اور رام کے پُرامن خوبصورت شہر کو تاراج کرنے جا رہے تھے —؟ یا ان ہندو جوگیوں کو موردِ الزام ٹھہراؤں جو رام گھاٹ پر دوبارہ ہنومان کا مندر بنانا چاہ رہے تھے اور میں کس کو حق بجانب ٹھہراؤں —؟"

اب کمال قریب آ کر گھاس پر بیٹھ گیا اور چمپا کے ہاتھ سے نظم لے کر پڑھنے لگا۔ لان پر لڑکوں اور لڑکیوں کے گروپ مختلف ٹکڑیوں میں بکھرے ہوئے تھے۔

"اور پھر تم متوقع ہو۔" کمال نے کہنا شروع کیا کہ "تم جو فخریہ اپنے آپ کو

بُت شکن کہتے ہو اور سومنات سے لے کر آج تک تم نے جو کچھ کیا ہے۔ اس کے باوجود ہندو تم سے محبت کریں گے۔ یہ اچھی دھاندلی ہے۔"

"کمال! تم تو بالکل مہا بھائی ہو۔ اچھے خاصے۔ تم سے کوئی بات کرنا بیکار ہے تم فرقوں سے آزاد بڑی وسیع النظری کا دعویٰ کرتے ہو۔ لیکن تمہاری اس شدت کی قوم پرستی بذاتِ خود ایک اور تعصب ہے۔" چمپا نے کہا۔

اس منطق کا میں جواب نہیں دے سکتا۔" کمال نے کہا۔ وہ دونوں اُٹھ کر سرو کے درختوں کے کنارے کنارے ٹہلنے لگے۔

"اصل قصہ یہ ہے چمپا باجی کہ مسلمان قوم کی سائیکولوجی عجیب و غریب ہے۔ تم کو کبھی اس سرزمین سے محبت نہیں ہوئی۔ چھوٹتے ہی میرے مولا بلا لے مدینے مجھے کا نعرہ تم نے لگایا۔ رہیں ایک ہزار برس یہاں تہذیبی اور روحانی ناطہ جوڑے رکھا۔ عجم اور عرب سے۔ پھر مجھے مہا بھائی بنا رہی ہو۔ واہ بھئی —— کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ قومی جدوجہد میں ہر جگہ مسلمانوں نے بھانجی ماری اور فوراً غیر ملکی عناصر سے جا ملے ——" اس نے ٹہلتے ٹہلتے رک کر جوش سے کہنا شروع کیا۔ "کیا واقعہ نہیں ہے کہ ۳۷ء میں جب کانگریس گورنمنٹ نے صوبے میں شراب پر پابندی لگائی تو مسلمانوں نے فوراً اس کے خلاف ایجی ٹیشن کیا کہ ان کے مذہب میں شراب پہلے ہی حرام ہے لہٰذا ان کے اوپر یہ قانون عائد نہیں ہوتا۔ انھیں اس مسئلے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کیا تم اس کی تردید کرو گی کہ جب لیگ نے یومِ نجات منایا تو راجندر بابو نے کہا لیگ نے جو الزامات ——"

"کیا کانگریس حکومت نے مسلمانوں پر ظلم نہیں توڑے ——؟" چمپا نے بات کاٹی۔

"یہی عرض کر رہا ہوں —— راجندر بابو نے کہا کہ لیگ نے جو الزامات کانگریس حکومت پر لگائے وہ فیڈرل کورٹ کے سامنے انکوائری اور فیصلے کے لئے رکھے جائیں لیگ نے یہ بھی نامنظور کر دیا اور کہا کہ یہ معاملہ رائل کمیشن کے سامنے البتہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس پر برطانوی حکومت تیار نہ ہوئی ——"

"ہاں کیونکہ برطانوی گورنروں کو تم لوگوں نے پہلے ہی اپنی طرف ملا لیا تھا ——"

"تمہارا خیال ہے کہ برطانوی گورنر وفادار مسلمانوں کو چھوڑ کر کانگریس کا طرفدار ہوگیا تھا ہوش کے ناخن لو چمپا باجی — ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے ذریعے ان کو اقلیتوں کے تحفّظ کے مخصوص اختیارات دے دیئے گئے تھے۔"

"چنانچہ یہ تم مانتے ہو کہ اقلیتوں کا مسئلہ ہندوستان میں موجود ہے —"

"یقیناً —" کمال نے گلا صاف کیا — "لیکن یہاں روس کی طرح ملٹی نیشنل اسٹیٹ بن سکتی ہے۔"

"یہی تو مصیبت ہے کہ تمہارے ساتھ جو بات کرو تان جا کر ماسکو پر ٹوٹے گی" چمپا نے کہا۔

"اور آپ کی تان جا کر مکّے مدینے پہ ٹوٹتی ہے — ایٹم کے عہد میں قرونِ وسطیٰ کے مذہبی تصورات لئے پھر رہی ہیں۔"

"دیکھو — تم پنڈت نہرو کی کہی ہوئی باتیں نہ دہرایا کرو۔"

"کیوں نہ دہراؤں۔ لکھیئے
چمپا باجی ساری بات یہ ہے کہ مسلمان سماجی طور پر پسماندہ ہے اور مذہب اس کے لئے ایک بہت واضح تصور ہے۔ انتہائی شخصی اور ذاتی۔ ہندو کے یہاں مذہب ایک سماجی نظام ہے۔ ہزاروں لاکھوں دیوتا ہیں وہ جن کو چاہے مانے جن کو چاہے رد کر دے۔ ایک مخصوص قسم کی تنگ نظری ہے۔ ایک مخصوص قسم کی آزاد خیالی۔ پھر اس کی انٹیلجنسیا نے سائنٹیفک ہونا سب سے پہلے سیکھا۔ وہ مذہب کے بارے میں جذباتی نہیں۔ اس کا ذہن انتہائی ریشہ دوانی اور جوڑ توڑ کا ماہر ہے۔ حساب کتاب جمع تفریق۔

ظاہر ہے مسلمانوں کے مقابلہ میں وہ کہیں زیادہ چالاک ہے۔ مسلمان بے چارہ خدا اور رسولؐ کا عاشق۔ بات بات پر ہجرت پر تیار۔ ترکی میں کسی کو چھینک آئی۔ آپ بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ افغانستان میں کسی کے پیر میں کانٹا چبھا یہ بیکل ہو گئے۔ ہندی ہو کر بھی ہند کا نہ ہوا۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ یہاں اجمیریؒ پیا بھی ہیں محبوبِ الٰہیؒ بھی۔ یہاں تاج محل پر بھی بھائی کو بہت ناز ہے کہ ہمارے بادشاہوں نے بنایا تھا مگر اس اسلامی مینیا لاقوامیت

کے چکر نے اسے کہیں کا نہ رکھا۔"

کمال نے چلتے چلتے ایک میز پر سے اُٹھا کر پانی کا گلاس پیا ——
"مسلمانوں کی ساری تاریخ اُٹھا کر دیکھ لو۔" اس نے تھوڑی دیر بعد کہنا شروع کیا
—"ہمیشہ مُلک گیری اور ذاتی اقتدار کے لیے آپس میں لڑے۔ شان و شوکت اور
امپریلزم کی جس قدر شائق یہ قوم ہے۔ میں نے آج تک کہیں نہیں دیکھی — بنوامیہ،
بنوعباس، ایران کی حکومتیں، عثمانی ترک، ہندوستانی مغل، افغان، عرب، مصری، سب
نے آپس میں کیا کیا خونریز جنگیں کی ہیں۔ اس وقت ان کا اسلام کہاں گیا تھا۔ مار اسلام
اسلام کی رٹ لگا رکھی ہے —"

"لیکن خلفائے راشدین کا زمانہ —"

"چمپا باجی — کیوں زخموں پر نمک چھڑکتی ہو —! رسولِ خدا کی آنکھیں بند ہوتے
ہی تو تمھاری ملتِ بیضا نے خانہ جنگی شروع کر دی — جنگِ جمل بھول گئیں ——
آج تک وہ زخم ہرے ہیں۔ تعصب اور نفرت۔ تعصب کے مسئلے کو تو تمھارا اسلام
بھی حل نہ کر سکا۔ میں لکھنؤ کا شیعہ ہوں۔ مجھ سے پوچھو۔ شیعہ اور سنّی ایک دوسرے سے
کس قدر متنفر ہیں۔ نہیں چمپا باجی — مجھے مذہب نہیں چاہیئے — فقہ اور حدیث
اور امام غزالی اور ابنِ خلدون سب ٹھیک ہے مگر اس وقت میرے سامنے دوسرے
مسائل ہیں۔ انسان کو امن چاہیئے۔ اور روٹی۔ اس کے بعد وہ یقیناً افکارِ غزالی پر
غور کر سکتا ہے۔" اب وہ پھر پارٹی لائن چلا رہا تھا۔

کمال موجودہ نسل کا نمائندہ لڑکا تھا۔ ذہن پرست۔ با اُصول۔ ایماندار۔ شدید طور پر
پُرخلوص۔ تصوّر پرست۔ چمپا اسے غور سے دیکھتی رہی۔ عامر رضا جنھوں نے اس سے
صرف فرانسیسی پروشنل شاعری اور وی آنا کی موسیقی کی باتیں کی تھیں کسی دوسری دُنیا میں بستے
تھے۔ کمال اور گوتم اور ہری شنکر یہ لوگ ان سے کس قدر مختلف کتنے بلند تھے۔

مگر وہ تو گلابوں کی دنیا میں بھی جانا چاہتی تھی۔ جہاں دیودار کے درختوں میں چھپے ہوئے کاٹج ہیں اور جن میں شوپاں کی موسیقی بجتی ہے ——

"ہماری لڑکیوں اور عورتوں کو ستیہ گرہ کی تحریک کے زمانے میں جیلوں میں کوڑے لگائے گئے ——"

اس کے کانوں میں کمال کی آواز آئی۔ وہ جوش کے ساتھ بولے جا رہا تھا۔ "ہمارے لیڈروں نے پندرہ پندرہ برس کی قید تنہائی کاٹی۔ تم جو جیل جانے والوں کا مذاق اڑاتی ہو —— ذرا سوچو۔ زندگی اور آزادی کسے عزیز نہیں۔ عمر عزیز کے ان گنت سال جیل میں کاٹ دینا کسے پسند ہے۔ محض ایک اصول ایک نظریے کی خاطر ہزاروں لوگوں نے جا کر قید خانے میں چکیاں پیسیں اور برطانوی سپاہیوں کے ظلم سہے۔ کیا یہ لوگ محض شہرت اور نام و نمود کے بھوکے تھے۔ کیا خالی جذباتیت کی بنا پر انھوں نے یہ قربانیاں دیں۔ انسان کو زندگی صرف ایک مرتبہ زندہ رہنے کے لئے ملتی ہے اور اس زندگی کا بیشتر حصہ انھوں نے جیلوں میں گزار دیا۔ ہنسی خوشی جا کر کال کوٹھڑیوں میں بند ہو گئے۔ سیاسی جدوجہد بہت بڑی چیز ہے۔ اس کا مذاق نہ اڑانا۔ اس آگ میں تپ کر جو لوگ نکلتے ہیں وہ کندن کی مانند ہیں۔ جو لوگ آپ کی طرح آرام کرسیوں پہ بیٹھ کر ان پہ ہنستے ہیں اور پھر بھی قوم کی ہمدردی کا دعوےٰ کرتے ہیں۔ وقت آنے پر خود ہی معلوم ہو جائے گا۔ کون کتنے پانی میں ہے۔ گھٹیا لوگ اور بڑے انسان سب آپ ہی الگ الگ راستوں پر چلے جائیں گے۔ تم کو معلوم ہے دہرہ دون جیل میں پنڈت جی کی کوٹھڑی میں سانپ اور بچھو تھے۔ کن کن مصائب کا ان سب نے سامنا کیا۔ مگر اب بجائے اس کے کہ متحد ہو کر ہم ایک عظیم طاقت بنتے ہم انگریزوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں۔" کمال کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔

"تم بڑے پکے نیشنلسٹ ہو کمال —— ؟" چمپا نے خائف ہو کر پوچھا۔

"ہاں۔ ہر ایماندار اور ضمیر پرست انسان نیشنلسٹ ہو گا۔ کیا وجہ ہے کہ ملک کے اکثر مسلمان انٹلکچوئل قوم پرست ہیں۔ کیا وہ سب ضمیر فروش ہیں۔ کانگریس نے ان کو رشوت دے رکھی ہے۔ خدا کے غضب سے ڈرو چمپا باجی۔"

"اور ایک اور بات ۔" اس ٹہلتے ٹہلتے رک کر کہا: "تمہارے نزدیک سیاست صرف شہروں کی سیاست ہے۔ تم دیہات سے واقف نہیں۔ شہروں میں رجعت پسند سرمایہ دار ہیں جو اپنا نظام قائم رکھنے کے لئے فرقہ وارانہ سیاست کو اچھال رہے ہیں۔ تم کبھی کسی گاؤں میں گئی ہو۔ اگر مادھو پور کی ہندو لڑکی بیاہ کر کرن گنج جائے تو مادھو پور کا مسلمان کسان کبھی کرن گنج میں پانی نہیں پیئے گا کیونکہ وہ اس کی بیٹی کی سسرال ہے۔ یہ انسانیت کی اقدار ہیں چمپا باجی جو مذہب اور سیاست سے بلند تر ہیں۔"

اب شام کا اندھیرا چھا رہا تھا۔ لان پر درخت کے نیچے طلعت بیٹھی گوتم اور چند لڑکیوں سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ اٹھ کر ان کی طرف آ گئی۔ کمال کہتا رہا: "ہماری ساری سیاست کی اصل بنیاد مراعات حاصل کرنے کا مقابلہ تھا۔ مسلمانوں کو اتنی ملازمتیں ملنا چاہئے سکھوں کی اتنی ہندوؤں کو اتنی مڈل کلاس سیاست۔ مجھے بتاؤ مسلمانوں کی آٹھ کروڑ آبادی میں مڈل کلاس اور یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ کتنے ہیں اور کسان اور کاریگروں کا تناسب کیا ہے — اور ہز ہائی نس دی آغا خان کیا ان کسانوں اور کاریگروں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان میں اور احمد آباد یا بمبئی کے کسی دوسرے سیٹھ میں کیا فرق ہے۔ وہ اور برلا اور ڈالمیا —"

"اوہ — " چمپا نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ "وہی کمیونسٹ پارٹی کے گھسے پٹے دلائل۔"

"تم سے بحث کرنا بالکل بیکار ہے چمپا باجی۔" کمال نے رنجیدہ ہو کر کہا۔

طلعت اب ان کے ساتھ ساتھ ٹہل رہی تھی۔ "تم نے آج کا اخبار پڑھا"

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔" کمال نے نیچی آواز میں جواب دیا۔

"کیا ہوا — " چمپا نے پوچھا

"میرے بابا، خان بہادر نواب تقی رضا بہادر آف کلیان پور لیگ میں شامل ہو گئے۔ یعنی دوسرے الفاظ میں یہ کہ ٹائپ پر لوٹ گئے ہے"

"مایا سے مایا ملے، کر کر لمبے ہاتھ — " طلعت نے کہا۔

"تلسی داس گریب کی کوئی نہ پوچھے بات —" کمال نے کہنا شروع کیا۔ "بابا سمجھتے ہیں کانگریس تعلقہ داروں کو ختم کرنے کے درپے ہے۔ کانگریس حکومت بنتے ہی پھر وہی کھڑاگ شروع ہو جائے گا۔ زرعی اصلاحات اور یہ اور وہ۔ انھیں نیشنلزم سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ فیوڈل اقدار کے آخری رکھوالے ہیں۔ مجھے ان سے پوری پوری ہمدردی ہے۔ میں اپنے والد کا نقطۂ نظر خوب سمجھتا ہوں۔ میں گھر جا کر ان سے بحث نہیں کروں گا۔ مگر مجھے صرف اس کا افسوس ہے کہ اس سرزمین میں ان کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ وہ ترکِ وطن کر کے سندھ اور بلوچستان کو اپنا ملک کیسے سمجھیں گے۔ بابا بوڑھے آدمی ہیں میں ان کو اس وقت دل شکستہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ مگر اس وقت تیر کمان سے نکل چکا ہو گا۔"

"کمال وطنیت اتنی بڑی چیز نہیں۔ تصور اصل چیز ہے۔ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان ہی میں مسلمانوں کی بقا ہے تو تم اعتراض کرنے والے کون۔ کیا تم آزادیٔ افکار کے قائل نہیں" چمپا نے جواب دیا۔ "وطن کو پرانے کوٹ کی طرح اتار کر نہیں پھینکا جا سکتا۔" طلعت نے غصے سے کہا۔

"کیا وطن ہے یار۔ بکواس۔ مسلمان کا وطن سارا جہاں ہے۔" چمپا نے کہا۔

طلعت اسے غور سے دیکھتی رہی "بجیا آئیے۔" اس نے کہا "پروفیسر حامد کے لیے بُلا رہے ہیں۔"

پروفیسر کے قریب ہی گھاس پر گوتم بیٹھا تھا۔ اُس نے اُٹھ کر چمپا کو نمستے کیا۔

"چمپا باجی مسلم لیگی ہو گئی ہیں بڑی بھاری۔ آج لیگ کی طرف سے ایک بیان چھپا ہے کہ ہندوؤں کا سوشل بائیکاٹ کر دیا جائے۔ لہٰذا کل سے وہ ہماری محفلوں میں نہیں آئیں گی —" کمال نے تلخی سے کہا۔

شام کی نیلگوں روشنی میں وہ درختوں کے قمقموں کے نیچے بیٹھے رہے۔ فضا کا غم گہرا ہوتا گیا۔

"چمپا۔ چلو، نو بجے سے ریہرسل شروع ہے۔" پھولوں کے پرے سے کسی

لڑکی نے پکارا۔

"اچھا۔" وہ سائیکل سنبھال کر پھاٹک کی طرف چلی گئی۔ گھاس پر بیٹھے ہوئے لوگ اسے روش پر سے گزرتا دیکھتے رہے۔

۵۲

کیلاش ہوسٹل میں سالانہ ڈرامہ تھا۔ لڑکیاں ہفتوں سے تیاری میں جٹی تھیں۔ شام کو ہال میں یا گھاس پر ریہرسلیں کی جاتیں۔ موسیقی کمپوز ہوتی۔ ناچ کی مشق کی جاتی۔ کوسٹیومز کے ڈیزائن تیار ہوتے۔ اسٹیج کے ڈیکور پر بحث ہوتی۔ فیروز جبیں نہایت تندہی سے سب کو پارٹ یاد کروا رہی تھی۔ کملا انارکلی تھی۔ طلعت دلآرام۔ ای ند سلیم۔ ایک اور سوانگ۔ پھر کواڈرینگل میں اسٹیج تیار ہوا۔ وائس چانسلر اور اسٹاف اگلی قطاروں میں آن کر بیٹھے۔ ریڈیو اسٹیشن کے آرکیسٹرا نے اسٹیج کے نیچے برآمدے میں اپنی جگہیں سنبھالیں۔ اب کلثوم محل سرا میں کنیزوں کے ساتھ بیٹھی گا رہی تھی ــــ

لب جو ہو فرشِ آب ہو شبِ ماہ ہو بادۂ ناب ہو

ای ند دریچے میں کھڑی کہہ رہی تھی ــــ راوی کے نوجوان ملاح ــــ انارکلی کہہ رہی تھی۔ ہندوستان کا شہزادہ اور کنیز سے محبت ــــ کیسی ہنسی کی بات ــــ یہ سب خواب کی طرح گزرتا گیا۔ پھر پردہ گرا۔ اور لوگ باتیں کرتے باہر نکلے

عامر رضا نے چمپا سے کہا۔ "ڈائریکٹر صاحب آپ نے کمال کر دیا۔"

کمال نے کہا۔ "چمپا باجی بس سوانگ رچتی رہئے ــــ انارکلی سے بہتر کوئی موضوع نہ مل سکا آپ کو۔ رومان پرستی کی بھی حد ہونی چاہئے۔" پھر وہ مجمع میں غائب ہو گیا۔

گوتم نے قریب آ کر کہا۔ "چمپا باجی کیا آپ کمال سے خفا ہیں۔ اس روز پروفیسر کے یہاں کمال نے آپ سے کافی سخت سست باتیں کہیں۔ میں اس کی طرف سے آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ آپ اتنی خاموش کیوں ہیں۔ آپ ہنستی ہوئی اچھی لگتی ہیں۔ زندگی میں اتنی اداسی ہے اس اداسی میں اضافہ نہ کیجئے۔"

"نہیں"، اس نے گوتم کو جواب دیا۔ "میں دراصل آج کل جینے کے مختلف رویّے اسٹڈی کر رہی ہوں۔"

"میں اس مسئلے پر کچھ روشنی ڈالوں۔" طلعت نے بشاشت سے قریب آ کر کہا۔ وہ ابھی تک دلآرام کا لباس پہنے تھی۔

"آج میری اس قدر تعریفیں ہوئی ہیں۔ تو میں نے سوچا کہ میں کس طرح کا ایکسپریشن اپنے چہرے پر قائم رکھوں۔ وقار۔ بشاشت۔ سنجیدگی۔ مصیبت یہ ہے کہ اگر انکسار برتو تو سمجھا جاتا ہے یہ احساس کمتری ہے —— اور اگر انکسار نہ برتا جائے تو اسے غرور پر محمول کیا جاتا ہے۔ ہر ایک سے اچھی طرح باتیں کرو تو لوگ کہتے ہیں عجب چنچل لڑکی ہے —— رکھ رکھاؤ سے رہو تو بوریا بدوماغ سمجھا جاتا ہے۔ یا یہ کہ بے چاری چار آدمیوں سے بات کرنے میں گھبرا جاتی ہے کہ نِرے گھُس ہے میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ انسان جیسا ہے اس کو ویسا ہی رہنا چاہیئے۔ کبھی ایسی چیزوں کی تمنّا نہ کرو جو بس سے باہر ہوں —— مثال کے طور پر بھائی گوتم کو دیکھیے۔ ان سے باتیں کیجیے تو لگتا ہے افلاطون کے ساتھ مکالمہ ادا کیا جا رہا ہے یا خلیل جبران کا المصطفےٰ دیوداروں کے باغ میں مصروفِ گفتگو ہے۔ نہیں چمپا باجی۔ جینے کے رویّے کے متعلق نہ سوچیے۔" پھر وہ بھی چھلاوے کی طرح مجمع میں غائب ہو گئی۔

گوتم نے ہنس کر چمپا کو دیکھا۔ "کس قدر ٹرّاتی ہے یہ لڑکی ——"

"مجھے اس پر رشک آتا ہے۔ اس کے ذہن میں کوئی اُلجھن نہیں۔" چمپا نے کہا۔ "اُلجھنوں سے ہم سب خود کو بچا سکتے ہیں۔"

"واقعی۔؟"

"ہاں چمپا باجی۔"

"تم کبھی اُلجھنوں سے دوچار نہیں ہوئے۔"

"شاید — نہیں۔"

"سنو گوتم — کون کس سے کہہ سکتا ہے کہ اس طرح نہ جیو —— اس راستے پر چلو۔

یہ باتیں سوچو — تم مجھ سے کہہ سکتے ہو —؟"

"شاید نہیں — "

سڑک پر مولسری کی ٹہنیاں جھکی ہوئی تھیں۔ ہواؤں کے راگ بہت سُریلے تھے۔ وہ دفعتاً پھاٹک کی پلیا کے پاس ٹھٹک گئی۔ "نہیں گوتم۔ میں کمال سے خفا نہیں ہوں۔ مجھے کسی سے بھی خفا ہونے کا حق نہیں پہنچتا —"

"آپ درجۂ شہادت حاصل کرنے والی ہیں! یہ مظلوموں والا لہجہ کیوں؟"

"تم — تم لوگ بڑے کمینے ہو۔" اس نے تلخی سے کہا۔

"ہم لوگ محض بے حد پُرخلوص ہیں — مگر شاید خلوص کی ایک قسم اور بھی ہوتی ہے اور وہ بھیا صاحب کے پاس موجود ہے —"

"تم — تم ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو — مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں ایک طویل شفّاف گیلری میں کھڑی ہوں اور میرے سامنے سے ایک کے بعد ایک فرّاٹے سے پردے اُٹھتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ پردے جن پر خوبصورت تصویریں بنی ہیں اور مناظر۔ اب آخر میں صرف ایک سیاہ پردہ باقی رہ گیا ہے —"

"چمپا باجی — آپ کا پرابلم بے حد ذاتی ہے — آپ کو بھیا صاحب سے بہت محبّت ہے۔ بس ساری بات یہ ہے۔ باقی سب فروعات ہے — اور آپ کا دوسرا پرابلم الفاظ ہیں۔" گوتم نے حسبِ معمول پہنچے ہوئے بزرگ کی طرح انکشاف کیا۔

نفرت سے چمپا نے اسے دیکھا۔ "الفاظ —"

"ہاں۔ صریحاً۔ میں نے یہی لفظ استعمال کیا تھا —"

"اور جو کچھ ہے وہ بے معنی ہے؟"

"کوئی چیز بے معنی نہیں — خود اس لفظ بے معنی کے بھی معنی موجود ہیں۔"

"طلعت ٹھیک کہتی تھی۔ تم بھی پوز کرتے ہو۔ تم سے باتیں کرو تو لگتا ہے خلیل جبران کے المصطفےٰ سے گفتگو کی جا رہی ہے —"

"چمپا باجی ——" وہ گھبرا گیا۔" للہ خفا نہ ہوجیے —— چلئے مجھے اپنے گھر لے جا کر کافی پلائیے —— وہاں ہم ان مسائل پر مزید روشنی ڈالیں گے —— اور للہ افسردہ نہ ہوجیے انسان صرف ایک بار پیدا ہوتا ہے۔ اگلے جنم کی کسے خبر ہے —— آئیے ——"

چمپا چاند باغ کی ایک پہاڑی لیکچرر سیتا ڈکشٹ کے ساتھ کالج کے پیچھے ایک چھوٹی سی کاٹیج میں رہتی تھی۔ وہاں پہنچ کر وہ دونوں برآمدے میں بیٹھ گئے۔ سامنے امرودوں کے اندھیرے باغ میں رکھوالا سگوں کو اڑانے کے لئے آوازیں لگا رہا تھا جو رات کا بسیرا لینے کے لئے ٹہنیوں پر آن بیٹھے تھے۔

قریب ایک اور پروفیسر کی کوٹھی میں پیانو بج رہا تھا۔ چاند سوئمنگ پول کی لہروں میں تیرا کیا۔

گوتم بید کی کرسی پر بیٹھا کیلے کے جھنڈ کو دیکھتا رہا۔ چمپا کافی بنا کر لائی اور اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"چمپا باجی آپ بہت گریٹ آدمی ہیں خدا کی قسم ——"

"واقعی؟"

"چمپا باجی۔ ایک بات بتلائیے۔"

"پوچھو۔"

"آپ بھیا صاحب کو کتنے عرصے سے جانتی ہیں۔"

"کئی سال سے۔"

"اور اتنے عرصے آپ نے کیا کیا۔"

"پڑھا۔ اور کیا کیا"

"اس کے بعد ——؟"

"اور پڑھا۔"

"اس کے بعد؟"

"بس پڑھتی چلی گئی۔" چمپا نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

"اور بھیا صاحب کو اتنے عرصے سے برداشت کر رہی ہیں؟ جب پہلے ملی ہوں گی تو سترہ اٹھارہ سال کی رہی ہوں گی — ان کا خیال آپ کے لئے ایک بڑی رئیسانہ عادت میں شامل ہو چکا ہے۔ گو آپ خود رئیس نہیں ہیں۔ میں آپ کو ایک بات بتلاؤں — آپ ذرا غور کریں تو معلوم ہوتا کہ آپ کا عشق —"

"واہیات باتیں مت کرو۔"

"واہیات — غضب خدا کا آپ تو بڑی سخت بلو اسٹوکنگ نکلیں۔ ارے عشق میں کیا خرابی ہے۔ بڑی عمدہ چیز ہے۔ میں خود اس میں اکثر مبتلا ہو جایا کرتا ہوں مگر متوسط طبقے کی لڑکیوں کا قاعدہ ہے کہ اس طرح کے الفاظ کو بہت بُرا سمجھتی ہیں۔ چمپا باجی سوری۔ اتنا سہانا سمے ہے۔ مجھے چاہیئے تھا کہ آپ سے بجائے کرسُنتا ستار پہ گت باگیشری۔ تین تال۔ اور یہاں میں نے آپ کے پرابلمز کا تجزیہ شروع کر دیا۔"

"یہ دوسروں کے پروبلمز کا تجزیہ کرنا بھی بڑا زبردست ریکٹ ہے۔ اور آپ بھولتے ہیں کہ آپ کے جیسے طالب علموں کو روز کالج میں پڑھاتی ہوں۔"

"میں جانتا تھا کہ آپ یہی کہیں گی۔ ہماری ساری زندگی ایک سے پٹے پٹائے جملے دُہراتے گزر جاتی ہے۔" وہ مُنہ لٹکا کر دریچے سے باہر دیکھنے لگا "میں یہ بھی جانتا ہوں کہ رومینٹک ہونے کے لئے آپ کے بھیا صاحب کون سے مینرزم استعمال کرتے ہوں گے۔ کون سے جملے دہراتے ہوں گے۔ سُنا ہے، فرنچ بہت فرسٹ کلاس بولتے ہیں —"

"لیکن آخر تم بھیا صاحب سے اتنا چڑتے کیوں ہو۔" چمپا نے کہا

وہ دفعتاً جھینپ گیا۔ اس قدر جھینپا کہ اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔

"مجھے چڑنے دیجئے آپ سے مطلب —؟" وہ اپنے جارحانہ حربوں پر اتر آیا۔ اتنا مضبوط انسان اور اس قدر کمزور نکلا۔ چمپا نے حیرت سے سوچا۔

"مطلب یہ —" چمپا نے کہا "کہ ہمارے گروپ کے سب لوگ بھیا صاحب کو بڑا بھائی سمجھ کر ان کی عزت کرتے ہیں۔ کم از کم تمہیں اس کا خیال تو کرنا چاہئیے۔ تمیز بھی

کوئی چیز ہے۔ یہاں آئے ہو تو ذرا تمیز بھی سیکھو — یہ کیا ہر سمے ہتڑ۔ دنگا۔ فوجداری۔ یہ چنڈو خانہ ہی کیا کم تھا کہ اُوپر سے تم بھی نازل ہو گئے۔"

"بھیا صاحب سے اگر آپ بیاہ فرما رہی ہیں تو یہ دوسری بات ہے۔ آپ کا فرض ہے کہ ان کو آسمان پر چڑھا دیں۔ ہر ہندوستانی لڑکی یہی کرتی ہے۔"

"میں نے کب دعوےٰ کیا تھا کہ میں امریکن لڑکی ہوں۔ اور دوسری بات یہ کہ۔"

"دوسری بات یہ ہے۔ چمپا باجی کہ آپ ان سے بیاہ کرتی عجب مسخری لگیں گی۔ اپی کی اور بات تھی۔ وہ پیدا ہی اسی لئے ہوئی تھیں۔ مگر آپ — حد ہے —"

اب چمپا جھینپی۔ "میں آپ سے رائے نہیں لے رہی ہوں۔" اس نے فی الفور بزرگی طاری کر لی۔

"میں رائے کب دے رہا ہوں۔ اگر آپ میں اتنی عقل ہوتی کہ مجھ سے رائے لیں تو یہ نوبت ہی کیوں آتی۔ مگر آپ ہیں کہ — آہ — اس بظاہر سمجھدار تعلیم یافتہ لڑکی کو دیکھو۔" اُس نے ٹہل ٹہل کر تھیٹریکل انداز میں کہنا شروع کیا۔ "یہ معاشیات کی اُستاد۔ ڈائیلکٹکس کی طالب علم۔ برسوں برس سے کس مصیبت میں گرفتار ہے — اسے رومانیت کی شکار نادان کنیا —" کمرے کے وسط میں کھڑا ہو کر وہ دہاڑا۔

"گوتم تم بالکل دیوانے ہو۔" چمپا نے محظوظ ہو کر کہا۔

"اب یعنی آپ مجھے میری دیدی یا موسی کی طرح پچکارا بھی کریں گی — میں کہتا ہوں یہ تُک کیا ہے — یعنی غضب خُدا کا۔ جو شخص پابندی کے ساتھ کلب جا کر اولڈ والٹس ناچے۔ پکنکوں اور پارٹیوں میں کالج کی لونڈیوں کی موٹر کھینچتا پھرے۔ خود لونڈیوں کی طرح حسین ہو اور قیامت یہ کہ اپنے حُسن پر نازاں بھی ہو — اس کو آپ پسند فرماتی ہیں۔ اگر آپ کو عشق ہی کرنا منظور ہے تو مجھ سے ہی کر ڈالئے۔ یا کمال اور ہری شنکر ہی میں کیا بُرائی تھی۔ ویسے ان کے علاوہ ہزاروں ہیں گو یہ علیحدہ بات ہے کہ میں بے حد منفرد ہستی ہوں۔" اُس نے ذرا انکسار سے اضافہ کیا۔ پھر دوسرے لمحے اس نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ "نہیں۔ چمپا باجی۔ مصیبت یہ ہے کہ آپ لوگ رومانوں پر جان دیتے ہیں بس ایک

—— دیو مالا کا ہونا ضروری ہے۔ آپ کی روایت۔ بھیا صاحب کے گلیمر کی روایت۔ گلفشاں اور سنگھار دے والی کوٹھی کی روایت۔

—— دلکشی کشش۔ جذب دل۔ مگر خالی دلکشی کا نتیجہ کیا ہے۔ کوئی تخلیقی کام ہی نہیں کرتیں۔"

"پڑھاتی جو ہوں۔" چمپا نے خود کو اس قدر بے بس محسوس کیا۔ ایسا غیر متوقع، ایسا بے رحم حملہ اچانک اس پر کیا گیا تھا۔ اس کا زرہ بکتر ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ وہ جو برسوں سے اپنے آپ کو، اپنے جذبات اور احساسات کو بے حد اہم سمجھتی آئی تھی۔ پل کی پل میں وہ خود کو بے حد قابلِ افسوس معلوم ہوئی۔ "اب ہر ایک تو کلاکار نہیں بن سکتا۔" اس نے باآوازِ بلند کہا۔

"کلاکار نہ بنئے۔ آج کل کلاکاروں کی تو فوج کی فوج ہر جگہ گھوم رہی ہے۔ کوئی بنیادی کام کیجئے۔ اتنا کچھ کرنے کو پڑا ہے۔" اس نے چاروں اور نظر ڈال کر تھکی ہوئی سانس لی۔ "آپ کو نظر نہیں آتا——؟"

"نظر آتا ہے۔" چمپا نے کہا۔ "لیکن زندہ بھی تو رہنا ہے۔ ملازمت کرتی ہوں مسلم اسکول میں تو تین سو روپے مہینے کے ملتے ہیں۔ میرے ابا بہت معمولی حیثیت کے وکیل ہیں۔ میں تم رئیس زادوں کی طرح خالی غربت کی تھیوری سے واقف نہیں مجھے تنگدستی کی حقیقت معلوم ہے۔"

کسی اور موقع پر اسے یہ گفتگو کرتے سخت شرم آتی کیونکہ وہ خالص سفید پوش گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ لیکن گوتم اس کے سامنے فادر کنفیسر کی طرح بیٹھا تھا۔ اس سے کون بات چھپائی جا سکتی تھی۔

"اور بھیا صاحب سے بیاہ ہو گیا تو آپ بھی کلب جا کر اولڈ وائنتر ناچیں گی اور راؤنڈ ٹیبل کے لئے جائیں گی——؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"تو کیا میں سرخ جھنڈا لے کر سڑک پر دوڑ پڑوں۔ کس قدر ایلی منٹری باتیں کرتے ہو جس طرح کی بحث تم مجھ سے کر رہے ہو۔ ایسی ہی بحثیں کرتے اسی لکھنؤ میں مجھے زمانہ

گذر گیا ہے۔"

"تو گویا شادی آپ کے اقتصادی مسائل کا حل ہے۔ شادی ہندوستان کی ہر لڑکی کے ذاتی اور عمرانی پرابلم کا حل تصور کیا جاتا ہے۔ چمپا بیگم میں تم کو اوروں سے مختلف سمجھتا تھا۔"

"انڈر گریجویٹ باتیں مت کرو۔" چمپا نے غصے سے کہا۔

"انڈر گریجویٹ آپ کے یہاں بڑا بھاری طعنہ ہے۔ ٹھیک ہے لیکن اس سے یہ کب ثابت ہوتا ہے کہ آپ بھیا صاحب سے لو لگائے بیٹھی رہیں۔ بتائیے تو آپ کو یہ صاحبزادے اس قدر پسند کیوں ہیں۔"

"پتہ نہیں۔" اس نے کم عمر لڑکیوں کی طرح جھینپ کر کہا۔ اور اسے سخت کوفت ہوئی۔ اسے اپنی زندگی میں آج تک اتنی شرمندگی نہیں اٹھانا پڑی تھی۔

"اچھا آپ کو اچھی شکلیں پسند آتی ہیں۔ شاعرانہ طبیعت ہے آپ کی!" پھر وہ ٹہلتا ہوا ہیٹ ریک کے آئینے کے پاس چلا گیا اور بھویں اٹھا کر غور سے اپنا چہرہ دیکھنے لگا۔" مجھ سے بھی کوئی لڑکی اتنا ہی اتم عشق کر سکے گی؟ ۔۔ اگر دیکھا جائے تو میں ایسا بدصورت نہیں۔"

"شانتا تم سے اتم عشق نہیں کرتی۔؟"

اب گوتم اپنی جگہ بھونچکا کھڑا رہ گیا۔ چمپا کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس کا زرہ بکتر ٹوٹ رہا ہے۔۔۔

"گوتم بہادر۔۔۔ تم بھی شیشے کے گھر میں رہتے ہو۔ دوسروں پر پتھر پھینکنے سے پہلے یہ یاد رکھا کرو۔۔"

"تم کو شانتا کے متعلق کیا معلوم ہے۔"

"تم اس کو چاہتے نہیں ہو۔ جو کوئی بھی وہ ہے۔ جو تمہارے کزن کی بیوی ہے اور تم سے پانچ سال بڑی۔ ہم کس کو ناصح سمجھیں اور خود کس کو نصیحت کریں۔ اور اب تم اس اپنی شانتا نیلمبر کو بھولتے بھی جا رہے ہو۔ بہت دنوں سے تم نے اس کو خط لکھ کر یہاں

کی رپورٹ نہیں بھیجی۔ وہ تمہاری ذہنی رفیق ہے۔ تم اس سے شادی نہیں کر سکتے۔ تم کسی سے بھی شادی نہیں کر سکو گے۔ نرملا سے بھی نہیں۔ گوتم بہادر یہ بڑے احمق معاملات ہیں۔ یہاں تمہارے نظریے نہیں چل سکتے۔ میں بھیّا صاحب کو پسند کرتی ہوں۔ ان سے میری کوئی ذہنی رفاقت نہیں۔ مگر گوتم بہادر مجھے تو تم بھی پسند ہو۔ بتاؤ اس کا کیا کیا جائے۔ انسانی رشتے بڑے انوکھے ہوتے ہیں۔ مجھے رفتہ رفتہ تم بھی اچھے لگ رہے ہو کیا میں فطرتاً فلرٹ ہوں ــــ؟ ہرگز نہیں۔ ذرا باہر جا کر پوچھو۔ میری کس قدر عمدہ ریپوٹیشن ہے۔ مجھے دیبی کہا جاتا ہے۔ یقیناً میری طبیعت میں آوارگی نہیں مگر انسانوں کو پسند کرنے کی اہلیت رکھتی ہوں۔ اب جو میں نے اتنا بڑا کنفیشن کیا تو اس لئے کہ تمہارا شیشے کا گھر بھی ٹوٹ چکا ہے۔ اسے تم نے افسوس خود ہی مسمار کر دیا ــــ کچھ دن اور ثابت رہنے دیتے اسے۔ بڑا خوبصورت تھا۔ بلّور کا مندر جس کے اندر گوتم سدھارتھ کی مورتی براجمان تھی ــــ سارناتھ سے واقفیت ہے ــــ؟ سارناتھ میری زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے ــــ میں کاشی میں پیدا ہوئی تھی۔" اس نے اداسی سے بات ختم کی۔

اندھیرے میں وہ جس کشتی پر سوار تھا وہ کشتی طوفانی ریلے کے ساتھ کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ وہ دریچے میں چپ چاپ کھڑا رہا۔

چمپا کو اس پر بڑا ترس آیا۔ کیسا پیارا لڑکا تھا۔ اس میں ہری شنکر اور کمال کی کس قدر مشابہت تھی۔ ان ہی کا جیسا سنجیدہ اور شیطان۔ یہ دونوں بھی کہاں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے جیسے کروک دستیاب کر لاتے تھے۔ اسی کو دیکھو۔ جنے کہاں سے بہتا بہتا آ نکلا آیا تھا کسی دیس سے ایک ہنس بے چارہ ــــ سلسلہ روز و شب۔ نقش گر حادثات۔ نقش گر ــــ وہ اپنے ذہن کو خالی کر کے بہت سی بے ربط باتیں سوچتی رہی تاکہ اس جذباتی لینڈ سلائیڈ کو نظر انداز کر سکے۔

"تم کو شانتا کے متعلق کیا معلوم ہے ــــ" گوتم نے دریچے میں کھڑے کھڑے غرا کر پوچھا۔ وہ اس سے لڑ رہا تھا یعنی اتنا نزدیک آ چکا تھا کہ اسے ڈانٹے اسے برا بھلا کہے اور اس سے لڑے۔ اس پر تنقید کرے۔ یگانگت کے اس احساس نے چمپا کو اور اداس

کر دیا۔

"گوتم — !" اس نے کہا۔ "اس خوفناک رپٹے ہوئے جملے کو معاف کرنا۔ مگر یہ کہ ہم سب کھلی ہوئی کتابیں ہیں۔ ہم میں سے کسی میں کوئی اسرار نہیں۔ تم مجھ سے کس قدر واقف ہو چکے ہو۔ ہر انسان بے حد Exposed ہے۔ تیز روشنی میں ہے۔ وہ نیم تاریکی، وہ دھندلکا تم کو کہیں نہ ملے گا جس میں جا کر بالآخر تم خود کو چھپا سکو — جب میں تم کو دیکھتی ہوں تو مجھے لگتا ہے میں بھی اسی تیز روشنی میں کھڑی ہوں اور تم مجھ کو آر پار دیکھ رہے ہو۔ لیکن میں تم کو خود آر پار دیکھ رہی ہوں اسی لئے مجھے معلوم ہے کہ تم بھی —"

"— آر پار دیکھ رہا ہوں — چمپا الفاظ کو ختم کر دو — الفاظ ہمیں کھا جائیں گے"

"الفاظ کو ختم کر دو مگر معنی کے معنی موجود رہیں گے۔ بتلاؤ ہم کیا کر سکتے ہیں۔" چمپا نے بڑی بے بسی سے کہا۔

۵۳

بھیا صاحب کے لاشعور کا حال تو اللہ بہتر جانتا ہوگا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جب تک وہ اپنی رخصت کے زمانے میں لکھنؤ میں رہے۔ انھوں نے بالکل مون برت رکھ لیا پہلے ہی وہ کون سی بات کر کے دیتے تھے مگر اب ان کی خاموشی کو مثال کے طور پر پیش کیا جاتا —

"بھیا صاحب کی خاموشی میں بڑے افسانے چھپے ہوئے ہیں۔" حمیدہ بانو نے ایک روز انکشاف کیا۔

"واہ کیا بات ہے۔ افسانے نہیں جوتا چھپا ہوا ہے — لاحول ولاقوۃ —" طلعت نے غصے سے جواب دیا۔ اس بورژوا رومانیت نے ہر طرف اودھم مچا رکھا تھا۔ خود حمیدہ بانو ان دنوں بڑے زوروں میں شاعری کر رہی تھی۔

موضوعِ سخن ایک مبہم سا اور اس قدر مثالی کردار تھا جو شاید یونانی دیو مالا کے لئے بھی تخلیق نہ کیا ہوگا —

"ہمیں اس بورژوانہ ہیئت کے خلاف سب سے پہلے جہاد کرنا ہے۔ جاگیردارانہ سماج نے جس طرح ذہنوں کی تشکیل کی —" طلعت نے نرملا سے کہنا شروع کیا —

"اور ذرا سُننا — قسم خدا کی — دل چاہتا ہے ان سب سے ایک پندرہ دن سڑکیں کُٹوائی جائیں تو یہ ساری افسانویت تشریف لے جائے — سُنا تم نے یہ بھیا صاحب جو ہیں ہمارے مشہور و معروف — یہ گوتم سے جلتے ہیں۔" طلعت نے ایک روز نرملا کو خبر دی۔

"گوتم سے —؟ ہائے رے۔ یہ تو بڑا لطیفہ ہے۔ کون جلے گا اس بے چارے سے۔ اس قدر تو وہ Defence-less ہے۔"

"اسے اپنے بچاؤ کی ضرورت ہی نہیں —" طلعت نے کہا "ہاں ہاں اور کیا — مطلب یہ کہ وہ تو — حد ہے بھئی —"

ٹھگوں کی منڈلی کی مانند ان سب کو اپنی منڈلی سے شدت کی وفاداری تھی جو اس میں شامل ہوا باقی سب اس پر جان چھڑکنے کو تیار —

"مگر کیا چمپا باجی تو کہیں —" نرملا نے دفعتاً سوچ کر کہا۔

"ہشت ایسی بچپنے کی باتیں مت کرو۔"

"اس میں بچپنا کیا ہے۔ وقت کی بات ہوتی ہے۔" نرملا نے بے حد بزرگی سے کہا۔

"غلط —" طلعت نے پُرزور احتجاج کیا "چمپا باجی۔ اب ایسی بھی امپیچور نہیں — اچھا تم گوتم سے کر سکتی ہو عشق —؟" اس نے خوفناک طریقے سے پُوچھا۔

"گوتم سے —؟ حد ہو گئی — اتنی جان پہچان کے بعد اب اس کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ عشق کرنے کے لئے میری جان تھوڑا سا اسرار چاہیے۔"

"اور اسی اسرار اور رومانیت کے خلاف ہم لوگ جہاد کرنے والے ہیں" طلعت نے کہا

"اور کیا ۔" نرملا نے صاد کیا۔

"دراصل چمپا باجی کے اس مسلسل عشق نے ہم سب کی سائیکولوجی خراب کر دی ہے غضب خدا کا جب سے وہ یہاں آئی ہیں۔ یاد ہے ہم لوگ فرسٹ ایر میں تھے۔ تب سے یہ سلسلہ چل رہا ہے۔ کس قدر تھرڈ کلاس بات۔"

"بے حد تھرڈ کلاس ۔" نرملا نے دوبارہ صاد کیا۔

"اور سمجھ میں نہیں آتا کہ جب بھیا صاحب اتنے مصر ہیں تو یہ ان سے کر کیوں نہیں لیتیں شادی ۔"

شام کا اندھیرا بہت جلد چھا گیا۔ ندی کے کنارے مندر میں چراغ جل اٹھے تھے۔ کشتی میں بیٹھا کوئی آرزو کی غزل گاتا جا رہا تھا۔ طلعت نے غور سے سننا چاہا۔ لیکن الفاظ سمجھ میں نہ آئے مگر ایک بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ دور گیت گایا جا رہا ہو اور فاصلے کی وجہ سے اس گیت کے الفاظ سمجھ میں نہ آئیں تو کیسا لگتا ہے ۔ " وہ سیڑھیوں پر سے اٹھ کر اندر آگئی۔ "آؤ ترپ چال کھیلیں ۔" اس نے ہری شنکر سے کہا۔

"بھیا صاحب ابھی کلب میں ملے تھے ۔" اس نے صوفے پر سے اٹھتے ہوئے بتایا۔

"پھر وہی قصہ ۔" طلعت نے بور ہو کر سوچا۔

"وہ ہم سے خفا ہیں کہ ہم نے گوتم کو اتنا لفٹ کیوں دے رکھا ہے ہر سمے یہاں گھسا رہتا ہے ۔"

"ماشاءاللہ سے ۔" طلعت نے کہا "کیا یہ ہمارے گارجین ہیں۔"

"اب بہرحال ۔ بڑے بھائی تو ہیں۔" ہری شنکر نے طرفداری کرنا چاہی۔ وفاداریوں کی کش مکش اس کے سامنے تھی۔ بھیا صاحب سے وفاداری ۔ گوتم نیلمبر سے وفاداری غریب شنکر سر پو استوا کرے تو کیا کرے ۔

"اور چمپا باجی کہاں ہیں ۔"

"وہ تو کل سے ہسٹری کانگریس کے لئے الٰہ آباد گئی ہوئی ہیں ۔"

اتنے میں سائیکل آن کر رکی اور گوتم نیلمبر آ موجود ہوا۔

"چمپا نہیں ہیں ۔ ؟" اس نے آہستگی کے ساتھ ہی سوال کیا

"نہیں ۔ مگر ہم لوگ تو موجود ہیں ۔ آؤ بیٹھو ۔"

"یہ اطلاع دینے آیا تھا کہ خاکسار کا آب و دانہ یہاں سے اٹھ گیا۔"

"اب کہاں جاتے ہو۔" طلعت نے پوچھا۔

"یہی ذرا ولایت تک ۔ اخبار بھیج رہا ہے۔ پر سوچتا ہوں دو تین سال اگر وہاں تک گیا تو ساتھ کچھ پڑھ بھی لوں۔ بہت وقت برباد کیا ہے ۔"

"یہی ذرا ولایت تک ۔" طلعت نے نقل اتاری "کس قدر کا رعب ڈال رہے ہیں جیسے ہم لوگ تو ولایت کبھی جا ہی نہیں سکتے ۔ چلو تم ہم سب بھی آتے ہیں پیچھے پیچھے ۔"

"کیا وہاں بھی منڈلی سے چھٹکارا نہیں ملے گا۔ اگر یہ بات ہے تو ولایت کا سفر منسوخ بندہ جاپان کا رخ کرے گا ۔"

"ہم جاپان بھی آئیں گے ۔"

"قصہ مختصر یہ کہ اب فرار حاصل کرنا مشکل ہے !"

"ظاہر ہے ۔ پہلے ہی تمھاری شامت آئی تھی تو شہر کا رخ تم نے کیا ۔ اب بھگتو۔"

"ذرا چمپا کو بھی خدا حافظ کہہ لیتا مگر وہ حضرت چھلاوے کی طرح غائب ہو جاتی ہیں ۔"

"ارے تم پیرس ہی تو جا رہے ہو تمھارا دیہانت تو نہیں ہو رہا ۔ پھر مل لینا ۔" ترنگنی نے کہا ۔

"ہسٹری کانگریس کب ختم ہو رہی ہے ۔"

"ہو جائے گی ختم ہفتے بھر میں ۔ مگر اس کے بعد دسہرہ ہے ۔ وہ سیدھی بنارس چلی جائیں گی ۔"

"یہ ہسٹری کانگریسوں میں جانے لگی ہیں ۔"

"اور کیا ۔ اتنی قابل جو ہیں ۔"

"یار بڑا افسوس ہو رہا ہے واقعی کہ تم جا رہے ہو۔" ہری شنکر نے کہا۔

"ہاں۔ یار افسوس تو ہونا ہی چاہیئے۔ میں اس قدر باغ و بہار آدمی تھا۔"

طلعت ان دونوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر اندر نرملا کے پاس چلی گئی۔

"گرو جا رہا ہے۔" اُس نے کہا

"میں نے سُنا ابھی" وہ رو رہی تھی۔ طلعت حیران رہ گئی۔

"اری کس قدر مہا بیوقوف لڑکی ہے۔ روتی کیوں ہے۔ شادی کر کے تو بھی ساتھ چلی جا۔ تیرا تو اس کے لئے جانے کب کا پیغام جا چکا ہے!"

"وہ بھلا مجھ سے کرے گا شادی۔ چمپا باجی کا دم بھرتا ہے۔ عمر بھر میرا مقابلہ ان سے کرتا رہے گا۔ میں چمپا باجی کی پرچھائیں بن کر جیوں گی۔۔؟"

چمپا باجی — چمپا باجی۔ تم سے زیادہ بُرا کون ہوگا — اب جانے تم اور کس کس کی قسمت برباد کرو گی — طلعت دہلیز پر اکڑوں بیٹھ گئی۔ "مت رو اے مہا بیوقوف۔" اُس نے روندھی آواز سے کہنا چاہا — برآمدے میں سے گوتم اور شنکر کے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

طلعت، چمپا سے اس روز سے زیادہ متنفر کبھی نہیں ہوئی۔

۵۴

"یہ گوکل بے حد خوبصورت جگہ ہے۔ مدھو مالتی ہوا میں جھولتی ہے۔ پروائی کے جھونکے بچوں کی طرح کنج میں کلکاریاں بھرتے پھرتے ہیں۔ بھول ماں کی سوچ کی طرح خوبصورت ہیں۔ یہ گوکل یہ منظر کس کے جلوے کا عکس ہے؟ تمھارے ماتھے کا تلک آسمان میں ڈوبتے سورج کی مانند جگمگاتا ہے۔" کل اس نے کہا تھا۔ اور میں، کمزور عورت۔ مجھے اپنی طاقت کا احساس ہوا۔ زمین خاموش ہے۔ ساری کائنات جیسے دل ہی دل میں آہستہ آہستہ دعا مانگ رہی ہے۔ لڑکیاں گھاٹ پر پانی پھینک رہی ہیں۔ ان میں سے ایک لڑکی چلا اُٹھتی ہے — ہری — ! ہری — !! ایک لڑکی رو رہی ہے۔ گوپالا — وہ کہتی ہے۔

زندگی میں اس کی وجہ سے راحت ہے۔ زندگی میں اس کی وجہ سے انتہا دُکھ ہے۔

ورندابن میرے انگ انگ میں رچ گیا ہے۔ صبح سویرے منڈیر پر رکھی ہوئی گاگریں دھند کے میں جھلملاتی ہیں۔ گایوں کی گھنٹیوں کی آواز۔ سبز گھاس کی گرم گرم مہک۔ دودھ کے سفید جھاگ۔ جنگل کی ہریالی۔ میری آتما چین سے بھر گئی ہے۔ رات کو ستارے ورندابن پر جھک کر اسی چین کا جاپ کرتے ہیں۔ پرندوں کے پروں کی مدھم سرسراتی آواز اوم آدم کا کیرتن کر رہی ہے۔ میرے اندر سکون لہریں مار رہا ہے جیسے چاندنی کی لہریں جمنا پر پھیل جاتی ہیں۔ رنگ روشنی۔ موسیقی۔ کرشنا۔ اکرشنا۔ موہن۔ ہری۔ نندلالہ۔ کانہا — اس کا ہر نام اس الوہی راگ کے نئے سُر کی طرح بجتا چلا جا رہا ہے۔ وہی اس کو جان سکتے ہیں جو اس سے محبت کرتے ہیں۔

اور یکایک سنہری موسیقی کی بوچھار میرے کانوں پر آن گری جیسے ہر سُر کے کنارے ایک ستارہ جل رہا ہو۔ اور پھر یہ پھوار تیز رنگوں والی دھنک میں تبدیل ہو گئی اور اس کی تیز جگمگاہٹ کی تاب نہ لا کر میں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ مجھے پتہ نہ چلا کہ میں موسیقی کو سُن رہی ہوں یا دیکھ رہی ہوں۔ اس سمے مجھے معلوم ہوا کہ سمادھی کا مطلب کیا ہے۔ وہ لمحہ جب روح پرم آتما کے روبرو کھڑی ہو کر کہتی ہے — یہ میں ہوں۔

لڑکیاں گھاس پر راس ناچ رہی ہیں۔ ایک دو تین چار — ایک دو تین چار —

ما - آ - دھا - وا - مادھو - مادھو - مادھو -

بادلوں میں چھپی ہوئی دیبی کی طرح وہ گاگر اٹھائے آہستہ آہستہ جا رہی ہے۔ کامنی شری رادھے۔ کرشن کی سب سے بڑی بھگت اور گرو۔ رادھا کرشنا۔ ! تخلیق کائنات سے لے کر آج تک اس سے زیادہ خوبصورت موسیقی کسی نے سُنی تھی – ؟ ورندابن پر بسنت کا سُورج چمک رہا ہے۔ ہرن موسیقی کی تانوں کی طرح کلیلیں بھرتے پھر رہے ہیں مُرلی کی آواز بلند ہوئی — موسیقی اس کی آواز ہے۔ پھُول اس کی مسکراہٹ۔ سمندر اس کے خیال کی وسعت۔ طلوعِ آفتاب سے پہلے کا آسمان اس کی سمادھی کا سایہ۔ میں، تارہ میلا، میں بھی گاؤں گی —

کائنات گہری نیلی روشنی میں تیر رہی ہے۔ زمین۔ آسمان۔ خلا۔ آدم کی سنسناہٹ سے گونج رہا ہے: نشار میلا۔؟

میرا نام اب نشار میلا نہیں۔ میں بھی کرشنا ہوں۔ ہر شے کرشنا ہے۔

میرے سامنے ایک نیلا سورج طلوع ہوا اور ساری فضا جگمگا گئی — اور اس نے کہا۔ او بیوقوف گوپیو — تم جو پانچوں حواسوں کے جھمیلے میں گرفتار ہو۔ سنو اور جانو کہ ہر شے فریبِ نظر ہے۔ ایک مکمل ورندابن جس میں مَیں آنکھ مچولی کھیلتا رہتا ہوں درخت کے پھول نارنجی قمقموں کی مانند جگمگا رہے تھے اور رادھا کلی کا گچھا اس کی کالی لٹوں کے پاس جھکا تھا اور اس کی آنکھیں بھٹکی روح کو راستہ دکھانے والے ستاروں کی طرح جھلملا رہی تھیں۔ وہ سمادھی میں کھو گیا اور اُس کے جگتے ہی شاخیں دوبارہ سرسرائیں۔ ستارے چمکے۔ ہوائیں بہنے لگیں۔ کیونکہ اس کے ساتھ ساتھ کائنات بھی سمادھی میں کھو گئی تھی —

اور کائنات سنگیت سے بھر گئی۔

مُراری — تینوں دُنیاؤں کے نُور۔ جے جے کرشنا

کچھ کو تو اپنے حُسن سے اپنی اور کھینچتا ہے۔

کچھ کو بانسری کی آواز سے۔

کچھ کو تو اپنے خداوندی جلال کے ذریعے اپنا بندہ بناتا ہے

کچھ کو اپنے قہر و غضب سے متاثر کرتا ہے — گوپیوں نے کہا۔

کچھ کو تو میدانِ جنگ میں نیست و نابود کرتا ہے۔

کچھ کو اپنی آواز کے جادو سے سرشار کرتا ہے — گوپیوں نے کہا۔

مگر تیرا سب سے بڑا ہتھیار محبت ہے۔

جے کرشنا۔ جے جے کرشنا۔

اوم شانتی! شانتی! شانتی!!

— موسیقی آہستہ آہستہ فیڈ آوٹ ہو گئی۔ چمپا چونک اُٹھی۔ اندھیرے کمرے میں سرف

ریڈیو کا ڈائل روشن تھا۔ "ریحانہ طیب جی کی انگریزی تصنیف "گوپی کے دل" کا ترجمہ آپ نے سنا۔ اب آپ کماری گیان وتی بھٹناگر سے چندر کونس کا ـــ" طلعت کی آواز آرہی تھی۔ چمپا نے ہاتھ بڑھا کر ریڈیو سیٹ بند کر دیا۔

پھر وہ دریچے میں جا کر شام کے آسمان کو دیکھنے لگی ـــ کرشنا ـــ کرشنا۔ کرشنا۔ اس نے دل میں دُہرایا۔ برابر کی کوٹھی میں کیرتن ہو رہا تھا۔ وہ کان لگا کر آواز سُنتی رہی۔ وجدان کیا شے ہوتا ہے اور محبت۔ اور جنوں خیز عشق۔ اور پُرسکون احساسِ رفاقت۔ یہ سب کیا ہے۔ اور بھگتی ـــ ریحانہ طیب جی، اس مسلمان لڑکی نے بھگتی کے جس جذبے سے سرشار ہو کر یہ کتاب لکھی ہے۔ اسے بڑے بڑے پنڈت بھی نہ سمجھ پائیں گے۔

یہ کیا شے ہے ـــ؟ میں ڈائیلکٹکس میں اس کا حل ڈھونڈوں گی۔

اور محبت ـــ

خداوندا ـــ

جے جے کرشنا ـــ　بنت بناؤں بن ناہیں آوے ہری کے بنا۔

ہری کے بنا ـــ برابر کے کمرے میں کوئی لڑکی پوروی کا خیال گا رہی تھی۔

دفعتاً اس کی سمجھ میں اس کا مطلب آگیا ـــ محبت دراصل فراق کو کہتے ہیں۔

گھاس پر لڑکیاں ٹہل رہی تھیں۔ سوشل روم میں پیانو بجایا جا رہا تھا۔ ہر طرف گوپی کا دل نظر آرہا تھا۔

"بجیا ـــ کیا کر رہی ہیں۔" حمیدہ بانو نے کھڑکی میں سے سر ڈال کر اندر جھانکا ـــ "پروفیسر بنرجی کے یہاں آپ کا انتظار کیا جا رہا ہے ـــ"

"ارے ـــ" اس نے چونک کر گھڑی دیکھی۔ سارے میں جنم اشٹمی کا تہوار منایا جا رہا تھا۔ ہوا میں طوفان لرزاں تھے۔ باغوں میں جھولے پڑے تھے جن میں کنہیا کو جھلایا جا رہا تھا۔ دُور سڑک پر ایک ٹولی کیرتن کرتی جا رہی تھی۔ اوم جے جگدیش ہرے بھگت جنوں کے سنکٹ ـــ چھن میں دور کرے ـــ

وہ اُتر کر نیچے آئی اور سائیکل اٹھا کر حمیدہ بانو کے ساتھ بادشاہ باغ روانہ ہوگئی
پروفیسر کے یہاں بہت بڑا مجمع تھا۔ اسے ذرا حیرت ہوئی۔ شاید جنم اشٹمی کی تقریب منائی
جائے گی۔ اس نے سوچا۔ وہ ابھی تک ورنداابن میں گھوم رہی تھی ــــ ڈائریکٹ ایکشن
ــــ کلکتہ ــ کلکتہ ــــ دو ہزار موتیں۔

یہ کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ خواب سے اس کو کسی نے جھنجوڑ دیا۔ سامنے دیکھا گوتم بھی
موجود تھا اور چند کاغذات پر جھکا جلدی جلدی کچھ لکھ رہا تھا۔

"کیا ہو گیا ــــ" اُس نے گھبرا کر پوچھا۔

طلعت نے غصے سے اسے دیکھا۔ ریڈیو اسٹیشن سے وہ بھی سیدھی وہیں پہنچی تھی اور
اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ "جو کچھ ہو گیا چمپا باجی وہ آپ کو خود ہی معلوم ہوا جاتا ہے"

"ہم امن چاہتے تھے۔ ہم امن چاہتے ہیں۔ ہم لڑنا نہیں چاہتے۔ ہم ہرگز نہیں
لڑیں گے۔" گوتم آہستہ آہستہ بڑی گمبھیر آواز میں کہہ رہا تھا۔ اُس نے نظر اٹھا کر چمپا
کو دیکھا بھی نہیں۔ وہ اپنے کام میں مصروف رہا۔

"لیکن ڈائریکٹ ایکشن ــ" کسی نے جوش سے کہا۔

"بکواس مت کرو ــ" ہری شنکر نے کہا

"ذرا اپنے لیڈروں سے جا کر پوچھو چمپا بیگم ــــ اب یہ کیا ہو رہا ہے۔" کسی اور
نے اس کے قریب آ کر کہا۔

چمپا نے ہڑبڑا کر چاروں طرف دیکھا ــــــــ میرے لیڈر ــ اس کا حلق
سوکھ گیا ــ

"ہاں۔ ہاں ــ تمہارے لیڈر ــ بڑے زوروں سے لیگ کو ووٹ دینے گئی
تھیں۔" نریندر نے کہا۔

"یہ غلط ہے ۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ اس نے گوتم کی طرف دیکھا۔
لیکن گوتم نے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"اگر غلط ہے تو کل ہی اخبار میں بیان دو گی ـ؟ بتاؤ ــ" نریندر نے گرج کر

کہا۔

"چلو یہاں سے چلیں۔ ہمارے گھر چلو — وہاں بیٹھ کر طے کریں گے۔"

"طے کریں گے کہ چمپا بیگم کو پھانسی پر چڑھایا جائے یا نہ چڑھایا جائے۔" چمپا نے تلخی سے کہا۔

مجمع نے اسے گھور کر دیکھا۔

"رشیدہ آپا کے یہاں چلو —"

"رشیدہ آپا کیا کریں گی۔ اور تم —" ایک اور شخص (یہ سب پھر سفید بلینک پھر رہے تھے) ہری شنکر کی طرف مڑا — "بڑے کمیونسٹ بنے پھرتے تھے بے چارے۔ — پاکستان کا مطالبہ عوامی مطالبہ ہے۔" وہ پھر اخبار پر جھک گئے۔

"اب خالی امن کی اپیلیں کرنے اور امن کمیٹیاں بنانے سے کیا ہوگا —" کمال نے کہا۔ "امن کی اپیل پر آج تک دنیا میں کسی نے عمل کیا ہے۔"

"ہم نہیں لڑیں گے —" گوتم نے دہرایا۔

"ہونہہ۔ گاندھی وادیوں سے زیادہ بڑا فراڈ کہیں نہیں دیکھا۔" تیسرے نے کہا۔

وہ پھر واپس لوٹی۔ کیلاش ہوسٹل میں یونین کا ہنگامی سیشن ہو رہا تھا۔ وہ وہاں سے آگے بڑھی۔ چاند باغ کے چیپل سے آرگن کی آواز بلند ہو رہی تھی اور ہال میں "جنگلی بطخ" کی ریہرسل کی جا رہی تھی۔ رلئے بہاری لال روڈ پر سے گزرتے ہوئے اس نے مکانوں پر نظر ڈالی۔ اس کو خوش آمدید کہنے والا کوئی دروازہ کہیں موجود نہ تھا۔ اپنے کمرے میں واپس پہنچ کر اس نے گوتم کو فون کرنے کے لئے ریسیور اٹھایا۔ کون ہے۔ گوتم کی تھکی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ شاید ابھی ابھی اپنے گھر لوٹا تھا۔

"ہلو — میں نے سوچا تم سے بات کر لوں۔"

"کیا بات —" گوتم نے ذرا جھنجھلا کر پوچھا۔

"تم — تم بھی سمجھتے ہو کہ میں ری ایکشنری ہوں۔"

"میں کچھ نہیں سمجھتا چمپا رانی۔ یہ وقت ذاتی مسائل اور اُلجھنیں حل کرنے کا نہیں ہے اگر تم اپنے مسائل کے باوجود ہمارے ساتھ رہنا چاہتی ہو تو یہ بہت بڑی بات ہے۔ اور اگر نہیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

ہم ——— گوتم گروہ کی طرف سے بول رہا تھا۔ وہ پھر تنہا تھی۔

"لیکن میں تمھارے ساتھ چلنا چاہتی ہوں۔"

"میرے ساتھ —؟"

"ہاں۔"

وہ بڑا متعجب ہوا "چمپا میں پیرس نہیں جا رہا ہوں۔"

چمپا کو بڑا سخت صدمہ ہوا۔ وہ اسے کس قدر غلط سمجھنے میں تلا ہوا تھا

"گوتم نیلمبر تمھارے ساتھ پیرس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں کہہ رہی ہوں تم لوگ ریلیف ورک کے لئے کلکتے جا رہے ہو کل۔ میں بھی ساتھ چلنا چاہتی ہوں۔"

"کہاں ماری ماری پھروگی۔ جان کا خطرہ الگ ہے اور تمھارے ابا بنارس سٹی مسلم لیگ کے صدر ہیں کیوں ان کا نام ڈبوتی ہو —"

"تم نے بھی مجھے طعنے دینے شروع کیے۔"

"میں نے بھی —! کیوں مجھ میں کوئی خصوصیت ہے — میں اور سب کی طرح ہوں۔ ان کے ساتھ ہوں۔ چمپا رانی یہ سمجھ لو — سنگھ بڑی چیز ہے اور آخری حقیقت ہے تنہا فردِ واحد، کی حیثیت سے تم اپنے خول میں جا گھسو تو اس کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں۔"

"تم نے پھر نظریاتی بحث شروع کر دی۔ اچھا شب بخیر۔ گوتم —" چمپا نے جھنجھلا کر فون بند کر دیا۔

دوسری صبح اسے معلوم ہوا کہ گروہ سر پہ کفن باندھ کر کلکتے روانہ ہو گیا۔ نرملا، طلعت تہمینہ سب چلی گئیں۔ صرف وہ اکیلی رہ گئی۔

مہینے گزرتے گئے۔

گروہ کلکتے کے بعد اب بنگال اور بہار کے سارے علاقے میں امن امن کی رٹ لگاتا پھر رہا تھا۔ رات کو گاندھی جی کے ساتھ بیٹھ کر وہ رگھوپتی راگھو راجہ رام الاپتے دن میں زخمیوں کی مرہم پٹی کرتے۔ لڑکیاں واپس آچکی تھیں۔ لکھنؤ کی زندگی معمول کے مطابق جاری تھی۔ مزید ڈرامے مزید پارٹیاں۔ مزید کانفرنسیں۔ ایک روز چمپا نے اخبار میں پڑھا کہ بہار میں پھلگو ندی کے کنارے بلوائیوں نے چند ورکرز پر حملہ کر دیا۔ جو لوگ زخمی ہوئے ان میں کمال اور شنکر اور گوتم بھی شامل تھے۔ چمپا نے گھبرا کر سائیکل اٹھائی اور گلفشاں روانہ ہو گئی۔ پھاٹک پر سے اس نے دیکھا کہ اسٹیشن ویگن میں سامان لد رہا ہے۔ تہمینہ اور طلعت اور نرملا سفر کے لیے تیار کھڑی ہیں۔ میاں قدیر گھبرائے گھبرائے پھر رہے ہیں۔ اخبار کی اطلاع دو تین روز پرانی تھی۔ تہمینہ نے اسے بتایا کہ خوش قسمتی سے شنکر کے چاچا اس وقت گیا میں موجود تھے اور ان تینوں کو موٹر پر لاد کر گورکھپور لے گئے۔ جہاں کے وہ سول سرجن تھے اور اب وہ تینوں بھی گورکھپور جا رہی تھیں۔

"خیریت سے ہیں وہ لوگ۔" چمپا نے تشویش سے پوچھا۔

"گوتم کی آواز سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔ ابھی میں نے ٹرنک کال کیا تھا۔"

"حالانکہ چوٹ سب سے زیادہ اسی کو آئی ہے چاچا کہہ رہے تھے فون پر —"
نرملا نے اضافہ کیا۔

"چمپا تم بھی چلو۔" تہمینہ نے کہا۔ وہ مصروفیت سے جھکی ایک اٹیچی کیس بند کر رہی تھی۔ "تم پچھلے دنوں اتنی الگ تھلگ رہیں کہ ہم سمجھے بہت مصروف ہو —"

"میں نہ تم سب کی طرح کتابیں لکھتی ہوں نہ گاتی بجاتی ہوں۔ سوائے پڑھانے کے میری مصروفیت کیا ہو سکتی ہے۔"

"کالج تو بند ہے تمہارا۔ چلو ہمارے ساتھ چلو۔ ہم واپسی میں تم کو بنارس چھوڑتے آئیں گے۔" تہمینہ نے کہا۔

چنانچہ چمپا کو گروہ نے پھر واپس بلا لیا۔

تینوں لڑکے سول سرجن صاحب کے بنگلے کے پچھلے چوڑے برآمدے میں لیٹے ہوئے گلا پھاڑ پھاڑ کر گا رہے تھے۔ چلو ہے ناگوری — جوبل پائے گوری وھائے —
تینوں بہت زخمی ہوئے تھے لیکن بے حد بشاش تھے۔ دن بھر وہ پڑے پڑے دُنیا بھر کے گانے گایا کرتے — اپٹا کے گیت۔ بنگالی کورس۔ راجستھانی اور گجراتی لوک گیت۔ فلمی گانے — لڑکیاں پہنچ گئیں تو اب دن بھر رمی کھیلی جاتی۔ شنکر کے چاچا نے حکم دے رکھا تھا کہ روزانہ اخبار ان لوگوں کے قریب نہ آنے پائے۔ ریڈیو کی خبریں ان کے کان میں نہ پڑیں۔ بڑے اہتمام سے کوئی لڑکی رات کو اخبار اسمگل کر لاتی۔ گوتم روز خبروں کے ساتھ ساتھ اپنے مستقبل کے پروگرام بدلتا رہتا — اس کے بائیں ہاتھ کی انگلیوں پر ابھی پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ "پتہ نہیں میں اپنی یہ تین انگلیاں استعمال کر سکوں گا یا نہیں۔" وہ بعض دفعہ اُداسی سے کہتا۔ "چمپا۔" ایک روز اس نے چلّا کر کہا — "ذرا سوچ سکتی ہو کہ اب میں پیانو کبھی نہیں بجا سکوں گا۔"

"کیوں نہیں بجا سکو گے یار مور بڑ نہ بنو۔ کیا ڈراما کھیل رہے ہو۔" کمال نے کہا اس کی اپنی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔

"اب بہر حال۔ کیا ہو سکتا ہے۔"

جب وہ تینوں چلنے پھرنے کے لائق ہوئے تو واپسی کی تیاری شروع ہوئی۔

"چلو پہلے ذرا آوارہ گردی کریں۔ جانے ادھر پھر کب آنا ہو۔" کمال نے کہا۔ کمال کو اب چپ لگ گئی تھی۔ وہ بیٹھے بیٹھے بالکل مراقبے میں چلا جاتا۔ مگر گوتم کو مور بڑ نہ بننے کی نصیحت کرتا۔

"ہم کو یہاں کے دیہات کے حالات دیکھنے چاہئیں — ہم مرتاپور بھی جائیں گے۔ جو ہماری کمرن کا گھر ہے۔"

"مرجاپور میں اور ن ٹھوزن کا شی ہما رو گھاٹ —" گوتم نے ہنس کر چمپا کو دیکھا وہ اُداسی سے مسکرائی۔

یہ علاقہ بڑا دلفریب تھا۔ سرسبز اور پُرسکون۔ یہاں کے لوگ بے حد دلکش تھے۔

معصوم اور پُر امن۔ رام دیا اور رام اوتار اور رکدیر اور رگمرن کا دیس۔ یہاں چاروں طرف جولاہوں اور ٹھاکروں کی بستیاں تھیں اور قصبات میں زمینداروں کی حویلیاں اور شہروں میں پیلے رنگ کی اُداس کوٹھیاں جن میں مرنجاں مرنج ڈپٹی کلکٹر رہتے تھے۔

وہ چھوٹی لائن کی ایک ٹرین پر سوار ہو گئے۔ برج مان گنج اسٹیشن پر گاڑی رُکی۔ یہاں ہری شنکر کی موسی ڈھیروں پھل پھلاری اور ناشتے کے انبار لے کر پلیٹ فارم پر موجود تھیں۔

"یہاں سے ذرا آگے کپل وستو ہے۔ چلو وہاں ہوتے آئیں —" چمپا نے تجویز کیا۔

"یہ ایک زمانے میں بدھسٹ تھا بڑی بھاری۔" کمال نے اُداسی سے کہا۔

"کہاں جنگلوں میں ماری ماری پھرو گی چمپا بیگم —" گوتم نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بہوت لمبا سفر با ٹے —" شنکر کی موسی نے کہا۔ "یہاں موٹر وٹر نہیں ملت ہے۔"

وہ خود بہلی پر آئی تھیں۔ یہاں صرف ہاتھی سواری کے لئے ملتے تھے۔ ترائی کے ہاتھی — وہ ہاتھیوں پر بیٹھ کر کپل وستو پہنچے۔ گاؤں والے ان کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

دُور ہمالیہ کی گلابی چوٹیاں دھوپ میں جھلملا رہی تھیں۔ چاروں اور سُرخ چھتوں والے مکان تھے اور آم کے باغ اور بانس کے جھنڈ۔

کپل وستو کے کھنڈروں میں پہنچ کر چمپا نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ کمال بڑی تندہی سے ایک پتھر کو رومال سے صاف کرنے لگا۔ اس پر لکھا تھا:

"مہاراجہ پیا داس نے اپنے جلوس کے اکیسویں سال بہ نفسِ نفیس یہاں آ کر عبادت کی۔ کیونکہ اس جگہ بدھ شاکیہ منی پیدا ہوا تھا۔ کیونکہ یہاں بدھ نے جنم لیا۔ اس وجہ سے اس گاؤں کی مالگذاری معاف کی جاتی ہے —"

اب یہاں وہ کنول کے تالاب اور سنہرے ہرنوں کی ڈاریں اور درختوں کے کُنج اور چنبیلی

کے پھولوں سے گھری ہوئی بارہ دریاں کہاں ہیں — چمپا نے اپنے آپ سے پوچھا۔ وہ ان سب سے ذرا الگ ایک پتھر پر بیٹھی تھی۔ یہاں تو ویرانہ ہے اور یہاں گیدڑ راتوں کو چلاتے ہیں۔ یہاں فصیل کی ٹوٹی پھوٹی دیواریں تھیں اور مٹی کے ٹیلے، اور شکستہ چوکور تالاب۔ مہارانی مایا دیوی کے محلات سُرخ اینٹوں کے ایک بڑے سے ڈھیر کی شکل میں چاندنی میں نظر آ رہے تھے۔ قریب روہنی ندی اس سکون سے گنگناتی ہوئی بہہ رہی تھی۔ گویا کوئی بات ہی نہیں۔

"یار بڑا سناٹا ہے۔" کمال نے یکلخت گھبرا کر کہا۔

"بڑا شدید سناٹا ہے۔" ہری شنکر نے جواب دیا "چلو اب واپس چلیں۔ ہاتھی ہمارے منتظر ہیں۔"

گوتم نے کیمرہ اتار کر ہاتھ میں لے لیا۔ "دن کا وقت ہوتا تو تصویریں ہی کھینچتا۔" اُس نے اور زیادہ بور ہو کر کہا۔

کمال مُنہ لٹکائے بیٹھا رہا۔

"شنکر یار تاریخ بڑا زبردست فراڈ ہے — تاریخ ہمیں بار بار دھوکہ دیتی ہے۔" اُس نے کہا۔

"ہاں۔ ٹھیک کہتے ہو۔" شنکر نے حسبِ معمول اس کی رائے سے اتفاق کیا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہاتھیوں کی طرف کو آئے۔ ان کے سائے چاندنی میں مہارانی مایا دیوی کے محل کے کھنڈروں پر سے گزرتے بڑے عجیب لگے۔

۵۵

واپسی میں چمپا بنارس اتر گئی۔ کینٹونمنٹ کے اسٹیشن پر پہنچ کر اس نے ساتھیوں کو خدا حافظ کہا اور تانگے میں بیٹھ کر گھر کی سمت روانہ ہوئی۔ دُرگا پوجا اور رام لیلا کا ہنگامہ شروع ہو چکا تھا۔ اُس نے اپنے شہر پر نظر ڈالی۔ تپلیشور — اُس نے کہا — ابدی کاشی — کاشی مجھے اپنی پناہ میں رکھ۔

اپنے محلے میں پہنچ کر اسے دُور سے اپنے گھر کا چھوٹا سا پھاٹک دکھائی دیا۔ گلابی جاڑوں کی رات تھی۔ اس کے مکان میں روشنی ہو رہی تھی۔ جس طرح اندھیرے سمندر میں جہاز روشن ہوتا ہے۔ وہ اندر پہنچی۔ ایک رشتے کی بہن کی شادی کا ہنگامہ تھا۔ چو طرفہ غُل مچ رہا تھا۔ دالان میں روئی کے پردے چھُٹے تھے۔ اندر تخت پر میراثنیں چڑھی بیٹھی تھیں۔ وہ جا کر ایک نیم تاریک صحنچی میں کھرّے پلنگ پر لیٹ گئی جس کی پائنتی کسی مہمان بی بی کا بچہ دلائی میں لپٹا بے خبر سو رہا تھا۔ دالان میں سے بوا حسین باندی کی بالٹ دار آواز بلند ہو رہی تھی

اُس نے کہا تو کون ہے —
میں نے کہا شیدا ترا
اُس نے کہا کرتا ہے کیا
میں نے کہا سودا ترا

آنگن کی دیوار پر عورتوں کے چلتے پھرتے سائے لرزاں رہے۔ کسی نے زور سے آفتابہ چوکی پر رکھا۔ صحنچی میں کوئی بچّی سوتے میں روئی۔

میراثنوں نے گایا —
اُس نے کہا کرتا ہے کیا
میں نے کہا سودا ترا

ان کی آواز بہت سے بے معنی الفاظ دُہراتی رہی۔ پھر ایک نوجوان میراثن نے گانا شروع کیا — اٹریا پہ چور بھوجی دیا تو جلاؤ — پھر سمدھنوں کی گالیاں شروع ہوئیں اس کے بعد سوہا گایا گیا۔ وہ آنکھیں بند کیے یہ ساری آوازیں سُنتی رہی۔ باورچی خانے میں تیل کا چراغ جل رہا تھا۔ چاروں طرف دھوئیں کی کالونچ تھی اور بگھار کی مہک۔

گھر — گھر — اپنا گھر —

پھر رات کا سناٹا چھایا۔ اور ایک بیل گاڑی کھڑکی کے نیچے سڑک پر چرخ چوں کرتی گزری۔ اس کے پہیوں سے وہ عجیب و غریب مع خراش آواز نکل رہی تھی۔ اسے یاد۔

آیا۔ بچپن میں جب وہ گنگا پار اپنے نانا کے گاؤں شمیم پور جایا کرتی تھی تو ایک مرتبہ رکّو کو لن
تھری نے کہا تھا۔ جانو جتنے ای گاڑی ما سے ای آواز نکلی جانو بھوانی خفا ہوئیں ۔۔۔
بُرا شگون ہو ۔۔۔ بہتے برا شگون ۔۔۔

دفعتاً اس کا دل دھڑکنے لگا۔ کیا ہوگا۔ کیا ہونے والا ہے اور اس کے منطقی وجود نے اسے سمجھایا۔ کچھ نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب ایسا بھی اندھیر نہیں مچا ہے کہ ۔۔۔ مگر کمال کی انالسس تو یہ ہے ۔۔۔ اونہہ کمال کو مارو گولی ۔۔۔ کیا اسی کی انالسس صحیح ترین ہے ۔۔۔ اور یہ کمیونسٹ کیا کہتے ہیں ۔۔۔ ہونہہ ان کی بھلی چلائی ۔۔۔ سوچتے سوچتے گوتم نیلمبر کا فلسفہ، کمال کا جوش و خروش، طلعت کی تیز گفتاری، تہمینہ کی پرسکون شخصیت سب ایک ایک کر کے اس کے ذہن میں آئیں اور وہ خود کون تھی۔ کیا تھی۔ اس کو لوگ کیا سمجھتے تھے۔ گوتم اسے کیا سمجھتا تھا۔ گوتم کی رائے اس قدر عزیز کیوں ہے۔ جہنم میں گیا وہ ۔۔۔ اور عامر رضا ۔۔۔ عامر رضا ۔۔۔

اگلی صبح کو وہ دن چڑھے تک سوتی رہی۔

دن گزرتے گئے۔ سروپ نکھا کی ناک کٹی۔ راون جلا۔ بھرت ملاپ ہوا۔ دبلے پتلے لڑکے منہ پر سیندور، خانہ اور سفیدہ پوتے، پنی کے نقلی تاج پہنے رام اور لچھمن بنے بڑی تمکنت کے ساتھ تخت رواں پر سوار ہوئے۔ انسانوں کو ان میں خدا کا جلوہ نظر آیا۔ چھٹیاں ختم ہونے پر وہ لکھنؤ واپس آگئی۔ زندگی جاری رہی۔ پھر کوار کے مہینے میں اماوس کی کالی راتوں کو دیپ مالیکا نے روشن کر دیا۔ چھوٹی اور بڑی دیوالی منائی گئی۔ گھر گھر لکشمی کی تقدیس کی گئی۔ آج تو ناچاری کی عملداری ہے۔ گلفشاں کے برآمدے میں خالہ بیگم نے اظہار خیال کیا۔ بچو۔ باہر مارے مارے مت پھرو۔ آج کی رات جانے کتنے جادو ٹونے ہوں گے سامنے چورا ہے پر ایک دونے میں مٹھائی رکھی تھی اور چراغ جل رہا تھا۔ جانے کون وہاں رکھ گیا تھا۔ یاد ہے ایک مرتبہ جادو کی ہنڈیا اڑتی ہوئی آئی تھی اور ہمارے احاطے میں گری تھی۔ طلعت نے کہا۔ وہ گھاس پر آ کر آسمان کو دیکھنے لگے۔ "آج کی رات لکشمی اپنی سواری کے الّو پر بیٹھی ساری دنیا پر پرواز کرتی پھر رہی ہے۔ جانے وہ کس کس کے

دروازے میں داخل ہو گی۔

"باہر گھاس پر مت جانا بچو ——" خالہ بیگم نے پھر آواز لگائی "برسات کا سانپ دیوالی کا دیا چاٹ کر بلوں میں جاتا ہے۔"

جگہ جگہ چوراہوں اور گلیوں میں جوا ہوا۔ رام اوتار اور قدیر جوا کھیلنے گئے۔ (لارنے اگر آج جوا نہ کھیلا تو اگلے جنم میں چھچھوندر کی جون ملے گی —— رام اوتار نے کہا) پھر بھیا دوج کا تہوار آیا۔ ہری شنکر قالین پر چڑھا بیٹھا تھا اور نرملا اس کے ماتھے پر تلک لگا کر اس کے سامنے مٹھائی پروس رہی تھی۔ گنگا کے بھائی یم کی طرح میرا بھیا امر رہے اس نے منتر دہرایا۔ پھر اگہن اور پوس کے پالے نے درختوں پر چاندی کے پتر چڑھا دیئے گاؤں میں نوٹنکیوں کے گیت گونجے۔ چوپالوں میں مہابھارت کے قصے دہرائے گئے۔ سفید انگی ساریاں پہنے عیسائی عورتیں گاتی پھریں —— او ہو مسیح آیا سرِ آسمان —— سرِ آسمان سرِ آسمان —— کھچڑی کا تہوار آیا تو لوگ ماگھ میلا نہانے تربینی چلے —— بسنت پنچمی میں گھر گھر سرسوتی پوجا کی گئی۔ انسانوں نے اپنے تخیل میں دیکھا کہ گورے رنگ کی دیبی سفید ساری پہنے سفید کنول پر بیٹھی شفاف اودی پانیوں پر تیر رہی ہے۔ کمہاروں کے ہاتھ کی بنائی ہوئی مٹی کی مورت میں بھی انھیں خدا کا جلوہ نظر آیا۔ پھر پھاگن کی رُت آئی۔ شوراتری کی تیاریاں کی گئیں۔ نرملا نے سنگھاڑے والی کوٹھی کے ٹھاکر دوارے میں ملوا کی پتیاں دھتورہ اور چاول تھالی میں رکھ کر شو کی آرتی اتاری

محرم کا ہنگامہ ہوا۔ گھر گھر گھاس اور موم اور کاغذ کے تعزیے تیار کیے گئے۔ انسانوں نے اپنی ساری صناعی ان پر ختم کر دی۔ ان کاغذ اور پنی اور ریشم کے گہواروں تابوتوں اور تعزیوں میں بھی انھیں خدا کا جلوہ نظر آیا۔ امام باڑوں میں چراغاں ہوا۔ گلی کوچوں سے پیلو اور سوہنی اور درگا میں نوحہ خوانی کی آوازیں بلند ہوئیں۔ ساری فضا نے غم کا لبادہ اوڑھ لیا۔ ہر شخص حسینؑ کا سوگوار بنا (سبطین آباد کے امام باڑے میں آٹھویں کی مجلس کے بعد ایک عیسائی فقیرنی نے چمپا کا دامن پکڑ کر کہا۔ بٹیا —— مولا

کے نام پر ایک ڈبل دیتی جائیے) شاہ نجف کے امام باڑے میں چراغاں کے روز حسب معمول برقی قمقموں سے بنے ہوئے حروف میں "ہز میجسٹی کنگ غازی الدین حیدر" کا نام جگمگایا۔ مارچ کے مہینے میں ساری فضا گلال اور عبیر سے سُرخ ہو گئی۔ کرشنا کی مورتی کو جھولوں میں بٹھایا گیا۔ صبح صبح بون فائر میں راکھشسی ہولکا جلی۔ ہلیارے سڑکوں پر کبیر گاتے پھرے۔

یہ سب دماغ کا دھوکہ تھا۔ ذہن کا فریب۔ نظر کا بہلاوا۔ کسی چیز کے کوئی معنی نہیں تھے۔ صرف ذاتی مسرت اصل چیز تھی۔ جہاں ملے جس قیمت پر ملے۔ ذاتی مسرت حاصل کرو۔ تمہارے اصُول، تمہاری جیل یاترائیں، تمہاری کانگریس، تمہاری مسلم لیگ سب بکواس ہے۔ تم لوگ جو انسانیت کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے چلے ہو۔ مارا ماری میں انسانوں کا منوں خون بہہ گیا۔ نہیں مجھے صرف ذاتی مسرت چاہیے۔ گھر۔ سکوُن۔ بچے۔ شوہر کی محبت۔

تم کیا افسوسناک باتیں سوچ رہی ہو چمپا بیگم۔ شرم کرو۔ شرم کرو۔ اس کے منطقی وجود نے جو کھڑکی میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا پلٹ کر اس سے کہا۔ شرم کرو۔ شرم کرو۔ فضاؤں میں آواز بازگشت گونجی۔ بھادوں کے جھالے اسے یہی سناتے ہوئے معلوم ہوئے۔ سیاہ بادلوں نے چاروں اور سے بڑھ کر اسے اپنے میں سمیٹ لیا۔ اس قدر زبردست ریلا آیا کہ زمین آسمان ایک ہوئے ندی نالے جل سے بھر گئے۔ گوڑ ملہار کی تانوں میں دُنیا بھر کا درد سمٹ آیا۔ پروائی کے جھونکوں نے دل کو کاٹ کاٹ ڈالا۔

وہ درختوں کی ٹہنیاں سامنے سے ہٹاتی سڑک پر آگئی۔ سامنے پروفیسر بنرجی کی کوٹھی تھی۔ ان کے ڈرائینگ روم میں بہت بڑا مجمع تھا۔ آج کے دن دنیا میں بڑے اہم فیصلے ہوئے تھے (یہ لوگ فیصلے کرتے وقت میرے متعلق کیوں نہیں سوچتے میں، چمپا احمد، جو یہاں تنہا کھڑی ہوں) ڈرائینگ روم کے پردوں کے پیچھے وہ سب موجود تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چنبیلی کی بھیگی جھاڑیوں میں سے گزرتی

دریچے کے نیچے آکر کھڑی ہو گئی۔ اور اس نے اندر جھانکا۔ پروفیسر سفید دھوتی اور کرتے میں ملبوس سیٹی پر چپ چاپ بیٹھے تھے۔ گوتم بھی تھا اور کمال بھی۔ گوتم نئے ہندوستانی سفارت خانے کے ساتھ ماسکو جا رہا تھا۔ کمال فلیٹ اسٹریٹ میں پاکستان کے نظریے کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کے لئے لندن بھیجا جا رہا تھا کہ آج معلوم ہوا کہ پاکستان کا مطالبہ منظور کر لیا گیا۔ ملازمت پیشہ لوگ اب اس فکر میں غلطاں پیچاں بیٹھے ہیں کہ اپنی نوکریاں کہاں منتقل کروائیں۔ یہاں رہے تو نقصان ہے

"ان کا خیال ٹھیک بھی ہے۔" گوتم کہہ رہا تھا "پاکستان مسلمانوں کا اقتصادی مسئلہ حل کرنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ تمہارے بابا کا کیا ارادہ ہے۔"

"بابا کیسے جا سکتے ہیں زمینداری نہیں چلی جائے گی ساتھ۔ بھیا صاحب نے البتہ اوپٹ کر دیا ہے۔" کمال نے جواب دیا۔

دلی۔ شملہ۔ نمبر ۱۰ اورنگ زیب روڈ۔ وائسریگل لاج۔ بھنگی کولونی۔ یہ الفاظ اس کے کانوں میں آتے رہے۔ وہ دریچے سے ہٹ آئی۔ اور چلتی ہوئی پھر سڑک پر آگئی۔

اب اس کے سامنے دو دنیائیں تھیں۔

ایک طرف یہ لوگ تھے۔ ان کے دل و دماغ۔ ان کے تصورات۔ ان کی جدوجہد مگر یہاں مستقبل بے حد مبہم تھا۔ دوسری طرف سکون تھا اور حفاظت۔ ذاتی مسرت۔ عامر رضا پاکستان جا رہے تھے۔ کیوں نہ جائیں آخر۔ وہ کمال کی طرح سر پھرے تھوڑا ہی ہیں۔ یہاں ان کا مستقبل کیا ہے۔ نئے ملک میں وہ ترقی کر کے کہیں سے کہیں جا پہنچیں گے۔ ذاتی مسرت۔ ذاتی ترقی۔ ذاتی مفاد۔ آخر کیوں نہیں۔ سیاست ہی تو ساری زندگی نہیں۔ دوسروں کے لئے میں کیوں سوچوں۔ دوسروں نے مجھے اب تک کیا دیا۔ چنانچہ — اس نے تفصیل سے سوچنا شروع کیا — میں عامر رضا سے شادی کر کے پاکستان چلی جاؤں گی — کتنی آسان بات ہے۔ یکلخت ایسا لگا جیسے ہلڑ ختم

ہو گیا۔ سکون سارے میں چھا گیا۔ اس نے تصور میں اپنا نام پڑھا — بیگم عامر رضا۔ کراچی — واہ بھئی۔ مگر یہ لوگ کمبخت بہت یاد آئیں گے۔ پر اب انسان کو دنیا میں ہر چیز تو حاصل نہیں ہو سکتی۔ تم کیک لو بھی اور اسے کھاؤ بھی۔ ناممکن ہے۔ وہ شاہی پھاٹک تک پہنچ گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے گوتم آ رہا تھا۔

"چمپا باجی، خدا حافظ۔" اس نے کہا۔

"جاتے ہو ماسکو۔"

"ہاں۔"

"کمال کا کیا ہوا۔"

"وہ جا تو رہا ہے۔ جولائی میں چلا جائے گا۔ طلعت اور نرملا بھی جا رہی ہیں۔ ان سب کو کیمبرج میں داخلہ مل گیا ہے۔"

"بہت خوب۔"

"آپ بھی کیوں نہیں باہر چلی جاتیں۔ چمپا باجی۔ یہاں بیکار اپنا وقت گنوا رہی ہیں یا اگر شادی کر رہی ہوں تو دوسری بات ہے — مجھے یقین ہے کہ آپ پاکستان چلی جائیں گی۔"

وہ بادشاہ باغ کے پھاٹک کے پرانے کھمبوں سے پیٹھ ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔ گوتم اس کے سامنے موجود تھا لیکن وہ بالکل تنہا تھی۔ "آخر تم بتلاتے کیوں نہیں مجھے کیا کرنا چاہیے۔" اس نے تقریباً چیخ کر کہا۔

"آپ کس سلسلے میں مجھ سے رائے لے رہی ہیں۔ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ کون کس کو رائے دے گا۔ کون کس کا ناصح بن سکتا ہے۔ میں کمینہ نہیں ہوں چمپا باجی۔ محض حقیقت پرست ہوں۔"

"تمہارے پاس میرے لئے صرف یہی الفاظ ہیں —؟"

"آپ تو الفاظ ہی کے معنی نہیں دیکھنا چاہتیں۔ اس لئے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں جو بھی کہوں وہ بے معنی ہوگا۔ خدا حافظ۔ گلفشاں جائیے تو آپا کو بتا دیجئے گا۔ میں صبح دلی

روانہ ہو رہا ہوں۔" وہ آگے چلا گیا۔

طلعت اور نرملا باتیں کرتی قریب سے گزریں۔

"دل نہیں مانتا۔ ملک کو اس حالت میں چھوڑ کر ہم انگلستان بھاگ جائیں۔ حالانکہ تعلیم بھی بڑی سخت ضروری چیز ہے — گو یہ بہت سخت بورژوا موقع پرستی ہوئی نا —" طلعت کہہ رہی تھی۔

"بالکل۔ حالانکہ کیمبرج میں اتنی مشکل سے داخلہ ملتا ہے۔ اگر اب نہ گئے تو سمجھو کئی سال برباد گئے۔" نرملا نے جواب دیا

"ہاں یہ بھی ٹھیک کہتی ہو —" وہ دونوں بھی اسے ہلو کہتی ہوئی آگے بڑھ گئیں اب کمال قریب سے گزرا۔

"چمپا باجی۔ مبارک ہو۔ تمہارا پاکستان بن گیا۔" اس کے لہجے میں جس قدر تلخی، نفرت اور شکستہ دلی چھپی تھی۔ اس کا احساس کر کے چمپا لرز اٹھی۔ اس کا خیال تھا کہ اب کمال ایک اور تقریر کرے گا۔ اسے برا بھلا کہے گا۔ مگر یہ کیا ہوا کہ کمال اب بالکل خاموش تھا۔ گویا اب مزید کچھ کہنے سننے خفا ہونے، بحث کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔ باتوں کا دور ختم ہوا۔ اب ایک حقیقی دنیا سامنے تھی۔ فیصلے اور عمل کی منتظر۔ کمال ایک لحظے کے لیے خاموش کھڑا پھاٹک کو دیکھتا رہا جس کے ایک اندھیرے طاقچے میں چوکیدار کی لالٹین جل رہی تھی اس کے بعد وہ بھی چپ چاپ آگے چلا گیا۔

وہ اکیلی وہاں پھولوں کی نیم تاریکی میں کھڑی رہی۔ یہ سب اس کا ساتھ چھوڑ کر اپنے اپنے راستے پر چلے گئے۔

وہ پھاٹک سے نکل کر سڑک پر آگئی۔ سارے میں سناٹا چھایا تھا۔ مکانوں اور درختوں کے پرے گلفشاں میں روشنیاں جل رہی تھیں۔ گلفشاں جو اس کے لیے اجنبی تھی۔ مگر اس میں وہ موجود تھا۔ وہ جو اس کا ہاتھ تھامے گا۔ وہ اس کے راستے پر چلے گی۔ آخر زندگی میں رومان اور محبت اور گلاب کے شگوفوں کا وجود ہے کہ نہیں انسان کہاں تک محض سایوں کا تعاقب کرے۔ وہ اس سے کہے گی۔ لو بھئی میں یہاں ہوں

ہنگامے ختم ہوئے۔ اب سکون اور آرام کا وقت ہے۔ ان لوگوں کو جدوجہد اور مصائب کی وادی میں دیوانوں کی طرح اپنے بال نوچنے اور خاک چھاننے دو۔ ایک وقت آئے گا جب یہ بھی تھک جائیں گے اور منہ لٹکا کر اپنی جائے پناہ تلاش کریں گے۔ لو میں آن پہنچی خالص رومان کا مطلب میں پوری طرح نہیں سمجھ پائی۔ جس کے تم سمبل ہو (یہاں ہر چیز کا سمبل موجود ہے۔ ان لوگوں نے سمبلز میں ساری زندگی کو تقسیم کر دیا تھا) مگر اب میں تمہاری اور آتی ہوں۔

پھاٹک پر اسے رام اوتار ملا۔

"بھیا صاحب ہیں ـــــ ؟" اس نے دفعتاً محسوس کیا کہ اس کی آواز کانپ رہی ہے وہ چوروں کی مانند خوفزدہ ہے۔ وہ گلفشاں میں سیندھ لگانے آئی ہے۔

"بھیا صاحب تو ابھی ابھی چلے گئے۔"

"کہاں ۔ ۔"

اب اندھیرے میں سے نکل کر گنگا دین بھی سامنے آ گیا۔

"کہاں چلے گئے بھیا صاحب ـــــ ؟" چمپا نے دہرایا

"وہیں ـــــ" رام اوتار نے تلخی سے جواب دیا۔ "مسلمانوں کے پاکستان۔ اب آپ بھی چلی جائیے گا ـــــ سب جنے چلے جائیں گے۔ ہم یہاں اکیلے رہ جئیں ـــــ"

گنگا دین، رام اوتار کے قریب آ گیا۔ وہ بڑا پڑھا لکھا آدمی تھا اور روز ہندی اخبارات کا مطالعہ کرتا تھا۔ بھیا صاحب بڑے بے وپھا نکلے۔ چمپا بٹیا کو چھوڑ کر چلے گئے جیسے سے۔ انھوں نے ہمیں بھی چھوڑ دیا۔ بھیا صاحب نے گنگا دین سے دغا کی ـــــ بڑی بے وپھا بے مروت قوم ہے ـــــ اسے صبح کا ہندی اخبار کا اڈیٹوریل یاد آیا جس میں مسلمانوں کو غدار بتایا گیا تھا ـــــ

"بھیا صاحب لمبئی گئے ہیں۔ ہُواں جہاجن[1] کا بٹوارہ ہوت ہے اپنے مسلمانی جہاج

[1] جہاز وں

لے کر کراچی چلے جہئیں — کدیر تباوت رہے —" رام اوتار نے اطلاع دی۔
"ہو — لا — لا — لا — لا —" اس نے طوطوں کو اڑانے کے لئے پھلوں کے درختوں پر ایک پتھر پھینکا۔

گنگا دین اور رام اوتار کو اپنی اپنی سوچ میں ڈوبا چھوڑ کر وہ واپس لوٹی۔ بھیا صاحب چلے گئے کیونکہ گھوڑوں اور تیز رفتار موٹروں اور لڑکیوں کے علاوہ اب ان کی زندگی میں ایک نئی دلچسپی پیدا ہو چکی تھی۔ نیا ملک۔ نیا عہدہ۔ ترقی۔ نئے مسائل۔ مردوں کی دُنیا بالکل علیحدہ ہوتی ہیں۔

"اس آدمی کے لئے میں نے اتنا وقت برباد کیا —؟ ارے میں کتنی مُورکھ تھی۔"

پھر اُسے احساس ہوا۔ ساری بات یہ تھی کہ بھیا صاحب بے حد خوبصورت تھے۔ اور اس نے بھیا صاحب کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارا تھا۔ یادوں کے خزانے میں ایسے وقت کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ لیکن مجھے ان سے محبت نہیں تھی۔ ہرگز نہیں — سامنے ان کی سابقہ کائنات پھیلی ہوئی تھی۔ گلفشاں کا لان جس کے سرے پر یوکلپٹس کے درخت کھڑے تھے۔ ان کے مصاحبین کمال۔ گنگا دین۔ ان کا خاندان۔ ان کی کزن تہمینہ جو اندر بیٹھی ہوگی — وہ بھی ان پر جان دیتی تھی۔ بھیا صاحب خوبصورت تھے اور مغرور۔ ان کو غرور جلنے کا ہے کا تھا۔ چمپا کو سوچ کر ہنسی آگئی۔ اس کا جی چاہا خوب زوروں کا قہقہہ لگائے۔ انسانوں کو آخر غرور ہوتا کس بات پر ہے — اپنی شخصیت پر —؟ شخصیت —؟ گوتم نیلمبر اپنے ذہن پر نازاں ہے۔ کمال کو اپنی اُصول پرستی کا زُعم ہے — تہمینہ اپنے انکسار اور مزاج کی نرمی پر فخر کرتی ہے۔ لوگ اس قدر خود پرست کیوں ہیں۔ چمپا نے چلتے چلتے آسمان کی طرف دیکھا۔ بارش آ رہی ہے۔ ہواؤں میں آزادی تھی۔ پتیوں کی سرسراہٹ میں عجیب قسم کی طمانیت پنہاں تھی۔ محض میں ہی یہ محسوس کر رہی ہوں یا اور لوگ بھی اس آزادی کا احساس کر سکتے ہیں۔ مثلاً تہمینہ — اور — گوتم جو اپنے کزن کی بیوی شانتا پر عاشق ہے —

"ہا۔ ہا — ہاؤ فنی — اس نے دل میں کہا۔

پھر اُس نے بے تحاشا بھاگنا شروع کیا۔ وسیع بھیگی خوشبودار زمین چاروں طرف پھیلی تھی۔ باغوں کے گیلے راستے۔ جن کے دونوں طرف اُونچی باڑیں تھیں۔ روشیں — گھاس جس پر سُرخ بیر بہوٹیاں چل رہی تھیں۔ آم کے درختوں پر اودے گھرے بادل جھکے تھے۔ زمین میں سے نمی اور خوشبو کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں۔ شفاف پانی کے برساتی نالے کے برابر جو پگڈنڈی ایسی بن گئی تھی۔ اسے الانگ کر وہ برسوں دوسری لڑکیوں کے ساتھ یونیورسٹی جاتی رہی تھی۔ سامنے مولسری والی سڑک پر سے گزرتے اب بھی لڑکیوں کے پرے ہوسٹل کی طرف جا رہے تھے۔ گلفشاں کے احاطے کا چکر کاٹ کر وہ پچھواڑے والی سڑک پر آ گئی۔ جدھر سے ایک کچا راستہ سنگھاڑے والی کوٹھی اور ندی کی سمت جاتا تھا۔ سامنے سرکنڈے کی ٹٹی لگی تھی۔ چاروں اور پھولوں کی بیلیں جھکی ہوئی تھیں۔ ہرے طوطے شور مچا رہے تھے ہر چیز دہی تھی۔ سامنے لوکی کی بیل میں سے اسے قمرن کا آنچل نظر آیا۔

”کا بات ہے بٹیا —“ قمرن نے دفعتاً سامنے آکر پوچھا

”کچھ نہیں دریبر کی بی بی —“ اُس نے کہا۔

قمرن چپ کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

”ہم یہاں بیٹھ جائیں دریبر کی بی بی —“

”جی ہاں۔ آئیے۔ ضرور بیٹھئے — بارش آ رہی ہے بٹیا۔ او سارے میں آجائیے —“

وہ شاگرد پیشے کے برآمدے میں آ گئی۔ برآمدے کا فرش خنک تھا۔ منڈیر پر برتن رکھے جگر جگر کر رہے تھے۔ دیوار پر قدیر کی گول کالی ٹوپی کھونٹی پر ٹنگی تھی۔ چادر پر پاپڑ پھیلے تھے۔

”پاپڑ سکھائے خاطر تنکو گھام اُو نہیں ملت ہے —“ قمرن نے بات شروع کی۔ اسے معلوم تھا۔ کوئی بات ضرور ہے۔ اندر کوٹھی میں بھی سناٹا تھا۔ ”بٹیا آپ لوگ منی کی طبیعت نہیں جانت ہیں — ہم پچھ تو ای جانت ہن کی منی جتنے خوش رہت ہے جب برابر اُو کی ٹہل کئے جاؤ — اُو کے لئے اپنی زندگی تج ڈالو — ویسے ای لوگ

کہئے خوش ناہیں ہووت ہیں۔ ہم تہمینہ بٹیا کو کیسے سمجھائی کہ لڑکین کا اپنی اوکات پہچانے کا چاہی۔ وہ بھیا صاحب سے بگڑ گئی رہن۔ تو وہ ان سے ایک ٹھو بات کیے بغیر ہی پاکستان چلے گئے۔ اب بٹیا صاحب روووت ہیں۔"

چمپا خاموش رہی۔

"لڑکی کی کا اوکات ہے۔" قمرن اداسی سے کہتی رہی۔ "مہارانی بن جائے تب بھی مئی کی نوکر۔ تمہاری بن جائے تب بھی اور جب بڑھوتی کے جمانے میں بہو بیاہ کر لائے اوکی دھونس الگ سہے ـــــ کا آپ ہو بلائیت جا رہی ہیں ـــــ ؟"

"ہاں شاید۔"

"اچھا ہے بٹیا۔ مل اگر ان کو چاہت ہیں جی کا چین ان کا چھوڑ کر بھی نہ ملیہے۔"

"بھیا صاحب نہ سہی کوئی اور سہی۔ سب مئی ایک سے تھوڑا ہی ہووت ہیں۔ دیر بہر کی بی بی ـــــ" چمپا نے ذرا گھبرا کر کہا۔ پروائی کا ایک جھونکا آیا۔ بارش کے قطرے ٹپ ٹپ چھپرپہ برس گئے۔

"سب مئی ایک سے ہوت ہیں بٹیا ـــــ" قمرن نے کہا۔ "پان بنائی ـــــ ؟"

"نہیں قمرن رہنے دیو ـــــ اب ہم ہو چلبا ـــــ" چمپا پیڑھی پر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور چھتری سنبھال کر پگڈنڈی پر سے گزرتی درختوں میں غائب ہو گئی۔

قمرن چھپر میں سے باہر آ کر اداسی سے اسے دیکھتی رہی۔ "ای بٹیاون بات کاہے نہیں سمجھ پاوت ہیں ـــــ" اس نے چھٹکی رام دیا سے کہا۔

"بٹیاون میں ہمت نہیں۔ ڈرت ہیں۔ سمجھت ہیں تھوڑا سا انگریجی پڑھ لیہین تو دنیا جان گئیں۔ بٹیاون میں ہمت نہیں ـــــ" چھٹکی نے سر ہلا کر کہا۔

۵۶

طلعت نان پورہ اٹھا کر برآمدے میں آن بیٹھی۔ اس نے "اب کے ساون گھر آجا" الاپنا چاہا۔ مگر آواز اس کے حلق میں اٹک گئی۔ تہمینہ کمرے میں بیٹھی مشین پر بلاوز سی رہی

تھی۔ بارش بند ہو جانے سے ایک دم حبس طاری ہو گیا۔ طلعت اٹھ کر کمرے میں آ گئی۔

بھیا صاحب کو گئے کئی دن گزر چکے تھے۔ اب وہ کراچی میں ہوں گے۔ ایسا لگتا تھا گویا وہ کبھی یہاں تھے ہی نہیں۔ یہ بالکل صحیح تھا کہ اس ہماری دُنیا میں ان کی کوئی جگہ نہ تھی۔ وہ پاکستان نہ جاتے تو اور کہاں جاتے۔ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست ــــ طلعت نے سوچا۔ ان کا جانا بالکل لوجیکل تھا۔ ان کے جانے سے گویا پہلا ایکٹ اپنی تکمیل کو پہنچا۔ وہ بھلا کیا کھا کر ہمارے ساتھ ہمارے طوفانوں کا مقابلہ کرتے۔ بھگوڑے کہیں کے ــــ وہ تہمینہ کی مدد کے لیے مشین کا ہینڈل گھمانے لگی: "چمپا باجی نے بڑے خوبصورت کُشن پیس خریدے ہیں۔" اس نے محض کچھ بات کرنے کی خاطر کہا۔

تہمینہ نے سر اٹھا کر اسے اس طرح دیکھا گویا وہ بڑی پُراسرار ہستی تھی۔ پنکھا گھوں گھوں کرتا چلتا رہا۔ باہر درختوں میں ایک کوئل مستقل کو اُو ــــ کُو اُو کیے جا رہی تھی۔ بہت دُور سے رام اوتار کی آواز آ رہی تھی۔ طلعت میں یکلخت خود اعتمادی واپس آ گئی۔

"دراصل آپی یہ سب جذبات کی بات ہے ــــ جذبات اور ذہنی ہمدردی اور ایکویشن۔" اس نے عالمانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔ اتنا عرصہ گوتم وغیرہ کی سنگت میں گزار کر اسے ان الفاظ میں یقین آ گیا تھا۔

"اب تم نے بھی یہ چار سو بیس شروع کی۔" تہمینہ نے اکتا کر کہا۔

"چار سو بیس ــــ ؟" طلعت نے دہشت زدہ ہو کر کہا ــــ "آپی یہ اصلیت ہے ــــ پرابلمز کا مثلث بن جاتا ہے نا۔ تمہارا پرابلم ــــ بھیا صاحب یا چمپا باجی کا پرابلم ــــ اور ان سب کا انٹرایکشن ــــ یعنی کہ ــــ"۔

تہمینہ نے اسے غور سے دیکھا۔ "تم ڈاکٹریٹ کے لئے کیمبرج جا رہی ہو نا؟"

طلعت بُرا مان گئی ــــ "آپی مجھے بیوقوف سمجھتی ہیں ــــ قسم خدا کی آپی مجھے

بیوقوف سمجھتی ہیں۔

"آپ کے نزدیک میں چغد ہوں۔۔۔؟" اس نے دکھ سے پوچھا

"نہیں۔ تم بے حد عقلمند ہو۔۔ مگر عورت بھی ہو۔۔"

"اپّی۔۔" طلعت دہاڑی "اپّی تم نے حد کر دی۔ تم اس قدر بورژوا ہو گئیں۔ تم نے پڑھ لکھ کر گدھے پہ لاد دیا۔" اس کا جی چاہا۔ اپّی کی ذہنیت پہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔ ہائے اپّی۔ اس نے تہمینہ کو الماری میں سے رنگین دھاگے کی ریلیں نکالتے ہوئے دیکھ کر کہا۔۔۔ "ارے تم تو موومنٹ میں شامل تھیں۔ تم نے بڑے بڑے معرکے سر کیے تھے۔ وہ ۱۹۴۲ء کا واقعہ یاد نہیں جب دلّی یونیورسٹی کا مارس گائیر آیا تھا اور تم نے کالی جھنڈیوں کے جلوس کی قیادت کی تھی۔ رشیدہ آپا کی تم لفٹننٹ رہیں۔ کیا کیا تقریریں تم نے یونین میں کر ڈالیں۔ چمپا باجی جیسی ری ایکشنری کو تم نے ایجوکیٹ کرنے کی کوشش کی اور اب تم عورت کا لیبل چپکا کر فارغ ہو گئیں۔۔۔ ارے لڑو۔۔ کام کرو۔۔۔ بھیّا صاحب چلے گئے تو کیا ہوا۔ جہاں مرغا نہیں ہوتا وہاں سویرا نہ ہو گا؟ بھیّا صاحب کی قوم کے سینکڑوں موجود ہیں اور یہ اسرار میرے پلّے نہیں پڑتے کہ ان سے بیاہ کرنے سے شدت سے انکار بھی ہے اور اب بیٹھی روتی ہیں۔ جہنم میں جائیں بھیّا صاحب۔ ارے ان کا دماغ بھی تم ہی نے خراب کیا تھا۔ نرملا بالکل ٹھیک کہتی ہے۔ مردوں کو اتنا منہ ہی نہ لگانا چاہیے۔ ورنہ ان کا دماغ خراب ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔۔ ارے پوچھو آپ ہیں کون چیز۔۔ نہ شکل نہ صورت۔ گورا رنگ، مولی کا ایسا۔ ہر اٹیلین لوفر اسی شکل کا ہوتا ہے۔ ایسے ایسے سستی تین سو ساٹھ ہر جگہ مارے مارے پھرتے ہیں اور پورے چھ سال تک عین تمہاری ناک کے نیچے چمپا باجی سے فلرٹ کیا کئے اور اب تشریف لے گئے تو بیٹھی ہچکو ہچکو روتی ہیں۔ ارے لگائیں ایک جوتا بھیا صاحب کی ناک پر۔۔۔"

"طلعت۔۔ وہ تمہارے بڑے بھائی ہیں۔ بدتمیزی مت کرو۔"

"ہاں اور کیا اب اسی کی کسر رہ گئی ہے کہ تم ان کی طرفداری بھی کرو۔ پرانوں میں

یہی لکھا ہے۔ ہرشنی نرملا استری کا یہی دھرم ہے — لاحول ولا قوۃ۔ میں کہتی ہوں تم میں اور چھپکلی میں کیا فرق ہے — وہ بھی رام اوتار کے ہاتھ سے روز پٹتی ہے۔ جسینی کی بی بی نے کل اس کی بمارری میں رام اوتار کو برا بھلا کہا تو اسے لو وہ تو جسینی کی بی بی کی جان کو آگئی کہ نجبدار جو میرے آدمی کو کچھ کہا —"

اتنا کہتے کہتے غم و غصے سے طلعت روہانسی ہوگئی۔ بھیا صاحب کے بجائے اسے اپّی پر غصہ تھا۔ اگر عمر میں بڑی نہ ہوتیں تو ان کی اتنی ٹھکائی کرتی کہ ساری وفاداری اور محبت اور بورژوا رومانیت ہوا ہو جاتی۔ ہائے ہائے۔ اس نے دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانا شروع کیا۔ آخر وہ اٹھ کر کمرے سے نکل بھاگی۔ سائیکل اٹھا کر وہ نرملا کے گھر پہنچی۔ وہاں جا کر اس نے چقندر کی بھجیا کھا کر پانی پیا اور نرملا اور مالتی اور ہری شنکر کے ساتھ بیٹھ کر ترپ چال کھیلی تب جا کر اس کا غصہ ذرا ٹھنڈا ہوا۔

طلعت کے جانے کے بعد تہمینہ مشین پر سے اٹھی اور دریچے میں جا کھڑی ہوئی پہلا ایکٹ ختم ہوا۔ اس نے دل میں کہا۔ ہوائیں طوفان لرز رہے ہیں اور کہکشاں کی بنیادیں ہل چکی ہیں۔ ہم سب کے ذاتی طوفان۔ اگر ڈرامہ لکھا جائے تو میرے کردار کی تشریح یوں ہوگی:

"نواب زادی تہمینہ بیگم۔ عمر پچیس سال۔ فرسٹ کلاس ایم۔ اے سائیکلوجی۔ جاہ پسند اندر ہی اندر غم کھاتی رہتی ہے۔ گھر میں اپّی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ خلیق اور منکسر المزاج مغرور، اس ہیئت و وضاحت کے بعد اور کیا باقی رہ جاتا ہے۔ ڈرامے کے پانچویں ایکٹ میں ہوگا :-

"دس سال کا وقفہ۔ تہمینہ جواب ذرا موٹی ہوگئی ہے۔ بچے کو گود میں لئے گنگنا رہی ہے — میں کھاؤں مور بالا کھاتے۔ بابے کا جھوٹا کوؤ نہ کھائے۔ بابے کا۔ — چہرے پر معصومیت اور اشتیاق کی جگہ صبر اور سکون آگیا ہے"۔ صبر اور سکون — لاحول ولا قوۃ — وہ برآمدے میں آگئی۔ بارش تھم چکی تھی۔ چبوترے پر بہت سے

رشتے دار بچے "کوڑا جمال شاہی" کھیل رہے تھے۔ درختوں کے پرے سوسن طلعت کی چنریاں رنگ کر پھیلا رہی تھی۔ کمال نے چبوترے کی منڈیر پر سے جھانکا۔ واہ کیا سہانا منظر ہے۔ دوپٹے رنگے جا رہے ہیں۔ اپّی مشین چلا رہی ہیں۔ برآمدے میں تخت پر تین چار خالائیں مصروف گفتگو ہیں۔ وہ بھی اندر آ کر نہایت ذہانت سے ان کی باتوں میں حصہ لینے لگا۔ جی ہاں۔ چھوٹی خالہ ٹھیک کہتی ہیں۔ ضرور پاکستان جائیے وہاں بڑے ٹھاٹھ رہیں گے۔ وہ بیچ بیچ میں لقمہ دیتا جا رہا تھا۔ تہمینہ نے اسے دریچے میں سے دیکھا۔ یہ سب ڈرامے کے کردار تھے۔ جو خواب میں چل پھر رہے تھے۔ اسٹیج پر دھندلکا چھا گیا تھا۔ وہ بھی باہر آ گئی۔

کمال نے بچوں کو کوڑا جمال شاہی کھلانا شروع کیا۔

"کوڑا جمال شاہی۔ پیچھے دیکھا مار کھائی — پیچھے دیکھا — ہلو — اپّی —" اس نے دوڑتے دوڑتے کہا — "سل گئے بلاؤز — کوڑا جمال شاہی —"

تہمینہ برآمدے کے ستون سے ٹک کر اسے دیکھنے لگی۔

"کوڑا جمال شاہی — اپّی چھپا باجی تشریف لے جا رہی ہیں بلکہ لے گئیں تشریف — پیچھے دیکھا مار کھائی —"

"کیا ہوا — کہاں —؟" تہمینہ نے چونک کر پوچھا۔

"فرانس — کوڑا جمال شاہی —" اس نے زور سے ایک چھوٹی سی بچی کو چنے ہوئے دوپٹے سے مارا — وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس کے پیچھے دوڑی۔

"کیسے —؟" تہمینہ نے آواز دی —

"یونیورسٹی اسکالرشپ —" کمال نے کہا۔ بچوں نے تیزی سے گھومنا شروع کر دیا — یہاں تک کہ کمال دوپٹے کی کنڈلی گھاس پر پھینک کر باہر بھاگ گیا۔

سڑک پر آ کر کمال نے گلفشاں پر ایک نظر ڈالی اور جیبوں میں ہاتھ ٹھونس کر سنگھاڑے والی کوٹھی کا رخ کیا۔

اگست کی بارشیں اب کے ایسی ٹوٹ کر برسیں کہ زمین آسمان ان میں ڈوب گئے۔ سنگھاڑے والی کوٹھی کے برآمدے میں سیتل پاٹی بچھا کر وہ سب بیٹھے بادلوں کو دیکھتے رہے موقع کی مناسبت کے لحاظ سے طلعت نے دوبارہ تان پورے کو ٹیون کر کے ملہار شروع کرنا چاہا۔ مگر ساری آوازیں ڈوب چکی تھیں۔

بارش کا پانی جو شفاف تھا شروں کی الوہی دھند جو کائنات پر تیرتی تھی اس میں خون ملا تھا خون کی برکھا رت۔ خون کی کیچڑ۔ خون برسانے والے بادل۔ خون کی اس فراوانی سے طلعت عاجز آگئی۔ نرملا کی نئی کینوس کے قرمزی رنگوں میں اسے خون نظر آیا۔ گومتی خونی ندی تھی جو بہہ رہی تھی (حالانکہ یہ صرف ڈوبتے سورج کا عکس تھا) پھولوں پہ خون تھا۔ انسانوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اس نے سہم کر نرملا اور ہری شنکر کو دیکھا۔

۵۷

اور جب دونوں بھائیوں میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو ارجن نے اپنی کمان اٹھا کر کرشنا سے کہا

"او جنار دھن — میرا رتھ دونوں فوجوں کے درمیان کھڑا کر دو تا کہ میں دیکھوں کہ مجھے کون سے فریق کا ساتھ دینا چاہیئے۔

اور کرشنا نے رتھ وہاں لے جا کر کھڑا کر دیا اور ارجن نے دیکھا کہ دونوں فوجوں میں ایک دوسرے کے پرکھ، باپ، دادا، چچا، بھائی، بھتیجے، بیٹے، دوست استاد، رفیق ایک دوسرے کے خلاف صفیں آراستہ کئے کھڑے تھے۔

تب کنتی کے بیٹے نے دکھ میں ڈوب کر کہا۔ او کرشنا۔ یہ منظر دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں شل ہیں۔ میرا حلق سوکھ رہا ہے۔ میرا جسم تھرتھر کانپتا ہے۔ میرے سر کے بال کھڑے ہو گئے ہیں۔ میری کمان میرے ہاتھ سے گری جا رہی ہے۔ میرا بدن تپ رہا ہے۔ او کیشو۔ میں سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا۔ میرا دماغ چکرا رہا ہے۔ مجھے برے

شگون دکھلائی دے رہے ہیں اودھو۔ میں اپنے ہی کنبے، اپنے دوستوں اور اپنے استادوں کو مارنا نہیں چاہتا۔

کیونکہ کنبے کی تباہی سے قدیم روایتیں ختم ہو جاتی ہیں اور روحانیت کے خاتمے کے ساتھ کنبہ بھی تباہ ہو جائے گا۔ عورتیں نیک نہ رہیں گی اور پرکھوں کی عزت خاک میں مل جائے گی پرکھوں کی تقدیس کرنے والا کوئی نہ رہے گا۔

اودھو سودن — میں نہیں جانتا کہ ہم دونوں میں سے کون بہتر ہے۔ میں یا میرے دشمن۔ ہمیں ان کو زیر کرنا چاہئے۔ یا انھیں ہمیں۔ اوگووند۔ میں نہیں لڑوں گا۔

۵۸

ہندوستان۔ ۱۹۴۷ء

۵۹

سرل ڈیرک ایڈون ہاورڈ ایشلے نے پھر وقت پر نظر ڈالی اور پکیڈلی کے ٹیوب اسٹیشن میں گھڑی کے نیچے جس میں ساری دنیا کا وقت معلوم ہو جاتا تھا ٹہلنا شروع کر دیا۔ اسے سخت کوفت محسوس ہو رہی تھی۔ اس قسم کے راں دے وُو سے اسے ہمیشہ سے نفرت تھی مگر وہ چمپا احمد سے وعدہ کر چکا تھا کہ اسے تھیٹر لے جائے گا اور وعدہ نبھانا بہرحال ضروری تھا۔ تنگ آ کر اس نے اسٹیسمین اینڈ نیشن کو دوبارہ پڑھنا شروع کر دیا۔ اس میں گوتم نیلمبر کا جو خط تقسیم ہند اور جنگ اور امن کے مسئلے کے متعلق چھپا تھا۔ سرل بیتاب تھا کہ سرکھیا کے گھر پہنچ کر اس پر دوستوں سے بحث کرے —

سرل دوسرے لارڈ باندن فیلڈ کا چھوٹا بیٹا تھا۔ اس کے دادا پہلے لارڈ سرل

ڈیرک ایڈورڈ ایشلے نے اس ارسٹوکریٹ خاندان کی بنیاد رکھی تھی جو اب ٹی میں ربر اور جوٹ کی تجارت پر چھایا ہوا تھا۔ سرل کے پردادا سر سرل ہاورڈ ایشلے ایک مفلوک الحال پادری کے بیٹے تھے جو اٹھارھویں صدی کے اواخر میں کلرک کی حیثیت سے بنگال گئے تھے جہاں انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کے دوران میں نیل کی تجارت سے لاکھوں روپے کمائے۔ روایت تھی کہ شاہ اودھ کے دربار میں بھی انھوں نے خوب ہاتھ رنگے اور جو لاکھوں پاؤنڈ کی مالیت کے ہیرے جواہرات شاہِ اودھ نے ان کو تحفے میں دیئے وہ علیحدہ۔ وہ کسی صوبے کے گورنر بن چکے تھے جب ان کا انتقال ہوا اور ان کے اکلوتے لڑکے نے جوان ہو کر انگلستان میں ربر کی تجارت شروع کی۔ گاؤں اور محلات خریدے۔ لارڈ کا خطاب حاصل کیا۔ پارلیمنٹ میں بیٹھا اور باقاعدہ ارسٹوکریسی میں شامل ہو گیا۔ یہ پہلا لارڈ بارن فیلڈ تھا۔ اس کی تجارت بڑھتی اور پھیلتی ہوئی سلطنت برطانیہ کے ساتھ ساتھ سارے مشرق میں پھیل گئی۔ اس کا بیٹا دوسرا لارڈ بارن فیلڈ ایمپائر کا اور بھی زیادہ قابلِ فخر فرزند ثابت ہوا۔ اس نے برطانیہ کی فارن سروس میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ترکوں اور افغانوں کا قلع قمع کیا۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کے خلاف پارلیمنٹ میں قانون وضع کئے۔ کلکتے سے ایک کنزرویٹو اخبار نکالا۔ ایک صحیح النسب ٹوری کی حیثیت سے اسے کالوں خصوصاً نیم وحشی ہندوستانیوں سے دلی نفرت تھی۔ چند اعلیٰ خاندان محمڈنز کو البتہ وہ گوارا کر لیتا تھا۔ جن کے ساتھ جب کبھی وہ ہندوستان جاتا تو گریٹ ایسٹرن کلکتہ یا امپیریل ہوٹل دلی کی لاؤنج میں بیٹھ کر اپنے دادا "نباب" سرل ایشلے کا تذکرہ کر لیا کرتا تھا۔ اس کے دادا نباب سرل ایشلے فی الواقع بڑی رومینٹک ہستی رہے ہوں گے۔ جو اردو میں شعر کہتے تھے اور مرغے لڑاتے تھے۔ کتھک ناچ دیکھتے اور حقہ پیتے تھے۔ ان کی ایک تصویر رائل اکیڈمی کے مصور زوفنی نے بنائی تھی جس میں وہ ایک بڑے بڑے ستونوں والے برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھے پیچوان گڑگڑا رہے ہیں اور کالا بھجنگ نیٹو ملازم پیچھے کھڑا مورچھل جھل رہا ہے۔ پس منظر میں تاڑ کے پتے ہیں یہ تصویر مینور کے وسطی ہال میں لگی تھی۔

دوسرے لارڈ بارن فیلڈ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں جرمنوں کی بمباری کا نشانہ بنے۔ ان کے دو لڑکے تھے۔ بڑا لڑکا تیسرا لارڈ بارن فیلڈ اب خاندانی کاروبار اور ریاست کا مالک تھا۔ سرل چھوٹا لڑکا تھا۔

بارن فیلڈ خاندان کا ستارہ اب گردش میں تھا۔ ملایا میں ان کے ربڑ کے جنگلات میں کمیونسٹ چھپے بیٹھے تھے۔ کینیا میں ماؤ ماؤ نے اودھم مچا رکھی تھی۔ ہندوستان کو جب سے آزادی ملی تھی۔ کلکتہ کی مارکیٹ بھی ڈاؤن ہو رہی تھی۔ لارڈ بارن فیلڈ اب مشرقی پاکستان میں روپیہ لگا رہے تھے اور اتوار کے روز اپنے خاندانی محل بارن فیلڈ پر ٹکٹ لگا کر پبلک کو اس کی سیر کراتے تھے۔ محل بیش قیمت نوادر سے پٹا پڑا تھا اور اس کے چاروں طرف سینکڑوں ایکڑ پر پارک پھیلا ہوا تھا۔ لارڈ بارن فیلڈ کو تجارت اور زمینداری کی پریشانیوں اور اقتصادی مشکلات نے قبل از وقت بوڑھا کر دیا تھا۔

لیکن سرل ان سب مادی جھگڑوں سے بے نیاز کیمبرج میں فلسفہ پڑھتا تھا چھوٹا بیٹا تھا۔ لہٰذا اسے ہر صورت میں اپنی روزی خود ہی کمانا تھی۔ ایک اور مصیبت یہ تھی کہ جب سے اُس نے روزماری سے شادی کی تھی۔ بڑے بھائی لارڈ بارن فیلڈ نے اس سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ لیڈی سنتھیا سے اس کا بیاہ رچائیں گے شاہی خاندان کے افراد اس میں شریک ہوں گے، ایک ڈیوک کا سرل داماد بنے گا، انگلستان کی ارسٹوکریسی کے بچے کچھے افراد کو چاہیئے کہ اس نازک دور میں ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑیں مگر سرل اس سرپھرے لڑکے نے تو لٹیا ڈبو دی۔ پہلے ان کا خیال تھا کہ لونڈا کمیونسٹ ہو گیا ہے لیکن ان کا شبہ غلط نکلا۔ اس لڑکے کو سیاست سے چنداں دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو خدا کے فضل سے فلسفی تھا۔ جنگ کے زمانے میں تعلیم ادھوری چھوڑ کر اسے کو پائلٹ بننا پڑا تھا۔ مہاتما گاندھی کی اہنسا کا پرستار تھا اور برلن اور کولون پر جا کر بم گراتا تھا جنگ کے بعد وہ کیمبرج واپس لوٹا۔ روزمیری جس سے اس نے شادی کی متوسط طبقے کی ایک لڑکی تھی جس سے اس کی ملاقات آرٹسٹوں کی ایک پارٹی میں ہوئی جہاں آرٹسٹ لوگ رت جگا منا رہے تھے۔ یہ لڑکی خوبصورت نہ تھی۔ مجسمے بناتی تھی۔ بے چاری کامیاب

سنگتراش بھی نہیں تھی۔ اسی لئے سِرل کو بہت اچھی معلوم ہوئی۔ مکمل، ماہرِ فن لڑکیاں اسے سخت ناپسند تھیں۔ یہ لڑکی بالکل نامکمل تھی۔ اس کی تکمیل ضروری ہے۔ سِرل نے سوچا۔ لہٰذا اس سے شادی کرلی اور لندن سے فون پہ اپنے بھائی اور بھاوج کو مطلع کیا۔ لارڈ بارن فیلڈ نے فی الفور اس کا جیب خرچ بند کردیا۔ ایک تو روز میری گمنام اور مفلس۔ اوپر سے رومن کیتھولک۔ لارڈ بارن فیلڈ آگ بگولا ہی تو ہو گئے۔ لیکن سِرل نے پرواہ نہیں کی۔ وہ ہیگل کے مطالعے میں جُٹا رہا۔

سِرل کیمبرج میں پڑھتا رہا۔ اس کی بیوی اسٹیفرڈ شائر کے چینی کے کھلونے اور برتن بنانے کے ایک کارخانے میں نوکر ہو گئی۔ سِرل کو بعض دفعہ اپنی انگلی پر شادی کی انگوٹھی دیکھ کر بڑا عجیب سا لگتا۔ پھر اسے دفعتاً یاد آتا کہ وہ شادی شدہ ہے اور اس کی ایک بیوی بھی ہے جو بڑی پیاری لڑکی ہے۔

مہینے میں ایک آدھ بار اس کی روز میری سے ملاقات ہو جاتی۔

ایک روز اسے بے حد لطف آیا جب وہ چند ساتھیوں کے ساتھ ایک شلنگ کا ٹکٹ خرید کر خود اپنے "اسٹیٹلی ہوم" کی سیر کرنے کے لئے جا پہنچا۔ اس کے بھائی اور بھاوج جنوبی فرانس گئے ہوئے تھے۔ ہاؤس کیپر اور اسٹاف کے لوگ محل کی سیر کرا رہے تھے۔ وہ نئے لوگ تھے کسی نے سِرل کو نہیں پہچانا۔ وہ سارے میں پھرا اور سوچتا رہا۔ کیسی عجیب بات ہے۔ میں یہاں پیدا ہوا تھا۔

سِرل کا محل قصبے کے اختتام پر تھا۔ چار پانچ سو سال قبل تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کی کھڑکیاں اصل Blown-glass کی تھیں۔ ان گنت کمرے اور ہال اور غلام گردشیں سرے پر لیڈی چیپل تھا۔ مارننگ روم میں ہمیشہ دھوپ آتی تھی۔ باغ میں حوض تھے اور روک گارڈن اور ڈچ وضع کی چمن بندیاں اور اطالوی سنگِ مرمر کے مجسمے پھولوں میں ایستادہ تھے۔ ایک زمانے میں وہ ان باغات میں خالص کنٹری اسکوائر کی مانند ٹویڈ کا سوٹ پہنے چہل قدمی کیا کرتا اور ٹہلتے ٹہلتے محل کے مغربی حصے کی سمت چلا جاتا جہاں بارھویں صدی کی دو راہبات کی قبریں تھیں۔ قبریں اب خالی پڑی تھیں۔ ... کے تابوت کی جگہ پر جو کُتبہ

گڑھا سا بنا ہوا تھا۔ اس میں اکثر بارش کا پانی جمع ہو جایا کرتا۔ ان قبروں کے پاس بیٹھ کر سرل نے لڑکپن میں گھنٹوں زندگی اور موت کے گورکھ دھندے کے متعلق سوچا تھا۔

باہر والوں کے لئے اس محل کے چپے چپے میں افسانویت کی افراط تھی۔ سرل کو یہاں کوئی خاص بات نظر نہ آتی۔ سوائے اس کے کہ اتنا بڑا کھڑاگ جو امرا کے طبقے نے پھیلا رکھا تھا۔ کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ اسے تو اپنے پر دادا نباب سرل ہاورڈ ایشلے کی ذات میں بھی کوئی رومان نظر نہ آتا۔ جانے کتنے غریب ہندوستانیوں کا خون چوس کر انھوں نے یہ دولت حاصل کی ہوگی۔ وہ سوچتا۔ اس قسم کے خیالات اس کے دماغ میں کمیونزم کے زیر اثر نہیں آتے تھے بلکہ وہ کچھ صوفی منش واقع ہوا تھا۔ ڈبلو ای ایٹس کا اس نے کافی مطالعہ کیا اور قرونِ وسطیٰ کے کیتھولک فلسفیوں کا۔ تو اس نے کہا کہ دنیا کے فانی ہونے سے کون منکر ہو سکتا ہے۔ اسی مارے جب وہ خود اپنے ہی محل میں اجنبی تماشائیوں کی طرح داخل ہوا تو اسے ایک عجیب سے سکون اور طمانیت کا احساس ہوا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں وہ دوسرے جدید انگلو سیکسن کی طرح رومن کیتھولک نہ بن جائے لیکن وہ کسی ایک مسلک کا پابند ہونے کے بجائے آزاد رہنا چاہتا تھا۔ خود وجودیت کے پرستاروں کی اس اصطلاح آزادی کے بڑے زبردست معنی پہنائے جا سکتے تھے۔ یہاں پہنچ کر انیشدوں کے معنی بھی سمجھ آ جاتے تھے۔

سرل ایشلے صحیح معنوں میں جدید انسان تھا اس عہد کی ساری ذہنی الجھنوں، روحانی ناآسودگیوں اور جذباتی بے اطمینانیوں اور شبہوں کا شکار۔

رورنگ ٹوینٹیز کا زمانہ اس کا بچپن تھا۔ سنہ ۳۰ سے ۳۹ تک کے دور میں اس نے ہوش سنبھالا۔ لندن میں اس کے ٹاؤن ہاؤس میں اکثر آرٹسٹوں وغیرہ کا مجمع رہتا۔ جو اس کی سوتیلی ماں لیڈی ایلین سے ملنے آتے جو اس قدامت پرست خاندان میں شادی کرنے کے باوجود ساری جدید تحریکوں کی بڑی زبردست حامی تھیں۔ یہ بڑا عجیب و غریب دور تھا۔ ڈیلی ورکر اور بائیں بازو والوں کا دور۔ بلومز بری والے اینٹی فاشسٹ تھے۔ اوڈن اور ڈے لوئیس اور اسپنڈر ترقی پسندوں کے گروپ ہوئے تھے۔ لندن کے یونی ٹی تھیٹر میں کمیونسٹوں

کے ڈرامے ہوتے تھے۔ ویسٹ منسٹر تھیٹر میں گروپ تھیٹر والے مک نیس اور آوڈن اور اشروڈ کی تمثیلیں اسٹیج کر رہے تھے۔ بائیں بازو سے تعلق رکھنا ذہنی فیشن میں داخل تھا۔ یہ کرسٹفر وڈ، اور سیڈرک موریس اور بن نکلسن کی پینٹنگز کا زمانہ تھا۔ آرٹ، ادب، ڈرامہ موسیقی، بیلے، انٹیریر ڈیکوریشن، ہر چیز میں جدیدیت کی تحریکیں چلائی جا رہی تھیں۔ مشرق کے فلسفے میں اسے مسز بیسنٹ اور ڈبلیو بی ییٹس، اور کرشنا مورتی اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر رادھا کرشنن کے مطالعے کی وجہ سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ٹی۔ ایس ایلیٹ اور ایذرا پاؤنڈ نے بار بار چینی اور سنسکرت حوالے دیے۔ شانتی شانتی شانتی کے الفاظ نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ سرل ونچسٹر سے (نہیں — میں ایٹن کبھی نہیں گیا۔ ونچسٹر بھی اتنا ہی خوفناک تھا) کیمبرج بھیجا گیا (یہیں کیمبرج نہ جاتا تو کیا گروکل کانگڑی جاتا؟) وہاں پیٹر ہاؤس میں اس کا داخلہ ہوا　　اور پھر مسلسل تفریح، مسلسل ذہنی ڈسی پیشن اور خیال پرستی کا دور شروع ہوا۔ لیکن فوراً ہی جنگ چھڑ گئی اور بمبار پائلٹ بن کر ان گنت خوبصورت جرمن شہروں کو جہاں اس کے محبوب فلسفی اور شاعر اور موسیقار پیدا ہوئے تھے۔ اس نے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔

اس کے بعد وہ پھر کالج واپس آیا اور ہیگل کا مطالعہ پھر اسی صفحے پر سے شروع کر دیا جہاں سے ادھورا چھوڑ کر وہ ایر فورس میں بھرتی ہونے کے لئے چلا گیا تھا۔ یہ جنگ کے بعد کی دنیا تھی۔ کل کے دشمن آج کے ساتھی تھے اور کل کے ساتھی آج خطرناک ترین دشمن تصور کئے جا رہے تھے۔ ایشیا کا نقشہ تیزی سے　　بدل رہا تھا۔ امن کے نعرے لگائے جا رہے تھے۔ تیسری جنگ کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ کل کے ترقی پسند آج شدت سے رجعت پسند بن چکے تھے۔ کسی ویلیو میں کوئی استحکام باقی نہ رہا تھا۔ وقت غیر حقیقی ہے۔ سارا وقت غیر حقیقی ہے۔ کیم کے کنارے کنارے ٹہلتے ہوئے وہ آلڈس ہکسلے اور جیمز جوائس کی طرح سوچتا۔ اب ذہنی ڈسی پیشن کا دور از سر نو شروع ہوا۔ جنگ کی تباہ کاریاں اور انسان کی ریاکاری دیکھنے کے بعد اس میں زیادہ تلخی آگئی تھی۔ مائیکل اور ڈینس اس کے ساتھی تھے۔ مائیکل یہودی تھا۔ ڈینس

بھی مائیکل کی طرح مڈل کلاس تھا۔ ان دونوں سے تہرل نے بہت اُمید کی کہ ذرا ان میں اسٹوبری کی جھلک دکھائی دے جائے مگر اس ضمن میں دونوں نے اسے بہت مایوس کیا۔ ڈینس کو شاعری کی جھک تھی۔

ان کے علاوہ اور بہت سے لڑکے تھے۔ کالے لڑکے۔ یوروپین لڑکے۔

اور لڑکیاں۔

تہرل کو اس کی اپنی ہم قوم لڑکیوں نے کبھی زیادہ متوجہ نہ کیا۔ بوجہ ان کی یکسانیت کے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد کی دُنیا ایک ایسا عظیم عہد تھی جس میں دُنیا بین الاقوامی دوستی اور بھائی چارے[1] اور کلچرل مفاہمت[2] کے دَور میں داخل ہو رہی تھی اور کیسی کیسی لڑکیاں دُنیا کے سارے کونوں سے انگلستان تعلیم کے لئے آ رہی تھیں۔ کالی لڑکیاں پیلی یعنی مشرقِ بعید کی لڑکیاں (یاد کرو پرل بک کے ناول) نیگرو لڑکیاں۔ جن کو دیکھ کر جدید سنگتراشی اور پیرس کی نئی تحریکوں اور نئی موسیقی کا خیال آتا۔

اپنی ہم قوم لڑکیوں میں جُون کارٹر تھی۔ جدید ناولوں میں برطانوی یونیورسٹی وومن کا جو حلیہ درج ہوتا ہے۔ اس پر وہ پوری اُترتی تھی۔ سیاہ فریم کی بیلرینا عینک لگائے، سر پر جھوّا ایسے بال۔ انتہائی انٹلکچوئل۔ یہ ٹائپ اب پچیس تیس سال پرانا ہو چکا تھا اور اس میں مزید ترقی کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

روز میری تھی۔ لیکن اس سے تہرل نے شادی کر لی۔

اب مختلف قوموں کی کلچرل ایوننگز کا دور شروع ہوا۔ جب مختلف ایشیائی قوموں کے طلبا۔ جمع ہو کر بڑی شدید کوشش کرتے کہ سفید فام طالب علموں کو اپنی اپنی تہذیب کے قدیم ترین ہونے کا ثبوت دے سکیں۔ اور "فِیل ناچ" ہوتے (جو زیادہ تر بکواس تھے۔ سوائے منی پوری ناچ کے) نظمیں پڑھی جاتیں۔ بے سُرے ساز بجائے جاتے۔ ستار تھا۔ امریکہ میں یہ ریکٹ نہایت اعلیٰ پیمانے پر چلایا جا رہا تھا۔ بہت جلد اس

---

[1] اور [2] یہ سب بہت عظیم الشان فراڈ تھا۔

فار ایسٹرن اور مڈل ایسٹرن تماشے سے اس کا جی اُکتا گیا۔ اب وہ اپنے کمرے پر لوٹتا اور کوئی اس سے کہتا کہ تھائی لینڈ والے یا انڈونیشیا والے کلچرل ایوننگ کر رہے ہیں تو اس کا جی چاہتا کہ کھڑکی میں سے کُود کر باہر بھاگ جائے۔

"جانتے ہو سیرل ایشیا سے اپنی مدافعت کر رہا ہے۔" ڈینس نے ایک روز بڑے خوفناک طریقے سے انکشاف کیا۔

ایک روز ایک نیا گروپ کالج میں داخل ہوا۔ یہ لوگ ہندوستانی تھے اور دُور دراز لکھنؤ سے آئے تھے (بڑی اُداسی کی بات یہ تھی کہ لوگوں کے گروہ آتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ ایک روز یہ گروہ بھی چلا جائے گا۔ اسے یہ سوچ کر بڑی پشیمانی ہوتی) نئے لوگوں سے وہ بہت کوشش کر کے چھپاتا کہ لارڈ فلاں کا بیٹا ہے۔ کسی نے اسے ڈی کیڈنٹ کہا تو وہ جھٹ لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گیا۔ تازہ وارد کالوں سے اس کی کئی دن تک ملاقات نہ ہوئی۔ گو اسے معلوم ہوا کہ یہ بڑے انگارے نگلنے والے لوگ ہیں۔ کیمبرج میں وہ صرف ایک کالی لڑکی کو جانتا تھا۔ جس سے وہ دیر تک ہندوستان کی تعریفیں کرتا رہا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ پاکستانی ہے۔ اس لڑکی کا نام روشن آرا تھا۔ اس ہندوستانی پاکستانی جھگڑے نے اس کا الگ ناک میں دم کر رکھا تھا گو وہ اس ٹنٹے کا زیادہ نوٹس نہ لیتا تھا۔

وہ ویک اینڈ پر شہر گیا ہوا تھا۔ چند دوستوں کے ساتھ وہ ایک جگہ گیا جہاں ایک اور کلچرل ایوننگ ہو رہی تھی۔ یہ 'ایوننگ' انڈیا والوں نے منعقد کی تھی۔ وہ جُوتے اتار کر بڑے ادب اور احترام سے فرش پر بیٹھ گئے۔ شاید ٹیگور جینتی منائی جا رہی تھی۔ ڈینس فوراً مراقبے میں چلا گیا۔ مجمع پر بہت سخت روحانی کیفیت طاری تھی۔ سیرل اپنی پتلون کی کریز کی فکر میں غلطاں رہا۔ اس سے آلتی پالتی مار کر ہرگز نہیں بیٹھا جا رہا تھا۔ اس نے اُداسی سے ان انگریزوں کو دیکھا جو بڑے اطمینان سے فرش پر سادھوؤں کی طرح بیٹھے تھے۔ یہ کون لوگ ہیں۔ کویکرز ہوں گے شاید۔ اس نے کاہلی سے سوچا۔ ڈینس ان سب کو جانتا تھا۔ ابھی پروگرام ختم ہونے کے بعد ڈینس ان سب سے بچھڑ کر ملے گا اور اس کا ان سب

سے تعارف کرائے گا۔ یہ سوچ کر اسے پھریری سی آگئی۔

اتنے میں ایک دبلی پتلی لڑکی اسٹیج پر آئی۔ اور کچھ اناؤنس کیا۔ اس کے پلے کچھ نہ پڑا۔ کیونکہ بڑے زور سے تالیاں بجیں۔ سرل نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سارا ہال جو چھوٹا اور گھریلو سا تھا اور جو دراصل ہندوستانی طالب علموں کا تہذیبی سنٹر وغیرہ تھا، اسی طرح کی لڑکیوں سے پٹا پڑا تھا اور قسم قسم کے لڑکے۔ سب بڑے کامریڈانہ اور کنبے برادری کے سے انداز میں فرش پر بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

لندن کی ہندوستانی کمیونٹی۔

اس لڑکی کو سرل نے غور سے دیکھا۔ روشن کی طرح کی ایک اور لڑکی۔ باقی اور ہندوستانی لڑکیوں کی طرح موٹے ریشم کی ساری باندھے بالوں میں پھول لگائے۔

اب ان لڑکیوں میں سرل کے لئے کوئی انوکھاپن نہ رہا تھا۔ اگر یہ لوگ روم وغیرہ چلی جایا کریں تو زیادہ بہتر ہو۔ اٹلی اور فرانس میں ان کے لئے زیادہ مواقع ہیں۔ اس نے یونہی سوچا۔ کیونکہ کوئی اور خیال اس کے ذہن میں نہیں آرہا تھا اور ٹیگور کے متعلق وہ کچھ سوچنا نہ چاہتا تھا۔ رومان پرست مڈل کلاس، جذبات زدہ یوگی —— اس نے بڑی عیاشی سے سوچا (ان دنوں وہ مغربی عیسائیت اور یوروپین تہذیب کا حامی بنا ہوا تھا)

اتنے میں سیاہ ساری پہنے ایک گداز سی بی بی اسٹیج پر آئیں

یہ بی بی پینتیس اور چالیس سال کے درمیان رہی ہوں گی اور پندرہ سال قبل حسینانِ کلکتہ میں ان کا شمار ہوتا ہوگا۔ ان کی بنگالی شکل تھی۔ بڑی بڑی سرمگیں آنکھیں پھولے پھولے گال۔ کانوں میں سونے کے پھول۔ بڑا سا جوڑا۔ سیاہ ساری کے نیچے سفید پیٹی کوٹ پہنے تھیں جو البتہ بڑا عجیب معلوم ہو رہا تھا۔

ان بی بی نے بڑی جادو بھری آواز میں گانا شروع کیا اور بعد گانے کے اس کا ترجمہ انگریزی میں سنایا

پھر ایک عدد تقریر میں اُنھوں نے بتایا کہ ٹیگور دُنیا کا عظیم ترین شاعر تھا۔
"جانتے ہو یہ کون ہیں۔" ڈینس نے بڑے رُعب سے سرل کو مطلع کیا۔ ڈینس ساری ہندوستانی کمیونٹی کا شہر خبرو تھا۔
"اگر نہ جانتا ہوں تو کیا حرج ہے۔ یہ تھیاسوفسٹ ہوں گی۔ یا ہندوستانی کلچر کی علمبردار۔ جو بتلائیں گی کہ Atomic تھیوری کو سب سے پہلے شنکر آچاریہ نے پیش کیا تھا۔" سرل نے بور ہو کر کہا۔
"یہ مسز شنیلا مکرجی ہیں۔" ڈینس نے بڑے پُراسرار انداز میں کہا۔
"یعنی —؟"
"ان سے ملتے رہنا۔ اس میں بڑے فوائد ہیں۔ ان کا یہاں صحافی حلقوں میں بہت اثر ہے۔ اگر تم اوبزروکے نمائندے بن کر ہندوستان جانا چاہتے ہو تو ان کو کلٹی ویٹ کرو۔"
سرل کے سامنے جو گوناگوں مسائل تھے۔ ان میں سے ایک روزی کا بھی تھا۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ کیا کرے گا۔ بی بی سی؟ — وہ پہلے ہی اس کی طرح کے انٹلکچوئلز سے اٹا ٹوٹ بھری ہوئی تھی۔ کسی فلم کمپنی میں اسکرپٹ رائٹنگ۔ اس کی بھی گنجائش کم تھی کیونکہ برطانوی پروڈیوسر امریکن اشتراک سے فلمیں بنا رہے تھے اور سرل کو ہر صحیح النسب انگریز کی مانند امریکنوں سے دلی نفرت تھی۔ محکمہ تعلیم وہ کبھی کالج کے لونڈوں کو نہ پڑھائے گا۔ کولونیل سروس یعنی میں، سرل ایشلے، انسانیت پرست، کینیا یا ملایا یا ویسٹ انڈیز میں نوکری کروں گا۔ سولا ہیٹ پہن کر دوروں پر جاؤں گا۔ شام کو کلب جا کر گوف کھیلوں گا۔ ہرگز نہیں۔ صرف صحافت ہی آخری جائے پناہ تھی لیکن یہاں بھی سخت مقابلہ تھا۔
پروگرام کے خاتمے پر مجمع تتر بتر ہُوا اور لڑکے لڑکیاں ٹکڑیوں میں منتشر ہو کر زور زور سے باتیں کرنے لگے۔ ڈینس اُٹھ کر شریمتی شنیلا دیبی کے پاس گیا جو اوبزرور کے کالم نگار بل کریگ سے باتیں کر رہی تھیں "ہلو ڈینس" اُنھوں نے مُسکرا کر کہا۔

"مسز مکرجی ہمیں اپنے گھر لے جاکر کافی نہیں پلائیں گی؟" ڈینس نے اپنی بچوں والی ادا سے ذرا مچل کر کہا۔

"ضرور۔ سب لوگ چلو۔"

ایک خاصا بڑا گروہ ان کے ہمراہ چلنے کو تیار ہو گیا۔ یہ سب لوگ قاضی نذرالاسلام کی جینتی کی تیاریوں کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ ٹسرل کو یہ مجمع بڑا دلچسپ معلوم ہوا۔ ان لوگوں نے اپنی مخصوص دنیا تخلیق کر رکھی تھی۔ ان کی اپنی گوسپ تھی۔ اپنی مصروفیات۔ ان کی آپس میں شادیاں بھی ہوتی تھیں۔ اکثر یہ شادیاں بڑی سنسنی خیز ہوتی تھیں یعنی اس لندن میں ایک اور ہندوستانی لندن آباد تھا۔

"چلو — چلو —" وہ سب شور مچاتے باہر آگئے۔ گلی نیم تاریک تھی۔ لڑکے سگریٹ خریدنے کے لئے ایک پب میں چلے گئے۔ لڑکیاں کہنے لگیں "شنیلا دیدی تھوڑی سی ترکاری خرید لیں۔ آپ کے یہاں چل کر کھانا بنائیں گے۔"

مسز مکرجی کا فلیٹ چیلسی کی ایک بہت شاندار رہائشی عمارت میں تھا۔ جس میں لفٹ لگے تھے اور گیلریوں میں دبیز قالین بچھے تھے اور وردی پوش پورٹر تھے۔

وہ سب فلیٹ میں داخل ہوئے۔

لڑکیوں نے ٹسرل سے بڑی بے تکلفی سے باتیں شروع کر دیں۔ یہ لوگ روشن کی طرح Tense نہیں تھیں۔ بڑے گھریلو اور سیدھے سادے انداز میں بات چیت کر رہی تھیں۔ ان میں سے ایک کا نام طلعت تھا اور دوسری کا نرملا۔ لڑکوں کے نام اسے یاد نہیں رہے۔ یہ لڑکیاں اسے معلوم ہوا اسی سال کیمبرج میں داخل ہوئی تھیں۔

مسز شنیلا مکرجی فرید پور مشرقی بنگال کی رہنے والی تھیں۔ ایک مشہور زمیندار خاندان کی چشم و چراغ۔ کلچر جن کے یہاں پانی بھرتی تھی۔ انھوں نے خود وشوا بھارتی میں پڑھا تھا مگر شادی کے بعد اپنے میاں سے ان کی نہ بنی (شادی مائی ڈیر ایک جوا ہوتا ہے۔ گرودیو نے کہیں پر لکھا ہے کہ —) ان کا ایک لڑکا فلائنگ آفیسر پرفلا مکرجی ہندوستانی فضائیہ میں ہوا باز تھا۔ خوبصورت لڑکا تھا۔ مسز مکرجی اب مدتوں سے

یورپ اور لندن میں رہ رہی تھیں۔ ان کے میاں کے متعلق کسی کو علم نہ تھا کہ کہاں ہیں۔

"لیکن اب وہ ایسی بھی قیامت خیز نہیں ہیں کہ تم ان پہ لٹو ہو جاؤ۔" دوسرے روز ڈینس نے برا مان کر کہا۔ وہ لوگ کالج کے ڈائننگ ہال میں ناشتے کی میز پر بیٹھے تھے دو رویہ سیاہ عباؤں کی قطاریں۔ چھری کانٹوں کا شور ہال کے سرے کی میز پہ پروفیسروں کی دھیمی دھیمی آوازوں کی بھنبھناہٹ اونچے دریچے میں سے باغ کا منظر ٹرنر کی کسی پینٹنگ کی مانند دکھلائی دے رہا تھا۔

"ایں —؟" سرل نے ذرا جھنجھلا کر کہا۔

"لیکن وقتاً فوقتاً ان سے ملتے ضرور رہا کرو۔ وہ اوبرزروکی کورسپونڈنٹ شپ" ڈینس نے کاناہوا میں ہلا کر جواب دیا۔

سرل اگلی بار جب لندن گیا تو ان کے فلیٹ کے پورٹر نے اسے بتایا کہ وہ جنیوا جا چکی ہیں۔ وہ باہر نکل رہا تھا تو اسے ایک اور لڑکی زینے پر ملی اور اسے پہچان کر ذرا سا مسکرائی۔

"ہلو۔" اس نے کہا۔

سرل نے شائستگی سے جھک کر اسے سلام کیا۔ اسے یاد آیا۔ یہ وہی لڑکی ہے جو اس روز ٹیگور جینتی میں اسٹیج پر اناؤنسمنٹ کر رہی تھی۔

یہ وہی لڑکا ہے جو ڈینس نے بتایا تھا کہ کسی لارڈ کا بیٹا ہے — چمپا نے یاد کیا۔

"میں بھی مسز مکرجی سے ملنے آئی تھی۔" اس نے سیڑھیاں اتر کر سڑک پہ آتے ہوئے کہا "مگر وہ جنیوا گئی ہوئی ہیں۔"

"آپ یہیں پڑھتی ہیں؟"

"جی نہیں۔ میں پیرس میں ہوں۔ آپ نرملا سریواستوا کو جانتے ہیں؟ وہ گرٹن میں ہے؟"

"جی ہاں۔ میں مس سریواستوا سے یہیں ملا تھا۔"

"اور کمال رضا —؟"

"سریکھا دیوی سے ان کا ذکر سنا ہے۔ ملنے کا اتفاق ابھی تک نہیں ہوا۔ آپ روشن آرا

کو جانتی ہیں —؟"

"جی نہیں - میں نے بھی سرکھیا اور ڈینس ہی سے ان کا ذکر سنا ہے ۔"

شروع کے پندرہ بیس منٹ ہمیشہ اس طرح صرف ہوتے ہیں کہ آپ فلاں کو جانتی ہیں اور آپ فلاں سے واقف ہیں اور جی ہاں فلاں بھی میرا کلاس فیلو رہ چکا ہے ۔

"آپ نرگیش کاؤس جی کو جانتے ہیں ؟" چمپا نے باآوازِ بلند استفسار کیا

"جی نہیں ۔ میں کسی کو بھی نہیں جانتا — میرا مطلب ہے — میرا حلقۂ احباب ڈینس کی مانند وسیع نہیں ہے —"

چمپا کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔ "میرا خیال تھا آپ شاید ینگ اشوتوش سے مل چکے ہوں ۔"

"میں ینگ اشوتوش سے نہیں ملا ۔ وہ کون ہے ۔"

"مسز مکرجی کا چھوٹا لڑکا ۔ وہ بڑا اچھا آرٹسٹ ہے ۔ پیرس میں رہتا ہے ۔"

چیلسی کا انڈرگراؤنڈ آگیا ۔

"اچھا اب آپ سے شاید کبھی کیمبرج میں ملاقات ہو ۔ اگر آپ کبھی وہاں آئیں ۔"

"یا شاید نہ ہو !"

"بہرحال اس موہوم امید پر کہ آپ سے کبھی دوبارہ ملاقات ہو ۔ میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں ۔"

"خدا حافظ —!" وہ ایک اخبار خریدنے کے بعد تیز تیز قدم رکھتی سرعت سے ایکسلریٹر پر اتر گئی ۔ ایک مکمل ، پُر اعتماد ، جدید ہندوستانی لڑکی ۔

اور اب آدھ گھنٹے سے وہ پکیڈلی کے انڈرگراؤنڈ میں چمپا کے انتظار میں ٹہل رہا تھا پچھلے دو سال میں چمپا سے کئی بار اس کی ملاقات ہوئی تھی اور آج چمپا نے اسے اطلاع دی تھی کہ وہ پیرس سے لندن آئی ہوئی ہے اور سرکھیا کے یہاں سب لوگ جمع ہو کر کھانا کھائیں گے ۔ سرل بیتاب تھا کہ سرکھیا کے یہاں پہنچ کر گلشن سے بحث کرے ۔ خط کے مصنف گوتم نیلمبر نے تقسیم ہند کا سارا الزام انگریزوں اور مسلمانوں پر ڈالا تھا اور لکھا تھا

کہ سر ، جنگ میں غیر جانب دار رہنے کا جو رویّہ اس کے ملک نے اختیار کیا ہے ۔ اینگلو امریکن بلاک ظاہر ہے ۔ اس کو پسند نہیں کر سکتا ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ سریکھا نے بتایا تھا کہ یہ گوتم نیلمبر بڑا انگارے اُگلنے والا افسان ہے ۔ حال ہی میں ماسکو سے تبدیل ہو کر یہاں آیا ہے ۔ سرل کو افسوس تھا کہ آج شام کو وہ اس شخص سے نہیں مل سکے گا کیونکہ سریکھا کی اطلاع کے مطابق وہ لندن سے باہر گیا ہوا تھا ۔

سرل بین الاقوامی وقت کے نیچے ٹہلتا رہا

۶۰

کیمبرج میں ایک دوکان سے نکل کر نرملا لائبریری کی اور جا رہی تھی کہ اسے گوتم نیلمبر دکھلائی پڑ گیا ۔

" نرمل — میں تو تم کو سارے میں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں — " گوتم نے لپک کر اس کی طرف آتے ہوئے کہا — " ایک انگریز مجرّد خاتون تمہارے کالج میں ملیں جو شاید عربی فارسی پڑھاتی ہیں اُنھوں نے مجھے ڈانٹ کر بھگا دیا ۔ پھر کمال نے کہا ۔ شاید اس وقت تم لائبریری میں ہو — کیسی ہو — کیا حال چال ہیں — "

نرملا نے آنکھیں بند کر لیں ۔ یہ گوتم تھا جو اس کے سامنے کھڑا اس سے جلدی جلدی باتیں کر رہا تھا ۔

" تم یہاں کیسے آ گئے ۔ "

" لندن سے آیا ہوں ۔ تم لوگوں سے ملنے ۔ "

" سنا ہے تم اب باقاعدہ فارن سروس میں ہو ۔ "

" ٹھیک سنا ہے ۔ "

" مزے میں ہو — ؟ "

" ہاں ۔ "

باتیں ختم ہو گئیں ۔ گوتم نے دیکھا کہ نرملا بڑی ہو گئی تھی ۔ سنجیدہ ۔ باوقار ۔ کم گو ۔

"لائبریری گول کرو۔ کمال اور طلعت نے کہا ہے۔ کوہ نور میں ملیں گے۔ چلو۔"

نرملا خاموشی سے اس کے ساتھ ہولی۔ برابر سے سیاہ عبائیں پہنے طالب علموں کی ٹولیاں گزر رہی تھیں۔ نرملا، گوتم کو بتاتی جا رہی تھی۔ یہ ڈینس ہے۔ وہ روشن جا رہی ہے وہ سرل ایشلے ہے۔ ادھر والا۔ بلونڈ لڑکا۔

یہ بھی اپنے وقت کے اکیلے ہیں۔ ان کا جواب نہیں۔ یہ بھی چمپا باجی کے چیلے بن چکے ہیں"

"اچ — چھا — چمپا سے تم لوگوں کا ملنا ہوتا رہتا ہے۔"

"اکثر۔"

"خوش ہیں؟"

"کیا پتہ — خوشی تو بڑی اضافی چیز ہے۔"

گوتم خاموش رہا۔ وہ کنگز کالج کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔

"مجھے لگتا ہے۔" نرملا کہہ رہی تھی "کہ چمپا باجی چند سال بعد مسز مکرجی کی ایسی بن جائیں گی — یہ کتنے دکھ کی بات ہے۔ تم جانتے ہو مسز مکرجی کو —"

"ہاں۔"

"وقت چوٹ دے کر چپکے سے آگے نکل جاتا ہے۔ کتنے دکھ کی بات ہے۔" نرملا نے دہرایا۔ گوتم اب بھی خاموش رہا۔

"تنبیلا دیبی پندرہ بیس سال پہلے کیا چیز رہی ہوں گی۔ لوگ ان سے دو باتیں کر لینا بھی فخر سمجھتے تھے۔ اب بے چاری اپنے بیٹوں کی عمر کے لڑکوں کو گھیر گھیر کر لے جاتی ہیں اپنے یہاں کافی پلانے۔ کتابیں لکھتی ہیں۔ فلیٹ اسٹریٹ میں مشہور ہیں۔ مگر کیا ان کی کتابیں اور ان کی شہرت زندگی کی ذاتی مسرت کا بہتر معاوضہ ہے؟ چمپا باجی بھی ایسی ہی بن جائیں گی حالانکہ قصور ان کا نہیں تھا۔ وقت نے ان کو چوٹ دی۔ انھوں نے دوسروں کو چوٹ دینے کی کوشش کی تھی۔"

گوتم چونک اٹھا۔ اس نے نرملا کو غور سے دیکھا۔

نرملا کی آنکھوں پہ بارش کی ایک بوند آن پڑی۔ اُس نے اپنا چہرہ رومال سے صاف کیا۔ اور کہتی رہی ــــ

"یہ ترسل کا دور ہے۔ کیونکہ وہ لارڈ ایشلے کا بیٹا ہے۔ جس طرح تم سر دیپ نرائن اور بھیا صاحب سر ذکی رضا بہادر کے فرزند تھے۔"

"نرمل تم چمپا کے ساتھ بہت بے انصافی برت رہی ہو ــ" گوتم نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں گوتم۔ یہ واقعہ ہے ــ چمپا باجی نے علاوہ اس کے کہ وہ خود مایوس ہوئی ہیں ہمیں بھی مایوس کر دیا ہے۔ کل کمال کہہ رہا تھا کہ کیا بات ہے۔ چمپا باجی کا سحر رفتہ رفتہ بالکل زائل ہو گیا۔ اس پر طلعت نے بھی ٹھیک بات ہی کہہ دی تھی۔ اُس نے کہا کہ چمپا باجی وہی ہیں۔ ہم لوگ بڑے ہو گئے ہیں۔"

گوتم نے اُداسی سے اُسے دیکھا۔ نرملا نے بات جاری رکھی۔

"پیرس میں تھیں مگر کام اُدھورا چھوڑ کر انگلستان آ گئیں۔ اب سُنا ہے۔ لندن میں کہیں نوکری مل گئی ہے اور اب یہاں بھی داخلہ لینے والی ہیں۔ اپنے متعلق کوئی فیصلہ بھی تو نہیں کر سکتیں۔ حد ہے۔ گوتم، چمپا ان لوگوں میں سے ہیں جن کو ہمیشہ کسی نہ کسی جذباتی سہارے کی تلاش رہتی ہے۔"

جیزس لین میں سے ٹرمپٹ کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ گوتم ٹھٹک گیا۔

"جانے کون ہے۔ اکثر بڑی غمگین دھنیں بجاتا ہے۔" نرملا نے کہا۔ بارش کی پھوار میں اُس کے بال بالکل بھیگ گئے۔ "بھیا صاحب بھی لندن میں تشریف رکھتے ہیں۔ پاکستان ہاؤس میں ڈپلومیٹ ہیں۔ آج کل وہ بہن روشن کو اپنی پینٹنگز دکھاتے رہتے ہیں۔"

اب وہ کوہ نور تک پہنچ چکے تھے۔

"گوتم ــ" نرملا نے سوچتے ہوئے پوچھا "لوگ اتنے پھیچڑ کیوں ہوتے ہیں؟"

وہ خاموش رہا۔ قریب سے طالب علموں کا ایک غول گزر گیا۔ سڑک کے کنارے

لاتعداد زرد پھول کھلے ہوئے تھے۔ بارش کی بوندیں کیتم کی سطح پر جلترنگ سے بجا رہی تھیں۔
"نرملا۔" گوتم نے رک کر کہا۔
"فرمائیے۔"
"تم مجھ سے شادی کرو گی؟"
"ہرگز نہیں۔"
"کیوں ـــ نرمل ـــ" آواز اُس کے حلق میں اٹکی۔
"اس لیے ـ" نرملا نے بڑی صاف اور گہری آواز میں کہا۔" کہ تم بھی پھٹیچر ہو ـــ
آؤ۔ اندر چلیں۔ بارش میں مت بھیگو۔"
نرملا واقعی بڑی ہو چکی تھی۔
وہ طعام خانے کے اندر داخل ہو گئے

۶۱

صبح چھ بجے چمپا اُٹھ بیٹھی۔ سورج کی ایک تیز اور گرم کرن عین اس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہی تھی۔ رات وہ دو بجے تک سریکھا کے یہاں گپیں ہانکتے رہے تھے۔ آخر لوگ اتنی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ غسل خانے میں سے جوَن نے سر نکال کر جھانکا۔" آج تمہاری ملازمت کا پہلا دن ہے ۔ جلدی تیار ہو جاؤ۔" چمپا نے بستر سے اُتر کر الماری کھولی اور بڑی کوفت سے ساریوں کو دیکھا۔ پھر اُس نے جوَن کو آواز دی۔" میں ورکنگ کلاس لڑکی ہوں۔ بتاؤ کون سی ساری پہنوں۔" پھر ناشتہ کر کے وہ بس میں بیٹھی اور سینٹ جانز وڈ پہنچی۔ ہَل کے فلیٹ پر جا کر اُس نے گھنٹی بجائی۔" کم اِن اِن ـــ" کسی نے اندر سے بشاش آواز میں کہا۔ وہ مزید ہمت کر کے اندر پہنچی۔ کمرے میں آتش دان کے سامنے صوفہ بچھا تھا۔ نیچی تپائیوں اور الٹرا ماڈرن آرٹسٹک طرز سے کمرہ سجایا گیا تھا۔ دیواروں پر جدید آرٹ کی تصویریں ٹنگی تھیں۔ ہندوستانی مجسمے رکھے تھے۔ ایک اسپینیئل کتّا بے نیازی کی شان سے آگ کے سامنے بیٹھا تھا۔ ہَل صوفے پر لیٹا کچھ پڑھ رہا تھا۔ ہلو مائی ڈیر ـــ کیا پیو گی؟"

"کچھ نہیں۔ شکریہ۔" چمپا نے کہا۔ پیرس میں رہ کر اسے معلوم ہو چکا تھا کہ بوہیمیا کے افراد کس اپنائیت اور بے تکلفی سے ایک دوسرے کو مخاطب کرتے ہیں

"پروف ریڈ کرنا آتا ہے؟" بل نے بے پروائی سے ایک پلندہ اس کے سامنے ڈال دیا اور باورچی خانے میں جا کر کھٹر پٹر کرنے لگا۔

شانتا کشمیری ریشم کی سیاہ سبز اور سرخ پھولوں والی ساری اور سیاہ کارڈیگن پہنے زینے پر سے اُتری۔ جو کمرے کے ایک کونے میں تھا۔ شانتا چمپا نے دیکھا کہ بے حد حسین تھی۔ بڑے بے ربک انداز میں وہ ٹائپ رائٹر پر جا کر بیٹھ گئی۔ پتہ نہیں اپنے میاں سے طلاق لینے کے بعد گوتم سے شادی کرنے کے بجائے اس نے بل سے شادی کیوں کی۔ عجب گھپلا ہے زندگی۔ چمپا نے تعجب سے سوچا۔ "گڈ مارننگ مسز کریگ ـــ" اس نے اخلاق سے کہا۔ سنا ہے مرہٹی میں بڑی عمدہ کہانیاں لکھتی ہے۔ اب میں اس کی کہانیاں پڑھنے کے لئے مرہٹی سیکھنے سے تو رہی۔ اس نے سرل سے کہا تھا۔ ہاں۔ مرہٹی مت سیکھنا۔ اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ سرل نے جواب دیا تھا

"میں گوتم سے تمہارا بہت تذکرہ سن چکی ہوں۔ یہ بڑی مختصر دنیا ہے ـــ" شانتا نے ٹائپ کرتے ہوئے اظہارِ خیال کیا۔

بل کافی کی کشتی اٹھا لایا۔ چمپا نے محسوس کیا کہ شانتا خاصی مغرور ہے۔ بل اتنا ہی خلیق تھا۔ "فرینک روس نے بھی تم کو بہت پسند کیا ہے۔" اس نے چمپا سے کہا۔

"فرینک روس ـــ؟" چمپا نے پوچھا

"ہاں۔" بل نے اطمینان سے اسٹیشن کی طرف اشارہ کیا۔ پھر وہ کاغذات کا پلندہ اٹھا کر پریس جانے کے لئے تیار ہوئے۔ چمپا کو بل کے پبلشنگ ہاؤس میں پروف ریڈر کی ملازمت کرنے کا یہ پہلا دن تھا۔

"تمہارا کیا پروگرام ہے زندگی کا۔" بل نے اس سے لنچ کے وقفے میں پوچھا۔ وہ انسانوں کو بھی پروف ریڈ کرتا تھا۔

"یہ تو بڑا زبردست سوال ہے۔"

"کیا تم بہت کنفیوزڈ ہو — ؟"

"ہاں ۔"

"تم بھی جال میں گرفتار ہو؟"

"ہاں ۔"

بَل منہ لٹکا کر خاموش ہو گیا۔ سب جال میں گرفتار تھے۔ وہ خود اور اس کی بیوی شانتا جو پہلے شریمتی شانتا نیلمبر تھی اور انگریزی اور مرہٹی میں ناول لکھتی تھی اور سرل ایشلے اور سارے مصنف اور ادیب اور ذہن پرست، سارے مغربی انسان، اور مغربی یورپین تہذیب۔ اور نیا ایشیا جس کے نمائندے یہاں موجود تھے مختلف جہنموں کے درمیان معلق تھے۔ انھیں اب معلوم ہوا تھا کہ پُل صراط پر چلنا کیا معنی رکھتا ہے۔ ان کی مسلمان اور ہندو اور بدھ روحوں کو بہت سی تکالیف لاحق تھیں۔ یہ لوگ جن کے متعلق ٹوئینبی نے دس کتابیں لکھ ڈالی تھیں اور اب تک کسی اطمینان بخش نتیجے پر نہ پہنچ سکا تھا۔

او رنیا ہندوستان اپنی روحانی بلندی اور اپنی تہذیب کی برتری کے سلسلے میں جارحانہ بنتا جا رہا تھا۔ یہ پبلسٹی کی دُنیا تھی۔ رسالوں اور کلچرل پروپیگنڈے کے پمفلٹوں اور کتابوں میں چھپنے والے کروڑوں الفاظ کی دُنیا۔ اور بَل الفاظ کا تاجر تھا اور الفاظ کی طاقت اور الفاظ کے کھوکھلے پن میں یقین رکھتا تھا۔ اسی لئے وہ شام کو اپنے اسٹوڈیو فلیٹ لوٹ کر شانتا کو تلقین کرتا کہ وہ گیتا کا دوسرا ادھیائے پڑھے اور شانتا ہنستی تھی۔ وہ بھی جال میں گرفتار تھی۔ ان سب کی پرائیویٹ جہنمیں، ذاتی تہ خانے اور نجی کائناتیں زیادہ تکلیف دہ اس لئے نہیں کہ ان میں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا

ایک راستہ تھا مگر وہ بے حد ہولناک تھا۔ بَل نے چمپا کو دیکھا "تم کمیونسٹ کبھی نہیں بنیں؟"

وہ چپ چاپ بیٹھی آلو کھاتی رہی۔

"تم افسانے لکھا کرو۔ میں تم کو بلڈ اپ کروں گا۔ ہندوستان کے متعلق ناولوں کا اس وقت انتہائی زبردست اسکوپ ہے۔ آر۔ کے نرائن اور ملک راج کو دیکھو۔ تم بھی لکھو

سمجھیں۔" اُس نے فیصلہ کُن انداز میں کہا۔

"افسوس کہ میں تمہارا مطالبہ پُورا نہیں کر سکتی۔ مجھے لکھنا بالکل نہیں آتا۔"

"اچھا؟ — یہ کیسے ممکن ہے۔ تمہارے گروپ میں تو ایک سے ایک ٹیکھک موجود ہیں۔"

"مجھے گروپ سے مماثل مت کرو۔"

"اچھا۔ تو آپ کا FAD یہ ہے کہ آپ انفرادیت پسند ہیں۔ اچھا ہے یہ بھی ——————" بل نے جواب دیا۔ پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا دفتر کی طرف چلا گیا۔ چمپا طعام خانے کی میز پر بیٹھی رہی۔

یہ جوزے کی سرائے تھی جہاں بہت سے جاننے والے دوپہر کے کھانے کے لئے جمع ہُوا کرتے تھے۔ قریب ہی بی بی سی کے اسٹوڈیو تھے۔ وہ ویٹرس کا انتظار کرتی رہی تاکہ پیسے چکائے۔ چند لڑکیاں کمرے میں داخل ہوئیں اور اس کو دیکھے بغیر کاؤنٹر کی طرف چلی گئیں۔ "یہ چمپا احمد ہیں۔ دوسروں کے منگیتر پھانسنا ان کا کریر ہے۔ اگر تم سمجھو کہ میں اسکینڈل مونگرنگ کر رہی ہوں تو نرملا سریواستو سے پُوچھو جسے ٹی بی ہو گئی ہے" ایک لڑکی نے کاؤنٹر پر سے ٹرے اٹھاتے ہُوئے کہا۔

"نرملا کو ٹی بی ہو گئی —؟" دوسری نے حیرت سے پُوچھا۔

"ہاں۔ اور وہ مڈہرسٹ سینی ٹوریم جانے والی ہے —" پہلی لڑکی نے جواب دیا۔ دونوں باتیں کرتی ہُوئی اپنی اپنی ٹرے اُٹھا کر کمرے کے دوسرے سرے پر چلی گئیں۔

تب چمپا نے چاہا کہ دوڑ کر ان کے پاس جائے اور اُن سے پُوچھے نرملا کیسی ہے۔ اُسے ٹی بی کس طرح ہُوئی۔ مگر وہ سکتے کے عالم میں وہیں بیٹھی رہ گئی۔ دریچے کے باہر سڑک پر سے رنگا رنگ ہجوم گزر رہا تھا۔ پھر اسے بہت سی جانی پہچانی شکلیں آتی اور جاتی نظر آئیں۔ بہت سے سفید ماسک جن کے اوپر ان کے نام لکھے تھے۔ زرینہ، سرکھا۔ طلعت، نرگیش۔ کملا۔ فیروز۔ یہ سب دوسرے دروازے سے طعام خانے میں داخل ہوئے۔ اُنھوں نے اسے ہلو ہلو کہا اور دوسری طرف چلے گئے

وہ سب نرملا کی بیماری کا تذکرہ کر رہے تھے اور بے حد پریشان نظر آتے تھے

پھر تیسرے دروازے سے عامر رضا داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ سسرل کی ہم جماعت روشن آرا تھی۔ عامر رضا کو چمپا نے آج اتنے برسوں بعد دیکھا۔ ان میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی سوا اس کے کہ پہلے سے زیادہ قیمتی سوٹ پہنے تھے اور زیادہ اعتماد سے قدم رکھ رہے تھے۔ انھوں نے چمپا کو دیکھا۔ ذرا ٹھٹک کر بڑے اخلاق سے آداب عرض کیا اور دُور کونے کی میز پر جا بیٹھے۔

"یہ دونوں ہم سب سے دُور ہی رہنا بہتر سمجھتے ہیں۔" طلعت کی میز پر کسی نے ہنس کر کہا۔

"اچھا ہی ہے۔ ہماری سنگت میں ان کے خیالات خراب ہو جائیں گے۔" کسی اور لڑکی نے جواب دیا۔

"اور ایمان جو خراب ہو گا وہ الگ ــــ"

"وہ الگ ــــ"

چمپا نے خلافِ ارادہ سر اٹھا کر ان کو دیکھا۔ سیّد عامر رضا، گلفشاں والے، لا مارٹینیر کالج والے، 'بھیّا صاحب' انسان جن لوازمات اور ایسوسی ایشنز کا مرکب ہوتا ہے۔ وہ پل کی پل میں کیسے بدل جاتے ہیں۔ اور یہ روشن نہ جانے کون تھی۔ بے چاری لڑکی۔ جو ہنس ہنس کر ان سے باتیں کر رہی تھی۔ دُنیا کے اندر اور کتنی دُنیائیں ہیں۔

چمپا نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ بیگ اٹھا کر طلعت کی میز کی طرف گئی۔ اور ان لوگوں سے نرملا کی خیریت دریافت کرنے کے بعد اپنے دفتر کی طرف روانہ ہو گئی۔

۶۲

سامنے دیودار کا جنگل ہے۔ سُرخ پتوں نے چاروں اور آگ لگا رکھی ہے۔ وادی میں ٹرینیں مکانوں کے پیچھے الگنیوں پہ پھیلے کپڑوں میں سے لہراتی اتر کی اور جا رہی ہیں۔

پارک میں زرد پتے اڑ رہے ہیں۔ جھیل میں ایک اکیلی کشتی ڈولتی ہے۔ آرام کرسیوں پر عسرت زدہ پنشن یافتہ بوڑھے، اپنی بے یار و مددگار آنکھوں سے سامنے کا دھند لکا دیکھتے ہیں اور کانپتے ہاتھوں سے کاغذی لفافوں میں سے بن نکال کر کھا رہے ہیں۔

آج کا دن ایک اور دن ہے۔ پل پر سے انسانوں کے گروہ یونیورسٹی، لا کورٹس سٹی کی اور جا رہے ہیں۔ میں کون ہوتی ہوں کہ اس اہمیت میں شامل رہنے سے انکار کروں ہاں یہ بالکل صحیح ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ جوزے کی سرائے میں وہ سب سرخ میزوں کے گرد جمع باتوں میں مصروف ہیں۔ یہ کون لوگ ہیں — ؟ کیا یہ ZERO HOUR ہے۔ مجھ سے بہت فاصلے پر لڑائیاں لڑی جا رہی ہیں اور سال ختم ہوا جاتا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے کہ ایک کرائسیس آکر گزر گیا؟ میں کیوں فکر کروں۔ جبکہ آج کی تہلکہ خیز خبریں کل ردی میں بکتی ہیں۔

گو سینٹ سیبستیان اپنے تیر کے انتظار میں کھڑا ہے۔

روشن نے سوچا۔

دیودار کا جنگل شفق کی سرخ روشنی میں چھپ گیا۔ اس جنگل سے میں بھی گزری ہوں۔ ہم سب گزرے ہیں۔ ہم نے اس میں ہیدر کے چھوٹے چھوٹے شگوفے جمع کیے تھے۔

(طلعت نے کہا)

کالج میں چھٹیاں ہیں۔ صولت روم سے آئی ہوئی ہے اور شکنتلا کے یہاں ٹھہری ہے۔ ہم سب کملا کے گھر میں محفوظ بیٹھے ہیں۔ گھر — نیچے صوفے۔ فرش پر بکھری ہوئی کتابیں۔ کھڑکی میں رکھی ہوئی اناناس کی ٹوکری۔ نیوکمن اور سترل کی بنائی ہوئی کیوبسٹ تصاویر۔ پرانے ملبوسات۔ تم چولہا سلگاؤ۔ میں پورٹر کو فون کرتی ہوں۔ دودھ کی بوتلیں کہاں رکھ گیا۔ مسٹر جنکنز۔ مسٹر جنکنز — یس مس — نو مس — ایک کمرہ ساری کائنات کا مرکز ہے۔

اوفوہ روشن ڈیر۔ آج اتنا کام تھا۔ کملا کہہ رہی ہے۔ چند روز بعد: دولتِ مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس ہے اور پھر سارا انفرمیشن ڈویژن۔ کشمیر کا مسئلہ۔ کوریا کا امن۔

کمیونٹی پروجیکٹس۔ آسام کے لوک ناچ۔ پلیسٹی۔ پلیسٹی۔
گیلری میں اوپر کی پانچویں منزل سے لفٹ آن کر رکا۔ نرگیش اندر آئی۔ وہ سب مل کر شکنتلا کے یہاں پہنچے جہاں ڈرائنگ روم میں شانتا اور بل موجود تھے۔ اور سریکھا، رام گوپال کی پارٹنر، سیدھی سادی، دلچسپ خلیق اور ذہین پنجابی لڑکی جو دیکھنے میں مرہٹی نظر آتی تھی اور زرینہ، بلونڈ، ہفت زبان، آرٹسٹ۔ جو فراٹے سے روسی بول رہی تھی۔ وہیں ڈیلین طامس بھی بیٹھے تھے۔ ان سب کا روشن سے تعارف کرایا گیا۔ ایک دنیا کے اندر اور کتنی دنیائیں ہیں۔ اس نے سوچا۔
پیرس میں ایک روز عامر رضا نے اسے مادموزیل دروپاری گا کر سنایا تھا اور اس سے کہا تھا۔ میتس کی تصویروں کے پیچھے گھوما گھوما پھرتا ہوں۔ میں صریحاً میتس پر عاشق ہوں۔ آپ کی شکل بھی میتس کی کسی پینٹنگ کی ایسی ہے اور اس نے کہا تھا "اے حسین خاتون۔ میں سکون کی تلاش میں ساری دنیا میں گھومتا ہوں۔ جہاں سایہ ملا وہاں بیٹھ گیا۔ کسی روز میں آپ کو اپنی کہانی سناؤں گا۔" وہ کہانی کیا ہوگی — کہانی کہنے والا کون ہے اور سننے والا کون۔
جی ہاں میں نے پروفیسر رادھا کرشنن کے لیکچر اٹنڈ کئے ہیں۔ جی نہیں — میں ہیگل پر مونوگراف لکھ رہی ہوں۔ اس نے مڑ کر بل سے کہا۔ جی نہیں مجھے ویدانت سے دلچسپی نہیں۔ مغربی فلسفہ میرا موضوع ہے — وہ باتیں کرتی بالکنی کی طرف چلی گئی۔ جہاں چاند مکانوں کی چمنیوں میں الجھا ہوا تھا۔ نیچے شفاف سڑک پر سے بسیں گذر رہی تھیں۔ تھیٹروں میں ٹریجڈیاں اسٹیج کی جا رہی تھیں۔ دریا پر سے جہاز گزر رہے تھے۔ نیم تاریک اسٹوڈیوز کے دریچوں میں سے بھی یہ چاند اندر جھانک رہا تھا جہاں ناکام مصور اور گمنام ادیب اور دولتمند مصور اور مشہور ادیب اپنی اپنی کائنات میں گھرے بیٹھے تھے۔ حدِ نظر تک مکان تھے۔ جن میں لوگ رہتے تھے۔ ان کو روشن نہیں جانتی تھی۔ عالیشان مکان اور مڈل کلاس مکان اور غریبوں کے مکان۔ اور قلعے اور محل اور کالج۔ ان سب جگہوں میں دکھ اور سکھ اور محبت اور نفرت اور امید اور ناامیدی اور کلمرانی اور شکستہ دلی کے ڈرامے ہو رہے تھے۔ بالکنی سے شہر ڈمی نیرو کی ایک پینٹنگ کی طرح نظر آ رہا تھا۔ سُرخ اور زرد اور

سیاہ دھبوں اور لکیروں کا ہیبت ناک مجموعہ۔

۶۳

جون کارٹر کا مکان ایک تنگ و تاریک گلی میں تھا جس میں وکٹورین عہد میں اصطبل تھا۔ اصطبل کے اوپر کوچبین کے کمروں میں جون اور نیل اور اودجیت رہتے تھے۔ نیل انجینئر ہونے کے علاوہ اس محلے کی اشتمالی جماعت کا سکرٹری تھا۔ اودجیت قانون پڑھ رہا تھا۔ جون کیمبرج میں گرٹن سے دو سال سینئر رہ چکی تھی اور یہاں یونیورسٹی میں ہنگرین زبان پڑھاتی تھی۔ کوچبین کے کمرے بہت خستہ حالت میں تھے۔ باورچی خانے میں کتابوں کی الماریاں تھیں اور نیل کی ورکشاپ جس میں وہ گھڑیاں اور بچوں کی موٹریں بنایا کرتا۔ اس کی بیوی نے اسے طلاق دے کر کسی مشہور ایکٹر سے شادی کر لی تھی۔ بوجہ نیل کی سیاسی مصروفیات کے۔ اس کے دو بچے تھے جو گاؤں میں اپنی دادی کے پاس رہتے تھے۔ فرصت کے وقت میں بے حد انہماک اور تندہی سے کوئی مکینیکل کھلونا تیار کرتا اور مہینے کے آخر میں اسے اپنے بچوں کو دے آتا۔ وہ بے حد کم گو انسان تھا۔ باورچی خانے میں ایک ٹوٹا صوفہ بھی پڑا تھا۔ ایک شکستہ اسٹوو کے اوپر ریڈیو رکھا تھا جو اکثر بند رہتا۔ کیونکہ نیل اسے ہمیشہ اوورہال کرتا رہتا تھا۔ نعمت خانہ عموماً خالی رہتا۔ برتن دھونے کا حوض برتنوں سے بھرا ملتا۔ کیونکہ اس مکان کے تینوں مکین بے حد کاہل تھے۔ الماری میں سے کبھی کبھار ایک آدھ پنیر کا ٹکڑا یا باسی ڈبل روٹی نکل آتی۔ کیونکہ اس گھر کے مکین بے حد مفلس تھے اودجیت غریب طالب علم تھا اور نیل اور جون اپنی تنخواہوں کا بیشتر حصہ پارٹی کو دے دیتے تھے۔ اودجیت کے کمرے میں ایک نیچا سا پلنگ پڑا تھا جو بیک وقت اس کی سنگھار میز، ڈیسک، کپڑوں کی کھونٹی اور بک شیلف کا کام دیتا۔ بہت سے خیر خواہوں نے کمر ہمت باندھ کر اودجیت کے کمرے میں تھوڑی سی تنظیم پیدا کرنے کی کوشش کی مگر اودجیت ان سب کوششوں کو کامیابی سے رائیگاں کرتا رہا۔ غسل خانے کی چھت کے باہر ٹیرس تھا جس پر تمام جلنے کے ٹوٹے برتن اور لکڑی کا صندوق تھا جس کے پیچھے محلے بھر کی بلیاں رات کو آ کر لڑتی تھیں۔ نیچے گلی میں صبح صبح کبھی

پیالوں والے گھوڑوں کی گاڑی آکر رکتی اور دودھ والا دودھ کی بوتلیں دروازے کی دہلیز پر رکھتا۔ اسی گلی کے نکڑ پر چارلس ڈکنز کا مکان تھا۔

جوآن کارٹر کا کمرہ اس فلیٹ میں گویا ہز مجسٹی کوئین ایلزبتھ کے کمرے کا درجہ رکھتا تھا الماریوں میں اَن گنت کتابیں ٹھنسی تھیں کیونکہ بہن جوآن کارٹر اللہ کے فضل سے چھ سات یوروپین زبانوں کی ماہر تھیں۔ آتشدان پر رنگ برنگی گڑیاں اور مشرقی یوروپین ممالک کے نوادر سجے تھے۔ کیونکہ جوآن ہر سال مشرقی یورپ میں منعقد ہونے والے نوجوانوں کے میلوں میں جایا کرتی تھیں اور وہاں سے تحفوں کے انبار ساتھ لاتی تھیں۔ اس کمرے کے دریچے میں روائتی سرخ جرنیم کے پودے تک موجود تھے۔ پلنگ کے برابر ٹیلیفون لگا تھا۔

چمپا احمد چند ہفتے قبل پیرس سے آکر جوآن کے یہاں ٹھہری تھی۔ جس سے اس کی ملاقات سرل نے کرائی تھی۔ وہ پبلشنگ ہاؤس سے لوٹ کر یہاں پہنچی تو اُسے جوآن دروازے میں کھڑی ملیں۔ میں ذرا ایک امن کانگریس کے لئے وارسا تک جا رہی ہوں میرے آنے تک تم یہیں رہو — راشن کے کوپن آتشدان پر رکھے ہیں اور اوجیت سے کہے جا رہی ہوں کہ وہ ہسٹری آف سویٹ کمیونسٹ پارٹی تم کو باقاعدگی سے پڑھاتا رہے۔ اتنا کہہ کر وہ غائب ہوگئیں۔

صبح سویرے دودھ کی بوتلیں گیلری میں سے اٹھا کر وہ باورچی خانے میں گئی اور ناشتہ تیار کیا۔ اس کا خیال تھا کہ دونوں لڑکے ڈریسنگ گاؤن پہنے اپنے اپنے کمروں سے نکل کر گڈ مارننگ کہتے چاء پینے کے لئے آجائیں گے مگر وہاں کا باوا آدم ہی نرالا تھا۔ دیر تک انتظار کرنے کے بعد اُس نے ان کے دروازوں پر جا کر آوازیں دیں مگر جواب ندارد۔ نو بجے اوجیت سو کر اُٹھے۔ معلوم ہوا کلاس گول کر دی ہے۔ ارادہ ہے پلنگ پر لیٹ کر ہی مطالعہ کریں گے۔ نیل تھوڑی دیر بعد برآمد ہوئے۔ ٹھنڈی چاء پی کر بڑے اطمینان سے کوٹ کندھے پر جھلاتے لمبے لمبے ڈگ بھرتے زینے پر سے اُتر گئے۔

فرانسیسی انداز میں کندھے اچکا کر چمپا مسکرائی۔ اور برساتی اوڑھ کر اُس نے بھی اپنے

دفتر کا رُخ کیا۔ یہ دستور العمل اسے ناپسند نہ ہوا۔ جس کی موڈ ہوئی دوسرے سے بات کر لی۔ ورنہ اپنے اپنے کام میں مگن رہے۔ ویک اینڈ پر فیروزیا سریکھا کے یہاں محفل جمتی اور رات گئے تک ہنگامہ رہتا۔ چمپا بنارس اور لکھنو اور پیرس کے بعد زندگی کے اس پیٹرن کی بھی عادی ہو گئی۔

گوتم، چمپا سے کہیں نہیں ملا۔ سُنا تھا کہ وہ اب بے حد اہم آدمی بن گیا ہے بے انتہا مصروف رہتا ہے۔ انڈیا ہاؤس کا سب سے زیادہ کارپرداز افسر ہے۔ کمال کیمبرج میں تھا۔ ہری شنکر امریکہ میں۔

ایک روز وہ اور سب کے ساتھ ہندوستانی طالب علموں کی کانفرنس میں گئی جو ایسیکس کے سبزہ زاروں میں منعقد کی گئی تھی۔ یہاں وہ سب دن بھر ناچتے اور گاتے اور سمپوزیم اور مشاعرے منعقد کرتے۔ ایک رات جب وہ ایک چیری کے درخت کے نیچے کھڑی نوجوانوں کے اس ہنگامے کو دیکھ رہی تھی جو چاند کے تلے سبزے پر برپا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ وقت پانی کی طرح سرسراتا اب بہت تیزی سے بہہ رہا ہے جس طرح ریگ خشک ام ندی پُر خطر پہاڑیوں اور گھاٹیوں میں پہنچ کر تند رو ہو جاتی ہے اور وہ ایک چٹان پر علیحدہ اور تنہا کھڑی ہے۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا بہت بڑا گروہ انٹرنیشنل گا رہا تھا۔ بیک وقت اس کے الفاظ انگریزی اُردو اور فرانسیسی میں ادا کئے جا رہے تھے۔ وہ کان لگا کر سنتی رہی۔ "دُنیا بھر سے ایک ہوئے نوجوان ایک آدرش یہاں لیے۔

One great vision unites us Tho' remote be the lands of our birth.

Foes may threaten and smite us, still we live to bring peace to the earth.
Ev'ry country and nation stirs with youth's aspiration.

Young folks are singing, happiness bringing, Friendship to all the world. Ev'ry where the youth is singing freedom's song, freedom's song, freedom's song.

یہ سب یہاں سے جا کر کیا کریں گے۔ ان کے ساتھ کیا ہوگا۔ باہر کی دنیا کے ساتھ ان کو کیسے سمجھوتے کرنے پڑیں گے۔ برابر سے برطانوی لڑکوں اور لڑکیوں کی ایک ٹولی

ویلش فوک گیت گاتی گزری۔ دور فارم ہاؤس کے ہال میں ڈرامے کی مشق کی جارہی تھی۔

میں نے یہ سب پہلے بھی دیکھا ہے۔ میں نے یہ سب پہلے بھی دیکھا ہے۔ اس نے ایلیٹ کے کردار کی طرح دہرایا۔ اس کے قریب سے دو لڑکیاں اور ایک بوڑھا آدمی باتیں کرتے گزرے۔ اس نے چاندنی کے دھندلکے میں غور سے دیکھا۔ لڑکیاں فیروزا اور طلعت تھیں جو پروفیسر لیوی سے باتیں کرتی سبزے کی طرف جا رہی تھیں اور اس ماحول اور ان فضاؤں میں مکمل طور سے گھلی ملی معلوم ہو رہی تھیں۔ میں ہمیشہ، ہر جگہ علیحدہ رہوں گی۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ حالانکہ اوجیت مجھے ساری ہسٹری اف سوویٹ کمیونسٹ پارٹی پڑھا چکا ہے — آخر میں وہ سب کیوں نہیں کرسکتی جو دوسرے کرتے ہیں وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی جا کر گجراتی لڑکوں اور لڑکیوں کے گربا میں شامل ہو گئی جو باغ کے ایک حصے میں جاری تھا —

ہے گووندا گھو چرن اب تو جیون ہارے —

سندھ کے کنارے اسندھ کے کنارے —

لڑکیوں نے دہرایا۔

ناچتے ناچتے اس کے دل پر چوٹ لگی — سندھ ؟ — سندھ تو پاکستان میں ہے۔ پھر اسے دفعتاً یاد آیا — یہ حقیقت ہے۔ ملک تقسیم ہو چکا ہے۔ دو قومیں ہیں۔ میں مسلمان ہوں۔ اس لئے قابل نفریں ہوں ؟ یہ لوگ ہندو ہیں۔ اس لئے قابل گردن زدنی ہیں ؟ — پنجاب سندھو گجرات مراٹھا دراوڑ اتکل ونگا — کیا بکواس ہے۔ میں تو ہمیشہ ٹیگور کی اس رومان پرستی کی مخالف رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اور یہ لوگ دو مختلف قومیں ہیں — مگر میں تو ہندوستانی ہوں۔ اس سے کیا ہوا مسلمان تو ہوں۔ اور کہا جاتا ہے کہ ہر مسلمان دل سے پاکستانی ہوتا ہے — مائیکل سے پوچھنا چاہئے۔ اس نے یہودی کی حیثیت سے اس کشمکش کو کیسے حل کیا — کیا میں ڈاکٹر لیوی سے چل کر اس کا حل پوچھوں۔

ناچ کے اختتام پر وہ چند لڑکیوں کے ساتھ فارم ہاؤس کے باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

۶۴

الاؤ سرد ہو چلا تھا۔ وہ سب گھاس پر بیٹھے رہے۔ چاند فارم ہاؤس کی چمنی پر پہنچ گیا تھا بارن میں سے اکارڈین کی آواز آ رہی تھی۔

پروفیسر لیوی باتیں کیا کیے۔ ان کی کتاب "لٹریچر ان دی ایج آف سائنس" ایک گھنٹے سے زیر بحث تھی۔ ان کے برف کے ایسے بال چاند کی روشنی میں چاندی کی مانند چمک رہے تھے۔ ہوا میں خنکی آ چلی تھی۔

"مجھے کچھ اپنے متعلق بتاؤ۔" انھوں نے سوچتے ہوئے کہا

"اپنے متعلق —؟" طلعت نے جواب دیا۔ "ہم لوگ — ہم لوگوں میں کوئی خاص بات نہیں — بالکل ذرا سا بھی کوئی اسرار نہیں۔ قطعاً —"

پروفیسر لیوی کے اور ان لڑکیوں کے درمیان کتنا بڑا فاصلہ تھا۔ پروفیسر کی اور ان کی عقلوں اور عمروں میں نصف صدی سے زیادہ کا تفاوت تھا۔ لیکن اس کے باوجود، ان کی فرشتوں کی ایسی شفقت کی وجہ سے گرما کی اس خنک رات کو دفعتاً کیسی یگانگت محسوس ہوئی۔ وہ اتنے بڑے آدمی تھے۔ دنیا کے چوٹی کے دماغوں میں سے ایک، اور کتنے خلوص سے وہ کہہ رہے تھے "جب تم لوگوں نے مجھے بلایا تو، حالانکہ میرے پاس وقت نہ تھا۔ پر میں نے سوچا، میری قوم نے اتنی صدیوں تک جو برتاؤ تمھارے ساتھ کیا ہے، ذاتی طور پر ایک اکیلے فرد کی حیثیت سے اپنی جگہ میں اس کا کفارہ اسی طرح ادا کر سکتا ہوں کہ تم لوگ جب بھی کہو میں تمھاری محفل میں آ شامل ہوں۔"

طلعت نے ایک خشک ٹہنی آگ میں پھینکی اور اس نے ہائی مین لیوی سے کہا۔ "ہم تو اتنے، یونہی سے لوگ ہیں۔ اور غالباً سخت خوف زدہ۔ جو ٹامس بیکٹ کے کورس کی بیچاری عورتوں کی طرح چلا رہے ہیں۔

فضا کو دھوؤ۔ آسمان کو دھوؤ۔ ہوا کو دھوؤ۔ پتھر کو پتھر سے علیحدہ کر کے دھوؤ۔ زمین ناپاک ہے۔ پانی ناپاک ہے۔ ہمارے جانوروں کے گلّے، ہم خود، خون میں لت پت ہیں۔

خون کی بارش نے میری آنکھیں اندھی کردی ہیں۔ میں خشک پتھروں کی سرزمین پر گھومتی ہوں اور اگر میں ان پتھروں کو چھُو لوں تو ان میں سے بھی خون بہنے لگتا ہے۔ میں ٹھنڈے موسم بہاراں کی طرف کس طرح لوٹوں ؟

فضا کو دھوؤ۔ آسمان کو دھوؤ۔ پتھر کو پتھر سے علیحدہ کرکے دھوؤ۔ ہڈیوں کو دھوؤ دماغوں کو دھوؤ۔ روحوں کو دھوؤ ۔۔۔

بار میں سے یک لخت گٹار کی آواز بلند ہوئی۔ ایوان مک کال کی صاف گہری آواز سارے میں چھا گئی۔

اب رات زیادہ آ گئی ہے۔ میں اگر تیز تیز چلوں تو قریب کے کسی اسٹیشن سے شہر کے لئے ٹرین پکڑ لوں گا ۔۔۔ پروفیسر لبوی نے پتھر پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ ۔۔۔ آپ پیدل جائیے گا ؟" فیروز نے گھبرا کر کہا۔

"کیا حرج ہے ۔۔۔" اُنھوں نے اطمینان سے جواب دیا ۔۔۔ "پیدل چلنا کوئی بری بات ہے۔ ابھی تو شاید بس بھی یہاں سے کوئی میل بھر کے فاصلے پر مل جائے گی۔"

لڑکوں اور لڑکیوں کی ٹولیاں مختلف یوروپین زبانوں کے کورس گاتے فارم ہاؤس کی طرف جا رہے تھے۔

سامنے سیب کے جھنڈ میں ایک کارآن کر رکی۔

"الو ۔۔۔" عامر رضا نے آواز دی۔

"الو ۔۔۔" اوجیت نے خالص فرانسیسی لہجے میں نعرہ بلند کیا۔

"آئیے آئیے بھیّا صاحب۔" طلعت نے کہا۔

وہ سب بار میں داخل ہو گئے۔

"میں جلدی میں ہوں۔ دُور سے گانوں کی آوازیں سُنیں تو ٹھٹھک گیا ۔۔۔" اُنھوں نے طلعت سے کہا۔ پھر وہ ایک اطالوی لڑکی سے نہایت گیلنٹ انداز میں جھک کر مخاطب ہوئے: "مجھے اپنا سیکسوفون دو ۔۔۔"

"بھیّا صاحب ۔۔۔ آپ ایوان سے ملے ہیں؟" فیروز نے لکھنؤ کے ناطے سے ان سے

اخلاق برتنے کی سعی کی۔" یہ اس ملک کے سب سے بڑے بیلڈ گانے والے ہیں۔ اور بہترین ڈرامائسٹ۔"

"مجھے اپنا سیکسوفون دو۔ میں تمھیں وینس کی نہروں کا ایک گیت سناؤں گا۔" عامر رضا نے فرانسیسی انداز میں اطالوی لڑکی سے کہا

"لاحول ولاقوۃ۔" فیروز نے جھنجلا کر ان سے سوشل گفتگو کی سعی ترک کر دی۔

"آئیے یہاں بیٹھئے عامر بھائی۔" وتو نے ان کے لئے پرال پر جگہ بنائی۔ سب لوگ ان سے طلعت اور کمال کے کزن کی حیثیت سے واقف تھے۔ اطالوی لڑکی بھی اپنا باجہ سنبھال کر ان کے قریب جا بیٹھی۔ "ترقی پسند عوامی محاذ خطرے میں ہے۔" سر یکھا نے چپکے سے زرینہ کے کان میں کہا۔

"بھائی عامر کی حالت پہلے ہی ناگفتہ بہ ہے۔" فیروز نے سرگوشی میں تشویش ظاہر کی۔

"اور یہ بہن مریا گرزولی اتنی دور روم سے ڈیلی گیٹ بن کر اس لئے آئی تھیں کہ بھیا صاحب ان کو وینس کے گیت سنائیں۔ یا اللہ تو ہی رحم کر۔" طلعت نے جل بھن کر کہا۔

"یہ بھی اپنے وقت کے رڈولف ویلنٹینو ہیں۔" نخیلا نے اظہار خیال کیا۔

لڑکوں نے پرچھتی پر چڑھ کر ایک اسپینش گیت شروع کر دیا۔

"اچھا بھئی۔ یون نوئی۔" کچھ دیر بعد عامر رضا نے پرال پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"یون نوئی۔" کورس ہوا۔

بارن سے باہر نکل کر وہ سیبوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئے۔

"۔۔۔ ؟" ایوان نے مجمع کی طرف استفسارانہ نظریں اٹھائیں۔

"یہ مک کمال صاحب۔۔ ایک ایسی منزل مقصود ہیں جس کی طرف بہت سی لڑکیاں سفر کر چکی ہیں یا کر رہی ہیں یا کرنا چاہتی ہیں۔۔" فیروز نے کھڑکی میں سے کہا۔

"ماشاءاللہ سے کس قدر پروفاؤنڈ بات کہی ہے۔" طلعت نے داد دی۔

سب نے مل کر امریکن حبشیوں کا بیلڈ شروع کر دیا۔

For if you are white, you're all right ;
If you are brown stick around,
But if you are black
Oh, no! Brother, get back, get back, get back.

گیت کی آواز دیر تک کھیتوں کے وسیع سناٹے میں گونجتی رہی۔ پھر سب لوگ اپنے اپنے خیموں اور کیبنوں کی طرف جانے کے لئے اُٹھے۔

لوگ کیبن میں ساری لڑکیاں آچکی تھیں اور سونے کی تیاری کر رہی تھیں۔ یہ ہندوستان کے سارے صوبوں سے آئی تھیں اور ہسٹری پڑھ رہی تھیں، اور ڈاکٹریٹ کے لئے کام کر رہی تھیں، اور اخبار نویسی اور ڈاکٹری کی ٹریننگ حاصل کر رہی تھیں۔ سائنس دان تھیں اور آرٹسٹ تھیں۔ اور گاتی اور ناچتی تھیں اور پچھلے ایک ہفتے سے کانفرنس میں نہایت مدلل تقریریں کر رہی تھیں اور رات کو فارم ہاؤس کے باورچی خانے میں مندوبین کے لئے کھانا تیار کرتی تھیں۔ رفتہ رفتہ رات کا سناٹا آسمانوں سے اُتر کر سارے میں پھیل گیا۔ وادی میں کچھ دُور پرخانہ بدوشوں کا قافلہ ٹھہرا ہوا تھا۔ ساری کائنات اس برستے ہوئے احساس کے دھارے میں کہیں بہہ گئی۔

۶۵

اے ہمارے آسمانی باپ۔ ہمیں آج کے دن ہماری روزانہ کی خبریں عطا کر۔ طلعت نے کانفرنس سے لوٹ کر شہر کے اسٹیشن پر پہنچتے ہوئے آنکھیں بند کر کے دعا مانگی۔ اور سرپٹ دفتر کی طرف دوڑی آجکل وہ ایک اخبار کے دفتر میں کام کر رہی تھی۔

نیوز روم میں وہی گہما گہمی تھی۔ اس نے اپنی میز پر جا کر کاغذات کو الٹا پلٹا۔ اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

"ہلو — ہلو —"

"ہاں کون ہے بھائی -"

دوسرے سرے پر فیروزہ دہاڑ رہی تھی -

"ساجدہ آپا کسی بین الاقوامی کانفرنس سے لوٹی ہیں - چچا نے کہا ہے - فوراً اسٹوڈیو پہنچ کر ان کا انٹرویو کرو —"

وہ سہ پہر کو اسٹوڈیوز پہنچی -

بی بی سی کی کنٹین میں حسب معمول شور قیامت مچا تھا - یورپین، مڈل ایسٹرن، اور فار ایسٹرن سروسز کے لوگ اپنے اپنے دفتروں سے نکل کر لنچ کے لئے آ رہے تھے - ہسپانوی، اسرائیلی، عرب، ایرانی، فرانسیسی، ہندوستانی، پاکستانی، ان سب کی عجیب و غریب برادری تھی - بہت سی میزیں برابر برابر لگا کر ہندوستانی اور پاکستانی گروہ اکٹھا بیٹھا کرتا - یہ تقریباً سارے کے سارے اولڈ ٹائمرز تھے - صدیق احمد صدیقی جو علی گڑھ برادری کے جگت چچا اور اپنی ذات سے انجمن تھے - یاور عباس - اعجاز بٹالوی - تقی سیّد - آل حسن عطیہ - زرینہ -

"اور وہ وفد آ گیا جس کا انٹرویو ہے"۔ طلعت نے اندر آ کر فیروز سے پوچھا - کنٹین میں ایک طرف کو ساجدہ آپا قناعت سے بیٹھی پیالی میں کانٹا بجا رہی تھیں "اب چلو ان کا انٹرویو کرنے"۔ — زرینہ نے چپکے سے کہا۔

"ان کا — ان کا —"

"اور کیا —"

"اور وہ وفد کہاں گیا جو جانے کہاں سے ہو کر آ رہا ہے ؟"

"یہی تو وفد ہیں -" زرینہ نے اس انداز سے کہا - گویا اب دُنیا کا کوئی رنج و غم اس پر مزید اثر نہیں کر سکتا -

— بس ہر وقت ہاتھ ہلا کر اور کندھے اُچکاتے ہوئے طرح طرح کی شکلیں بناتے سڑکوں کے کنارے بیٹھے کافی پیتے رہتے ہیں —" ساجدہ بیگم بیزاری سے فیروز سے مخاطب تھیں -

"جی ہاں۔ بڑے بیہودہ ہوتے ہیں۔ اب یہی دیکھئے۔ سڑک پر بیٹھ کر کافی پینے کی کون تک ہے۔" زرینہ نے کامل اتفاق ظاہر کیا۔

"کون؟" طلعت نے چپکے سے پوچھا۔

"اطالوی یا غالباً فرنچ — ان میں سے ایک قوم سے یہ بہت خفا ہیں۔" زرینہ نے بتایا۔

"پچ پچ — پور ڈیرز۔" طلعت نے کہا۔

"بوشش"۔ ساجدہ آپا نے بات ختم کی۔ "مجھے ہر دفعہ انگلینڈ دو —"

اسٹوڈیو میں پہنچ کر ساجدہ بیگم مائیک کے سامنے بیٹھیں "جب میں میڈرڈ میں تھی۔ تو اہلیہ اہرن برگ سے میں نے کہا۔"

طلعت نے نڈھال ہو کر اسکرپٹ ایک طرف رکھ دیا۔

"دیکھو ساجدہ آپا گپ نہ ہانکو۔ مجھے معلوم ہے تم میڈرڈ کبھی نہیں گئیں۔"

"چلو میڈرڈ کے بجائے اوسلو کر دو۔ فرق کیا پڑتا ہے۔" زرینہ نے اطمینان سے رائے دی۔

"اور اہلیہ اہرن برگ کون ہیں —؟" فیروز نے طلعت سے مطالبہ کیا۔

"یہ اہرن برگ صاحب کی گھر میں سے ہیں —" زرینہ نے جواب دیا۔

"دوسری بات یہ کہ یہ میڈرڈ میں کیا کر رہے تھے۔" فیروز نے مزید جرح کی۔ "کہاں میڈرڈ کہاں غریب اہلیہ —"

ساجدہ بیگم نے کھسر پھسر سنی تو اسکرپٹ پر سے سر اٹھا کر ادھر متوجہ ہوئیں اور ایک لحظے کے لئے زرینہ کو دیکھ کر چونکیں کہ یہ سبز فراک میں ملبوس بلونڈ لڑکی یہاں کیا کر رہی ہے۔ پھر غالباً ان کو یاد آ گیا کہ یہ زرینہ ہے — "کیا پوچھنا ہے آپ کو؟"

"ہاں پیاری بہن — پتہ نہ مارو۔ جو پوچھنا ہے پوچھ لو۔ پھر یہ وقت ہاتھ نہ آئے گا — زرینہ نے طلعت سے کہا۔

ساجدہ بیگم نے بو   مانی ہوئی زنانہ لیڈر تھیں کہنا شروع کیا — "مجھے یہاں کا

طریقہ تعلیم بہت پسند آیا۔"

"کتنی خوشی کی بات ہے۔" فیروز نے کہا۔

"ہالینڈ میں جہاں میں ابھی گئی تھی۔ ہر جگہ لالہ کھلا ہوتا ہے اور لوگ لکڑی کے جوتے پہنتے ہیں۔" اُنھوں نے مزید انکشاف کیا۔

انٹرویو ہوتا رہا۔

چند روز بعد سُنا گیا کہ ساجدہ آپا نے طلبار کی انجمن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ جب میں وطن کی نمائندگی کرنے کوپن ہاگن گئی تو ڈنمارک کی بی بی سی سے ایک تقریر کے دوران میں نے بتلایا کہ بائی دی گریس اف اللہ —

اس کے چند روز بعد اطلاع ملی کہ سید عامر رضا نے ساجدہ بیگم کو استانبول کھانے پر مدعو کیا ہے۔

یہ دعوت ساجدہ آپا کے لئے تباہ کُن ثابت ہُوئی۔

۶۶

وقت کالے تھنبوں کی طرح آگے آگے بھاگ رہا ہے۔ اس کے لرزہ خیز سائے چاروں کھونٹ منڈلاتے ہیں وقت جو گزر رہا ہے آخر مجھے ختم کر دے گا۔

خداوند کی ماں مریا۔ جس کا دل سات بار زخمی ہُوا مجھ پر رحم کر۔

میرے پُرانے دُشمن۔ روشن سیبوں کے سائے میں چلتی رہی۔ جیزس لین میں کسی نے ٹرمپٹ پر ایک پُرانی دھن بجانا شروع کر دی۔ پتھروں پر سے ندی کا پانی بہتا جا رہا تھا۔ ایک کتا ہنستا ہُوا اسے عبور کر رہا تھا۔ پتلی ٹہنیوں والے درخت پانی کی سطح پر جھکے ہوئے تھے۔ ان کی چھاؤں میں ایک بطخ تیر رہی تھی۔

وہ کواڈرینگل میں داخل ہُوئی۔

"روشن" کسی نے دریچے میں آکر اسے آواز دی۔

"روشن — اندر آؤ — کیا تم بھی اس کانفرنس سے واپس آ رہی ہو۔ جس میں

دُنیا کے مستقبل کے بارے میں تجویزیں پاس کی گئی ہیں —؟" سِرل نے دروازے میں آکر کہا۔

"نہیں۔" اُس نے اپنے پیروں کو دیکھا۔ "نہیں۔ میں محض ہنرل پیر تک گئی تھی۔"

"وہاں کیا ہے —؟"

"کچھ نہیں —"

"ڈینس نے ایک نئی نظم لکھی ہے۔"

"ہلو ڈارلنگ —" سریکھا نے آتش دان کے پاس سے اُٹھتے ہوئے اُس سے کہا۔

"تم کب آئیں۔"

"میں —؟ مجھے کیمبرج مجلس نے مدعو کیا تھا۔"

"میں اپنی نئی کتاب تمھارے نام معنون کروں گا —"

ڈینس سریکھا سے کہہ رہا تھا۔ روشن دریچے میں کھڑے ہو کر ان سب کی گفتگو سُنتی رہی (پھر یہ سب لوگ اُڑ کر چلے گئے۔ ان میں سے کچھ ملایا اور کوریا اور کینیا میں مارے گئے۔ کچھ کار کے حادثے میں زخمی ہو گئے یا حلق میں کینسر نکل آنے کی وجہ سے ختم ہوئے چند کو اعلیٰ ملازمتیں مل گئیں۔ کچھ نے کتابیں لکھیں۔ شہرت پائی اور دُنیا ان کے قدموں کے نیچے آگئی۔ چند ایک یونہی رہ گئے)

"ہونہہ — خدا۔" ڈینس کہہ رہا تھا۔

"خدا۔" سریکھا نے کہا "جب میں ناچتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے۔ واقعی شیو نے تلاتا کے سُروں پر کائنات تخلیق کی تھی۔ وہی احساس اگر مستقل منجمد کر دیا جائے تو شاید خدا ہو گا۔

— تلاتا کی دُھن کا احساس — پتہ نہیں۔"

"ابھی شاید دروازے میں سے وہ داخل ہو گا جس کا کوئی نام نہیں۔ دیکھو باہر ایک منحوس چاند پُرانی قندیل کی طرح ڈول رہا ہے —" سِرل نے کہا۔

"ویک اینڈ کے لئے شہر چلو گی — میں رات کی گاڑی سے واپس جا رہی ہوں۔"

سر تہمینہ، روشن سے بات کرنے کے لیے دریچے کی طرف مڑی۔ مگر روشن باہر جا چکی تھی۔
"چلو ہم سب روشن کے ساتھ ہیزل میئر چلیں —" سرل نے سگریٹ رول کرتے ہوئے تجویز کیا۔
"کیوں، ہیزل میئر کس لیے اور کوئی جگہ کیوں نہیں —" مائیکل نے سوال کیا۔
"سب جگہیں ایک سی ہیں۔ کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" ڈینس نے کہا۔
"لہٰذا ہیزل میئر چلو۔" سب نے مل کر نعرہ لگایا۔
"روشن — ہم تمہارا تعاقب کر رہے ہیں۔ ہم تمہارے دشمن ہیں۔ ہم تمہارے دوست ہیں۔" سرل نے کہا۔
وہ رات کی مدھم روشنی میں جنگل کی طرف جانے والی سڑک پر آ گئے۔
یہ وسط گرما کی رات ہے۔ چڑیلیں اور بھتنے اور اگیا بیتال درختوں کی چھاؤں میں دوڑتے پھر رہے ہیں۔
سندیشور — ؟ روشن بھاگتے بھاگتے تھک کر ایک پگڈنڈی پر بیٹھ گئی۔
تمہاری حقیقت دھندلکے میں چھپی ہے — عامر رضا نے انگلی اٹھا کر واضح کیا۔ میں اس کے سفر میں شامل رہوں — ؟ اس نے کہا اور گھاس پر بیٹھ کر غور و فکر میں ڈوب گیا۔
پہاڑیوں پر روشنیاں جل رہی ہیں۔ جنگلوں میں سرخ کوٹ پہنے شکاری ویبر کی دھنیں بجا رہے ہیں۔ اتوار کے دن ہمیں ہیمپٹن کورٹ اور سر ل ایشلے کے محل میں داخل کیا جاتا ہے — مائیکل نے کہا۔
لیکن ہم بھوکے تھے۔ لہٰذا اپنی کتابیں بیچ کر کھا گئے۔ اس شخص نے کہا جس کا کوئی نام نہیں۔
جنگل میں وہ سب خرگوشوں کی طرح اچھلتے پھر رہے ہیں۔ ڈینس سر کے بل کھڑا کملا کو اپنی نظم سنا رہا ہے۔ سر تھامس راج کے ایک انداز میں منجمد ہو گئی ہے۔ ڈیلن طامس جھیل کے کنارے بیٹھے گیتا کا پاٹھ کر رہے ہیں۔
"سنو۔ کیا تمہیں بھی کسی دور کے فاصلے کی فون کال کا انتظار ہے — ؟" سرل نے

قریب آکر عامر رضا سے دریافت کیا۔

"ہاں۔ نہیں۔" عامر رضا پھر گھاس پر بیٹھ کر سوچ میں مبتلا ہو گیا ہمارے خواب مختلف ہیں۔ خالص خیال خوفناک ہے۔ ٹھہرو — تفصیلات کی دنیا میں ہمارا میبھون کہاں ہے۔ — جلد بتاؤ — مجھے دیر ہو رہی ہے۔ اس نے یک لخت گھبرا کر روشن سے پوچھا۔ وہ روشن کے سامنے گھاس پر جھک گیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ چمپا ہے۔

ہمیں دیر ہو رہی ہے — جلدی کرو — چولدی — چول — چول — چول — پہاڑیوں پر گھنٹیاں بجنا شروع ہو گئی ہیں۔ میرے دماغ کے ویرانے میں جو ہوائیں سسکا رہی تھیں۔ اب وہ آندھی بن کر سارے میں پھیل گئی ہیں۔ چمپا نے کہا جو دراصل روشن تھی — میں تمہارے تھکے ہوئے پاؤں دھوؤں گی۔ تم گرم قالین پر آگ کے سامنے بیٹھے رہنا۔ جلدی — جلدی — دیر ہو رہی ہے —

شور میں اضافہ ہو گیا۔ چلو — چلو — ہیزل بیئر چلو — دلی چلو — چرچل کے گھر چلو — دنیا بھر سے ایک ہوئے نوجوان — ایک آدرش مہان لئے — خطرہ ہو بلیدان کا — پھر بھی ہم لائیں گے سکھ چین — لائیں گے سکھ چین —

— ان بستیوں کو جگمگانا ہے سدا — ان کھیتیوں کو لہلہانا ہے سدا — ہم کیا گورے کیا کالے۔ رب ایک ہیں۔ ایک ہیں۔ ہم موت پر ہنسنے والے سب ایک ہیں ایک ہیں — کہہ رہے ہیں ہم ہیں شکتی مان — اور وشو ما تا یہ ستّ گان — خطرہ ہو بلیدان کا — خطرہ ہو بلیدان کا — جوانیاں ہیں گا رہی — ہنسی خوشی منا رہی — دنیا بھر سے ایک ہوئے نوجوان — نوجوان — کارارائی لو ہو کہ پاٹ بھنگ رے بھنگ کو رے لو پاٹ — آزاد دلی میں ہیں۔ نہرو جینوا میں ہیں۔ ایشیا کا سب سے بڑا اسٹیڈیم بہاول پور میں ہے۔ روشن، عامر رضا کے چکر میں ہے — سٹر گھنٹہ، یہ ساری سرمایہ داری کی سازشیں ہیں۔ معاشرے کی خرابیاں۔ کل میں نے ایک نیا کوٹ خریدا۔ دماغوں کو دھوؤ۔ روحوں کو دھوؤ — آلو کو دھوؤ۔ گوبھی کو دھوؤ۔ پتیلی کو دھوؤ — دھوؤ۔

رفتہ رفتہ بھیڑ چھٹی۔ خاموشی چھاگئی۔ چاند عین اُوپر آگیا۔ عامر رضا نے دفعتاً ایک چھلانگ لگائی اور پھولوں کے دُھندلکے میں غائب ہوگیا۔

وہ پگڈنڈی پر بیٹھی رہ گئی۔ سِرل اور ڈینئس مائیکل دلدل کے کنارے کنارے چلتے ہوئے اُس کے پاس آئے اور مُنہ لٹکا کر اِدھر اُدھر بیٹھ گئے۔

یہ ٹھنڈے اور اُداس دن — روشن نے سر اُٹھا کر اُس سے کہا۔

بھیگے، زخم خوردہ، خوفناک دن۔ سِرل نے کہا۔

بھاری، گھِسٹنے والے، لنگڑے، اپاہج دن — ڈینئس نے کہا۔

یوں ہماری زندگی بیتتی ہے — اُنھوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

ہمارے لئے کٹھن آزمائشیں ہیں۔

تکلیفیں

دل کا رنج

ندامت

پشیمانی

وہ مگن ہیں

ہم روتے ہیں —

ہیزل میئر کا جنگل آہستہ آہستہ دھندلکے میں محو ہوگیا۔

۶۷

دن بھر بارش ہوتی رہی۔ وہ سب آگ کے سامنے بیٹھے تھے۔

"ساجدہ آپا نے قوم کو صحرائی چوہے دیکھنے کے لئے مدعو کیا ہے۔" طلعت نے اطلاع دی۔

"صحرائی چوہے کیوں۔ صحرائی لومڑی کیوں نہیں؟" سریکھا نے پوچھا۔

"دراصل ساجدہ آپا کو رچرڈ برٹن کی ذات سے بہت عقیدت ہے۔" طلعت نے کہا۔

"تو پھر کرا دو ان کا انٹرویو رچرڈ برٹن صاحب سے۔ وہ تو اکثر براڈ کاسٹنگ ہاؤس آتے رہتے ہیں۔"

"دراصل ان کی شکل ایک اور بزرگ سے ملتی ہے جو اوریجنل ہیں۔"

"اوہو۔۔ یہ بات ہے۔" فیروز نے کہا۔ پھر دفعتاً وہ چلائی۔ "ارے یہ تو واقعی بڑی ایکٹوفی ہو گئی"۔

اُٹھا لاؤ کھنجر کرو قتل ہم کو
بڑی دیر سے مونڈی جھکائے ہوئے ہیں

طلعت نے کہا (یہ قدیر کا پسندیدہ شعر تھا)

"یہ بات ہے۔ تو آؤ میدان میں"۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی جگہ بڑبڑا کر فیروز نے کہا "السلام علیکم۔ لائیے میم کا"۔

اشعار کس کو یاد تھے۔ لہٰذا پہلے غلط پڑھے گئے۔ پھر حسب ضرورت۔ ان میں ترمیم کی گئی۔ نہ کہ ہم نشیں بے وقوفی کی باتیں۔ میں بھولا نہیں ہوں وقوفی کی باتیں۔ خود شعر گھڑے گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ فلمی گانوں کے بول نہایت بے تکلفی سے استعمال کئے جانے لگے۔ "یا د رکھنا چاند تارو اس سہانی رات کو۔ لاؤ واؤ کا ــــ" طلعت نے کہا

"واہ کٹ کٹ کر رہی ہیں مرغیاں"۔ کملا نے کہا

"یہ فاؤل ہے۔" طلعت دہاڑی

"ہرگز نہیں۔"

"اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا"

طلعت نے میز پر مکہ مارا۔

"آہ کٹ کٹ کر رہی ہیں مرغیاں"۔ کملا نے گرج کر جواب دیا۔

جب دوبارہ کملا کی باری آئی تو اس نے اطمینان سے جواب دیا ــــ "ہائے کٹ کٹ کر رہی ہیں مرغیاں"۔

"یہ سب ہو چکا ہے۔" طلعت چلائی

"یہ دُوسری مُرغیاں ہیں ـــ" کملا نے اطمینان سے جواب دیا۔

دوسرے روز ساجدہ آپا نے طلعت کو ویمنز پریس کلب میں فون کیا۔

"سنو ساجدہ بہن۔ میں صحرائی چوہے دیکھنے سے معذور ہوں۔ میرا سارا دن تو بہت سے اصلی چوہے دیکھنے میں گزر جاتا ہے"۔ طلعت نے کہا۔

"نہیں۔ مجھے تم سے رائے لینا ہے۔ ایک نہایت ضروری بات ہے"۔

"اچھا تم سیدھی یہیں آجاؤ اور لنچ بھی یہیں کھاؤ۔ طلعت نے زور سے ریسیور پٹخ دیا۔ شہر کی ان محبت زدہ خواتین نے اور جان آفت میں کر رکھی تھی۔

آدھ گھنٹے بعد ساجدہ بیگم کھانے کی چھوٹی میز پر طلعت کے سامنے بیٹھی تھیں۔ وہ ایسچیوں کی طرح ساجدہ بیگم کو دیکھا کی۔

"کل میں عامر رضا سے ملی ـــ" انھوں نے کہنا شروع کیا۔

"یہ چوزے کی سرائے کا ذکر ہے۔ جہاں آپ بی بی سی والوں کے ساتھ گئی تھیں؟" طلعت نے دریافت کیا۔

نہیں۔ ہم دونوں استانبول میں کھانا کھا رہے تھے"۔

"اوہ"

"اور پھر انھوں نے بتایا ـــ"

انھوں نے بتایا کہ وہ مجمع سے کتنا گھبراتے ہیں، کہ وہ سائے کی تلاش میں ساری دُنیا میں گھومتے ہیں ـــ جہاں سایہ ملا وہیں بیٹھ گئے۔ یہ تیز دھوپ ان کی آنکھوں کو بری لگتی ہے ـــ"

"ہاں کہا تو تھا۔ بالکل یہی کہا تھا انھوں نے" ـــ

"خدایا ـــ لو یہ گوبھی کھاؤ" ـــ طلعت نے پلیٹ ان کی طرف سرکائی۔

"میرا خیال ہے اس ملک کے بارے میں جو میرے تاثرات ہیں۔ ان پر ایک افسانہ لکھوں"۔ ساجدہ بیگم نے سوچ کر کہا۔

"ضرور ـــ اس سے عمدہ بات کیا ہو سکتی ہے ـــ طلعت نے ویٹرس کو بلانے کا

اشارہ کیا۔ "کافی لوگی ساجدہ۔" اُس نے اُونگھتی آواز میں پوچھا: "یا آئس کریم ---؟"
برابر کی میزوں پر برطانیہ کی مشہور اخبار نویس خواتین ٹوپیوں کے تازہ ترین فیشنوں پر تبادلۂ خیالات کر رہی تھیں۔
طلعت اُداسی سے ساجدہ بیگم کو دیکھتی رہی۔ اس کا جی چاہا کہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔

۶۸

چمپا نے نرگیش کے کمرے میں آکر چاروں طرف نظر ڈالی۔ مانوس کمرہ۔ صوفہ۔ تصویریں۔ نیلے پھول۔ میرے لئے ایک ساری نکال دینا۔ نرگیش نے غسل خانے میں سے آواز دی۔ دوسرے کمرے میں شانتا ایک ہی ریکارڈ بار بار بجائے جا رہی تھی۔ اسی روز اس کی ایک نئی کتاب چھپ کر آئی تھی۔ بل نیچے کورٹ یارڈ میں گلشن کے ساتھ ٹہل رہا تھا۔ چمپا نے الماری کھولی۔ ایوننگ گاؤن اور ساریاں اور جوتے۔ اور بیگ۔ ایک تختے پر ہاتھی دانت کا ایک چھوٹا سا مندر تھا جس میں ایک ننھا سا بُت رکھا تھا۔ پارسی کس کا بُت پوجتے ہیں۔ وہ سوچتی رہی ۔ یا شاید زرتشت۔ یا جانے کیا۔ اسے پارسی مذہب سے واقفیت نہ تھی اسے کسی مذہب سے واقفیت نہیں تھی۔ ہم سب کے نہاں خانوں میں ایک چھوٹا سا شرائن ہے جس میں ایک گمنام بُت رکھا ہے۔ اس بُت کا نام مجھے معلوم نہیں۔ یسوع۔ سینٹ طامس۔ کرشنا۔ نارائن۔ زرتشت۔ یہ بُت آخر وقت تک گمنام رہے گا۔ انت سمے جب انسان کی آنکھیں آخری بار ہمیشہ کے لئے بند ہونے لگتی ہیں۔ اس وقت اسے جانے کیا نظر آتا ہے وہ گمنام بُت کونسی شکل اختیار کرتا ہے۔ یہ کسے معلوم۔
شانتا نے اندر آکر نرگیش کے لئے ایک سرخ ساری نکالی۔ "الماری بند کر دو۔ الماری بند کر دو۔" چمپا نے باآوازِ بلند کہا۔
"ہیں ---؟" شانتا نے کمرے میں آکر پوچھا: "کس سے کہہ رہی ہو ---"
"کچھ نہیں۔ میں سوچ رہی تھی کہ دن میں کتنی بار نرگیش یہ الماری کھولتی ہے۔"
"ہاں ---؟" شانتا بالکل نہ سمجھی۔

"اور اس میں سے رنگ برنگے کپڑے نکلتے ہیں"

"ہاں - ہاں - تو؟"

"اور نیلی گھاس کا عطر - اور پیرس کی ٹوپیاں" - چمپا کہتی رہی۔ "اس کا بُت شرائن میں رکھا رہتا ہے اس کونے میں - اس نے یہ الماری بنائی اور اب اسی میں چھپا بیٹھا ہے —— تمھاری الماری بھی کوئی بُت ہے؟"

"میری الماری میں ڈھانچے ہیں" —— شانتا آتشدان کے قریب آکر بیٹھ گئی اور اسے غور سے دیکھنے لگی۔ "تم ——" اُس نے کہا —— "تم تھوڑی سی دیوانی ہو ——"

"ہاں - تم نہیں ہو —؟"

"تمھاری باتیں معرفت کی حدوں کو چھو رہی ہیں - اس طرف مت جانا - بڑی افسوسناک بات ہوگی" شانتا نے جواب دیا۔

سریکھا سفید ساری پہنے بال تولیے میں لپیٹے باہر آئی اور دریچے میں کھڑی ہو کر ٹیرس گارڈن کو دیکھنے لگی - باہر جدھر پھول ہی پھول تھے اور بہار کا روشن آفتاب جگمگا رہا تھا۔

"زندگی - زندگی" —— سریکھا نے خوشی کا گہرا سانس لے کر ہوا میں بازو پھیلائے۔

"سریکھا میرے لئے زندگی کی علامت ہے - بشاش - رقصاں تم علامتوں کی دُرستی کی قائل ہو؟" چمپا نے مڑکر شانتا سے پوچھا۔

شانتا آتشدان میں بجلی کے مصنوعی سُرخ انگاروں کو دیکھا کی۔

زندگی میرے سامنے کھڑی ہے - سفید ساری میں ملبوس - ہنستی، گنگناتی - خوفزدہ نڈر - باہمت - بزدل - ہر لفظ کے دو مختلف متضاد معنی ہیں - زندگی —— اُس نے شانتا کو دیکھا - میں نے ایک مرتبہ گوتم سے کہا تھا —— میں اور تم ہمیشہ مختلف رہیں گے:

کئی سال قبل، گلفشاں کے باورچی خانے میں ترکاری بناتے ہوئے طلعت نے کہا تھا - چمپا باجی، گوتم ہر وقت ہر چیز کا تجزیہ کرنے پر تُلا رہتا ہے - اس بات سے خبردار رہیے گا - وہ کسی کو بخشنے والا نہیں چاہے آپ ہی کیوں نہ ہوں۔"

"جب مجھے ایسے لوگوں سے سخت چڑ ہے جو بات بے بات، ہر فقرے، ہر لفظ، ہر لکھے

۵۴

ہوئے جملے میں نفسیاتی اُلجھنوں کے اشارے تلاش کرتے ہیں۔ لاحول ولا۔" اس نے جواب دیا تھا۔

"گوتم بھی یہی سب کرتا ہے؟" نرملا نے تجاہل عارفانہ سے پوچھا تھا۔

"بالکل" طلعت نے جواب دیا تھا۔

"تب تو گوتم بہت بُرا آدمی ہے۔ ہم اسے منع کر دیں گے کہ لوگوں کی باتوں میں نفسیاتی اُلجھنوں کے اشارے نہ تلاش کیا کرے۔ خصوصاً آپ کی باتوں میں ——" نرملا نے کہا تھا۔ یہ لڑکیاں اب صریحاً بدتمیزی پہ اُتر آئی تھیں۔ نرملا مجھ سے جلتی ہے —— کس قدر واہیات بات —— تہمینہ کی طرح —— لاحول و لا۔ میری باتوں سے اُسے مطلب —— اُس نے غصے سے سُرخ ہو کر بآوازِ بلند کہا۔ تین چار بار تو اس سے ملاقات ہی ہوئی ہے۔ دوسرے لمحے اس نے اپنے غصے کو چھپا کر گفتگو کو مزاحی رنگ دینا چاہا۔" اور وہاں اُس نے باتوں کو ایسی ٹرچھوڑ رکھی تھی کہ کسی کو بولنے ہی نہ دے۔ ہر سوال کا جواب اسے آتا ہے ہر علم میں وہ ماہر ہے۔ توبہ۔ آدمی نہ ہوا راکھشس ہو گیا۔ وس سر والا۔"

"ہے —— ہے ——" تہمینہ نے بڑی مہارت سے پرٹے کاٹتے ہوئے باورچی خانے کے دوسرے کونے سے کہا تھا۔ "گوتم نے تم پہ بہت رعب ڈالا ہے۔ اور آ گئیں تم اس کے رُعب میں۔"

"میں نہیں آئی اس کے رعب میں"۔ اُس نے بگڑ کر کہا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ جلدی سے پیازوں کے ڈھیر پر جھک گئی۔

"پھر اس کا اس قدر لمبا چوڑا ذکر کیوں کر رہی ہو —— ہم لوگ تو بے چارے گوتم کو ایسا قابلِ ذکر نہیں سمجھتے —— نہ راکھشس نہ دیوتا۔ تم نے اس چکر میں چاء بھی ٹھنڈی کر دی —— اے لو مصالحہ جلا جا رہا ہے —— بھُن گیا مصالحہ، لے اب گوشت ڈال دو بی طلعت ——"

آوازیں ماضی کے آبشار کے شور میں ڈوب گئیں —— یہ نرگس کا فلیٹ تھا اور سر کھیا بچوں میں کھڑی بال سُکھا رہی تھی اور شانتا صوفے پر ٹانگیں رکھی بیٹھی تھی۔ چہرے پہ

ماسک ننے تھے۔

"گوتم اب تک سرکولیشن میں ہے؟" شانتا نے باآوازِ بلند پوچھا۔

"کیا ـــ؟" وہ چونکی۔

"میرا مطلب ہے۔" شانتا نے سگریٹ جلاتے ہوئے اس طرح پوچھا۔ گویا چمپا ایک کھلی کتاب کی طرح سامنے رکھی تھی جسے وہ پچھلے چند منٹوں سے پڑھ رہی تھی۔" وہ اب بھی سرکولیشن میں ہے یا اسے لائبریری کے بک شیلف پر واپس رکھ دیا گیا۔"

"پتہ نہیں"

"تمھاری ممبر شپ کی میعاد ختم ہو چکی؟"

شانتا کرینگ علاوہ مغرور ہونے کے کمینی بھی تھی۔

"یہی سوال غالباً میں تم سے کر سکتی ہوں۔"

شانتا اُداسی سے مسکرائی۔ اسں کا پُر غرور تبسم، اس کا انداز، اس کا طرزِ لباس، چمپا کس دھیان سے اِن دنوں اس کی تقلید میں مصروف تھی۔ خوبصورت، کامیاب ہر دلعزیز کریر وومن۔ وہ بھی شانتا ٹیلمبر کی طرح کیوں نہیں بن سکتی؟ شانتا نے اطمینان سے اسے دیکھا۔ "میں اس کے الوژن تباہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مصیبت یہ ہے کہ وہ شاعر ہے۔"

"واقعی یہ مجھے معلوم نہ تھا۔" چمپا نے طنز سے کہا۔

تمھیں یہ معلوم نہیں ہو سکتا۔ تم خود اپنے تصوّرات میں ضرورت سے زیادہ مبتلا ہو۔ آدمی قربانی چاہتے ہیں۔ بغیر اپنی قربانی دیئے تم ان کو حاصل نہیں کر سکتیں ـــ تم پیرس سے یہاں کیوں آ گئیں۔ اپنا اکیڈمک سال اُدھورا چھوڑ کر۔ اس لئے کہ وہ یہاں ہے۔"

"بکواس ـــ یہ تم سے کس نے کہہ دیا۔" چمپا کو بے حد غصہ آیا۔ اب وہ اپنی مزید توہین نہیں کروائے گی۔

"لیکن یہ جنگلی بطخ کا تعاقب ہے۔" شانتا اپنی سُریلی آواز میں کہتی رہی (وہ احمد آباد اور بمبئی سے مرہٹی گانے براڈ کاسٹ کیا کرتی تھی)

"تم افسانہ نگار ہو نا ـــ اسی لئے میرے متعلق تم نے اپنے تخیّل کو بے لگام چھوڑ رکھا

ہے۔"

"— اب بل تم کو بلڈ اپ کرنا چاہتا ہے —" شانتا نے اپنی سُریلی آواز میں بات ختم کی۔ اور پھر اطمینان سے آتش دان پر رکھی ہوئی تصویروں کو دیکھنے لگی۔

تہمینہ رضا — نرملا سریوستوا۔ شانتا کربگ۔

"اچھا۔ یہ بات ہے۔" چمپا نے اپنا کوٹ اور دستانے اُٹھائے۔ "میں قابلِ نفرت ہوں۔ میں قابلِ نفرت ہوں۔ مم اچھا بھئی اب چلا جائے۔ نرگیش — سریکھا — شانتا — خدا حافظ۔"

"کل دفتر آؤ تو وہ نیلی اُون لیتی آنا جو ہم لوگوں نے اس دوکان پر دیکھی تھی۔" شانتا نے اسی اطمینان سے کہا۔

"میں شاید کل دفتر نہ آؤں۔" دروازے تک پہنچ کر اُس نے دوبارہ پلٹ کر کہا۔ "کل کیا معنی، میں شاید کبھی تمھارے دفتر نہ آؤں۔ خیر بخیر۔"

باہر چیلسی کی سڑک پر آکر اُس نے دیکھا۔ مکانوں کے دریچے بارش کے سہانے دھندلکے میں چھپ گئے تھے۔ نکڑ کی بوڑھی عورت جو پھول بیچتی تھی۔ بارش سے بچنے کے لئے برساتی اوڑھے کرسی پر دیوار کی طرف منہ کئے بیٹھی جانے کیا سوچ رہی تھی۔ دریچوں میں سے موسیقی کی آواز آرہی تھی۔ وہ اپنے گھر پہنچی جو بہت دُور مضافات میں تھا۔ اپنے کمرے کی دہلیز میں اسے سِرل کا خط ملا۔ اُس نے لکھا تھا: "نیوہم میں تمھارا داخلہ ہوگیا ہے۔ ستمبر میں تم یہاں آرہی ہو۔ یہ گرمیوں کے چند مہینے کسی اداس اور رومینٹک اطالوی یا ہسپانوی شہر میں گذار آؤ۔ میں شمال جا رہا ہوں۔ روز ماری بیمار ہے۔"

روز ماری — ؟؟

۶۹

کوہ نور کی ایک میز پر جو دریچے کے پاس بچھی تھی۔ گوتم نرملا کے مقابل بیٹھا باہر برستی ہوئی بارش کو دیکھتا رہا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی ٹولیاں آآکر بیٹھ رہی تھیں یا اٹھ اٹھ کر باہر

جا رہی تھیں۔ کمال معاف کرنا کہہ کر کسی دوست سے بات کرنے کے لئے ایک دُوسری میز کی طرف جا چکا تھا اور بڑے جوش وخروش سے کسی بحث میں مصروف تھا جس میں بار بار ماؤ اور چیانگ کائی شیک کا نام دُہرایا جا رہا تھا۔ گوتم نے اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ اس پر نظر ڈالی

"کمال کتنا پیارا لڑکا ہے۔" اُس نے کہا۔

"ہاں — کمّن بھیّا کے ہونے سے مجھے یہی لگتا ہے کہ بھیّن یہاں موجود ہیں۔ اگر کمّن بھیّا اور طلعت نہ آ رہے ہوتے تو امّاں مجھے ہرگز اکیلا ولایت نہ بھیجتیں۔" نرملا نے کہا۔

"تم نے مجھے جو باتیں چمپا کے متعلق بتائیں مجھے سُن کر بڑا دُکھ ہُوا۔" گوتم نے کہا۔ وہ ابھی تک چمپا کے متعلق سوچ رہا تھا۔ نرملا نے اپنے آنسو پینے کی کوشش کی۔ چند منٹ قبل اس شخص نے پروپوز کیا تھا۔ وہ چُپ بیٹھی رہی۔

"تم سب نے، ہم سب نے ان کے ساتھ انصاف نہیں برتا — ہم نے ان کو برابر غلط سمجھا ہے — مثال کے طور پر —" اس نے ذرا جوش سے دُہرایا اور کانام ٹھاکر نرملا کو سمجھانا شروع کیا — "انھوں نے کبھی بھیا صاحب کو اپنے سے، یعنی کہ، چھیننا نہیں چاہا تھا۔"

"بہرحال، میرا خیال ہے اب ہم چمپا باجی پر مزید بحث نہیں کریں گے۔" نرملا نے کہا اور مصروف نظر آنے کے لئے بیگ میں کوئی چیز تلاش کرنے لگی "تمھارے نزدیک چمپا باجی مکمل ہیں مگر شاید تم بھولتے ہو کہ ہم چمپا باجی کو اپنے بچپنے سے جانتے ہیں۔"

"یہ بچپنے سے جاننے کی دھونس اچھی ہے!" گوتم نے کہا "تمھارے یہاں ہر سمے بچپنے کا راگ کیوں الاپا جاتا ہے۔ جو لوگ تم کو یا چمپا احمد کو بچپنے سے نہیں جانتے، وہ گدھے ہیں —؟"

اب گوتم پر چاروں طرف سے بڑی تیز روشنی پڑ رہی تھی۔ جس طرح وہ خود گوتم کے سامنے تیز روشنی کی زد میں تھی۔ لیکن دیکھو کیا ہُوا کہ گوتم نے ہاتھ بڑھا کر دفعتہً سوئچ بند کر دیا۔

گوتم، انسانی کردار کا بے رحم نقاد، ویدانت کا گرو۔ چمپا جیسی فراڈ کو مکمل سمجھتا ہے بھگوان تیری لیلا نیاری ہے۔ لیکن وہ کہہ رہا تھا —

"نرمل ــ میں تمھاری غلط فہمی دُور کرنا چاہتا ہوں ۔ مجھے چمپا سے کیا مطلب۔ میں بہت پھیچڑ ہوں ۔ تم نے ٹھیک کہا۔ مگر میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں ــ"

"نعم البدل ــ؟ نہیں، سوری گوتم۔"

"نرمل ــ مجھے سمجھنے کی کوشش کرو ــ او نرمل ــ" اب وہ پھر اندھیرے میں چلا گیا، وہ بہت قابلِ رحم تھا۔ اسکول کے لڑکوں کی مانند۔ کون کہتا ہے۔ مرد سمجھدار ہوتے رہیں۔ ارے ان سے زیادہ مورکھ کون ہوگا ۔ میز پر بیٹھے بیٹھے نرملا کو احساس ہوا۔ وہ بیل کی طرح، درختوں کی طرح، بیرومیٹر کے پارے کی طرح اونچی ہوتی جارہی ہے ۔ اس میں گیان آرہا ہے۔ اب مصنوعی روشنیاں بجھا کر وہ بھی اس اندھیرے میں چلی جائے گی جو سب کیفیتوں سے اتم ہے۔ اس میں بیٹھی وہ باہر جھانکا کرے گی ۔ اب وہ سلیمانی ٹوپی پہن لے گی۔ جس کی کہانی بچپن میں اسے گلفشاں کے شاگرد پیشے میں قدیر ڈرائیور نے سنائی تھی۔

یہ سلیمانی ٹوپی ہر ایک کو دستیاب تھوڑا ہی ہوتی ہے۔ میں تمھاری شکر گزار ہوں نرمی نیلمبر، کہ تم نے میرے بڑے ہونے میں میری مدد کی اور سلیمانی ٹوپی پہننے کا راستہ دکھایا۔ کاش میں تم سے بیاہ کر سکتی۔ مگر مجھ میں بہت زیادہ گیان آگیا ہے ــ چمپا احمد کی پرستش کئے جاؤ گوتم جی ۔ شاید تم کو بھی راہِ نجات مل جائے۔

اسی رات نرملا کی ایکسرے رپورٹ میں معلوم ہوا کہ اسے پھیپھڑوں کی دق ہے ۔

۷۰

جس سال چمپا کیمبرج پہنچی ۔ طلعت احمد نرملا وہاں سے جا چکی تھیں (میں ہمیشہ مڈہرسٹ جانا چاہتی ہوں لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آتی ۔ سرل اب کے ویک اینڈ پر ضرور مڈہرسٹ چلیں گے بے چاری نرملا کو دیکھنے) اب وہ اُونچے طبقے کی برطانوی لڑکیوں کے لہجے میں گفتگو کرتی۔ کیمبرج کی بذو ماغی بھی اس نے پوری طرح اوڑھ لی۔ کچھ طور طریقے اس نے ادیبوں کے گروہ میں رہ کر لندن میں سیکھ لئے تھے۔ اس کے علاوہ رکھ رکھاؤ، سلیقہ ۔ نفاست ۔ بردباری۔ ایک خاص سطح کا دھیما دھیما مزاج ۔ رات کو آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر وہ دفعتاً سوچتی ۔ چمپا احمد

کہاں رہ گئی۔ چمپا احمد جو ایک دیو مالا ایک حکایت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ وہ بسنت کالج بنارس والی لڑکی کہاں گئی، یا وہ لڑکی جس کو عامر رضا نے گلفشاں کے سائیڈ روم میں ترکاری بناتے دیکھا تھا۔ عامر رضا کا خیال اب اسے بہت مضحکہ خیز لگتا۔ معظم اسٹاروں کے جلنے والا ڈپلومیٹ جس کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ شام کو کون سا سوٹ پہن کر اور کون سی لڑکی کو لے کر تھیٹر دیکھنے جائے۔

پھر ایک روز کیمبرج میں فلسفی لڑکی روشن سے اس کی ملاقات ہوئی۔ وہ لائبریری کی طرف جانے والی سڑک کے کنارے ایک پلیا پر بیٹھی مائیکل سے باتیں کر رہی تھی جو سائیکل پر سوار ایک پاؤں پلیا سے ٹکائے یہودیوں کی جلاوطنی کی نفسیات پر روشنی ڈالنے میں مصروف تھا دفعتہً اس نے نعرہ لگایا — روشن — مگر روشن سوچ میں ڈوبی سامنے سے نکل گئی۔ چمپا احمد نے کندھے اچکائے۔

"ہاں ڈون اسپنوزا" مائیکل نے کہا۔ دوسرے روز روشن سیاہ فریم کی پڑھنے والی عینک لگائے بڑے غور و خوض میں ڈوب کر سگریٹ پیتی کیم کے کنارے بیٹھی نظر آئی۔ چمپا کو وہ بہت اچھی لگی۔ اب چمپا اپنی دانست میں اس اسٹیج پر پہنچ چکی تھی۔ جب انسان خود غیر متعلق ہو کر دوسروں کا مطالعہ کرتا ہے اور فراخ دلی سے دوسروں کو معاف کرتا رہتا ہے

روشن نے چمپا کو بڑے شک و شبہے کی نظروں سے دیکھا۔ کسی لڑکی نے اسے بتایا کہ یہ چمپا احمد عامر کی اولڈ فلیم ہے۔ چمپا اگر یہ لفظ سن لیتی تو سوچ کر ہی اسے بڑی دہشت ہوتی۔ وہ بے حد تو بہ تِلّا کرتی اور کہنے والے کو صلواتیں سناتی۔ کیونکہ اس قدر جدید بن جانے کے باوجود تھوڑا سا کھرچنے کے بعد وہ وہی خالص یو۔پی کی با عزت مڈل کلاس لڑکی تھی جس کے تصورات اس قسم کی باتوں کے سلسلے میں بڑے قدامت پسندانہ ہوتے ہیں اور بہر حال وہ خود کو کسی کا اولڈ فلیم کہلانا پسند نہ کر سکتی تھی۔

اس نے اس کے باوجود ایک گھنٹے تک روشن سے اسپنوزا کے متعلق تبادلۂ خیالات کیا۔ روشن حکومت پاکستان کے کسی بہت اعلیٰ افسر کی لڑکی تھی۔ اور اسے طرح طرح کے وظائف ملے تھے اور یہاں بھی بہت قابل اور سنجیدہ مشہور تھی۔ قصہ مختصر وہ ان ہونہار

طلباء میں سے تھی جو بیرونی ممالک میں وطنِ عزیز کے نام میں چار چاند لگاتے ہیں اور پبلیسٹی کے کالموں میں اکثر جن کی تصویریں چھپتی رہتی ہیں۔

ایک چھٹی کے روز وہ دوسرے لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ ایک دیہاتی چائے خانے کے باغ میں بیٹھی تھی۔ ایک اطالوی طالب علم اینجلو سیب کے پیچھے گٹار بجا رہا تھا۔ قریب کی آرام کرسی پر مائیکل نیم دراز بڑی اداسی سے سیب کی کلیاں سونگھنے میں مصروف تھا۔ اس روز اُس نے اناؤنس کیا تھا کہ وہ ترکِ وطن کر کے اسرائیل جا رہا ہے۔ وہ کئی گھنٹے سے وطنیت کے مسئلے پر بحث کرتے کرتے تھک کر اب خاموش بیٹھے چائے کا انتظار کر رہے تھے۔ میں یہ پیارا، ہرا بھرا خوبصورت انگلستان چھوڑ دوں گا اور اسرائیل کے ریگ زاروں میں پتھر کوٹ کر سڑکیں بناؤں گا۔ اُس نے کہا۔ نرمل اسے دیکھا کیا۔ ہاں۔ مائیکل تم ضرور ایسا کرو گے۔ مجھے معلوم ہے۔ اُس نے کہا۔ یونیورسٹی کے کئی پروفیسر، سائنس دان، موسیقار، اس وقت اسرائیل میں پتھر کوٹ کر سڑکیں بنا رہے تھے۔

"وژن میں بڑی طاقت ہے۔" ڈینس نے کہا۔ "ذرا شاعروں کی شاعری دیکھو۔"

"طاقت تباہ کُن ہوتی ہے۔" نرمل نے مُنہ لٹکا کر کہا۔ سامنے چائے خانے کے پھاٹک پر ایک کار آن کر رُکی۔ گوتم نیلمبر، کمال اور طلعت اور چند اور لوگ اُتر کر چائے خانے کی طرف بڑھے۔ اُنھوں نے اور جھُنڈ میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو نہیں دیکھا۔

گوتم نیلمبر بھی بڑی تباہ کُن طاقت ہے۔ کیونکہ اس کا وژن سب سے زبردست ہے نہرو کا ہندوستان — " اینجلو نے کہا

جدید تصورات میں شاونزم خطرناک ترین تصور ہے۔" نرمل نے مائیکل سے کہا۔

"تمھاری صیہونیت، پاکستانیوں کا اسلام، ہندوستانیوں کی گپتا عہد کی تجدید"

"گوتم شاونسٹ نہیں ہے۔" سریکھا بولی "۔ وہ صرف امن کا خواہاں ہے۔ جس میں ہندوستان کی اقتصادی ترقی ہو سکے۔ ہم مذہب کی لائنز پر نہیں سوچتے۔ ہمارا پڑھا لکھا طبقہ اور وہ لوگ جن کے خیالات کی اہمیت ہے۔ پہلے پانچ سالہ منصوبے کی کامیابی کے درپے ہیں۔ ہند کا کسان اس وقت ہمارا سب سے اہم مسئلہ ہے — زمینداری کے خاتمے کے

بعد سے آ کر دیکھو۔ اس کی حالات کتنی سدھرتی جا رہی ہے — ہمارا —"

"تم تو انڈیا ہاؤس کے کسی پمفلٹ کی زبان میں گفتگو کر رہی ہو۔" نرمل نے مسکرا کر اس کی بات کاٹی۔

"اقتصادی ترقی سے مذہب کا کیا تعلق۔ یہ بات پاکستانیوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔" گلشن نے کہا۔

"امریکہ اسلام کا سب سے بڑا خیر خواہ ہے، آج کل ترکی میں قرآن شریف کے نسخے چھاپ چھاپ کر تقسیم کر رہا ہے۔ جس طرح نپولین اور مسولینی اسلام کے بڑے زبردست خیر خواہ تھے" — ڈینس نے کہا۔

"پاکستان کا اسلام —" مائیکل نے کہا

"تم تو مسلمانوں سے نفرت کرتے ہو —" روشن نے مائیکل سے کہا۔

"نفرت کی نفسیات —" ڈینس نے کہنا شروع کیا — "آج کی دنیا نفرت کے تانے بانے پر زندہ ہے۔ جیزس نے بالکل غلط کہا تھا کہ دنیا محبت پر قائم ہے — اصلیت یہ ہے کہ ہم سب درندوں کی طرح ایک دوسرے کو کھا رہے ہیں۔"

"میں درندہ ہوں —؟" مائیکل نے اداسی سے پوچھا۔ "میں تو صرف جیفہ جا کر رہنا اور کوٹنی چاہتا ہوں۔"

"تم سب کو کوا کر زے سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ گاندھی کا مطالعہ کرو۔" ڈینس نے کہا

"ذرا گوتم کو بلا کر پوچھو۔ جو ہر وقت پاکستان کے خلاف پروپگنڈہ کرتا ہے۔" روشن نے جذبے سے کہا۔

"اور پاکستان اس کے خلاف پروپگنڈہ کرتا ہے۔" سریکھا نے جواب دیا۔

"اگر صرف ایک روز کے لیے ساری دنیا میں پروپگنڈے کی مشینری رک جائے تو کتنا سکون ملے —" چمپا نے آہستہ سے کہا۔

"یہ کس طرح ممکن ہے۔ ہم سب کو تو صبح شام گوئبلز کی تصویر پر پھول چڑھانے چاہئیں

تم گاندھی کی بات کرتے ہو۔ ہمارے عہد کا سب سے بڑا پیغمبر گوئبلز تھا۔ ڈاکٹر گوئبلز زندہ باد"
گلشن نے کہا۔

دراصل،" ڈینس نے بات شروع کی۔" ہم سب غیر شعوری طور پر فاشسٹ ہیں ہم سب تباہی اور موت کے خواہاں ہیں۔ میں رومان پرستوں کی موت کی خواہش، کے معنی خوب سمجھتا ہوں۔"

"میں تو نہیں چاہتی کہ یہ خوبصورت امد چرڈ تباہ کر دیا جائے۔" چمپا نے دہشت کے ساتھ کہا۔

"ہم سب چھپے ہوئے فاشسٹ ہیں۔ ہم سب کے ہاتھ میں غیر مرئی مشین گنیں ہیں۔ جن کا رُخ ہم نے دوسروں کی سمت کر رکھا ہے۔ خیالات کی مشین گنیں۔ صرف بوڑھی عورتیں امن چاہتی ہیں۔ لیکن دُنیا کو بوڑھی عورتوں کی ضرورت نہیں۔" اُس نے چمپا کو دیکھا۔ وہ اسے ایک بوڑھی رنجیدہ ماں کی طرح نظر آئی۔

"مجھے ہمیشہ تباہ کیا گیا۔" مائیکل نے سر اٹھا کر کہا۔" لیکن میں نے اپنے عزیزوں کی لاشوں کے انبار میں بیٹھ کر تمھارے لیے موسیقی کمپوز کی اور خیالات کی قندیلیں روشن کیں۔ میں زندہ ہوں؟ میں صرف ——"

"سرکیس کو ٹنی چاہتے ہو ——" ڈینس نے بات کاٹی۔" ہم تم کو اس کی اجازت دیتے ہیں مائیکل۔ تم اپنے وژن کے راستہ پر چلو ——"

"دوسروں کے وژن میں مخل ہو کر اس کو برباد کرنے کی خواہش سب سے بڑا گناہ ہے دس احکام میں اس گناہ کا کہیں ذکر نہ تھا۔" سرل نے کہا۔" میں تم کو اس کی اجازت دیتا ہوں۔"

انجبو نے گٹار ایک طرف رکھ دیا۔" مائیکل تم یہودی ہو۔ لیکن تم انگریز بھی ہو۔ تم نے اپنے بمبار طیارے پر آ کر میرے خوبصورت شہروں کو برباد کیا تھا۔ لیکن میں تم کو معاف کرتا ہوں۔"

"مائیکل۔" سرکھیا نے کہا۔" تم یہودی ہو۔ لیکن تم انگریز بھی ہو۔ لہٰذا خود کو ہم سے برتر

سمجھتے رہے۔ اب تم بڑے ذوق و شوق سے ایشیائی بننے جا رہے ہو۔ کیونکہ تمھارا خیال ہے کہ تمھاری جڑیں فلسطین میں ہیں۔ حالانکہ تمھاری جڑیں دراصل ہمپسٹڈ میں ہیں۔ لیکن ہم تم کو معاف کرتے ہیں۔ روشن! مائیکل ایشیائی بننے جا رہا ہے۔ اسے خوش آمدید کہو—"

"میں اسے خوش آمدید نہیں کہہ سکتی۔ کیونکہ میں مسلمان ہوں۔ لہٰذا مجھے اسے قابلِ نفرت سمجھنا چاہئے۔ یہ سب بہت زبردست گھپلا ہے۔" اس نے میز پہ اپنا سر ٹکا دیا اور پیالیوں کے نقش و نگار کو دیکھنے لگی۔

"تمھیں سریکھا سے بھی نفرت کرنا چاہئے۔ کیونکہ یہ ہندو ہے۔"

"ہاں۔"

"لہٰذا روشن مجھ سے ہاتھ ملاؤ۔" مائیکل نے سنجیدگی سے ہاتھ بڑھایا۔ "ہندوؤں نے تم کو ہندوستان سے نکالا—"

"میں نے نہیں نکالا۔ یہ خود نکلی۔" سریکھا نے احتجاج کیا۔

مائیکل سُنی ان سُنی کر کے کہتا رہا۔ "تمھاری طرح ہم نے بھی ایک اسٹیل ہوم لینڈ بنا لیا تو ہم کیوں قابلِ گردن زدنی ہو گئے؟"

"تم— تم نے عربوں کو اُن کے وطن سے نکالا جہاں وہ سینکڑوں سال سے رہتے آئے تھے۔"

"تم نے بھی ہندوؤں کو ان کے وطن سے نکالا۔ جہاں وہ ہزاروں سال سے رہتے آئے تھے۔"

پھر بڑی غمگین خاموشی چھا گئی۔ درختوں کے جھنڈ میں تیتریاں اڑ رہی تھیں۔ سامنے ندی پر سے ایک کشتی گزر گئی۔ اینجلو نے پھر گٹار بجانا شروع کر دیا۔

۱۷

گوتم نیلمبر اور اس کے ساتھی کار سے اُتر کر چائے خانے کے اندر چلے گئے۔ لاؤنج میں بیٹھ کر انھوں نے لسنر کی ورق گردانی کی اور چائے منگوائی اور گوتم نے چند خطوط پڑھ کو

پوسٹ کرنے کے لئے دیے۔ وہ لندن سے آرہے تھے اور ڈٹہرسٹ جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ بِل تھا اور خوبصورت برنارڈ جو اسکول آف اکنامکس میں اُستاد تھا اور شانتا۔ طلعت اور نرگیش۔ وہ لوگ بھی کوئی آفاقی مسئلہ حل کرنے میں مصروف تھے۔ کمال نے دریچے سے باہر جھانکا۔ جہاں سے باغ کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ ڈھلوان پہ ندی بہہ رہی تھی۔ بید مجنوں اور ریم روز کے پتوں میں سے ایک سفید لاج نظر آرہا تھا۔ جس پر اس کا نام "کلاراجین" لکھا تھا۔ "امن۔ امن"، کمال نے دُہرایا۔ گوتم نے اسے دیکھا۔

"باہر چمپا باجی اور سِرل وغیرہ بیٹھے ہیں"، طلعت نے دریچے میں آکر کہا۔

"نرملا کے لئے میں انگس ولسن کی کتاب لانا بھول گیا"۔ بِل نے کہا۔ شانتا پیالیوں میں چائے انڈیل رہی تھی۔ اُس نے سفید ساری پہن رکھی تھی اور بے حد حسین لگ رہی تھی۔ وہ لوگ نرملا کو دیکھنے جا رہے تھے۔ اسے اب سینی ٹوریم میں تیسرا سال تھا۔ اس کے ایک پھیپھڑے کا آپریشن ہو چکا تھا اور اس کے معالج سر رونلڈ گریے کا خیال تھا کہ ممکن ہے اب وہ مکمل طور پہ صحتیاب ہو جائے۔ ہفتے کے روز اس کے دوست لندن سے اسے دیکھنے کے لئے آتے۔ گوتم بھی برابر جب اُسے فرصت ملتی۔ کمال اور طلعت کے ساتھ اسے دیکھنے کے لئے جاتا اور پابندی سے اُسے رسالے اور کتابیں بھیجتا۔ اس کے آپریشن کے موقع پر ہری شنکر بھی واشنگٹن سے وہاں پہنچ گیا تھا۔ گوتم بڑی لگن سے نرملا کا خیال کرتا۔ اکثر جب کمال ہفتے کے روز ڈٹہرسٹ نہ پہنچ سکتا تو گوتم کو تار دے دیتا۔ گوتم سب کام چھوڑ کر وہاں چلا جاتا۔ وہ اور نرملا چمپا کا ذکر کبھی نہ کرتے۔ زندگی اس قدر گنجلک اتنی مصروف، اتنی بے ربط اور غیر منطقی تھی کہ انسان سارے شناساؤں اور جاننے والوں کے ساتھ نباہ نہ کر سکتا تھا۔ اتنا وقت ہی نہیں تھا۔

گوتم اب بہت مشہور ہو چکا تھا۔ اس نے ہندوستان کی فارن پالیسی، اس کے اقتصادی مسائل اور ملکی سیاست پر دو کتابیں لکھی تھیں جن کی دھوم مچ گئی تھی۔ وہ اب بہت بڑا سے لے بریٹی تھا۔ کامیاب۔ اور ہر دلعزیز۔ بے حد متوازن اور سلجھے ہوئے خیالات کا مالک۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ لوگ جذباتی کس طرح ہو سکتے ہیں؟ ۔ ۴۷ء ۔ ۴۸ء میں ہم نے

کیا کیا۔ ہم بیمار لوگ تھے۔ اب ہم اپنے ذہنی عارضوں کا علاج کرنا چاہ رہے ہیں۔ ہم کو اتنی مہلت دے دو کہ ہم تندرست ہو جائیں۔ پھر ہم سے مذہب اور روحانیت اور گیتا کی گفتگو کرنا۔ مجھے بھی گیتا بہت پسند ہے۔ لیکن مجھے فی الحال پانچ سالہ پلان زیادہ پسند ہے اس کی رپورٹوں کی تلاوت سے مجھے نسبتاً زیادہ سکون حاصل ہوتا ہے۔" وہ کہتا۔

ہے مارکیٹ کے رائٹرز کلب میں بیٹھے ہوئے اکثر کوئی برطانوی جرنلسٹ اس سے سوال کرتا۔ گوتم تمھاری کوئی ذاتی زندگی بھی ہے یا نہیں۔ تم تو بالکل کرشنا مینن بنتے جا رہے ہو۔

"مجھے خطرہ ہے کہ گوتم لیڈر بن جائے گا۔" سرل کہتا۔

"گوتم لیڈر نہیں بنے گا۔ بہت بڑا اسٹیٹسمین بنے گا۔ وہ ایک بے حد صاحب نظر انسان ہے۔" کمال فخر سے کہتا۔

۱۹۴۷ء نے ذہنوں کی دنیا جلا کر رکھ دی تھی۔ گوتم اور کمال بدلے ہوئے عالمگیر حالات بین الاقوامی سیاسی جرائم اور ریاکاری اور بے ایمانی اور ضمیر فروشی کے اس عظیم الشان دور جدید سے سمجھوتہ ———— نہیں کر سکتے تھے۔ گوتم کے سیکولر خیالات کی وجہ سے ہندو شاونسٹ اور مہا سبھائی نظریات کے لوگ اس سے خفا تھے۔ کمال کی قوم پرستی اور صاف گوئی نے اسے کہیں کا نہ رکھا تھا۔ اس کے بیشتر مسلمان دوست اور رشتے دار پاکستان جا چکے تھے، مگر وہ مصر تھا کہ انگلستان سے ہندوستان ہی واپس جائے گا۔ لندن اور کیمبرج کے پاکستانی طلباء اسے انڈیا ہاؤس کے گوتم نیلمبر کا اسٹوج کہتے۔

یہ سب سُن کر اس کے دل پر چھریاں چل کر رہ جاتیں

نرملا کی بیماری نے، جو اسے طلعت کی طرح عزیز تھی۔ زندگی کے متعلق کمال کا سارا رویہ بدل دیا تھا۔ اسے دفعتاً احساس ہوا تھا کہ زندگی اور موت میں بال سے زیادہ باریک حدِ فاصل قائم ہے۔ زندگی ایسی شے نہیں کہ اس سے مذاق کیا جائے۔ انسان بہت عظیم ہے۔ اس کا دل کائنات کی سب سے قابلِ قدر چیز ہے۔ پھر اسے خیال آتا کہ عیسائی یسوع مسیح کی تصاویر میں ان کے دل کو کیوں اس قدر نمایاں کرتے ہیں۔ دل کی تصویریں کیوں بناتے ہیں جس میں کانٹے چبھے ہیں۔ ہاں۔

دوسروں کا دل دکھانا کیوں سب سے بڑا گناہ ہے

نرملا کی بیماری نے گوتم کی ساری کائنات میں انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ بجّی جہنّم جو انسان کی روح ہے، اس میں کیسی کیسی دنیائیں آباد ہیں۔ ان میں کون لوگ بستے ہیں۔ آفاق کے اس کونے میں جہاں پر "گوتم نیلمبر" کا بورڈ لگا ہے کیسی کیسی آندھیاں چلتی ہیں۔ اس گھر میں (جس طرح کا گھر ہر نوجوان کے دل میں ہوتا ہے) کون لڑکی بیٹھی ہے۔ ہر نوجوان جو صرف ایک بار اس گھر کے دروازے وا کر کے صرف ایک لڑکی کی مانگ میں سیندور لگاتا ہے۔ مگر اس نوجوان کا اسرار کون جانے جس کا نام گوتم نیلمبر ہے۔ اس کے دل میں دراصل کون ہے۔ شاید اس کو بھی معلوم نہیں۔ یا شاید معلوم ہو دوسرے جاننے والے کون۔

اور اس بال سے زیادہ باریک پل پر جسے زندگی کہتے ہیں۔ نرملا کھڑی تھی۔ زندگی سے مذاق نہیں کیا جا سکتا۔ دل جو بہت عظیم شے ہے اس سے مذاق نہیں کیا جا سکتا۔ گو کہ چی کا دل جو ساری کائنات کا مرکز ہے۔

"چمپا باجی باغ میں بیٹھی ہیں۔" طلعت نے دریچے میں جا کر دہرایا۔ "چلو ان سے ملنے چلیں۔ عرصے سے ان سے ملاقات نہیں ہو سکی۔"

گوتم نے گھڑی دیکھی۔ "نہیں۔ اب سیدھے مڈہرسٹ چلو۔ ورنہ ہمیں واپسی میں دیر ہو جائے گی۔"

وہ سب چائے خانے کی لاؤنج سے نکل کر کار میں جا بیٹھے اور مڈہرسٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔

۴۷

چمپا نے دیکھا کہ کارزن سے چائے خانے کے پھاٹک سے باہر نکل گئی۔ اینجلو درخت کے نیچے میٹھا گٹار بجایا کیا۔ روشن، مائیکل، ڈینس، سر کھیا اور گلشن میز سے اٹھ کر

ٹہلتے ہوئے ندی کی طرف جا چکے تھے۔ چمپا نے آرام کرسی پر سے جھک کر گھاس کی ایک پتی توڑی۔

"کیا سوچ رہی ہو۔" سرل نے پوچھا۔ وہ دھوپ سے بچنے کے لئے ایک رسالہ چہرے پر رکھے مقابل کی آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔

"کچھ بھی تو نہیں۔"

"وہ تمھارے دوست لوگ جا رہے تھے۔ کار میں —"

"ہاں۔"

"میں نے دیکھا ہے کہ تم کراوڈ سے خود کو مماثل بھی نہیں کرنا چاہتیں مگر کراوڈ کی چاہت بھی بہت ہے — ایک عجیب قسم کی وفاداری۔ اس لئے کہ تمھارا اور ان کا ماضی مشترک رہا ہے۔ تم عجب مجموعۂ تضاد ہو —" سرل نے رنجیدہ آواز میں کہا۔ "میں تم کو دیکھتا ہوں تو بہت اداس ہوتا ہوں۔"

"اطالویوں کی طرح باتیں مت کرو۔" چمپا نے کہا۔

"یہ بھی تمھارے ساتھ ایک اور مصیبت ہے۔ ذاتی سطح تک پہنچتے ہی تم زور سے دروازہ بند کر دیتی ہو — بزدل — تمھیں اپنی بزدلی اور کمزوریوں کا علم ہے —؟" وہ کرسی سے اتر کر درخت کے تنے سے ٹک کر بیٹھ گیا۔ "اکثر جھوٹ بولتی ہو۔ حاسد ہو۔ دوسروں کی مسرت کو رشک سے دیکھتی ہو۔ دوسروں کو مرعوب کرنے کی کوشش میں ہر وقت مصروف رہتی ہو۔ دوسروں کو خود سے بہتر نہیں دیکھنا چاہتیں۔" وہ کہتا رہا —
"مثال کے طور پر — تمھیں روشن پسند نہیں۔ کیونکہ وہ یونیورسٹی میں تم سے زیادہ مشہور اور ہردلعزیز ہے۔ تم لکھنؤ میں مشہور رہی ہو گی مگر وہ ۱۹۴۷ء تھا۔ اور تم بھولتی ہو کہ اس بات کو دس سال گزر چکے ہیں اور روشن تم سے دس سال چھوٹی ہے چمپا — وقت کا سب سے بڑا کمینہ پن یہ ہے کہ ہم ابھی اس چیز کے لئے تیار نہیں ہو پاتے کہ ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا زمانہ نکل چکا۔ چمپا! خدا کرے تم سنیلا مکرجی کبھی نہ بنو —"

"سنیلا مکرجی —؟"

"ہاں۔ میں تم کو ایک انسٹیٹوشن میں تبدیل ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا۔ چمپا احمد جو آج سے دس سال بعد چلیسی کے ایک فلیٹ میں آرٹسٹوں اور ذہن پرستوں کی سرپرست اور گرُو ہو گی۔ خداوندا —— یہ بڑا دہشت ناک خیال ہے۔"

"میں اس قدر قابلِ رحم ہوں ——؟"

"نہیں ۔ہم سب قابلِ رحم ہیں۔ تم ان ساری باتوں کے باوجود بہت پیاری ہو۔ تم نیکدل ہو۔ یہ بہت بڑی چیز ہے —— اور شاید تم میں دوسروں کو معاف کرنے کی اہلیت بھی ہے۔ ہے نا؟"

"ہاں شاید۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ وہ اُٹھ کر چائے خانے کے لاؤنج میں آ گئے۔ روشن اور مائیکل اور ان کے ساتھی دُور لانچ پر بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ لاؤنج کے ایک صوفے پر چند روی کاغذ اور اخبار رکھے ہوئے تھے جو گوتم نیلمبر وہاں بھول گیا تھا۔

"تم دوستی کر سکتی ہو۔" سرل کہتا رہا۔ "ورنہ باقی تم سارے میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھری ہُوئی ہو —— اس کاغذ کے ٹکڑے کی طرح ——" اس نے بے دھیانی سے خالی لفافہ اُٹھایا جس پر گوتم کا پتہ لکھا ہُوا تھا۔ اس نے لفافے کو موڑ توڑ کر ایش ٹرے میں پھینک دیا۔

"سرل میں اتنی تیز روشنی میں ہوں —————— جتنی تم نے ابھی ظاہر کیا۔"

"ہم سب اسی تیز روشنی میں موجود ہیں ——————" اس نے صوفے پر سے ایک رسالہ اٹھایا۔ اس پر بھی گوتم کا نام چھپا تھا۔

"تم اسے بہت زیادہ چاہتی ہو نا ——؟" اس نے رسالہ چمپا کی طرف پھینک دیا۔ ایک وقت تھا خود گوتم نے اس سے عامر رضا کے متعلق اسی قسم کے امتحانی سوالات کیے تھے۔

"لیکن وہ تم سے ملتا کیوں نہیں ——" اس نے دوبارہ کہا۔

"پتہ نہیں —— مجھے اس سے ملنے کی فرصت کہاں ہے ——"

"تم پھر جھوٹ بول رہی ہو۔"
وہ ایک اونچی چوٹی پر کھڑی تھی۔ اور ساری دنیا اس کے رتی رتی احوال سے واقف تھی میں نے اپنے آپ کو اس طرح کیوں بکھرنے دیا۔ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ سارا زمانہ نکل چکا۔ سارا زمانہ۔۔۔
باہر بارش میں چند اور موٹریں آ کر رکیں۔ چند مشہور شیکسپیرین اداکار لاؤنج میں داخل ہوئے وہ اپنی تمثیل لے کر کسی تہوار کے لئے برابر کے گاؤں میں آئے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک ایکٹر سرل کو جانتا تھا۔ وہ سب آتش دان کے قریب جا بیٹھے۔ دوسری باتیں شروع ہو گئیں

۷۳

مڈہرسٹ کا عظیم الشان اور پُر فضا سینی ٹوریم سینکڑوں ایکڑ پر پھیلے ہوئے معطر جنگلوں اور باغوں میں گھرا، سکون سے بارش میں بھیگ رہا تھا۔ اس کے بشاش اور خوبصورت ہال میں ہر طرف پھول ہی پھول تھے اور مسکراتے ہوئے ہمدرد چہرے۔ شفاف، طویل گیلریاں، حسین ڈرائینگ روم۔ جھلملاتا ہوا اوڈی ٹوریم جہاں مشہور تھیٹر کمپنیاں آ کر مریضوں کے لئے تمثیلیں اسٹیج کرتیں۔ اس دل آویز جنت میں لوگ آرام سے ٹیلی ویژن دیکھتے ہوئے اپنے خاتمے کا انتظار کرتے یا کسی دوسری طرح کے خاتمے تک کے وقفے کے لئے پھر باہر کی دنیا میں واپس چلے جاتے۔ عمارات کے ایک ونگ میں سرے پر نرملا کا کمرہ تھا۔ جس کے تین طرف باغ تھا۔ یہ میرا کمرہ ہمارے آئی ٹی والے، نشاط محل ہوسٹل کے کسی کمرے کا ایسا ہے نا۔ نرملا نے طلعت سے کہا تھا۔ یہ لوگ ہر شے ماضی سے منسلک کرتی جاتی تھیں (سوئٹزرلینڈ نینی تال تھا۔ لیک ڈسٹرکٹ دہرہ دون کی طرح تھی۔ لندن میں بمبئی کی جھلک تھی) ماضی محفوظ تھا۔ کیونکہ اس میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہ تھی۔ کسی حادثے کا امکان نہ تھا۔
نرملا تکیے کے سہارے نیم دراز خوشی سے سب کو دیکھتی رہی۔ "اب مجھے لندن کی تازہ خبریں سناؤ۔"
"اچھا۔" طلعت اچک کر دریچے میں بیٹھ گئی۔ اس نے تفصیل سے بتانا شروع کیا۔

شانتا، کمال اور تل کے ساتھ نرملا کے پلنگ کے دوسری طرف بیٹھی تھی۔ گوتم پھولوں کے بڑے واز کے نزدیک کونے میں بیٹھا برنارڈ سے باتیں کر رہا تھا۔

"گوتم جی —" نرملا نے اسے مخاطب کیا۔ "اب ہندی سماچار ہو جائیں —" وہ اٹھ کر اس کے سامنے دریچے میں جا بیٹھا۔

"مجلس میلے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔" نرملا نے طلعت سے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"بڑے زوروں ہیں —" طلعت نے کہا۔ پھر ایک لمحے کے لئے وہ سب خاموش ہو گئے ہر سال نرملا مجلس کے سالانہ میلے کی تیاریوں میں پیش پیش رہا کرتی تھی۔ میلے میں اس کی غیر موجودگی کا یہ تیسرا سال تھا۔

"بس صرف اس اگست میں تم ہمارے ساتھ نہیں ہو۔" کمال نے کہا۔ "اگلے سال انشاء اللہ تم پھر میلے کی لیڈری کر رہی ہو گی۔"

"انشاء اللہ —" نرملا نے مسکرا کر کہا۔

"کل بھیا صاحب سے ملے تھے۔" گوتم بولا۔ "کہتے تھے کہ شاید آج تمہارے پاس آئیں۔"

"وہ تو مجھے کئی بار دیکھنے کے لئے آچکے ہیں بے چارے۔" نرملا نے کہا۔ "ان کی ایڈکیوں کی صورت حال کیسی چل رہی ہے —"

"ٹھیک چل رہی ہے روشن آرا —" طلعت نے کہا۔

"پھر اسکنڈل شروع ہوئے۔" کمال نے ڈانٹا۔

"نہیں۔ میں تو اس کے بعد ابھی پروفیسر ٹوینٹی کا ذکر کرنے والی تھی۔" طلعت نے ذرا سہم کر کہا۔

"تم نے ان کو میلے میں بلایا ہے۔" گوتم نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"یہ اچھا رکیٹ ہے۔ برطانیہ کے ان سب جغادری انٹلکچولز کو اپنی محفلوں میں بلا

بُلا کر وہی بڑے کھلاڑی ہو اور اس طرح ہندوستان کے لئے ان کی موافقت حاصل کرتی ہو۔ وہی بڑا ڈپلومیسی۔" بِل نے ہنس کر کہا۔

"وہی بڑا اور بھارت ناٹیم۔ انہی حرکتوں سے پاکستان ہاؤس والے جلتے ہیں۔" گوتم نے کہا۔

"اب رام گوپال کے مقابلے میں انھوں نے بلبل چودھری کو کھڑا کیا ہے ــــ" برنارڈ بولا۔

"تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے کہ بہت بڑا اکھاڑہ ہے اور رام گوپال اور بلبل اس میں کشتی لڑنے کے لئے اُتر رہے ہیں۔" طلعت نے اُداسی سے کہا۔

"تمھاری یہ تشبیہہ ــــ" گوتم نے کہا۔ "بالکل صحیح ہے ــــ سب سے بڑی ٹریجڈی وہ ہے جب فن کاروں کو غیر فنی اغراض کے لئے استعمال کیا جائے۔"

"ہم نے میلے ہیں اسپنڈر کو بھی بلایا ہے۔" طلعت نے مُنہ لٹکا کر کہا۔

"یہ بکے ہوئے اور خریدے ہوئے انٹلکچوئیلز کا دور ہے۔" گوتم نے کہا "اس عہد میں آرٹسٹ کی بڑی بھاری قیمت مقرر ہو چکی ہے۔ کون کہتا ہے کہ دُنیا میں آرٹسٹ کی قدر نہیں۔ دیکھو۔ ایشیا کے فن کار لوگ کس طرح فل برائٹ اور طرح طرح کے وظیفوں پر دھڑا دھڑ امریکہ چلے جا رہے ہیں۔"

"ایشیا کے فن کار لوگ تو دھڑا دھڑ سوویٹ یونین اور چین بھی جا رہے ہیں۔" بِل نے کہا۔ وہ بڑا سخت غیر جانب دار تھا۔

باہر دیودار کے جنگل پر شفق کی روشنی چھا گئی۔ عمارت کے مختلف کمروں سے موسیقی کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

"اب چلیں۔" گوتم نے کہا۔ "لندن واپس پہنچتے پہنچتے بہت رات ہو جائے گی"

"تم سب جا رہے ہو۔" نرملا نے یک لخت دہشت زدہ ہو کر پوچھا۔ "میں پھر اکیلی رہ جاؤں گی۔"

"تم اکیلی نہیں ہو نرمل۔" کمال نے اس کے پلنگ پر جھک کر کہا۔ "ہم سب ہیں سمے

تمہارے ساتھ ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" اُس نے آنکھیں بند کرلیں۔

"اگلے ہفتے تک کے لئے خدا حافظ نرملا" طلعت نے اس سے کہا۔

"نرمل۔ شاید میں اگلے ہفتے نہ آسکوں۔ پنڈت جی کسی کانفرنس کے لئے دلی سے آرہے ہیں۔ بڑی سخت مصروفیت رہے گی۔" گوتم نے نرمی سے کہا۔

"ہاں گوتم۔ تم میرے کارن اپنے کام میں حرج نہ کیا کرو۔" نرملا نے رسان سے جواب دیا۔

وہ سب گیلریاں عبور کرکے باہر آگئے۔ ڈرونگ کے روشن دریچے میں سے نرملا ان کو دیو داروں کے اندھیرے میں اوجھل ہوتا ہوا دیکھتی رہی۔

۷۴

طلعت کا فلیٹ سینٹ جانز ووڈ میں تھا۔ اس کے نزدیک ہی شانتا اور بل رہتے تھے۔ آس پاس اور بہت سے مشہور مصنفوں اور اداکاروں کے مکان تھے۔ بہار کا موسم آتا تو ان مکانوں کے پائیں باغ پھولوں سے بھر جاتے۔ شفاف سڑک پر سے سرخ رنگ کی ڈبل ڈیکر زسکون سے گزرتی رہتیں۔ چوراہے کی گروسر اور تمباکو فروش کی دوکانوں میں خریداروں اور دوکانداروں کے درمیان تلی گفتگو جاری رہتی۔ آگے بڑھ کر ایک چھوٹا سا اطالوی ریسٹوران تھا۔ اس میں ایک داڑھی والا پولش یہودی آرٹسٹ ہمیشہ اپنے کونے میں بیٹھا اسکیچ بناتا نظر آتا۔ وہ ہمیشہ متوقع رہتا کہ کوئی اُس سے اس کے اسکیچ خرید لے گا۔ کوئی اُس سے اُس کی تصاویر نہ خریدتا۔

سینٹ جانز ووڈ کے ان خوبصورت مکانوں میں رہنے والوں کی ذہنی زندگیاں بڑی طوفانی تھیں۔ محبتوں، طلاقوں، نفسیاتی اُلجھنوں کشمکشوں اور سیاہ قہوہ پر یہ لوگ اپنی زندگیاں بتاتے تھے۔ ان کے نشست کے کمرے انتہائی آرٹی انداز میں سجے تھے۔ لڑکیاں بالوں کی پونی ٹیل بناتی تھیں اور سیاہ رنگ کی تنگ موری والی پتلونیں پہنتی تھیں اپنے والدین سے

نفرت کرتی تھیں اور اپنی سائیکو اینالسس کرواتی تھیں۔ اکثر مرد اداکار اور ادیب، ہوموتھے۔ یہ کامیاب اور دولت مند فن کاروں کا محلہ تھا۔ یہ لوگ قدیم ایشیائی تہذیبوں، بازنطیم، رومن کیتھولک چرچ اور گپتا عہد کے آرٹ میں دلچسپی رکھتے تھے۔ یہ برطانیہ کی ذہنی ارسٹوکریسی تھی۔

چند فرلانگ پر سرکھیا کا مکان تھا۔ اس کا شوہر گلشن آہوجہ اسکول آف اکنامکس میں تھا۔

یہ دونوں میاں بیوی لاہور کے شرنارتھی تھے۔ اور دلی سے یہاں تعلیم کے لئے آئے ہوئے تھے۔ سرکھیا رقاصہ کی حیثیت سے بہت شہرت حاصل کر چکی تھی اور رائل اکیڈمی آف آرٹ میں کریوگرفی سیکھ رہی تھی۔ اس کے قریب میاں بی بی چوپڑہ رہتے تھے۔ آشا سنگتراش تھی۔ ستیش چوپڑہ بی بی سی کے ہندی سیکشن میں تھا۔ بدھ کے روز ان کے یہاں ہندی کے حلقہ ارباب ذوق کا اجتماع ہوتا۔ چیلسی کی ایک عالیشان موڈرن بلاک میں کملا کا الٹرا ماڈرن فلیٹ تھا۔ کملا طلعت اور نرملا کی بچپن کی ساتھی تھی۔ قیامت کی ذہین اور بڑی زبردست انٹلکچوئیل۔ بے حد خوش شکل لڑکی تھی۔ کلاسیکل رقص کی ماہر۔ وہ فارن سروس میں تھی۔ نرگیش بمبئی کے کسی کروڑپتی کی لڑکی تھی۔ کیمبرج کی تعلیم یافتہ۔ دوسری پارسی لڑکیوں کی طرح مغربی لباس پہنتی وہ بھی کہیں ملازم تھی اور کسی انگریز سے شادی کرنے والی تھی۔ کملا کی بڑی بہن ترکنسلا کا مکان نائیٹس برج میں تھا۔ یہ بھی ایک غیر معمولی ذہانت کی مالک اور بہت اونچے پائے کی انٹلکچوئیل تھی اور بے حد دلکش۔ اور بے انتہا پیاری لڑکی تھی۔ اس کے شوہر انڈیا ہاؤس میں پبلک ریلیشنز آفیسر تھے۔ فیروز جہاں یونیورسٹی میں اردو میں ریسرچ کر رہی تھی اور ریجنٹ پارک میں رہتی تھی۔ زرینہ بھی یونیورسٹی میں تھی اور اوسٹرلی میں اپنی والدہ اور بھائیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کے والد دلی میں تھے۔ ان سب کی بڑی مصروف زندگیاں تھیں۔ یہ سب اپنے اپنے مقاصد کی تکمیل میں جٹے تھے۔ صرف نرملا سریواستو۔ اس ہنگامے سے الگ مڈہرسٹ میں پلنگ پر پڑی تھی۔ اس کا خیال کر کے طلعت کا دل ڈوب جاتا۔ انہیں کو مسرت اب کس طرح حاصل ہوگی۔ نرملا جس کو اور سب کی طرح زندگی سے بڑی بڑی توقعات تھیں۔ خوشی بے حد

عظیم چیز ہے لیکن بے حد اضافی۔

طلعت دوسروں کی خوشی سے خوش ہوتی تھی۔ سرکھیا کے ڈانس کے بعد کئی مرتبہ انکور ہوتا یا گوتمہ کی کتاب کا نیا ایڈیشن نکلتا، یا کملا کی کسی اخبار میں تعریف چھپتی تو اس روز طلعت کی عید ہو جاتی۔ وہ دوسروں کے غم سے غمگین ہوتی تھی۔ وہ چمپا کا خیال کر کے بھی کافی ملول ہوتی۔ اکثر وہ انگریزی میں ایک زبردست ناول لکھنے کا وقتاً فوقتاً اعلان کرتی رہتی مگر کاہلی اور مختلف مصروفیات کی وجہ سے یہ ارادہ کبھی شرمندہ تکمیل نہ ہو پاتا۔ دن بھر اور اکثر رات گئے اخبار کی رپورٹنگ کے سلسلے میں دوڑنا دھوپنا پڑتا۔ اور اس میں طرح طرح کے ایڈونچر ہوتے۔ اسے عموماً سے لے بربڑ کے انٹرویو کے لئے بھیجا جاتا جو قریب سے دیکھنے کے بعد پتہ چلتا کہ بے حد معمولی انسان تھے۔ غیر معمولی انسانوں سے بے حد معمولی حالات میں ملاقات ہوتی۔

طالب علموں نے طرح طرح کی مصروفیات بنا رکھی تھیں۔ ایک ایشین فلم سوسائٹی قائم کی گئی تھی۔ جس میں ایک سے ایک بوگس ہندوستانی فلم دکھائے جاتے۔ انڈیا کلب میں ہندو آرٹسٹوں کی نمائشیں ہوتیں۔ فیروز کے گھر کے پاس ہمراز بھائی رہتے تھے۔ ان کا مکان علی گڑھ کا ایکسٹنشن تھا۔ یہاں ہر وقت مشاعرے ہوا کرتے۔

بی بی سی والوں کی ساری زندگی باتیں کرتے گزرتی تھی۔ بعض اوقات یہ لوگ سارا سارا دن کنٹین میں بحثیں کرتے بتا دیتے۔ ہر ایک اپنی اپنی ہانکتا۔ آلِ حسن اور اس کی بی بی کرشنا کا مکان بھی ایک اور گپ کا سنٹر تھا۔ کرشنا قانون پڑھ رہی تھی۔ آلِ بی بی سی کے ہندی سیکشن میں تھا۔ ترونا اور فیروز کے مکانوں پر لڑکوں اور لڑکیوں کا جھمگٹ رہتا۔ اس میں زیادہ تر بنگالی شامل تھے۔ یہی لوگ لندن مجلس کے روحِ رواں تھے۔

طلعت لڈہرسٹ سے لوٹ کر اپنے فلیٹ پہ پہنچی۔ اسی وقت اوجیت کا فون آیا۔ ہلو سنو — وہ دہاڑ رہا تھا۔ "دیکھو۔ یہ ٹیگور ٹیگور کا ہر وقت بنگالی شور مچاتے ہیں۔ اب اقبال ارننگ ہونا ضروری ہے" (اوجیت خود بنگالی تھا۔ اسے ایک لفظ اُردو کا نہ آتا تھا۔ پراگ میں اس نے انجینئرنگ پڑھی تھی) طلعت نے رالف رسل کو فون کیا۔ یہ علی گڑھ سے اُردو پڑھ کر آئے تھے اور یونیورسٹی میں اُردو کے اُستاد تھے۔ "اقبال ارننگ سے کہہ دیا ہے"؟ اُنھوں نے پوچھا۔ "ہاں"۔

طلعت نے جواب دیا۔ "اور اوجیت نے تو انگریزوں کے جگر مرادآبادی کو بھی بلایا ہے۔"

انگریزوں کے جگر صاحب انگریزی کے غزل گو شاعر تھے۔ جگر مرادآبادی ان پر کچھ ایسا چپک گیا تھا کہ ان کا اصل نام اب کسی کو یاد ہی نہ رہا تھا۔ یہ انگریزی کے اچھے خاصے دوسرے درجے کے شعرا میں شمار کئے جاتے تھے۔ روحانی طور پر سخت مسلمان تھے اور مشرق کے فلاسفی میں ان کو خدا کی قدرت اور روحانی برتری نظر آتی تھی۔

اب پھر ریہرسلیں شروع ہوئیں۔ ڈھاکے کا عطاء الرحمٰن، اقبال کے کلام کے لئے موسیقی کمپوز کرنے میں مصروف ہو گیا۔ فیروز اسکرپٹ تیار کرنے میں جُٹ گئیں۔ ترونا، شیلا، پرمودا، اوجیت اور ... اور سارے بنگالی اور کشمیری اور گجراتی لڑکوں اور لڑکیوں نے گانے کے لئے صحیح تلفظ کی پریکٹس شروع کی۔

طلعت اور رمیش سنگھوی مڈل ٹیمپل کی لائبریری میں اقبال کی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کرنے میں مصروف رہے۔

اقبال ایوننگ منعقد ہو چکی تو میلے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔

۷۵

لندن مجلس کا سالانہ میلہ شروع ہوا۔ ہال کے اُوپر کے زینے پر آ کر روشن نے نیچے کا منظر دیکھا۔ لڑکیوں نے دوکانیں لگا رکھی ہیں۔ ایک کمرے میں دہی بڑے اور کچوریاں بک رہی ہیں۔ بالکل امین الدولہ پارک کا نظارہ ہے۔ "ہاکرز" اپنے اخبار بیچ رہے ہیں۔ کمیونسٹ اپنا لٹریچر فروخت کرنے کے لئے آواز لگا رہے ہیں۔ سوشلسٹوں کا ایک گروہ اپنے پمفلٹ لئے کھڑا ہے۔

بِل ایک ستون سے ٹکا چپ چاپ کھڑا تھا۔ "ہلو روشن۔" اس نے کہا۔

وہ ٹہلتے ہوئے دوسرے ہال میں چلے گئے جہاں مختلف ایشیائی ممالک کے اسٹال تھے۔ تصویروں کی نمائش۔ ایک طرف ڈوکومنٹری فلم دکھائے جا رہے تھے۔

دفعتاً خاموشی چھائی۔ اور وہ سب گاتے ہوئے اسٹیج پر آئے۔ پرمود دا حسبِ معمول آرکیسٹرا کنڈکٹ کر رہے تھے۔

لائی سال چھے پیار بھرے ناواں ——

"کشمیر ——؟" ایک انگریز تماشائی نے پوچھا۔

"کشمیر —— یہ ہمارے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے۔" روشن نے کہا۔

"یہ لوگ، جو گا رہے ہیں کون سے کشمیر سے آئے ہیں؟ —— مقبوضہ یا آزاد ——؟" تماشائی نے سوال کیا۔

پوشن مالہ کرناواں چھیس

شالیمار گوشن چھیس دوراواں ——

"دونوں طرف کا کشمیر ایک دوسرے کے لئے آزاد اور مقبوضہ ہے۔" گلشن نے کہا۔

بل خاموشی سے پائپ پیتا رہا۔

روشہ روشہ یزاں وچھ پوشش کا رواں

پوشن مالہ کر۔

پھر بنگالی گاتے ہوئے آئے۔

"یہ اتنے جوش وخروش سے گا رہے ہیں۔ کیا یہ دہشت پسندوں کا گروہ ہے۔؟"
ایک ٹوری اخبار کے نمائندے نے پوچھا۔

"یہ۔؟ ہاں یہ دونوں بنگالوں کے رہنے والے ہیں۔" طلعت نے قریب آکر
بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

——— پون گھنٹہ گزر گیا۔ ٹوری اخبار نویس خفا بیٹھا تھا۔

"تم لوگ ہر وقت سیاسی گفتگو کیوں کرتے ہو۔" ایک برطانوی ادیب نے آہستہ
سے کہا۔ اب تک وہ بڑی اداسی سے اس منظر کو دیکھتا رہا تھا۔

"ہم لوگ بے حد بد قسمت ہیں اس لئے۔" طلعت نے ملول آواز میں جواب دیا اور پھر
کسی کام سے اٹھ کر اسٹیج کے پیچھے چلی گئی۔

اب ڈھولک بج رہی تھی۔

"پنجاب۔؟" ایک اور اخبار نویس نے پوچھا۔

"ہاں۔ پنجاب بھی وہ ہیں۔" قریب بیٹھے ہوئے سرکھیا کے میاں گلشن احمد جہ نے اسے

تلخی سے جواب دیا۔ "اور سوال کرو میں تمہاری معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کروں گا"

"ـــــ دھرتی چی آمی ہی لے کر بھاگوان ــــ دھرتی
شیتا ور جادو یا۔ سنگاتی گا دو یا۔ رانو پا کھر ــــ"

یہ مرہٹی گیت تھا۔

پھر گجراتی کورس شروع ہوا۔

"ہمے کھیترنی واڑی وتی۔ جنگل تی جھاڑی وتی
ساگر تھی گرو رتھی
سونی ساد آویا ـــــ او ہمیں سُونی ساد آویا"

فلیٹ اسٹریٹ کے نمائندے اسٹیج کے قریب فٹ لائٹس کے اندھیرے میں فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھے سامنے کے جگمگاتے منظر کو دیکھا کیے۔

اسٹیج پر وہ گا رہے تھے۔

"ہمیں جُگ جُگ کیر اکنگال
بھانگی نرکو نہ ودار
دنیا ڈگ ایک تال
دھرتی پر آویا ـــــ او ہمیں دھرتی پر آویا ـــــ
دیکھ دیکھ اورے اندھ
کارسین آویا
کارسین آویا ـــــ"

پھر ہال کے وسط میں وہ سب گھیرا بنا کر کھڑے ہوئے اور انھوں نے انٹرنیشنل شروع کیا۔

"ہر جگہ جوانیاں ہیں گا رہی
ہنسی خوشی منا رہی
اور لا رہی دشو متر تا ـــــ

دُنیا بھر سے ایک ہوئے نوجوان ایک آدرش مہان لیے
خطرہ ہو بلیدان کا — پھر بھی ہم لائیں گے سُکھ چین
سُکھ چین — سُکھ چین —

اُن کی آوازیں دُور ہوتی چلی گئیں —— روشن باہر آ گئی۔ یہ سب کیا بکواس ہے۔ ہجوم میں سے نکل کر تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے اُس نے سوچا۔ یہ درست ہے کہ اس طرح کے گیتوں سے خون میں ایک لمحے کے لیے ایک قسم کی جھنجھناہٹ سی محسوس ہوتی ہے لیکن صرف ایک لمحے کے لیے۔ یہ لوگ اس قدر ہلڑ کیوں مچا رہے ہیں۔ کیونکہ سب فنا ہے۔ اور انسان ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ انسان کبھی ایک نہیں ہو سکتے — اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔

"مس کاظمی۔" کسی نے پیچھے سے آواز دی۔ وہ ٹھٹھک گئی۔ یہ ترونا تھی۔ پھر لڑکیوں کے ایک ریلے نے اسے آ لیا۔ جن سے بچ کر وہ ابھی باہر نکلی تھی۔

"روشن —" فیروزہ نے کہا۔ "نذرل دا آ گئے ہیں۔ اس وقت ہم لوگ وہیں جا رہے ہیں۔ کل صبح سے ہم ان کے لئے چندہ جمع کرنے نکلیں گے۔ تم کو لینے کے لئے آٹھ بجے پہنچ جائیں گے۔ سمجھیں، تیار رہنا؟"

طلعت اس کے نزدیک آئی۔ "یہ کنجی لیتی جاؤ۔ میں شاید دیر سے آؤں۔ یا شاید سرلیکھا کے یہاں رہ جاؤں۔ صبح کو ضرور چلنا ساتھ۔ گڈ نائٹ۔"

وہ سب دوسری سڑک پر مڑ گئیں۔ وہ حسبِ معمول مصروف معلوم ہوتی تھیں: مصروفیت تکمیل مقاصد کا ہنگامہ۔ ہجوم ندی کے پانی کی مانند چاروں طرف بہا کیا۔ کالج میں چھٹیاں تھیں۔ اور وہ یورپ جاتے ہوئے چند روز کے لئے طلعت کے یہاں ٹھہر گئی تھی۔ میڈاویل کے اسٹیشن پہ پہنچ کر وہ اُوپر آ رہی تھی کہ اچانک اسے عامر رضا مل گئے۔ وہ کار میں اسی کی تلاش میں ادھر آ رہے تھے۔

"تم کہاں تھیں۔ میں تمھارے سارے ٹھکانوں پر تمہیں ڈھونڈ آیا۔"

"میلے میں —"

"میلہ — ؟ اوہ ۔ ہاں ۔ میلہ ۔ ٹھیک ہے ۔ آؤ ۔"

وہ نکڑ کے اطالوی ریستوران میں داخل ہوئے ۔ یہودی آرٹسٹ انھیں دیکھ کر فوراً اپنے کاغذ پر جھک گیا ۔

"روشن —" عامر نے میز پر بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا — "تم بڑی غلطی کر رہی ہو ۔ تمہارے ابا کو تمھاری رپورٹ پہنچ جائے گی ۔"

"اوہ —" وہ ہنس پڑی ۔ "لیکن عامر ان لوگوں میں بہت سے میرے عزیز دوست ہیں ۔ ان کے سیاسی خیالات یا ان کی قومیت دوستی کے راستے میں تو حائل نہیں ہو سکتی ۔"

"یہ تمھارا نظریہ ہے ۔" عامر نے کہا ۔ "لیکن زیادہ پریکٹیکل بنو اور اپنے نفع نقصان کو دھیان میں رکھو ۔ تمھاری سرگرمیوں سے تمھارے والد کی ملازمت پر بھی اثر پڑ سکتا ہے —"

"اور شاید میری اور تمھاری دوستی پر بھی —" روشن نے معاً دل میں کہا ۔ "لیکن عامر — میری کیا سرگرمیاں ہیں —" اُس نے چڑ کر کہا ۔ اس آدمی کو سمجھانا بیکار تھا ۔ پہلی مرتبہ اسے محسوس ہوا کہ یہ انسان جسے وہ اتنے عرصے سے اپنا دیوتا تصور کر رہی تھی ۔ ایک مختلف ہستی تھا ۔ ایک دوسرے جزیرے پر بیٹھا تھا ۔ اسے نہیں سمجھ سکتا تھا مگر وہ تیار ہو گئی ۔ کہ اس کے خیالات کی تابعداری کرے گی ۔ مرد کی تابعداری عورت کا فرض ہے ۔ فلسفے بیکار تھے ۔ مرد ہر حالت میں عورت کی مکمل اطاعت کا خواہاں ہے ۔ یہ کامریڈ وامریڈ سب غلط بات ہے ۔ اور یہ عامر رضا بہر حال کامریڈ نہیں تھا ۔ اب یک لخت اُس کی سمجھ میں آ گیا کہ چمپا احمد سے اس کی کیوں نہ نبھ سکی ۔ چمپا ، اپنے خیالات میں ، خواہ وہ کتنے ہی گنجلک کیوں نہ رہے ہوں ، خود مختار رہنا چاہتی تھی ۔ لیکن شاید چمپا بھی مکمل طور پر خود مختار نہ تھی ۔ کاش وہ چمپا سے پوچھ سکتی کہ وہ اب کس کے خیالات کی اطاعت میں مصروف ہے ۔ وہ خاموشی سے کھانا کھاتے رہے ۔ باہر ریسٹوران کے دروازے پر چیتھڑوں میں ملبوس ایک ہنگرین ساز ندے نے وائلن پر "ہپا لوی باغ میں ایک رات" بجانا شروع کر دیا تھا ۔

"اسپین چلو گی — ؟" عامر نے پوچھا ۔

۵۳۱

"ہاں۔"

"جرمنی؟"

ہاں۔ جہاں کہو گے چلوں گی۔ اس نے دل میں کہا۔ فلسفے اور آزادیٔ افکار لغو بات ہے۔ اگر اس وقت طلعت یا کملا کو اس کے ان خیالات کا پتہ چل جائے تو وہ فوراً اسے پھانسی پر لٹکا دیں۔ یہ سوچ کر وہ اُداسی سے مُسکرائی۔

عامر رضا نے اس کی مسکراہٹ نہیں دیکھی۔

دوسرے دن وہ لڑکیوں کے ساتھ قاضی نذرالاسلام کے لئے چندہ جمع کر کے طلعت کے فلیٹ واپس پہنچی تو اُس نے ایک اجنبی کو موجود پایا جو اُس کے انتظار میں نیچے باغ میں ٹہل رہا تھا۔

"آپ کے خلاف رپورٹ پہنچی ہے کہ آپ کمیونسٹوں ———— کے جلسوں میں شریک ہوتی ہیں۔" اجنبی نے کہا۔

"جی — ؟" وہ ہکّا بکّا رہ گئی۔

"یہ غلط ہے — ؟"

"بالکل وہ لوگ کمیونسٹ قطعی نہیں ہیں۔"

"آپ کو برابر ایک خاص گروہ کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ"

"مگر یہ تو محض طالب علمانہ ہنگامے ہیں۔ ہر جگہ ہوتے ہیں۔"

"جی!"

"آپ کا مطلب ہے —" وہ وہیں مکان کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ "کہ میں انسانی رشتوں

کو سیاسی مصلحتوں پر قربان کر دوں؟ ان لوگوں میں سے بہت سے میرے عزیز ترین دوست اور ساتھی ہیں۔"

"انسانی رشتے —" اجنبی نے حیرت سے پوچھا۔ "وہ کیا چیز ہے — رشتے صرف سیاسی ہوتے ہیں — انسانی رشتے کس چڑیا کا نام ہے۔ اس بے تکلفی کو معاف فرمایئے گا مس کاظمی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ فلسفوں اور آئیڈیلز نے آپ کو کہیں کا نہ رکھا۔ اسی لئے میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ فلسفے اور ادب عالیہ کی تعلیم آج کی دنیا میں بالکل لغو اور بے معنی ہے۔ آپ نے بزنس ایڈمنسٹریشن کیوں نہ پڑھا۔"

روشن غصے سے تلملا رہی تھی لیکن ہنس پڑی —

"تشریف رکھئے۔" اُس نے دوسری سیڑھی کی طرف اشارہ کیا

"میں نے آپ کا بہت ذکر سنا ہے۔" اجنبی نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ کی قابلیت کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ لیکن افسوس کہ —"

"کہ میں غلط راستے پر پڑ گئی —؟! میں آپ سے عرض کر دوں مسٹر —"

"— خان —"

"مسٹر خان کہ میں کمیونسٹ نہیں ہوں۔"

"نہیں ہیں —؟ اس کا ثبوت آپ کے پاس کیا ہے؟"

یہ بڑا ٹیڑھا سوال تھا۔ خیالات جیسی غیر مرئی چیز کے متعلق کس طرح کوئی ثبوت پیش کیا جا سکتا تھا۔ وہ فلسفے اور خیالات کی طالب علم، اس بے بسی پر بے حد تلملائی۔

اب امریکہ جانا گول سمجھو — اس رات پلنگ پر لیٹتے ہوئے اس نے سوچا (اسے آئندہ سال ہارورڈ جانے کے لئے فل برائٹ وظیفہ مل چکا تھا) دیر تک کروٹیں بدلتے رہنے کے بعد نیند آئی۔ صبح جب وہ سو کر اُٹھی تو اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ عدالتیں۔ سزائیں جیل بندوق۔ گولہ بارود۔ نعرے۔ رات بھر اس نے اس قسم کے خوفناک خواب دیکھے تھے۔

"آخر جن کو جیل بھیجا جاتا ہے۔ وہ آسمان سے تو نہیں اُترتے ہیں۔ ہماری تمہاری طرح

۵۳۳

ہی کے انسان ہوتے ہیں۔" ناشتہ تیار کرتے ہوئے اُس نے طلعت سے کہا۔
طلعت نے اس کی رائے سے اتفاق ظاہر کیا۔
"تم مذاق سمجھ رہی ہو۔" روشن نے جھنجھلا کر کہا۔
"بالکل نہیں۔" طلعت نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
"سوال یہ ہے۔" روشن انڈے پھینٹتے ہوئے آہستہ آہستہ بولی۔ "کہ ایک طرف روپیہ اور عزت اور شان و شوکت ہے۔ اور سیکورٹی۔ اور دوسری طرف محض دھندلکا ہے اور دھندلکے میں خواب نظر آتے ہیں۔"
"ہاں۔ ایک طرف سیکورٹی ہے۔ دوسری طرف سیکورٹی ایکٹ۔ فیصلہ تمہیں خود کرنا ہے۔" طلعت نے کہا۔
سرکھیا نے جلدی جلدی چائے پینے کے بعد گھنگرو باندھ لئے وہ سب نذر الاسلام کے پروگرام کی ریہرسل کے لئے صبح صبح طلعت کے یہاں جمع ہو چکے تھے۔
"روشن۔" گوتم نے اسے غیر معمولی طور پر خاموش دیکھ کر سوال کیا۔ "تمہارا پرابلم کیا ہے۔" وہ حسب معمول پیغمبرانہ شان سے آکر دیوان پر بیٹھ گیا۔
"ذہنی کشمکش ———" طلعت نے مختصراً جواب دیا اور توس سینکنے میں مصروف رہی۔
"تو کیا ہوا۔ اپنے وطن واپس جاؤ۔ چند سال بعد وہاں ریوولیوشن آئے گا۔ اس میں تمہاری بڑی ضرورت ہوگی۔" گوتم نے اس قدر یقین اور اعتماد کے ساتھ کہا کہ روشن کو ہنسی آگئی۔
"لیکن میں ریوولیوشن نہیں چاہتی۔" اس نے کہا۔
"وہ تو میں جانتا ہوں۔" گوتم نے اطمینان سے جواب دیا۔ "میں نے صرف یہ کہا تھا کہ جب ریوولیوشن آئے گا تب تم کام کرو گی۔"
"اسے غلط راستے پر مت لگاؤ۔" طلعت نے کہا۔ "پہلے ہی اس کی رپورٹ ہو چکی

ہے — اسی طرح تم نے چمپا باجی کو ایجوکیٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔ فیل ہو گئے۔ اور دیکھو ان کا کیا ہوا۔"

"کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ یہی افسوس ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کا کچھ نہیں ہوتا معلق رہتے ہیں۔ کہیں نہیں پہنچ پاتے۔ بہتے رہتے ہیں۔" گوتم نے آہستہ آہستہ کہا۔

کیا اس وقت یہ چمپا کو یاد کر رہا ہے۔ طلعت نے سوچا۔

"لیکن روشن۔ تم اپنے سفارت خانے جاکر کہہ دو کہ تم کو ہم لوگوں سے کوئی مطلب نہیں" گوتم، روشن کو مخاطب کرکے کہہ رہا تھا۔

"میں غلط بیانی نہیں کر سکتی۔ مجھے اپنی ضمیر پرستی پر اب تک بہت ناز رہا ہے۔ مجھے تم لوگوں سے بہت بڑا مطلب ہے۔ تم لوگ میرے دوست ہو — میں دوستی کا مطلب سمجھتی ہوں۔ اس کی قدر و قیمت۔"

"مطالب سمجھنے کی کوشش نہ کرنا۔ بہت دکھی ہوگی۔" گوتم نے دفعتاً بڑی رنجیدہ آواز میں کہا۔ طلعت نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ یہ اس وقت چمپا کو یاد کر رہا ہے۔ اس نے دل میں دہرایا

"اجی انکار کرنے میں کیا رکھا ہے۔" اس نے گوتم کا دھیان بٹانے کے لئے شگفتگی سے بات شروع کی۔ "ایک سے ایک لوگ ایک زمانے میں ترقی پسند تھے۔ اعلان کر دیا کہ اب ترقی پسند نہیں ہیں۔ اور دیکھو کیا مزے کر رہے ہیں۔" اس نے روشن کی طرف مڑ کر کہا۔ "اور تم تو کبھی بھی ترقی پسند نہیں تھیں نہ کل نہ آج —"

"بھیا صاحب نے بھی تو مضامین لکھے تھے۔" فیروز نے سوچ کر کہا۔

"مگر اب تو وہ بہ بانگِ دہل کہتے ہیں کہ تائب ہو چکے ہیں۔" طلعت نے جواب دیا۔

"بھیا صاحب کو لٹریچر میں بھی دخل تھا —؟" گوتم نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ ایامِ جہالت میں۔ اب انھیں گیان حاصل ہو چکا ہے۔ ورنہ فارن سروس میں یونہی لے لئے جاتے۔" طلعت نے کہا۔

"یہ ایامِ جہالت کب تھے —؟" گوتم نے سوال کیا۔

"۳۹ سنہ وغیرہ ہیں۔" طلعت نے جواب دیا۔ "ارے تم کو کیا معلوم۔ بہت بڑے انقلابی تھے ایک زمانے میں۔ لکھنؤ کے اندر۔ چمپا باجی بھی سب کے ساتھ ساتھ لگی رہتی تھیں۔ رشیدہ آپا کے یہاں بیٹھ کر یہ سب آزاد نظمیں لکھتے تھے۔"

"چمپا باجی اتنی پرانی ہیں — ؟" روشن نے چونک کر پوچھا۔

"معلوم نہیں ہوتیں —" نروتا نے کہا۔

"سدا بہار ہیں۔" فیروز نے جواب دیا۔

"دوستی محبت سے بلند تر شے ہے۔" گوتم نے آہستہ سے کہا۔ "بہت سے لوگ یہ بات نہیں سمجھ پاتے —"

"تم بھی اعلان کر دو جی —" طلعت نے پھر جلدی سے گفتگو کا رُخ اصل موضوع کی طرف موڑا۔ "کہ مجھے ان موئے سُرخوں سے کوئی مطلب نہیں۔"

"تم کہدو کہ تم سُرخا سُرخ فرخ آبادی کبھی نہ تھیں، نہ ہو، نہ ہو گی —" فیروز نے کہا۔

دروازہ کھلا اور محمود الظفر مسکراتے ہوئے داخل ہوئے۔

"دستِ صبا لائے ؟" کورس ہوا۔

"جی ہاں۔" انھوں نے کہا۔

سب آگ کے پاس جا بیٹھے اور "دستِ صبا" عقیدت سے ہاتھوں ہاتھ لی جانے لگی۔

"سمجھیں تم —" گوتم نے کتاب کے صفحے پلٹتے ہوئے بے دھیانی سے کہا۔ "بس تم جا کر کہدو۔ آئندہ ہم سب سے قطع تعلق کر لوگی — کیا تم کو معلوم نہیں کہ قطع تعلق کرنا دراصل بے حد آسان ہوتا ہے —"

"تم اسٹیون اسپنڈر کی طرح —" طلعت نے کہنا شروع کیا۔

"یہ بات بے بات انگریزی ادیبوں کا ذکر کئے بغیر تمھارا کھانا ہضم نہیں ہوتا —" فیروز بولی۔

"کیا کیا جائے۔ اپنی اپنی کمزوری ہے۔" طلعت نے کہا۔ اور بات جاری رکھی۔

"تم ایک کتاب لکھنا کہ کس طرح تم کو ڈوپ بنانے کی کوشش کی گئی مگر تم صاف بچ گئیں۔"
"تم نے فریڈم کا انتخاب کیا۔" فیروز نے لقمہ دیا۔
"وغیرہ وغیرہ ـــ" سریکھا نے کہا۔ اب تک وہ کمرے کے سرے پر کھڑی تلانا کی پریکٹس کر رہی تھی۔
"کیا بیوقوفی کی باتیں کر رہی ہو تم لوگ ـ" ترونا نے پیانو پر سے اُٹھتے ہوئے کہا۔
"روشن تم جرمنی جا رہی ہو کل ـ ؟"
"ہاں ـ"
"تو ہمارے ساتھ ہی چلو۔ ہم لوگ بھی یوتھ فیسٹول کے لئے کل جا رہے ہیں۔ مشرقی برلین ـ"
"مشرقی برلین میں کیسے جا سکتی ہوں ـ" روشن نے کہا۔
"کیوں ـ تم میں کیا سرخاب کا پر لگا ہے۔ ساری دُنیا کے لوگ جا سکتے ہیں تم نہیں جا سکتیں ـ "
"کمال ہے بھئی۔" فیروز نے سر ہلا کر کہا "ساری رامائن ہو گئی آپ پوچھتی ہیں سیتا کون تھی ـــ ارے یہی تو قصّہ ہو رہا ہے ـ"
"بکواس ؎ ـــ سریکھا نے کہا "چلو روشن یہ ایسا تجربہ ہے۔ جو زندگی بھر کبھی حاصل نہ ہو گا۔"
"نہیں ـ"
"ارے۔ کیا رکھا ہے۔ واپس آ کر سوویٹ یونین اور مشرقی یوروپ کے خلاف تین چار مضمون لکھ دینا۔ سب یہی کرتے ہیں ـ" طلعت نے کہا۔
"یہاں اتنی بے ایمانی ہے۔ اتنی ضمیر فروشی ہے روشن بیگم جس کا تم کو اندازہ نہیں ہو سکتا ـ" گوتم نے کہا "آج کی دُنیا میں تم اپنے ضمیر کو بچائے نہیں رکھ سکتیں ـ"
وہ کوٹ پہن کر باہر جانے کے لئے تیار ہوئی۔
"ہم تم سے برلین میں ملیں گے ـ"

"مغربی برلین میں۔" روشن نے مسکرا کر کہا۔
"نہیں ہم تم سے مشرقی برلین میں ملیں گے۔"
"یہ تقسیم شدہ دنیا ہے۔ ملک، انسان، نظریے، روحیں، ایمان، ضمیر، ہر شے تلواروں سے کاٹ کاٹ کر تقسیم کر دی گئی ہے — یہاں ہر طرف سرحدیں ہیں۔ اس تقسیم شدہ دنیا میں ہم ایک دوسرے سے سرحدوں ہی پر مل سکتے ہیں — روشن —" گوتم نے کہا "ہم تم سے مشرقی اور مغربی برلین کی سرحد پر ملیں گے۔"
"اگر اس وقت تم کو جیل نہ بھیج دیا گیا۔" طلعت نے ہنس کر کہا۔

۷۶

بارش ختم ہونے پر چمپا اور سرل دیہاتی چائے خانے سے باہر نکلے۔ لانچ پر بیٹھ کر وہ سب کیمبرج واپس پہنچ گئے۔ راستے میں ندی ہرے بھرے کنجوں میں سے گزری۔ جہاں گھنی شاخوں نے پانی پر چھت سی بنا رکھی تھی۔ یہ ٹرم کا آخری دن تھا۔ کل سے چھٹیاں شروع تھیں۔ چمپا نے سرل پر نظر ڈالی۔ ہر چیز کہی جا چکی تھی۔ اب کہنے کو کیا باقی تھا۔ ہر شے میں گھسا پٹا پن آ گیا تھا سرل ایشلے میں بھی۔ وہ اسے اتنی اچھی طرح جانتا تھا۔ اور وہ اس سے اتنی اچھی طرح واقف تھی۔ کتنے رنج کی بات تھی۔ اب وہ کن جنگلوں میں جا کر چھپے گی۔ اب بن ابن بن میں۔ چنچل مورے من میں۔ کنج کنج پھرے شام۔ وہ ریلنگ پر جھک کر ایک بہت پرانا گیت گنگناتی رہی۔ سرکھا نے ندی کی سطح کو دیکھا جو بہت پرسکون تھی۔ کنارے پر پہنچ کر وہ لندن کی طرف روانہ ہو گئی۔
اسے واپس پہنچ کر مجلس میلے کی تیاری کرنا تھی۔ اس کے بعد وہ برلین جا رہی تھی۔ وہاں سے لوٹ کر اسے ٹی وی پر ناچنا تھا۔ پھر وہ رام گوپال کے ساتھ سارے یورپ کا دورہ کرنے والی تھی۔ "گریٹ سرکھا دیوی — انڈیاز انیا پاولووا۔" سرل نے تمسخر سے کہا۔ "خدا حافظ۔"
"خدا حافظ۔" سرکھا نے اپنے خلیق تبسم کے ساتھ جواب دیا۔ وہ اسے رخصت کرنے

کے بعد لکڑی کے بوٹ ہاؤس کے نیچے آکر بیٹھ گئے۔ سِرل کے سنہرے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ وہ چمپا کو اس قدر مانوس معلوم ہوا۔ گویا اس کا شوہر تھا۔ اسے ایک جھرجھری سی آئی۔ وہ اس کا نہیں کسی اور لڑکی کا شوہر تھا۔ اس لڑکی کو چمپا نے آج تک نہ دیکھا تھا۔ منظر پر سائے پھر پھیل گئے۔ کشتیاں کنارے سے بندھی کھڑی تھیں اور موسم کی ساری خوشبوئیں اکٹھی ہو کر گلابوں کی چھاؤں میں پانی پر تیر رہی تھیں۔ آسمان پر سے مرغابیاں گزریں۔ گابوں نے آکر پانی میں اپنا عکس دیکھا اور مطمئن ہو گئیں۔ بوٹ ہاؤس کی بالکنی پر ایک لڑکی آکھڑی ہوئی۔ بہت سے لوگ پریم روز کی بیلوں کے کنارے بنسیاں اٹھائے پانی کی اور جا رہے تھے۔

"چمپا۔" سِرل نے ایک الٹی ڈونگی پر بیٹھ کر کہا "مجھے کچھ اپنے پس منظر کے متعلق بتاؤ۔"

اس نے دیکھا کہ دور دیس سے آئی ہوئی یہ لڑکی اس کے سہارے وہاں بیٹھی تھی۔ وہ بے حد غیر محفوظ تھی۔ اپنے پس منظر میں شاید وہ محفوظ رہ سکے۔ لیکن اس کی اپنی دنیا جانے کون سی تھی۔ دنیائیں برابر بدلتی رہتی ہیں۔ یہ لڑکی اسے بے انتہا مانوس نظر آئی۔ روز ماری اس کے لیے اجنبی تھی۔ وہ یکلخت بہت گھبرا گیا۔ اسے معلوم ہوا کہ وہ اس لڑکی چمپا احمد سے ایک غیر مرئی بندھن میں بندھا ہوا ہے۔ اسے اپنے آپ پر اور اس لڑکی پر بڑا ترس آیا۔

"کیا تم بھی میرے متعلق ناول لکھو گے۔" چمپا نے پوچھا۔

"نہیں — اور کون لکھنے والا تھا؟"

"ہری — ولیم کریگ۔"

"نہیں۔ میں ناول نہیں لکھنا چاہتا۔"

"کیا میں تم کو بہت عجیب معلوم ہوتی ہوں؟"

"تم عجوبۂ روزگار نہیں ہو۔ تمھاری طرح کی بے شمار لڑکیاں موجود ہیں۔ ذہین حساس۔ اور دلکش۔"

چنانچہ ان تین الفاظ سے میری وضاحت ہو جاتی ہے — چمپا نے دل میں کہا۔ اس نے آنکھ بند کر کے اپنا پس منظر یاد کیا۔ بنارس کا محلہ۔ گھر۔ آنگن میں کھری چارپائیاں پڑی ہیں۔ بابا بجوان پی رہے ہیں اور مقدموں کی مسلیں دیکھتے جاتے ہیں۔ سِرل کو یہ منظر دکھانا اسے اچھا

نہ لگا۔ وہ اسے پھلانگ کر آگے بڑھ گئی۔ لکھنؤ۔ آئی ٹی کالج۔ کیلاش۔ گلفشاں ۔۔۔ لیکن گلفشاں اس کا گھر نہ تھا (ہو سکتا تھا)

"یہ دیکھو کون آرہا ہے۔ تمہارے پس منظر سے نکل کر۔" سرل نے کہا۔

چمپا نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ کنارے پر دور دور تک بکھرے ہوئے تعطیل منانے والوں کے مجمع سے نکل کر کمال بوٹ ہاؤس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ گھاس پر اس کا سایہ آگے آگے چلتا رہا۔

"ہلو چمپا باجی۔ ہلو سرل۔" اس نے قریب آکر کہا۔

"ہلو۔"

"کل صبح ہم نے آپ کو ایک روڈ ہاؤس میں دیکھا تھا۔"

"ہاں۔"

"مگر ہم لوگ ذرا ۔۔۔ جلدی میں تھے۔"

"ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں۔ بیٹھو۔"

وہ بھی ایک الٹی ہوئی ڈونگی پر بیٹھ گیا۔

"میں سرل کو لکھنؤ کے متعلق بتا رہی تھی۔" چمپا نے کہا۔

"واقعی۔" کمال نے اخلاقاً دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ یہ ابھی تک وہیں بیٹھی ہیں۔ دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی۔ کمال نے تاسف سے سوچا۔

چمپا نے کمال کے لہجے کے رنج کا اندازہ لگا لیا۔ تم مجھے کبھی نہیں سمجھ سکو گے کمال۔ اس نے کہا۔ تم نے مجھ پر ہمیشہ چیزوں کی پرستش کا الزام لگایا ہے۔ لیکن گرمی کی دوپہروں میں بھوسے کے ڈھیر کی مہک، اور گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز، اور خاموش سڑکوں پر سے گزرتی ہوئی بیل گاڑی ۔۔۔ مجھ میں شاید زیادہ عقل نہیں۔ لیکن میں ان سب چیزوں کو محسوس کرنا اور اپنے پاس رکھنا چاہتی ہوں۔ اگر میں بہت زیادہ عقلمند ہوتی تو تمہارا فلسفہ پڑھتی اور مطمئن ہو جاتی۔

اوجیت ندی میں سے نکل کر آیا اور کمال کے نزدیک بیٹھ گیا۔

"سرل کاش تم نے بارش کے بعد چاند باغ کے کنجوں پر جو رنگ بکھر جاتے تھے، وہ

دیکھے ہوتے۔ یا رام نگر کی وہ گرد آلود سڑک جس میں گرمیوں کی بھری دوپہر کے سناٹے میں ایک چھوٹا سا اداس ہندو بچہ لمبی سی چوٹی رکھائے ایک منڈیر پر تنہا بیٹھا سوائیوں کا پہاڑہ یاد کر رہا تھا — نہیں سرل۔ میں تم کو اپنا پس منظر نہیں بتا سکتی۔ بہت مشکل ہے اور تم سمجھ نہیں سکو گے۔“

”میں تم کو بتاؤں گا“ کمال نے آگے جھک کر کہنا شروع کیا۔ وہ معاً اس دنیا میں داخل ہو گیا جو یہاں سے بہت دور تھی۔ جس پر وہ عاشق تھا۔ ان مناظر کی روح کو کمال سے بہتر کون جان سکتا تھا۔ وہ اس کا پیارا ہندوستان تھا۔

”لو سنو — گیان وتی کندھوں پر بال جھٹکا کر اَمّن کا خیال گاتی تھی — آلِ نبیؐ اولادِ علیؑ پرواری واری جاؤں — زہراؑ کے فرزند حسنؑ حسینؑ — اب میں اس کا ترجمہ کیسے کر سکتا ہوں — اور مالتی گاتی تھی — کا نہا موہے آساوری راگ سناؤ — اور شادیوں کے موقعوں پر کلیان پور میں والان کے پردے گرا دیئے جاتے تھے اور تختوں کے چوکے پر بیٹھ کر میراثنیں الاپتی تھیں — اس بنے پر سایہ علیؑ کا۔ مورا شیام سندر بنا — کون مغربی سوفسٹی کیٹ اس منظر کے حسن کو سمجھ سکتا ہے — مورا شیام سندر بنا —“

”اور —“ چمپا نے کہا۔ ”میرے گھر کی میراثنیں گاتی تھیں — منگل گاؤں — چوک سجاؤں — گجرا چنبیلی کا لاؤ ری — چنبیلی کا گجرا تم نے دیکھا ہے سرل — ؟“

”اور گھاگرا کے کنارے میرے گاؤں کے کسان کھیتوں کی منڈیر پر بیٹھ کر چاندنی رات میں آلہا اودل کی تانیں اڑاتے تھے — علی علی کر کے سیّد دوڑین — آلہا کھینچ لہن تلوار — اور غدیر کا جا بجا نوٹنکی میں چہرے پر سفیدہ پوت کر گایا کرتا تھا ؎

خدا کا شکر ہے لیلےٰ تیرے دربار میں آیا
کہ جس سرکار کا تھا میں اسی سرکار میں آیا

چمپا باجی — وہ نوٹنکی تم کو یاد ہے — ہم تمہیں کرسمس کے زمانے میں اپنے گاؤں لے گئے تھے اور رات بھر کمبلوں میں لپٹ کر ہم نے لیلےٰ مجنوں ملاحظہ کیا تھا اور میرے گاؤں کے اداکار ہم کو خوش کرنے کے لئے اپنا سارا آرٹ صرف کئے ڈال رہے تھے۔

۵ ۱۴۱

"ہاں ـــ" چمپا نے جو اس وقت لکھنؤ سے پچیس میل کے فاصلے پر کلیان پور میں موجود تھی، وہیں سے جواب دیا۔ "ہاں اس نے ہوا میں ہاتھ لہرا کر کہا تھا ؎

تیرا چہرہ مرا قبلہ ہے، تری زلفیں، میرا ایماں
طوافِ کعبہ کرنے کو ترے دربار میں آیا"

"ہاں" کمال نے کہا۔ وہ بھی کلیان پور میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ سب نوٹنکی میں منڈپ کے نیچے شال اور کمبل اوڑھے بیٹھے تھے۔ شکستہ حال اسٹیج پر صرف مدھم سا گیس کا ہنڈا روشن تھا۔ پردہ پہ ایک فوارہ بنا ہوا تھا اور چارپائیاں جو کھمبوں کے سہارے میٹھی تھیں۔ تقدیر کا بھا لخب ماسٹر پھریدو جو اپنی تیز پاٹ دار آواز کی وجہ سے جھینگروا کہلاتا تھا، لیلےٰ کے سامنے کھڑا دہاڑ رہا تھا۔ گاؤں کا آرکسٹرا زور شور سے ہارمونیم اور طبلہ بجانے میں مصروف تھا۔ ماسٹر پھریدو نے گایا ؎

زلیخا کی طرح جب ترا عاشق ہوا لیلا!
تو یوسف کی طرح بکنے ترے بازار میں آیا

برابر کے مونڈھے پر گوتم نیلمبر بیٹھا تھا۔ اس کے برابر ہری شنکر موجود تھا اور ساتھ کی ساری لڑکیاں۔ اور گوتم آگے جھک کر بڑی سنجیدگی کے ساتھ چمپا کے سامنے فوک کلچر کے مسئلے پر روشنی ڈال رہا تھا۔ وہ سب صبح چار بجے تک نوٹنکی کے منڈپ میں بیٹھے رہے تھے۔ اور انھوں نے مٹی کے کورے کلھڑوں میں ادرک والی چائے پی تھی اور گنّے کا رس کھایا تھا۔ یہ کمال کے والد نواب تقی رضا بہادر کا موروثی گاؤں تھا۔ یہاں کمال کی موجودگی میں اس کی رعیت میں صرف سید اور برہمن پلنگ پر بیٹھ سکتے تھے۔ باقی لوگوں کے لئے حکم تھا کہ کھڑے ہو کر باتیں کریں۔ اب اسٹیج پر ماسٹر مراری لال جو کلکتہ تک تھیٹر کمپنیوں کے ساتھ گھوم آیا تھا، سوہنی میں گا رہا تھا ؎

یاس کا عالم نہ تھا، یوں بے کسی چھائی نہ تھی
اب تو لیلےٰ تھی تماشا خود تماشائی نہ تھی

وہ سب مونڈھوں پہ بیٹھے نوٹنکی دیکھتے رہے۔ سباہر آم کے جھرمٹ میں پوس کی ہوا

سائیں سائیں کر رہی تھی۔ گرم اور محفوظ، وہ منڈپ میں بیٹھے طبلے پر کہروا سنتے رہے۔ دفعتاً ایک موٹر لانچ ایک انگریزی ریکارڈ بجاتی ہوئی تیزی سے گیم کی لہروں پر سے گزر گئی۔ چمپا اور کمال واپس آ گئے۔

"ہمارے گاؤں کی نوٹنکی میں نل دمینتی اور راندر سبھا بھی بہت فرسٹ کلاس ہوتا تھا۔" کمال کی ملول آواز سنائی دی۔ وہ جھک کر سرل کا سگریٹ جلا رہا تھا۔

"اور تم کو جو تھیکارائے یاد ہے کمال۔" چمپا نے آہستہ آہستہ کہا۔ "اور وسنتی کا وہ گیت۔ جو گن کھوجن نکلی ہے —"

"ہاں۔" کمال نے اس کے ساتھ تعاون جاری رکھا۔

"اور جاڑوں کی دھوپ میں بیٹھ کر ہری شنکر گاتا — اگر دینی تھی ہم کو حور و جنت تو یہاں دیتے — اور پیا ملن کو جات تھی میں، بیج دھج سیس گندھائے۔ لوگ کہت ہیں باوری — سب جگ ہنسی اڑائے — تم کو کیا پتہ —" اس نے غصے سے سرل کو مخاطب کیا۔ "کہ پنکج ملک کون ہے۔ پہاڑی سانیال۔ اور آرزو لکھنوی۔ اور نرائن راؤ ویاس اور کانن دیوی — ان لوگوں کا ہماری زندگیوں میں کیا مقام ہے —"

"تمھیں کیا پتہ —" چمپا نے اس کی خفگی کا کیوُ لے کر کہنا شروع کیا۔ "تم جو مجھ سے میرا پس منظر دریافت کرتے ہو — کہ پیارے قوال کی کیا ہستی ہے اور فیاض خاں اور دبیاپالی تعلقدار — اور —"

"اور تم کو کیا معلوم کہ لکھنؤ اور علی گڑھ کے مشاعرے کیا ہوتے تھے۔ اور جگر صاحب کی ہمارے لیے کیا اہمیت ہے اور فراق صاحب کی۔ اور آنند نرائن ملاّ کی۔" کمال نے کہا۔

"اور تم کو کیا پتہ —" اب چمپا کی آواز میں غصے کی جگہ اتھاہ رنج نے لے لی۔ "کہ کالی داس کے اس شعر کے کیا معنی ہیں۔ — یہ شعر —

نرمدا تھیا اور سندھو پر سے گزرتا بگلوں اور بطخوں کی معیت میں بادل پیغام لے کر چلا —"

"اور تم کو کیا معلوم کہ ہالڈر کی بنائی ہوئی تصویر؟ اشوک کے جھنڈ میں سیتا ہمیں کیوں اتنی خوبصورت لگتی ہے۔" کمال نے کہا "نہیں سرل یہ بڑا مشکل کام ہے۔"

"اور یاد ہے کمال ——" چمپا واپس جانے پر مُصر رہی "ہم سنگھاڑے والی کوٹھی کے لان پر بیٹھ کر پندرہ پندرہ سال پُرانے ریکارڈ بجایا کرتے تھے" کملا جھریا اور جانکی بائی اور رہری تھی ——"

"ہاں۔" کمال نے کہا۔ "اور محمد حسین ساکن نگینہ کا ریکارڈ دھوئیں کی گاڑی اُڑائے لیے جا ——"

"ہاں ——" چمپا خوش ہوئی کہ کمال کو واپس لے جانے میں کامیاب رہی۔ مگر اب کمال حال میں آ کر ماضی سے پیچھا چھڑا کر نکل بھاگنا چاہتا تھا۔ لیکن چمپا اس کے سامنے وقت کے ضمیر کی طرح بیٹھی تھی۔

دفعتاً کمال کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ وقت کی آندھی میں پتے کی طرح ادھر اُدھر ڈول رہی ہے۔ اُڑی جا رہی ہے۔ اور وہ اس کو اپنی گرفت میں نہیں لا سکتا۔ وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"کمال ——" سرل نے سحر زدہ آواز میں اس سے کہا۔ "مجھے کچھ اور بتاؤ۔"

"اور کیا بتاؤں۔" اس نے رنج کے ساتھ جواب دیا اور بوٹ ہاؤس کی سیڑھیوں پر جا کر کھڑا ہو گیا اور ندی کو دیکھتا رہا۔ ندی گومتی میں تبدیل ہو گئی۔

"کمال —— سنو ——" چمپا نے کچھ یاد کر کے کہنا شروع کیا۔ "رات کا سماں ہے۔ کتے بھونک رہے ہیں۔ سناٹا بازار بھر میں پڑا ہے۔ چڑیاں چگمن تک سوتی ہیں۔ چوکیدار خربوزوں کے کھیت بچا رہے ہیں۔ باغبان گوندنی کے کھٹکھٹے کو کھٹکھٹاتے ہیں۔ اب کوئی دم میں چکّیاں چلیں گی ——"

"سرشار ——؟"

"ہاں ——" وہ پھر سوچ میں ڈوب گئی۔

"ہم لوگ عموماً ہری شنکر کے کمرے میں جمع ہوا کرتے تھے جو دراصل ایک برجی تھی۔"

کمال نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا "اس کے نیچے دریا بہتا تھا۔ اس کمرے کی دیواروں پر اَن گنت پُرانے فوٹوگراف تھے اور دو ٹوٹے ہوئے صوفے۔ اس کمرے میں بیٹھ کر ہم نے لاتعداد کتابوں کے موضوع سوچے۔ دُنیا کے مسائل حل کئے۔ یہ کمرہ اور یہ گروہ ساری دُنیا میں موجود ہے۔ زندگی ابھی بہت غیر واضح تھی۔ بہت سے پردے اُٹھتے تھے اور گرتے تھے۔ کبھی تیز روشنی اندر داخل ہوتی۔ کبھی دھند لکے کا سایہ سامنے آجاتا۔ اس ذہنی دھوپ چھاؤں میں وقت نکلتا گیا۔ اب پسند ناپسند کے بجائے ... عجز ہمارا روّیہ بنتا جا رہا تھا۔ یہ روّیہ احساسِ برتری نے پیدا نہیں کیا تھا۔ ہمیں یہ لگتا جیسے ساری انسانیت کے خُون سے ہمارے ہاتھ رنگے ہُوئے ہیں۔ ہمیں اس خون کو دھونا ہے اور دیکھو کیا ہُوا" — اس نے ہاتھ آگے پھیلائے — "ایک روز صبح کو ہم اُٹھے اور ہم نے دیکھا کہ ہمارے ہاتھ واقعی خُون سے رنگے ہوئے ہیں — اور ہمارے وہ سارے کردار جن کا ذکر تم نے چمپا باجی سے سُنا ہوگا — نوئل کارڈ کے کریکٹرز کی مانند ذہین اور پُرلطف گفتگو کرنے والے نوجوان، مارگ کا مطالعہ کرنے والی اور مانی پوری ناچنے والی لڑکیاں، ہندوستان کی قدیم کلاسیکل تہذیب کا راگ الاپنے والے پوز یُر — ان سب کو ہم نے دیکھا کہ خُون میں رنگے ہُوئے ہیں۔ مگر ہم میں سے بہت سے ایسے تھے جو اس خُون کا کفارہ دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ وہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں اور مذہب کی بلندی اور خدا کی بزرگی کا چرچا کرتے ادھر اُدھر بھاگ گئے —

ان کرداروں کے علاوہ اور لوگ بھی تھے — حقیقی اصل انسان —" اُس نے چمپا کو دیکھا

"قدیر — اور قمرن — ؟" چمپا نے کہا۔

کمال نے خاموشی سے اجازت چاہی کہ ان کا ذکر کرے۔ وہ اسے بے حد مقدس ہستیاں معلوم ہُوئیں۔

"ہاں۔ قدیر اور قمرن اور رام اوتار اور رمو دیا۔ اور ہمارے گاؤں کے کاشتکار اور ہمارے اکّے والے اور نواڑی — اور ہمارے زردوزی چکن کاڑھنے والے اندھے

ہو جاتے تھے اور ہمارے باغوں کے کنجڑے اور پالکیوں کے کہار —— یہ سب ہمارا اپنا منظر ہے۔ جسے تم کبھی نہ جانو گے —" اس نے بات ختم کی۔

چمپا ابھی واپس نہ آئی تھی۔ اُس نے کہنا شروع کیا۔ "ہاں اور ہمارے دریا۔ دریا بھی ایک مستقل کردار تھا اور ان کے نام۔ ذرا ان کے نام سُنو — سَرجُو۔ شاردا۔ وِرگا وتی۔ مندکینی۔ مدھومتی۔ گومتی —"

"گنا بھروبا لائیں جو ہماوت سے اُتر کر بنوں میں بسنت رُت منانے نکل آئی تھیں۔" طلعیان صاحب نے کہا۔

کمال نے چونک کر اُنھیں دیکھا۔ اب تک وہ اُن کے وجود سے بے خبر بیٹھا تھا۔ وہ چند لمحے قبل آکر چوتھی اُلٹی ہوئی ڈونگی پر بیٹھ گئے تھے۔

"ٹھیک ہے یار۔" کمال نے آزردگی سے کہا۔ "میں نے بھی ایک زمانے میں بڑی کویتا لکھی ہے۔ یہ اسٹیج سب پراتی ہے۔"

"تو دریا میرے گھر کے نزدیک تھا۔ گنگا میرے گھر کے پاس بہتی تھی۔ گومتی، ہری شنکر کے گھر کے نیچے بہتی تھی۔ گوتم نے بتایا ہوگا کہ —— ہم لوگ ذرا سوچو دریاؤں کے وجود سے کتنے بے نیاز رہتے ہیں۔ ارے پُل دیکھو۔ کشتیاں۔ گھاٹ۔ سنگھاڑے۔ کنول کے پھول۔ اور پھر ندی پر برستی ہوئی بارش۔ یہ سب کتنی اہم چیزیں ہیں۔ مجھے سمندر سے وحشت ہوتی ہے۔ اس سے ڈر لگتا ہے۔ سمندر بیکراں ہے۔ ندی کو اپنا راستہ معلوم ہے۔"

اب دفعتاً چمپا کی آواز سے کمال بور ہونا شروع ہوا۔ لڑکیوں میں یہ کیا مصیبت ہے۔ اس نے سوچا کہ ایک تو ہوتی ہی بکی ہیں۔ اگر ان پر یہ وحی آجائے کہ کلاکار بھی ہیں تو بیڑا ہو گیا۔ چمپا باجی کلاکار نہیں تھیں لیکن ان کے شاعرانہ مزاج کا کون منکر ہو سکتا تھا۔

وہ اس ندی کا ذکر کر رہی تھی اور کمال بھاگ جانا چاہتا تھا۔ ندی کا کردار —؟ مجھ سے زیادہ اور کون یہ بات جان سکتا ہے۔ اُس نے لرز کر سوچا۔ مجھے وہ مکان یاد ہیں —؟ وہ ندی۔ وہ درخت — چمپا باجی تم خود —

"اور باغ میں املتاس کے درخت تھے۔" وہ کہہ رہی تھی "اور ایک بیل کا درخت بھی۔

بیل تم نے کھایا ہے کبھی — ؟" اُس نے اوجیت سے پوچھا" پورب کی خاص چیز ہے۔ کمال گوتم سے پوچھنا اسے وہ ٹپ ٹپ گرتے بیل یاد ہیں — " اُس نے بے اختیار ہو کر پہلی بار گوتم کا نام لیا۔

کمال سوچ رہا تھا۔ میں انھیں کیسے بتاؤں کہ گوتم ان کو تقریباً بھول چکا ہے — مگر بھولنا کیا معنی — ضرور یاد ہوں گی۔ جیسے اسے ندی یاد ہے اور سنگھاڑے والی کوٹھی۔ اور املتاس کا درخت۔ اب بھی وہ اکثر بڑے جذبات میں ڈوب کر ان چیزوں کا ذکر کرتا۔ کیا مصیبت ہے۔ اس نے جھنجھلا کر چمپا کو دیکھا۔ یہ لڑکیاں مری کیوں جاتی ہیں؟ اصل میں — اس نے اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر سوچنا شروع کیا — ان کو ہزاروں برس سے اس کمپلکس میں مبتلا کر دیا گیا ہے — ایک سنا ہے وہ ستی تھیں پھر سیتا۔ پھر گوپیوں کا دَور چلا — ان کو دنیا میں کوئی کام نہیں۔ بس کسی بھلے مانس کو پکڑ کر دے اس کی پوجا۔ دے اس کی پوجا۔ اری نیک بختو۔ اللہ رسولؐ سے دل لگاؤ۔ اگر محبت ہی کرنا ہے۔ رابعہ بصری سے سبق لو۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی پہنچی ہوئی بیبیاں گزری ہیں۔ لیکن یہ ساری سینٹ وینٹ خواتین بھی یہی سوچتی ہوں گی کہ اگر یسوع مسیح مل جائیں تو لے کر ان کے موزے رفو کر دیں —" میں گوتم سے ضرور پوچھوں گا —" اُس نے بآوازِ بلند کہا: "اور مجھے اپنے موزے بھی رفو کروانے ہیں۔" اُس نے اپنے پیروں پر نظر ڈال کر اسی رو میں کہا۔ "مجھے یوتھ فیسٹیول کے لئے جرمنی جا رہا ہوں۔ راتوں رات لندن پہنچ جاؤں تو طلعت میرا سارا سامانِ سفر ٹھیک کر دے گی۔"

"بہنوں کے ہونے کا یہ بڑا فائدہ ہے۔" طیان صاحب نے بات کی۔

"جی — ؟ جی —" کمال نے جواب دیا" اس لئے چمپا باجی اب اجازت دیجیے۔ خدا حافظ نرمل۔ اوجیت۔"

"چلو ہم تمہارے ساتھ ہی چلتے ہیں۔" نرمل نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ وہ شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ کمال اسٹیشن چلا گیا۔ چمپا نے اپنے ہوسٹل کے کمرے میں آ کر دریچہ کھولا۔ نیچے سنسان سڑک لیمپ کی نیلگوں روشنی میں خاموشی سے بہہ رہی تھی۔ سینٹ جان کے گھڑیال

۵۴۶

نے گیارہ بجائے۔ دُور چیئرنگ کراس لین میں کوئی شخص ٹرمپٹ پر اپنا غمگین نغمہ چھیڑ رہا تھا۔

۷۷

گھنٹی بجی تو طلعت نے دروازہ کھولا۔ وہ مشرقی برلن کے ایک جدید وضع کے فلیٹ میں اپنی ایک سنگتراش دوست کے یہاں ٹھہری ہوئی تھی۔ باقی کے سب لوگ ابھی ادھر اُدھر سڑکوں پر گاتے بجاتے پھر رہے تھے۔ اس نے بالکنی پر سے جھانک کر دیکھا۔ پھولوں کی بیل کے نیچے نیم تاریک پورٹیکو میں دو سائے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے جلدی جلدی دوسرے سے کچھ کہا اور اسے اندر دھکیل دیا۔

نووارد اسٹوڈیو میں داخل ہوا تو طلعت نے اسے پہچانا یہ وہی نوجوان تھا جو چند روز قبل سینٹ جانز ووڈ میں روشن سے ملنے آیا تھا۔

"میں نے سنا تھا کہ مشہور سنگتراش فراؤلین کریمر یہاں رہتی ہیں۔"

"آپ نے بالکل صحیح سنا تھا۔ لیکن ان کے بجائے میں موجود ہوں۔ فرمائیے آپ کی کیا خدمت کی جا سکتی ہے۔ آپ کو سر چاہیئے؟ تانبا یا پلاسٹر آف پیرس ——؟" طلعت نے بڑے پروفیشنل انداز میں جھاڑن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"جی۔ میں سر نہیں چاہتا۔" اس نے سٹپٹا کر جواب دیا۔ "میری ایک دوست ہیں ان کو چاہیئے۔" پھر دفعتاً اس نے چونک کر غور سے طلعت کو دیکھا۔ جو اطمینان سے مجسمہ سازی کے لوازمات میں گھری کچھ کھٹر پٹر کر رہی تھی فیسٹول کی وجہ سے فراؤلین کریمر کا کام خوب چمک گیا تھا۔ بھانت بھانت کے لڑکے اور لڑکیاں ہر قوم اور ہر ملک کے اس کے پاس آ رہے تھے وہ بے حد جذباتی ہو کر نیگرو اور ایشیائی لڑکوں اور لڑکیوں کے سر بناتی اور ان کو تحفتاً دے دیتی۔ سخت مصروفیت کا زمانہ تھا۔ اسٹوڈیو میں برابر رت جگا رہتا۔ طلعت جسے آرٹ میں بھی دخل تھا۔ اس کی اسسٹنٹ بنی ہوئی تھی۔

نووارد جب یہاں آ رہا تھا تو دوستوں نے اس سے کہا تھا کہ فراؤلین کریمر بورژوا آرٹسٹ نہیں ہے۔ اس سے فلرٹ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ وہ وہ لیکچر پلائے گی کہ ہوش ٹھکانے

آجائیں گے۔ یا سارے مجسمے توڑ کر بھاگ کھڑی ہوگی اور تم کو دام بھرنے پڑیں گے۔

" اپنی دوست کو بلا لائیے ــ تاکہ میں ان کا مولڈ بنا لوں۔ میں فرا دلین کریمر کی پارٹنر ہوں۔" طلعت نے جھک کر بڑے اخلاق سے کہا۔ اس نے ہنگیرین لڑکیوں کا رنگ برنگی کڑھت والا قومی لباس پہن رکھا تھا جو اسے اسی روز تحفے میں ملا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اجنبی اس کو پہچاننے کی بے انتہا کوشش کر رہا ہے لیکن اب تک پہچان نہیں پایا۔ اسے اس طرح ایکٹنگ کرنے میں بہت لطف آیا۔" اس الماری میں چائے کی پتی رکھی ہے۔ ادھر اسٹوو ہے ــ آپ کافی بنائیے میں ابھی آتی ہوں۔" اس نے خالص بوہیمین انداز کی بے تکلفی کی نقل کرتے ہوئے کہا۔ اور پلاسٹیسین نکالنے کے لئے اسکرین کی دوسری طرف چلی گئی۔

دروازہ کھلا اور ساجدہ بیگم اندر داخل ہوئیں۔

" ٹلی ــ ؟" انھوں نے اجنبی سے پوچھا۔

" نہیں یہاں اجنبی نہیں ہے۔ مگر آہستہ بولو۔ شاید یہ لڑکی اردو سمجھتی ہو۔"

" کون لڑکی ۔"

" وہ اسکلپٹر اس وقت نہیں ہے۔ اس کی اسسٹنٹ ہے۔ ہنگیرین سی دکھلائی پڑتی ہے۔ مگر مجھے تو کچھ گھپلا نظر آتا ہے ــ اس میں بھی ــ"

اسکرین کے دوسری طرف سے طلعت کے اسکرٹ کی جھلک دکھلائی دی تو اس نے ذرا گھبرا کر اونچی آواز میں کہا " اس بدتمیزی کو معاف کیجئے گا مادموزیل کہ ہم اپنی زبان میں باتیں کرنے لگے ــ"

" کوئی بات نہیں۔" طلعت نے اسکرین کے پیچھے سے جواب دیا۔ " مجھے اس کی ساؤنڈ بہت اچھی لگتی ہے جیسے مکھیاں بھنبھناتی ہوں۔"

" مکھیاں ــ ؟"

" جی ہاں۔ یہ میں نے تشبیہہ استعمال کی۔ شہد کی مکھیاں۔ میں بہت عرصے تیونس میں رہی ہوں۔ وہاں عربی سنا کرتی تھی۔"

"جی ہاں — حبیب بورغیبہ کے ساتھ۔"

"وہاں کیا کر رہی تھیں آپ؟"

"جاسوسی۔" طلعت نے اطمینان سے جواب دیا اور پلاسٹیسین کا گولہ بنانے میں مصروف رہی۔

ساجدہ بیگم کا رنگ سفید پڑ گیا۔ میں نے کہا تھا کہ مشرقی برلین نہ آنا۔ جانے کس مصیبت میں مبتلا ہوں گے۔ اب دیکھو کہاں پھنس گئے۔ انھوں نے اب تک ہالی وڈ کی فلموں میں جو کچھ سنٹرل یورپ کے بارے میں دیکھا تھا۔ وہ سب پل کی پل میں تصور میں کوند گیا۔ آرٹسٹوں کے بھیس میں خطرناک جاسوس۔ بین الاقوامی سازشیں۔ اغوا۔ اورینٹ ایکسپریس۔ وکی بام کا گرینڈ ہوٹل۔ کمیونسٹوں اور غیر کمیونسٹوں کی دست بدست جنگ۔ اندھیری گلیوں میں تعاقب۔ قتل — ہاں قتل — ساجدہ بیگم لرز اٹھیں اور اُنھوں نے گھبرا کر اپنے ساتھی کو دیکھا۔

ان کے ساتھی پر طلعت کی بات کا بالکل مختلف ردِ عمل ہوا تھا۔ وہ فوراً سمجھ گیا۔ کہ یہ لڑکی کون ہے اور یہ بھی کہ یہ اس کی اس اسٹوڈیو میں آمد کا مطلب سمجھتی ہے۔ — اُس نے بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلا۔

طلعت اسکرین کے باہر آئی۔

"ارے یہ تو طلعت بہن ہیں —" ساجدہ بیگم چلائیں۔ "توبہ ہے۔ تم نے یہ کیا روپ بھرا ہے۔ اچھا بیوقوف بنایا۔"

"ہلو۔ ساجدہ آپا —" طلعت نے شگفتگی سے کہا۔ "بیٹھئے ابھی آپ کا فرسٹ کلاس مولڈ بناتی ہوں۔ آپ نے کافی تیار کر لی —؟" اُس نے ساجدہ بیگم کے ساتھی سے دریافت کیا۔

"معاف کیجیے گا۔ میں نے بھی آپ کو بالکل نہیں پہچانا تھا اس لباس میں۔ لندن میں بھی آپ سے ملنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ صرف آپ کا ذکر بہت سنا ہے۔"

"جی — آپ کی یہاں تشریف آوری کیسے ہوئی —؟ میں نے دیکھا تھا۔ آج آپ پولش لڑکیوں سے بہت برادرانہ سلوک کر رہے تھے۔

"وہ — تو ہیں ذرا ان لوگوں کا جھوٹ سچ معلوم کرنے آیا ہوں۔ میں ایک انگریزی اور دو اُردو اخباروں کے لئے لندن لیٹر لکھتا ہوں۔ یہاں سے جاکر ان لوگوں کی قلعی کھولوں گا"

"تم ان سے پہلے کبھی نہیں ملیں۔" ساجدہ نے کہا۔ "بڑے مشہور جرنلسٹ ہیں۔"

"جی۔ اور ساجدہ آپا آپ یہاں کیسے —"

"میں — میں ذرا ان لوگوں کا —"

"— جھوٹ سچ معلوم کرنے آئی تھیں — !"

"بالکل — !" انھوں نے جواب دیا۔

"مگر ساجدہ آپا — اور آپ —"

"خان —"

"مسٹر خان — مجھے واقعی بڑا افسوس ہے کہ آپ روشن کا تعاقب کرتے یہاں تک آئے مگر وہ نہ ملی — وہ یہاں کبھی نہیں آئی۔ اگر آجاتی تو اس کے لیے اچھا ہی تھا۔ اتنی شدت سے اُلجھی ہوئی نہ رہتی۔ مگر وہ عین اس لمحے سالزبرگ میں موزارٹ کی موسیقی سن کر اپنی روح کو فائدہ پہنچا رہی ہے — جہاں تک میرا خیال ہے —"

"کیسا تعاقب بھئی — کیا اُڑا رہی ہو۔" ساجدہ نے خفگی سے کہا۔

"نہیں تو۔ اچھا ہے ساجدہ آپا۔ یہاں ایک سے ایک تحفے آپ کو ملیں گے۔ پندرہ دن تک وہ وہ خاطر مدارات ہوگی جس کا ٹھکانہ نہیں۔ مفت کی تفریح۔ کیا حرج ہے۔ آپ لوگوں نے ان ممالک کو جانے کیوں ہوّا بنا رکھا ہے۔" وہ سُرعت سے ان کی ناک بناتے ہوئے بولی۔

"یہ مشغلہ آپ نے کب سے شروع کر دیا۔" مسٹر خان نے کہا۔ "مجسمہ سازی؟"

"جی۔ مشغلوں کی بات ہے۔ بعضوں کا مشغلہ مخبری ہوتا ہے۔"

ساجدہ نے گھڑی دیکھی۔ "اب چل دوں — جہاں ہم ٹھہرے ہیں وہاں کھانے پر انتظار ہو رہا ہوگا۔"

"بہت خوب۔ دوسری میٹنگ کب دیکھیے گا — ؟"

٥٥١

"میں فون کر دوں گی۔"

"بہت اچھا۔"

وہ بالکنی میں سے ان دونوں کو جاتے دیکھتی رہی۔ پھولوں کی بیل پھر جھک آئی جس کے سائے میں "مسٹر خان" ایک لمحے کے لئے گم سم کھڑا رہا۔ پھر ساجدہ بیگم کے پیچھے پیچھے بس اسٹینڈ کی طرف چل پڑا۔

واپسی پر وہ لوگ فرانس کی سرحد عبور کر رہے تھے جب ٹرین میں کسی نے بتایا کہ روشن پکڑی گئی۔

"کیا چنڈو خانے کی اڑاتے ہو۔" طلعت نے آزردہ ہو کر کہا۔ "وہ سیاسی کبھی نہیں تھی۔ آخر اس کے پکڑے جانے کی تک کیا ہے۔ یہ ایک یار لوگوں نے اس کے لئے افواہیں پھیلا رکھی ہیں خواہ مخواہ۔ اور پکڑے جانے کا مطلب؟ وہ اسمگلنگ کرتی تھی۔ بم بناتی تھی۔ امریکہ کے اہم راز روس کو اور پاکستان کے اہم راز ہندوستان کو بتاتی تھی۔ آخر کیا کر رہی تھی بھائی۔ اس غریب کو اپنے فلسفے ہی سے فرصت نہیں اس کو یہ تک تو معلوم نہیں کہ فورتھ انٹرنیشنل ۔"

"اصل خیالات سے کیا ہوتا ہے۔ اصل خیالات کی تصویر تو نہیں لی جا سکتی۔" گوتم نے اس کی بات کاٹی۔ "وہ مغربی جرمنی کے سفارت خانے میں کسی کام سے آیا ہوا تھا اور راستے میں ان کے ساتھ ہو گیا تھا۔" "تم افواہوں کی نفسیات نہیں جانتیں۔ اور اسٹریو ٹائپ کی طاقت۔ اگر میں مستقل تمہارے لئے پروپگنڈہ کروں کہ تم طلعت رضا نہیں ہو دراصل دلائی لامہ کی جانشین ہو تو واقعی تمہیں دلائی لامہ کی جانشین سمجھا جائے گا۔ ہماری زندگیوں کا جھوٹے مفروضوں اور غلط پروپگنڈے پر انحصار ہے۔ روشن تو بہت غیر اہم ہستی ہے۔ پوری قوموں سموچے ملکوں کے خلاف اسٹریو ٹائپ کا حکم چلتا ہے۔ یہ آج کی دنیا ہے طلعت آرا بیگم۔ جس میں فن کاروں کے علاوہ طالب علموں کی تو سب سے بڑی قیمت مقرر ہے۔"

"اب میں نے دیکھا کہ پروپگنڈہ کسے کہتے ہیں۔ کمال ہے بھئی۔ روشن غریب جس کے کوئی سیاسی خیالات کسی قسم کے ایک سرے سے ہیں ہی نہیں، اس کو اتنی اہمیت دی جا رہی

ہے کہ وہ بھلے آدمی اس کے پیچھے پیچھے برلین تک آئے گو وہ ان کو تب بھی نہ ملی۔"

"مگر اس بہانے ان دونوں نے تفریح تو کر لی۔"

"سنا ہے روشن کے والد بہت بیمار ہیں۔ مجھے بون میں کوئی بتا رہا تھا۔ ممکن ہے ان افواہوں سے اس کی اسکالرشپ پر بھی اثر پڑے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ کراچی کی سیاست کا اس میں کافی دخل ہے۔" ایک لڑکے نے کہا۔

"وہ کس طرح۔" طلعت نے پوچھا

"سنا ہے کوئی مرکزی وزیر ہیں جو روشن کے والد کے خلاف ہیں۔ یا شاید روشن کے والد مرکزی وزیر کے خلاف تھے۔ ایسا ہی کچھ سلسلہ ہے۔ بہرحال تو وہ سول سروس کے آدمی نہیں ہیں۔ اُن کو ویسے ہی کسی پچھلے وزیر اعظم نے کوئی بہت بڑا عہدہ دے دیا تھا۔ اب ان وزیر اعظم کے جانے کے بعد روشن کے والد کے خلاف بڑا محاذ قائم ہو رہا ہے ممکن ہے۔ روشن بے چاری کے خلاف جو مضحکہ خیز کارروائی کی جا رہی ہے۔ اس کا اس محاذ سے کچھ تعلق ہو۔"

"یا اللہ۔" کمال نے گڑبڑا کر کہا۔ "اس قسم کے حالات ہیں؟"

"ہیں تو سہی۔" حمید نے جواب دیا۔ وہ سب کھڑکی سے باہر بھاگتے ہوئے سبزہ زاروں کو دیکھتے رہے۔

۷۸

شیو پرشاد بھٹناگر رنجور بارہ بنکوی ان لوگوں میں سے تھے جو لندن میں برسوں برس سے خود اختیاری جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ رنجور صاحب دوسری جنگِ عظیم سے پہلے بارہ بنکی سے اوکسفرڈ آئے تھے۔ تعلیم ختم نہ کر پائے تھے کہ جنگ چھڑ گئی اور یہ یہیں رہ پڑے۔ ایک عدد لیتھوین یا لیتھوینین لڑکی سے شادی کر لی۔ سخت مُوڈی اور کاہل آدمی تھے۔ بی بی بڑی نیک بخت ثابت ہوئی۔ وہ اب بورڈنگ ہاؤس چلاتی تھی۔ جس ہندوستانی یا پاکستانی کو کہیں ٹھکانہ نہ ملتا۔ وہ سیدھا یہیں آتا۔ رنجور صاحب بہت ہی شریف آدمی تھے۔

سب کی بہت خاطریں کرتے۔ اکثر مہمان ان کا بل ادا کیے بغیر ہی بھاگ جاتے مگر رنجور صاحب ان کی شکایت نہ کرتے۔ اتر پردیش سے اگر کوئی چوہا بھی آنکلتا تو اس کے لیے بچھ بچھ جاتے۔

ہمراز فیض آبادی ان کے مکان کی اوپر کی منزل میں ان کے کرائے دار تھے۔ رنجور بارہ بنکوی ہندو تھے اور ہندوستانی۔ ہمراز فیض آبادی مسلمان تھے اور بڑے کٹر پاکستانی۔ تھے دونوں شاعر۔ ایک دوسرے سے مستقل جھک جھک کرتے۔ رنجور صاحب کہتے۔ تم لوگوں نے ہندو شعرا کی کبھی اتنی قدر نہیں کی جس کے وہ مستحق تھے۔ تم علی گڑھ والوں نے فرقہ پرستی کا زہر پھیلایا۔ وغیرہ۔ یا رامائن فرحت لے کر بیٹھ جاتے اور بیئر کے چند گلاسوں کے بعد روہانسے ہو کر کہتے تم ملیچھ مسلمنٹے تم نے بھارت ماتا کے ٹکڑے کر ڈالے۔ اس پہ ہمراز بھائی بھارت ماتا کی شان میں کچھ گوہر افشانی کرتے۔ شیو پرشاد روتے روتے کہتے یہ شعر سنو۔ کل رات ہوا ہے۔ شعر سن کر ہمراز بھائی کہتے — ہاں یار اچھا ہے مگر ذرا بوئے کچوری و ہینگ می آید — اس پر دوبارہ فساد شروع ہو جاتا۔ روز رات کو کھانے کے بعد یہ سلسلہ رہتا۔ ایک بات میں رنجور اور ہمراز دونوں اپنے سارے اختلاف چھوڑ کر متفق تھے۔ وہ تھی پنجابیوں کے لیے ان کی ناپسندیدگی۔ اس موضوع پہ دونوں گھنٹوں باتیں کرتے کرتے نہ تھکتے۔ گو ہمراز بھائی بڑے شعلہ بداماں پاکستانی تھے مگر بہر حال آبائی وطن اتر پردیش تھا۔ کہتے۔ ارے یہ پنجابی گھڑسوار رسالدار اردو کیا جانیں۔ شیو پرشاد بڑے زور شور سے ہاں میں ہاں ملاتے۔ ان کی پہلی ہندو بیوی سے جو لڑکی ہندوستان میں تھی اس نے کسی پنجابی سے شادی کر لی تھی اور چنڈی گڈھ میں رہتی تھی جس روز اس کی شادی کی اطلاع آئی۔ شیو پرشاد صاحب نے خاص طور پہ آ کر ہمراز بھائی کو اس سانحے کی اطلاع دی۔

"لو میاں ہمارے خاندان کی زبان بھی بگڑ گئی۔ آخر ہم اس پنجاب گردی سے کہاں تک نہ بچے رہتے۔" ہمراز بھائی اس صدمے میں ان کے دلی شریک رہے کیونکہ خدانخواستہ کل کو ان کی بہن کی شادی بھی کسی پنجابی سے ہو سکتی تھی۔ رنجور صاحب کی ان محفلوں میں ان کے بورڈنگ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے اتر پردیش والے ہندو مسلمان ہندوستانی اور پاکستانی بیٹھ کر اپنے وطن کی بزرگی بیان کرتے۔ اس کی عظیم کلچر پر روشنی ڈالتے اور شعر پڑھتے ایک

روز کمال اس محفل میں گیا تو اس کو بڑی حیرت ہوئی۔ "کس قدر غیر منطقی ہیں آپ —" اس نے ہمراز بھائی سے کہا۔ "آپ کا وطن پاکستان ہے۔ آپ کو اب یو۔پی سے مطلب—؟"

"اجی وہ تو ٹھیک ہے — مگر —" ہمراز بھائی نے گڑبڑا کر کہنا شروع کیا۔

"ٹھیک کیا ہے —" کمال نے ان کی بات کاٹی۔ "اسی لئے تو پاکستان میں یو۔پی والوں کی وفاداری پر شبہ کیا جاتا ہے — دل اٹکا ہوا ہے فیض آباد میں۔ ملازمت کرتے ہیں کوئٹے میں اور پاسپورٹ بنوا کر اماں بیگم سے ملنے فیض آباد جاتے ہیں تو وہاں خفیہ پولیس پیچھے لگ جاتی ہے۔ ادھر پاکستان میں کہا جاتا ہے کہ یہ مہاجر لوگ سارے کے سارے ملک سے فائدہ اُٹھانے کے لئے آ گئے ہیں — ورنہ ان کا اصل وطن تو بھارت ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ بھائی نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے — کس قدر دیوانی قوم ہے مسلمانوں کی۔ حد ہے واللہ —"

"میاں صاحبزادے۔ زیادہ بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بناؤ —" ہمراز بھائی نے جواب دیا۔ تھا۔ "بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ تم ہندوستانی مسلمان ہو۔ یاد رکھو۔ جب وہاں ملازمت نہیں ملے گی اور بھوکے مرنے لگو گے تو دھکے کھا کر پاکستان ہی کا رُخ کرو گے۔"

غالباً ہمراز بھائی ٹھیک کہہ رہے تھے۔ اس نے لرز کر ان کی صورت دیکھی۔ اس وقت رنجور صاحب پان کی گلوریاں بنا بنا کر خاصدان میں رکھتے جا رہے تھے۔ پان ایک بڑی مقدس شے تھی جو کراچی سے بذریعہ ہوائی جہاز ہر ہفتے ہمراز بھائی کے لئے لندن آتی تھی اور بطورِ تبرک رنجور صاحب کو صبح شام اس کے دو بیڑے کھلائے جاتے تھے۔ پان بنانے کے مقدس فریضے کو بڑے اہتمام سے تکمیل تک پہنچانے کے بعد رنجور بارہ بنکوی کمال کی طرف مڑے اور ملول آنکھوں سے اسے دیکھنے لگے۔

"مصیبت یہ ہے کمال میاں —" انھوں نے اپنے خوبصورت لہجے میں اداسی سے کہا۔ "کہ تم شاعر ہو — ہر نوجوان شاعر ہوتا ہے۔ اصول پرست۔ راست باز۔ تصورات پر مرمٹنے والا۔ وہ حقیقت کو نہیں دیکھنا چاہتا۔ مگر بدقسمتی سے دنیا کا نظام شاعر نہیں

بیارٹ وان چلا رہے ہیں جن کو تمھارے وژن سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ تم حقیقت سے کس حد تک سمجھوتہ کرنے پر تیار ہوتے ہو۔ تمھاری اصل بڑائی یا گھٹیا پن اس وقت ظاہر ہوگا کہ تم نے حقیقت سے، یعنی بے ایمانی سے، جھوٹ سے، ریاکاری اور اخلاقی جرم سے کس حد تک سمجھوتہ کیا۔"

طلعت اور کمال وغیرہ کی سرگرمیوں کو رنجور صاحب بہت سراہتے تھے۔ اقبال اوینگ میں جاکر انھوں نے اقبال کے فلسفے پر تقریر کی۔ لندن مجلس کو ہمیشہ مختلف قسم کے عطیے اپنی بساط سے بڑھ کر دیتے رہتے۔ حالانکہ رنجور صاحب کی مالی حالت اتنی خستہ تھی کہ اپنے مکان کی مرمت تک نہ کروا سکتے تھے۔ اس غربت کی زیادہ وجہ یہ تھی کہ جیسا کہ پہلے لکھا گیا۔ ان کے اکثر کرائے دار ان کو کرایہ دیئے بغیر ہی غائب ہو جاتے اور یہ اپنے مہمانوں سے بے حد واجبی پیسے لے کر انتہائی بڑھیا کھانے انھیں کھلاتے۔ سوئیٹ کس قدر کریک ہیں رنجور صاحب۔ طلعت نے ایک روز کہا تھا۔ ایسے لوگوں کی دنیا میں جگہ کہاں ہے — ان کی بی بی مایا (ان کا اصل نام ہی تھا اور رنجور صاحب نے اس نام کی بنا پر اپنے ایک مضمون میں جو ۳۹ء میں زمانہ کانپور میں چھپا تھا۔ یہ ثابت کیا تھا کہ ٹیوٹن لوگ دراصل ہندو تھے — بعد میں جب جدید تحقیقوں سے یہ ثابت ہونے لگا کہ غالباً آریوں کا اوریجنل وطن بالٹک کی طرف تھا، اور سنسکرت اپنی اصل حالت میں انھی علاقوں میں بولی گئی تھی تو رنجور صاحب نے طے کر لیا وہ خود بہت بڑے محقق ہیں۔ انھوں نے اعلان کیا کہ اب وہ تاریخ پر ایک کتاب لکھنے والے ہیں۔ پچھلے پندرہ سال سے وہ اس کتاب کی تصنیف میں مصروف تھے۔ مگر وہ ابھی پہلے چند ابواب سے آگے نہ بڑھی تھی۔ اس تحقیق کے لئے ان کو آئرلینڈ کا سفر درکار تھا، جہاں اشومید ھ عہد عتیق میں منایا جاتا تھا اور بالٹک کے ممالک کا جہاں اندر کی پوجا ہوتی تھی۔ مگر اس سفر کے لئے جو روپیہ چاہیے تھا۔ وہ رنجور کبھی فراہم نہ کر پاتے۔ لہٰذا وہ کتاب ابھی نامکمل تھی) بڑی خاموش طبع اور گھریلو خاتون تھیں اور چند سال قبل بے حد خوبصورت رہی ہوں گی (رنجور صاحب خود کافی خوش شکل تھے) ان کا سارا وقت میاں اور بچوں کی خدمت اور کھانا پکانے میں گزرتا۔ دن بھر وہ مشین کی طرح

کام کریں۔ طلعت وغیرہ کے گروہ کو ان سے بہت ہمدردی تھی۔ رنجور صاحب کو اپنی تاریخ کی کتابوں اور شاعری ہی سے چھٹی نہ ملتی تھی جو وہ مایا کی طرف توجہ کرتے۔ وہ ٹھیٹھ ہندوستانی پتی ورتا عورتوں کی طرح چپ چاپ باورچی خانے میں گھسی رہتیں یا کپڑے دھوتیں۔

زندگی یونہی گزرتی جا رہی تھی کہ شیو پرشاد بھٹناگر رنجور بارہ بنکوی کے بورڈنگ ہاؤس میں ایک نوجوان پارسی طالب علم آن کر ٹکا۔ لڑکیاں جرمنی سے لوٹ کر آ چکی تھیں اور اب قاضی نذرالاسلام کے لیے چندہ جمع کرنے کی مہم شروع ہو رہی تھی۔ ان کے علاج کے لیے روپیہ فراہم کرنے کے سلسلے میں ایک بڑا زبردست ورائٹی پروگرام ترتیب دیا جا رہا تھا جس کی تیاری کئی مہینے قبل سے شروع ہو چکی تھی۔ ہارلے اسٹریٹ کے ڈاکٹروں کی فیسیں بہت زیادہ تھیں۔ شاید اُن کو وی آنا بھی لے جایا جائے۔ لڑکوں اور لڑکیوں نے طے کر لیا تھا کہ ان کا علاج پُوری طرح سے کرا کر رہیں گے۔ ان کے ہمراہ ان کی بی بی کے علاوہ ایک بہت بڑی پارٹی تھی۔ ٹوٹینگ میں اُن کو ٹھہرایا گیا تھا جہاں وہ گم سم بیٹھے بچوں کی طرح حیرت زدہ سب کو دیکھتے رہتے۔ ان کا دماغ ماؤف تھا۔ ان کی بی بی کے اعضا مفلوج تھے۔ وہ نزدیک ایک پلنگ پر لیٹی رہتیں۔ ان کا گھر بنگالی طلبا کے لیے زیارت گاہ بنا ہوا تھا۔ ٹیگور کے لئے ہمارے دلوں میں بے پناہ عزت ہے اور نذرل کے لئے بے پناہ محبت — اوجیت نے ٹائمز کے نمائندے کو بتایا تھا۔ ایک روز طے ہوا کہ چند ہندوستانی فلم اسٹاروں سے جو لندن آئے ہوئے تھے پیسہ وصولا جائے۔ اتوار کے روز چندہ جمع کرنے کے ٹرپ پر نکل کر لڑکے اور لڑکیاں مختلف ٹکڑیوں میں بٹ گئے طلعت اور فیروز نے پہلے سوئس کاٹج کا رُخ کیا جہاں رنجور بارہ بنکوی رہتے تھے۔

مکان کے زینے پر ان کو ہمراز بھائی مل گئے "ہمراز بھائی! لائیے پیسے" طلعت نے دستِ سوال دراز کیا۔

"یہ طالب علم کیوں نذرالاسلام کے لئے اتنے بے حال ہوئے جا رہے ہیں" ہمراز بھائی نے کہا۔

"یا اللہ — ہمراز بھائی۔" طلعت نے کہنا شروع کیا۔ ادھر یہ لوگ ہمراز بھائی

سے بحث میں اُلجھ رہی تھیں۔ عین اُسی وقت علاّمہ رنجور بارہ بنکوی کی زندگی میں ایک قیامت برپا ہوگئی۔

شام کا وقت تھا اور سُورج صنوبر کے درختوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا۔ مکانوں کے دریچوں کے شیشے ڈوبتے سُورج کی روشنی میں قرمزی نظر آرہے تھے۔ رنجور صاحب فکرِ شعر میں مبتلا مکان کے سامنے ٹہل رہے تھے۔ نیچے تہ خانے کے کمرے میں تیز روشنی ہو رہی تھی۔ جہاں ماّیا عموماً اس وقت روزانہ رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف دکھلائی دیتی تھیں۔ ٹھیک اس سمے رنجور صاحب کو جانے کیا نظر آیا کہ ان کو یقین ہو گیا کہ ماّیا بھٹناگر ہوشنگ ماچس والا سے افیر چلا رہی ہیں۔ چلا رہی ہیں کیا معنی عرصے سے چلاتی آئی ہیں۔ اور یہ اب تک کسی کو معلوم ہی نہ تھا۔ رنجور صاحب کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا اور وہ تیر کی طرح تہ خانے میں پہنچے۔

ہال کے زینے پر کھڑے ہو کر طلعت اور فیروز کو تہ خانے میں ایک زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں دوڑی ہوئی نیچے گئیں۔ ماّیا خون میں لت پت فرش پر پڑی تھیں ان کے سر میں سخت چوٹ آئی تھی اور ان کی بڑی لڑکی قریب کھڑی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ رنجور صاحب دروازے میں صم بکم کھڑے تھے۔

"کیا ہوا۔" طلعت نے دہل کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" اُنھوں نے سکون سے جواب دیا۔ "زینے پر سے ان کا پاؤں رپٹ گیا۔ فکر مت کرو۔" پھر وہ خاموشی سے اُوپر چلے گئے۔

دوسرے لمحے اُوپر کی منزل سے اتنے ہی زوردار دھماکے کی آواز آئی:

لڑکیاں بوکھلاہٹ میں دوڑی ہُوئی اُوپر پہنچیں۔ جتنی دیر میں طلعت نے ۹۹۹ کو فون کر کے ایمبولنس منگائی اتنی دیر میں رنجور صاحب ہوشنگ ماچس والا کی ٹھکائی بھی اچھی طرح کر کے فراغت پا چکے تھے۔ ہمراز بھائی اور دوسرے لوگ ہاں ہاں کرتے اپنے اپنے کمروں سے بیچ بچاؤ کے لئے دوڑے مگر رنجور صاحب نے بڑبڑاہٹ میں ایک ایک جھانپڑ ان سب کو بھی رسید کیا اور اسی سلسلے میں ہمراز بھائی سے باقاعدہ ان کے

دو دو ہاتھ ہو گئے۔ لینڈنگ پر جہاں یہ ہنگامہ ہو رہا تھا، اندھیرا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ہمراز بھائی اور رنجور صاحب دونوں ایک دوسرے کو ہوشنگ ماچس والا سمجھے ــ

اب رنجور صاحب سے کہا گیا کہ وہ قریب کے پب سے اپنی بے چاری بی بی کے لئے تھوڑی سی برانڈی لے آئیں۔

یہاں برانڈی کا انتظار ہوتا رہا لیکن معلوم ہوا کہ وہ خود ہی پب میں شغل کرنے کے لئے بیٹھ گئے۔ طلعت مایا دیوی کو ہسپتال لے گئی۔ فیروز ان کے بچوں کو پچکارنے میں مصروف ہوئی۔ ہوشنگ ماچس والا نے اسباب باندھ کر ٹیکسی منگوائی اور وہاں سے کان دبا کر بھاگا۔

اس ہڑبونگ میں نسیم بانو سے ملنے کا وقت نکل گیا۔ مایا بھٹناگر کی مرہم پٹی کروانے کے بعد طلعت اور فیروز نائٹس برج کے ایک بہت بڑھیا فلیٹ میں پہنچیں جہاں نسیم بانو کی والدہ سیٹی پر ہار مونیم لئے بیٹھی تھیں اور جنھوں نے سلام دعا کے بعد چھوٹتے ہی کہا کہ تم لوگوں نے اب تک شادی کیوں نہیں کی۔ کب تک پڑھتی رہوگی ــ اب شادی کر ڈالو۔ اور نسیم بانو نے پکوڑے تل کر کھلائے۔ مگر چندے کے نام کا ایک پیسہ بھی نہ دیا۔

دونوں غصے میں بڑبڑاتی نیچے اتریں۔ اب کون سے فلم اسٹار کے پاس جائیں۔ سڑک پر کھڑے ہو کر انھوں نے سوچا۔

یہ فلم والوں کا سلسلہ طلعت کو ہمیشہ بور کرتا تھا۔ کیونکہ جب سے انڈین فلم انڈسٹری کی ترقی ہوئی تھی۔ آئے دن کوئی نہ کوئی بڑا فلم اسٹار لندن آپہنچتا۔ ایشین فلم سوسائٹی میں اسے بلایا جاتا۔ ان کی پبلسٹی سے ہندوستان کی پبلسٹی ہوتی تھی۔ "اس پبلسٹی کے ریکیٹ نے دماغ چکرا دیا ہے۔" طلعت کہتی۔

"چلو چل کر مایا دیوی کی خیریت معلوم کر لیں۔" وہ الٹے پاؤں سوئس کاٹج گئیں۔ فیروز پر اس وقت ڈیپریشن کا دورہ پڑا ہوا تھا۔

"حد ہے یار۔" اس نے کہا۔

"ہاں یار حد ہے ــ" طلعت نے جواب دیا۔

ہمراز بھائی کے فلیٹ میں بہت چہل پہل تھی۔ ساری عمارت کے مکین یعنی رنجور صاحب

کے مہمان وہاں جمع زور و شور سے اس غیر متوقع اور عجیب و غریب واقعے پر تبصرہ کر رہے تھے۔ کمال بھی موجود تھا۔ وہ طلعت کو ڈھونڈتا ہوا ادھر آنکلا تھا۔

"ہیڈکوارٹرز میں تمھارا انتظار ہو رہا ہے۔ تم لوگ کہاں رہ گئی تھیں بھئی۔" اس نے کہا۔

"مسز بھٹناگر اب کیسی ہیں بھابھی ——؟" طلعت نے ہمراز بھائی کی بی بی سے پوچھا۔

"مگر صاحب —— رنجور جیسا مرنجاں مرنج اور بھگت آدمی۔ جو کبھی اونچی آواز میں بول کر نہ دے اور کیا پہلوانی داؤ دکھائے ہیں میرے شیر نے۔ مجھے تو ایسا جھانپڑ دیا ہے کہ اب تک دماغ جھنّا رہا ہے واللہ ——" ہمراز بھائی نے خوش ہو کر داد دی۔

"مگر یہ ہوا کیا۔ ایسی پتی ورتا عورت ——" ایک ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

"اور وہ خود کیسا تھا۔ مرگلّا بالکل۔ پیلی چھپکلی ایسا۔ لاحول ولا —— وہی ماچس والا ——" ان ڈاکٹر صاحب کی بیگم نے کہا۔

"مطلب یہ کہ انسان کے اندر جو طوفان چھپے ہیں ان کا اندازہ کیسے ہو سکتا ہے۔" کمال نے آہستہ سے کہا۔ "رنجور صاحب کا طوفان۔ تایا دیوی کا طوفان۔ ہم سب کتنے بڑے جوالا مکھی پہاڑ پر زندہ رہتے ہیں۔ حد ہے بھئی ——"

اسی وقت دروازہ کھلا اور رنجور صاحب دہلیز میں کھڑے نظر آئے۔

"آئیے آئیے ——" ہر ایک نے کہا۔ مگر سب اپنی اپنی جگہ بہت نادم محسوس کر رہے تھے۔

انھوں نے اندر جھانک کر چاروں طرف دیکھا۔ "نہیں۔ میں آپ لوگوں کے تبادلۂ خیالات میں مخل نہیں ہونا چاہتا۔ ایسے ہی ادھر آنکلا تھا۔ خدا حافظ۔" دوسرے لمحے وہ غائب ہو گئے۔

شیو پرشاد بھٹناگر کئی دن تک گھر نہ لوٹے۔ ان کی بی بی اسی طرح سر پر پٹّی باندھے خاموشی سے کپڑے دھونے اور کھانا بنانے میں مصروف ہو گئیں۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

چند روز بعد شیو پرشاد بھٹناگر زنجور بارہ بنکوی ٹیمز کے کنارے سردی میں ٹھٹھرے ہوئے پائے گئے۔

۷۹

بلبل چودھری بھی پہنچ چکے تھے اور نذرالاسلام کے پروگرام میں تعاون کر رہے تھے ان کا ٹور بُری طرح فیل ہوا تھا۔ پھر وہ بیمار پڑے۔ ان کو بے حد خراب پریس ملا۔ ہر نقّاد نے "پاکستانی اور ہندوستانی" رقص کا موازنہ کر کے سوال اٹھایا کہ ان میں کیا فرق ہے حالانکہ فنونِ لطیفہ اور جمالیات کے سرکاری ماہرین ان کے متعلق اپنے عجیب و غریب نظریوں سے پریس کی تواضع کرتے رہے تھے

کئی مہینے ڈرامے اور میلے کی تیاری میں گزر چکے تھے۔ نذرالاسلام کے لئے اتنا پیسہ اب تک اکٹھا نہ ہو سکا تھا کہ ان کا باقاعدہ علاج شروع کروایا جاتا۔ "نذرل ایڈ کمیٹی" میں سرپھرے طالب علموں نے کبیر اور اصفہانی کو اکٹھا کر دیا۔ (کم از کم ان کے نام سرپرستوں کی حیثیت سے پروگرام کی کتاب پر برابر چھپ گئے) کمیٹی کی صدر ہندوستان ٹائمز کی شریمتی ایلا سین تھیں۔ نائب صدر ڈی کے کرشنا مینن۔ ان کے علاوہ اس کمیٹی میں امرت بازار پتریکا کے سندر کباڈی بھی تھے اور ڈان کے نسیم احمد بھی (یہ اجتماعِ ضدّین — نذرل دادا تمہارا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ کمال نے کہا) اس مرتبہ پی ایس ایف اور لندن مجلس نے مل جل کر کام کیا۔ پچھلے سال دونوں جماعتوں نے مل کر بڑی دھوم دھام سے ایشین اسٹوڈنٹس کانفرنس منعقد کی تھی۔ جس میں عرب اور اسرائیلی طلباء کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کر دیا گیا تھا (عالمگیر امن اور بھائی چارہ سب فراڈ ہے۔ ان لوگوں کے بھرّے میں مت آنا عامر رضا نے ایک کاک ٹیل پارٹی کے دوران روشن سے کہا تھا)

اب ان لوگوں کے ذہنوں میں صرف ایک خیال تھا۔ ہم نذرل دادا کو اس بیکسی کے عالم میں مرنے نہ دیں گے۔

پروگرام میں پدما کے سیلاب کی داستان موسیقی اور تمثیل میں پیش کی جا رہی تھی۔ گھنٹوں

رقص، گیتوں اور مکالموں کی ریہرسل کی جاتی۔ ایک ایک نکتے پر بحث ہوتی۔ کاسٹ بے انتہا لمبی چوڑی تھی۔ دھان پھٹکنے والی لڑکیاں۔ بھٹیالی گانے والے ملاح۔ سیلاب کی زد میں خزاں کے پتوں کی طرح بہتے اور ڈوبتے ہوئے کسان۔ سرکاری لنگر خانے کے سامنے کھڑے ہوئے بھوکے بے پناہ گزینوں کی قطاریں۔

"اُفوہ۔ کس قدر خوفناک ......" رومینٹک بل نے نیم تاریک اوڈیٹوریم میں ایک کرسی پر نیم دراز ہو کر سامنے روشن اسٹیج پر ریہرسل دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم لوگ ٹریجڈی سے محظوظ ہوتے ہو۔"

"موت سے تو ہماری بڑی پرانی دوستی ہے بل کریگ۔" طلعت نے اسکرپٹ کے کاغذات ایک طرف ڈال کر فرش پر اس کے نزدیک بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ہماری پوری نسل نوصر یجاً عاشق ہے موت پر۔ تم باہر کے دشمنوں سے لڑتے تھے۔ پر ابھی چند سال ہوئے ہمارے گھر کے آنگن میں ایک خونریز جنگ ہوئی تھی اور وہ جنگ بہت سارے محاذوں پر اب تک جاری ہے اور روز بروز زور پکڑتی جا رہی ہے۔ یہ سامنے والی ٹریجڈی تو ہمارے لئے گویا روزمرہ کے معمولی واقعات میں شامل ہے۔ بہت سوں کو تو اس ٹریجڈی کا احساس تک نہیں۔" طلعت نے ترش روئی سے بات جاری رکھی۔ "اور بہت ممکن ہے ابھی جس وقت میں تم سے یہ باتیں کر رہی ہوں، یہ سیلاب کا منظر مشرقی بنگال میں سچ مچ لوگوں کو نظر آ رہا ہو۔"

چھن چھن کرتے بیلے کے ٹروپ کے افراد ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔

"سیلاب کے منظر میں سرریلزم چلاؤ تھوڑی سی ——" اسٹیج کی پروپس کے انبار میں سے سر نکال کر زرینہ چلائی۔

سرریلزم چلائی گئی۔ ڈرامہ پروڈکشن کی ساری جدید ترین تکنیک نہایت زوروں میں ہر طرف استعمال کی جا رہی تھی۔ پیچھے گیلری میں فریدہ لڑکیوں کو دھان پھٹکنے والے ایک گیت کی مشق کرا رہی تھیں۔

—— بیلا نائی رے جولدی جولدی —— بیلا نائی ——

بالآخر 'فرسٹ نائٹ' آن پہنچی۔ گرین روم کی گہماگہمی۔ آخری منٹ کی گھبراہٹ۔ کاسٹ کے افراد کی طرف سے فکر جانے کون کہاں پر کوئی ڈائیلاگ گڑبڑ کردے۔ ویسٹ اینڈ کی پروفیشنل اسٹیج کے اہم افراد کو مدعو کیا گیا تھا۔ پریس والے سامنے کی قطاروں میں بڑی انہماک سے بیٹھے اسٹیج کو دیکھ رہے تھے۔ ڈرامہ کرنے والے اس شہر کے پریس اور تماشائیوں کے ردِ عمل کے عادی تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ کل صبح مانچسٹر گارجین اور ڈیلی ایکسپریس میں کس طرح کے نوٹس نکلیں گے۔

انٹرویل کے دوران میں بہت سے لوگ گرین روم میں آگئے۔ وہاں چمکنے والی لڑکیوں کا گروہ بالوں میں پھول اڑسے سنتھال طرز کے جوڑے بنائے سامنے سے گزرا۔

"یہ سب بنگالی لڑکیاں ہیں ۔۔۔؟" ایک لبرل اخبار کے نمائندے نے کیمرہ سنبھالتے طلعت سے دریافت کیا۔

"یہ ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ وہ سنتھال لڑکی فیروز جبیں ہے۔ اتر پردیش کی رہنے والی۔ یہ دوسری خوبصورت کسان لڑکی عذرا حیدر ہے ۔۔۔ یہ ادھر والی پنجابی خاتون ہیں ۔۔۔"

"ہاؤ فیسی نیٹنگ ۔۔۔" نمائندے نے بڑے صدقِ دل سے کہا اور اپنی نوٹ بک پر جھک گیا۔ "دیکھو۔ ایک بات مجھے اور پریشان کر رہی ہے ۔۔۔" اس نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔ "تم ہو تو ان ہی لوگوں میں سے یہ آج کل میری برادری سے تعلق رکھتی ہو ۔۔۔ لہٰذا مجھے کسی اینگل سے کوئی اسٹوری نہ دینا ۔۔۔ میں ۔۔۔ میں تم لوگوں کو اس طرح یکجا دیکھ کر بے حد پریشان ہوں۔ صبح سے شام تک میری ساری زندگی تمہارے آپس کے سیاسی جھگڑوں اور تنازعوں اور خونریزیوں کی خبریں چھاپتے چھاپتے گزری جا رہی ہے۔ اور اب یہ کیا سلسلہ ہے۔ تم ہمیں بے وقوف تو نہیں بنا رہی ہو۔ تم ایک سا لباس پہنے ایک موسیقی کی آہنگ پر ایک سے گیت گا رہے ہو ۔۔۔ یہ کون سا نیا اسٹنٹ ہے ۔۔۔ ایں ۔۔۔؟"

"رابرٹ صاحب ۔۔۔" طلعت نے منہ لٹکا کر کہا۔ "اسے تو بس اسٹنٹ ہی سمجھو

۵۶۳

— اچھا اب تم باہر جاؤ — دیکھو اگلا ایکٹ شروع ہونے والا ہے —"
"پتہ نہیں اگلا ایکٹ کیسا ہوتا ہے ۔" اُس نے غیر یقینی لہجے کے ساتھ رنجیدہ آواز میں کہا۔

"مجھے تو خود پتہ نہیں —" طلعت نے گرین روم کے صوفے پر اسے اُٹھتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے اگلے ایکٹ کے متعلق ہمیشہ ڈر لگا رہتا ہے ۔"

دروازے میں پہنچ کر اخبار نویس پھر ٹھٹکا — "ایک بات اور — صرف ایک آخری سوال —"

"مجھے معلوم ہے ۔" طلعت نے جھنجلا کر جواب دیا۔

"— خدا حافظ —" طلعت نے گرین روم کا دروازہ بند کیا اور ونگ میں جا کر اپنے کیو کے انتظار میں مصروف ہو گئی ۔

وھاں کے پھٹکنے اور ساون کی بارش کی صداؤں کے ساتھ ساتھ فریدہ کی حسین بنگالی آواز رفتہ رفتہ اُونچی ہوتی گئی —

بیلا نائی رے جولدی جولدی —
وقت نہیں ہے جلدی کرو
او بیلا شونار کوتر او نچل دھوئی را —
سنہری کنیا کا آنچل پکڑ کر دن ڈوب رہا ہے
جادور کاٹھی ہاتھے لوئی یا آئی تورایت بوجھی
بیلا نائی رے جولدی جولدی —
بیلا نائی —

۸۰

وقت نہیں ہے ۔ جلدی کرو ۔ جلدی کرو —
وقت نہیں ہے —

لوگوں کو دیکھو۔ ان کے چہرے کتنے کریہہ ہیں۔ یہ کتنے بدصورت ہیں۔ ان سے بھاگو ۔۔۔ بھاگو ۔۔۔ اب میں کس اور جاؤں۔ میرے دشمن۔ میرے دوست۔ میں نے انھیں راستے کے کس موڑ پر چھوڑ دیا ۔۔۔

جھیل کے پار، ندی کے پار، سمندر کے پار وہاں کیا ہے؟ ہم نے ٹکٹ تو جنوبی ممالک کا لیا تھا پر کیا تمھیں یقین ہے کہ جہاز والوں نے، گائیڈز نے جو بتایا وہی ٹھیک ہے ۔۔۔؟ یہ میں ہوں۔ یہ تم ہو۔ باقی سب میرا پروجیکشن ہے۔ یہ مستقل میں۔ سامنے سرخ چھت کا چیپل ہے اور اس میں گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ یہاں کس کی شادی ہے ۔۔۔؟ بہار آ گئی ہے پگڈنڈیوں پر پھول جھک آئے ہیں۔ ابھی وہ دونوں نہیں پہنچے جن کا بیاہ ہوگا۔

چلتے چلتے میرے پاؤں بھی جل گئے۔ اس نے رنج سے اپنے پیروں کو دیکھا۔ ایک ستا ہوا چاند برنٹس گاڈن کے اوپر ڈول رہا تھا۔ وہ سرحد عبور کر کے ہنستے ہوئے ساؤ برگ میں داخل ہوئے۔ یونہی خوشی سے ادھر ادھر گھومتے ہوئے ایک چھوٹے سے سینما ہاؤس میں پہنچے جہاں ایک بیس سال پرانا فلم چل رہا تھا۔ بیس سال پرانا فلم دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ باہر آ کر وہ ایک اور سرائے میں جا بیٹھے۔ وہ اپنی ٹانگیں کرسی پر رکھ کر دریچے سے باہر دیکھنے لگی۔ ایپرن سے ہاتھ پونچھتا ہوا خوش مزاج دھندلی آنکھوں والا بڈھا ان کے سامنے آیا۔

"یہ شاہانِ اودھ کا خاندان ہے ۔۔۔" وہ خوب ہنسا۔ "تم جانتے ہو شاہانِ اودھ کون تھے؟"

انھوں نے کاغذ کے نیپکن پر اپنے نام اکٹھے لکھے ۔۔۔

وقت نہیں ہے ۔۔۔ وقت نہیں ہے ۔۔۔

"ہلو بھائی جان ۔۔۔" دروازہ کھلا اور زرد تنگ موری والی پتلون پہنے ایک بے حد حسین لڑکی ان کی میز کی سمت بڑھی ۔۔۔ "بھائی جان آپ کا تار مجھے آج ملا۔"

"آپ کون ہیں ۔۔۔" روشن نے پوچھا

"یہ میری کزن ہیں ۔۔۔ شاہ رخ سلطان۔ پیرس میں وڈیا لوجی پڑھتی ہیں۔"

"بھائی جان یہ کون تھیں ۔۔۔" روشن کے باہر جانے کے بعد نووارد لڑکی نے دریافت

"یہ ـــ ان کو بھی میری کزن ہی سمجھو۔"

"ہائے اللہ ـــ آپ کتنے مزاحیہ ہیں ـــ پر یہ کافی مغرور سی معلوم ہوتی ہیں ـــ ایک دم اُٹھ کر باہر کیوں چلی گئیں۔"

"مغرور تو نہیں۔ ہائی برو ضرورت سے زیادہ ہیں۔ گرٹن کالج انٹرنیشنل رسٹ سے ملاقات وغیرہ۔ جانتی ہو تم یہ ٹائپ ـ"

"ہائے اللہ کس قدر دلچسپ ـ" شاہ رُخ سُلطانہ نے مسرت سے کہا۔

اُس نے ایک گہری تھکی ہوئی انگڑائی لی۔ یہ سالتو برگ ہے اور مئی کا مہینہ ـــ میں تمھیں ایک روز اپنی کہانی سناؤں گا۔

وقت نکلا جا رہا ہے ـ جلدی کرو۔

بھاگو۔ بھاگو۔ بھاگو۔

باہر ایک امریکن مشنری آ کر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ درختوں کے نیچے کرسیاں پڑی تھیں اور گلی کی محراب کے نیچے کوئی اکارڈین بجا رہا تھا۔ سڑک کی دیوار پر بیٹھے بیٹھے اس نے بڑے اخلاق سے مشنری کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "ہاؤ ڈو یو ڈو ـ" اُس نے کہا

"کیا تمھیں اپنی روح بچانی ہے۔" مشنری نے بے اندازہ اہمیت اور رازداری کے لہجے میں کہا۔ گویا اگر آپ کو مضبوط جوتے بنوانے ہوں تو ہماری فرم میں تشریف لائیے ـ

"امریکن ـ ؟" اُس نے پوچھا۔

"ہاں مجھے پیٹر کہتے ہیں ـ"

"بیٹھ جاؤ پیٹر۔ کہو اچھے تو ہو۔"

"جی تھینکس ـــ میں یہاں سے چھتیس گڑھ جا رہا ہوں۔ ہم نے وہاں ایک نیا مشن قائم کیا ہے۔" پیٹر نے آسمانی خوشی سے بے حال ہو کر بتایا۔ "میں پرنسٹن میں پڑھتا تھا۔"

"ہاؤ ونڈر فل ـ"

"میں پروفیشنل بیس بال کا کھلاڑی بننے کی ٹریننگ لے رہا تھا۔ جب میں نے دفعتاً کال سُن لی۔"

"کیا سُن لی ـ ؟"

"کال۔"

"تمہیں ایک بات بتاؤں پیٹر — میں نے بھی کال سن لی ہے۔" اُس نے سوچتے ہوئے کہا۔

"یہ تو خداوند خدا کی بڑی مہربانی ہے۔ کب سُنی —" پیٹر نے دلی مسرت سے پوچھا۔

"ابھی ابھی۔ چند لمحے پہلے۔ تقریباً نو بج کر پندرہ منٹ پر۔" اُس نے گھڑی دیکھی۔ "یا شاید نو بج کر بارہ منٹ تھے۔" اُس نے سڑک کی دوسری طرف سرائے کے جگمگاتے دریچے کی اور نظر اٹھائی۔ پھر اُس نے ہنس کر شنری کو دیکھا۔ وہ بے وقوفوں کی طرح مُنہ کھولے اُسے تکتا رہا۔

۸۱

سوتا ہوا چاند تیرتا تیرتا دریچے کے عین سامنے آکر ٹھہر گیا۔ اور اس کی روشنی سے خاموش کمرہ دفعتہً جگمگا اُٹھا۔ برابر کے اسٹوڈیو میں رنگا ناتھن مردنگم بجا رہے تھے۔ براؤن بالوں، ترچھی آنکھوں اور پیلی رنگت والے ڈچ انڈونیشین لڑکے جو سرکھیا کے ٹروپ میں شامل تھے، ناچنے کے بعد لکڑی کے فرش پر کاہلی سے آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے۔

طلعت دریچے میں اس طرح بیٹھی

تھی جیسے کسی نے چوہے کو سیسہ پلا دیا ہو۔

ہائے اللہ آپ کتنا عمدہ گاتے ہیں —

ہائے اللہ اسکنگ کا لباس آپ پر کتنا سجتا ہے —

ہائے اللہ —

فیروز دوسرے دریچے میں بیٹھی جانے کاہے کی نقل کر رہی تھی۔ طلعت نے اجنبیوں کی طرح ایک آنکھ کھول کر اسے دیکھا۔

برج باسیوں میں شیام

برج باسیوں میں شیام بنسری بجائے جا۔ بجائے جا —

طلعت نے یکلخت الاپنا شروع کیا۔

"پھر بے وقت کی راگنی۔" فیروز نے غصے سے طلعت کو دیکھا۔

"روشن آ گئی ——" نرگس نے دریچے میں سے جھانک کر اطلاع دی۔

"ہوا میں پھولوں کی مہک اڑ رہی ہے۔ اور یہ مئی کا مہینہ ہے۔ ہم اس اندھیرے کمرے میں حسبِ معمول الوؤں کی طرح بیٹھے بول رہے ہیں —— ٹوو ٹ —— ٹو ہُو —— آؤ بہن روشن —— تم بھی آؤ ——" طلعت نے اسے صدقِ دل سے خوش آمدید کہا۔

"تم لوگ ——" اُس نے شک و شبہے کی نظروں سے لڑکیوں کو دیکھا۔ "تم نے مجھے کیوں چھوڑ دیا —— میں سرحد کے پار تنہا رہ گئی ہوں۔ سرحد کے ادھر لوگوں کے چہرے کتنے کریہہ ہیں۔ یہ کتنے بدصورت ہیں۔ میں چاروں اور گھومتی ہوں۔ کہیں جگہ تلاش کر سکوں جہاں بیٹھ کر روؤں۔"

وہ لکڑی کے فرش پر بکھرے ہوئے سازوں کے قریب بیٹھ گئی۔

"تم ابھی کون گانا گا رہی تھیں ——؟" اُس نے پوچھا۔

"یُونہی —— بکواس تھی —— لکھنؤ ریڈیو کا ایک پرانا گیت ——" طلعت نے جواب دیا۔

"مجھے وہ گیت سناؤ۔"

"میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو ——؟" طلعت نے فرش پر چاروں طرف ناچتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

"تم لوگ —— تم اتنے مغرور کیوں ہو ——؟" وہ زور سے چیخی۔

گلی کے نیم تاریک محراب میں سے نکل کر کملا دریچے کے پاس آ گئی۔

"ٹھہرو روشن۔ میں تم کو ایک گیت سناؤں گی۔ گندھروید کا سام گیت —— رنگا ناتھن" —— طلعت نے ناچتے ناچتے رُک کر آواز دی —— "مردنگم اور زور زور سے کیوں نہیں بجاتے ——"

"تم روتی کیوں نہیں ——" کملا نے روشن کے قریب آ کر اسے غور سے دیکھا۔ "کیا ایسا نہیں ہوتا کہ جب لوگ انھیں چھوڑ کر آگے چلے جاتے ہیں تو لڑکیاں روتی ہیں ——" اُس نے

اُداسی سے سوال کیا۔

"دیکھو۔" روشن نے کملا کو مخاطب کیا "اتنے برسوں تک میں ایک گھر بنانے میں جُٹی رہی۔ لیکن ٹھیک نو بج کر پندرہ منٹ پر وہ گھر ٹوٹ کر زمین پر آ رہا۔"

"کاہے۔ کیسے۔؟" طلعت نے پوچھا۔

"میں نے اسے خود توڑ دیا۔ میں نے بڑے زور سے اسے ایک ٹھوکر لگائی اور اڑا اڑا دھم۔ وہ ایک دم نیچے آن گرا۔ اب میں بڑی بے فکر ہوں۔ اب میں آرام سے سویا کروں گی اور کوئی گھر تعمیر نہ کروں گی۔ اللہ حافظ۔" وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ "اب میں تمھارے بدصورت، اُداس اُجاڑ مکانوں میں رہا کروں گی۔"

ڈچ انڈونیزین لڑکے ایک جمائی لے کر دریچے میں جا کھڑے ہوئے۔

"میں نے اس گھر کے ٹیلی فون کے تار بھی کاٹ دئے ہیں۔" چلتے چلتے اُس نے دروازے میں سے سر نکال کر کہا۔ اور زینے کی اور مڑ گئی۔

طلعت بھی دریچے میں آ گئی۔ اُس نے دیکھا کہ باہر بے پایاں اندھیرا ہے اور اندھیرا مہربان ہے۔ اور اندھیرا ہمارے ہر دُکھ، ہر غم، ہر شکست کو اپنے میں سمیٹ لیتا ہے۔ کیونکہ آخر میں ہم خود اس بے پایاں اندھیرے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ گو ہمیں کبھی اس طرح نہ مرنا چاہیئے۔

"ہلو۔" اچانک فیروز نے گلی میں آکر دریچے میں سے اندر جھانکا۔

"تم کہاں چلی گئی تھیں۔؟"

"میں دھوبن کے یہاں گئی تھی۔"

"بہت اچھا کیا تھا۔" طلعت نے بے دلی سے کہا۔

"اب ان کا۔ تمھارے بھیا صاحب کا کیا کیا جائے۔" اُس نے فکرمندی سے پوچھا۔

"ڈارلنگ۔ کافی میں تم نے پھر کتھا گھول دیا۔" اسٹوو کے پاس سے کملا چلّائی۔

"تم سے کس نے کہا ہے کہ بکری کی طرح ہر وقت پان چبایا کرو۔" طلعت نے

گرج کر جواب دیا "سارے بیں مار پان کے لوازمات بکھرے ہوئے ہیں۔"
"ڈارلنگ۔" نرگس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے خبر سنائی "ساجدہ آپا۔"
"بیچے گیلری میں کھڑی پوچھ رہی ہیں کہ اپنا افسانہ کب تک لکھ کر لائیں۔ یہ کون سا
نیا ریکٹ تم نے چلایا ہے۔" کملا نے غصے سے مطالبہ کیا۔
"دراصل — دراصل کملا — برلین کے واقعے کے بعد سے میں ساجدہ آپا کی رائے کوہل
بنی ہوئی ہوں۔ ایک روز انھوں نے کہا کہ وہ اپنے مختلف تجربات اور تاثرات پر ایک افسانہ
لکھنے جا رہی ہیں تو میں نے — میں نے ان سے کہا کہ میں اسے کسی اردو رسالے میں
چھپنے کے لئے بھجوا دوں گی —" طلعت نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "اد برائے خدا ان
سے کہدو کہ مجھ پر اپنڈی سائیٹس کا حملہ ہوا ہے اور مجھے ہسپتال لے گئے ہیں۔"
"ادھر آؤ تم سب۔" نرگس نے گیلری میں سے آواز دی۔
ریہرسل روم میں ساجدہ بہن ایک سیٹی پر بیٹھی تھیں۔
"السلام علیکم — پیاری بہن —" انھوں نے گرم جوشی سے کہا۔
"وعلیکم السلام پیاری بہن — بیٹا قیس کس حال میں ہے — اور شیر لوہے کے
جال میں ہے —" طلعت نے نعرہ لگایا۔
"ہائے بس تم ہر وقت مذاق کرتی ہو —" انھوں نے کہا "اب اپنا افسانہ پڑھ کر
بھی سناؤ گی ساجدہ بہن —؟" طلعت نے لرز کر سوال کیا۔
"آہ — یہ کچھ یادیں ہیں میرے انگلستان کے زمانۂ قیام کی —" انھوں نے بیگ میں سے
کاغذات نکالتے ہوئے کہا۔ "تم تو مجھے سمجھتی ہو نا —"
"لو ساجدہ بہن — کافی پیو —" فیروز نے مہمان نوازی شروع کی۔
"ہرگز نہ پیجیے گا۔ اس میں کتا گھلا ہے —" کملا نے آگاہ کیا۔
"اجی کتا ہو یا نہ ہو۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ دنیا کی ہر چیز فراڈ ہے فراڈ —" فیروز نے
سخت فلسفیانہ انداز سے کہا۔
طلعت کو غصہ آگیا۔ وہ آتش دان کے پاس جا کھڑی ہوئی اور ہوا میں ہاتھ ہلا کر اس نے

کہنا شروع کیا :

میز ہل جائے گی اور کافی چھلک جائے گی مجھے معلوم ہے دوست۔

میز میں پیر لگا۔ میز کو جھٹکا سا محسوس ہوا۔

ہل گئی میز تو کافی چھلکی ، کافی چھلکی تو مگر گر نہ سکی

میز کا فعل عبث

یا مرا فعل عبث

دونوں میں کوئی نہیں ، کچھ بھی نہیں

گھور کر دیکھ نہ یوں دوست مجھے

بدتمیزی سے بہت دُور رہا کرتا ہوں

اتفاقات کے گہرے نکات

میز تو میز ہے گردوں کو ہلا دیتے ہیں

اور سیارے چھلک جاتے ہیں

ایسے ہی جیسے کہ کافی چھلکے

ساجدہ بہت خوش ہوئیں ۔" اس کا عنوان کیا ہے۔" اُنھوں نے پوچھا۔

"فراڈ —— ہی سمجھ لو — یہ کرشنا کے میاں کی تازہ ترین تصنیف ہے۔"

"اچھا ، سریکھا دیوی سے ملاقات ہو سکتی ہے۔؟ اُنھوں نے فون پر مجھے اسی وقت کا اپوائنٹ منٹ دیا تھا۔"

سریکھا دوسرے کمرے میں ڈچ انڈونیشین رقاصوں کو ریہرسل کرا رہی تھی۔ "تم اپنے حواس میں ہو۔" طلعت نے اس کے پاس جا کر غصے سے کہا۔ "یہ تم لوگوں کو ملاقات کا وقت کب سے دینے لگیں؟"

"روشن کو تم نے کہاں غائب کر دیا۔؟" وہ گرجی۔

"مجھے کیا معلوم۔ میں ہر سمے اس کے پیچھے پیچھے تو نہیں پھر سکتی۔" طلعت نے جواب دیا۔

"ہائے کس قدر دلچسپ۔" ساجدہ بہن نے دروازے میں پہنچتے ہوئے کہا۔ "میری بٹشیہ

تمنا تھی کہ بیک اسٹیج زندگی دیکھوں ۔"

"کیا ذلیل تمنا تھی ۔" طلعت نے غصے سے دانت پیستے ہوئے دل میں کہا ۔

"نمستے جی ۔" تریکھا نے بے حد سنجیدگی سے ساجدہ آپا کے قریب آ کر کہا ۔ "میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں ۔" اُس نے فوراً انٹرویو دینے والا انداز اختیار کیا ۔

"تمہاری رائے نے سب کا بیڑا غرق کر دیا ۔" ساجدہ آپا کے جانے کے بعد کملا نے طلعت سے کہا ۔

"ایں ۔۔ ؟"

"ہاں ۔ مثلاً اگر تم نے ساجدہ بہن کو رائے نہ دی ہوتی کہ وہ فری ورلڈ کی لیڈری چھوڑ کر افسانہ نگاری پر اُتر آئیں تو کیا ہوتا ۔۔ ؟"

"تو وہ فری ورلڈ کی سب سے بڑی لیڈر ہوتیں ۔" طلعت نے اطمینان سے جواب دیا ۔

"لیکن اب وہ انسپریشن کی تلاش میں رومینٹک جنگلوں میں گھومتی ہیں ۔" فیروز نے کہا

"جنگلوں میں ۔۔ ؟" کملا نے پوچھا

"ہاں جنگل یعنی وُڈلینڈ ۔۔"

"سینٹ جانز وُڈلینڈ ۔۔ ؟" طلعت نے سوال کیا ۔

"کمینہ پن پر مت اُترو ۔۔" فیروز نے کہا ۔

"در اصل سینٹ جانز وڈ کے اسٹوڈیو فلیٹس میں تبدیل شدہ اصطبلوں اور ان میں رہنے والے کلاکاروں کی صحبت نے ان کی نفسیات پر بہت پریشان کن اثر ڈالا ہے ۔ اور دوسری بات یہ ۔۔" کملا نے خفگی سے کہا ۔ "کہ اگر تم نے روشن کو کوئی سیدھا راستہ دکھایا ہوتا تو وہ کب کی گھر واپس جا کر کسی ٹھکانے کے آدمی سے بیاہ کر لیتی ۔"

"وہ لامحالہ گھر واپس جا کر کسی ٹھکانے کے آدمی سے بیاہ کرے گی ۔ وہ فلسفی ضرور ہے مگر یہ نہ بھولنا کہ بورژوا فلسفی ہے ۔" طلعت نے کہا ۔ "ارے جب میاں بنسرے باگوں میں آئے ۔۔ مالی بھئے اگوانی ۔۔" اس نے ڈھول اٹھا کر الاپنا شروع کر دیا ۔

"اور میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ یہ سارا اسرار ہے کیا آخر ۔" سر یکھا نے اندر آتے

ہوئے سوال کیا۔

"پیرس میں کزن شاہ رُخ سلطانہ ڈاکٹری پڑھتی ہیں۔ یہ اب تک روشن کو معلوم ہی نہ تھا۔" طلعت نے کہا۔

"اتفاقات کے یہ گہرے نکات۔" ریحانہ نے سیٹی بجائی۔

"میں دھوبن کے یہاں جا رہی ہوں۔" فیروز نے دریچے میں سے باہر گلی میں کودتے ہوئے کہا۔

۸۲

جاڑے آئے اور برف سے سارے راستے سفید ہو گئے۔ ایسٹنٹ گاورٹ۔ ترویز۔ ویرزن۔ ساری جگہوں کو برف نے ڈھانپ لیا۔ کرسمس کے پینٹو مائم شروع ہوئے۔ لوگوں نے جنوب کی طرف روانہ ہونا شروع کیا۔ اسٹراس برگ میں چار رخانے دار موزے پہنے غریب جرمن لڑکیاں کرسمس کی خریداری کر رہی تھیں اور امریکن سپاہی انھیں سگریٹ کے ڈبے تحفے میں دے رہے تھے۔ نوتر دام کی راہبات سین کے کنارے کنارے اپنی بگھیاں ہانک رہی تھیں۔ ونٹر سپورٹس کا زمانہ آیا۔ برف کے خطرناک حصوں کو جالیاں لگا کر علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ وکی بام نے شاید کوئی نیا ناول لکھ لیا تھا اور برف بڑی مہربان تھی۔

پھر برف پگھلی۔ درختوں میں نئی کونپلیں نکلیں۔ ساری کائنات پر شدید، خالص رنگ بکھر گئے۔ خزاں آئی۔ جنگلوں میں سُرخ آگ ایسی لگ گئی۔ تیز سُرخ پتوں کے انباروں نے پگڈنڈیوں اور سڑکوں کو اپنے میں چھپا لیا۔ ہوا کی نیلاہٹ میں زردی شامل ہو گئی۔

چلتے چلتے تھک کر روشن راستے میں ایک جگہ ٹھہر گئی۔ سامنے ایک پرانا چرچ تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر تبروں کے کتبے پڑھنے لگی۔ پھر وہ اندر گئی۔ چیپل خالی پڑا تھا۔ گھسے ہوئے اوک کی بنچیں۔ بپتسمہ دینے کا حوض۔ دیواروں پر ان کرنلوں اور کپتانوں کی تاریخ وفات کی پیتل کی تختیاں لگی تھیں جو اس قصبے میں پیدا ہوئے اور سلطنت کی حفاظت کرتے ہوئے جھانسی اور کانپور اور رنگون میں کھیت رہے۔ اُس نے بے دھیانی سے اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے چند سکّے

فنڈ کے ڈبے میں ڈال دیئے۔

"ہلو۔ میری بچی۔۔" بہت بوڑھے پادری نے محبت سے کہا وہ پیچھے درختوں سے نکل کر آیا تھا اور لنگڑا تھا۔

"ہلو۔ گڈ ایوننگ۔۔" اسے بے حد ڈر لگا۔ اُس نے مسکرا کر چند اور سکّے بکس میں ڈالے اور باہر آگئی۔ کیا فضول بات ہے۔ چرچ بنا رکھے ہیں۔ اُس نے جھنجلا کر کہا۔ پھر اس کا جی چاہا کہ واپس جائے اور ایک اوک کی بنچ پر سر رکھ کر پڑی سوتی رہے۔

اس کے ساتھ وہ گھنے جنگلوں اور ہرے جزیروں میں سے گزری تھی۔ طویل مرمریں گیلریوں میں چلی تھی۔ اُونچی سفید سیڑھیوں پر چڑھی تھی جن کے اختتام پر رومن ستونوں میں سے تیرتا ہوا چاند یک لخت سامنے آجاتا تھا اور چناروں اور سائیپرس کے درخت تھے۔ آسٹریا۔ یونان۔ اٹلی۔ اب وہ پھر مانوس پرانے انگلستان میں موجود تھی۔

لندن میں وہ سرلکھیا کے مکان کی بالکنی پر جھکی رہی۔

"وہ سب ایکٹنگ تھی۔" اُس نے بڑے باوثوق طریقے سے عامر رضا سے کہا۔

"پتہ ہے۔" عامر رضا نے اطمینان سے جواب دیا۔ ان کو ہمیشہ سے ہر بات کا پتہ تھا۔ خود اُن کو نروان ملنے والا تھا۔ نروان کی مختلف کیفیات ہوتی ہیں۔

"مجھ میں بہت کمال کا اینیج سنس ہے۔۔"

"معلوم ہے۔۔ تم نے بھی کالج میں ایلوکیوشن سیکھا ہے اور اس کا لاتھیٹر میں تم۔۔"

"ہاں۔۔" اُس نے خوشی کے لہجے میں بات کاٹی۔۔ "اور اسی لئے اب میں تم سے یہ کہنے آئی ہوں کہ مجھے مسرت ہے کہ تم نے مجھ پر ثابت کر دیا ہے کہ تم بہت سمجھدار ہو۔۔ دراصل غلطی سراسر میری ہی تھی۔ میں صدقِ دل سے تم سے معافی مانگتی ہوں۔"

"میں تمھیں معاف کرتا ہوں۔۔" اُس نے بہت فراخ دلی سے جواب دیا۔

پھر وہ دونوں بالکنی پر جھکے سیٹی بجاتے رہے۔

٭

۸۳

سوتا ہوا چاند کابل سے چاروں اور تیر آیا۔ بالکنی کے نیچے سریکھا بیٹھی تھی۔ وہ اور زرینہ نئے اسٹیج ڈیزائن بنانے میں مصروف تھیں۔

"وہ دیکھو۔ چاند مر رہا ہے۔" اس نے اچانک انگلی اٹھا کر روشن کو مخاطب کیا۔

"ہاں۔" روشن نے پہلی بار دیکھا۔ چاند مر چکا تھا اور اس کی زرد لاش رات کی ہوا کے رحم و کرم پر ادھر اُدھر ڈول رہی تھی۔

"تم نے دیکھا۔" سریکھا نے آہستہ آہستہ کہا۔ "یہ سب اسٹیج کی سینری تھی۔ ڈیزائن۔ ڈیکور۔ کینوس کے رنگین پردے۔ پروپس۔"

گیلری میں لفٹ آن کر رکا۔ طلعت اور نرگیش اندر آئیں۔ وہ نرملا کو دیکھنے مدھرست گئی تھیں اور واپسی میں انھوں نے دیکھا کہ ہیزل میئر کا جنگل وہاں نہیں تھا۔ تب طلعت کو معلوم ہوا کہ موسموں کے ساتھ ساتھ اس جنگل کی جائے وقوع بدلتی رہتی ہے۔ ہیزل میئر کا جنگل کبھی ایک جگہ پر نہیں ٹھہرتا۔

کمرے میں وہ سب چپ چاپ بیٹھے رہے۔ کملا نے روشن کو غور سے دیکھا گویا اسے پہچاننے کی کوشش کرتی ہو۔ پھر وہ اپنی اور سریکھا کی بھارت ناٹیم کی ملبوسات کو الٹنے پلٹنے لگی۔

"کملا۔" طلعت نے دفعتاً کہا۔ "لوئی مک نیس کی وہ نظم سناؤ۔"

"کون نظم۔؟"

"وہی۔ جو 'خزاں نامے' میں شامل ہے۔"

کملا آتش دان کے مصنوعی انگاروں کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ کہا۔

'I loved my love with a platform ticket,
A jazz song.
A handbag, a pair of stockings of Paris Sand......
I loved her long
I loved her between the lines and against the clock,
Not until death
But life did us part
I loved her with peacock's eyes
and the wares of Carthage,
With blasphemy, camaraderie,
and bravado and lots of other stuff.
I loved her with my office hours, with flowers and
Sirens,
With my budget, my latchkey
and my daily bread.,'
And so to London and down the
ever-moving Stairs

سب خاموش بیٹھے رہے۔

"کملا—" طلعت چلائی— "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" وہ قریب آکر ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گئی۔

"تمھیں یاد ہے—" کملا نے سوچتے ہوئے کہا— "جولائی یا اگست کی ایک شام جب بارش ہو کر تھمی تھی۔ گلفشاں بالکل سنسان تھی۔ سب لوگ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ میں اور نرملا اور تم اکیلے برساتی کی سیڑھیوں پر بیٹھے تھے اور شام کی نیلی روشنی سارے میں پھیل گئی تھی۔ اور اس سمے دو سنیاسنیں منتر پڑھتی پھاٹک کے اندر آگئی تھیں اور مُصر تھیں کہ ان کو دکشنا دی جائے اور بچوں کی طرح ہمیں ایکا ایکی یہ خیال آیا تھا کہ یہ چڑیلیں ہیں ہم اتنے بڑے گھر میں تنہا ہیں۔ ابھی یہ ہمیں کوئی شراپ دیں گی۔ ابھی کچھ ہوگا۔ اس سنّاٹے میں کوئی خوفناک انجانی بات ہوگی۔" پھر وہ جاپ کرتی اور راجستھانی میں بڑبڑاتی واپس چلی گئی تھیں۔ ہم نے خوفزدہ ہو کر انھیں

زور سے ڈانٹا تھا۔" طلعت نے آہستہ آہستہ کہا۔" اور پھر ہمیں جھوے کے سائے سے بھی ڈر لگا تھا۔ ہم سہمے ہوئے سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے تھے — میں نے کوشش کر کے آیتہ الکرسی پڑھی تھی اور تم نے اپنا وہ اکلوتا اشلوک دُہرانا چاہا تھا جو تمہیں کبھی یاد نہ ہو سکا۔"

"وہ بڑی سنسان شام تھی۔" کملا نے یاد کیا۔" تم نے کبھی سوچا ہے۔ ساری شامیں بہت، سنسان ہوتی ہیں۔ ان میں ایسی بے پایاں اُداسی ہوتی ہے۔ شام — جب دونوں وقت ملتے ہیں۔ جب ہم جگمگاتے کمروں میں ہنستے ہیں۔ اس وقت بھی دفعتاً بڑے رنج، بڑی پشیمانی کا احساس ہوتا ہے۔"

پھر ہم تینوں خاموش سڑک پر سے گزر کر سنگھاڑے والی کوٹھی چلے گئے تھے اور وہاں دو آج کے ساتھ مل کر اپنے اس طرح خوفزدہ ہو جانے پر بہت ہنسے تھے۔" طلعت بولی۔

"وہ سنیاسنیں ہمیں ہر جگہ، ہر موڑ پر ملتی ہیں۔ وہ ہمیں بددُعائیں دیتی جھوے کے سائے میں غائب ہو جاتی ہیں۔ اندھیری راتوں میں میں نے ان سنیاسنوں کو چلّا چلّا کر روتے سُنا ہے" کملا نے کہا۔

دوسرے کمرے میں زور زور سے مردنگم بجنا شروع ہو گیا۔ آج رات سرلیکھا اور کملا کا ناچ ہے۔ سارا عالم دیکھنے کے لئے آئے گا۔ طلعت کو خیال آیا۔

روشن اس کے قریب آئی۔" میں واپس جارہی ہوں — تم لوگ مجھے کبھی کبھی خط لکھا کرو گے —؟" طلعت کو ایسا لگا جیسے اس کی آواز میں التجا تھی۔

"ہاں۔ ہم تمہیں ہر سال عید اور سالِ نو کے کارڈ بھیجیں گے۔" طلعت نے کہا (کیا انجام بس اتنا ہے۔ کچھ عرصے تک ان سب کے کرسمس کارڈ روشن کے پاس جائیں گے مگر وہ بھی بند ہو جائیں گے۔ راہ میں جب مختلف خوابوں کے وسیع ویرانے اور سیاسی حد بندیاں حائل ہوں تو کہاں تک ان خوشگوار تعلقات کو گھسیٹا جا سکتا ہے) ہاں۔ ہم تمہیں کبھی بھولیں گے نہیں روشن ڈیر —" اُس نے دہرایا۔" ہم سب ایک شراپ کے زیر اثر ہیں۔"

مردنگ کی آواز تیز ہو گئی۔ نادر دام نانا دی رے نا — سرلیکھا چھن سے اسٹیج پر

آئی۔ اب حسبِ معمول میں ناچوں گی۔ اس نے سوچا۔ کملا ناچے گی۔ سب ناچیں گے۔ آئی لپُو جتی سورم۔ سب دام۔ شو جاری رہے۔ ایسی کیا خاص بات ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیوں جاری رہے۔ کرڑ تک تام تت تام۔ کرڑ تک تئی تت تئی — کل مجھے ٹیلی وژن پر ناچنا ہے۔ پرسوں ہالینڈ جا کر ملکہ جولیانہ کے لئے رقص کرنا ہے۔ دریا بہے جا رہا ہے۔ ڈی لن ٹامس مر گئے بلبل چودھری مر گئے۔ روشن — افسوس کہ وہ بھی شاید مرگئی —

اور اب ہال خالی پڑا ہے۔ صرف راڈا کی چند لڑکیاں اور لڑکے ادھر اُدھر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ اخباروں کے نمائندے کاغذ پنسل ہاتھ میں لئے سریکھا دیوی کے قیمتی الفاظ سننے کے لئے کان لگائے کھڑے تھے۔ کارڈ بورڈ کے سیٹ افراتفری کے عالم میں بکھرے ہوئے تھے

"رقص میں میری زندگی ہے۔" سریکھا نے رامیشورم کے مندر کی سیڑھی پر پیر ٹکاتے ہوئے انٹرویو والی شائستہ اور متوازن آواز میں کہنا شروع کیا۔

"خداوندا — سریکھا۔" طلعت نے بے انتہا بور ہو کر جمائی لی۔

"ہش — میں پریس کو بیان دے رہی ہوں۔"

اخبار کے رپورٹر مسحور ہو کر اسے دیکھتے رہے۔

طلعت نیم تاریک اڈیٹوریم کی ایک نشست پر بیٹھ کر اونگھنے لگی۔ یہ ننھا سور مارکیٹ گیا تھا۔ یہ ننھا سؤر مارکیٹ گیا تھا۔ یہ ننھا سؤر گھر پہ رہا۔ اس ننھے سؤر نے بھنا گوشت کھایا۔ یہ ننھا سؤر سارے راستے روتا ہوا گھر واپس آیا — وی وی وی وی وی —

۸۴

وی وی وی وی —————— شور اب آسمان تک پہنچ گیا۔ چمپا نے دریچہ بند کر دیا اور ہوسٹل سے باہر نکل آئی۔ سارے میں سہ پہر کا سناٹا طاری تھا کل کالج بند ہو جائے گا۔ اب میں کہاں جاؤں گی۔ کیا کروں گی — (زندگی منتظر ہے منہ پھاڑے) یہ تجربہ بھی غالباً ناکام رہا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دُور دُور تک پھیلے ہوئے باغوں کو دیکھا۔ کیمبرج کی ہریالی پر نیلی گھٹائیں چھائی تھیں

وہ پیکس پر سے گزرتی لائبریری کی طرف جانے والی پُلیا پر آ گئی۔ "شولوم علیخم۔" ایک یہودی طالبعلم دوسرے یہودی طالب علم کو جو پُلیا پر بیٹھا تھا، سلام کرتا ہُوا سائیکل پر گزر گیا۔ "تم پر خدا کی رحمت ہو۔"

"تم سب پر خدا کی ۔۔ رحمت ہو۔" چمپا نے دل میں دہرایا۔

زندگی میں بذاتِ خود اتنی شدت ہے۔ اس کے لئے فلسفے کی فروعات کی کیا ضرورت ہے اور مسرت کی تلاش کے سلسلے میں ہم کس قدر کمینے بن جاتے ہیں۔ یہودی طالب علم جو پُلیا پر بیٹھا تصویریں بنا رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر خوشی سے کھل گیا۔ "بیٹھ جاؤ۔" اُس نے چمپا سے درخواست کی۔ "میں تمہارا اسکیچ بناؤں گا۔ وہ بیٹھ گئی تا کہ اُس کی دل شکنی نہ ہو۔ "آج آخری دن ہے۔ کل تم جانے کہاں چلی جاؤ گی۔ تمہارا اسکیچ میں اپنے پاس رکھوں گا۔" اُس نے تندہی سے پنسل چلاتے ہوئے کہا۔

چمپا نے جھانک کر دیکھا۔ اسکیچ بڑا خراب تھا۔ مگر وہ بڑے صبر اور اخلاق سے چپکی بیٹھی رہی۔ شاید میری اصل شکل ہے۔ اُس نے دل میں کہا۔ "یہ ناکام مصوّر ہی شاید میری شبیہہ اتارنے میں دراصل کامیاب رہا ہے۔"

"پسند آئی تم کو تصویر۔" یہودی لڑکے نے خوشی سے پُوچھا۔ "میں تم کو مسرور دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں تم کو کس طریقے سے خوش کروں ۔۔؟" وہ بڑا پُرخلوص نظر آیا۔

"تم مجھے خوش نہیں کر سکتے۔" چمپا نے دفعتاً بڑی کرختگی سے کہا (ہم سب کمینے ہیں۔ مسرت کی تلاش میں ہماری چاروں طرف تو دیکھو ۔۔ اس نے دل میں سوچا)

"وہ کون ہے۔" لڑکے نے یکلخت بے حد رنجیدہ ہو کر پُوچھا۔ "وہ، کون ہے جو تم کو مسرت بخشے گا ۔۔"

"یہ بڑا بے رحم اور کمینے پن کا سوال ہے۔"

"معاف کرنا۔" اُس نے اُداسی سے کہا۔

"اچھا۔ خدا حافظ شولوم علیخم۔" چمپا نے مسکرا کر کہا۔

"شولوم علیخم۔" لڑکے نے جواب دیا اور اسے ندی کی سمت جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

جدھر مائیکل اور ڈینس کھڑے تھے۔

"سرل اب تک نہیں ملا — ؟" ڈینس نے سراسیمگی کے عالم میں چلّا کر پوچھا۔

"نہیں —"

"کہاں غائب ہو گیا سرل —" ڈینس نے کہا۔ ان دونوں نے غصے سے چمپا کو دیکھا۔

"میں سرل کی ذمہ دار نہیں ہوں ڈینس —" چمپا نے آہستہ سے کہا۔

"اوہ چمپا — مجھے معاف کر دینا۔ کیا میں تم پر برس پڑا تھا — ؟" مائیکل نے عجز سے کہا۔

"نہیں مائیکل۔ ٹھیک ہے۔"

"آج آخری دن ہے چمپا۔"

"ہاں۔"

"چلو چل کر آخری مرتبہ کوہ نور میں کھانا کھا لیں —"

"آج آخری —" سب یہی دُہرا رہے تھے۔ وہ اس جذباتیت سے بچنا چاہتی تھی مگر یہ ناممکن تھا۔ یہ واقعہ تھا آج کیمبرج میں طالب علمی کی زندگی کا آخری دن تھا —

ریسٹوران میں بیٹھ کر اُنھوں نے سرل کا قطعی ذکر نہیں کیا۔ اُنھوں نے تو روشن تک کا ذکر نہیں کیا۔ لوگ اتنے مہربان کیوں ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے سے اتنی ہمدردی کیوں کرتے ہیں۔ یہ لوگ میرے بھی بہت سخت بہی خواہ ہیں۔ اب میں پھر کمینے پن پر اُتر آئی ہوں۔

چند روز قبل، اُس نے برسبیلِ تذکرہ روز ماری کی خیریت دریافت کی تھی۔

"اچھی ہے۔" سرل نے جواب دیا تھا۔ "وہ غریب تو بیماری کی حالت میں بھی نوکری کرتی ہے تاکہ میں کیمبرج میں تعلیم مکمل کر سکوں۔"

"— اور دوسری لڑکیوں سے عشق لڑا سکو —" چمپا نے بے دھیانی سے کہا تھا

یہ سن کر سرل چھلانگ لگا کر کھڑکی سے باہر کود گیا تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو رہا تھا

اس روز سے سرل غائب تھا۔ کالج کے کواڈرینگل میں، گلیوں میں، ندی کے کنارے، قہوہ خانوں

اور کتابوں کی دوکانوں میں کہیں سرل کا پتہ نہ تھا۔

دفعتاً وہ باہر بارش میں بھیگتا دکھائی دے گیا۔ ڈینس پیک کر اس کی طرف دوڑا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ پھر مائیکل اس کو بلانے کے لئے گیا۔ مگر وہ وہیں کھڑا رہا۔ ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ طالب علم برساتیاں اوڑھے خراماں خراماں چل رہے تھے۔

"اندر چلو۔ یہ کیا بچپنا ہے۔" چمپا اٹھ کر باہر گئی اور ڈانٹ کر اس سے کہا۔

"نہیں۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"بکومت۔"

"میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ کیسے آؤں اندر۔" اس نے آہستہ سے ڈینس سے کہا۔

چمپا کے حلق میں کوئی چیز آ اٹکی۔ ایک ہفتہ قبل اسی جگہ پر اس نے سرل سے کہا تھا۔ تمہاری بی بی اس لئے ملازمت کرتی ہے کہ تم دوسری لڑکیوں سے عشق لڑاؤ۔

پھر وہ چمپا کی طرف مڑا۔ "تم کو غالباً یہ معلوم کر کے دلچسپی ہوگی کہ روزماری نے مجھے اس ہفتے چیک نہیں بھیجا کیونکہ میں نے اسے اطلاع دی تھی کہ میں نے اسے چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"تمہارا۔ تمہارا دماغ یعنی کہ — بالکل چل گیا ہے —" چمپا نے ہڑبڑا کر کہا۔ اسی لمحے اس نے محسوس کیا کہ مائیکل اور ڈینس اسے انتہائی نفرت کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ نفرت جو اس نے تہمینہ، نرملا اور نسانتا گریگ کی نگاہوں میں دیکھی تھی۔

"ہاں۔" سرل نے اطمینان سے جواب دیا اور برساتی کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ تلاش کرنے لگا۔

ڈینس اور مائیکل خاموشی سے رستوراں میں واپس چلے گئے۔

بارش چمپا اور سرل پہ برستی رہی۔

"چلو یہاں سے چلیں۔ پانی میں بھیگنے کی کون تک ہے۔"

"ایسے تو کس بات کی کون تک ہے۔" سرل نے اسی انداز میں کہا۔ پھر وہ ہنس پڑا۔

"دیکھو تو سہی۔ بالآخر مجھ پر بھی تمہارے اپنشدوں کا اثر ہو ہی گیا۔"

"تمہارا دماغ چل گیا ہے سرل۔" چمپا نے دوبارہ کہا۔

"ہر واقعہ منفرد ہے۔ دہرایا نہیں جائے گا۔ یہ مت سمجھنا چمپا کہ لمحے دہرائے جاسکیں گے تمہاری زندگی ـــ میں ـــ یہ ساری چیزیں ـــ وقت کے المیے پر تم ہنس نہیں سکتیں ـــ"

"چلو ـــ میں تمہاری طرف چلتی ہوں ـــ" اس نے آہستہ سے کہا۔

وہ فٹ پاتھ پر اس طرح چلنے لگے گویا قبرستان کی طرف جاتے ہوں۔ جب شناسا لڑکے اور لڑکیاں راستے میں ملتے تو وہ بڑے الم سے ان کو ہلو ہلو کہتا جاتا۔

"تم کیا واقعی ـــ میری وجہ سے ـــ یعنی کہ ـــ" اتنی خوفناک بات اس کی زبان پر نہ آسکی۔ "یعنی کہ" اس نے مری ہوئی آواز میں کہنا چاہا۔ "کہ تم نے آخر اتنا بڑا فیصلہ کیوں کیا۔" فیصلہ ـــ اور اس کی وجہ ـــ دو چیزیں، جو اس کی سمجھ میں آج تک نہ آسکی تھیں۔

"جی نہیں ـــ مجھ کو بقول تمہارے باؤلے کتے نے کاٹا تھا۔" سرل نے اطمینان سے جواب دیا۔ "مجھ پر دراصل کبھی کبھی خلل دماغ کے دورے پڑتے ہیں۔ اسی کے زیر اثر ایسی حرکتیں کر بیٹھتا ہوں۔"

چمپا چوراہے پر آکر دفعتاً اپنے ہوسٹل کی سمت مڑ گئی۔

"تم تو اپنے زریں مشوروں سے مجھے مستفید کرنے میرے ہوسٹل آرہی تھیں۔"

"میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتی سرل ـــ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتی۔"

"یہ تمہارا آخری، قطعی جواب ہے؟" سرل نے زرد پڑتے ہوئے کہا۔

"آخری، قطعی، بالکل، یقیں اس میں شک و شبے کی کوئی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی۔"

"تو گویا تم نیلمبر کا تعاقب کہاں تک کروگی۔"

"میری توہین مت کرو سرل۔" چمپا کے جانو تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"اچھا۔ اچھا۔" سرل نے سانس روک کر کہا۔ "سڑک پر چلاؤ مت چمپا۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ غلطی میری ہی تھی ـــ خدا حافظ ـــ" بارش کا ایک زوردار ریلا آیا جس سے مکانوں کے پردے لہرا گئے۔ ہوا میں خنک گلابوں کی مہک تھی۔

شام کو وہ چند کاغذات لینے کے لئے سرل کے کالج گئی۔ رات کی ٹرین سے بہت سے ساتھی اپنے اپنے ملکوں کو لوٹ رہے تھے۔ سینو کارنوس برازیل جا رہا تھا۔ اس سے اس کی کتنی تکرار رومن کیتھولک فلسفے پر ہوتی تھی۔ لڑکیاں اور لڑکے بارش سے بچنے کے لئے پھاٹک کے اندر کھڑے تھے۔ پھاٹک کا بھاری پندرھویں صدی کا چوبی دروازہ اب آخری بار کھل کر بند ہو گا۔ اس کے بعد جب کبھی وہ یہاں آئیں گے تو سب کچھ تبدیل ہو چکا ہو گا۔

بارش اور زور سے ہونے لگی۔ پورٹر ٹیکسیاں لے کر آرہے تھے۔ لڑکوں نے برساتیوں کے کالر کان تک اُٹھا لئے تھے۔ لڑکیاں چھتریاں کھول رہی تھیں۔ سب خاموش تھے۔ اب بات کرنا کس قدر مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ مثلاً ڈورس سے یہ کہنا کہ جب میں اسٹیٹس آئی تو تم سے ملنے نارتھ ڈیکوٹا ضرور آؤں گی۔ یا جینیٹ یہ کہہ سکتی تھی کہ تم جب نیوزی لینڈ آؤ تو میرے ہاں ہی آکر ٹھہرنا۔ یہ سب کس قدر مسخرے پن کی بات تھی۔ اگر یہ آخر وقت خدا حافظ کہنے کا سلسلہ نہ ہوا کرے تو انسان کس قدر زبردست کوفت سے بچ جائے مگر نہیں کھڑے ہیں سب بے ربط۔ بے تکے جملے ادا کئے جا رہے ہیں۔ نظریں بچا بچا کر آنسو پیے جا رہے ہیں۔ لاحول ولاقوۃ۔ ٹیکسیاں آئیں اور سب ایک ایک کر کے اس میں بیٹھ گئے۔ پھاٹک بند ہو گیا۔ ایک بار اس نے گھوم پھر کر سنسان کواڈرینگل کا چکر لگایا۔ چیپل میں گئی۔ سنگ مرمر کی تختیوں پر ان لڑکوں کے ناموں کو آخری بار پھر سے پڑھ ڈالا جو دوسری جنگ عظیم میں کام آئے۔ مالیوں سے بات کی۔ ایک خانساماں ڈائننگ ہال کی طرف لپکا جا رہا تھا۔ اس کو بڑے تپاک سے خدا حافظ کہا۔ گویا وہ خود میدانِ جنگ پر جا رہی ہے اور دنیا کا انجام ہونے والا ہے۔ پھر وہ صحن کی دیوار کے دروازے کی طرف جانے لگی جو جیزس لین کی طرف کھلتا تھا۔ راستے میں اسے کیٹ مل گئی۔ "میں تم کو ڈھونڈھ ہی رہی تھی۔" اُس نے ہاتھ بڑھایا۔ "میں کل کینیڈا جا رہی ہوں۔ اب کب ملیں گے؟"

"پتہ نہیں کیٹ۔" چمپا نے اس لایعنی سوال سے بچنے کی کوشش کی۔ "سرل کو دیکھا ہے؟ میں اس کو بھی خدا حافظ کہہ لوں۔" اس نے بڑی بے تعلقی کا انداز پیدا کر کے کیٹ سے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ تو سینئر کومن روم میں بیٹھا ہے۔" کیٹ نے جواب دیا۔ "اس کے مزے ہیں کہیں بھی نہیں جا رہا۔ مزے سے اپنے وطن میں رہے گا۔ ڈاکٹریٹ ختم کرے گا اور تم کو معلوم ہے۔ مجھے کتنی خوفناک جگہ جا کر رہنا ہے۔ نیوگنی ——— اچھا ڈارلنگ ——— خدا حافظ۔"

چمپا کچھ دُور تک اس کے ساتھ چلی۔ اور اس کو پھاٹک تک پہنچا کر سینئر کومن روم کی طرف مڑ گئی۔

سارے کالج پر مکمل سناٹا طاری تھا جسے صرف برستی بارش کی آواز مخل کر رہی تھی اور پتوں کی سرسراہٹ۔ سرل ایشلے کومن روم میں دریچے کے پاس چمڑے کے صوفے پر بیٹھا وہ معمہ دیکھ رہا تھا جو کنگز لے مارٹن ہر ہفتے اپنی انتہائی انٹلکچوئیل ریڈنگ پبلک سے حل کرواتے ہیں۔ چمپا کمرے میں آ گئی۔ تب بھی وہ معمہ حل کرتا رہا۔ پھر جب چمپا ایک کرسی پر بیٹھ گئی تو اُس نے سر اٹھا کر ایک حل کے متعلق اس کی رائے پوچھی۔ چمپا نے غور کر کے اس کا جواب بتایا۔

"ٹھیک ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تم غلطی پر نہ ہو ——" اُس نے خالص برطانوی انداز میں کہا۔

وہ چونکی۔ اس نے دفعتاً دیکھا کہ اس کے سامنے صوفے پر سنہرے بالوں والا، ایک برطانوی لارڈ کا لڑکا تھا۔ قدامت پسند، مغرور، خاموش طبع۔ باوقار۔ اس لڑکے کے ساتھ اُس نے چند سال اس یونیورسٹی میں بتائے تھے اور ہم جماعت ہونے کے ناطے اب اسے خدا حافظ کہنے آئی تھی۔ یہ لڑکا وہ نہیں تھا جس نے اس کے ساتھ گھنٹوں دیوانی بحثیں کی تھیں رہبر کی سی رانی کی تھی۔ کھیتوں میں دوڑتے ہوئے گیت گائے تھے جو چمپا کے ذہن اور روح کے بھنور میں بلا خوف و خطر کودنے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ جس نے صبح بارش میں بھیگتے ہوئے دیوانوں کی طرح اس سے شادی کی درخواست کی تھی۔ یہ لڑکا تو لارڈ بارن فیلڈ کا چھوٹا بیٹا سرل ڈیرک ایڈون ہاورڈ ایشلے تھا جس نے معمہ حل کرتے ہوئے بڑی تمکنت سے اس سے پوچھا "ہم اب تک گئی نہیں۔ کون سی ٹرین سے جا رہی ہو۔"

"ساڑھے چھ کی ٹرین سے ۔" چمپا نے گھڑی دیکھ کر جواب دیا۔ "تم کب لندن آؤ گے ۔"

"جب بھی آؤں لیکن جہاں تک میرا خیال ہے تم سے ملاقات نہ ہو سکے گی ۔ میں تم سے عمر بھر نہیں ملنا چاہتا ۔"

وہ خاموش رہی ۔ پانی کی شفاف پھوار دریچے پر ٹکرایا کی ۔ ہوا کا بھینا بھینا پن کمرے میں رچ گیا ۔

یکلخت چمپا نے نہایت بشاشت سے باتیں شروع کر دیں ۔ یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد کے جو پروگرام گو وہ کے افراد نے بنائے تھے ۔ ان کا ذکر کیا " میں تو ابھی قانون پڑھوں گی ۔"

"مبارک ہو ۔ اس کے بعد کیا کرو گی ۔"

"علم نجوم تو مجھے آتا نہیں ۔ کہ بتا دوں کہ ۶۲ء میں کیا کروں گی اور ۶۵ء میں میرا کیا ارادہ ہے ۔" اُس نے خوشدلی کا لہجہ برقرار رکھنے کی سعی کرتے ہوئے کہا ۔

"یہ بھی ٹھیک ہے ۔" وہ رسالے پر جھکا رہا ۔

"تم البتہ ڈاکٹریٹ لینے کے بعد یہاں کے استاد بن جاؤ گے ۔ تنقید پر موٹی موٹی کتابیں لکھو گے ۔ ٹی وی کے برین ٹرسٹ کی پینل پر بیٹھو گے ۔ دُنیا عش عش کرے گی"

"ہو سکتا ہے ۔"

"یا تم ڈاکٹریٹ سے بور ہو کر بنک آف انگلینڈ میں نوکری کر لو ۔"

"یہ بھی ممکن ہے ۔"

"اچھا اب چلنا چاہیئے ۔" چمپا نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا ۔

"اگر میں تمھاری جگہ پر ہوں تو مجھے زیادہ تاخیر نہ کرنا چاہیئے ۔ ٹرین کا وقت قریب ہے ۔" سرل نے کہا ۔ اور کھڑا ہو گیا ۔ گویا اب تشریف لے جائیے بیگم صاحبہ ۔

۸۵

چمپا نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کمرے پر آخری مرتبہ نظر ڈالی۔ ایسی جذباتی حرکتیں کرتے ہوئے وہ خود کو پکڑ لیتی تو بعد میں بہت نادم ہوتی تھی۔ دروازے تک آ کر اس نے سیرل کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ دروازہ بہت نیچا تھا۔ کئی سو سال سے اس پر عشق پیچاں کی گھنی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ کئی سو سال سے ان گنت طالب علم اسی طرح اس دروازے سے خدا حافظ کہہ کر نکلے تھے اور باہر کی دنیا میں دھکیل دیے گئے تھے۔

سیرل نے جھک کر اس کو جانے کا راستہ دیا اور ہاتھ بڑھائے رکھا۔ "اتنے عرصے —" اس نے ایک ایک لفظ الگ الگ صاف اور گہری آواز میں ادا کیا۔ "تم کو جان کر اور تم سے واقفیت حاصل کر کے مجھے بے حد مسرت ہوئی —— خدا حافظ —"

وہ عشق پیچاں کی بیل کے نیچے سے جھک کر باہر نکل آئی۔

"تم مجھے پھاٹک تک چھوڑنے نہیں آؤ گے —؟" اس نے یک لخت اپنی اٹل، ازلی اور ابدی تنہائی کو محسوس کرتے ہوئے دہشت زدہ ہو کر کہا۔

"نہیں —" سیرل نے جواب دیا۔ "مجھے معمہ حل کرنا ہے —— اور خدا کرے میری تم سے دوبارہ ملاقات کبھی نہ ہو —"

وہ واپس اندر چلا گیا۔

چمپا کواڈرینگل کے موڑ پر پہنچ کر ٹھٹکی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ دریچے کے اندر رسالے پر جھکا معمے میں مصروف تھا۔ چمپا نے پھاٹک کھولا اور سنسان سڑک پر آ گئی۔

سیرل نے بالکل صحیح کہا تھا۔ اس روز کے بعد چمپا احمد کی سیرل ایشلے سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔

۸۵

بس مڈہرسٹ کی طرف جانے والی سڑک پر سے گزر رہی تھی۔ ہیزل میئر کے جنگل پر شام کا اندھیرا چھا گیا تھا۔ سڑک کے لیمپ لطیف سے دھندلکے میں ٹمٹما رہے تھے۔ چاروں اور اونچے درخت کھڑے تھے۔ انسانوں کی قسمتوں کے پاسبانوں کی مانند، خاموش اور سب کچھ دیکھتے ہوئے۔

پھر کئی گھنٹے کا سفر طے کر کے بس مڈہرسٹ کی طرف مڑی۔ چڑھائی پر دور سے سینی ٹوریم کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ جیسے اندھیرے میں روشنی کا مینار ہو۔ یا کسی ان دیکھے اسکاؤٹ نے کسی خطرناک پہاڑ پر سگنل کے لیے الاؤ روشن کر دیا ہو۔ دور سے تاریکی میں روشنیاں اس طرح جھلملا رہی تھیں جیسے زندگی روشن ہوتی ہے اور بجھتی ہے، روشن ہوتی ہے، اور بجھتی ہے۔

گوتم نیلمبر بس سے اتر کر سینی ٹوریم کی طویل سڑک پر چڑھنے لگا۔ اندھیرے کے جنگل میں سے گزرتا ہوا جگمگاتی عمارت کی سیڑھیوں پر پہنچا۔ شفاف گیلریاں عبور کرتا نرملا کے کمرے میں داخل ہوا۔

نرملا اس کو دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھی۔ اس کے آنے سے پہلے وہ دیوار کی طرف منہ کیے لیٹی تھی۔ اور جانے کیا سوچ رہی تھی۔

"بی بی —" گوتم کی آواز یکایک اس کے حلق میں رندھ گئی۔ باہر کی شور مچاتی، خود غرض دکھی دنیا سے علیحدہ وہ اتنے سکون سے کا ہے کے انتظار میں مصروف تھی۔

اس کو دیکھتے ہی وہ اٹھ بیٹھی۔ جلدی جلدی انگلیوں سے اس نے بال درست کیے اور دل میں سخت جھنجھلائی کہ کوئی آئینہ قریب نہیں جس میں وہ جلدی سے اپنا چہرہ دیکھ لیتی۔

"اوہ۔ تم تو بے حد صحت مند نظر آ رہی ہو۔ بالکل ہُر خا ہُر خ فرخ آبادی" — عیادت کرنے والوں کی طرح یہ بشاش انداز اختیار کرتے ہوئے گوتم نے دل میں خود کو

گالیاں دیں۔

"کیوں گپ مارتے ہو۔ ذرا میرا ٹمپریچر چارٹ دیکھو تو پتہ چلے گا بچہ جی کو ۔۔ آج بھی میرا بخار ایک سو ایک تھا۔ اب تو مہینوں سے چلا آ رہا ہے۔" اس نے گویا بڑے فخر سے کہا۔

گوتم ڈوبتے دل سے اس کے قریب بیٹھ گیا۔ مگر وہ خود بہت خوش نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب وہ اس سے حسبِ معمول لندن کے تازہ ترین اسکنڈلز سنانے کی فرمائش کرے گی۔ دوستوں کے جمِ غفیر کی فرداً فرداً خیریت دریافت کرے گی۔ بات بات میں جرح کرے گی۔

نرملا تو جس کا میں نے کبھی نوٹس نہ لیا تھا۔ اب تو میری روح میں شامل ہے۔

مگر وہ دو لڑکیوں کو بیک وقت کس طرح چاہ سکتا ہے۔ یہ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ چمپا، ۔۔ اور یہ لڑکی ۔۔ جس میں چمپا والی کوئی خطرناک خصوصیات موجود نہیں۔ سیدھی سادی، خوش خلق، معصوم لڑکی۔

چمپا جو "وومن آف دی ورلڈ" بن چکی تھی۔ ہمیشہ سے مردوں کو اپنی خطرناک کشش سے رجھاتی آئی تھی۔ تجربہ کار تھی اور زمانے کی اونچ نیچ دیکھے ہوئے، مگر اس کے باوجود بے بس تھی اور اس کی توجہ کی منتظر ۔۔ نرملا تھی جو بسترِ مرگ پر پڑی تھی۔ گھریلو، ناتجربہ کار۔ اس کی توجہ کی منتظر۔ وہ چمپا کو یکسر بھول جائے گا۔ کس قدر کوشش کے بعد پچھلے پانچ برسوں میں اس نے چمپا کو اپنے خیالوں سے دیس نکالا دے دیا تھا۔ ایک ملک اور دوستوں کے ایک حلقے میں رہنے کے باوجود اس نے بڑی کامیابی سے چمپا سے ملنے سے احتراز کیا تھا۔ مگر اب چمپا کو پکار سے مقابلہ کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ یہ پکار میڈرڈ اور روم اور وی آنا میں بجتے ہوئے آرکیسٹرا میں سنائی دیتی۔ بارش کی پھواروں میں، بازاروں اور طعام خانوں کی چہل پہل میں، اطلانتک کی لہروں میں نیو یارک کے شور و شغف میں، ہر جگہ یہ پکار اس کا پیچھا کرتی آ رہی تھی۔ آوازوں کے ظلم سے وہ عاجز آ گیا تھا۔ تمام سناٹا اس کے مقدر میں نہ تھا۔ چمپا آواز تھی۔ نرملا سناٹا۔ چمپا نے اس سے طرح طرح کی

باتیں کی تھیں لکھنؤ کے بادشاہ باغ کی سڑکوں پر ٹہلتے ہوئے، کرسی نگر کے کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر سے گزرتے، گلفشاں، اور سنگھاڑے والی کوٹھی اور پروفیسر بنرجی کے گھر اور کیلاش ہوسٹل کے ڈرائینگ روم میں بیٹھے ہوئے، پکنکوں میں اودھم مچاتے ہوئے۔ اسے وہ سب باتیں یاد تھیں۔ وہ سب شامیں، دوپہریں، لمحات۔ یہ سب سُروں کا ایک تسلسل قائم تھا۔ اٹل اور مضبوط۔ کیونکہ جب گیت ختم ہو جائے۔ تب بھی سُر فضا میں موجود رہتا ہے۔ نرملا خاموش تھی۔ گوتمی خاموش تھی۔ برسات کی دوپہر کا سکون، جب بارش ہو کر کھلی ہو۔ کہر آلود سرسوں کے کھیتوں کا سناٹا۔ نرملا نے اس سے کبھی شخصی باتیں نہ کی تھیں۔ چمپا کے ہر لفظ ہر انداز کے ذریعے دوسرے انسان سے ایک غیر مرئی Mystic رشتہ قائم ہو جاتا تھا۔

اسے یاد آیا۔ مدتیں گزریں۔ جب وہ پہلی بار لکھنؤ گیا تھا۔ اس نے سنگھاڑے والی کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھ کر اپنی اس وقت کی محبوبہ شانتا نیلمبر کو خط میں لکھا تھا کہ گو مجھے افیشیل طور پر پڑھنے کے لئے یہاں بلایا گیا ہے مگر میرے ہونے والی منگیتر نرمل رانی کو اپنی الٹی سیدھی بحثوں ہی سے فرصت نہیں جو وہ میری طرف توجہ کریں —— ہاں۔ نرملا میں بڑی شان اور تمکنت تھی۔ اس میں خود سپردگی کا انداز کبھی نہ آیا۔ وہ علیحدہ رہی تھی۔ غیر شخصی اور خاموش۔ دیبی کی طرح بلند اور اتم —— دیبی کی طرح سکون بخشنے والی۔ اب مجھے تھوڑا سا سکون بخش دے —— اس نے نرملا پر جھک کر دل میں کہا۔ اور اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

"گوتم۔"

"ہاں — بی بی —"

"سریکھا کا نیا فلیٹ کیسا ہے —"

اُس نے تفصیل سے سریکھا کے مکان کا جغرافیہ سمجھایا۔ "اب اچھی ہو جاؤ تو آ کر خود ہی دیکھ لینا۔"

"ہاں — بالکل —" نرملا نے بڑی گرمجوشی سے جواب دیا۔

"آج کل ایک نئے بزرگ آئے ہوئے ہیں طلعیان بھاگل پوری۔"

"ہائے کتنے مزے کا نام ہے۔ کریک ہیں؟"

"بہت سخت۔"

"چندرا ابھی ہے؟"

"ہاں ہاں۔"

"تمہارے نئے نئے دوستوں کا ذکر سُن کر اس قدر دل چاہتا ہے کہ ان سے ملوں خصوصاً رمیش سنگوی سے۔"

"ہاں۔ رمیش سنگوی بالکل آفت کا پرکالہ ہے۔" گوتم نے مزید بے معنی انداز میں کہا۔

"اب رات زیادہ آگئی ہے گوتم ماسٹر۔" نرملا نے حسبِ عادت کمال اور ہری شنکر کے لہجے میں اس سے کہا۔

"ہاں۔" وہ کرسی پر سے اٹھا۔

"ارے رے رے ایک بات تو سنو۔" دفعتاً نرملا نے بشاشت سے کہا۔ "اتنی زبردست خبر پوچھنا تو بھول ہی گئی۔"

"کیا۔" گوتم نے آہستہ سے پوچھا

"کل طلعت بتا رہی تھی کہ چمپا باجی اپنا فائنل امتحان دینے کے بعد کیمبرج سے لندن آگئی ہیں۔ تم کو معلوم ہے۔؟"

"نہیں۔" گوتم نے کہا اور اپنے آپ کو دل میں بھرکی گالیاں دیں

"اچھا۔" نرملا نے سادگی سے جواب دیا۔ "میرا خیال تھا شاید طلعت نے بتایا ہو۔ تم ان سے مل لو ضرور۔ بے چاری سے۔" اس نے اپنا سر تکیے پر رکھ دیا۔

"مجھے آج کل اتنی فرصت کہاں ہے نرمل کہ میں لوگوں سے سوشل ملاقاتیں کرتا پھروں۔ ایچ۔سی[۱] رات کے دس دس بجے تک کام کرواتے ہیں۔" اُس نے نظریں بچاتے

[۱] ہائی کمشنر

ہوئے جلدی سے کہا "اچھا بی بی۔ خدا حافظ۔۔ " وہ تیزی سے دروازے سے باہر نکل گیا۔ گویا نرملا کے سامنے سے جلد از جلد بھاگ جانا چاہتا ہو۔

نرملا جس کا چھٹا حس بیدار ہو چکا تھا، سمجھ گئی کہ گوتم نے اس سے جھوٹ بولا ہے اس کو چمپا باجی کی آمد کی اطلاع ہے اور اس کے چہرے کی بدلتی رنگت کو دیکھ کر نرملا کو یہ بھی یقین ہو گیا کہ وہ چمپا باجی سے ضرور ملے گا۔

نرملا نے آہستہ سے بیڈ سوئچ دبا کر روشنی بجھائی اور پھر دیوار کی طرف منہ کر کے لیٹ گئی۔

۸۶

گوتم نے نرملا سے جھوٹ بولا تھا۔ اس روز، مڈہرسٹ آنے سے کچھ دیر قبل اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ اُسے بڑی جھنجلاہٹ ہو رہی تھی۔ اس کی کار کوئی دوست لے گیا تھا اور وکٹوریہ اسٹیشن جا کر وہاں سے مڈہرسٹ کے لئے گرین لائن کی بس پکڑنا تھی۔ خواہ مخواہ کی دیر ہوئے جا رہی تھی۔ اور اب یہ فون آگیا تھا۔

اس نے ریسیور اٹھایا۔

آواز۔۔ اُس کے کانوں میں پہنچی۔

"گوتم۔۔ ہلو۔۔ ارے بھئی گوتم۔۔"

وہ خاموش رہا۔

"گوتم نیلمبر۔۔ دوسرے سرے پر چمپا نے زور سے کہا "کیا بات ہے۔ میری آواز سُن رہے ہو۔"

"سُن رہا ہوں۔"

"فون خراب ہے کیا؟"

"نہیں تو۔"

"شرم کرو۔" چمپا بڑی نارمل آواز میں کہہ رہی تھی "ڈوب مرو جی۔۔ حد ہے۔ میں اتنے

برسوں سے یہاں ہوں اور تم کو ایک روز بھی توفیق نہ ہوئی کہ مجھ سے مل لیتے ۔ کیا میں کھا جاتی تم کو ۔" پھر وہ ہنسی۔

وہ چپکا رہا۔

اتنا بڑا ڈپلومیٹ اور حاضر جواب بذلہ سنج آدمی ۔ اور اس سے مطلق کوئی جواب نہ بن پڑا۔

اور چمپا نے کہا تھا۔" میں کیمبرج سے آگئی ہوں

اور جون کارٹر کے یہاں ٹھہری ہوں ۔ آؤ کسی روز ملنے۔ تعلیم کا زمانہ بالآخر ختم ہو چکا اب مجھے فرصت ہی فرصت ہے ۔"

" ہاں چمپا ۔۔ میں ضرور آؤں گا۔" گوتم نے ہڑبڑاتے ہوئے جواب دیا تھا ۔۔ " دراصل ۔۔ وہ تم جانتی ہو لندن کی زندگی کس قدر ہنگامہ خیز ہے اور پھر فارن سروس کی مصروفیات ۔ یہ کوئی لکھنؤ یونیورسٹی کا زمانہ تھوڑا ہی ہے کہ گھنٹوں بیٹھے گپ کر رہے ہیں ۔۔ اور پھر میرا کام بھی ایسا ہے کہ مستقل دورے پر رہتا ہوں ۔ آج ہائی کمشنر کے ساتھ یہاں جا رہا ہوں ۔۔ کل وہاں جا رہا ہوں ۔ جب کبھی کشمیر کا کیس یو۔ این ۔ او میں جاتا ہے تو کرشنا مینن کے ساتھ پندرہ پندرہ چکر نیو یارک کے لگانے پڑتے ہیں ۔۔ ویسے میں تمہاری خیریت دوستوں سے برابر دریافت کرتا رہا ۔"

اُس نے کامیابی سے بات ختم کی اور بے انتہا نروس ہو کر سگریٹ جلایا۔

اسے کیا معلوم تھا کہ چمپا دوسرے سرے پر اس کی آواز سُن کر اس قدر مسرور ہے جیسے اسے ساری دُنیا کی دولت مل گئی ہو ۔۔ جیسے اسے راج سنگھاسن پر بٹھلا دیا گیا ہو ۔

مڈہرسٹ سے واپسی میں رات کے بارہ بج گئے ۔ اپنے فلیٹ میں پہنچ کر اس نے ڈرتے ڈرتے فون اٹھایا اور جون کارٹر کا نمبر ڈائل کیا۔

" ہلو۔ کون ہے ؟" ادھر سے نِیل کی سوتی سوتی آواز آئی ۔

"مس احمد ہیں؟"

"نہیں۔"

"کہاں چلی گئیں۔" اُس نے بوکھلا کر پوچھا

"آپ کون صاحب ہیں۔"

"نیلمبر۔"

"اوہو۔ ہلو مسٹر نیلمبر۔ مس احمد نے شام کو کئی بار آپ کو فون کیا تھا مگر آپ شاید باہر چلے گئے تھے۔ اس وقت تو وہ جوتن کے ساتھ کہیں گئی ہوئی ہیں۔"

"اوہ۔"

"آپ نے گیننگ کے باقی افراد کے یہاں فون کر لیا۔ کوئی ضروری بات ہے؟" گوتم کی آواز کی بسراسمیگی محسوس کر کے نیل نے کہا۔ "فیروز، سریکھا، زرینہ، کملا، طلعت، ان سب کے یہاں فون کر دیکھئے۔ شاید مل جائیں۔"

"بہت بہت شکریہ نیل۔ میرے خیال میں اب رات بہت آگئی ہے۔ کل دیکھا جائے گا۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ گڈ نائٹ۔" اس کو اپنی حماقت کا احساس ہوا اُس نے ریسیور رکھ دیا اور سگریٹ جلا کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

۸۷

اُس رات ٹیمز کی ایک لانچ پر بہت سی لڑکیوں اور لڑکوں نے ایک پارٹی کی تھی۔ جوتن کے ساتھ چمپا وہاں گئی اور رات گئے تک وہ لوگ عرشے پر ناچتے رہے۔ کشتی میں چمپا کو بہت سے اجنبی چہرے نظر آئے۔ کالے۔ گورے۔ انگریز۔ فرانسیسی لندن مجلس کے چند لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ ریلنگ پر جھکے وہ لوگ باتیں کر رہے تھے۔

"ارے یہ پروگریسو ہو گئیں۔ جوتن کار ڈے کے ساتھ گھومتی ہیں۔ سنا ہے پہلے تو بڑی سخت لیگر تھیں انڈیا میں۔" کسی نے چپکے سے اپنے ساتھی کے کان میں کہا۔

"ممکن ہے پاکستان کی جاسوسی کرتی ہوں۔ کیا بھروسہ۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے اور پھر ہندوستانی مسلمان — ان سے زیادہ دوغلا اور خطرناک کون ہوگا۔" ایک مراٹھی ڈاکٹر نے کہا۔

"اور سُنا ہے۔" پہلے نے کہا۔ "رضا جو کمال اور طلعت کا کزن ہے۔ اس سے شادی کرنا چاہتی تھیں۔ اُس نے گھاس نہیں ڈالی — وہ آج کل کیمبرج والی روشن کے چکر میں ہے کیونکہ روشن کا باپ کسی منسٹری کا سکرٹری ہے —"

"روشن کو بھی رضا نے گھاس نہیں ڈالی — کیونکہ اس بے چاری کے باپ کا انتقال ہوگیا ہے۔"

"باپ کا انتقال اصل وجہ نہیں — دراصل اس کا جی بھر گیا۔ بور ہوگیا بیچارہ۔"

"میں یہ نقطۂ نظر خوب سمجھ سکتا ہوں۔ لڑکیوں کے ساتھ یہ کیا مصیبت ہے کہ جہاں ذرا سی دلچسپی ان میں لی اور وہ فوراً شادی پر تیار — میں رضا کے نقطۂ نظر کو خوب سمجھتا ہوں بھائیو — کیونکہ کل میں ایلن سے شادی کرنے جارہا ہوں۔"

فوراً ہلڑ شروع ہوگیا۔ "یہ آندرے کی آزادی کی آخری رات ہے۔ اس رات کو اچھی طرح منالو — بھائیو —" کمال نے اسٹول پر چڑھ کر رقت انگیز آواز میں کہا۔

وہ سب بوٹ سے اتر کر شور مچاتے قریب کے ایک پب کی طرف روانہ ہوگئے۔

عرشے پر صرف لڑکیاں رہ گئیں اور وہ نوجوان جس نے سب سے پہلے یہ تذکرہ چھیڑا تھا۔ سیڑھیاں اُترتے ہوئے کمال سے بولا —

"عامر رضا بڑا سمجھدار آدمی ہے۔ ہم کو چاہیئے اس سے ٹریننگ لیں۔ آخر یہ لڑکیوں سے شادی کرنے سے صاف کیسے بچ سکتا ہے۔"

"مگر دیکھ لینا آخر میں کرکری کھائے گا۔"

"ابھی بعد کی بات بعد میں دیکھی جائے گی۔ فی الحال تو عیش کر رہا ہے۔"

"ہاں بھائی۔"

"اور یار یہ کزن شاہ رُخ سلطانہ کون ہیں۔ تمہاری رشتے دار ہیں؟"
"آج تک تو میں نے ان کا نام سُنا نہیں تھا۔ شاید پاکستان میں بھیا صاحب کی کوئی عزیز پیدا ہو گئی ہوں۔"
"جرمن کزن ہوتے آئے تھے۔ یہ پاکستانی کزن کی قسم آج ہی معلوم ہوئی۔"
"دراصل یہ نوجوان خاتون کسی وزیر کی بھتیجی ہیں۔"
"اوہ آئی سی۔"
آوازیں ڈوبتی چلی گئیں۔ کشتی آگے بڑھ گئی۔ چمپا اتر کر کنارے پر واپس آ گئی۔ اور قلوپطرہ کی سوئی کے نیچے آن کر بیٹھ گئی۔ سامنے دریا بہہ رہا تھا۔
اسے معلوم نہیں تھا کہ چند روز قبل عامر رضا رات بھر یہیں اسی جگہ پر بیٹھے رہے تھے۔ اُس رات بھی پورنماشی کا چاند دریا کی لہروں پر بہہ رہا تھا۔ اور عامر رضا کو بے حد ڈر لگا تھا۔ اپنے آپ سے۔ دُنیا کے حُسن سے۔ مستقبل سے۔ ان کے سامنے کوئی خطرات نہیں تھے۔ کوئی مسائل ـــ صرف ان کے ذاتی غرور کا مسئلہ تھا۔ مگر اس کا تعلق تھیالوجی سے تھا۔ اقتصادیات سے نہیں۔ قلوپطرہ کی سوئی کے سائے میں بیٹھے بیٹھے ان کو ان لڑکوں کا خیال آیا تھا۔ جو تلاشِ معاش میں سرگرداں تھے اور ان لڑکیوں کا جن کو عامر رضا نے چھوڑ دیا۔ روپیہ اصل چیز ہے۔ روپیہ اور عزت۔ اور ایک کوٹھی۔ اپنی ذاتی۔ ساٹھ ہزار کی مالیت کی۔ ہاؤسنگ سوسائٹی ڈرگ روڈ کراچی میں۔ ایک امریکن کار۔ فریجڈیر۔ ریڈیوگرام زندگی کی اصل حقیقت، اتم حقیقت صرف یہ چیزیں ہیں۔ زندہ باد زندگی۔ مجھے تجھ سے کوئی شکایت نہیں۔ صبح ہوتے سیڑھیوں سے اُٹھ کر وہ کار کی طرف چلے گئے تھے۔ دوسرے روز وہ چھٹی لے کر شادی کرنے لکھنؤ جا رہے تھے۔

۸۸

"میں ایک کتاب لکھنے والا ہوں۔ جس کا نام ہوگا پورٹریٹ آف دی آرٹسٹ ایز اے ڈون ژوان ـــ" کمال نے مُنہ لٹکا کر کہا۔

"کیوں کیا ہوا —" طلعت نے ہمدردی سے پوچھا۔

"بس یونہی — اب جیمز جوائس اور ڈی لن طامس کے بعد —"

"کل ڈی لن طامس نے پل کے یہاں بڑے مزے کی باتیں کیں۔ ترنگ میں تھے مولانا۔" شنکر نے مڑ کر کہا۔

"اجی وہ تو تھے۔ آپ کس ترنگ میں ہیں آج کل —" گلشن آہوجہ نے کمال سے پوچھا "یہ کیا پڑھ رہے ہو —"

"کچھ نہیں۔ یار خط آیا ہے گھر سے — یعنی لکھنؤ سے —"

"کیا خبریں ہیں —" طلعت نے پوچھا۔

وہ سب سریکھا کے وسیع ڈرائینگ روم میں فرش پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھے تھے۔ جس کا بڑا دروازہ باغ میں کھلتا تھا۔ بہار کا روشن دن تھا۔ سریکھا دبلیز کے پاس بیٹھی مشین پر لہنگے کی آڑی گوٹ سی رہی تھی۔ طلعت اور فیروز باورچی خانے میں کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ ہری شنکر بھی ان دنوں وہیں موجود تھا جو واشنگٹن سے آیا ہوا تھا اور قاہرہ جا رہا تھا۔ "یہ ہری شنکر اور گوتم کے مزے ہیں — بالکل ابن بطوطہ بنے ہوئے ہیں — آج کل۔ صبح صبح گوتم کا فون آیا تھا کہ پھر ماسکو جا رہا ہے۔" گلشن نے اظہار خیال کیا۔

"گوتم تو ہیون سانگ بھی ہے —" کمال نے کہا۔ "اکثر چین سے آیا کرتا ہے۔"

باغ میں چندر ماتھر نے ایک اور گیت شروع کر دیا۔ ان سب کی پرانی دوست چندرا جو نیویارک سے دلی جاتے ہوئے زرینہ کے یہاں لندن میں ٹھہر گئی تھی۔ بہت اچھا گاتی تھی۔ ڈرائینگ روم کے دوسرے سرے پر طغیان صاحب سریکھا کے شوہر گلشن آہوجہ کے ساتھ مصروف گفتگو تھے۔

بڑا خوشگوار اور پرسکون اتوار کا دن تھا۔ باغوں میں پھولوں کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ صبح صبح جب چمپا جون کارٹر کے گھر سے سریکھا کے یہاں آنے کے لئے بس میں سوار ہوئی تھی۔ تو بس کا بوڑھا کنڈکٹر اسے دیکھ کر خوشدلی سے مسکرایا تھا اور اس نے اپنی ٹوپی چھوتے ہوئے کہا تھا۔ مائی ڈیر، تم بے حد خوبصورت لگ رہی ہو — تمہارا بوائے فرینڈ تمہیں دیکھ کر

بہت مسرور ہوگا۔ خوب خوشی سے اتوار مناؤ — دُنیا بڑی مہربان تھی اور خوشگوار۔ کون کہتا ہے کہ دُنیا غم خانہ ہے اور فلانا ہے اور ڈھماکا نہ ہے۔ دُنیا تو بے حد آرام دہ حسین جگہ ہے۔

وہ بے حد خوش تھی۔ کل اُس نے گوتم سے فون پر باتیں کی تھیں۔ اتنے برسوں بعد آج اس کی آواز سُنی تھی۔

وہ سرلیکھا کے یہاں پہنچی۔ یہاں محفل جمی تھی۔ وہ بے حد مسرّت کے ساتھ سب سے باتیں کرتی رہی۔

"رات کی پارٹی میں بوٹ پر بڑا چنڈو خانہ رہا" کمال نے اس سے کہا۔ "آپ کے بجے تک گھر پہنچ گئی تھیں؟"

"ہم جب لوٹے تو ٹرینیں بند ہو چکی تھیں۔ اسٹرینڈ سے گھر تک پیدل آئے۔"

"کیا خبریں ہیں بھئی۔ کس کا خط ہے۔" طلعت نے باورچی خانے میں سے سر نکال کر دوبارہ پوچھا۔

"اپّی کا —" کمال نے جواب دیا۔

"میاں ہری شنکر — اے بھائی ہری شنکر ہوت۔" طلعت نے باورچی خانے میں سے آواز دی۔

ہری شنکر جو باغ کے دروازے میں کھڑا تھا۔ پلٹ کر اندر آیا۔ "لو یہ گرم گرم پوریاں۔ چمپا باجی کدھر ہیں۔ یہ پلیٹ ان کو دے آؤ —"

وہی گلستاں کا سخت گھریلو ماحول یہاں بھی موجود تھا۔ گھر۔ جو اُسے کبھی میسّر نہیں ہوگا۔ چمپا کو ایک دریچے کی نشست میں بیٹھے بیٹھے ایک جھرجھری سی آئی۔

ہری شنکر نے پلیٹ ہاتھ میں لے کر کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ چمپا دوسرے سرے پر دریچے میں بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ سب یاد آتا تھا۔ نگار خانوں کی زندگی۔ فرن کے پتے۔ دریچے میں جھانکتا ہوا پیرس کا مدھم سورج۔ بوہیمیا۔ برآمدے میں رکھی ہوئی جدید وضع کی آرام کرسیاں۔ وھاری دار سن شیڈ۔ ایک کاہل الوجود ذہنی زندگی جس میں فلسفے تھے

اور نیا فرانسیسی ادب۔ بڑے سائز کے سمفنی کے ریکارڈ۔ سالزبرگ کے موسیقی کے تہوار۔ کیمبرج کے کواڈرینگل۔ اور جانے کیا کیا۔ اسی قسم کی چیزیں۔ جن کی ایک علیحدہ دُنیا نیویارک کے گرینج ویلج۔ بائیں ساحل اور یہاں لندن کے چیلسی اور سینٹ جانز ووڈ میں آباد تھی۔ اس دُنیا کے باسیوں کے یہاں بڑے گہرے جذباتی تجربے تھے اور ادراک اور ماورائی قسم کی گفتگو۔ چمپا باجی تم تو بہت جلد ایک دم دوسرے سرے پر پہنچ گئیں پتہ نہیں۔ اب تم کھل کر ہنستی بھی ہو یا نہیں۔ اندرونی توازن تم نے قائم رکھا یا نہیں۔ جس کی تم کو ہمیشہ بڑی تلاش تھی۔ اب سرکھیا، طلعت، فیروزان لڑکیوں ہی کو دیکھ لو کیسی سمجھ دار ہیں۔ ایک سے ایک۔ لڑکیوں کا معاملہ دراصل بڑا بے ڈھب ہوتا ہے۔ ایک دفعہ میں نیا پار لگ گئی تو لگ گئی ورنہ پڑا ہوا۔ ہم تو صاحب یہ جانتے ہیں — "چمپا باجی، لو پوریاں کھاؤ —" اُس نے بآوازِ بلند کہا۔

چمپا کے قریب جا کر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ جس طرح سنگھاڑے والی کوٹھی کے لان پر وہ اس کی کرسی کے قریب بیٹھا کرتا تھا۔

"ان سب کو کیا ہو گیا۔ سب چُپ ہو گئے ایک دم —" طغیان صاحب نے باتیں کرتے کرتے رُک کر گلشن سے سرگوشی میں پوچھا۔

"ان سب پر خیالات سوار ہیں —" گلشن نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"بڑا پُر مدت سمے ہے —" طغیان صاحب نے کہا۔ "سرکھیا دیوی کپڑے سینا بھی جانتی ہیں مجھے گیان نہ تھا۔ کمال جی پوریاں کھا رہے ہیں۔ چندریا دیوی پھلواری میں مرغیاں چراتی ہیں۔ طلعت جی پھلکیاں تل رہی ہیں۔ یہ تو بالکل گرو دیو ٹیگور کے ناولوں جیسا ماحول ہے۔ پُرسکون۔ شاعرانہ۔ مدھر۔"

"اجی دیکھے تھے ٹیگور کے ناول۔" گلشن نے چڑ کر کہا۔ "طلعت تم نے ساری پوریاں جلا دیں اُٹھا کر۔ چاء بھجواؤ۔"

طغیان صاحب پھر مراقبے میں چلے گئے۔

"ہلو۔ ہری شنکر۔" چمپا نے اخبار پڑھتے پڑھتے سر اٹھا کر کہا۔ "کیا بات ہے۔"

اب پوچھتی ہیں۔ کیا بات ہے۔ قسم خدا کی ان کی دھاندلی کی حد نہیں۔" کچھ بھی تو نہیں چمپا باجی — چپاتی بنیں گی۔"

"بنا دو۔"

اُس نے پیالی اُٹھائی۔ چمچہ نیچے گر گیا۔

ہم ایک دوسرے کی زندگیوں میں گھُسے زندہ ہیں۔ اور مستقل ایک دوسرے کو مارتے چلاتے رہتے ہیں۔ چمپا باجی —" ہری شنکر نے کہا "تم ہم سب میں گریٹ ہو۔ کیونکہ تم میں محبت کی اتھاہ بے پناہ اہلیت موجود ہے۔" اُس نے دفعتاً آہستہ سے کہا۔ "سنو — یو۔ این۔ میں ایک بڑی اچھی جگہ نکلی ہے۔ انڈیا کے کوٹے میں اس کے لئے کروں کوشش تمہارے لئے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا — میں عمر بھر اسی طرح ماری ماری پھروں گی — ؟"

"اس کے علاوہ اور کرنا بھی کیا ہے تمھیں —" ہری شنکر نے کہا۔ پھر معاً اسے اپنی اس فاش غلطی کا احساس ہوا۔ اُس نے کسی چھوٹی موٹی اینٹ کے بجائے پورا پہاڑ لڑھکا دیا تھا۔ مگر یہ تو بڑی بہادر، فراخ دل آدمی ہیں۔ اس کا کیا بُرا مانیں گی "میرا مطلب ہے — اُس نے ہڑبڑا کر بات بنائی "کہ تم میں اتنی خود اعتمادی ہے۔ تم اوروں کی طرح تھوڑا ہی ہو کہ کہیں چوٹھا ہنڈیا لے کر بیٹھ جاؤ —" اُس نے باورچی خانے میں گھُسی لڑکیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ابھی میں تو کہتا ہوں کہ تم تو ایورسٹ تک مزے سے چڑھ جاؤ گی دندناتی ہوئی۔ تم بڑی گریٹ ہو چمپا باجی —" اب اس کی آواز میں رقت آگئی — اسے چمپا پر یکلخت بے حد ترس آ رہا تھا۔

وہ خاموش بیٹھی باغ کو دیکھا کی —

کمرے کے دوسرے سرے پر اب باتیں پھر زور شور سے شروع ہو چکی تھیں۔

چمپا کو یکلخت ایسا لگا جیسے خاتمہ اب بالآخر آن پہنچا۔ کمرہ بڑے زور سے ناچنے لگا۔ باغ میں گھومتی چندرما اسے قندیل کی طرح چکر کاٹتی نظر آئی۔ کمرے میں بیٹھے لوگ کٹھ پتلیوں کی طرح عجیب عجیب آوازیں نکال رہے تھے۔ طغیانی صاحب سے ایک

بہت عظیم بطخ نظر آئے جو نیچے سُروں میں قائیں قائیں کر رہی تھی۔ میں دیوانی ہو جاؤں گی۔ اُس نے آہستہ سے کہا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

ہری شنکر نے اُس کی آنکھوں میں آنسو پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔

"چمپا باجی۔" اُس نے کہا۔ "محبت کو خدارا جذباتیت میں تبدیل نہ کرو۔ توازن ضبط۔ تناسب۔ کلاسیک گریک آئیڈیلز اصل چیز ہیں۔ یعنی کہ۔"

"کیا معماروں کی سی باتیں کرتے ہو۔" چمپا کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ "میں محبت کر رہی ہوں یا کوئی عمارت کا نقشہ تیار کرنے میں مصروف ہوں۔"

"چمپا باجی۔" ہری شنکر نے اسی طرح احتجاجاً کہا۔ "تمہارے خیالات گو ٹھیک ہیں، ہمیشہ سے تھے۔ تمہارے جذبات میں واگز کا بوجھ ہے۔ پہلے بھی تھا اب زیادہ ہو گیا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ تم اپنی روح کی پیورٹی کو تباہ کئے ڈال رہی ہو۔ دس سال گزر گئے مگر تم بالکل نہ بدلیں۔"

جون اور راجیت پارٹی کی تاریخ لے کر اندر آئے اور کمال کی طرف چلے گئے۔

"ہری شنکر۔" چمپا نے جھک کر کہا۔ "مجھ پر ترس نہ کھاؤ۔ مجھے شکست کا احساس آج تک نہیں ہوا۔ میں تو یہ جاننا چاہتی ہوں کہ شکست کیسی ہوتی ہے۔"

ڈائننگ ٹیبل پر سے طغیان صاحب کی آواز بلند ہوئی "ہم سب سانے ہیں سائے۔" وہ گلشن سے کہہ رہے تھے۔

"جی ہاں درست ہے۔" گلشن نے بور ہو کر سگریٹ جلایا اور چمپا کی طرف بے دھیانی سے دیکھنے لگا۔

"کمیونسٹوں نے مارکسزم کو تباہ کر دیا۔" طغیان صاحب نے جون کارٹر پر نظر ڈال کر دوسرا موضوع شروع کر دیا۔

موصوف بڑے زبردست سوشلسٹ تھے۔ صوفی ازم ان کی سائیڈ لائن تھی۔

اُنھوں نے ہندی میں بہت سے ناول لکھ ڈالے تھے۔ اب انگریزی میں لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ ان کا پورا نام رائے ہربنس رائے طغیانؔ بھاگلپوری تھا۔ بہار کے رہنے والے تھے۔

"میرے حضرت نے مجھ سے کہا"۔ اُنھوں نے کہنا شروع کیا۔

ان کے ایک مسلمان گرو ہیں جو سرینگر میں رہتے ہیں۔" ہری شنکر نے چپکے سے چمپا کو بتلایا۔

"میرے حضرت نے مجھ سے کہا۔ بچہ تو روس جا ـــــ"

"اور ان ملعون ملحدوں کو سچی سوشلزم کی مشعلِ ہدایت دکھلا کر راہِ راست پر لا۔" طلعت نے باورچی خانے میں سے لقمہ دیا۔

"انھوں نے تو بھئی اپنے حضرت کو بھی اچھا سدھایا۔" چندرا نے باغ کے دروازے میں آکر کہا۔

طغیانؔ صاحب نے چونک کر اسے دیکھا۔

"یہ کون چھیلا ہیں ـ؟" اُنھوں نے سر لکھا سے دریافت کیا۔

"یہ چھیلا بھی بڑے پوگو لیسو وچاروں کی مالک ہیں۔ لیکن ڈالر کمانے کی اُدھیش سے نیویارک کی آکاش بانی سے ہندی میں سماچار سنایا کرتی ہیں۔ ان کا وان ابھی ہی یہاں پہنچا ہے ـ" کمال نے جواب دیا۔

"آپ بہار کے رہنے والے ہیں ـ؟" چندرا نے شگفتگی سے پوچھا۔

"جی ہاں۔" طغیانؔ صاحب نے خفا ہو کر کہا۔ "ہوں تو سہی۔ پھر ـــ؟"

"ارے۔ میرا مطلب تھا، تب تو آپ شاید گوتم نیلمبر کو جانتے ہوں۔ اُس نے پٹنہ یونیورسٹی میں پڑھا ہے۔"

"جانتا ہوں ـــ بیوقوف چھوکرا ہے۔" طغیانؔ صاحب نے مختصراً کہا۔ "ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ہم سب سائے ہیں۔ میں بھی۔ تم بھی۔ گوتم نیلمبر بھی تمھارا ـــ میرے حضرت نے کہا تھا ـــ"

"کمال۔" طلعت پتیلیاں چولھے سے اتار کر جھاڑن سے ہاتھ پونچھتی باہر آئی۔ "اپّی نے کیا لکھا ہے خط میں۔"

"ارے ہاں۔" کمال نے اوجہیت سے باتیں کرتے ہوئے مڑ کر کہا۔ "کچھ نہیں۔ بھیّا صاحب کی شادی ہو گئی۔"

"ہائیں۔ وہ کب؟" کورس ہوا۔ ہر ایک اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔

"اتنی بڑی بات ہو گئی اور تم گپ چپ کالڈو بنے بیٹھے ہو۔" طلعت نے کمر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"ایسی کون بڑی بات ہو گئی بھئی۔ ہم سب سائے ہیں۔" کمال نے اطمینان سے کہا "ابھی تم نے سنا ہے طلیان صاحب کے حضرت کیا کہتے ہیں۔"

"تم بکواس مت کرو۔" ہری شنکر نے چھلانگ کر کمرے کے وسط میں آتے ہوئے کہا۔ "تفصیل سے واقعہ بتاؤ۔ کیا لکھا ہے اپّی نے۔"

"یار۔ ہوا یہ کہ۔"

"شروع سے شروع کرو۔" طلعت نے حکم دیا۔

"خوب نمک مرچ لگا کر سناؤ۔ ورنہ لڑکیوں کو چین نہیں آئے گا۔" گلشن نے حسبِ معمول اپنے سوتے سوتے انداز میں کہا۔ سب کمال کے چاروں اور آن بیٹھے اور کان کھڑے کر کے قصّہ سننے لگے۔ کمال نے ماہرِ فن داستان گو کی طرح سگریٹ مٹھی میں لے کر لمبا کش لگایا۔ چمپا دریچے میں بیٹھی ان سب کو دیکھتی رہی۔

"بھائیو اور بہنو۔ تم کو معلوم ہی ہے۔ کہ بھیّا صاحب بے چارے بڑے زبردست سوشل کلائمبر۔"

"یہ کیسے۔ لکھنؤ میں تو نہیں تھے۔"

فیروز نے اعتراض کیا۔

"تم اپنا لکھنؤ لئے پھرتی ہو بات بے بات۔ بھیّا صاحب اور ان کے وہاں کی ویلیوز۔"

"پھر سیارت شروع ہوئی ۔" گلشن نے کہا۔ "یہ تم تو اپنے بھیا جی کا قصہ سنانے لگے تھے ۔"

"سُنانے لگے تھے نہیں یار سُنانے والے تھے۔ تم پنجابی اوبدا کر غلط اُردو بولتے ہو" — ہری شنکر نے ناک بھوں چڑھا کر کہا

"ارے جا۔ یو، پی کے بنئے ۔" گلشن نے جواب دیا

" لاؤ بھئی۔ امی کا خط دو۔ ہم باہر جا کر خود پڑھ لیں۔" فیروز نے تنگ آکر کہا۔

"تم لوگوں کی لونڈہار پارٹی کبھی سنجیدہ ہونا جانتی ہی نہیں۔ ہونہہ ۔"

"ہاں۔ تو ہوا یہ کہ بھیا صاحب ایک سوشل کلائمبر — جب روشن کراچی واپس گئی ہے اس سے بہت، پہلے ہی ان کو معلوم ہو چکا تھا کہ بے چاری کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اب شاہ رخ سلطانہ منظر پر آئیں۔ مگر کراچی میں حکومت تبدیل ہو گئی ۔"

" — ایں — اس کا کیا مطلب جو بات کی بے تکی ۔" ہری شنکر نے کہا۔

"ارے۔ اس کا مطلب یہ کہ کزن شاہ رخ کے ابا منسٹر نہیں رہے ۔"

"اوہ ۔"

"اب لکھنؤ سے ہماری والدہ یعنی بھیا صاحب کی چچی کے خط پہ خط آنے شروع ہوئے کہ میرا چل چلاؤ کا وقت ہے۔ میاں تم گھر بسا لو۔ ایک ایک کر کے گلفشاں سے پنچھی اڑ گئے کم از کم تم یہاں آ کر بہو کا ڈولا ہی لے جاؤ — طلعت ذرا چاء بنانا۔"

چاء کا دور چلا۔ کمال نے سانس لے کر پھر داستان شروع کی ۔" تو بھائیو اب سچویشن یہ ہے کہ سارے مسلمان بیچلرز پاکستان میں ہیں اور لڑکیاں انڈیا میں۔ تو لڑکیاں وہاں سے جہیز بنا بنا کر پاکستان لاتی ہیں اور وہاں ان کی شادیاں ہوتی ہیں یا بیچلر لوگ چھٹی لے کر انڈیا جاتے ہیں اور وہاں سے دلہنیں بیاہ لاتے ہیں۔ انڈیا آج کل بڑی تعداد میں علاوہ علی گڑھ کے گریجویٹوں کے مسلمان لڑکیاں پاکستان ایکسپورٹ کر رہا ہے — تو بھائی ہمارے بھیا صاحب نے بھی امی کے ان خطوط سے متاثر ہو کر چھٹی لی اور ایسا سپاٹا مارا کہ لندن سے پہنچے لکھنؤ سیدھے۔ امی نے لکھا ہے کہ گلفشاں میں بڑے گلے شکوے

ہوئے۔ بھیا صاحب اپّی کے گلے لگے۔ گنگا دین سے بچھڑ کر ملے۔ وغیرہ وغیرہ۔ بڑا ڈرامہ رہا۔ نئے سُننے والوں کی خدمت میں عرض ہے"۔ اُس نے سر کھجایا، چندرا اور نرگیش کی طرف مڑ کر اضافہ کیا "کہ میری بڑی بہن جن کا یہ خط ہے۔ بھیا صاحب کی بچپن کی منگیتر تھیں اور بھیا صاحب نے ان سے بیاہ نہیں کیا تھا یا اُنھوں نے بھیا صاحب سے بیاہ نہیں کیا تھا بہرحال اس کا بھی بڑا زبردست ڈرامہ رہا تھا۔ اب اپّی کی شادی کافی عرصہ ہوا ایک صالح نوجوان سے ہو چکی ہے۔ جو یو۔پی گورنمنٹ کے محکمہ زراعت کا افسر ہے اور اپّی بقول شخصے اپنے گھر میں خوش ہیں۔ ہاں — تو اب بھیا صاحب نے الٹی میٹم دیا کہ وہ صرف چند ہفتے کی رخصت پر آئے ہیں۔ انڈیا یا پاکستان کا معاملہ بہت مشکل سے کھٹپٹ منظور ہوتی ہے۔ لہٰذا جلد از جلد ان کے لئے لڑکی تلاش کی جائے۔ اور ظاہر ہے کہ لڑکی بڑے آدمی ہی کی درکار تھی۔ کیونکہ آپ جانو ہم لوگوں کا خاندان بھی بہت بڑے آدمیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اللہ کے فضل سے۔"

"آپ لوگ لکھنؤ کے نواب ہیں — ؟" طلغیان صاحب نے گردن بڑھا کر بے حد دلچسپی سے عینک کے پیچھے آنکھیں جھپکاتے ہوئے پوچھا۔ ان کو اپنے نئے ناول کا پلاٹ سجھائی دے گیا تھا۔

"جی ہاں — ہیں۔" کمال نے مختصراً جواب دے کر بات جاری رکھی۔ "ان کی وہ مُنہ بولی بہن یاد ہے۔" اُس نے ہری شنکر کو مخاطب کیا۔ "وہ پہاڑی لڑکی یونیورسٹی والی —"

"ہاں ہاں۔ کیے جاؤ۔ وہی سیتا ڈکشٹ —" ہری شنکر نے سر ہلایا۔

"ہاں۔ وہی چپٹی سی ناک والی، گوری سی موٹی سی لونڈیا۔ وہ جو راکھی باندھ کر ان کی بہن بنی تھی۔ ایک دفعہ۔ بس جناب وہ سارے ہیں ان کے لئے رشتے ڈھونڈتی پھری۔ کوئی موٹی آسامی ہاتھ آئے۔ کوئی موٹی آسامی ہاتھ آئے۔ اس معاملے میں بھی بھیا صاحب اپنے حساب خوش قسمت ہی رہے — سر فلاں کو جانتے ہو — نام نہیں لوں گا۔"

"وہی جن کی ایک لڑکی ایک مرتبہ —" ہری شنکر نے منقار کھولی ہی تھی کہ کمال نے

جلدی سے بات کاٹی — "ہاں۔ہاں وہی — وہ آج کل انڈیا میں فلاں صوبے کے ہائی کورٹ کے جج ہیں۔بس اے جناب۔ سیتا فوراً ٹکٹ کٹا کر مسوری پہنچی۔ جہاں سر فلاں کا خاندان موجود تھا۔اور جب دیکھو تب سوائے میں موجود۔ بھیا صاحب کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر کے رکھ دیا اُس نے مگر لونڈیوں کے دماغ اتنے چھوٹے ہوتے ہیں۔ اپّی نے لکھا ہے کہ جب ایسی ایسی تعریفیں کرے سیتا تو اس دوسری لونڈیا نے جل کر کہا کہ ایسے ہی آپ کے چہیتے بھیا صاحب تو آپ خود ان سے بیاہ کیوں نہیں کر لیتیں۔ اس پر سیتا بہت روئی۔ اور بھیا صاحب کو اس نے لکھ دیا کہ میں اس معاملے سے ہاتھ دھوتی ہوں تم خود آن کر لڑکی دیکھ جاؤ۔ بھیا صاحب تُرت ہی مسوری پہنچے۔ لونڈیا کی ماں نے کہا ہمارے تو پاکستان سے ایک سے ایک بڑھیا پیغام آئے ہوئے ہیں۔خیر اس طرح کے نخرے تو لڑکی والے کرتے ہی ہیں۔ قصّہ مختصر یہ کہ بات طے ہو گئی۔ سیتا جھٹ پٹ بری خریدنے دلی پہنچی۔ بھیا صاحب نے اس سے کہا۔ میری کوئی سگی بہن نہیں۔ دو چچا زاد بہنیں تھیں دونوں گھر پہ موجود نہیں۔طلعت ولایت میں ہے۔ تہمینہ اپنے سسرال میں ہیں۔ اب تم ہی سارا انتظام کرو شادی کا۔چنانچہ صاحب، تاریخ مقرر ہو گئی۔ مگر یار ہری شنکر —"

"ہاں یار کمال —"

"بھیا صاحب کا وہ زمانہ یاد ہے ۳۹ءء والا۔جب ہم تم ان کے اسٹوج بنے پھرا کرتے تھے۔جو لوگ اس دھوم دھام سے اُٹھتے ہیں۔ اُن کا انجام کتنا پھسپھسا ہوتا ہے۔"

"پر یہ سیتا کا کیا قصہ ہے یار —"

"کچھ بھی نہیں یار — طلعت — چاء مانگنا —"

چاء کا دوسرا دور چلا — سب تازہ دم ہوئے۔چمپا اس اثنا میں اُٹھ کر باہر باغ میں جا چکی تھی۔

"یار اس سیتا ڈکشٹ پر روشنی ڈالو" — ہری شنکر نے پھر مطالبہ کیا۔ "میں یہ اسٹوری بالکل بھول چکا ہوں۔"

"ارے میاں۔ وہ چمپا باجی ہی کی کلاس فیلو تو تھی۔ ان کے ساتھ بعد میں چاند باغ والی

اس کالج میں رہا کرتی تھی اور پڑھاتی تھی آئی ٹی میں۔ چمپا باجی کے واقعے کے بعد بھیا صاحب نے سکونِ دل کی خاطر اسے بہن بنایا۔ راکھی واکھی باندھ کر باقاعدہ۔ اور جناب بات تو یہ ہے کہ وہ بنی دل سے ان کی بہن۔ یہ چیز میں ہندو لونڈیوں کی مانتا ہوں۔ بہن بنتی ہیں تو صدقِ دل سے یہ رشتہ مانتی ہیں۔ لیکن اس کے برعکس ہمارے یہاں زیادہ تر مسلمان لڑکیوں کی افسوسناک سائیکولوجی یہ ہے کہ — "

"ارے چھوڑو یار مسلمان لڑکیوں کی سائیکولوجی — اچھا تو بھیا صاحب نے سکونِ دل کی خاطر — "

"ہاں۔ اصل میں ان کی سائیکولوجی یہ تھی۔"

"اس سے ہم سب واقف ہیں۔ تم آگے چلو۔"

"بات تو پوری کرنے دے۔ بیچ میں بولے جاتا ہے نامعقول۔ تو بھیا صاحب کا یہ تھا کہ جب تک تین چار لونڈیاں ہفتہ وار ویک سے ان کی پرستش میں نہ جُٹی رہیں۔ ان کی زندگی ان کو نامکمل دکھلائی دیتی تھی۔ اس قدر عادی ہو گئے تھے وہ اس کے۔ در اصل ان کو ان کے فرنچ بولنے نے مارا۔ میں کہے دیتا ہوں نہ آئے ہوتے بھیا صاحب سوئٹزرلینڈ سے شوں ووں کرتے۔ کندھے اُچکاتے۔ نہ لونڈیوں کا یہ پڑا ہوتا۔ مگر خیر وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ اب یوں سمجھ لو کہ سیتا ڈکشٹ کے واقعے میں بھی بڑے گہرے نفسیاتی نکتے تھے۔"

"ایں —؟ تم تو کہہ رہے تھے کہ ہندو لونڈیاں دل سے بھائی سمجھتی ہیں۔" گلشن نے کہا۔

"یہی تو لاشعور کا ایک اہم نکتہ ہے۔ سیتا کے لاشعور میں یہ پنہاں تھا۔"

کمال ڈرون کرتا رہا۔ چمپا باغ میں ٹہلتی ہوئی کمرے کے پاس سے گزری۔ کمال کی آواز آتی رہی — "یہ نکتہ پنہاں تھا کہ سیتا میں احساس ملکیت بہت شدید تھا۔ سب لونڈیوں کے یہاں ہوتا ہے — شعوری طور پر چاہتی تو وہ یہ تھی کہ بھیا صاحب بیاہ کر لیں وہ نند بن کر قاعدے کے موافق ان کے سر پر دوپٹہ ڈال کر بارات لے جائے مگر تحت الشعور میں یہ خواہش

تھی کہ بھیا کی شادی نہ ہو۔"

"یہ سب، بصیرت افروز باتیں اپّی نے لکھی ہیں؟" فیروز نے بور ہو کر پوچھا۔

"نہیں۔ یہ اس نیاز مند کی ریڈنگ ہے۔ چنانچہ جناب اس نے، جو لڑکی تجویز کی گئی اسی کو کھٹ دینی سے ناپسند کر دیا۔ اور بھیا صاحب اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ چمپا باجی کی طرف سے دل اسی نے سیتا ڈکشٹ نے برا کرایا تھا بھیا صاحب کا لکھنؤ میں۔ گو چمپا باجی خود آخر میں کون سی گھاس ڈالے دے رہی تھیں بھیا صاحب کے آگے مگر گوئیاں کی حیثیت سے اس کا فرض تھا کہ — مگر میں نے یہ اسٹڈی کیا ہے بھائی گلشن، کہ لونڈیاں جہاں کسی لونڈے کا معاملہ آیا۔ سارا بہناپا بھول جاتی ہیں۔ خیر صاحب تو اپّی رقم طراز ہیں کہ پچھلے اتوار کو نکاح ہوا۔ ہنی مون کے لئے نینی تال گئے ہیں بھیا صاحب اگلے مہینے لندن واپس پہنچ جائیں گے دلہن کو لے کے۔"

"یار سُنا ہے۔ شانتا اور بل میں کھٹ پٹ رہنے لگی ہے۔" طلعت نے جھک کر اطلاع دی۔ "اور بل چھوڑنے والا ہے اسے۔"

"زیادہ تر انٹلکچوئل لوگ اپنی بیویوں کو چھوڑ دیتے ہیں — اگر وہ خود بھی انٹلکچوئل ہوتی ہیں—" کمال نے لاپروائی سے کہا۔ "تم لوگ تو یار لندن کی ایک انسائیکلو پیڈیا اسکنڈلیکا مرتب کر ڈالو۔ ریفرنس کے لئے آسانی رہے گی۔"

"روشن کی بھی سُنا ہے شادی ہو گئی کسی بڑے افسر سے۔" طلعت نے کہا۔

"مبارک ہو۔" کمال نے جواب دیا۔

"بے چاری چلی گئی واپس اپنے خول میں۔" فیروز بولی۔ "بیکار اس نے یہ سارا جھنجھٹ کیا۔"

"یہ لڑکیاں عشق کیوں اور کیسے کرتی ہیں۔ آج تک میرے پلّے نہ پڑا۔" طلعت نے کہا۔

"ارے یار بہ خدا کے لئے آہستہ بولو— وہ ٹہل رہی ہیں سامنے باغ میں—"

کمال نے کہا۔

"ہماری نگریا میں آئے بسو بنواری —" طلعت نے لوفروں کی طرح گانا شروع کیا لڑکیاں اٹھ کر ایک کونے میں چلی گئیں۔

"آج کل ان کا کیا سلسلہ ہے —" سرلیکھا نے چپکے سے پوچھا۔

"میاؤں - میاؤں —" کمال نے دور سے چڑایا۔

"یار وہ سرل ایشلے تو کل میں نے دیکھا شنیلا مکرجی کے یہاں ڈٹا ہوا تھا۔ کیا وہ بھی سکونِ دل کی خاطر —" طلعت نے پوچھا۔

"واہ - یعنی یہ معلوم ہو رہا ہے مسلم اسکول لکھنؤ کی سیکنڈ ائر میں پڑھنے والی لڑکیاں گفتگو کر رہی ہیں ——" کمال نے کہا۔ سرلیکھا اور طلعت اور نرگیش سُنی اَن سُنی کرکے کھس پھس کرتی رہیں۔

"یہ لوگ کتنی ہی افلاطون کیوں نہ بن جائیں رہیں گی وہی کشمیری محلہ گرلز اسکول لکھنؤ۔" کمال نے دوبارہ کہا۔

"سوال یہ ہے —" فیروز نے فرش پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کہ مڈل کلاس لڑکیاں اتنی رومان پرست کیوں ہوتی تھیں۔"

"ہوتی تھیں کیا معنی - اب بھی ہیں۔ تم تو اس طرح کہہ رہی ہو گویا یہ پوسٹ ریوولیوشن پیریڈ ہے اور ماضی پر خالص مورخانہ انداز سے بحث کر رہے ہیں ہم۔" طلعت نے کہا۔

"مگر صاحب۔ روشن میں ممکنات تھیں۔ وہ برلین والا قصہ یاد ہے ——

—— وہ تو جب ہم لوگ بخارسٹ جا رہے تھے تو پٹی ہمارے ساتھ آسٹریا کی سرحد تک پہنچ گئی۔ وہ نکل چلتی ہمارے ساتھ مگر —" فیروز بولی۔

"مگر کیا یار۔ ڈرپوک تھی۔ بچانوے فی صدی بورژوا لڑکیوں کی طرح۔ بس رومانس دماغ میں ٹھنسا تھا۔ وے رومانس۔ وے بورژوا فلسفہ۔ لاحول ولا۔ مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں۔ یعنی عشق بھی کیا تو کس سے —— بھیا صاحب جیسے بوگس انسان سے۔"

طلعت نے کہا۔

"اب وہ اس بڑے آدمی کی بیوی بن کر جم خانہ کی پارٹیوں میں زندگی گزارے گی۔ کیا ڈاؤن فال ہوا ہے۔" سرلیکھا نے کہا۔

"تمھارا تخیل اس وقت زوروں پر ہے۔" طلعت نے کہا۔

"میرے تخیل نے ہم سب کو عجیب عجیب حالتوں میں دیکھا ہے۔" سرلیکھا نے اداسی سے کہا۔ "میں نے دیکھا ہے کہ چمپا بیگم ایک تھکی ہاری پروفیسرنی کی طرح ہندوستان کے کسی کالج میں لڑکیوں کو ہسٹری پڑھا رہی ہیں۔ بہت جلد وہ سمے بھی آنے والا ہے جب میری شہرت ختم ہو جائے گی۔ رقص کے متعلق کتابوں میں ایک آدھ پیراگراف میرے سارے وجود کا ماحصل رہ جائے گا۔ شریمتی سرلیکھا دیوی جو دس سال قبل بہت عظیم رقاصہ تھیں طلعت کو لوگ بھول جائیں گے۔ کملا گمنام ہو جائے گی۔ اس وقت ہم میں اور دروشن میں کیا فرق رہے گا۔"

"ایسی ڈیکیڈنٹ باتیں مت کرو۔" طلعت نے ڈانٹا۔

"میں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی۔" سرلیکھا نے ذرا شرمندہ ہو کر کہا۔

"میں بھی سوچ رہا تھا۔" کمرے کے دوسرے سرے پر ہری شنکر نے کمال سے کہا "لڑکیوں کا معاملہ بڑا بے ڈھب ہے۔ ذرا ان کو دیکھو تو۔ کیسی مگن ہیں اس سمے۔ ایک نے نیا بلاؤز سی لیا ہے تو خوشی سے پھولی نہیں سماتی۔ دوسری ادھر اُدھر کی بے ضرر گپیں ہانک کر ہی مسرور ہے۔ مگر دراصل انھیں کتنے عظیم دکھ اٹھانے پڑتے ہیں۔ یہ ایک بچے کی تخلیق کے ذریعے ساری کائنات کی ذمے داری سنبھالتی ہیں۔ بے چاریاں اپنے آپ کو ایک دوسرے انسان کے حوالے کر دیتی ہیں۔ ان کا دل رکھنا کتنی آسان بات ہے۔ کتنی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے خوش ہو جاتی ہیں یہ لوگ۔ ان کو تو دیوی بنا کر رکھنا چاہیے۔ ان کا دل دکھانا سب سے بڑا گناہ ہے۔"

طلعت، ہری شنکر کی طرف آئی۔ ہری شنکر پھر مبالغے سے کام لے رہا تھا۔ یہی مبالغہ طلعت کو ہر طرف نظر آتا تھا۔ گوتم نیلمبر کے کردار میں، چمپا میں۔ اپنی میں۔ یہ لوگ گویا انسانوں کی انلارجڈ تصاویر تھیں۔ اپنی عام سے فوکس سے کبھی کبھی باہر ہو جاتی تھیں۔

"میاں۔ کیا بے تکی ہانک رہے ہو۔" اُس نے سنجیدگی سے کہا۔ "یہ بھڑے کسی اور کو دینا۔ کہاں کی دیوی اور کیسے دیوتا ــــ یہ شاعری رکھو چھپر پہ۔ معاشی آزادی اصل چیز ہے۔"

"یہی بات تو تمھاری سمجھ میں نہیں آتی۔ معاشی آزادی اصل چیز ہوتی تو چمپا بیگم اس بے باغ میں چکّر نہ کاٹ رہی ہوتیں۔" شنکر نے جواب دیا۔

"اُونھ۔ ان کا تو دماغ خراب ہے۔" طلعت نے کہا۔

"اے لیجئے۔ اتنی قابل لڑکی کیمبرج میں سب پہ دھاک بٹھا کر آرہی ہے جس سے ملی ہے وہی فلور ہو جاتا ہے آپ ان کا دماغ خراب بتائے دے رہی ہیں۔"

"کیوں بھئی کمیونسٹ لوگ عشق نہیں کرتے ــ؟" طغیان صاحب نے نہایت بھولے پن سے گلشن سے سوال کیا۔

"لاحول ولاقوۃ۔" طلعت جل کر واپس چلی گئی۔

"بی بی۔" ہری شنکر نے اس سے بڑے پیار سے کہا۔ وہ نرملا کی قائم مقام تھی۔ "ابھی تم اور پڑھو۔ اب تم لگے ہاتھوں پی۔ ایچ۔ ڈی کر ہی ڈالو۔ کون مردود کہتا ہے کہ معاشی آزادی ضروری نہیں۔ اپنا دل چھوٹا نہ کرو۔" وہ یک لخت گھبرا گیا کہ اس نے طلعت کو خفا کر دیا ہے۔

"پی ایچ ڈی کر کے بڑے لڈّو مل جائیں گے۔ تین سو کی ملازمت صرف تین سو کی۔" اُس نے عین ہری شنکر کی ناک کے آگے تین اُنگلیاں لہرائیں۔ وہ بالکل ملنے کی موڈ میں نہیں تھی۔ دراصل بھیّا صاحب کی شادی کی خبر نے اس کی طبیعت مکدر کر دی تھی۔ اسے اس وقت پہلی بار احساس ہوا تھا کہ شادی کی کتنی زبردست مارکیٹ ہے جس میں لڑکیاں خواہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں خواہ اجّل جپٹ، برائے فروخت دوکان پر رکھی جاتی ہیں۔

"ارے نور دیدہ یہ تو سب کچھ نہیں ہے ــــ نیا ہندوستان ہے۔ ہم سب کو اس کے لئے کام کرنا ہے ــــ کملا کو دیکھو۔ صولت کو۔ کیسی ٹھاٹھ دار کیریر و مین ہیں۔"

چمپک نے ٹہلتے ہوئے ایک مرتبہ کمرے میں جھانکا اور ان سب کو باتوں میں مصروف پا کر

باغ میں سے گزرتی باہر سڑک پر آگئی۔

۸۹

برفباری شدید ہوگئی۔ شنیلا دیبی نے کھڑکیاں بند کردیں۔

سوامی دیویکا نند نے گیتا کا صفحہ الٹ کر مجمع کو دیکھا۔ یہ وہی کمال اور ہری شنکر کے انگریز پروفیسر تھے جو تیرہ چودہ سال قبل ایک روز لا مارٹینئر کالج لکھنؤ سے اچانک غائب ہوگئے تھے اور کمال اور ہری شنکر ان کے تعاقب میں ہردوار کی گھاٹیوں میں مارے مارے پھرے تھے۔ اب یہ زعفرانی کپڑے پہنے داڑھی بڑھائے یوروپ اور امریکہ میں لیکچر دیتے پھرتے تھے۔ گوتم نے شنیلا مکرجی کے فلیٹ میں پہنچ کر کھڑکی میں سے جھانکا تو اسے یہ منظر نظر آیا کہ سوامی جی مشرق پسند انگریز لڑکیوں میں گھرے بیٹھے ہیں۔ ایک طرف کیرتن ہو رہا ہے۔ شنیلا مکرجی سب کو کافی پیش کرنے میں مصروف ہیں۔

گوتم اسی صبح کئی ماہ بعد ماسکو سے لوٹا تھا۔ کمال نے اس کے توسط سے ہندوستان میں مختلف ملازمتوں کے لئے جو درخواستیں دے رکھی تھیں۔ ان کے جواب میں انڈیا ہاؤس میں گوتم کی میز پر بہت سے لفافے آئے رکھے تھے۔ وہ ان کو کھولے بغیر خوشی سے ہڑبڑا کر کمال کو سارے میں ڈھونڈتا پھرا۔ سرلکھا کے یہاں معلوم ہوا کہ کمال اور ہری شنکر اپنے پرانے پروفیسر سے ملنے شنیلا مکرجی کے یہاں گئے ہوئے ہیں مگر وہ لوگ یہاں بھی نہیں تھے۔ گوتم اندر آکر ایک کونے میں مائیکل کے پاس بیٹھ گیا۔

"ہلو کامریڈ ـــ ماسکو وا سے کب لوٹے ـــ" مائیکل نے چپکے سے پوچھا۔

"آج صبح ـــ"

"بھئی یہ تمہارے سوامی جی تو بالکل فراڈ معلوم ہوتے ہیں۔" مائیکل نے کہا۔

"ہوں گے۔ مجھے ان میں دلچسپی نہیں ہے۔ تم نے کمال کو دیکھا ہے؟"

"نہیں۔" مائیکل نے اپنی بات جاری رکھی۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ امریکہ ان کو روپیہ دے رہا ہے کہ مذہب کا پرچار کریں اور کانگریس آف کلچرل فریڈم کی طرف سے

۱۹۶۱ء

یہ دورے پر نکلے ہیں ۔۔۔"

"تم اب تک اسرائیل نہیں گئے ۔۔" گوتم نے دریافت کیا۔

"بس اب جانے ہی والا ہوں۔"

"سب جا رہے ہیں۔" شنیلا دیبی مائیکل کی بات سن کر ان کی طرف آئیں۔۔"

"نمشکار مسٹر نیلمبر ۔۔" انھوں نے کہا۔

"نمسکار شنیلا دیوی ۔۔"

بہت سے پھول اٹھائے نرگیش کمرے میں داخل ہوئی۔" روشنی میں آکر دیکھا تو یہ سب سُرخ نکلے میرا خیال تھا زرد ہوں گے ۔" اس نے سوامی جی کے سامنے پھول رکھ کر کہا۔

"نرگیش ۔۔" گوتم نے آزردگی سے نیچی آواز میں کہا" یہ کیا سوانگ رچا رہی ہو۔۔"

"گوتم ۔۔۔ کلچر کی خاطر ۔۔۔ یہ سب کلچر کی خاطر ہے ۔۔" اس نے پہنچے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"کمال کہاں ہے۔"

"سریکھا کے یہاں دیکھ لیا ۔۔؟ شاید وہ لوگ مڈہرسٹ سے نہ لوٹے ہوں۔"

"مڈہرسٹ ۔۔" گوتم کے ذہن پر ایک موگری سی پڑی۔" مگر آج تو اتوار نہیں ہے۔۔"

"ہاں ۔لیکن نرملا کے دوسرے پھیپھڑے کا آپریشن ہوا ہے۔ تم کو معلوم نہیں ۔۔؟ ارے ہاں تم آج ہی تو باہر سے لوٹے ہو۔۔"

"سب جا رہے ہیں ۔۔ سب اپنے اپنے اسرائیل کی طرف جا رہے ہیں۔"

شنیلا مکرجی نے آنکھیں نیم وا کر کے گوتم سے کہا" تم لوگوں کی پوری پارٹی ہندوستان واپس جانے والی ہے۔ نرگیش نے آج بتایا مائیکل بھی جا رہا ہے۔ ڈینس کو نیروبی کی یونیورسٹی میں پروفیسری مل گئی ہے ۔۔"

"شنیلا دیوی۔ یہ تو دنیا کا قاعدہ ہی ہے۔" گوتم نے سخت اُکتا کر کہا۔ "لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔"

"یہ تو مجھے معلوم ہے کہ لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ بلکہ چلے جاتے ہیں۔ آتے کبھی نہیں۔" اب وہ بھی پھر گرودیو ٹیگور کا حوالہ دینے والی تھیں۔ گوتم جلدی سے اُٹھا "ہزگیش" اس نے مڑ کر کہا "مجھے کمال کی بڑی سخت تلاش ہے اس کے نام چند بے حد ضروری خط آئے ہیں۔"

"بی بی سی کینٹین میں دیکھ لو۔ یا شاید چوزے کی سرائے میں ہوں وہ سب سوامی جی سے تو ملتے جاؤ۔"

"ارے ہاں۔" وہ آگے بڑھ کر سوامی جی کے سامنے جھکا اور اُن کے پیر چھوئے سوامی۔ دیویکانند جی سابق ڈاکٹر رچرڈ ہیملٹن نے اسے اخیر وادوی اور آکسفرڈ کے لہجے میں اُس سے اس کی روح کی خیریت دریافت کی۔

"مجھے تمہارا ہی انتظار تھا کہ تم آجاؤ تو ایک روز اسٹیون اسپنڈر وغیرہ کو اپنے یہاں بلوا کر ایک محفل منعقد کریں۔" شنیلا دیوی نے کہا "سوامی جی سے میں نے تمہارا بہت ذکر کر رکھا ہے۔"

گوتم دوبارہ جھکا اور سب کو نمسکار کرتا ہوا باہر نکلا۔

—— وہ اوور کوٹ میں منہ چھپا کر تیز تیز قدم رکھتا کار کی طرف چل دیا۔ شنیلا مکرجی کے فلیٹ میں سے کیرتن کی آوازیں بلند ہوتی رہیں۔

۹۰

چوزے کی سرائے اس وقت غیر معمولی طور پر سنسان پڑی تھی۔ صرف ایک لڑکی دروازے کی طرف پشت کئے اُونچے اسٹول پر بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ گوتم ویٹرس سے پوچھنے کے لئے کاؤنٹر کی طرف بڑھا کہ بی بی سی والے تو ابھی ادھر نہیں آئے تھے۔ اسٹول والی لڑکی نے مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ چمپا احمد تھی۔

"ہلو — تم یہاں موجود ہو —" گوتم نے بے ساختہ کہا۔

وہ اپنی جگہ سے اُتر کر برابر کے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ "تم ہی نے تو کہا تھا کہ دنیا بہت مختصر ہے۔ ہم کہیں نہ کہیں ضرور ملیں گے دوبارہ۔"

"اب ایسی مختصر بھی نہیں ہے۔" گوتم نے ذرا بُرا مان کر کہا۔ "یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر بات کو لٹرل سمجھ لیا جائے۔"

"لٹرل تو تم جانتے ہو باتوں کو —"

"وہ کیسے —" گوتم نے پھر کمال کی تلاش میں چاروں اور نظریں دوڑا کر پوچھا۔

"میں نے تم سے ایک مرتبہ کہا تھا کہ تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔ بڑی مابعد الطبیعاتی بات تھی۔ تم اس کو مجاز کی طرف لے گئے۔ یہ کب تمہارا قصور ہے —" اس نے انگلی اُٹھا کر کہا۔

"مابعد الطبیعات کا ذکر مت کرو۔" گوتم نے بے انتہا چڑ کر کہا۔ "میں ابھی شنیلا دیوی کے یہاں سوامی ویویکانند سے مل کر آ رہا ہوں — تم نے کمال کو تو نہیں دیکھا۔"

"نہیں —" چمپا نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔ یہ آدمی پل پل میں کیسے رنگ بدلتا تھا۔ ابھی تک میں مردوں کو سمجھ نہیں پائی — "تم نے مجھے فون کیا تھا اس روز — جون کارٹر کے یہاں۔ یوروپ جانے سے پہلے۔"

"ہاں۔ کیا تو تھا۔" گوتم کو اپنا اس طرح پکڑا جانا بالکل پسند نہ آیا۔ "کیونکہ تم نے مجھے رنگ کیا تھا کیمبرج سے لوٹ کر —"

"گوتم۔ یہ تم کاٹنے کو کیوں دوڑ رہے ہو۔ بات بے بات۔ تم پہلے تو ایسے نہ تھے۔ میں تقریباً سات سال بعد تم سے ملی ہوں۔ ذرا تو تمیز سے پیش آؤ۔"

"چمپا —" گوتم نے کہا۔ "میں اس وقت بے حد پریشان ہوں۔ کمال کے کئی ضروری خط ہیں۔ ممکن ہے اسے دو تین دن کے اندر انٹرویو کے لئے دلی پہنچنا ہو۔ نرملا کا دوسرا آپریشن ہوا ہے — تم چوبیس گھنٹے خوابوں میں کھوئی رہتی ہو۔ باقی

کی دُنیا ہر سمے تمہارے خوابوں کا ساتھ کس طرح دے سکتی ہے ۔"

"ارے ۔" وہ فوراً کھڑی ہوگئی ۔ "چلو کمال کو ڈھونڈتے ہیں ۔ مجھے یہ سب معلوم نہ تھا ۔" گوتم نے اسے دیکھا ۔ یہ کیسی عجیب دلکش عورت تھی ۔

وہ سرائے سے باہر نکلے اور سُریکھا کے یہاں فون کیا ۔ گلشن نے دوسرے سرے سے جواب دیا ۔ "کمال کا پتہ نہیں ۔ شاید سر رو جر کے یہاں نرملا کی رپورٹ لینے گیا ہے ۔ سُریکھا ابھی راڈ ا سے نہیں لوٹی ۔ کمال نے کہا تھا کہ وہ سر رو جر کے یہاں سے ہمارے گھر ہی آئے گا ۔ تم آجاؤ ۔ میں کالج جا رہا ہوں ۔ کنجی ہمسایوں کو دیئے جاتا ہوں ۔"

"کوئی مڈہرسٹ گیا ہے ۔؟" گوتم نے پوچھا ۔

"طلعت اور ہری شنکر گئے ہیں ۔ اگر تم بھی جا رہے ہو تو میرے یہاں سے ایک پارسل لیتے جانا ۔ نرملا کو بھجوانے کے لئے سُریکھا نے ڈائننگ ٹیبل پر رکھ دیا تھا ۔ طلعت لے جانا بھول گئی ۔"

"اچھا ۔ میں ابھی آتا ہوں ۔"

گوتم کار کی طرف لوٹا ۔ اور وہ سینٹ جانز وڈ کی طرف روانہ ہوگئے ۔ آشا کے یہاں سے کنجی لے کر وہ سُریکھا کے مکان میں داخل ہوئے ۔ گیلری میں دو بڑے بڑے مجسمے رکھے تھے ۔

"اوہو ۔ ہماری طلعت نے بڑے زوروں سے سنگتراشی شروع کر رکھی ہے ۔"

"یہ آشا کے بنائے ہوئے ہیں ۔" چمپا نے فوراً کہا ۔

گوتم ٹھٹکا ۔ چمپا ، طلعت اور ان سب کو کس قدر ناپسند کرتی تھی ۔ اس نے اندازہ لگایا ۔ وہ ڈرائننگ روم میں گئے اور باغ کی طرف کا بڑا شیشوں والا دروازہ کھولا ۔ اب برف پھر مدھم سی دھوپ میں روشن تھی ۔

"کتنا آرام دہ گھر ہے سُریکھا اور گلشن کا ۔" گوتم نے صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا ۔ باغ کی دیوار کے پرے سے موسیقی بلند ہو رہی تھی ۔ فضا میں خوش گوار

خنکی تھی۔ چمپا نے آتش دان روشن کیا۔ گوتم کمرے کے ساز و سامان پر کاہل ـــــ اور مطمئن انداز سے نظریں دوڑاتا رہا۔ اب چمپا کی موجودگی کی وجہ سے برسوں بعد ایسا معلوم ہوا۔ گویا وہ بہرائچ میں اپنے گھر پہنچ گیا ہے۔ یہ بڑا غیر منطقی اور عجیب سا احساس تھا۔

کمرے میں ایک طرف کتابوں کی الماریاں تھیں۔ اقتصادیات۔ علامہ اقبال۔ فیض۔ کرشن چندر۔ پھر سریکھا کی کتابیں تھیں۔ موسیقی۔ بیلے۔ کریوگرافی۔ سارے میں نفیس آرٹسٹک چیزیں سجی تھیں۔ جو سریکھا اور گلشن نے سارے ہندوستان، عوامی چین اور یوروپ میں گھوم کر جمع کی تھیں۔ روس کا بیلا لیکا۔ چین کے فوادر، ہنگری کی گڑیاں، اٹلی اور فرانس کی پینٹنگز۔ کمرہ موڈرن انٹریر ڈیکوریشن کا بہت اچھا نمونہ تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایک آرٹسٹ، اور رقاصہ کا کمرہ ہے۔ پیانو پر مارگو فونٹین اور رابرٹ ہیلپ مین کی دستخط شدہ تصاویر رکھی تھیں۔ جگہ جگہ بالی اور جنوبی ہند اور سیام کے رقاصوں کے چھوٹے چھوٹے مجسمے سجے تھے۔ کونے میں سینے کی مشین دھری تھی اور مردنگم اور ترکاری کی ٹوکری۔ گوتم مسکرایا۔ یہ آرٹسٹ کا کمرہ تھا۔ مگر اس میں آرام اور بے تکلفی اسے رہا بھی جاتا تھا۔ زندگی کی اسی سادگی اور بے تکلفی کا وہ ہر جگہ متلاشی تھا۔

"میں نے یہاں بڑے اچھے لمحے گزارے ہیں۔" اس نے کہا۔

"یہ بڑے پیارے لوگ ہیں۔ ہیں نا ـــ" وہ کہتا رہا ـــ "کمروں سے مکینوں کی شخصیت کس قدر عیاں ہوتی ہے ـــ ذرا سوچو تو ـــ" وہ اٹھ بیٹھا ـــ "چیلسی میں کملا کا الٹرا موڈرن فلیٹ دیکھا ہے ـــ؟ اس کی آرائش سے معلوم ہوتا ہے کہ مکین شدید ایکسنٹرک، شدید خوش ذوق اور انتہا مزاجی حس کی مالک ہے۔ اور ڈائریکٹ۔ اس کے خیالات میں کوئی الجھاؤ نہیں ہے۔ اور تری میں زرینہ کا مکان بھی ایک آرٹسٹ کا مکان ہے لیکن ستھرا۔ خوبصورت اور گھریلو سینٹ جانز ووڈ میں طلعت اور کمال کا گھر عین مین گلفشاں کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے۔ وہی ہنگامہ۔ وہی افراتفری۔ ہماہمی۔ مہمانداری۔ حد ہے محرم میں مجلسیں تک تو یہ دونوں کرتے

ہیں یہاں۔ میں نے واشنگٹن میں ہری شنکر کا فلیٹ دیکھا ہے جو بالکل ننگھاڑے والی کوٹھی کا ایکسٹنشن معلوم ہوتا ہے۔ پھر شنیلا دیبی کا کمرۂ نشست جہاں ہر چیز شروع سے آخر تک پوز ہی پوز ہے۔"

"تم پوز اور غیر پوز میں فرق کیسے معلوم کر لیتے ہو —" چمپا نے اس کی بات کاٹی۔

"نہیں چمپا —" وہ کہتا رہا۔ "ہم خود کو اپنے پس منظر سے کبھی اپنے ظاہر کو اصلیت سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔" پھر وہ رکا۔ "مگر کتنی عجیب بات ہے کہ میں نے آج تک تمھارا اصل پس منظر نہیں دیکھا — چوزے کی سرائے کے اسٹول پر بیٹھی تم بالکل معلوم نہیں ہوتا تھا کہ بنارس سے آئی ہو — عجیب بات ہے نا —"

"اچھی بات ہے یا بری —؟"

"پتہ نہیں — مگر ہمیں اپنے پس منظر سے وفادار رہنا چاہیئے جو شاید تم نہیں رہیں۔"

"یہ غلط ہے —" چمپا نے سرخ ہوتے ہوئے کہا۔ "میں بنارس واپس جانا چاہتی ہوں۔ مگر مجھے کوئی لے جانے والا نہیں ملتا۔"

وہ خاموش ہو گیا۔

"تم سب الگ الگ دور دور نکل گئے ہو۔ میں تنہا کھڑی ہوں۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی۔ پھر تم شکایت کرتے ہو کہ میں وفادار نہیں رہی۔"

"تم کو معلوم ہے۔" گوتم نے کہا۔ "پچھلے سال میں نے تم کو امریکہ سے خط لکھا تھا۔ میں ایک بے حد خوبصورت علاقے میں گیا ہوا تھا۔ وہاں ایک دیودار کے جنگل میں بیٹھ کر میں نے تم کو خط لکھا۔ ان دنوں میں جانے کیوں بے حد خوش تھا۔ مجھے یہ وقتاً فوقتاً اپنے خوش ہوتے رہنے کی وجہ آج تک سمجھ میں نہ آئی۔ بہرحال میں نے تم کو لکھا تھا خط ایک عدد — مگر شاید وہ تم کو ملا ہی نہیں۔"

"مجھے آج تک کوئی خط نہیں ملا۔"

"اب تم پھر رومانٹک ہوئیں — !"
برابر کے مکان میں آشا کے یہاں کسی نے اونچی آواز میں گانا شروع کر دیا۔
"گوتم — کمینے پن پر مت اترو —" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
"تمھارے بنارس واپس جانے کے راستے میں کون چیز حائل ہے۔ اور تم رنجی کیوں ہو بھائی۔ زندگی میں آنسوؤں کی کمی تو نہیں کہ تم یونہی رونا شروع کر دو بیٹھے بٹھائے ہنسا کرو۔ مثال کے طور پر بھیا صاحب کو لو۔ آج میں نے ان کو سلفرجز سے نکلتے دیکھا اپنی بیگم کے ساتھ۔ اس قدر خوش تھے کہ کیا بتاؤں کھلے جا رہے تھے بڑے تپاک سے انھوں نے میرا تعارف اپنی بی بی سے کروایا۔ میں نے بھی بہت بشاشت محسوس کیا۔ دماغی طور پر صحت مند لوگ ایسے ہوتے ہیں جیسے بھیا صاحب ہیں۔"
"بکواس مت کرو۔"
چمپا نے کہا۔ اور آتشدان کے کوئلے ٹھیک کرنے میں مصروف ہو گئی۔
گانے کی آوازیں اب قریب تر ہو گئیں۔ اوجیت اور ترونا کی آواز ان سب میں اونچی تھی۔ چمپا دریچے کے قریب جا کر سنتی رہی۔ پھر واپس آ گئی۔
"دریچہ بند کر دو۔" گوتم نے معاً کہا۔
"ہاں۔" چمپا نے جواب دیا۔ "یہ تو رات گئے تک ہلڑ مچتا رہے گا۔ لندن مجلس والوں کو اس کے علاوہ اور کوئی کام معلوم نہیں ہوتا۔"
"ارے رے —" گوتم نے چونک کر کہا۔ "وہاں شاید کمال بھی پہنچ گیا ہو — یہ لوگ رت جگا کیوں کرنے والے ہیں؟"
"صبح یہ سب بوڈاپسٹ جا رہے ہیں۔ اس لئے۔"
"بوڈاپسٹ — ؟"
"ہاں۔ وہیں۔ بالکل وہیں۔ نیلی ڈینیوب کے کنارے۔"
گوتم نے کان لگا کر آوازیں پہچاننے کی کوشش کی۔

"وہی سارے پرانے کورس ہیں اور اپ ٹا کے گیت۔" چمپا نے اکتاہٹ کے ساتھ کہا "ابھی تمہارا جی ان گانوں سے نہیں بھرا۔"

"ان گانوں سے میرا جی کس طرح بھر سکتا ہے چمپا بیگم —؟"

"اوہ — میں بھول گئی تھی کامریڈ گوتم — مگر تم ہی نے کہا تھا کہ دریچہ بند کردو۔"

اب وہ "بوجھ اٹھا لو ہیّا ہیّا" گا رہے تھے — گوتم نے باہر جاکر باغ کی دیوار پر سے جھانکا۔ بہت سے لوگوں کو ہاتھ ہلا کر ویو کیا اور واپس آ گیا۔ "نہیں کمال وہاں نہیں ہے —"

"گوتم ماشٹر —"

"ہاں بھائی —"

"کیا میں بہت ہی بیوقوف ہوں —؟"

"نہیں تو۔ لیکن کچھ ایسی زیادہ عقلمند بھی نہیں۔"

"بس — میں یہی پوچھنا چاہتی تھی۔ اچھا ہوا تم نے بتلا دیا۔ اب مجھے اطمینان رہے گا۔"

"گرو گوتم کو بلاؤ — گرو گوتم کہاں ہے۔" آشا کے گھر میں سے صدائیں بلند ہوئیں۔

"گرو گوتم ہری شنکر کے یہاں بیٹھا ہے —" کسی نے جواب دیا۔

وہ باہر جاکر دوستوں سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔ "نہیں میں آ نہیں سکتا۔ ایک بے حد ضروری فون کا انتظار کر رہا ہوں۔"

مگر دوسرے لمحے وہ دیوار کود کر گانے والوں کی منڈلی میں جا شامل ہوا۔ چمپا پھر اکیلی رہ گئی۔ اس کی دنیا کی کشش اس کے لئے زیادہ طاقتور ہے — یہ مجھے معلوم ہونا چاہیئے۔

بہت دیر بعد وہ ہری شنکر کے ڈرائینگ روم میں داخل ہوا۔ "کمال کا فون تو

نہیں آیا تھا — ؟" اُس نے سوال کیا۔ چمپا آتشدان کے سامنے قالین پر لیٹی پڑھ رہی تھی۔ "نہیں" اس نے جواب دیا۔ گوتم نے اس طرح اسے تنہا چھوڑ کر آشا کے یہاں چلے جانے کی معذرت نہیں کی۔ وہیں بیٹھ کر وہ بھی ایک کتاب پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ "یار چائے بنائی جائے۔" کچھ دیر بعد اُس نے تجویز کیا۔

"تم آشا کے یہاں پی کر نہیں آئے۔"

"ہاں مگر تم نے جو نہیں پی ہو گی۔ آشا تم کو اتنی دیر تک آوازیں دیتی رہی۔ تم وہاں آئیں کیوں نہیں — اب تم بنا لو چائے اپنے لئے۔"

بہت جلد تم کو میرا خیال آیا — چمپا نے کہنا چاہا۔ مگر وہ جھگڑنا نہیں چاہتی تھی۔ یہ اس قدر واہیات نسوانیت ہوتی۔ وہ چپ چاپ اُٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔

"آتا بھی ہے چولہا سُلگانا —" گوتم نے پیچھے سے مذاقاً آواز لگائی۔

"بنارس میں میری اماں خود کھانا بناتی ہیں۔" اُس نے مختصراً کہا۔

"مگر تم تو کیمبرج پلٹ ہو — !"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"چمپا رانی —" گوتم آ کر باورچی خانے کے دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ "آخر اس قدر افسردہ کیوں نظر آ رہی ہو —"

"اور کیا کروں۔ ناچوں —"

"یہ تو کوئی جواب نہ ہُوا۔ تم تو ایک زمانے میں بڑی سخت بذلہ سنج تھیں۔"

وہ دیکھو توس جلا دیا تم نے —"

"افسوس طلعت یہاں موجود نہیں جو تم کو پکوان بنا کر کھلاتی۔"

"چمپا۔ ایسی واہیات باتیں مت کرو۔"

"گوتم —" چمپا نے کیتلی اُٹھاتے ہوئے رسان سے کہا۔ "اگر تم چاہتے ہو کہ میں یہاں سے چلی جاؤں تو میں ابھی چلی جاؤں گی اور آئندہ تم سے کبھی ملنے کی

کوشش نہ کروں گی۔ غلطی میری ہی تھی کہ میں نے اتنے برسوں تم سے دوبارہ ملنے کی آس لگائے رکھی۔"

"چمپا رانی۔" گوتم باورچی خانے میں آ کر ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا سر اپنے ہاتھوں پر ٹکا دیا۔ "چمپا رانی ۔۔" اس نے بھاری آواز میں کہا۔ "اصلیت جاننا چاہتی ہو ۔۔ اصلیت یہ ہے کہ میں اپنے آپ سے ڈر رہا ہوں میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں تم سے کیا بات کروں۔ تم مجھ کو کیا بتانا چاہتی ہو اور میں تمھیں کیا سنانے کا متمنی ہوں ۔۔۔ اتنا طویل وقفہ گزر چکا ہے اور ظاہری طور پر ہمارے پاس باتیں کرنے کے لئے کوئی مشترکہ موضوع نہیں ہے سوائے ان خرافات کے جو ہم پچھلے دو گھنٹہ سے دہرا رہے ہیں ۔۔" اس نے سر اٹھا کر چمپا کو دیکھا۔ واقعہ یہ تھا کہ وہ چولھے کے پاس کھڑی اور زیادہ خوبصورت نظر آرہی تھی۔ اس نے چمپا کو آج تک اتنے گھریلو اور پُر سکون ماحول میں نہیں دیکھا تھا۔

وہ چائے بنا کر ڈرائینگ روم میں لے آئی۔

"ادھر آجاؤ۔" اس نے ذرا درشتی سے کہا۔ گوتم اس کی آواز کی درشتی سے ڈر سا گیا۔ وہ پھر آتش دان کے سامنے آن بیٹھے۔

محض کوئی بات کرنے کی خاطر گوتم نے دارجلنگ کے ایک بیگ کو چھوا۔ جو کرسی پر رکھا تھا۔ "کتنا خوبصورت ہے۔" اس نے کہا۔

"اس بیگ میں اپنے یہ کاغذات رکھ دوں ۔۔؟"

"رکھ دو۔۔"

اس نے لفافے بڑی احتیاط سے بیگ میں ٹھونس دئے۔

اب پھر باتیں ختم ہو گئیں۔

"اس بیگ میں ۔۔" اس نے گلا صاف کر کے پھر کہنا شروع کیا۔ "تمھارا سامان ہے نا۔ چلتے وقت مجھے یہ کاغذات نکال دینا۔ ورنہ سب گڑبڑ ہو جائے گا۔"

"زیر بحث بیگ ۔۔" چمپا نے تلخی سے کہا۔ "میرا نہیں سرکھیا کا ہے۔ اس میں

تم اپنا سامان رکھ سکتے ہو۔ اسے اپنے گھر لے جا سکتے ہو۔ میری اور تمھاری کوئی چیز مشترک نہیں ہے۔ نہ یہ بیگ۔ نہ کاغذات۔ نہ یہ مکان۔ چیزیں۔ حتیٰ کہ یادیں۔ کچھ بھی نہیں جس میں تمھارے ساتھ حصّہ لگا سکوں۔ صرف دُکھ مشترک ہے۔ لیکن تم اپنے دُکھ بھی اپنے لئے ہی محفوظ رکھنا چاہتے ہو۔"

گوتم خاموش رہا۔

"کیا تم کو معلوم ہے گوتم نیلمبر، کہ گو پچھلے سات سال سے میں نے تم کو نہیں دیکھا مگر مجھے پتہ ہے کہ تم ہر سمے، سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے، اپنے خلاف گواہی دیتے رہے ہو۔۔۔؟"

"ٹھیک ہے۔ میں جس سے بات کرتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے میرا مخاطب میرا کنفیسر ہے میرا سارا وجود میرا اعتراف ہے۔ میں نے کتنے قتل کئے ہیں۔ تم کو مارا ہے۔ اپنے آپ کو ختم کیا ہے۔ میرا جرم تمھارے جرم سے مختلف ہے۔ تمھارے اندر معصومیت کا جرم چھپا ہوا ہے ایک بات بتاؤ۔" اس نے رُک کر کہا۔ "تصوّرِ گناہ، تمھارے نزدیک کیا ہے۔"

"کسی کا دل دُکھانا۔۔۔" چمپا نے سوچ کر جواب دیا۔

"اور۔۔۔؟"

"ریاکاری۔۔۔"

"اور۔۔۔؟"

"اور۔۔۔ اور کمینہ پن۔۔۔" اُس نے دماغ پر اور زیادہ زور ڈال کر جواب دیا۔

"سنڈے اسکول کے سبق۔۔۔"

"ایں۔۔۔؟" چمپا نے اس کی بات اچھی طرح نہیں سمجھی۔

"میں نے دل دُکھایا ہے۔۔۔ تمھارے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ ہے۔۔۔؟"

"بہت بڑا۔"

"لیکن تم کو جلد یہ معلوم ہو جائے گا چمپا رانی کہ راستے میں بعض ایسے موڑ آتے

ہیں جب کسی دوسرے کا دل دُکھانا بالکل ناگزیر اور لازمی ہو جاتا ہے۔"
وہ قاتل بھی قتل کرتے وقت یہی سوچتا ہے کہ یہ قتل بالکل ناگزیر اور لازمی ہے۔ ورنہ وہ قاتل ہی کیوں بنتا — ؟"
گوتم پھر خاموش ہو گیا۔
"سُر اونچے نیچے ہوتے جا رہے ہیں —" کچھ دیر بعد اس نے باہر کی آوازوں پر کان لگاتے ہوئے کہا۔ "مگر ہارمنی کی طرف بڑھتے ہوئے دفعتاً رُک گئے ہیں۔" اس نے پیانو کے نزدیک جا کر پردوں پر اُنگلیاں پھیریں۔
"اس کا ایک سُر کہیں سے ٹوٹ گیا ہے۔" چمپا نے کہا۔
"مجھے معلوم ہے۔ پیانو میں اکثر چوہے اپنا گھر بنا لیتے ہیں۔ میرے پیانو میں، بہرائچ میں اکثر آدھی رات کو ایک پیارا موٹا سا چوہا اندر تاروں پر دوڑ دوڑ کر سمفنی بجایا کرتا تھا —"
"تم نے مجھ سے بہرائچ کا ذکر کبھی نہیں کیا۔"
"بڑی پیاری جگہ ہے — کیونکہ میرا وطن ہے —"
"ہم سب ایک دوسرے کے رحم و کرم پر زندہ ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ وقت میں مقید ہیں۔ یہ بڑی کوفت کی بات ہے۔" اُس نے چند لمحوں بعد اُلجھ کر کہا۔
حالانکہ یہ وقت بڑا غیر حقیقی تھا جس میں کمرے کی ہر چیز بے حد روشن اور واضح نظر آ رہی تھی۔ باغ کے پھولوں پر سے برف پگھلنا شروع ہو گئی۔
"یہ جوتا دیکھو —" معاً گوتم نے ٹانگیں آگے بڑھا کر سنجیدگی سے کہا۔ "زندگی اس کی طرح فِٹ نہیں بیٹھتی —" پھر اس نے ایک توس کا ٹکڑا اُٹھا کر بلّی کو پھینکا جو دریچے میں آن بیٹھی تھی۔ اُس نے توس سونگھ کر چھوڑ دیا۔
"یہ بھی بوہیمین بلّی ہے۔ توس نہیں کھاتی۔ اس کے لئے ڈبل روٹی اور شمپین لاؤ۔" پھر وہ چمپا سے مخاطب ہوا۔ "چمپا تم نے اتنے دنوں بیکار میرا انتظار کیا۔ میں بالکل بوگس ہوں۔" وہ آتش دان کے پاس بیٹھی اسے خود بے حد غیر ضروری نظر آئی۔

غیر ضروری اور سخت بیوقوف۔ اب بھلا اس کی کیا تک ہے کہ اتنی گنوان ہونے کے باوجود مجھ جیسے لپاڑی آدمی کی آس لگائے بیٹھی ہیں۔ حد ہے۔ بے وقوف لڑکی ہے اور سخت معصوم۔ بورژوا فلسفی بے چاری۔ اگر اس کے دماغ کو کھرچا جائے اندر سے تو اس میں سے کتنی فالتو مٹی ملے گی۔ ہزاروں سال پرانی مٹی۔ ٹیراکوٹا۔ طلعت نے اتنے سارے مشہور لوگوں کے سر بنائے ہیں۔" اس نے بآواز بلند کہا "تم نے کبھی اس سے اپنا سر بنوا کے نہ دیا۔ اب بھی وقت ہے بنوا لو۔ تم کہیں جا تو نہیں رہیں۔" اس نے پُر امید لہجے میں پوچھا۔

"فی الحال تو نہیں — ہم ایک دروازے سے داخل ہوئے تھے مگر باہر جانے کے سب دروازے بند ہو چکے ہیں —"

"تمھاری اتنی معصومیت بھی غلط ہے۔ بیکار ایک دم۔" وہ ٹہلتا ہوا مجسموں کی طرف چلا گیا اور ان کے سر ٹھونک بجا کر دیکھنے لگا۔ "کیونکہ —" اس نے ایک مجسمے کی ناک چھوتے ہوئے کہا۔ "ہر دفعہ تم پکڑی جاؤ گی — تمہارا خیال ہے تم نے فیصلہ کر لیا۔ اس لئے اب ہر بات آسان ہے۔ حالانکہ یہ اتنا آسان نہیں ابھی تم پر اور مصیبتیں آئیں گی —"

وہ دریچے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ لمحہ گھومتا چکر کاٹتا ناچتا رہا۔ لمحے کا بھنور دور دور تک پھیل گیا۔ ختم ہو گیا۔ باقی رہا جگمگاتی ہوئی برف پر سے پھسلتی روشنی کمرے میں داخل ہوئی۔ پیٹرن مکمل ترین بن گیا۔ وہ ساکت و صامت آتشدان کے پاس بیٹھی رہی۔ کمرے کے تجربے میں بلی بھی شریک تھی — ہوائیں بھی جانتی تھیں۔ بہت دور سڑک کی موٹریں۔ راہگیر۔ دوکانیں سب کو معلوم ہو چکا تھا۔

اب سارا وجود ایک کتاب ہے۔ جسے میں پڑھ چکی ہوں اور رات سمے تک کئی بار پڑھوں گی — چمپا نے اپنے آپ سے کہا۔

"دو دنیائیں ہر سمے میرے ساتھ رہتی ہیں۔ ایک دنیا میں یہ سب لوگ ہیں" اس نے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ "دوسری دنیا میں صرف میں اور تم تنہا ہیں۔"

دونوں کے درمیان ایک پُل ہے۔ جس روز یہ پُل ٹوٹ گیا تو کیا ہوگا۔"
"پُل تم خود توڑو گے۔"
"نہیں —— لوگوں نے چاروں طرف مشین گنیں لگا رکھی ہیں۔ جھاڑیوں میں توپیں چھپی ہیں۔ اُوپر بادل گرج رہے ہیں۔ ایک روز مجھے لگتا ہے لوگوں کی دُنیا پاتال میں گر کر غائب ہو جائے گی۔ میں باہر ہاتھ پاؤں مارتا رہ جاؤں گا۔ یہ سوچ کر دل ڈوب جاتا ہے۔"
"تم اپنی اسپوٹ لائٹ لئے چھت کی کڑیوں میں چھپے بیٹھے ہو جو شامت کا مارا اسٹیج پر آتا ہے تم انتہائی کمینے پن سے اچانک لیمپ کا رُخ اُس کی طرف کر دیتے ہو۔ وہ روشنی میں عیاں ہو جاتا ہے۔"
"میں خود بھی تو برابر اس روشنی میں ہوں۔"
"نہیں تم پردوں کے پیچھے چھپے رہتے ہو — اگر کسی روز ایک سرچ لائٹ تم پر پڑ گئی تو کیا ہوگا۔ اس دن تم اُوپر کی منزل سے چھلانگ لگا کر سرپٹ نکل بھاگو گے۔ کھڑکیوں میں لوگ تمھیں نظر آئیں گے۔ اسٹوو کے گرد بیٹھے بحثیں کرتے، کھانا پکاتے کھاتے تم کسی آوارہ گرد بلے کی طرح چاند کے مقابل میں چھت کے ٹائلوں پر دبے پاؤں چلتے ہوئے آؤ گے۔ تمھارا چہرہ ہمیں کھڑکی کے شیشوں میں سے نظر آئے گا — بوگی مین —!"
"اور اس سمے میں تمھارے ساتھ وہیں موجود ہوں گا۔ اسٹوو کے گرد بحثیں کرتا، کھانا بناتا کھاتا۔ اور تم مجھے کھڑکیوں میں سے جھانکتا دیکھو گی —— بوگی مین —!!"
وہ خاموش ہو گئے
وہ اُچک اُچک کر دیواروں کی تصویریں دیکھتا پھرا۔ پھر دریچے کی طرف چلا گیا۔
"آج بہت برف پڑی —" دریچے میں کھڑے کھڑے گوتم نے ایک

جنرل اسسٹنٹ دیا۔

ابھی، اس کے بعد بھی باقی ہے۔ اس کے بعد، جو موت تک، ابد تک پھیلتا چلا جائے گا۔ موجود رہے گا ___ چمپا نے اپنے آپ سے کہا۔

"سرکھیا کا باغ کتنا خوبصورت ہے۔" گوتم نے کمرے کی طرف سے پُشت کئے کئے دُوسرا بیان دیا۔

میری کوئی قسمت نہیں۔ سُنا ہے لوگوں کی قسمتیں ہوتی ہیں۔ چمپا نے اپنے آپ سے کہا۔

معاً وہ چونکا اور پیچھے مُڑا۔ اُس کا چہرہ دُھلے ہوئے کپڑے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ سارا دن گزر گیا ___ سُورج ڈھل چکا ___ شام آ گئی ___ میں ابھی یہیں ہوں ___ میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔ میں نے اتنا وقت برباد کیا ___ اتنا انمول۔ انمول وقت ___ وہ بڑبڑایا۔ اور تیر کی طرح گیلری کی اور بڑھا۔ ڈائیننگ ٹیبل پر رکھے ہوئے پارسل پر اُس کی نظر پڑی۔ اُس نے پیچھے پلٹ کر چمپا کو نہیں دیکھا۔ پارسل جھپٹ کر وہ بگولے کی طرح باہر نکلا اور موٹر میں بیٹھ کر دیوانہ وار مڈہرسٹ کی جانب روانہ ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد چمپا نے جُھک کر دارجلنگ کے بیگ میں سے کمال کے نام کے وہ ملبے ملبے سرکاری لفافے نکالے جو گوتم یہیں بھول گیا تھا۔ اس نے ان کو کھولا۔

ایک ایک کر کے ہر ٹائپ شدہ خط میں کمال کی ملازمتوں کی درخواستوں کو نامنظور کیا گیا تھا۔

۹۱

آئے پریم نگے پروانے۔ جو ال منی چھوی کے دیوانے
جرت چلمن کے پیچھے دسے بیٹھی

دیپ شیکھا لہرائے رہے۔ دیپ شیکھا لہرائے رہے۔
دیپ شیکھا لہرائے رہے۔
چندرا گاتی ہوئی باغ سے کھانے کے کمرے کے اندر آ گئی۔
"طلعت — چائے —" اس نے میز پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
طلعت نے چائے انڈیلی۔

سرکھیا انہماک سے ریڈیو ٹیون کرتی رہی۔ زرینہ نے باغ کے رخ دروازے میں پھیلی ہوئی دھوپ میں ایزل رکھ کر ایک اور تصویر شروع کر دی۔ پڑوسن نے باڑ پر سے سر نکال کر تھوڑی سی شکر مانگی۔

دنیا کا کام سکون سے جاری رہا۔ بلکہ جب سے نرملا مری تھی دنیا کا کام اور زیادہ سکون سے جاری تھا۔ سب اپنی اپنی مصروفیات میں اس طرح جٹے تھے۔ گویا اس سے پہلے انھیں پتہ ہی نہیں تھا کہ ان کے فرائض کیا ہیں۔ اسی شدید مصروفیت کے مارے وہ ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے تھے۔ طلعت اخبار کی رپورٹیں لکھتی۔ کملا مڈل ٹمپل میں ڈنر کھاتی۔ فیروز کتابیں سنبھال کر بڑی سعادت مندی سے روز یونیورسٹی کا رخ کرتی۔ کمال اشکنتلا یا سرکھیا کے ڈرائینگ روم میں آتش دان کے سامنے اوندھے لیٹ کر مزید درخواستیں لکھتا۔ ہری شنکر نے ایک نیا مشغلہ شروع کر دیا تھا۔
وہ چڑیوں کے پر جمع کیا کرتا۔

نرملا کو مرے آج محض دسواں روز تھا مگر معلوم ہوتا جیسے اسے ان لوگوں سے رخصت ہوئے کئی سو سال گزر چکے ہیں۔ وقت ربر کی طرح پھیلتا چلا جا رہا تھا۔
جس روز ایک جھٹکے کے ساتھ ربر کا یہ تناؤ ٹوٹے گا تو کیا ہوگا —

"اب ہمیں نرمل کے دسویں کی فکر کرنا چاہیئے نا — ؟" شنکر نے چڑیوں کے پروں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے اس طرح کمال سے کہا جیسے وہ اکثر اس سے پوچھتا تھا "اب ہمیں نرمل کے بیاہ کی فکر کرنا چاہیئے نا —"
"ہاں۔ شاید" — کمال نے آہستہ سے جواب دیا۔

"یہاں کوئی پنڈت جی بھی نہیں ہیں جن سے پوچھ لیتے کہ آج کے روز ہمیں کیا کرنا چاہیئے تھا ـ" طلعت نے بھی ہری شنکر ہی کی طرح بڑے عملی انداز میں بات کی۔ بُرا بھلا زندگی کا کاروبار نرملا نپٹا کر چلی گئی تھی مگر اُس کی موت کے بعد کے کاروبار تو ابھی باقی تھے۔

فون کی گھنٹی بجی :

شیلا دیبی پوچھ رہی تھیں کہ اگر تم لوگوں نے دسویں کا کچھ انتظام نہ کیا ہو تو فکر نہ کرو۔ سوامی دیویکانندجی کہہ رہے ہیں کہ ان کے سنٹر میں ـــ

"جی ـــ جی ہاں ـــ جی بہت اچھا ـــ شکریہ ـــ" کمال نے ریسیور رکھ دیا۔

موت بھی سوامی دیویکانند کی طرح فراڈ ہے۔

اب پھر وہ سب اپنی اپنی شدید بہادری کا ثبوت دینے کے لئے اپنے اپنے مورچوں پر جا بیٹھے۔ طلعت نے ایک مضمون ٹائپ کرنا شروع کر دیا۔ سُرکھیا گیلری میں جا کر ڈانس کی مشق میں مصروف ہو گئی۔ ہری شنکر نے پروں کا البم اُٹھا لیا۔

وقت کا سناٹا بہت سی توپوں کی طرح گرجنے لگا۔ گھڑی نے تین بجائے۔

کمال نے بزبانِ خاموشی ہری شنکر سے کہا۔" سررو جر سے ڈیتھ سرٹیفکیٹ لینے جانا ہے ـــ" کیونکہ اس لرزہ خیز جملے کو الفاظ میں تو نہیں ادا کیا جا سکتا تھا۔

"لے آؤ۔" ہری شنکر نے اسی خاموشی میں جواب دیا۔

"ڈہرسٹ سے نرملا کا سامان بھی آنا ہے ـــ" طلعت نے اپنے خاموش الفاظ بھی اسی سناٹے میں انڈیل دیئے۔

"لیکن ہم ڈہرسٹ کس طرح جا سکتے ہیں ـــ" کمال نے اسی طرح احتجاج کیا۔

ہری شنکر نے ان الفاظ کو ڈی کوڈ کیا۔ ہاں ـ مگر ہم بہت بہادر ہیں۔ ہم ضرور جائیں گے ہم سرٹیفکیٹ بھی لائیں گے اور اس کا سامان بھی۔ چلو اُٹھو۔ اپنے اپنے زرہ بکتر پہنو۔ لفٹ رائٹ۔ مارچ کرو۔ اپنے پُرانے آزمودہ ہتھیار سنبھالو۔ چلو ہم جا کر نرملا کے

زرہ بکتر اور ہتھیار واپس لے آئیں جن کی اب اسے ضرورت نہیں۔
اس پنٹو مائم کے بعد جسے کسی نے، خود انھوں نے نہیں دیکھا۔ وہ سب باہر نکلے، موٹر میں بیٹھے اور ایک جانے پہچانے راستے پر روانہ ہو گئے۔ چار سال تک متواتر وہ اس سڑک پر سے گزر کر سینی ٹوریم جاتے رہے تھے۔
اب وہ آخری بار مڈہرسٹ سے لوٹ رہے تھے۔ شام کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ خاموشی سے موٹر سے اتر کر وہ اس روڈ ہاؤس میں گئے جہاں وہ ہمیشہ نارنگیوں کے سائے میں بیٹھ کر چائے پیتے تھے۔ روڈ ہاؤس کی مالکہ موٹی سارہ نے باہر آ کر ان کے سامنے چائے رکھی۔ وہ بھی اس پنٹو مائم میں شامل ہو گئی۔
سینٹ جانز ووڈ میں اپنے فلیٹ پر واپس پہنچ کر کمال نے سارا سامان گیسٹ روم میں رکھ دیا۔ جس میں ہری شنکر ٹھہرا ہوا تھا۔
جب سب لوگ اپنے مورچوں پر واپس لوٹ گئے تو طلعت نے چوری سے نظر بچا کر اپنا مورچہ چھوڑا۔ اپنا زرہ بکتر اتار کر گیسٹ روم میں داخل ہوئی۔
ہری شنکر پردوں کا البم میز پر ڈال کر کمال کے ساتھ باہر چلا گیا تھا۔ کمرے میں ہر چیز لیمپ کی روشنی میں بڑی واضح نظر آ رہی تھی۔ آبنوس کا فرنیچر۔ وکٹورین وضع کا اونچا سائیڈ بورڈ جس پر الم غلم بہت سی فالتو چیزیں رکھی تھیں۔ دیوار پر ایک موڈرن پینٹنگ لگی تھی جسے ایک مرتبہ طلعت کسی کباڑی کی دوکان سے بہت سستی خرید لائی تھی۔ ایک تانبے کا سو سال پرانا مجسمہ جو ایک مرتبہ طلعت نے کیمڈن ٹاؤن میں ایک کباڑیئے سے محض چند شلنگ میں خریدا تھا۔ پرانے اخبار اور رسالے۔ تقریباً شکستہ صوفہ۔
ان سب چیزوں کے درمیان گھرے ہوئے جبکہ نرملا کا سامان اس کے قدموں میں پڑا تھا۔ اسے لگا گویا اس کی زندگی، ساری زندگی ایک بہت عظیم الشان کباڑی کی دوکان ہے۔ یہ سب سامان فالتو ہے۔ ان سب چیزوں کو ذرا بیچ کر تو دیکھو اپنی زندگی کو ذرا اس کباڑی مارکیٹ میں رکھو۔ موت اس کی قیمت ہے۔

دفعتاً پھر اس کے کانوں میں ایک توپ دغی۔ موت۔

سامنے سائیڈ بورڈ کے گوشے میں وہ چھوٹا سا مرتبان تھا جس میں کماری نرملا سریواستوا کی راکھ تھی۔ اس کی کنجی ہری شنکر کے پاس تھی جو گویا اس کا قانونی وارث تھا۔ اس مرتبان کو گنگا میں بہانے کے لئے اپنے ساتھ واپس وطن لے جائے گا۔ جو اس وقت کمال کے ساتھ اسی موت کے سلسلے کے باقی ماندہ آخری انتظامات کرنے کے لئے گیا ہوا تھا۔ آخری انتظامات۔ ڈیتھ سرٹیفکیٹ۔ گیتا کا پاٹھ۔ ہوائی جہاز کا ٹکٹ۔

ہر شے میں بڑی واقعیت تھی۔ وہ مرتبان بھی اتنا ہی ٹھوس اور حقیقی تھا جیسے یہ کرسی یا وہ صوفہ۔ یا کھانے کے برتن۔

کون اُلّو کا پٹھا کہتا ہے کہ موت ماورائی ہے۔

موت سے زیادہ پھیچر بیکنڈ ریٹ بات کیا ہوگی۔

یعنی ذرا یہ غور کیجئے کہ دوسروں کی موت پر ٹپکو ٹپکو روتے ہیں اور پھر خود مر جاتے ہیں۔

ارے میں کہتی ہوں۔ رونے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ایک سخت ایڈیٹ لڑکی تھی۔ اس کا یعنی کہ انتقال ہو گیا۔ کون سی ایسی طرم جنگ تھی۔

اور لکھنؤ میں آپ ردولی والی ثریا باجی کی مرنے کی خبر سن کر کتنا روئی تھیں جب کمال نے ڈانٹا تھا کہ صرف دو دفعہ تو ملی ہی تھیں۔ ثریا باجی سے اس قدر دھاڑیں کیوں مار رہی ہو تو اس نے جواب دیا تھا۔ میں تو اصولاً رو رہی ہوں جب کسی کا انتقال ہو جائے تو کیا ہنسنا چاہیئے ——؟

یوں بھی سب کو ثریا باجی کے انتقال کا بہت غم ہوا تھا۔ کیونکہ مرحومہ بارہ بنکی والے اصغر بھائی پر جان دیتی تھیں اور اصغر بھائی نے وعدہ تو ان سے بیاہ کا کیا تھا مگر ایک روز نینی تال جا کر کسی عیسائی لڑکی سے انھوں نے شادی رچالی تھی۔ اور اس صدمے سے ثریا باجی کو سل ہو گئی تھی اور کئی سال تک ردولی کی نیم تاریک کوٹھڑی میں پلنگ پر پڑے رہنے کے بعد انھوں نے اس جہان فانی سے کوچ کیا

تھا۔

اور چونکہ وہ نہ رفاقتہ تھیں۔ نہ انٹلکچوئل۔ نہ لیکھکا۔ نہ چترکار۔ نہ ہی لیڈر۔ لہٰذا نہ ان کی تصویریں چھپی تھیں۔ نہ ان پر مضمون لکھے گئے۔ ان کے جہیز کے کپڑے اور ان کی حیدرآبادی چوڑیاں زنانہ اسلامیہ یتیم خانے میں بھجوا دی گئی تھیں اور ان کے چالیسویں کے بعد جس میں لکھنؤ سے رشتے دار آ کر شریک ہو گئے تھے۔ گویا اسٹیج پر پردہ گر گیا تھا۔ ہاں ان کے مرنے کے دوسرے روز لکھنؤ کے مسلم اسکول کے اسمبلی ہال میں ان کی مغفرت کی دعا بھی مانگی گئی تھی جہاں انھوں نے ایف اے تک پڑھا تھا۔

یوں بے چاری ثریا باجی کی زندگی کا افسانہ ختم ہوا تھا جو کوئی ایسا لمبا چوڑا افسانہ بھی نہ تھا۔ ایک بڑے، غیر اہم قصّے کا بے حد غیر اہم کسب پلاٹ تھا۔

ٹپیکل مسلم شوشل پکچر۔

مگر نرملا تو بڑی غیر معمولی لڑکی تھی۔

وہ بھی اس معمولی طریقے سے ختم ہو گئی۔

اری نرملا کی بچّی۔ ایڈیٹ۔ ارے بھائی تو بھی اتنی ہی حقیر نکلی۔ کہاں گیا وہ تیرا سارا فلسفہ اور آئیڈیالوجی۔ مگر واقعہ صرف یہ ہے کہ سچ مچ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا۔ جب لاد چلے گا بنجارہ — وغیرہ — واقعہ صرف یہ ہے کہ آپ کی زندگی ہی کیا تھی۔ لمبی چوڑی۔ عمر تو محنت کرتے، پروگرام بناتے گزری۔ رات رات بھر پڑھا جا رہا ہے کہ فرسٹ ڈویژن مل جائے۔ یا اللہ۔ اچھا سیکنڈ ڈویژن ہی مل جائے۔ ہائے بھگوان کم از کم پاس ہی ہو جائیں بچی۔۔ پھر ملک اور قوم کی فکر میں جان دے رہی ہیں لڑتی بھڑتی پھر رہی ہیں جہاں کسی نے کوئی غلط بات کہی اور یہ کاٹ کھانے کو دوڑیں ہر بحث میں بیچ کو دنے کو موجود۔ پھر جب فرسٹ کلاس مل گیا تو کیمبرج جانے کے لئے انھوں نے منہ نامنتھ مچا دی۔ ان کے بابا نے بڑی مشکل سے روپیہ جوڑ کر، ان کو ولایت بھیجا۔ وہاں یہ خوشی سے پھولی نہ سمائیں۔ کئی دن تک تو ان کو یقین نہ آئے کہ واقعی کیمبرج میں موجود ہیں۔ سہمی سہمی پھریں کہ یہ خواب ہے جلد ٹوٹ جائے گا۔ پھر

پروگرام بنے کہ جب یہاں سے پڑھ کر نکلیں گی۔ اچھی سے اچھی ملازمت ملے گی۔ بابا پر جو قرضہ چڑھا ہوا ہے وہ اتاریں گی۔ بھتیجی کے لئے بہو ڈھونڈیں گی۔ پری زاد بالکل پھر ذرا پیسے جمع ہو گئے تو میکسکو کی سیر کریں گی جا کر (یہ جانے میکسیکو جانے کا انتا شوق کیوں تھا) یہ موہوم سی امید بھی تھی کہ ایک روز ایک اپنا مکان بھی بنے گا۔ اس میں ایک چھوٹا موٹا سا باغ ہو گا۔ روک گارڈن۔ مکان کا نام رکھیں گی ---- کسی قسم کا کنج ---- یا کچھ اور ---- خیر ---- کومل جی سے پوچھ لیں گی وہ شاعرہ ہیں۔ اتنی تو تھی مستقبل کی چنتا۔ پھر یہ کہ بلیاں پل رہی ہیں۔ کتے۔ کبوتر۔ گائیں بھینسیں پالنے کا بھی شوق ہے اور ساریوں پر تو خیر دم نکلتا ہے۔ نیا اوورکوٹ بنانے کے لئے وہ مہا بھارت مچائے ہوئے ہیں۔ ضد ہے کہ جیسے زمرّد کے گہنے لاج کے بنے ہیں ایسے ہی میرے بھی بنیں۔ اپنی سہیلیوں کے لئے جان حاضر ہے۔ چند لوگوں سے سخت جلن بھی ہے۔ محبّت کی اہلیت بھی ہے۔ جو ہر انسان، ہر جاندار میں ہوتی ہے

پھر ہوا یہ کہ کیمبرج میں ان کو بخار ٹھہر گیا۔ ان کو ہسپتال پہنچایا گیا جہاں کئی سال تک پلنگ پر لیٹے رہنے کے بعد ایک روز آپ نے جان شیریں جاں آفریں کے سپرد فرما دی۔"

تو کیا اس موت پر اصولاً رونا چاہیئے ---- قطعی نہیں۔ یہ تو بڑی سخت ہنسی کی بات ہے۔ دراصل اس سے زیادہ لطیفے کی بات تو طلعت نے بہت دنوں سے نہیں سُنی تھی۔

اُس نے کمرے کا چکّر لگایا۔ سارے فلیٹ میں گھومی۔ باغ کے سرے پر باورچی خانے میں روشنی ہو رہی تھی۔ چندرا اور سرلکھا کے سائے دریچے میں سے نظر آ رہے تھے۔ گھوم پھر کر وہ پھر ہری شنکر کے کمرے میں واپس آ گئی۔ فرش پر بیٹھ کر اُس نے نرملا کے سامان کو اکٹھا کر کے سنگوانا چاہا ---- بے دلی سے اُس نے چیزیں اُلٹی پلٹیں۔ کتابوں کے بکس میں گیتا پر اس کی نظر پڑی۔ اسے نکال کر وہ ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

لیمپ جلا کہ اُس نے اصولاً گیتا کا صفحہ کھولا۔ اس احساس کے ساتھ کہ گویا وہ شانتی کے حصول کے لیے اس آسمانی صحیفے کا مطالعہ کر رہی ہے۔ اس نے بے حد دھیان سے پڑھنا شروع کیا:

ان کو بہادری سے جھیل۔

جسم فانی ہیں لیکن ان جسموں کے اندر رہنے والی روحیں امر ہیں۔ چنانچہ لڑ۔ او بھارت کے فرزند۔ آتما نہ قتل کرتی ہے۔ نہ خود قتل ہوتی ہے۔ تلوار اسے زخمی نہیں کر سکتی۔ آگ اُسے جلا نہیں سکتی۔ پانی اسے بھگو نہیں سکتا۔ ہوا اسے خشک کرنے سے قاصر ہے جو پیدا ہوا اُس کی موت یقینی ہے۔ جو مرا اس کی پیدائش اٹل۔ اس میں دُکھ کی کیا بات ہے؟

دُکھ اور سُکھ، نفع نقصان، ہار جیت کو ایک سمجھ کر تُو جنگ کر۔

تب ارجن نے کہا۔ او کیشو۔ اگر خرد کی راہ عمل کی راہ سے افضل ہے تو تُو مجھے جنگ کرنے کے لئے کیوں کہتا ہے؟ جنگ کا عمل خوفناک ہے۔۔

بھگوان نے جواب دیا۔ انسانوں کو کام نہ کرکے کرم سے نجات نہیں مل سکتی۔ نہ کرم سے بے نیاز ہو کر وہ مکمل بن سکتا ہے کیونکہ پراکرتی سے پیدا شدہ گنوں کے زیرِ اثر انسان متواتر مصروفِ عمل رہتا ہے۔

او ارجن! تُو اور میں کئی بار پیدا ہوئے ہیں۔ گو میں خداوندِ عالم ہوں۔ لیکن اپنی پراکرتی پر قدرت رکھتے ہوئے اپنی مایا کے ذریعے خود وجود میں آتا ہوں۔ او بھرت جب دنیا میں نیکی کا زوال ہوتا ہے تو میں خود کو مجسم کر لیتا ہوں اور جو میری الوہی پیدائش اور میرے عمل کو پہچان لیتا ہے۔ اے ارجن وہ اپنا جسم چھوڑنے کے بعد دوبارہ پیدا ہونے کے بجائے مجھ سے آن ملتا ہے۔ بڑے بڑے گنوان گھبرا جاتے ہیں کہ کرم کیا ہے اور نہ کرم کیا۔ وہ جو نہ کرم میں کرم اور کرم میں نہ کرم دیکھتا ہے وہی اصل گنوان ہے۔ او ارجن، عقل کی آگ کرموں کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔

او جنار دھن — میری پراکرتی مٹی، پانی، ہوا، آکاش، دماغ، ذہن اور

انانیت میں منقسم ہے۔ یہ ادنیٰ درجے کی پراکرتی ہے لیکن اے مضبوط بازوؤں والے شہزادے۔ میری اعلیٰ پراکرتی وجود اور حیات کے احساس اور شعور میں موجود ہے جس کے سہارے یہ کائنات قائم ہے۔ میں ہی ابتدائے عالم ہوں اور میں ہی اس کی انتہا! او کنتی کے بیٹے۔ میں پانی کا سواد ہوں۔ سورج اور چاند کی روشنی۔ میں سارے ویدوں میں لکھا ہوا اوم ہوں۔ میں آکاش کی آواز ہوں۔ میں انسانیت کی اجتماعی خود آگہی ہوں۔ میں زمین کی متبرک خوشبو ہوں۔ میں سارے جانداروں کی جان ہوں راہبوں کا زہد ہوں۔ جو جس عقیدے سے میری عبادت کرتا ہے۔ میں اسے بھگتی میں تبدیل کر دیتا ہوں۔ میں عالم الغیب ہوں لیکن مجھے کوئی نہیں جانتا۔

میں عبادت کے مختلف طریقے ہوں۔ میں ہی جڑی بوٹی ہوں اور پوجا کی آگ۔ میں خود ہی پوجا کا عمل بھی ہوں۔ میں کائنات کا باپ ہوں۔ میں ہی ماں۔ میں راستہ ہوں اور گواہ۔ اور آخری جائے پناہ۔ ابتدا۔ انتہا۔ آرام گاہ۔ گنجینہ اور ازلی بیج۔ او ارجن! میں تپش پیدا کرتا ہوں مینہ برساتا ہوں۔ میں ابدیت ہوں۔ میں موت ہوں میں وجود اور عدم وجود ہوں۔ میں وشنو ہوں۔

ویدوں میں میں سام وید ہوں۔ دیوتاؤں میں اندر، حواس میں ذہن ہوں اور خود آگہی۔ رودروں میں شنکر ہوں۔ پہاڑوں میں کوہ میرو۔ میں بزرگ ترین کاہن برہسپتی ہوں۔ سپہ سالاروں میں میں سکند ہوں پانیوں میں مہاساگر، الفاظ میں اوم۔ عبادت میں جپ۔ نہ ہلنے والی چیزوں میں ہمالیہ ہوں۔ رشیوں میں نارد۔ میں فلسفی کپل ہوں۔ گھوڑوں اور شاندار ہاتھیوں اور انسانوں میں الگ الگ میرا بادشاہ کا رتبہ ہے ناگوں میں میں اننت ہوں۔ پانی کے باسیوں میں ورن۔ فرمانرواؤں میں یم۔ پیمائش میں میں وقت ہوں۔ جنگلی جانوروں میں شیر ببر، پرندوں میں گرڑ۔ جنگجو بہادروں میں رام، دریاؤں میں گنگا ہوں۔

میں بے پایاں وقت ہوں۔ میں تباہ کن موت ہوں۔ میں عورت کی گفتار اور ذہانت، وفاداری اور رحمدلی ہوں۔ میں گائتری منتر ہوں۔ میں جیت ہوں۔ جدوجہد ہوں

میں ہیں ویاس ہوں۔ رتوں میں بسنت ہوں۔ اناجوں میں جو۔ میں سنسار کا آدھار
اور انت ہوں۔ میں رازوں کا سناٹا ہوں — او ارجن! — میرے الوہی
مظاہر بیکراں ہیں —

او ارجن —

او ارجن کے بچّے۔ ایڈیٹ —

وہ کتاب زور سے بند کر کے پھر اُٹھی۔ اُس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ نو بجنے والا
تھا۔ ابھی ہری شنکر اور کمال لوٹتے ہوں گے۔ اُس نے ابھی ہری شنکر کا کمرہ بھی
ٹھیک نہیں کیا تھا۔ وہ دوبارہ گیسٹ روم میں داخل ہوئی۔ فرش پر بیٹھ کر اُس نے
ایک بار پھر نرملا کی چیزوں کو درست کرنے کی کوشش کی — ساریاں۔ جوتے۔
چوڑیاں۔ میک اپ کے پٹارے۔ ہینڈ بیگ جس میں دُنیا بھر کی الا بلا جمع تھی۔
جو لڑکیوں ہی کے ہینڈ بیگ میں سے دستیاب ہو سکتی ہے۔ بس کے ٹکٹ۔ لانڈری
کے بل۔ پُرانے خالی لپ اسٹک۔ کانوں کے بُندے۔ پنیں۔ پیسے۔ خریداری
کی فہرستیں۔ اور جانے کیا کیا۔ ان سب چیزوں پر چار سال قبل کی تاریخیں پڑی تھیں۔
چار سال سے نرملا دُنیا سے الگ تھلگ سینی ٹوریم میں مقیّد تھی۔ پھر اُس نے نرملا
کی کتابوں کا بکس پیک کرنا چاہا۔ ایک کتاب میں سے ایک تصویر ٹپ سے نیچے
گری۔ طلعت نے جھک کر اُسے اُٹھایا۔

یہ گوتم نیلمبر کی تصویر تھی۔ جو آج سے دس سال قبل بر دکھوے کے لئے بہرائچ
سے سنگھاڑے والی کوٹھی بھیجی گئی تھی۔ طلعت نے خالی خالی آنکھوں سے اس تصویر
کو دیکھا اور اسے کتاب میں واپس رکھ دیا۔

ہال میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ لڑکے واپس آ چکے تھے۔

سرکھیا نے کھانے کی میز پر سے آواز لگائی۔

طلعت، ہری شنکر کا کمرہ قرینے سے ٹھیک کر کے محاذ پر واپس چلی گئی۔

برف باری شدید ہو چکی تھی۔

اُس رات جب ہری شنکر سو چکا تھا۔ طلعت نے اس کے کمرے میں دبے پاؤں جا کر کتاب میں سے گوتم کی تصویر نکالی۔ اپنے کمرے میں آ کر اس تصویر کو جوتوں سے خوب ہی مارا۔ جب جا کر اسے ذرا شانتی کا احساس ہوا۔ تب وہ فرش پر بیٹھ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر روئی۔

چونکہ وہ پچھلے دس روز سے نہیں روئی تھی۔

روتے روتے وہ بیہوش ہو گئی اور گھر میں ڈاکٹر کو بلانے کے لئے ایک اور ہنگامہ شروع ہو گیا۔

۹۲

ساری دُنیا نے سفید برف کا کفن پہن لیا۔ سڑکوں کے کنارے کھڑے ہوئے درخت ایسے نظر آ رہے تھے جیسے کسی مصور نے کینوس پر پھیلے ہوئے چائنا وائٹ پر سیاہ رنگ سے اِدھر اُدھر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ دی ہوں۔ جن کے عقب میں مکانوں میں سے چھنتی ہوئی اداس زرد روشنی کے دھبے سے چاروں طرف پھیلے تھے۔ بڑے زور کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ اُس عظیم کینوس کے ایک کونے میں ایک خوبصورت دو منزلہ کاٹج تھا۔ جیسے کاٹج عام طور پر اوسٹرلی ـــ میں جا بجا ہیں۔ ایونیو میں داخل ہو تو بائیں ہاتھ پڑتا تھا۔ سامنے چھوٹا سا روک گارڈن تھا۔ جو بہار کے زمانے میں پھولوں سے لد جاتا۔ سامنے منا سا برآمدہ تھا جس کی سُرخ اینٹوں کی دیوار پر تانبے کی لالٹین نصب تھی۔ اندر گیلری تھی جس میں سے زینہ اوپر بیڈ روم کو جاتا تھا۔ نیچے نشست کا کمرہ تھا۔ اور کھانا کمرہ۔ اور گیلری کے سرے پر پارلر تھا۔ اس کے اندر جا کر باورچی خانہ۔ پیچھے لان تھا جس کے سرے پر شاہ بلوط کا درخت کھڑا تھا۔ گھر والوں کا زیادہ وقت پارلر میں گزرتا تھا۔ جہاں وائرلیس سیٹ اور ٹیلی ویژن رکھا تھا۔ وہیں کھانا بنتا، برتن دھوئے جاتے۔ اسٹوو کے پاس بیٹھ کر گپیں ہوتیں۔ جاڑوں کے زمانے میں زرینہ سر پر اسکارف لپیٹے، پتلون پہنے باہر

کولری میں سے لکڑیاں نکال کر سوں سوں کرتی اندر لاتی اور ڈرائنگ روم کا آتش دان دہک اٹھتا۔ تب دُنیا ایک دم بے حد محفوظ معلوم ہونے لگتی۔ آتش دان پر ایک موڈرن مجسمہ رکھا تھا۔ دیوار پر آشا کا بڑا سا پورٹریٹ تھا جو زرینہ نے متس کی طرز میں بنایا تھا بڑا سا ایرانی قالین تھا۔ بڑے بڑے اسٹینڈرڈ لیمپ۔ دریچے میں سے باہر حدِ نظر تک برف دکھلائی دیتی۔ ریڈیو پر اپنے پسندیدہ نغمے بجتے۔ دوستوں کے فون آتے۔ اب تک بڑی پُرامن، سیدھے سادے پُرسکون احساسات سے گھری ہوئی زندگی گزر رہی تھی۔

زرینہ یہاں اپنی ماں اور چھوٹے بھائیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ اور یونیورسٹی میں روسی ادب اور فارسی میں بی اے آنرز کر رہی تھی۔ سلیڈز سے آرٹ کا ڈپلوما لے چکی تھی۔ اس کے والد بیرسٹر تھے۔ اس کی جواں سال، سُرخ بالوں والی ماں جو نسلاً انگریز تھیں مگر خالص لکھنؤ زبان میں گفتگو کرتی تھیں ٹکسالی محاورے بولنے میں ان کو بڑا ملکہ حاصل تھا۔ بے حد محبت والی بی بی تھیں اور بے حد خوش مزاج اور بذلہ سنج۔ ان کا گھر زرینہ کی دوستوں کے لئے ہمیشہ جائے پناہ کا کام دیتا۔ اور وہ ان سے بڑی بہنوں کی طرح پیش آتیں۔

اس وقت زرینہ پارلر میں میز پر بیٹھی ایک روسی رسالہ پڑھ رہی تھی۔

اتنے میں گیلری کی گھنٹی بجی۔ زرینہ نے اٹھ کر دریچے میں سے جھانکا۔ برف سے جوتے لت پت کئے، اوورکوٹ کے کالر سے مُنہ ڈھانپے سامنے گوتم کھڑا تھا۔ زرینہ اُسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

وہ ہاتھ میں اٹیچی کیس لئے سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں آ گیا۔

"یہ پانچواں شہر ہے۔ یہاں بھی روشنیاں جل رہی ہیں۔ میرا خیال تھا یہ جگہ مختلف ہوگی۔"

"مگر افسوس کہ تمہارا خیال غلط ثابت ہوا۔ اندر آ جاؤ —" زرینہ نے جواب دیا۔

"میرے ساتھ باہر بہت سے لوگ کھڑے ہیں۔"

"ان کو بھی بلا لو اندر۔"

"کیسے بلالوں۔ اس روشنی میں تم ان کی شکلیں نہیں دیکھ سکو گی۔"

"وہ کون لوگ ہیں۔"

"بہت سے بھوت۔ لاشیں۔ ارواحِ خبیثہ۔ وہ سب میری دوست ہیں اور باہر اندھیرے میں دانت نکوسے کھڑی ہیں۔ ان کا جلوس میرے ساتھ چلتا ہے۔"

"مجھے ان سے ڈر نہیں لگے گا۔"

"تمہیں ان سے ڈر نہیں لگنا چاہئے۔ کیونکہ ہم سب برابر خود ان لاشوں میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ مگر —" اُس نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ "میرا خیال تھا یہ جگہ مختلف ہوگی۔ یہاں اندھیرا ہوگا۔ لیکن تم نے یہاں بھی دیوالی منا رکھی ہے۔ روشنی میں تم کیا دیکھنے کی کوشش کرتی ہو بھائی —؟"

وہ اُکتا کر اپنے اٹیچی کیس پر بیٹھ گیا۔ زرینہ نے گیلری کا دروازہ کھولا۔

"گوتم — میرا مطلب ہے، کہ تم واپس آگئے ہو۔ جہاں بھی گئے تھے — یعنی کہ — دراصل ہم سب بے حد پریشان تھے تمہاری وجہ سے"

"میں تم سب کا ممنون ہوں۔"

"میرا مطلب ہے کہ — ویلکم ہوم — ہوم جہاں کہیں بھی ہو یعنی — ہر سفر کے بعد کا عارضی پڑاؤ —"

"ٹھیک ہے۔" اُس نے شانِ استغنا سے ہاتھ ہلایا۔ "میں نے تمہارا سواگت قبول کیا۔ پھر اس نے چاروں طرف دیکھا۔" یہ مکان تو وہ والا نہیں ہے۔ جس میں تم رہا کرتی تھیں۔ آرٹسٹ کا مکان —"

"وہی ہے —"

"اچھا —" اُس نے غیر یقینی انداز میں کہا۔ "تم کہتی ہو تو ٹھیک ہی ہوگا۔ زرینہ کیا میں ایسا خبطی ہوگیا ہوں —؟"

"نہیں تو —" اُس نے گھبرا کر جواب دیا۔ "صرف تم تھکے ہوئے زیادہ لگ رہے ہو۔"

"متواتر بھاگتے رہنے سے انسان تھک ہی تو جاتا ہے — میں جانے کتنے لاکھوں کروڑوں میل چل چکا ہوں اب تک —"

"تم کہاں تھے —؟"

"میں — یہ کیوں بتاؤں —" اُس نے بچوں کی طرح جواب دیا۔ "کئی راتیں میں نے کھیتوں میں گزاریں۔ بھوسے کے ڈھیروں پر سویا۔ ندیوں کی کشتیوں میں گھسا بیٹھا رہا۔ اسٹیشنوں کے ویٹنگ رومز میں چھپتا پھرا — سارے میں پولیس کی نظروں سے بچا بچا گھوما کیا — تب آج میں نے کہا کہ کیوں نہ ایک شریف بہادر انسان کی طرح سامنے آکر اقبالِ جرم کر لوں۔"

"پولیس —؟"

"ہاں۔ کیا تم کو نہیں معلوم —؟"

"نہیں تو — کیا؟"

"میں نے، زرینہ بیگم —" اُس نے بڑے ٹھاٹھ سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر کہنا شروع کیا — "میں نے دو قتل کئے ہیں۔ تب سے میں مارا مارا پھرتا ہوں کہ کہیں سر چھپانے کو ٹھکانا مل جائے۔ واپس آکر سارے دوستوں کے دروازے کھٹکھٹائے۔ مگر سب دروازے بند تھے اور اندر تیز روشنیاں جل رہی تھیں۔ پھر میں ادھر سے گزر رہا تھا تو میں نے سوچا۔ لاؤ تمھیں بھی آزما لوں۔"

"اندر آجاؤ گوتم — یہاں ہوا بہت تیز ہے۔"

"مگر تم پولیس کو خبر تو نہ کر دو گی —" اُس نے سہم کر پوچھا۔

"قطعی نہیں۔"

"نہیں میں نہیں بیٹھوں گا۔ گھروں کی چھتیں میرے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں" زرینہ نے اسکارف سر کے گرد لپیٹ کر جھکڑ کی زد سے بچنا چاہا۔ برف

کے گالے چاروں اور بکھر گئے۔

"سنو زرینہ بیگم ۔" اس نے اٹیچی کیس پر بیٹھے بیٹھے سر اٹھا کر اس سے کہا۔ "میں اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے دو قتل کئے ہیں۔ اور کمال یہ ہے ۔" وہ ہنسا۔ "کہ میں اس قدر چار سو بیس انسان ہوں کہ میرے دونوں مقتولوں کو اس کا علم تک نہ ہوا کہ میں نے ہی ان کا کام تمام کیا ہے ۔" اب دفعتاً اس کی آواز بالکل نارمل ہو گئی ۔ "اس روز جب میں سر لکھیا کے یہاں سے پارسل لے کر بھاگم بھاگ ہسپتال پہنچا تو نرملا نے مجھے پہچان کر نہ دیا۔ کیونکہ وہ مر چکی تھی۔ اور جب میں اسی رات وہاں سے لوٹ کر شہر میں مارا مارا پھر رہا تھا تو مجھے چیلسی کے ایک پب میں چمپا احمد نظر آئی اور اس نے بھی مجھے نہیں پہچانا ۔ کیونکہ وہ بے حد ڈرنک تھی ۔ چنانچہ ۔" اس نے بڑے فخر سے کہا ۔ "میں اس قدر کا ماہر فن کردک ہوں ۔ دیکھا تم نے ۔"

برف کا طوفان بڑھتا جا رہا تھا۔ عین اسی وقت پانی اور برفیلی کیچڑ کے چھینٹے اڑاتی ایک موٹر ڈرائیو پہ آکر رکی اور اس کی تیز روشنی میں برف پہ ایک پیلا راستہ سا بن گیا۔

کمال اور ہری شنکر موٹر میں سے اترے ۔

"زرینہ ۔" انھوں نے ڈرائیو پہ سے آواز دی ۔ "گوتم تو یہاں نہیں آیا ۔؟"

وہ دونوں برف پہ بھاری بھاری قدم رکھتے سیڑھیوں پہ آگئے ۔

"سوامی جی کے سنٹر میں ابھی معلوم ہوا کہ گوتم لندن لوٹ آیا ہے اور شاید اوسٹرلی کی طرف گیا ہے ۔" کمال کہہ رہا تھا ۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں گوتم نیلمبر کو موٹر میں ڈال کر اپنے گھر لے گئے ۔

۹۳

"کوئی نہیں آیا۔" شیلا دیبی نے دروازے میں آکر کہا۔ "تینوں کے تینوں دہریے ہیں سور گباشی نرملا کے گھر والے — سوامی جی نے سارا انتظام کیا تھا۔ پھول منگوائے تھے۔ مدراسیوں کی ایک کیرتن پارٹی بھی سوئس کاٹیج سے آگئی تھی۔ مگر یہ لوگ شانتی کا مارگ ڈھونڈنا نہیں چاہتے۔"

"اور جانتی ہو اب یہ لوگ کیا کر رہے ہیں وہاں اپنے گھر میں، یا اس انڈین ڈانسر کے فلیٹ میں جمع ہو کر صبح سے شام تک تاش کھیلتے ہیں — حد ہے۔" ایک بے حد روحانی انگریز بڑھیا نے دریچے میں سے منڈیا نکال کر بات کی۔

چمپا سیڑھیوں پر سے واپس اتری۔

"تم کسی کی متلاشی معلوم ہوتی ہو۔" دوسری ویدانت پرست امریکن بڑھیا نے دریچے میں سے سر نکال کر کہا۔ "دیکھو — وہ یہاں موجود ہے — تمھیں — ہم سب کو بلا رہا ہے —" انھوں نے انگلی اٹھا کر کرشن کی بڑی تصویر کی طرف اشارہ کیا جو سنٹر کے ہال میں رکھی تھی۔ "اسے دیکھنے کے لئے وہ تیسری آنکھ چاہیئے جسے افسوس کہ تم ہندوستانی کھو بیٹھے۔"

چمپا ہڑبڑا کر دوڑتی ہوئی نیچے اتر گئی۔ سڑک پر آکر اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔ اسے محسوس ہوا کہ جیسے سڑک پر چلنے والے سب انسانوں کے ماتھوں پر تیسری آنکھ موجود ہے جو اسے گھور رہی ہے۔

وہ دوڑ کر ایک ۳۰ نمبر کی بس میں سوار ہو گئی۔

سنٹر میں سوامی دیویکانند نے اپنا لیکچر بلانا شروع کر دیا تھا۔ یوگا پر ان کا لیکچر سننے کے بعد ان کی سامعین معرفت پسند بڑھیں اپنے گھروں کو لوٹ کر سنک میں پڑے ہوئے صبح کے برتن دھوئیں گی اور موزے رفو کریں گی اور گیس کے بل کی فکر کریں گی۔ اس وقت لارڈ کرشنا ان کے کتنے کام آئیں گے۔

وہ بس سے اُتر کر طالب علموں کے مرکز کی طرف روانہ ہوئی۔
ہال میں طالب علموں کی ایک بالکل نئی ٹولی گپّوں میں مصروف تھی۔
"میں چمپا احمد ہوں۔" اُس نے دروازے میں جاکر کہا۔
"یس — ؟"
ایک مدراسی طالب علم نے آگے آکر پوچھا۔
اُس کا دل ڈوب گیا۔ اُس کا نام کتنا غیر اہم تھا۔ اسے کوئی نہ جانتا تھا۔ کسی کو اُس کی ضرورت نہ تھی۔
"کچھ نہیں — کچھ نہیں —"
"جی — آپ کو کیا چاہئے —" ایک بنگالی لڑکی نے پوچھا۔
"کچھ بھی تو نہیں —" اُس نے اور زیادہ ہڑبڑا کر جواب دیا۔ "ایسے ہی آپ لوگوں کا سنٹر دیکھنے چلی آئی تھی۔"
چند لڑکوں نے اُسے شک و شبے کی نظروں سے گھورا —
وہ اُلٹے پاؤں پھر سڑک پر آگئی۔
اسٹرینڈ پہنچ کر وہ انڈیا ہاؤس میں داخل ہوئی۔ لفٹ میں اُوپر کی منزل پر پہنچی جہاں کنٹین میں حسب معمول خوب شور مچ رہا تھا۔
"میں چمپا احمد ہوں —" اُس نے کاؤنٹر پر جاکر کہا — اسے اپنی اس احمقانہ حرکت پر مطلق تعجب نہ ہوا۔
"یس ڈیر —" ادھیڑ عمر کی ہندوستانی عیسائی عورت نے جو ایڈنگ مشین پر بیٹھی تھی انگریز عورتوں کے لہجے کی نقل کرتے ہوئے کہا۔ "کھانا تو ختم ہو چکا ہے — اسنیکس ہیں —"
"نہیں — ٹھیک ہے۔" وہ رٹ پٹا کر پھر باہر نکلی۔ میزوں پر بیٹھے ہوئے لڑکوں اور لڑکیوں نے سر اُٹھا کر بھی اسے نہ دیکھا۔ ایک کونے میں سر کیا کامیاں گلشن سر جھکائے کچھ پڑھ رہا تھا۔ وہ پھر باہر آگئی۔

اب وہ چوزے کی سرائے پہنچی۔ وہاں اسے کمال ملا جو کاؤنٹر پر کھڑا کسی کو فون کر رہا تھا۔ اس سے چند باتیں کرنے کے بعد وہ جلدی سے باہر نکل گیا وہ شیشے کے دروازے کے پاس کھڑی اسے بھیڑ میں شامل ہوتے دیکھتی رہی۔ پھر باہر آکر اس نے بی بی سی کی کنٹین میں جھانکا ــــ چچا صدیقی کوئی لطیفہ بیان کر رہے تھے۔ اعجاز بٹالوی نے ایک نئی بحث شروع کر دی۔ تقی سید منہ لٹکائے بیٹھے تھے۔ یاور عباس کچھ گنگنا رہے تھے۔ میں چمپا احمد ہوں۔ اس نے ان سب کو بتانا چاہا۔ مگر پھر واپس لوٹ گئی۔

سامنے ہی انڈر گراؤنڈ تھی۔ سیڑھیاں اتر کر اس نے بالکل غیر ارادی طور پر میڈا ویل کا ٹکٹ لے لیا۔ چند منٹ بعد میڈا ویل کی چوڑی سڑک پر برآمد ہو کر وہ ایک درخت سے ٹک گئی اور چاروں طرف دیکھا۔ سامنے کچھ فاصلے پر سرکھیا اور اشا کے مکان تھے۔ باڑ کی دوسری طرف چند قدم پر طلعت اور کمال کا فلیٹ تھا اسٹیشن کے مقابل کے جدید بلاک میں ثنا ستا اور ولیم کریگ رہتے تھے۔

عین اسی وقت گروسری کی دوکان سے سبزی کا تھیلا اٹھائے سرکھیا باہر نکلی۔ "ارے ہلو چمپا" اس نے چلا کر کہا۔ "وہاں کیسی کھڑی ہو ــــ آؤ ــــ آؤ ــــ"

وہ خاموشی سے سرکھیا کے ساتھ ہو لی۔

چند قدم چل کر وہ مکان میں داخل ہوئیں۔

"چنانچہ یہی گوکل تھا ــــ ثنار میلا ــــ یہی گوکل تھا ــــ" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کیا ــــ" سرکھیا نے پلٹ کر پوچھا۔

"کچھ بھی تو نہیں ــــ"

"بیٹھو۔ گلشن ابھی انڈیا ہاؤس سے نہیں لوٹا ــــ تمھیں معلوم ہے اس نے وہاں کام شروع کر دیا ہے۔"

"اچھا۔"

ڈرائینگ روم کے چوڑے دروازے کے باہر ابھی دن کا اجالا باقی تھا بہت سی

سُرخ پتیاں آہستہ آہستہ تیرتی ہوئی آکر نیچے بکھر گئیں۔ پورچ کی سیڑھیوں پر۔ ڈرائیو پر۔ چار پانچ پتیاں دریچے کے باہر رکھی ہوئی بید کی کرسیوں کے نیچے ہوا میں لرزتی رہیں۔ دھوپ کی سنہری لکیر نے گھاس پر حلقہ سا بنا لیا۔

کیا پتہ انسان دراصل کیا چاہتا ہے؟

"ارے چمپا — یہاں اس صوفے پر بیٹھ جاؤ آرام سے —" سرلکھا نے ترکاریاں سینی میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

"اس صوفے پر بیٹھنے سے کمرہ وہی تو نہیں بنے گا۔ جو اُس روز تھا —" چمپا نے اپنے آپ سے کہا۔

"اُس روز — کس روز —؟ کیسا تھا —؟" سرلکھا نے باورچی خانے میں جاتے ہوئے پوچھا۔

"کیا معلوم —"

خالص موسم اب باہر فضاؤں میں پھیل چکا تھا۔ تند سردی۔ شفاف، پاکیزہ برف سارا وجود بے حد ہلکا پھلکا اور صاف محسوس ہو رہا تھا۔ سرلکھا نے شال اوڑھی اور کمرے میں آکر آتش دان جلایا۔

"کل —" اُس نے بالٹی میں سے کوئلے اُلٹتے ہوئے بات کی۔ "بہت سے لوگ گھر واپس جا رہے ہیں۔"

"گھر —؟" چمپا نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں۔ ہندوستان۔" سرلکھا نے راکھ کریدنا شروع کی۔

"کون — کون —" چمپا نے بے تعلقی سے پوچھا۔ اب اسے کسی سے کیا مطلب۔ وہ اس خالص موسم کی طرح سارے میں پھیلی تھی۔ اسے مخصوص شخصیتوں سے کیا غرض۔ اس کا کسی سے کوئی تعلق نہیں۔

سرلکھا شدید گھریلو انداز میں پلّو کمر میں کھونسنے کے بعد پھر ترکاری کاٹنے بیٹھ گئی۔

"سبھی —" اُس نے جواب دیا۔ "کمال۔ ہری — کملا۔ ہری فلائی کر رہا ہے۔

کمال پرسوں کیلئے ڈونیا سے جائے گا۔ گوتم تو آج صبح کرشنا مینن کے ساتھ
پھر نیویارک چل دیا۔"

باہر کھیتوں کے پرے ایک دم سورج ڈوب گیا۔ بگ بین نے ریڈیو میں اپنا بگل
بجایا۔ باہر تاریکی چھا چکی تھی۔ جاڑوں کی رات کی تاریکی جو دفعتاً دنیا کو آ دبوچتی ہے۔ وہ
مسز مکھیا کی مدد کرنے کے لیئے باورچی خانے میں چلی گئی۔

ڈرائینگ روم میں گلشن کے اور اس کے دوست داخل ہو چکے تھے۔ وہ باورچی خانے
کے دروازے سے نکل کر سرد باغ میں سے گزرتی آشا کے گھر چلی گئی۔

مسز مکھیا کی آواز پر وہ واپس لوٹی۔ اُس نے دریچے میں سے اندر جھانکا۔ شام
کا اثر کمرے میں ختم ہو چکا تھا۔ اس کی جگہ رات نے لے لی تھی۔ وہ دوبارہ اس کمرے
میں گئی مگر وہاں کچھ نہیں تھا۔ سائے دوسرے تھے۔ رنگ، فضا، کا سُر۔ وقت بھی
کھڑکی کے راستے باہر چلا گیا۔ اس کا ذرا سا ٹکڑا ابھی پیچھے پڑا نہیں ملا۔

مسز مکھیا کے گھر سے باہر نکل کر اُسے کمال کے مکان کی روشنیاں نظر آئیں

مجھے چھوڑ کر مت جاؤ — مجھے چھوڑ کر مت جاؤ — مجھے چھوڑ کر مت —
اُس نے چلا چلا کر کہنا چاہا۔ مگر خاموشی سے تیز تیز قدم رکھتی اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئی۔
اور جون کارٹر کی گلی میں پہنچی اور اصطبل کے دروازے میں جا کر روشنی جلانے کیلئے
ہاتھ بڑھایا۔

مگر دفعتاً تاریکی نے سامنے آ کر اسے خوش آمدید کہا۔ وہ دریچے میں رکھے ہوئے
جرینیم کے پودوں پر جھک گئی۔ اب تک رات میرے خلاف تھی۔ اُس نے سوچا۔ اب
شاید میری ساتھی بن جائے۔ اونچے مکانوں پر سے گزر کر آتی ہوئی ہوا گھاس
کی سرسراہٹ۔ پتوں پر جمی ہوئی برف۔ زمین پر رات کی موجیں بہتی چلی جا رہی ہیں اور
اب دھارے الگ الگ ہو چکے ہیں۔ اب میں واقعتاً مکمل طور پر آزاد ہوں۔ وہ
ہنسی۔ نیچے بہت ٹھوس، حقیقی زمین ہے۔ اور اس زمین پر مجھے موت تک چلے
جانا ہے۔ قدم مجھے کہاں کہاں لے جائیں گے (اس نے پیروں کو اس طرح دیکھا

گویا آج تک وہ اسے پہلے کبھی نظر نہ آئے تھے) رات میرے ہاتھ میں موجود ہے اور اس کے ہاتھ میں بھی۔ رات کی رسی کو میں مضبوطی سے تھامے تھامے دن تک پہنچ جاؤں گی۔ رات تو آج سے میری سکھی ہے۔ کہو سکھی کیسی ہو۔ میں تو تم کو مدتوں سے جانتی ہوں۔ برساتوں میں، پھاگن کی رت میں، پورنماشی میں، امتحانوں کی پڑھائی کے زمانے میں، اجنبی دیسوں میں، ٹرینوں میں سفر کرتے ہوئے، میں نے تمہاری ہر کیفیت کو دیکھا ہے۔ میں نے اور تم نے اکٹھے سمے بتایا ہے —— ایک روز تم ہی جیتو گی۔

اور تم —— اس نے دوسری بات شروع کی —— میں تم کو تمہارے خوابوں کی دوسراتھ میں چھوڑتی ہوں —— میں شاید ایک واقعیت تھی اور تم خواب دیکھنے سے کبھی باز نہ آؤ گے۔

رات تاریک تر ہوتی گئی۔ سردی بڑھ گئی۔ جوّن کارٹر کے فلیٹ میں مکمل سناٹا تھا۔ نیل اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ جوّن بھی سو چکی تھی۔ ادجیت اپنی میٹنگ سے نہیں لوٹا تھا۔ خاموشی کی لہریں بوسیدہ دیواروں سے ٹکرا گئیں۔ وقت نے کہا۔ مجھے پہچانو۔ میں تمہارا پیچھا کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ تمہارا خیال تھا لمحے اپنی جگہ قائم رہیں گے۔ لیکن تمہارا یہ خیال بھی غلط تھا۔ مجھے دیکھو اور جانو۔ میں جا رہا ہوں پل پل۔ چھن چھن۔ پردوں کے پیچھے تہ در تہ اندھیروں میں غائب ہوتا جا رہا ہوں میں حدِ فاصل ہوں۔ اس کے آگے تم نہیں جا سکتیں۔ اب واپس لوٹ چلو۔ سرحد پر تم پہنچ چکی ہو۔ سامنے پھاٹک ہے۔ اب دوسرا دیس شروع ہوتا ہے۔ اب تم کو دوسرے پروانہ راہداری، نئے کاغذات کا انتظام کرنا ہوگا۔ نئے سرے سے خانہ پُری اور دستخط کرنے ہوں گے۔ کیونکہ اب نئی سرحد شروع ہوتی ہے میں نے اب تک بہت سے سحر توڑے ہیں۔ تمہارا والا سحر تو بہت ہی غیر اہم تھا۔

مجھے پہچانو۔ میں برابر تمہارے ساتھ چلتا رہوں گا۔ تم کم از کم مجھ سے نہیں

بھاگ سکتیں۔ لوگ تمھیں چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ ....

میں تم کو کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ دیکھا تم سرحد پر کتنی جلدی پہنچ گئیں۔ تم کو فیصلہ کرنے میں کتنی دقت پیش آ رہی تھی۔ میں سارے معاملے طے کر دیتا ہوں۔ سارے فیصلے سارے سارادے۔ میری وجہ سے خود بخود پورے ہوتے چلے جاتے ہیں۔

ابھی تم پر اور مصیبتیں آئیں گی۔ لیکن میں تم کو ان کا مقابلہ کرنا بھی سکھا دوں گا اب مجھ سے صلح کر لو۔ میں اب بھی موجود ہوں۔

ہوا کے ایک تیز جھونکے سے کھڑکی کا پردہ پھٹپھٹانے لگا۔ کمرہ کہرے سے بھر گیا۔ تب اسے معاً محسوس ہوا کہ وہ سردی سے کپکپا رہی ہے۔ اس نے جلدی سے دریچہ بند کیا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

۹۴

"اپّی کے بیاہ میں پہننے کے لئے میں تو بڑی بڑھیا بڑھیا ساریاں بنواؤں گی کارچوبی۔" نرملا کہہ رہی تھی۔

میں خاموش رہی۔

"مجھے تو یہ نئے قسم کی بارڈر والی ساریاں بالکل اچھی نہیں لگتیں۔" مالتی نے ہونٹ لٹکا کر بڑی بوڑھیوں کی طرح کہا۔ مالتی رائے زادہ سولہ برس کی تھی۔ نرملا اس سے ایک سال چھوٹی تھی۔ میں نرملا سے ایک سال چھوٹی۔ ان دونوں نے سخت بزرگی کے عالم میں ملبوسات کے متعلق اپنی وسیع معلومات کا مجھ پر رعب ڈالنا شروع کیا۔ میں بڑی عقیدت سے ان کی باتیں سنتی رہی۔"

(پھر طلعت دفعتاً خاموش ہو گئی۔ دیکھو اس نے کمال سے کہا میں نے آج یہ محسوس کیا ہے۔ میرا ماضی صرف میرے لئے اہمیت رکھتا ہے۔ دوسروں کے لئے، دنیا کے لئے اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ نہ دنیا کو اس سے کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے۔

"میرا ماضی محض میرا ماضی ہے۔" کمال نے طلعت کی بات دہرائی۔
"اور دنیا کو صرف حال سے دلچسپی ہے۔" ہری شنکر کی آواز گونجی۔
"لیکن ماضی حال ہے۔ حال ماضی میں شامل ہے اور مستقبل میں بھی۔ وقت کی اس شعبدے بازی نے مجھے بڑا حیران کر رکھا ہے۔" طلعت نے کہا۔ "میں وقت کے ہاتھوں عاجز آچکی ہوں۔ تم میں سے کوئی میری مدد کیوں نہیں کرتا۔"
"تمھاری مدد طلعت بیگم شاید آئن اسٹائن بھی نہیں کر سکتا۔"
"تیرے ماضی سے دوسروں کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔" کمال نے پھر ضد سے دہرایا۔
"وقت برابر موجود ہے۔ وقت مسلسل حال ہے۔" طلعت نے کہا۔
یہ لوگ جو لندن کے سینٹ جانز وُوڈ میں بیٹھے ۱۵ دسمبر ۱۹۵۴ء کی سہ پہر کو یہ باتیں کر رہے تھے۔ ان کے سائے کھڑکیوں کے شیشوں پر عجیب عجیب شکلیں بناتے رہے۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی۔ موٹریں آجا رہی تھیں۔ وائرلیس میں سے ویانا کے کسی کونسرٹ کی آوازیں آرہی تھیں۔ وقت کے وسیع اندھیرے اور اونچی دیواروں اور سڑکوں اور گلیوں اور آوازوں کی بھول بھلیاں میں گھرے تینوں موجود رہے۔
وقت کے اسی اندھیرے میں طلعت ۱۹۴۱ء کی جولائی میں ننگھاڑے والی کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھی نرملا اور مالتی سے باتیں کر رہی تھی۔ اس طلعت میں اور اس لڑکی میں کوئی فرق نہ تھا مگر دونوں مختلف ہستیاں تھیں۔ شاکیہ منی نے کہا تھا کہ انسان ہر لحظہ بدلتا رہتا ہے۔ بچپن میں کچھ اور ہوتا ہے۔ جوانی میں کچھ اور تم اس لمحے سے پہلے نہیں تھے۔ صرف تسلسل باقی رہتا ہے۔ دور پہاڑوں میں گلیشیر ٹوٹ ٹوٹ کر بہہ رہے تھے۔ ہوائیں۔ وقت جو سیال تھا۔ وقت جو منجمد تھا۔
"ہم اپنا قصہ دہرا کر اپنا اطمینان کرنا چاہتے ہیں۔" ہری شنکر نے کہا۔
"کیونکہ ہم خوفزدہ ہیں۔"

"اور گوتم نیلمبر تک کس قدر خوف زدہ نکلا۔" کمال نے کہا۔

"گوتم نیلمبر کا اس وقت ذکر نہ کرو۔ تم اصل موضوع سے بہت دُور ہٹ جاؤ گے۔ طے یہ کرنا ہے کہ زندگی میں اصل موضوع کیا ہے۔" ہری شنکر نے کہا "میں چودہ سال قبل بھی موجود تھا اور اگر زندہ رہا تو چودہ سال بعد بھی ہری شنکر ہی سمجھا جاؤں گا۔ اور جب وقت کے سارے تجربے ہم اپنے اُوپر کر لیں گے۔ تو یہ جو چھوٹے چھوٹے گنی پگ ہم لوگ ہیں۔ ہم بھی ختم ہو جائیں گے۔"

وقت کے پیٹرن میں طلعت جہاں بیٹھی تھی وہی طلعت اسی پیٹرن میں ایک جگہ اور موجود تھی اور دونوں نقطوں کے درمیان برسوں کا فاصلہ تھا۔ اور اس فاصلے پر انسان صرف آگے کی سمت چل سکتا تھا: آگے — اور آگے — پیچھے جانا ناممکن تھا۔ گو ہزاروں طلعتیں ان گنت ٹکڑوں میں منتشر ان گنت جگہوں پر موجود تھیں جیسے آئینے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں میں ایک ہی چہرے کے مختلف عکس نظر آتے ہیں۔

کمال گویا اسٹیج پر چلتا ہوا وسط کی میز پر آ کر بیٹھ گیا۔ یکھی کی آنکھوں سے اس نے سب کو دیکھا۔ مائیکل۔ بل کرنیک۔ زرینہ۔ وہ سب صبح صبح گوتم نیلمبر کو ایئرپورٹ پہنچا کر واپس لوٹے تھے اور کمال کے کمرے میں ہری شنکر اور کمال کے بندھے ہوئے اسباب پر چڑھے بیٹھے تھے۔

گوتم زرینہ کے یہاں سے آ کر پندرہ دن تک کمال کے گھر پر بیمار پڑا رہا تھا۔ تب وہ دن بھر تاش کھیلتے یا بیت بازی کرتے۔ مکی ماؤس کے کومک اور فلمی رسالے تک پڑھے گئے۔ گوتم ابھی پوری طرح صحت یاب نہ ہوا تھا کہ کشمیر کے کیس کے لئے اسے پھر نیویارک جانے کا حکم آ گیا۔ لندن میں یہ کمال اور ہری کا آخری دن تھا۔ ہری رات کو ایرانڈیا سے پرواز کرنے والا تھا۔ کمال کل صبح بوٹ ٹرین پر سوار ہونا تھا —— کملا بھی جا رہی تھی۔ مائیکل بھی جا رہا تھا۔

طلعت نے دوبارہ کیلنڈر پر نظر ڈالی۔ ۱۵ ر دسمبر ۱۹۵۴ء۔ اسے جھرجھری سی آئی۔ "مائیکل دروازہ بند کر دو۔"

مائیکل نے اٹھ کر ایسا ہی کیا۔ لوگ طلعت کو کاٹھ کے کلدار کھلونوں کی طرح نظر آئے۔ سپاہی جن کے ہاتھوں میں اس بندوقیں تھیں (مائیکل) سر ہلاتے ہوئے سفید "چگی" داڑھی والے چینی فلسفی (ہری شنکر) مہاراجہ چندر گپت کے دربار کی نرتکی (سرلکھا) دھاڑیں مار مار کر روتے، ماتم کرتے اپنی زندگی کے تعزیے کے ساتھ ساتھ ننگے پاؤں چلتے گولہ گنج والے سکر خمیدہ نواب کمن صاحب (کمال) دیوالی کے گڑیوں گڈوں کی طرح وہ سب سامنے سجے تھے۔ مورتیاں جن کو لکھنؤ کے کمہاروں نے بنایا تھا (ان میں سے ایک مورتی گر کر ٹوٹ چکی تھی) ابھی بہشتی آئے گا۔ چھڑکاؤ ہو گا۔ تخت بچھے گا۔ تخت پر راجہ بیٹھے گا۔ لونا چماری کا جادو چلے گا۔ پھر یہ سب جا کے اپنے اپنے طاقوں میں بیٹھ جائیں گے

"میں بالکل ٹھیک تھی۔" اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "مگر پھر ایک دم چیزوں نے مجھے ڈرانا شروع کر دیا۔"

کمال نے گویا اس سے کیو لے کر کہا۔ "یہ انکشاف ہوا کہ کائنات میں بڑی گڑبڑ ہے۔"

"اور اس سے پہلے کہ مجھے معلوم ہو۔ میں الفاظ کے سمندر میں سے گزرتی خیالات کے پُر خطر راستے پر نکل کھڑی ہوئی تھی۔

"الفاظ کیا تھے۔ حقیقت کیا تھی۔ کتابوں نے کہا۔ الفاظ غلط ہیں حقیقت کوئی شے نہیں۔ سمبندھ لایعنی ہیں۔ پتارم۔ ماترم۔ پُترم۔ پوترم — سب ہر شے فالتو ہے۔ کبھی میں نے دیکھا برہسپتی راکھشسوں کو اپنا علم پڑھا رہا ہے۔ کبھی میں خود اپنے آپ کو ایک عظیم راکھشسنی نظر آئی۔ یا پریوں کی کہانیوں کی کوئی چڑیل جو اپنے علم کی جھاڑو پر سوار تاریک خلاؤں میں ٹاپتی پھر رہی تھی۔ ان تاریک خلاؤں میں اور بہت سی جھاڑوئیں تھیں جو پاس سے گزر جاتیں

جن پر ہزاروں لڑکیاں سوار تھیں۔ تہمینہ، نرملا، روشن، جون کارٹر، فیروزہ، چمپا، زرینہ، اور جانے کون کون۔ یہ جھاڑوئیں اب اتنی اوپر اُڑ گئی تھیں کہ اب ان کا نیچے اترنا محال تھا۔ دراصل ساری دُنیا کے آسمان ان جھاڑوؤں سے پُر تھے۔

ان سب میں چمپا ایک بڑی قابلِ ذکر ہستی تھی۔ اس سے غلطی یہ ہوئی۔ خواب دیکھنے شروع کر دیئے۔

اب اگر آپ ایک جھاڑو پر سوار ہوں اور سو جائیں تو لامحالہ آپ راستہ بھول جائیں گی اور آپ کی جھاڑو ٹکرا کر نیچے آ رہے گی۔

اپنی خواب کی حالت میں وہ عہدِ عتیق کے بھگتوں کی مانند گاتی پھری۔ گرجاؤں میں گئی۔ راہبات کو رشک سے دیکھا۔ ذاتی زندہ خدا اور اپنی زندگی کے مجازی خدا کے تصور کو یکجا کرنے سے اسے غالباً بڑی مسرت حاصل ہوئی۔ اس مسرت کا تم تجزیہ نہیں کر سکتے۔ یہاں عقیدے اور اللہ کی ذات میں یقین کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ محض تھوڑی سی معرفت کی ضرورت تھی جو صبح منہ اندھیرے اُٹھ کر بھیروں گاؤ تو آپ سے آپ حاصل ہو جاتی ہے —— میں رادھا ہوں۔ میں سیتا ہوں۔ میں مریم مگدلین ہوں۔ میں زرّیں تاج طاہرہ ہوں —— مدتیں گزریں۔ اُس نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا کہ جب میں چیپل میں جاتی ہوں اور بشپ گھنٹی بجاتا ہے اور یوکرائسٹ کے گلاس اٹھائے جاتے ہیں تو میں اس ساری اشاریت کے جال میں خود کو موجود پاتی ہوں —— گوتم نیلمبر کی طرح اسے ہر واقعے میں رمزیت نظر آ جاتی تھی۔"

وہ سب کمرے سے نکل کر نیچے سڑک پر آ گئے۔ کمال نے ناک اُٹھا کر کہرے کو سونگھا۔

"چیزوں کی رمزیت کا مجھے بھی اندازہ ہے۔ میں نے اس کی وجہ سے بہت دُکھ اُٹھائے ہیں۔" مائیکل نے ہوا میں ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" طلعت نے جواب دیا۔ وہ سب سر جھکائے زمین کو تکتے چلا کئے۔

شام کی گلرنگ روشنی میں وہ ہمیشہ ہیتھ کی طرف بڑھتے رہے۔ مکانوں

کے چھوٹے چھوٹے بیک گارڈن۔۔۔۔۔ کھڑکیوں میں سے جھانکتے ہوئے لوگ تنگ گلیارے جن کے سرے پر نیم تاریک قہوہ خانے تھے۔ لڑکیاں دفتروں سے لوٹ رہی تھیں۔

"یہ منظر میرے لئے لرزہ خیز ہے ۔" ہری شنکر نے کہا۔

"ہاں ۔" طلعت نے اسی طرح جواب دیا۔

پہاڑی پر پہنچ کر وہ مصوروں کی تصویریں دیکھتے پھرے اور مزید بور ہوئے۔

"وہ دیکھو تروتا وغیرہ آرہے ہیں۔"

"آہا۔"

نیچے میلہ لگا تھا۔ جپسی عورتیں ہاتھ دیکھ کر قسمت کا حال بتلا رہی تھیں۔ بچے مونگ پھلی اور آئس کریم کھا رہے تھے۔

"سب سے بڑی حماقت یہ ہے کہ ہم دوسروں کو اپنے خوابوں میں گھسیٹنے کی کوشش کریں ۔" مائیکل نے کہا

"ہاں ۔" طلعت نے دہرایا۔ "میرا ماضی، میرا وقت، میرے خواب صرف میرے ہیں۔ وہ کسی اور کے نہیں ہو سکتے ۔ گو خیال رکھو ۔" اس نے جلدی سے اضافہ کیا۔ "میں شخصی سطح پر یہ بات کر رہی ہوں ۔ مستقبل ہم سب کا مشترک ہے۔"

مائیکل نے ایک کنکر اٹھا کر غصے سے اسے مارا۔ "خدا کے لئے اس نقطے پر پہنچ کر بھی پارٹی لائن مت چلاؤ ۔ مستقبل مشترک نہیں ہے ۔ مستقبل اس پہاڑی کے ادھر ہم سب کے لئے الگ الگ منہ پھاڑے کھڑا ہے ۔ ہری کے دس سر والے خدا کی طرح ۔"

"او مائیکل۔" طلعت نے بچوں کی طرح کہا۔ "یہ واقعہ ہے کہ میں بہت ڈرتی رہی ہوں ۔"

"ہاں ۔"

میرے ڈرانے کو کیا کم چیزیں تھیں۔ خوبصورت مناظر۔ آرام دہ گھر۔ بیگ کھولتی تو اس میں سے طرح طرح کے کاغذات نکلتے۔ بنکوں کے مراسلے۔ شیئرز کے کاغذات جوائنٹ اسٹاک کمپنیوں کی رپورٹیں جن پر نام ہوتے۔۔۔ لارڈ سنہا۔ سر بیرن مکرجی۔ ٹری تھاپڑ۔ ان سب ناموں کے پیچھے ایک اور دنیا تھی۔ اونچی مضبوط عمارتیں۔ شفاف غیر شخصی دفاتر۔ روپیہ۔ روپیہ۔ معاشیات کے مسائل۔ اسٹرائک۔ بھوک۔ بے روزگاری ڈائرکٹروں کے اجلاس۔ ٹریڈ یونین۔ مزدور بستیاں۔ سٹی آف لندن۔ کلائیو رو کلکتہ۔ بشپ گیٹ۔ چورنگھی۔ ٹاٹا نگر۔ اینڈریو یُول کلکتہ۔۔۔

"میں ڈرتے ڈرتے ان کاغذات پر دستخط کرتی۔ جو گویا میرے تحفظ کے ضامن سماج میں میرے اونچے دولت مند درجے کے گواہ تھے۔۔۔ یہ سب کیوں ہے مجھے اس کا کیا فائدہ ہے۔ میں نے تو نہیں کہا تھا کہ میں رضا خاندان میں پیدا ہو کر اس کھڑاگ کی وارث قرار دی جاؤں۔ کاغذ کے ٹکڑے۔ روپیہ۔ روپیہ۔ روپیہ۔ دفعتاً روپے کی اہمیت کا سارا احساس میرے دل سے مکمل طور پر زائل ہو گیا۔ لوگوں نے کہا۔ پوتڑوں کے رئیس ایسے ہی خبطی ہوتے ہیں۔ وغیرہ۔ مجھے یہ سن کر بڑی ہنسی آتی۔"

وہ سب پتھروں پر بیٹھ گئے۔ نیچے وادی میں جھیل کے پانی پر ڈوبتے سورج کی کرنیں رقصاں رہیں۔ سالویشن آرمی والوں کا ایک دستہ بینڈ بجاتا سامنے سے گزرا۔

کمال جھیل کے کنارے تنہا کھڑا تھا اور اس بلندی پر سے بہت چھوٹا سا نظر آ رہا تھا۔

معاً طلعت زور سے قہقہہ مار کر ہنسی۔

سب نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"میں نے ایک مرتبہ نرملا سے پوچھا تھا۔ رانی بی بی! تمہیں ڈر کاہے کا ہے۔ نرملا نے جواب دیا تھا کہ میں اپنے خوابوں کو اس سے بچانا چاہتی ہوں۔ وہ میرے

خواب جانتا ہے — کتنی ہنسی کی بات ہے کہ نرملا کے خواب اب اس کے پاس ہمیشہ کے لئے محفوظ ہیں۔ گوتم بالآخر لاعلم رہا۔

ہم لاعلمی میں پیدا ہو کر لاعلمی میں زندہ رہتے ہیں اور اسی میں مر جاتے ہیں۔ یہی اصل سدھانت ہے۔

کمال ان کی طرف بڑھتا دکھلائی دیا۔ مائیکل نے جھک کر گھاس کا پتہ توڑا۔ میلے میں بجتی ہوئی موسیقی ختم ہو چکی تھی۔ سردی زیادہ ہو گئی۔

ایک جٹ طیارہ ان کے سروں پر سے گرجتا ہوا گزر کر تاریکی میں غائب ہو گیا وہ سر اٹھا کر اسے دیکھا کئے۔

"لاعلمی کا جو شہر ہم نے بسا رکھا تھا۔ اس کی دیواریں ہم نے فلسفے کی اینٹوں سے چنی تھیں۔" طلعت نے بات جاری رکھی "ایک روز سیند لگا کر موت ہمارے شہر میں داخل ہوئی۔

"ایک مرتبہ جب فارن برا کے ایر فیسٹول کے موقعے پر بے چارہ جان ڈیری آواز کی سرحد توڑتے خود ہلاک ہو گیا تھا۔ اس کا طیارہ فضا میں پاش پاش ہو کر تماشائیوں کے اوپر آن گرا تھا۔ بیسیوں لوگ مرے تھے۔ اس لمحے جب طیارہ دہکتے ہوئے آتشیں گولے کی صورت میں آواز سے زیادہ تیز رفتار کے ساتھ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس لمحے مجھے پتہ تھا کہ یہ موت ہے۔ اس کی آگ میں میں بھی جل کر بھسم ہو جاؤں گی مگر جانتے ہو — زمین پر اوندھے لیٹنے کے بجائے میں طیارے کے ٹکڑوں کی بوچھار میں چندرا اور زرینہ کو پکارتی پھری کہیں وہ نہ مر گئی ہوں — مجھے اس وقت اپنے بجائے ان دونوں کی زندگیوں کی فکر تھی۔ اپنے متعلق تو احساس بھی نہیں تھا۔

"لہٰذا نرملا نے موت کا سامنا کیا تو مجھے لگا کہ اسے بھی خوف محسوس نہ ہوا ہو گا۔ گو یہی ایک واحد تجربہ ایسا ہے جس میں انسان کسی دوسرے کو شریک نہیں کر سکتا لہٰذا ہم نے اسے یہ تجربہ کرنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا۔ بے چاری ہاتھ پاؤں مارتی دریا کے تاریک دھارے میں بہہ گئی۔

• ویدانت میں کہیں پر وجود کی چار کیفیتوں کا ذکر ہے — جاگتا ہوا انسان۔ خواب بغیر خواب کی نیند۔ اور موت۔

"جس روز میں بے ہوش ہوئی تھی۔ مجھے اچھی طرح احساس تھا کہ میں بہت گہری نیند سو رہی ہوں۔ خالی اس گہری نیند میں مجھے خواب نہیں دکھائی دیئے۔ میری آتما جا کر اندھیرے سے مل گئی اور جب واپس آئی تو مجھے معلوم بھی نہ ہوا کہ میں کہاں گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہی موت ہے اور جب یہ آئی تو آتما دوسرے غیر مرئی لیکن مادی جسم کو ساتھ لے کر اپنی راہ نکل کھڑی ہوئی۔ اب بہت سے راستے سامنے تھے۔ ان پر مارا مارا پھرنا تھا مگر واپس نہیں آنا تھا۔ یا نہ جانے کیا ہونا تھا۔ جہاں راجہ جنک نے کہا تھا۔ متھلا جل رہا ہے۔ مگر میں باقی ہوں۔ غالباً یہ صحیح ہے۔" طلعت نے کہا

"ہم سب جلے جا رہے ہیں۔" ہری شنکر نے مائیکل سے کہا۔ "کیا آگ کی لپٹیں تم تک نہیں پہنچیں۔"

مائیکل نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

نیچے نیم تاریک گھاٹی میں کمال گاتا پھر رہا تھا۔ اس کی آواز ہوا پر تیرتی ان لوگوں کے کانوں تک پہنچی۔ چاند درختوں پر طلوع ہو رہا تھا۔

طلعت پھر اپنے سفر پر چل کھڑی ہوئی۔ اس سے چاند سنگھاڑے والی کوٹھی کے باغ میں کنوئیں پر جھکا آنگن کے اندر کھڑا ہے۔" اس نے کہا۔ "مرنے کے بعد روح شعلے سے رات میں، رات سے بڑھتے چاند میں، بڑھتے چاند سے بڑھتے سال میں، دیولوک میں، دادی کی دنیا میں، ہوا، سورج اور بجلی سے گزرتی چلی جاتی ہے۔ واپسی میں وہ فضا، ہوا، دھوئیں، بادل اور بارش اور پودوں میں پہنچی، قربانی کا شعلہ ہوا سے دھوئیں میں، دھوئیں سے کہر میں، کہر سے بادل میں، بادل سے بارش میں تبدیل ہو کر برس جاتا ہے۔ ساری روحیں فضا میں تحلیل ہو گئیں۔"

"خیالات کا اور روح کا سفر ایک ہے۔" شنکر نے کہا۔

موت مجھے ختم کر دے گی۔ موت کو کون ختم کرے گا۔ ہوائیں میرے

سانس کو اڑائے جائیں گی۔ سورج میری آنکھوں کی روشنی پر پردہ ڈال دے گا۔ چاند میرے دماغ کو سُلا دے گا۔ آتما فضا میں گھل جائے گی۔ میرے انگ کے رُوئیں جھاڑ جھنکار میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ سر کے بالوں سے درخت اُگ گئے ہیں۔ خون پانی میں گھل کر پانی بن گیا۔" طلعت نے چٹان پر کھڑے ہو کر دُہرایا۔

"گہری نیند۔ گہرا پانی۔ گہرا خواب۔" شنکر نے کہا: "عناصر سوچ رہے ہیں۔ حواس سو چکے ہیں۔ صرف موت باقی ہے۔"

"جسم سوچتا اور محسوس کرتا ہے۔ وہ ختم ہوا تو مجھو سب کچھ ختم ہوا۔ جلتی اگنی۔ سرد پانی، خنک ہوائیں۔ سب اپنے بھاؤ سے آپ پیدا ہوئی ہیں۔ گوتم نے جو یہ کہا تھا۔ اگر تمہارا جسم تمہارے ذہن سے کوئی علیحدہ چیز ہے تو اسے علیحدہ کر دو اور صرف تم میرے پاس آ جاؤ۔ مگر تم ایسا نہیں کر سکتیں۔" مادہ پرست گلشن نے کہا۔

"آئے پریم پگے پروانے جوال مُکھی جیوی کے دیوانے
جن چلمن کے پیچھے رے بیٹھی دیپ شکھا لہرائے رے۔
دیپ شکھا لہرائے رے۔" چندر ما نے گایا

"ابھی بہت سوں کو مرنا ہے۔ میں ان کے پہلے جا رہا ہوں۔ بہت سے مر رہے ہیں۔ میں ان کے ساتھ جا رہا ہوں۔ پیچھے مُڑ کر دیکھتا ہوں۔ جو مر گئے اُن کے ساتھ کیا ہوا۔ آگے دیکھتا ہوں۔ جو میرے بعد مریں گے ان کے ساتھ کیا ہو گا۔" ہری شنکر نے کہا۔

"چیونٹی چڑھی پہاڑ پر کانوں میں ہاتھوں لٹکائے
ایک اچنبھا ہم نے دیکھا نیّا بیچ ندیا ڈوبی جائے۔"

گھاٹی میں سے کمال کے گانے کی آواز آئی۔

"میری قیمت کیا ہے۔ میں نے اب تک کیا کیا ہے۔" سر لیکھا نے کہا۔
"میں جو کچھ کرتا ہوں۔ میرا ہر فعل منکشف ہے ساری کائنات کے چکر سے اس کا

براہِ راست تعلق ہے۔ اس اہمیت کو چھپانے کی غرض سے میں ہنستا ہوں۔ میں یہ تم کو یہ بتلا دوں۔" مائیکل نے انگلی اُٹھا کر کہا۔ "ہمارا حشر بہت بُرا ہوگا۔"

"کیا کریں۔ کیا کریں۔ کیا کریں۔" ڈرائڈ نے کورس کی مانند ان کی آواز پہاڑی پہ گونجی۔

"سامنے مستقبل کی دیوار ہے۔ اور میں مائیکل کی مانند اس کے سامنے کھڑی کھڑی چلا چلا کر رو رہی ہوں۔ کیا تکلیف اُٹھانا جرم کا ثبوت ہے ——؟" طلعت نے کہا۔

"کسی امریکن نیگرو کو بلاؤ۔ کسی جرمن یہودی کو پیش کرو۔ کسی عرب پناہ گزین کو ہمارے سامنے حاضر کیا جائے۔ کسی پاکستانی مہاجر اور ہندو شرنارتھی کو آواز دو —— اور ان سب سے پوچھو کہ تمھارا جرم کیا ہے جس کی یہ سزا تم کو ملی ——" گلشن نے کہا

"میں تمھارے سامنے موجود ہوں۔ میری سزا تجویز کرو ——" مائیکل نے کہا

"اسرائیل کے نئے نغمہ نواز —— ! ہم تو محض ڈیبورا کا گیت تم سے سُننا چاہتے تھے۔" طلعت نے کہا۔ "مگر تم نے ہاتھ میں بندوق اُٹھالی۔"

"ہم ہزاروں برس تک رُلتے رہے صحراؤں کی بھوک۔ غصہ۔ بے کسی چیخ چیخ کر ہم نے یہوواہ سے فریادیں کیں۔ داؤد کے گیت کاروں کا کرب۔ بے چارگی۔ خواب میں طلعت کا سوال دُہراتا ہوں —— کیا تکلیف اُٹھانا جرم کا ثبوت ہے؟ روح کی تنہائی اُنھوں نے اپنے لحن میں انڈیل دی۔ گہرائی کی تنہائی۔ اونچائی کی تنہائی۔ دُکھ، شک، ترغیبات اور گناہ کی تنہائی۔ کسی کشش میں گرفتار ہو کر انسان خود کو کس قدر اکیلا محسوس کرتا ہے ——" مائیکل نے کہا۔

"جنگلوں میں ایک ہزار جوگی بیٹھے بھجن کرتے تھے۔ میں نے اُن کی آوازیں سُنیں" ہری شنکر نے کہا۔

"بابل اور فلسطین کے سبزہ زاروں پر میں گاتا پھر رہا تھا۔" مائیکل نے کہا۔

"میں نے تمھاری آواز بھی سُنی تھی۔" طلعت نے کہا۔

"یہ سارے تصوّرات جمع کر کے ایک قربان گاہ کا پردہ کاڑھ دو یا کھڑکیوں کے شیشے رنگ دو۔ تمہارا تخیل بازنطینی مصوروں کی طرح حد سے زیادہ بھرپور ہے۔" مادہ پرست گلشن نے کہا۔

"تاریخ کا احساس میرے سر پر تلوار کی طرح معلّق ہے۔ میں اپنے آپ سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔" مائیکل نے کہا۔

"کیا کریں۔ کیا کریں۔ کیا کریں۔" کورس نے کہا۔

"کتابیں وہی تھیں جو اب تک ہزاروں لوگ پڑھ چکے تھے۔ نئی کتابیں چھپتی تھیں جن میں مضمون لکھے جاتے تھے۔ نئی کہانیاں بنتی تھیں۔ روز صبح کو پہاڑوں پر روشنی پھیلتی تھی۔ کلیساؤں میں داؤد کے نغمے دہرائے جاتے تھے۔ میرے ربائی نے کہا۔ انسان کو سبت کی رات پانی نہیں پینا چاہیے۔ اگر پیے گا تو اس کا اپنا خون اس کے سر پہ ہے ـــــ لیکن انسان پیاسا ہے تو اس کا کیا علاج ہو ــــ؟ اس سے کہو۔ انسان سے کہو داؤد کے ساتھ سات آوازوں کو دہرائے۔ خداوندا خدا کی آواز پانیوں کے اوپر ہے۔ خداوند خدا کی لرزہ خیز قہرناک آواز۔ اس آواز سے لبنان کے دیودار ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ اس آواز سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں۔ اس آواز سے ویرانے لرز اٹھتے ہیں۔ جنگل سونے ہو جاتے ہیں اور اس کے ہیکل کے پجاری کہہ اٹھتے ہیں ــــ تقدیس ہو ــــ تقدیس ہو ــــ تقدیس ہو ــــ مگر تم پھر بھی کہتے ہو۔ میں پیاسا ہوں۔ میں پیاسا ہوں ــــ" مائیکل نے کہا۔

"بھوک سے انسان پیدا ہوتا ہے۔ عمر بھر اسے بھوک ستاتی ہے محبت کی۔ روٹی کی۔ سکون کی ــــ" مادہ پرست گلشن نے کہا۔ "بھوک اور پیاس ہمارے سب سے بڑے بھوت ہیں۔ میں سب سے پہلے ان بھوتوں سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ پھر دوسری نجات مجھے آپ سے آپ مل جائے گی ــــ"

کمال گاتا ہوا چڑھائی پر آگیا۔

"لوگوں کو احساسِ جرم اکٹھا کرتا ہے۔ یہاں احساسِ معصومیت نے کہیں کا نہ رکھا۔ کاش ہم نے ایک آدھ چھوٹا موٹا گناہ کر لیا ہوتا۔ اس احساسِ معصومیت کی رسیوں سے ہم سب ایک دوسرے سے جکڑے ہوئے ہیں۔ جس دن ہم میں سے ایک نے اس رسّی کو توڑا۔ ہم سب ہمیشہ کے لیے تتر بتر ہو جائیں گے۔" ہری شنکر نے کہا۔

طلعت اب ایک دوسری چٹان پر جا بیٹھی تھی اور سب کی طرف سے پشت کیے وادی کو دیکھ رہی تھی۔ "ایسا کبھی نہ ہوگا۔" اس نے مڑ کر جواب دیا۔ "ہمیشہ ہماری کلچر، ہماری بیاک گراؤنڈ۔ ہمارا بے حد اونچا مورل کوڈ آڑے آجائے گا۔"

"نہیں طلعت بیگم۔" ہری شنکر نے کہا۔ "ہماری کلچر کی رسّی تو پہلے ہی ٹوٹ چکی ہے۔ جس کے ایک سرے پر تم اور دوسرے پر میں ہوا میں معلّق لٹک رہے ہیں۔"

"اپنے بھوتوں کو بھول جاؤ — اپنے بھوتوں کو بھول جاؤ —" گوتم نے کہا۔

"پھر شیشے کا بڑا دروازہ کھلا۔ اس میں سے جو لوگ اندر آ رہے تھے اس میں چمپا بھی تھی۔ ہلو — اس نے کہا۔ اور میری طرف آئی۔ یہ کون لوگ ہیں۔ یہ کون جگہ ہے۔ یہ چونزے کی سرائے ہے اور میں جہاز کے دفتر فون کر رہا ہوں۔ میں فی الحال بہت محفوظ ہوں۔ میرے چاروں اور شہر کی سنگی عمارتیں کھڑی ہیں۔ میرے پیروں کے نیچے ٹھوس زمین ہے۔ مگر مجھے بے حد ڈر لگا — چمپا باجی میرے سامنے موجود ہیں۔ ان کے بال بھی وہی ہیں۔ ساری بھی اسی انداز سے پہنی ہے۔ وقت کا الاؤ جو جل رہا ہے۔ اس میں وہ بڑی نکھری ہوئی نظر آ رہی ہے اور مجھے یہ بھی احساس ہے کہ مجھے اسے دیکھ کر کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ کوئی رنج۔ کوئی جھنجلاہٹ بلکہ یہ کہ میں جلد از جلد یہاں سے چھپتا ہوا بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ میں کیا کر سکتا ہوں کہ تم چمپا ہو۔ اگر تم دوبارہ دس پندرہ سال تک بھی مجھے نظر نہ آؤ۔ تو مجھے ہرگز فکر نہ

ہو گی۔ پندرہ سال قبل میں تم کو یہی کہا کرتا تھا۔ اب تم تب سے بھی زیادہ خوبصورت نظر آ رہی ہو۔ زیادہ سمجھ دار۔ سنجیدہ۔ بردبار۔ اللہ جانے تم کیا کیا بن چکی ہو۔" میں نے سُنا تھا کہ آپ آج کل اپنی آواز اُردو میں ڈب کر رہی ہیں۔ کسی فلم کے لیے۔ شاید آلِ کہہ رہا تھا۔" میں نے اخلاقاً گفتگو شروع کی۔

مجھے لگا جیسے وہ مجھے کوئی بڑی اہم بات بتانا چاہتی تھی۔ مگر خاموش ہو گئی۔

آسمان پر بادل گھر آئے تھے اور ہلکی پھلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ چمپا باجی سامنے کون فلم ہو رہا ہے۔ میں نے پھر اخلاقاً گفتگو کی سعی کی۔ لوگ جو سینماؤں میں سے باہر نکل رہے تھے ان کے چہرے اُداس تھے۔ بیزاری سارے ماحول پر چھائی تھی۔ روشنیاں غمگین تھیں۔ موسیقی رو رہی تھی۔ سڑک پر موٹروں اور بسوں کے چلنے کی آواز میں پژمردگی تھی۔ وقت گھسٹتا جا رہا تھا۔ وہ شیشے کی بڑی دیوار سے ناک چپکا کر کھڑی ہو گئی اور باہر ٹریفک کو دیکھنے لگی۔ میں جلدی سے اسے خدا حافظ کہہ کر باہر آ گیا۔

"اب میں نے اس کو بہت پیچھے کھڑا چھوڑ دیا ہے۔

"میں گھر کی طرف جا رہا ہوں۔ وہ اس بیکراں اُداسی، سناٹے کے اس پُرشور بھنور میں اکیلی چپ چاپ شیشے کے دروازے کے پاس کھڑی رہ گئی ہے۔ میں کیوں اس قدر تھک گیا ہوں۔ مجھے چپکا بیٹھ جانے دو۔" کمال نے قریب ایک پتھر پر بیٹھنے کے بعد کہا۔

"لکڑی جل کوئلہ بھئی، کوئلہ جل بھئی راکھ
میں برہن ایسی جلی نہ کوئلہ بھئی نہ راکھ"

چندرا نے گایا —

"چوروں کی طرح ہم نے بھی اپنے دیوتا جگائے۔ مگر دیکھو کیا ہوا۔ دیوتا صاف چوٹ دے گئے —" طلعت نے کہا۔

"کاگا سب تن کھائیو چُن چُن کھائیو ماس   دو نینا جِن کھائیو، پیا ملن کی آس

چندرا نے گایا۔

"سبز رنگ کا کہرہ اب سارے میں پھیل گیا ہے۔ سب اس کہرے میں بہتے چلے جا رہے ہیں۔ میں تاریکی کے کنارے، اُجالے اور خوف کے سنگم پر پاؤں ٹکائے سونے کے رنگ والے خدا پرجاپتی کی مانند از سرِ نو چیزوں کے نام تجویز کر رہی ہوں۔" طلعت نے کہا۔

"دیکھو۔" اُس نے چٹان پر کھڑے ہو کر اُفق کی طرف اشارہ کیا۔ "مائیکل — اُدھر تمھارا یروشلم ہے — ہم سب کا یروشلم ہے —"

"اور یروشلم ابھی تقسیم شدہ ہے —" ہری شنکر نے اسے یاد دلایا —

"اور پہاڑیوں پر داؤد کے نغمہ نواز کراہتے پھر رہے ہیں۔ لحن ختم ہو چکے صلیبوں پر یسوع کے ساتھ ہمیں لٹکایا گیا ہے۔ یسوع کے بجائے ہم سُولی پر چڑھتے ہیں۔ کیونکہ ہم سب سے بڑے چور تھے۔ ہم نے خُدا کے خزانوں میں سے مسرت کی چوری کرنا چاہی تھی۔" طلعت نے کہا۔

"دیبی شیشے کے دروازے کے پیچھے کھڑی رہ گئی ہے" اب مجھے کچھ یاد نہیں۔ گزرتے ہوئے برس بگولوں کی طرح میرے چاروں اور منڈلا رہے ہیں۔ سڑکوں پر بارش میں رات کی روشنیاں جھلملاتی ہیں۔ سوتے ہوئے مکانوں کی چمنیوں پر سے چاند لڑھکتا ہوا سمندر کی اور جا رہا ہے۔ ندی کے کنارے۔ گلپوشں۔ سنہرے باغوں میں۔ ایسٹ اینگلیا کے جنگلوں میں تیز ہوائیں چل رہی ہیں سنسان بندرگاہوں میں سیاہ پانیوں پر رات کے پرند چکر کاٹ رہے ہیں۔

میرے سامنے سے لوگوں کے ہجوم گزرتے ہیں۔ جھیل میں ڈونگیاں تیرتی ہیں۔ میں کنارے پر ہوں۔ مجھے اب اپنے جہاز کو تلاش کرنا ہے۔ ایسا جہاز جس کی روشنیاں بجھ گئی ہوں۔ جو چپکے سے سمندر کی عمیق تاریکی میں داخل ہو جائے۔ ایسا جہاز جو صرف اُس سمت جاتا ہو جہاں کوئی خوش آمدید کہنے والا نہ ہوگا۔" کمال نے کہا۔

کہرہ اب بہت گہرا ہو چکا تھا۔

"سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رین کرو کہ بھور کبھی نہ ہوئے"

چندرا گاتی ہوئی پہاڑی کے نیچے اتر گئی۔

"روپ اور نام روپ۔" ہری شنکر نے کہا۔

"ودیا اور اودیا۔" طلعت نے کہا۔

"کانٹ اور ویدانت۔" مائیکل نے کہا۔

"اب ہماری سمجھ میں آگیا ہے۔" سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

"کیونکہ جذبات اور خیالات کی سب سے اونچی چوٹی پر ہمیشہ وہی اکیلا کھڑا رہ جاتا ہے۔ تنہا، ازلی اور ابدی۔ جس کا نام گوتم ہے اور مائیکل اور ہری اور سرل، اور کمال رضا۔ اس کی تنہائی امٹ ہے۔"

سرو تاریک ہواؤں میں ان کی آواز ڈوب گئی اور سیاہ کہرے نے ان کو اپنے اندر ڈھانپ لیا۔

۹۵

طلعت دوسرے روز صبح منہ اندھیرے ٹیوب میں بیٹھ کر چیلسی روانہ ہوئی۔ اس وقت بہت سخت سردی پڑ رہی تھی اور دھند کی وجہ سے ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ انڈر گراؤنڈ اسٹیشن ابھی سنسان پڑے تھے۔ وہ چیلسی پہنچ کر اس مانوس سڑک پر چلنے لگی جس پر کئی سال سے چلتی آئی تھی۔ یہ راستہ بھی ختم ہوا۔ اس نے سوچا۔ کملا کے بلاک پہنچ کر حسبِ عادت ورنن کے پیتل کو چھوا۔ بوڑھے پورٹر نے جس کا ایک ہاتھ کٹا ہوا تھا اسے دیکھ کر سر ہلایا اور مسکرایا۔ برسوں سے مسٹر جنکنز اور طلعت میں یہ مکالمہ ہوتا آیا تھا۔ کیسا اچھا موسم ہے یا کیسا برا موسم ہے یا اچھی ہوا چل رہی ہے۔ یا بہار آنے والی ہے۔ مسٹر جنکنز زندگی کے اس کے

ڈرامے" کا خاموش کورس تھا۔ مسٹر جنگنز جس کا دایاں ہاتھ برما کے محاذ پر کٹ گیا تھا۔ لفٹ کے پاس کھڑا رہ گیا۔ طلعت اوپر پہنچی۔ گیلری کے دبیز سرخ قالینوں پر سے گزر کر اس نے کملا کے فلیٹ کے دروازے پر دستک دی۔ آج گویا جو کچھ ہو رہا تھا۔ ایک اداس سے رمز کی حیثیت رکھتا تھا۔ کملا نے دروازہ کھولا۔ اس کا سامان فرش پر بکھرا پڑا تھا۔ خاموشی سے، ایک لفظ کہے بغیر دونوں پیکنگ میں جٹ گئیں۔ اتنے برسوں میں کتنی گرہستی جمع ہو گئی تھی۔ برتن، کتابیں، ملبوسات یہ بھی تم لے لو۔ یہ بھی تم لے لو — کملا میکانکی انداز سے کہتی گئی۔ کتابوں کو بڑے ٹرنک میں ٹھونسا گیا۔ جوتے نکال کر باہر پھینکے گئے۔ تصویریں دیواروں پر سے اتریں۔ سامان کے ڈھیر پر بیٹھ کر ایک اٹیچی کیس بند کرتے کرتے کملا نے یکلخت ہوا میں ہاتھ لہرا کر ASH WEDNESDAY پڑھنا شروع کر دی۔ اور پھر اسی طرح چپکی ہو کر سلیپر اور ہاؤس کوٹ سمیٹنے میں مصروف ہو گئی۔ باہر ابھی دھندلکا موجود تھا۔ ایک آدھ روشنی کسی فلیٹ میں جھلملا جاتی تھی۔
"یہ گوتم صاحب بھول گئے یہاں پر —" طلعت نے ایک کتاب اٹھا کر اسے الٹا پلٹا اور صندوق میں اوپر سے گرا دیا۔ جس طرح تالاب میں پتھر گراتے ہیں۔ اب وہ تھک گئی۔ چائے بنائی گئی۔ سویرا ہوا۔ آدھ گھنٹے بعد کملا کینیڈا کے لیے روانہ ہو گئی۔

اب طلعت نے کمال کا سامان پیک کرنے کی غرض سے واپس گھر کی طرف رخ کیا۔ صبح دس بجے کمال کی بوٹ ٹرین چھوٹ رہی تھی۔

٩١

جہاز کے برآمدے میں آرکیسٹرا کا رخصتی نغمہ بلند ہوا۔ کمال کا دفعتاً دل بھر آیا۔ وہ ریلنگ پر جھکا نیچے دیکھتا رہا۔ لندن میں اسے بوٹ ٹرین پر پہنچانے کے لیے بیسیوں لوگ آئے تھے۔ آنسو پونچھے گئے تھے۔ رومال ہلائے گئے تھے۔ اور جب

اور ترونا نے تو چول چول بھی شروع کر دیا تھا۔ قدم قدم بڑھائے جا۔ خوشی کے گیت گگائے جا۔۔ گویا وہ سپاہی تھا اور ایک ایسی جنگ میں کودنے جا رہا تھا جس کا مقصد کسی کو معلوم نہ تھا۔

مگر پورٹ سعید میں وہ اکیلا تھا۔ اجنبی بندرگاہ۔ اجنبی مسافر۔ دُنیا کی اجنبیت ابھی سے اس کے لئے شروع ہو گئی۔ بڑی مشکل سے اُس نے اپنے امنڈتے ہوئے آنسوؤں کو ضبط کیا۔ بار میں دو بوڑھے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے شفقت سے اُس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ کمال نے جذبۂ تشکر میں ڈوب کر اسے دیکھا بوڑھا سُونی سُونی آنکھوں سے بندرگاہ کا نظارہ کر رہا تھا۔ جہاز نے لنگر اٹھایا تو وہ اپنے کیبن میں آگیا اور سارا دن اُس نے اپنے کیبن میں گزار دیا۔ اپنے ہم سفر سے بھی بات نہ کی جو کوئی اطالوی معمار تھا۔

دوسرے روز اُس نے سارے جہاز کا جائزہ لیا۔ ہندوستانی اور پاکستانی فارن سروس کے چند اعلیٰ حکام اور ان کے خاندان۔ فوجی افسر۔ طالب علم جو سرکاری وظیفوں پر سفر کر رہے تھے۔ چند پاکستانی، ہندوستانی اور لنکا کی لڑکیاں جو ڈاکٹری اور ایجوکیشن کی ڈگریاں لے کر لوٹ رہی تھیں۔ انگریز اور امریکن جو دولتِ مشترکہ اور امریکن امداد کے پروگراموں کے تحت برِصغیر کو ترقی دینے کی غرض سے جا رہے تھے۔ ٹورسٹ کلاس کا مجمع زیادہ دلچسپ تھا۔ طلباء جو اپنے خرچے پر پڑھنے آئے تھے۔ اَن پڑھ سکھ اور کاروباری۔ مشنری۔ کیتھولک راہبات۔ ایک فرانسیسی بھکشو۔ برلن کی مسجد کے قادیانی مبلغ اور ان کا خاندان۔ پنڈت جی جن کو کمال لندن میں بھی جانتا تھا جو چھٹی پر گھر جا رہے تھے۔ اورنٹیل سکول میں پڑھاتے تھے۔ شدھ ہندی نسٹ تھے۔ بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ گھنگھریالے لمبے لمبے بال۔ لڑکیوں کی ایسی خوبصورت شکل۔ دُبلے پتلے نازک سے مہاتما گاندھی کے چیلے۔ بے حد ہنس مکھ اور خوش اخلاق۔ چلّے کے جاڑوں میں بھی لندن میں دھوتی اور چپل پہنتے۔ برج کے علاقے کے لوک گیتوں پر ریسرچ کر رہے تھے۔۔۔ "ری اماں مورے بھیّا کو بھیجو ری کہ

ساون آیا" خوب لہک لہک کر گاتے۔ اُنھوں نے چھوٹتے ہی کمال سے فرداً فرداً سارے دوستوں کی خیریت پوچھی اور رکماری نرملا کے دیہانت پر اظہارِ تعزیت کیا۔ مائیکل بھی جو جبرالٹر تک جا رہا تھا۔ ٹورسٹ کلاس میں تھا۔

شروع شروع میں فرسٹ کلاس کی لڑکیوں نے کمال کو بے حد دلچسپی سے دیکھا مگر جب اُس نے کوئی پیش قدمی نہ کی تو وہ اُکتا کر دوسرے لوگوں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

ایک روز کمال برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھا ریلنگ میں پیر اٹکائے واقعتاً سمندر کی لہریں گن رہا تھا کہ پیچھے سے کسی کی آواز آئی —

"میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں —؟"

"ضرور —" اُس نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ وہی بوڑھا کھڑا مسکرا رہا تھا جس نے پہلے روز کمال کو خاموشی سے دلاسہ دیا تھا۔ وہ اس اجنبی بوڑھے کی اس چھوٹی سی مہربانی کا بے حد ممنون تھا۔ وہ جلدی سے اُٹھ بیٹھا اور اس کے لئے دوسری آرام کرسی کھینچ لی۔

"فریڈی۔ پال۔ تم لوگ بھی ادھر آجاؤ —"

"ٹھہرو۔ ہم بیئر لے آئیں —"

چند لمحوں بعد دو اور یورپین آکر قریب بیٹھ گئے۔

"میرا نام ڈاکٹر ہینس کریمر ہے۔ میں آسٹرین ہوں۔ میں اور میرے دونوں دوست جو تاریخ کے پروفیسر ہیں۔ انڈیا جا رہے ہیں۔ تم انڈین ہو —؟"

"ہاں۔"

"اسی لئے میں نے پہلے سے پوچھ کر اطمینان کر لیا۔ کیونکہ کل میں نے اس سامنے والی لڑکی کو انڈین کہہ دیا تو وہ بپھر گئی۔ وہ پاکستانی ہے —" تینوں کھوکھلی سی ہنسی ہنسے۔

کمال خاموش رہا۔

"تم انڈیا میں رہتے ہو"

"جی۔"

"میں بودھ جینتی کے لیے جا رہا ہوں۔" ڈاکٹر کرتیر نے کہا۔

"اوہ — ؟ اوہ — ! بدھ جینتی — !!"

"بودھا تاریخ کا سب سے بڑا آدمی تھا۔" پال نے اظہارِ خیال کیا۔ "تم ہندو ہو نا — ؟"

"جی نہیں۔"

"اوہ — معاف کرنا۔ مجھ سے پھر غلطی ہوئی۔ تو کیا تم محمڈن ہو — ؟"

"جی۔"

"تو پھر انڈیا میں کیسے رہتے ہو — ؟"

"یہی اب تک خود میری سمجھ میں نہیں آیا۔" کمال نے جواب دیا۔

"ہائی ڈوک —" ایک امریکن نے بشاشت سے قریب آتے ہوئے کہا —

"ہائی — !" اس نے بے تکلفی سے کمال کو مخاطب کیا۔

"ہائی — !!" کمال نے جواب دیا۔

"میرا نام ٹامس جیرلڈ ایکنسز ہے۔ مگر مجھے ٹام پکارو۔ اور تم — ؟"

"مجھے کمال کہتے ہیں۔"

"میں تم کو کم کہوں گا — کپلنگ کا کم — !!"

"لو بیٹر ہو اولڈ ٹام —" کمال نے اکتاہٹ کے ساتھ کہا۔

"باقی جرنلسٹ لوگ کہاں ہیں — ؟" فریڈی نے پوچھا۔

وہ لوگ بھی آ گئے۔ ان میں سے ایک فرانسیسی تھا۔ مارتیں۔ جو ہندچینی جا رہا تھا۔ دوسرا ایک مشہور برطانوی شاعر تھا۔ جو بی بی سی کے نمائندے کی حیثیت سے بدھ کی پچیس صد سالہ برسی میں شرکت کے لیے عازمِ ہند تھا۔ چند دولت مند امریکن سیاح خواتین تھیں جو امریکہ سے اسی یاترا پر نکلی تھیں۔ ایک فرانسیسی بھکشو نارنجی چادر میں ملبوس سب سے الگ تھلگ ایک کونے میں بیٹھا رہتا۔ وہ بھی گیا اور بنارس جا رہا تھا۔ وہ ٹورسٹ مسافر تھا۔

"میں دیکھتا ہوں کہ تم دوڑ دوڑ کر نیچے بہت جاتے ہو۔" کھانے کے وقت ٹام نے مسکرا کر دوستانہ لہجے میں کمال سے کہا۔ "کیا وہاں تمہاری گرل فرینڈ سفر کر رہی ہے۔۔؟"

"نہیں میرا پرانا دوست ہے — مائیکل گولڈ اسٹین۔ کیمبرج میں میرا ہم جماعت تھا۔ اس سے آپ سب ضرور ملئے گا۔"

"مائیکل گولڈ سٹین — یہودی ہے۔؟" پال نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"اوہ۔"

خاموشی چھا گئی۔

"اور سونے پر سہاگہ یہ — " کمال نے گلا صاف کر کے کہا۔ "کہ اسرائیل جا رہا ہے۔"

شام کو کمال نے مائیکل کو ان سب لوگوں سے ملوایا۔ پنڈت جی بھی اس حلقے میں شامل ہو گئے۔ اب ان سب کی اٹھک بیٹھک ساتھ رہتی۔ ایک بیگم صاحبہ نے جو نیو یارک سے آ رہی تھیں کئی مرتبہ کمال کو اپنی محفلوں میں بلایا۔ ان کی لڑکی بھی ہمراہ تھی اور یونیورسٹی آف سن سناٹی سے سوشل سائنس میں ایم اے کر کے آ رہی تھی اور حیرت انگیز طور پر کم عقل تھی۔ بیگم صاحبہ کے گروہ میں اعلیٰ افسران اور دوسرے بڑے لوگ شریک رہتے۔ وہ مسلمان لڑکیاں اور تھیں جو ہمیشہ نٹنگ کرتی رہتیں۔ ایک مرہٹی لڑکی گاتی بہت عمدہ تھی۔ یوروپین اور امریکن لڑکیاں ہر وقت آفتابی غسل میں مصروف رہتیں۔ کمال کی شکل و صورت اور اس کی کم آمیزی سب کو بہت بھا گئی تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی ہر وقت ہلڑ مچانے والا لڑکا ہے — جو ایسا فقیر منش بنا ہوا ہے۔

دن بھر اور رات گئے تک وہ سب ادھر ادھر کرسیوں پر بیٹھے کتابوں پر تبصرہ کرتے فلسفہ تاریخ کھنگالا جاتا۔ پنڈت جی کیرتن کرتے لیلا بھاسکر گاتی۔ رات کو

رقص ہوتا۔ سینما دکھایا جاتا۔ ہر طرف زور شور میں فلرٹیشن چل رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے قصّے تیار ہو گئے تھے۔ شادی شدہ بیگمات، مسلمان لڑکیوں کی ایک ایک بات نظر میں رکھتیں۔ جہاز پر ایک شادی بھی تقریباً طے ہو گئی۔ ایک پٹھان انجینئر صاحب تھے۔ ایک کراچی کی ماہرِ تعلیم صاحبزادی تھیں۔ وہ دونوں گھنٹوں ڈیک پر کھڑے ہو کر سمندر کے منظر کا مطالعہ کریں تو لامحالہ بہن رشیدہ سلطانہ کے کانوں میں شادی کی گھنٹیاں بجنے لگیں گی۔ ایک شادی شدہ بزرگ جو تنہا سفر کر رہے تھے بہن ایڈوینا رتن ورودھن پر بہت مہربان ہو گئے۔ جو کولمبو جا رہی تھیں۔ اس کا بڑا قصہ رہا۔ کمال یہ سب دیکھا کرتا۔ جہاز کی اس چھوٹی سی محدود دُنیا میں انسانوں کی ساری اچھائیاں، ساری کمزوریاں ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہتی تھیں۔ کاش میں بھی ان عام نارمل انسانوں میں شامل ہوتا — وہ بعض مرتبہ جھنجھلا کر سوچتا اور پھر ڈاکٹر کریر کے پاس جا بیٹھتا۔ اپنے ساتھی بچھڑ گئے تھے۔ مگر یہ لوگ کتنے اچھے تھے۔ سفر بہت تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔

کل صبح جہاز جبرالٹر پہنچنے والا تھا۔ کمال مختلف گروہوں میں بیٹھ کر لوگوں کی باتیں سُن کر، تاش کھیل کر، سوئمنگ کر کے لائبریری میں رسالے پڑھ کر اب بُری طرح اکتا چکا تھا۔ ایک انگریز لڑکی سے فلموں پہ تبادلہ خیالات کرنے کے بعد وہ پھر سارے جہاز کا چکر لگاتا پھرا اور آخر سب سے اوپر کے ڈیک پر جا کھڑا ہو گیا۔

عقب سے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ دُور کشتیوں کے پاس ڈاکٹر ہیتس کریر اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ مائیکل ریلنگ کے سہارے کھڑا ان کو مخاطب کر رہا تھا۔ ایک امریکن پروفیسر لڑکی فرش پہ دری بچھائے کہنیوں کے بل لیٹی تھی۔ کسی نے گٹار بجانا شروع کر دیا تھا۔

"لکھو —" مائیکل کی آواز آئی۔

"کیا لکھوں —" ٹام نے کہا۔

"جو میں کہتا ہوں اس کی غلط رپورٹ کرو۔ کیونکہ خداوند خدا کی وعدہ کی بھلائی سے تم اسی طرح کملاتے ہو —" مائیکل گرجا۔

"اوہ —" کمال نے سوچا۔ مائیکل اور ٹام میں پھر جھگڑا شروع ہوا۔
"وہ دیکھو۔ کمال رضا آرہا ہے — اس کی باتیں بھی غور سے سنو اور واپس جا کر جو کتاب لکھو اس میں ذکر کرنا کس طرح ایک انڈین مسلم تمھیں جہاز پہ ملا جو پاکستان کا شدید مخالف تھا مگر ۵۵ء کے ہندوستان میں کوئی اس کی بات نہ پوچھتا تھا۔"
"مصیبت یہ ہے مائیک۔" ٹام نے کہا، "کہ تم جذباتی ہو۔ آخر ہونا اصل نسل ایشیائی —!"
"میں جذبات کو باعثِ شرم یا گالی نہیں سمجھتا۔" مائیکل نے منہ لٹکا کر جواب دیا۔
"آہا ہا —" پنڈت جی نے زلفیں جھٹکا کر کہا۔ "آیئے شری رجاجی۔ اپنا مائیکل ایک اور بھاشن دے رہا ہے۔
"آہا۔ پنڈت جی۔" اس کی کٹھوتا کا درشن ناسک میرے پاس بھی نہیں۔"
کمال نے ہنس کر جواب دیا۔
برطانوی شاعر غور سے دونوں کو دیکھتا رہا۔
"مصیبت یہ ہے۔" ٹام نے کمال سے کہا۔ "جو غیر ملکی تمھارے ملک کے بارے میں کچھ لکھتا ہے تم اسے ای۔ ایم فارسٹر کے پیمانے سے ناپتے ہو، جو بے چارہ خود آئیڈیلسٹ تھا۔ بونوں کی دنیا میں رہنے والا دیو —"
فارسٹر نے اپنا ناول ۱۹۲۴ء میں لکھا تھا۔ اس وقت اس نے ڈاکٹر عزیز کو ہندوستان کے نمائندہ کردار کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔" برطانوی شاعر نے کہا — آج اگر فارسٹر دوسرا "پیسج ٹو انڈیا" لکھے تو اسے اپنا یہ کردار بدلنا پڑے گا۔ اب ڈاکٹر عزیز ہندوستان کا نمائندہ نہیں رہا۔ اب ہر مسلمان لامحالہ پاکستانی ہے۔ اب ہندو ہندوستان کا صحیح نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔"
"ہاں —" کمال نے جواب دیا۔
"کمال تم نے بہت دکھ اٹھائے ہیں —؟" شاعر نے پوچھا۔
"ہاں۔ مگر میں مظلوم کے روپ میں نظر نہیں آنا چاہتا۔ ہندوستان کی ازلی اور

ابدی، دُکھ سہنے والی رُوح — ! یہ تحمّل، یہ گریس، یہ دُکھ اُٹھانے اور برداشت کرنے کی عادت، تم موسیو پال بلاں کی طرح دھوتی پہن کر چوکے میں بیٹھ جاؤ۔ تب بھی نہیں سمجھ سکتے۔"

"سینٹ اگسٹین تو بنارس میں پیدا نہیں ہوئے تھے۔" مارتیں نے کہا۔

"کیتھولک نظریۂ حیات ایک مخصوص CULT تھا۔ ساری زندگی کو اُس نے اپنے اندر نہیں سمیٹا — ورنہ تم آج کیتھولک ہونے کے باوجود انڈو چائنا لڑنے کے لیے نہ جا رہے ہوتے۔" کمال نے چڑ کر جواب دیا۔

"اوبزروار اور COMBATANT میں کیا فرق ہے —؟" مارتیں نے پُوچھا۔

"یہ تم اپنے آپ سے پوچھو — دوسرے جنگ کریں تم ابزرو کرتے رہو اس سے کیا احساسِ جُرم کم ہو جاتا ہے۔ کمال نے کہا۔"

"تم تو مجھے کویکرز کی طرح پروفیشنل امن پرست معلوم ہوتے ہو —" ٹام نے کہا۔

"بھور بھئے گیّن کے پاچھے مدھوبن موہے پٹھایو —" ڈیک کے سرے پر لیلا بھاسکر نے گانا شروع کیا۔ کمال ٹام کی بات کو نظر انداز کر کے گانے کی طرف متوجہ ہو گیا — پنڈت جی نے تال دینا شروع کی۔ چند لمحوں بعد وہ دونوں لیلا بھاسکر کی طرف چلے گئے۔

"ہر کلچر کی ایک خفیہ — زبان ہے — جسے صرف وہی کلچر سمجھ سکتی ہے —" برطانوی شاعر نے کہا۔

مزید اشپنگلر — !" ٹام نے کہا۔ "پنڈت اور ہم کی کلچر ایک کہاں ہے۔"

"تم تو خیر مائیکل کی بھی خفیہ — زبان سمجھنے سے قاصر ہو۔" برطانوی شاعر نے مسکرا کر کہا "اسرار تمہاری سمجھ سے بالاتر ہیں ٹامس جیسے ایکنز —!"

مائیکل ڈرائی مارٹینی کے اثر میں مبتلا ایک کونے میں چپکا بیٹھا تھا۔ اپنا نام سُن کر وہ چونکا۔ میکانکی انداز سے اُس نے پلٹ کر وہیں سے بات شروع کر دی جہاں سے

اس کا سلسلہ تقریر منقطع ہوا تھا۔

"لکھو۔" اُس نے گرج کر کہا۔

"لکھو۔" مائیکل پھر گرجا۔ "دُنیا کی اقوام کی تاریخ فتوحات اور سلطنتوں کے قیام اور ملکوں کی آبادکاری سے عبارت ہے۔ میرے ہاں تاریخ کا تسلسل شدید ترین مظالم اور تکلیفوں کی داستان کی طویل کڑی ہے۔ تیرھویں صدی میں مجھے انگلستان سے نکالا گیا۔ چودھویں میں فرانس سے۔ پندرھویں میں اسپین کا قہر شروع ہوا۔ سارا زمانہ میں نے یورپ کے شہروں میں اچھوتوں کی طرح زندہ رہ کر گزارا۔ بے گھر، خانہ بدوش، دنیا کی لعنت کا شکار، مشرق اور مغرب دونوں جگہ میں نے آنسوؤں کے چراغ جلا کر علم کی روشنی پھیلائی۔ میں نے بوعلی سینا اور ابن خلدون اور امام غزالی اور الفارابی اور خوارزمی کے نظریوں کو یورپ میں رائج کیا۔ میں نے ——"

"ٹھہرو —— تم بھولتے ہو کہ ——" ٹام نے بحثنا شروع کیا۔

لیلا لہا سکر گاتی رہی۔ کمال نچلے ڈیک پر اُتر آیا۔ جہاں برآمدے میں موسیقی بج رہی تھی۔ بیگمات خوبصورت ساریاں اور شلواریں پہنے ایک حلقہ میں بیٹھی تھیں۔ ایک میز پر برج ہو رہا تھا۔

دوسری طرف سینما دکھایا جا رہا تھا۔ کمال ایک کھمبے سے لگ کر اندھیرے میں کھڑا ہو گیا۔ سامنے اسکرین کے پیچھے عمیق بیکراں اندھیرا تھا۔ اسکرین پر ایک خندہ صفت لوفروں کی سی شکل والا مشرقی برلین کا کمیونسٹ جاسوس امریکن ہیروئن کو اُڑا لے جانے کی فکر میں دبے پاؤں ایک گلی میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں پستول تھے۔ پھر ہیروئن موزہ اتار کر چھت پر چڑھ گئی۔ دوسری طرف سے ہیرو جو شاید رابرٹ ٹیلر تھا کود کر سامنے آیا۔ اور کمیونسٹ ولین کو چاروں شانے چت گرا کر ہیروئن کو بچانے کے لئے لپکا۔

"آیئے۔ آیئے۔ بیٹھئے کمال صاحب ——" بس خان نے کرسی کھینچتے ہوئے کہا ——

"جی نہیں اب میں چل دوں۔ میں یہ فلم پہلے دیکھ چکا ہوں دراصل۔"

لڑکیوں کو کھس پس کرتا چھوڑ کر وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا جہاں کراچی اور کلکتے کے چند ملک التجار پلیس پگال کا تذکرہ کر رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ ان کی بیویاں اس وقت باہر سینما دیکھنے میں مو تھیں۔ ان کے قریب سے گزرتا ہوا وہ ایک دریچے میں جا کھڑا ہوا۔

"کیوں جی۔ اب کے سے مرسی ڈیز خرید کر خشکی کے راستے واپس آیا جائے کراچی کیا خیال ہے۔ وہ فورڈ کونسل تو میں نے اپنے بھائی کو دے دی۔" دریچے کے نیچے برآمدے میں باتیں ہو رہی تھیں۔

"اچھا جی۔ میں اپریل میں یو۔این سشن کے لئے نیویارک جا رہی ہوں۔ مجھے اپنی بھابھی کا پتہ ضرور دے دیجئے گا۔ شیو تو اب میں ۵۶ء کا موڈل ہی لاؤں گی۔"

"میں نے بھی اپنی لڑکی کو انگلستان کے اسکول میں داخل کرا دیا ہے جی۔ پاکستان میں تو اسکول بالکل نکمے ہیں۔ میرا ارادہ ہے چھوٹے بچوں کو بھی ولایت ہی بھیج دوں۔"

"کیا کیا جائے پاؤنڈ نہیں ملتے۔"

"میری بڑی لڑکی نے لاہور سے ایم اے کر لیا ہے کہیں اس کی شادی کرائیے"

"کیسا لڑکا چاہیئے۔"

"کم از کم سی ایس پی تو ہو۔"

"کہیں کام کر رہی ہے بچی —"

"جی ہاں۔ کنڈرگارٹن اسکول میں پڑھاتی ہے۔ ویسے اس کو تو امریکہ کا اسکالرشپ بھی مل گیا ہے مگر میں چاہتی ہوں کہ شادی —"

"ہاں جی۔ یہ تو بالکل ٹھیک ہے۔ یہ بیگ روم سے لیا ؟"

"جی — آپ — اب کے امریکہ سے بہت جناور ی فریجڈیر لے آئیں۔"

"جی کیا بتاؤں — ضروریاتِ زندگی بڑھتی ہی چلی جا رہی ہیں —"

"یہ تو بالکل ٹھیک ہے۔"

کمال دریچے سے ہٹ آیا۔ سیڑھیاں اتر کر ٹورسٹ کلاس کا چکر لگانے میں مصروف ہو گیا۔ ڈیک پر سردار صاحبان دری بچھائے ہیر گانے میں محو تھے۔ دوسری طرف رقص ہو رہا تھا۔ ڈرائینگ روم میں تاش کھیلے جا رہے تھے۔ کمال مائیکل کے کیبن کے سامنے سے گزرا اور اسے یکلخت خیال آیا کہ کل صبح مائیکل جبرالٹر پر اتر جائے گا۔ اور اس کے بعد عین ممکن ہے کہ ساری عمر، مرتے دم تک اس سے دوبارہ ملاقات نہ ہو۔ کیسی عجیب بات تھی۔ سردار صاحبان کے گانے کی آواز مدھم پڑ گئی وہ مائیکل کے کیبن کے باہر ریلنگ پر جھکا کھڑا رہا۔ سامنے پورنماشی کا چاند افق پر طلوع ہو رہا تھا۔ سمندر بے حد پُرسکون تھے۔ جہاز لہروں کو چیرتا وقار سے آگے بڑھ رہا تھا۔ ڈیک کے اس حصے میں مکمل تنہائی تھی۔ صرف فرانسیسی بھکشو ایک سرے پر کمال کی طرف سے پشت کئے بیٹھا تھا۔

کمال کا دل دھڑکتا رہا۔ سناٹا اتنے زور سے گرجا کہ اسے محسوس ہوا کہ اس کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔ اسے ٹام اور برطانوی شاعر کی باتیں یاد آئیں۔ اس کا جی بیٹھنے سا لگا۔ وہ ریلنگ کو مضبوطی سے پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں اسٹیٹ لیس ہوں میں اسٹیٹ لیس ہوں —" اس نے پہلی مرتبہ اپنے آپ سے کہا۔

سمندر کی لہروں کے سفید جھاگ چاندنی میں چمکتے رہے۔ دُور دُور دُنیا کے چاروں کھونٹ چاندنی کی اس وسیع نیلگوں چادر پر مسافروں سے بھرے ہوئے جہاز چل رہے تھے۔ کونسٹیٹوشن اور کوئین الزبتھ۔ امراء کے یاٹ۔ تجارتی اور جنگی بیڑے۔ ان کشتیوں سے موسیقی کے سر بلند ہو رہے تھے۔ دور دراز کے ملکوں کے انسان ان کشتیوں میں سوار تھے۔ یوروپ اور انگلستان کے عالم۔ اٹلی کے راہب امریکن سیاح میکسکو کے نقاش۔ ہندوستان کے رقاص۔ دُنیا میں فی الحال امن قائم تھا۔ دلی میں پنڈت نہرو حکومت کرتے تھے۔ زندگی میں بظاہر بڑی گہما گہمی تھی۔

"خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنھیں دل کا چین نصیب ہے بھائی۔ مجھے شانتی چاہیئے۔" کمال نے آہستہ سے کہا۔

فرانسیسی بھکشو نے آنکھیں اُٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر کامل سکون تھا اور لازوال مسرت۔ ایسی ہی ایک پورنماشی کی رات، ڈھائی ہزار سال ادھر اس سمندر کے اس پار ایک ملک میں شاکیہ منی پیدا ہوئے تھے۔ چودھویں کا چاند سمندر کی لہروں پر ادھر اُدھر تیرا کیلاس کی تیز اور ٹھنڈی کرنیں کمال کے اور بھکشو کے چہروں پہ پڑ رہی تھیں۔

"مجھے میرے خیالوں سے نجات دلاؤ۔" کمال نے کہا۔

بھکشو اپنی پُراسرار نیلی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ "خیال۔ خیال خود کو نہیں جان سکتا خیال اپنے آپ سے باہر نہیں جا سکتا۔ کائنات سے باہر کوئی خدا نہیں ہے اور خدا سے باہر کوئی کائنات نہیں۔ حق و باطل میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن ان سب سے بالاتر ذات مطلق ہے جو سناٹا ہے۔" اُس نے فرانسیسی میں کہا۔

"مجھے اس سناٹے سے بڑا ڈر لگتا ہے۔" کمال نے کہا۔

"شُونیا۔ سناٹا۔ شونیتا۔ سُونا۔ جو ذات مطلق ہے۔ جو صفر کا تصور ہے۔"

"مجھے اس تصور سے بھی وحشت ہوتی ہے۔" کمال نے کہا۔ "اس سناٹے میں میں اکیلا کدھر جاؤں گا۔ تم بھی میرا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اس نے تھایان مذہب کے اس فرانسیسی بھکشو کو شک و شبہے کی نظروں سے دیکھا جو سوبورن یونیورسٹی کا ڈاکٹر آف فلاسفی تھا۔

"میں اسٹیٹ لیس ہوں اور یہ تمھاری سکھ دتی نہیں ہے—" اس نے دل میں کہا۔

اور بھاری بھاری قدم رکھتا اپنے ڈیک پر واپس آ گیا۔ رات گذر گئی۔

جہاز اپنا سفر طے کرتا رہا۔ منزلیں گویا قریب تر آتی گئیں۔

۹۷

ہندوستان کا ساحل—! بمبئی—!! گھر—!!! گھر—؟؟

کمال لکھنؤ پہنچا۔ گلفشاں کے پھاٹک میں داخل ہوا۔ اسے دنیا بدلی ہوئی نظر آئی۔ باغ کے درخت جل چکے تھے۔ پودے سوکھ گئے تھے۔ گھاس کی جگہ جھاڑ جھنکا

اُگا ہوا تھا۔ موٹر خانہ اور اصطبل گودام بنے ہوئے تھے (جتنے عزیز پاکستان ہجرت کر کے جاتے ہیں اپنا اپنا سامان لا کر یہاں ڈمپ کر دیتے ہیں۔ خالہ بیگم نے کہا)۔ شاگرد پیشہ سنسان پڑا تھا۔ اس کی آنکھوں نے گنگا دین کو ڈھونڈا۔ قدیرن اور قمرن کی تلاش کی۔ حسینی کی بی بی اور رام اوتار اور چھٹکی کو آوازیں دیں۔

آخر وہ اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر گر گیا۔ اور چپکے چپکے رونے لگا۔ دُنیا وہی تھی۔ گلفشاں۔ لکھنؤ۔ عزیز رشتے دار۔ سب کچھ وہی تھا۔ کیا صرف وہ خود بدل گیا تھا کیا وہ اپنے باپ کی تنگدستی دیکھ کر جذباتی طور پر مضطرب تھا؟ وہ جس کی ساری عُمر زمینداروں کے خلاف نعرے لگاتے گزری تھی۔ زمینداری کے خاتمے کی وجہ سے اب اتنا بڑا زوال آیا تھا کہ گلفشاں والوں کے یہاں دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے چلتی تھی (بہت انقلاب انقلاب کرتے تھے۔ لو بوڑھے باپ کو ایکّے پر بیٹھا دیکھ کر اب تو خوش ہو لو۔ نواب صاحب بہادر نے کہا) بڑی بڑی ریاستیں تباہ ہو گئیں تو ہم کس گنتی میں ہیں۔ شام کو امّی نے اس سے کہا جو اس سے ملنے کی خاطر جھانسی سے آئی ہوئی تھیں۔ نانپارہ کی کراکری بک رہی ہے۔ راجہ سُورج سنگھ کے پاس ایک دھیلہ نہیں رہا۔ امّی نے اپنے آدھے زیور بیچ ڈالے۔

"اب کیا ارادہ ہے۔" کمال نے اپنے بابا سے پُوچھا۔ "کربلا ہجرت کیجئے گا یا پاکستان۔۔؟"

"یہیں رہوں گا۔" اُنھوں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "کوئی ہم بھگوڑے ہیں۔"

کمال ہکا بکا رہ گیا۔ "مگر بابا آپ تو بڑی دھوم دھام سے مسلم لیگ میں شامل ہوئے تھے۔"

"ہاں ہاں تو پھر۔ پاکستان بن گیا۔ ٹھیک ہُوا۔ اب اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ ہم بھی بھاگ جائیں یہاں سے ——"

"آپ پاکستان کو اپنا جائز وطن سمجھنے کے باوجود ہجرت نہیں کرنا چاہتے۔ کیونکہ سوچتے ہیں کہ اس بڑھاپے میں کہاں در بدر مارے پھریں گے یا اس لئے کہ ہندوستان کو اپنا وطن سمجھتے ہیں اور اس سے محبت کی بنا پر اسے نہیں چھوڑ سکتے" —— کمال آج قطعی طور پر یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس کے باپ اور اس کے باپ کی نسل کے لوگوں کی نفسیات آخر کیا تھی۔ ان کے آئڈیلز۔ ان کی منطق۔ ان کی بہادری یا بزدلی ——

"اب تم سے جرح کون کرے۔ تمہاری کھوپڑی ہمیشہ کی اُلٹی ہے۔" نواب صاحب نے جواب دیا اور گھڑی دیکھی۔ ان کو آج عدالت سے جا کر معاوضے کی قسط کے دو سو روپے لانے تھے۔ جن سے مہینے کا خرچ چلتا تھا۔

"اب میں عامر بھیّا کی دُلہن کے در پر تو جا کر پڑنے سے رہی کراچی میں۔ یہاں کم از کم اپنا گھر تو نہیں چھنا ہے۔ اگر چلے گئے۔ تو یہ بھی گیا اور معاوضہ بھی ختم۔ وہاں کون کلیم ولیم کرتا پھرے گا — ویسے میرا دل نہیں لگتا اب یہاں —" امّی بیگم نے کہا۔

"مگر یہ تو آپ کا گھر ہے۔ آپ کا شہر۔ آپ کا وطن — جنم جنم کا دیس۔"

"مُسلمان کا کوئی وطن نہیں ہے۔ سارا جہاں وطن ہے —" چھوٹے پھوپھا نے کہا۔ جو حال ہی میں ہجرت کر کے کراچی گئے تھے اور ان دنوں سامان کا تیا پانچہ کرنے آئے ہوئے تھے۔

کمال نے مزید تبادلہ خیالات اس موضوع پر لاحاصل سمجھا اور اُٹھ کر باہر آگیا۔

چند روز بعد اس نے کمر کس کر ملازمت کی تلاش شروع کی۔ اس کے پاس ان گنت ڈگریاں تھیں۔ ٹرنٹی کالج کیمبرج۔ امپیریل کالج آف سائنس۔ لندن۔ اور کئی سال اس نے انگلستان کی ایک مشہور لیبارٹری میں نوکری کی تھی۔ برطانیہ کی ملازمت چھوڑ کر وہ وطن کی خدمت کے جذبے سے واپس آیا تھا۔ یونیورسٹی میں جس جگہ کے لئے وہ کوشاں تھا وہ ایک معمولی ایم ایس سی کو دے دی گئی۔ چونکہ وہ ہندو تھا۔

چھ مہینے گزر گئے۔ وہ دلّی کے چکّر لگا لگا کر دیوانہ ہو گیا۔

"میاں کسی سے سفارش کروا لو —" نواب صاحب نے کہا۔

"سفارش تو میں قیامت تک نہیں کرواؤں گا۔ کیا مجھے اپنی اہلیت پر بھروسہ نہیں جو سفارشیں کرواتا پھروں —"

"یہی تو تمہارے دماغ میں خنّاس ہے —"

اب وہ سارا سارا دن گلفشاں میں چپ چاپ پڑا رہتا یا طلعت کو خط لکھتا۔ انڈیا ہرگز مت آنا۔ جہاں تک ہو سکے وہیں رہے جاؤ۔ یہاں آؤ گی تو وہی حشر ہوگا جو میرا ہو رہا ہے۔

"تم کو کیا ہو گیا ہے۔" طلعت جواب دیتی۔ "اتنے ڈی مورلائزڈ کیوں ہو گئے۔ جدوجہد کی ہمت ہار بیٹھے۔ یہی تو وقت ہے آزمائش کا۔ ڈٹے رہو۔ مزدوری کرو۔ ہل چلاؤ۔ آخر انقلاب کا سامنا کرنا اسی کو تو کہتے ہیں۔ مگر کیا تم عیش کے خواب دیکھ رہے ہو؟"

کیا لڑکیوں میں ہمت زیادہ ہوتی ہے۔؟ وہ سوچتا۔ یا وہ آئیڈیلسٹ پرلے درجے کی ہوتی ہیں۔ بہر حال طلعت کے خطوط سے اس کو بڑا سہارا مل جاتا۔

گوتم نے اسے متواتر نیویارک سے خط لکھے۔ اس نے کسی کا جواب نہ دیا۔ وہ لکھتا کیا آخر؟ ہری شنکر امریکہ سے ——— لوٹ چکا تھا اور بنگلور میں تعینات تھا۔ کمال نے اسے بھی کوئی خط نہ لکھا۔

بھیا صاحب نے کراچی سے ڈاک بٹھا دی۔ فوراً یہاں آجاؤ۔ ایک سے ایک بڑھیا عہدے یہاں موجود ہیں۔ بس تمہارے آنے کی کسر ہے۔ ضد چھوڑ دو" وہ دوبارہ تبدیل ہو کر برازیل کے سفارت خانے جانے والے تھے اور برابر لکھا کرتے۔ آجاؤ۔ آجاؤ۔ آجاؤ

نوبت یہ آئی کہ اب کمال نے ان کے خط کھولنے بھی چھوڑ دیئے۔ چند روز بعد اسے بارہ بنکی کے کالج میں لیکچررشپ مل گئی مگر چونکہ بھیا صاحب پاکستانی تھے اور "گلفشاں" اور موروثی جائداد میں ان کا بھی حصہ تھا لہٰذا کسٹوڈین کا قضیہ شروع ہو گیا۔ نواب صاحب نے عدالت میں کسٹوڈین کے فیصلے کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ اب دن بھر کمال اس چکر میں مارا مارا پھرتا۔ اس کے لہجے میں اب تلخی آ گئی تھی۔ وہ

بہت کم ہنستا تھا۔ اودھم مچانا وہ کب کا بھول چکا تھا۔

"بورژوا انقلابی تھے حضرت۔ جب اصلیت کا سامنا کرنا پڑا تو بیٹا چیں بول گئے ـــ" کافی ہاؤس میں کامریڈز نے کہا۔

حسینی اور ان کی بی بی بھیا صاحب کی دُلہن کے ساتھ کراچی جا چکے تھے۔ تدّیرا اور قمرن مدتیں گزریں، موٹر بکنے کے بعد مرزا پور واپس چلے گئے۔

ایک روز وہ حسبِ معمول دلّی میں لاج کے یہاں جمنا روڈ پر ٹھہرا تھا اور ایک درخواست لکھ کر میڈنز ہوٹل کے ڈاک خانے میں پوسٹ کرنے کے لیے جا رہا تھا کہ راستے میں اسے ٹامس الیکنز مل گیا جو جہاز پر اس کا ہم سفر رہ چکا تھا

"ہلو ـــ تم یہاں کہاں۔" کمال نے پوچھا۔

"میں سارے ملک کا چکر لگاتا پھر رہا ہوں ـــ جنوب بنگال اور آسام اور اڑیسہ۔ اب راجستھان کا قصد ہے۔"

"تم نے دلّی کی سیر کر لی؟"

"ابھی نہیں۔"

"تم نے ہمارا راشٹرپتی بھون دیکھا۔" کمال نے فخر سے کہا۔ "اور براڈکاسٹنگ ہاؤس اور نئی دلّی کی عمارات جو نئے ہندوستان کی سمبل ہیں اور پوسا انسٹیٹیوٹ ـــ اور راج گھاٹ ـــ اور ـــ اور ـــ" وہ دفعتاً پرانا کمال بن گیا۔ فکرِ معاش سے آزاد۔ ہندوستان کا جوشیلا فرزند۔ وہ دلّی کی ایک ایک چیز ٹام کو دکھاتا پھرا۔ شام کو اس نے سپرو ہال میں کونسرٹ سنانے کا پروگرام بنایا۔

"آج کل تم کیا کر رہے ہو ـــ" الپس میں بیٹھ کر قہوہ پیتے ہوئے ٹام نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ نوکری ڈھونڈ رہا ہوں۔" اُس نے بے فکری سے جواب دیا۔

"بے روزگاری بڑا زبردست پروبلم ہے۔" تام نے کہا۔

"سب کے لئے ہے۔ اس میں میری کیا تخصیص ہے۔ جب خوشحالی آئے گی تو سارے ملک کے لئے آئے گی۔ یہ تھوڑا ہی دیکھتی پھرے گی کہ یہ ہندو کا دوار ہے یہ مسلمان کا۔ ہم سب اکٹھے ڈوبیں گے اکٹھے ابھریں گے۔"

"لیکن تم نواب زادے ہو۔ تم مزدوری نہیں کرو گے۔" گلشن نے کہا۔ جسے اُنھوں نے براڈکاسٹنگ ہاؤس سے ساتھ لے لیا تھا۔ "تم اپنے آپ کو ڈی کلاس نہیں کر سکتے۔"

"بالکل غلط ہے۔"

"اچھا تو آؤ میرے ساتھ چلاؤ ٹریکٹر۔"

"اگر میں نے ٹریکٹر چلانے کی ٹریننگ لی ہوتی تو ضرور چلاتا۔ مگر افسوس کہ میں آٹھ سال نیوکلر فزکس میں برباد کر کے آیا ہوں۔"

"سُنا ہے پاکستان میں بڑا قحط الرجال ہے۔ وہاں جاؤ۔ یہاں کیوں جھک مار رہے ہو۔" گلشن نے رائے دی۔

"تم بھی یہی کہتے ہو۔؟"

"بالکل۔"

رات کی ٹرین سے وہ لکھنؤ لوٹ رہا تھا۔ اسٹیشن پر اسے ہمراز بھائی ملے۔ وہ بھی لندن سے کراچی آچکے تھے اور اب اپنی والدہ سے ملنے فیض آباد جا رہے تھے۔

"کہو کمال میاں کیا حال ہے۔" انھوں نے پوچھا۔

"بہت اچھا حال ہے ہمراز بھائی۔"

"اچھا تو نہیں دکھتا مجھے۔ کیا قصہ ہے۔ ایں۔؟"

"کچھ بھی تو نہیں ہمراز بھائی۔" اُس نے جلدی سے ان کو آداب کیا اور آگے بڑھ گیا۔

آخر وہ دن بھی آن پہنچا۔ جب کمال نے دہلی جا کر ویزا کی درخواست دی۔ اس فیصلے پر پہنچنے سے پہلے اُس نے کئی راتیں جاگ کر گزاری تھیں۔ وہ دُنیا کی نظروں سے بچتا پھرا تھا۔ بھائیں بھائیں کرتی گلفشاں میں صرف سائے ڈولتے نظر آتے۔ دروازے بند ہوتے۔ ہوا سے خالی کمروں کے پردے پھٹپھٹاتے۔ اندر کی خواب گاہ سے بوڑھے نواب صاحب کے کھانسنے کی آواز آتی۔ امّی بیگم پچھلے برآمدے میں تخت پر بیٹھی وظیفے پر وظیفے کیے جاتیں۔ ہزاروں منتیں اُنھوں نے مان ڈالی۔ جناب عباسؓ کی درگاہ پر نذرانے چڑھائے۔ سبطین آباد کے امام باڑے میں جا کر جمعرات کی جمعرات جناب علی اکبرؓ کے نام کی مجلسیں کروائیں کہ یا مولا کمّن بھیا کام پر لگ جائیں۔ یا مولا کمّن بھیا کی مدد کر (بارہ بنکی کی لیکچرر شپ ختم ہو چکی تھی) وہ متواتر اپنے آپ سے مکالمہ جاری رکھتا۔ تم بزدل ہو۔ کمینے۔ ڈرپوک۔ تمھاری وہ ساری نیشنلسٹ ٹریننگ کہاں گئی۔ طلعت ٹھیک کہتی ہے۔ گھاس کھودو۔ ہل چلاؤ۔ لعنت ہو تم پر۔ موقع پرست بے ایمان ڈھلمل یقین کہیں کے۔ اب جامعہ ملیہ اور علی گڑھ یونیورسٹی دو جگہ کا اور آسرا رہ گیا تھا۔ مگر فی الحال وہاں بھی اس کے لائق کوئی جگہ خالی نہ تھی۔ اُس نے بہر حال طے کر رکھا تھا کہ بھوکا مر جائے گا مگر ترکِ وطن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تب ایک روز عدالت نے فیصلہ سُنا دیا۔ "گلفشاں" کمال کے بڑے ابا یعنی بڑے نواب صاحب مرحوم کے نام سے رجسٹرڈ تھی۔ عامر رضا ان کا اکلوتا وارث پاکستانی تھا۔ گلفشاں متروکہ جائداد قرار دے دی گئی۔ دوسرے روز صبح جب کمال کی آنکھ کھلی تو اُس نے خود کو لکھنؤ میں ریفیوجی پایا۔ تیسرے دن پولیس کے افسر کوٹھی میں تالے ڈالنے کے لیے آ گئے۔ چوتھے روز کمال رضا نے ویزا بنوایا اور اپنے بوڑھے والدین کو لے کر ٹرین میں بیٹھا۔ پانچویں دن ٹرین دلی پہنچی۔ چھٹے روز ٹرین نے بارڈر کراس کیا۔ ساتویں روز کمال رضا کراچی میں تھا۔

ساتواں روز یومِ سبت تھا اور انسان اپنا خون پی رہا تھا۔

۹۸

• کراچی — مملکت خداداد پاکستان، دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت اور دنیا کے پانچویں بڑے ملک کا دارالحکومت۔ جہاں کے سلمز اور پناہ گزینوں کے جھونپڑے عجائبات عالم میں شمار کیے جاتے ہیں۔ خصوصاً وہ غلیظ ترین بھیانک "جھگیاں" جو قائد اعظم کے مزار کے آس پاس پھیلی ہیں۔ اس شہر میں سفید فام غیر ملکیوں بالخصوص امریکنوں کی بہت بڑی نو آبادی ہے۔ ہاؤسنگ سوسائٹی میں بے انتہا خوبصورت کوٹھیاں بنی ہیں۔ جن کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان متوسط طبقے نے اپنی ساری تاریخ میں آج تک اس قدر زبردست خوشحالی حاصل نہیں کی تھی۔ یہاں نئے دولت مند متوسط طبقے کی حکومت ہے ان کا نیا سماج۔ ان کے نئے اصول۔ کراچی بے حد موڈرن شہر ہے۔ یہاں روزرات کو اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں اور کلبوں میں ایک جگمگاتی کائنات آباد ہوتی ہے۔ ماہرین عمرانیات کے لئے یہ مسئلہ انتہائی دلچسپی کا باعث ہونا چاہئے۔ کہ پچھلے نو سال میں کس طرح ایک نئے معاشرے نے اس ملک میں جنم لیا ہے۔ اس معاشرے کی بنیاد روپیہ ہے اور روپیہ بناؤ اور دولت حاصل کرو۔ آج بہتی گنگا میں ڈبکیاں

لگا لو۔ کل جانے گنگا خشک ہو جائے یا اپنا رُخ بدل لے۔ تیسرا عنصر شدید ترین فرسٹریشن کا احساس ہے۔ بلیک مارکیٹئے کو فرسٹریشن ہے کہ مزید بلیک مارکیٹ کیوں نہیں کر سکتا۔ بائیں بازو کا انٹلکچوئیل رونا ہے کہ اب انقلاب کی کوئی امید نہیں جماعت اسلامی والا چلا رہا ہے کہ مسلمان عورتیں بے پردہ گھوم رہی ہیں اور بال روم میں ناچتی ہیں۔ متوسط طبقے والے کی جان کو ہزاروں فکریں کھا رہی ہیں۔ سفارشوں کے بغیر نہ ملازمت ملتی ہے نہ بچوں کا اسکول اور کالج میں داخلہ ہو سکتا ہے نہ عہدوں میں ترقی ہوتی ہے۔ اُوپر سے بنگالی اور پنجابی مہاجر اور مقامی آبادی کی کش مکش اعصاب پر سوار ہے۔ یہ کش مکش اتنی ہی شدید ہے جتنی غیر منقسم ہندوستان میں ہندو مسلمان کی تھی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں آخری امید اب فوجی انقلاب میں باقی ہے۔

ایک جماعت مہاجرین کی کہلاتی ہے۔ یہ پاکستان کی عجیب ترین مخلوق ہے اور ہندوستان سے آئی ہے اور ملک کے ہر شہر، قصبے اور قریے میں پائی جاتی ہے۔ کراچی اس کا ہیڈ کوارٹرز ہے۔ اس جماعت کا خاص ریکٹ کلچر ہے۔

تقسیم کے بعد معلوم ہوا کہ اب ہندو کہتا ہے کہ جب تمہاری کلچر اور تمہارے نظریے علیحدہ ہیں تو جاؤ پاکستان۔ اب ہمارے سر پر کیوں سوار ہو۔ چنانچہ یہ قوم "مہاجر" بن کر پاکستان آئی۔ یہاں انکشاف ہوا کہ ہندو سے تو چھٹکارا ملا مگر ایک اور مصیبت کا سامنا درپیش تھا۔ لاہور میں پنجابی تھا۔ ڈھاکے میں بنگالی۔ دونوں جگہ مہاجرین کو بڑا فرسٹریشن ہوا۔ لہٰذا ہر مہاجر نے ادبار اکر کراچی کا رُخ کیا۔ اب کراچی گویا مہاجرین کا گڑھ ہے۔ بڑی تعجب خیز چیز یہ ہے کہ اتر پردیش کی اس آبادی نے کس خوش اسلوبی سے اپنے آپ کو ٹرانس پلانٹ کر لیا۔ اب یہاں جگہ جگہ ان کی "کولونیاں" قائم ہیں۔ یہاں آگرے والے رہتے ہیں۔ ادھر

رمپوریوں کا جتھا ہے۔ وہ حیدر آباد دکن کے جانبازوں کا محلہ ہے۔ اس طرف علی گڑھ والے، لکھنؤ والے، دلّی والے رہتے ہیں۔ بڑے بڑے چھوٹے چھوٹے مکان قرضہ لے کر بنائے گئے ہیں۔ یہ زیادہ تر ناظم آباد کا علاقہ ہے۔ لارنس روڈ الٰہی بخش کولونی، جہانگیر روڈ، مارٹن روڈ، کے سرکاری کوارٹروں میں ایک پوری دُنیا آباد ہے۔ یہ خالص، ٹھوس، مسلمان متوسط اور نچلے متوسط طبقے کی دُنیا ہے اور مہاجرین کی سماجی زندگی گویا ریڑھ کی ہڈی۔ ان کی لڑکیاں برقعے پہن کر بسوں میں بیٹھ کر اسکول اور کالج اور یونیورسٹی جاتی ہیں۔ بندر روڈ پر خریداری کرتی ہیں۔ ریڈیو پر عورتوں کے پروگرام میں حصّہ لیتی ہیں۔ ویمنز نیشنل گارڈ میں پریڈ کرتی ہیں۔ یہ طبقہ اب کراچی میں اس طرح رہتا ہے گویا صدیوں سے یہیں رہتا آیا ہے۔ یہ لوگ جنگ اور انجام اور ڈان پڑھتے ہیں۔ کشمیر حاصل کرنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ سال میں ایک مرتبہ ویزا بنوا کر خاندان کے بچے کھچے افراد سے ملنے ہندوستان جاتے رہتے ہیں۔ جس کو اب تک یہ "گھر" کہتے ہیں۔ یعنی گھر در اصل سندیلہ یا مُراد آباد ہے۔ مُلک پاکستان ہے۔

انسانیت کا وہ حصّہ جو برِ صغیر ہند و پاکستان کی مسلمان قوم کہلاتا ہے اس کی نفسیات سمجھنا کوئی آسان بات نہیں!

دُوسرا طبقہ اعلیٰ طبقہ کہلاتا ہے۔ پچھلے نو سال میں بے حد مستحکم ہو چکا ہے۔ اور محتاجِ تعارف نہیں۔ اس طبقے کی زندگی اس قدر الف لیلوی ہے کہ اب "قصہ سوتے جاگتے کا" اس کے مقابلے میں بالکل ہیچ سمجھو۔ یہ جو صاحب بالکل گمنام اور رہما شما قسم کے آدمی تھے۔ آج وہ مرکزی وزیر ہیں یا کروڑپتی یا بہت مشہور لیڈر۔ پورے ملک کی قسمت کا فیصلہ ان کے ہاتھوں میں ہے۔ نہایت ادق بین الاقوامی سیاسی مسائل پر اس فراٹے سے اخباروں میں بیان دیتے ہیں کہ طبیعت صاف ہو جاتی ہے۔ انتہائی معمولی قابلیت کے حضرات اقوامِ متحدہ اور دوسرے بڑے بڑے

عالمگیر اداروں میں ملک کی نمائندگی فرماتے ہیں اور ہاؤ لرز کرتے ہیں مگر کوئی برا نہیں مانتا۔

ان گنت خواتین و حضرات اندھوں میں کانے راجہ بنے بیٹھے ہیں۔

اور خواتین! پاکستان کی بیگمات بھی دنیا کی عجائبات سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی ساریاں۔ ان کے زیورات۔ ان کے ڈنر اور پارٹیاں۔ بیرونی ممالک میں ان کے سفر۔ ان کی زندگی کا عکاس اور گویا ان کا اوفیشل آرگن ماہنامہ مرر ہے جس میں ان کی دعوتوں کی تصویریں چھپتی ہیں۔ تب اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان دراصل کس قدر ترقی یافتہ اور دولت مند ملک ہے جس کی آدھی آبادی صرف ڈنر اور ایٹ ہوم کھاتی ہے اور سیمبا ناچتی ہے۔

ہندوستان ——————————————
پوری کوشش کر کے یہ ثابت کرنے میں مصروف ہے کہ تقسیم غلط تھی اور ملک دراصل ایک ہے اور اس کی تہذیب ناقابل تقسیم۔ پاکستان ——————
یہ ثابت کرتا ہے۔ تقسیم بالکل جائز اور صحیح تھی اور یہاں کی کلچر بے حد مختلف ہے اور اسی علیحدہ قومیت کی بنیاد پر یہ ملک حاصل کیا گیا ہے۔

—————— ادھر ہندوستان کہتا ہے کہ سارے مشرق کی تہذیب کا منبع اس کی کلچر ہے۔ اُدھر گپتا پیریڈ پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ ادھر خلافت راشدہ اور عباسیوں اور مغلوں کے زمانے کے راگ الاپے جاتے ہیں۔ ان دونوں ممالک کا پروپگنڈہ غرضیکہ بڑے زوروں میں چالو ہے اور اس چاند ماری کا نشانہ مغربی ممالک

ایک اور عجیب و غریب چیز یہ ہے کہ ملک کے حالات سے لوگ حد سے زیادہ نالاں ہیں۔ اقتصادی مشکلات۔ گرانی۔ رشوت ستانی۔ اقربا پروری۔ بے ایمانی۔ چار سو بیس۔ سیاسی غنڈہ گردی۔ وغیرہ وغیرہ کا روزانہ بلاناغہ اخباروں کے اڈیٹوریل میں ہوتا ہے۔ لوگوں کے پاس بھی سوائے اس کے اور کوئی موضوع نہیں۔

مگر اس کے باوجود کوئی ان حالات کا مداوا کرنے کے لئے کچھ نہیں کرتا۔ لوگوں کو معلوم ہے کہ پنسلین اور دواؤں کی بلیک مارکیٹ ہوتی ہے۔ ان کو پتہ ہے کہ ناممکن سے ناممکن کام ذاتی رسوخ یا سفارش کے ذریعے چٹکی بجاتے میں پورا کر لیا جاتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ شروع سے آخر تک اوپر سے نیچے تک بے ایمانی کا دور دورہ ہے۔ مگر اس کے لئے کوئی کچھ بھی تو نہیں کرتا۔ عوام جانتے ہیں کہ ان کے لیڈر کتنے پانی میں ہیں۔ لیکن لیڈروں کو بھی چند ایسے گُر یاد ہیں جن کے ذریعے عوام کو قابو میں رکھا جا سکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ تاریخ میں اتنے بڑے پیمانے پر مسلمانوں نے اتنے گرے ہوئے کردار کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ بار بار میں نے اپنے نئے دوستوں سے (جن کا تعارف میں تم سے آگے چل کر کروں گا) پوچھا کہ جب مسلمان کو آزادی اور اقتدار ملا تو اس نے من حیث قوم اتنے گھٹیا پن کا مظاہرہ کیوں کیا۔ مجھے بتلایا گیا کہ شروع کے دو تین سالوں میں جس قدر جوش و خروش یہاں طاری تھا۔ اب اس سے دوگنی مایوسی کی عملداری ہے۔ اب تو لوگ کہتے ہیں کہ یار ہمیں بیرونی ممالک میں خود کو پاکستانی کہتے شرم آتی ہے۔ یہی احساس کمتری زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتا ہے۔

کراچی میں شام کو لوگوں کو کوئی کام نہیں سوائے پارٹیوں میں جانے یا سینما دیکھنے کے۔ نہ یہاں تھیٹر ہیں نہ کانسرٹ۔ نہ سیمنار۔ نہ دوسری تہذیبی سرگرمیاں ——— ——— تھوڑی بہت دلچسپی غیر ملکی سفارت خانوں کے دم قدم سے قائم ہے۔ کسی روز برٹش کونسل نے اسٹیج پر ایک لیکچر کروا دیا یا تصویروں کی نمائش منعقد

کر لی گئی۔ کسی روز امریکن اطلاعات کے دفتر میں کوئی پروگرام ہو گیا۔ کبھی ایران یا انڈونیشیا یا فرانس والوں نے کوئی تقریب کر لی۔ کبھی جرمن سفارت خانے میں فلم شو منعقد کر لیا۔

ویسے بس پارٹیوں کا بڑا زور ہے۔ جن میں خم پہ خم لنڈھائے جاتے ہیں۔ پارٹیوں کے ذریعے لوگ اپنا اپنا مستقبل بناتے ہیں۔ موٹروں کا لین دین ہوتا ہے۔ اعلیٰ عہدے حاصل کرنے کی ریس لڑائی جاتی ہے۔ مکانوں اور زمینوں کے الاٹمنٹ کا کاروبار ہوتا ہے۔

یہاں مجموعی طور پر جنگل کا قانون نافذ ہے

اعلیٰ طبقہ جو بڑے بڑے تاجروں، لیڈروں، اعلیٰ ——— حکام پر مشتمل ہے اس کی علیحدہ برادری ہے۔ اتوار یہ لوگ سمندر کے کنارے گزارتے ہیں چھٹیاں لے کر یورپ اور امریکہ جاتے ہیں۔ ان کی اولاد بھی مغربی ممالک میں پڑھ رہی ہے۔ انھوں نے لاکھوں روپیہ سوئٹزرلینڈ کے بنکوں میں جمع کر لیا ہے۔ بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ یہ لوگ جو بات بات پہ دوسروں کو غدّار اور وطن فروش کے نام سے نوازتے ہیں اور حبِّ وطن کا سارا ٹھیکہ انھوں نے خود لے رکھا ہے، یہی سب لوگ خود انگلستان یا کینیڈا میں سکونت اختیار کرنے کے پروگرام بنا رہے ہیں۔

مسلمان قوم کی تاریخ کا یہ ہولناک ترین دور ہے۔

پاکستانی انٹلکچوئیلز کو دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے۔ ان ذہین لوگوں کا وقت کس بھیانک خلا میں برباد ہو رہا ہے۔ ان کے سامنے کوئی پروگرام نہیں ہے۔ کوئی راستہ۔ کوئی مقاصد۔ یہ سب بھی جنگل کے قانون میں گرفتار ہیں۔ محض تلخی اور بیزاری اور مایوسی ان کا فلسفہ ہے۔ میں ان کا مقابلہ اپنے ساتھیوں سے کرتا ہوں۔ جو ان ہی کی نسل کے نوجوان ہیں اور پچھلے نو سال میں بالکل مختلف راہوں پر چلتے ہوئے ارتقاء کی منزلوں میں کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں۔ اکثر میرے نئے دوست مجھ سے پوچھتے ہیں اور ملکوں ہر مہینے اہم، ٹھوس موضوعات پر کتنی ان گنت کتابیں چھپتی ہیں۔ مختلف شعبوں میں کس قدر زبردست ریسرچ اختیار کی جا رہی ہے۔

کیسے کیسے رسالے نکل رہے ہیں۔ کیا کچھ سوچا اور لکھا جا رہا ہے۔ حکومت فنونِ لطیفہ اور ادب اور علم کی کتنی سرپرستی کر رہی ہے۔ ان میں سے ایک افسر مجھ سے کہتا ہے۔ "یار! قسم خدا کی، باہر کے اخبار پڑھنے کو دل نہیں چاہتا۔ بڑا فرسٹریشن ہوتا ہے۔"

فرسٹریشن — یہ لفظ یہاں کی ساری ذہنی زندگی کا سمبل ہے۔

دوسرا لفظ "ریکٹ" ہے۔ سیاست۔ ادب۔ کلچر۔ مذہب۔ ہر چیز کا نہایت اعلیٰ پیمانے پر ریکٹ چلایا جا رہا ہے۔ میرے ذہن پرست دوست جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو بڑے بے نیاز انداز میں سوال کرتے ہیں۔ "کہو بھئی آج کل کون سا ریکٹ چلا رہے ہو۔"

جب میں ان لوگوں کو اپنی عمر کا بہترین حصہ اس خلا میں ضائع کرتے دیکھتا ہوں تو مجھے کس قدر صدمہ ہوتا ہے۔ صبح ہوتی ہے۔ یہ لوگ اپنے اپنے کام پہ نکلتے ہیں دوپہر کو ایک نیم تاریک اور غیر دلچسپ کافی ہاؤس میں جمع ہو کر کھانا کھاتے ہیں اور شام کو جا کر کوئی انگریزی فلم دیکھ لیتے ہیں۔ مینگل کے منگل کسی ایک کے یہاں جمع ہو کر پھر وہی باتیں شروع کر دیتے ہیں۔ ان سب کو اپنے اپنے ضمیر کا بڑا احساس ہے مگر زندہ بہرحال رہنا ہے۔ روزی بہرحال کمانا ہے۔ اگر بھوکوں ہی مرنا ہوتا تو ہندوستان سے ادھر کیوں آتے (ان میں سے اکثر حضرات "مہاجر" ہیں) جرنلسٹ ایمانداری سے رپورٹنگ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اپنے اپنے اخباروں سے نکال باہر کیے جائیں گے ادیبوں کے پاس لکھنے کے لئے کچھ باقی نہیں رہا (گو بے شمار رسالے نکل رہے ہیں)

ترقی پسندی آؤٹ آف فیشن ہو چکی۔ حتیٰ کہ ادب میں جمود کا نعرہ بھی پرانا ہو گیا

اسلام — اس لفظ کی جو گت بنی ہے (کرکٹ میچ میں پاکستانی ٹیم ہارنے لگے تو سمجھو اسلام خطرے میں ہے) دنیا کے ہر مسئلے کی تان آخر میں آ کر اسی لفظ پر ٹوٹتی ہے۔ دوسرے مسلمان ملک اس بات پہ خوب چڑتے ہیں۔ ساری دنیا کی طرف سے اسلام کا ٹھیکہ اس وقت ان لوگوں نے لے رکھا ہے۔ ہر چیز پر تنگ نظری کا غلاف

چڑھا ہوا ہے۔ موسیقی آرٹ، تہذیب، علم و ادب، سب کو "مُلّا" کے نقطۂ نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ اسلام جو ایک چڑھتے ہوئے دریا کی طرح ان گنت معاون ندی نالوں کو اپنے دھارے میں سمیٹ کر ایک عظیم الشان آبشار کی صورت میں رواں ہوا تھا اب وہ سمٹ سمٹا کر ایک مٹیالے نالے میں تبدیل کیا جا رہا ہے نالہ ایک وسیع، بہیڑ میں بہہ رہا ہے۔ جس میں چاروں طرف سے بند باندھے جا رہے ہیں۔

لطیفہ یہ ہے کہ اسلام کا نعرہ لگانے والوں کو فلسفۂ مذہب سے قطعی کوئی سروکار نہیں ہے۔ ان کو صرف اتنا معلوم ہے کہ مسلمانوں نے آٹھ سو سال عیسائی اسپین پر حکومت کی۔ ایک ہزار سال ہندو بھارت پر۔ عثمانیوں نے صدیوں تک مشرقی یوروپ کو تابع رکھا۔ امپیریلزم کے علاوہ اسلام کی جو عظیم انسان پرستی کی روایات ہیں ان کا تذکرہ نہیں کیا جاتا۔ عرب حکماء، ایرانی شعرا اور ہندوستانی صوفیائے کرام کی وسیع القلبی کا چرچا کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ علیؑ اور حسینؑ کے فلسفے سے کوئی غرض نہیں۔ اسلام کو ایک نہایت جارحانہ مذہب اور طرزِ زندگی بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔

علاوہ ازیں اپنے ملکی اور اشد اہمیت کے مسائل نظر انداز کر کے کلچر کو غیر ملکیوں کے سامنے پیش کرنے کا رجحان بھی زوروں پر ہے۔ یعنی یہ کہ شاید ہماری یہ کتاب انگلستان یا امریکہ سے چھپ جائے۔ کوئی امریکن فلم کمپنی ہمیں اپنے مُووی میں لے۔ ہم کسی بین الاقوامی کانفرنس میں بھیج دئے جائیں۔

انگریزی جرنلزم کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ مسلمانوں کے پاس پہلے ہی کون سے اخبار تھے اور کون سی ان کو صحافت کی ٹریننگ ملی تھی اور ۴۷ء کے بعد سے اب تک جو کھیپ یونیورسٹیوں سے باہر نکلی اس میں اچھے لکھنے والے منوا رہنے چاہئیں تھے ——— ان گنت خواتین و حضرات یوروپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں سے

ڈگریاں لے کر لوٹے ہیں۔ ہمارے زمانے میں کوئی اکّا دکّا خوش نصیب ہی اعلیٰ تعلیم کے لیے سمندر پار جاتا تھا۔ جانے آج کل لوگوں کو ڈگریاں اور ڈاکٹریٹ کیسے مل جاتے ہیں اور یہ لوگ پڑھ لکھ کر کہاں لاد دیتے ہیں۔ یہ اسرار آج تک میری سمجھ میں نہ آیا۔

مگر خوشی کی بات یہ ہے کہ پاکستانی لڑکیاں بڑی تعداد میں تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ (کم از کم شہروں میں۔ کیونکہ متوسط طبقہ موڈرن ہو چکا ہے) ان گنت لڑکیاں ڈاکٹر، نرس اور لیکچرر بن رہی ہیں۔ ملازمتیں کر رہی ہیں۔ لڑکیوں کی ملازمت کو اب معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ مجموعی طور پر پاکستانی خواتین نے فی الواقعہ بہت ترقی کی ہے۔ اور یہ ایک بہت ہی اچھا شگون ہے۔

رات گزرتی جا رہی ہے۔ جو کچھ میرے ذہن میں آتا جا رہا ہے لکھتا جا رہا ہوں۔ اسی وجہ سے شاید تم کو خط بے ربط معلوم ہوگا۔ مگر اتنی بہت سی باتیں تم سے کرنا ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ تم میری آنکھوں سے میرے نئے ملک کو دیکھ لو۔ میری ہمت بڑھاؤ تاکہ میں اس ملک کے لیے اپنے بھر بُرا بھلا کچھ کر سکوں۔

مغربی پاکستان کی سوسائٹی کا ڈھانچہ اب تک فیوڈل رہا ہے۔ لہٰذا یہاں سیاسی شعور کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عوام مڈل ایسٹ کے بادشاہوں کے جلوس دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں جہانگیر پارک میں جمع ہو کر وزیرِ اعظم کی تقریر سننے کے بعد زندہ باد اور مخالف پارٹی کے لیڈروں کی تقریروں کے بعد مردہ باد کے نعرے لگاتے ہنستے بولتے خوش خوش گھر لوٹتے ہیں۔ عام طور پر سرکاری اور غیر سرکاری جلسے جلوسوں کے لیے کرائے کے آدمی بلوائے جاتے ہیں نعرہ بازی کے بعد ان کو پیسے دے کر رخصت کیا جاتا ہے۔ سیاسی لیڈرشپ بڑے بڑے کاروباریوں اور سیٹھوں کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ اکبر اللہ اکبر۔

عوام کی نفسیات اور ہسٹیریا کی عجیب و غریب مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں۔

چند سال قبل پنڈت جی یہاں آئے تو عوام کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے پولس کورڈن توڑ دیے اور زندہ باد کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ پنڈت جی خود

ایک نمبر کے جذباتی آدمی۔ ان پر خوب رقت طاری ہوئی۔ خوش آمدید کے پھاٹک بنائے گئے۔ تقریبیں ہوئیں

یہی عوام وقتاً فوقتاً مخالفین کی ارتھی کے جلوس نکالتے ہیں اور اُن کے پُتلے سڑکوں پر جلاتے ہیں۔

اس کے علاوہ کرکٹ میچ بھی اس ہسٹریا کا ایک تاریخی واقعہ ہے۔ انڈیا پاکستان کا میچ ہوا تو چند روز کے لئے گمان ہوتا تھا۔ پنجاب تقسیم نہیں ہوا اور لاہور اور امرتسر حسب سابق ایک ہی صوبے کے دو شہر ہیں۔ ہزاروں سکھ اور ہندو جوق در جوق سائیکلوں پر بیٹھ کر لاہور آئے۔ لاہور کے حلوائیوں نے ان کو مفت مٹھائی کھلائی۔ تانگے والوں نے ان سے کرایہ نہیں لیا۔

قیامت کی چہل پہل رہی۔ آئیڈیلیسٹ قسم کے کالم نگاروں نے اخباروں میں عظمت انسان کے گُن گائے۔ بڑے دلخراش واقعات بھی ہوئے۔ ایک بوڑھا اندھا سکھ مشرقی پنجاب سے آیا اور اپنے سابق شہر کے گلی کوچوں کے درو دیوار چھوتا پھرا۔ اس نے کہا۔ مجھے میرے پُرانے مکان پے چلو جو کہیں شاہ عالمی وغیرہ میں تھا۔ لوگوں نے اسے وہاں تک پہنچایا اور وہ اپنے گھر کی دیواروں سے لپٹ لپٹ کر رویا۔

میں اس نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر میرا دماغ کام نہیں کرتا۔ اسٹریوٹائپ کے متعلق ہم نے سوسیولوجی میں بہت کچھ پڑھا ہے مگر جب اصلیت میں اس سے دوچار ہوتے ہیں تو عقل حیران رہ جاتی ہے۔

مہاجرین کا ایک اور مسئلہ ہے۔ یہاں ہنوز روزِ اوّل ہے۔ ۱۹۴۷ء کے ہندوستان میں جو حالت شرنارتھیوں کی تھی۔ وہ آج آٹھ سال گزرنے کے بعد مہاجرین کی ہے اور روز بروز ہولناک تر ہوتی جا رہی ہے۔

چونکہ میں ٹیکنیکل طور پر خود "مہاجر" ہوں لہٰذا اس پرابلم پر میں نے بہت غور کیا۔ دیکھو بیٹا۔ بات ساری یہ ہے کہ ہندوستان میں متوسط طبقے کے مسلمان کے قدم اکھڑ چکے ہیں۔ وہی اسٹریوٹائپ کا حوالہ یہاں پھر دینا پڑے گا۔ سیکیورٹی کی تلاش میں یہاں کے ناگفتہ بہ حالات جانتے ہوئے بھی ہندی مسلمان یہاں آجانا چاہتا ہے۔

جب مسلمان لڑکے یونیورسٹیوں سے نکلتے ہیں تو ہند کی دفاعی افواج میں اس لئے نہیں جاتے کہ ان کی وفاداریاں مشکوک ہیں۔ سارے خاندان بٹ چکے ہیں۔ ایک بھائی پاکستان آرمی میں ہے دوسرا نیوی میں۔ تیسرا آزاد کشمیر ریڈیو میں نوکر ہے۔ اس کا چوتھا بھائی جو ابھی پٹنہ میں بی ایس سی کر رہا ہے۔ انڈین ایر فورس میں درخواست بھیجنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔ لہٰذا وہ یہاں پہنچ کر جھٹ پائلٹ بن جاتا ہے۔ پٹنے میں شاید کلرک بھی نہ بن سکتا۔ دوسرا عنصر یہ ہے کہ اسے یہ خیال رہتا ہے کہ اگر وہ ملازمتوں کے کمپیٹیشن میں بیٹھا بھی تو ہندو سے جو زیادہ محنتی ہوتا ہے نہیں جیت سکے گا۔ اگر جیت بھی گیا تو تعصب کی وجہ سے اسے سلیکٹ نہیں کیا جائے گا۔ ہندوستان وطن نہیں ایک قسم کا عارضی پڑاؤ کا کیمپ ہے۔

علی گڑھ میں کہاوت ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی سڑک نئی دلی کے بجائے سیدھی کراچی جاتی ہے برطانوی دورِ حکومت میں مسلمانوں کی دوسری اقلیتوں کی مانند ملازمتوں میں نشستیں مخصوص تھیں۔ نامزدگی کا دستور تھا۔ اور ہندوستان میں ملازمتوں کے سلسلے میں مسلمانوں سے جو تعصب برتا جارہا ہے اندازہ مجھ سے بہتر کس کو ہوگا۔

مسلمان کے لاشعور میں ہجرت کا فسوں بسا ہوا ہے۔ پچھلی صدی میں ایشیا میں سیاسی بیداری کے پھیلتے ہی یہ قوم متضاد مخالف وفاداریوں کی کش مکش کا شکار ہوگئی۔ رہا ہند میں لیکن "مجھے مولا بلالے مدینہ مجھے" اس کا محبوب نغمہ تھا۔ پان اسلامزم کی تحریک نے اس تصور کو اور دلآویز بنایا۔ اور مسلمان کے یہاں نیشنلزم اور وطن پرستی کا تصور ہی بدل گیا۔ اب ہندوستانیت اور اسلام ہم معنی نہیں تھے کیونکہ اول الذکر میں ہندوازم بھی شامل تھی اور اس میں انگریزوں نے فرقہ پرست عناصر کے ذریعے الگ ہندویت کی تحریک چلا رکھی تھی۔ ایرانیت اور اسلام، عربیت اور اسلام میں کوئی تصادم

نہیں تھا جس طرح ہر فرانسیسی لامحالہ عیسائی بھی ہے۔ مگر ہندی مسلمان کو اس ملک میں اکثریت کی ایک بڑی رنگین تہذیب اور مضبوط معاشرے سے مقابلہ کرنا تھا۔ لہٰذا وہ اس ماحول میں شامل ہو کر بھی اس سے مدافعت کرتا رہا ــــــ مگر یہ مدافعت کب پیدا ہوئی؟ سارے غیر ملکی مبصرین کا جو مغلوں کے زوال کے وقت ہندوستان میں آئے اور جن کو اس وقت جدا کرو اور حکومت کرو کی پالیسی کا علم نہ تھا جو انیسویں صدی میں تیار کی گئی۔ یہ کہنا ہے کہ اس طوائف الملوکی کے باوجود ملک میں ہندو مسلم سوال کا وجود نہیں تھا۔ ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ سوال کس طرح پیدا ہوا۔ انیسویں صدی میں جب ملک کی اقتصادی تباہی کی وجہ سے یہ کھنچاؤ شدید تر ہو گیا۔ ہندو اکثریت کے ہاتھوں پٹ جانے کے خوف کی نفسیات کا تذکرہ پنڈت نہرو اور سردار پانیکر دونوں نے کیا ہے۔ یہ سوال تاریخ کا بہت بڑا "اگر" ہے کہ اس خوف کا تدارک کیا جاسکتا جو کہ کانگریس کر سکتی تھی تو آج حالات کیا ہوتے۔

خیر۔ تو ہندی مسلمانوں کا صیہون، حجاز تھا۔ یوروپین یہودیوں اور ہندی مسلمانوں کے علاوہ دنیا کی کسی اور قوم نے وفاداریوں کے اس تصادم کا سامنا نہیں کیا۔ دونوں نے اپنے اپنے علیحدہ ملک بنائے ہیں اور دونوں اب ان مزید مسائل سے دوچار ہو رہے ہیں۔

پاکستان میں جو نفسانفسی کا عالم اور حبِ وطن کی کمی نظر آتی ہے۔ اس کی یہی وجہ ہے کہ مسلمان کو اس سرزمین سے کوئی بے اختیار جذباتی اور روحانی لگاؤ نہیں۔ وہ موقع اور سیکیورٹی کی تلاش میں یہاں آئے ہیں۔ جس طرح یوروپین اقوام امریکہ پہنچی تھیں۔ نیویارک میں رہنے والا پولش بوڑھا وارسا کو یاد کر کے آہیں بھرتا ہے مگر پولینڈ کے اس دھندلے تصور سے اس کی اولاد کو کوئی غرض نہیں جو نئے ملک میں امریکن کی حیثیت سے پروان چڑھی ہے۔ اسی طرح یہاں پر جو لوگ گومتی کے خربوزوں اور پریاگ کے میلے اور ساون کی گھٹاؤں کو یاد کر کے روتے ہیں۔ ان کی اولاد جو یہاں بڑی ہو رہی ہے۔ اس کے لئے یہ سارے تصورات بے معنی اور مضحکہ خیز ہیں۔ یہ نسل خالص پاکستانی ہوگی اور اس طرح ان متضاد وفاداریوں کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔

زبان کا مسئلہ ہماری کتنی بڑی بدقسمتی رہی ہے۔ ہندوستان سے مڈل کلاس مسلمان کے قدم اکھڑنے کی دوسری وجہ سنسکرت آمیز ہندی زبان کا تسلط ہے۔ اپنی زبان کی تباہی کسی قوم کے لئے سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔ انسان اپنی دولت لٹتے دیکھ سکتا ہے مگر اپنی زبان اور تہذیب کی بیخ کنی برداشت نہیں کر سکتا۔ علاوہ ازیں ہندی مسلمان کو غیر شعوری اور شعوری طور پر اپنی مخصوص تہذیب کی برتری کا ناز بھی رہا ہے۔ چنانچہ یہ اُس کی دوسری بڑی زبردست نفسیاتی شکست ہے۔ مسلمان بچے اسکولوں میں ہندی پڑھ رہے ہیں (جبکہ ان کے باپوں کی نسل کے ہندو انہی اسکولوں میں اُردو پڑھتے تھے) یہ بچے اگر ہندوستان میں رہ گئے تو اس نئے تمدنی سانچے میں کھپ جائیں گے اور اسی میں ان کی عاقبت ہے۔ اگر وہ اسے بھی RESIST کرنا چاہتے ہیں تو لامحالہ ان کو ادھر آنا پڑے گا۔

زبان کا مسئلہ زیادہ تر شہروں کے مسلمانوں کے لئے ہے۔ کیونکہ پورب کے مسلمان کسانوں کی زبان وہی ہے جس میں ملک محمد جائسی نے پدماوت، کبیر داس نے اپنے دوہے اور تلسی داس نے رامائن لکھی تھی۔

دیہاتوں میں مسلمانوں کو ایک مختلف مذہبی فرقے کی بجائے محض ایک اور جات سمجھا جاتا رہا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اتر پردیش کا وہ مسلمان جو مسلمانوں کی مڈل کلاس سیاست اور تہذیب کا علمبردار تھا نہ ادھر کا رہا نہ ادھر کا۔ اس کی حالت قابلِ رحم ہے۔

اب میں پھر یہاں کے حالات کی طرف واپس آتا ہوں۔

کل میں بھیّا صاحب کے دفتر میں بیٹھا ان کا انتظار کر رہا تھا۔ وقت گزارنے کے لئے میں نے پبلسٹی کے لٹریچر کی ورق گردانی شروع کی اور بہت سی کتابیں گھر اُٹھا لایا۔ رات کو میں نے پچھلے برسوں کے وزرائے اعظم کی اہم ترین تقاریر نکال کر پڑھیں۔ طلعت! وعدوں کا ایک سمندر ہے کہ ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اسکیموں کا ایک ریلا ہے جو ۱۹۴۸ء سال سے اب تک بہتا چلا آ رہا ہے۔

مسلمان سیاست ہمیشہ سے مڈل کلاس، شہروں کی سیاست رہی ہے۔ لہٰذا دیہاتوں کی طرف کوئی بھولے سے بھی توجہ نہیں دیتا ـــــــ مسلمانوں کے پروگرام میں

تقسیم سے پہلے زرعی اصلاحات وغیرہ کا دور دور کہیں ذکر نہ تھا۔ وہی روایت اب بھی باقی ہے۔ زمینداری کے خاتمے کا فی الحال سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اسی طبقے کی حکومت ہے۔

آج جمعے کی رات ہے اور میں ایک انٹلکچوئیل محفل سے لوٹ کر آرہا ہوں۔ وہاں گھاس پر، قالینوں پر، صوفوں پر بیٹھے گروپ بنائے مغربی ادب اور عالمگیر سیاست کی موشگافیاں کرتے ہوئے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو دیکھ کر میں سوچا کیا کہ کاش تم ان سب کی باتیں سنتیں (اس محفل میں دیسی لڑکیاں صرف دو تین ہی ہوتی ہیں میں نے یہاں کی مسلمان لڑکیوں میں ان کی اعلیٰ تعلیم کے باوجود بنیادی سنجیدہ مسائل کے متعلق سوچنے کی طرف سے حیرت انگیز بے اعتنائی دیکھی)

اس محفل کے غیر ملکی اراکین بھی بہت دلچسپ ہیں۔ الفریڈ ایک انگریز لڑکا ہے۔ جو لندن اسٹیج پر رہ چکا ہے۔ جولین ایک اور انگریز لڑکا ہے۔ رومن کیتھولک انٹلکچوئیل اس کا ساتھی رونلڈ ہے یہ بھی آکسفرڈ سے آیا ہے۔

اس محفل میں دنیا جہان کے مسائل پر زور شور سے بحثیں ہوتی ہیں۔ دراصل یہ ایک قسم کا ہائیڈ پارک کورنر ہے جہاں لوگ باگ آکر اپنے اپنے دلوں کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔

آج شام وہاں ایک طرف کیتھولک عقیدے پر بحث ہو رہی تھی اور دوسری طرف مغرب کے حقیقت پسند ادیبوں پر تبرا بھیجا جا رہا تھا۔ ایک فرانسیسی پر الجیریا کے سلسلے میں لعنت ملامت ہو رہی تھی۔ امریکن امداد کے بارے میں میری رچرڈز کی لوگ جان کھا رہے تھے

میں دوسری طرف مڑا۔ قالین کے ایک سرے پر اُجلا کا گروپ فرانسیسی انٹلکچوئیل سے الجھ رہا تھا۔ کانگریس آف کلچرل فریڈم کا تذکرہ تھا۔

"فرانس کی موجودہ دگرگوں حالت سے مغربی دانشوروں کی حالت غیر ہے۔ فرانس جو یوروپ کی کلچر اور ذہن کا سمبل تھا۔ اس کے موجودہ رویے نے مغربی انٹلکچوئیلز کو ہڑبڑا دیا ہے مغرب کا اب واقعی زوال ہو گیا ہے۔ اب اس کے پاس اپنے جواز میں کوئی دلیل نہیں۔" تنویر گرج رہا تھا۔ "اب اگر کل کو سارتر دوبارہ تائب ہو جائے تو میں متعجب نہ ہوں گا۔ مغربی تہذیب کے علمبرداروں کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ہے۔"

"برطانوی دانشوروں کی کیا مضحکہ خیز حالت ہے۔ امریکہ سے روپیہ کھاتے ہیں —— "

دیمین دوسری طرف گوہر افشانی کرنے میں مصروف تھا۔ میں ٹہلتا ہوا جا کر امریکنوں کے پاس بیٹھ گیا۔

"میری۔ ذرا امریکن ایڈ دینا" رونلڈ نے سگریٹ لینے کے لئے میری رچرڈز کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنسی۔ بڑی خوش اخلاق لڑکی ہے۔

دوسرے گروپ میں چند بین الاقوامی شہرت کے مورخ بیٹھے تھے جو چند روز کے لئے کراچی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

"اگر امریکہ خانہ جنگی کے بعد دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہوتا تو ہم لوگوں کا آج تک جانے کیا حشر ہوا ہوتا" امریکن مورخ نے کہا۔ "تم اپنی وہ بھبوری رٹ دہرانا کہ "تقسیم" کی وجہ اقتصادی تھی" اس نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ "اس کے علاوہ اور کیا تھا میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں تو یہ جاننا چاہتی ہوں کہ مشرق کے ڈاؤن فال کی اصل وجہ کیا ہے۔" فرنی نے کہا۔ "میں نے ٹوئنبی سے بھی یہ پوچھا وہ حیران ہیں۔ ہندوستان کا اٹھارھویں صدی میں کیوں زوال ہوا۔"

"ہندوستان کی نہری آبپاشی کا انتظام ناقص تھا" جیکب موریسن نے کہا۔ "یہ مسئلہ خالص زرعی ہے۔"

اب رونلڈ اور دیمین اور میری رچرڈز ایک اور بحث کر رہے تھے۔

"مشرق کے ڈاؤن فال کی وجہ اسلام ہے۔"

"ایں۔؟"

"ریفرمیشن کے بعد عیسائی یورپ نے انتقاد کی اسپرٹ پیدا کی۔ وہ اسلام میں آج تک موجود نہیں۔ تم اعلانیہ اپنے مذہب پر اعتراض کر سکتی ہو۔؟ تمہارا جینا دوبھر کر دیا جائے گا۔"

"واہ اسلام میں بھی بدعتی اور باغی پیدا ہوتے رہے ہیں۔" فرنی نے کہا

"ہاں۔ مگر اپنے رسول یا خدا کے تصور۔ یا قرآن، کسی چیز پر بھی تنقید کر سکتی ہو؟

عیسائیوں کے یہاں ان گنت چرچ ہیں اور ملحدوں کی فوج کی فوج موجود ہے عیسائی

بڑے اطمینان سے تثلیث اور ورجن میری کے تصور کا مذاق اڑاتے ہیں کوئی پرواہ نہیں کرتا
۔ مسلمان سائنٹیفک طریقے سے سوچنے کا اہل نہیں ۔"

"جبھی ٹوئنبی نے کہا ہے کہ انڈک سوسائٹی اسلامک سوسائٹی کے مقابلے میں زیادہ
رواداد ہے ۔"

"بدھ ازم اور ۔۔"

ڈیڑھ بجے کے قریب ہم لوگ وہاں سے اُٹھے ۔ ایر پورٹ جا کر قہوہ پیا ۔ جب میں
واپس گھر پہنچا ۔ اس وقت میں تھک کر چور چور ہو چکا تھا ۔

سامنے ٹام کی کوٹھی ہے ۔ اس میں روشنیاں بجھ گئی ہیں ۔ ٹام بھی کسی پارٹی سے لوٹ کے
سونے جا چکا ہے ۔ یہ لڑکا میرے ہمراہ جہاز پر بمبئی آیا تھا ۔ پیشے کے لحاظ سے اخبار نویس
ہے ۔ کچھ عرصے ہندوستان میں گھومتا پھرا ۔۔۔۔۔۔۔ اب محکمہ فشریز یعنی مچھلیوں
کا ایڈوائزر ہو کر یہاں آگیا ہے ۔ فشریز کے علاوہ براڈ کاسٹنگ کو بھی ایڈوائز کرتا ہے ۔

ایڈوائزرز کی ہر طرف ریل پیل ہے ۔ ہر محکمے میں ان گنت ایڈوائزر منسلک
ہیں جو جانے کیا جادو سکھاتے ہیں ۔ مگر اب تک کوئی خاص ترقی کہیں نظر نہیں آئی ۔

چہار سو اسکنڈلز کا بازار گرم ہے ۔ رشوت کے اسکنڈل ۔ دھاندلی اور سیاسی غنڈہ گردی
کے اسکنڈل ۔

آج کا سب سے بڑا واقعہ ، طلعت میری چہیتی بہن ، یہ ہے کہ میں لکھنؤ کا انقلابی ،
کانگریس کا سرگرم کارکن ، متحدہ ہندوستان کی عظمت کا جو شیلا نقیب ، آج صبح میں بارہ سو
روپے ماہوار کے ایک عہدے پر لے لیا گیا ۔ ایک پوری لیبارٹری مجھے سٹ اپ کرنا
ہے ۔ اس کے لئے ساز و سامان خریدنے میں شاید جلد امریکہ بھیج دیا جاؤں ۔ فی الحال اسی
کام کے سلسلے میں اگلے ہفتے مشرقی پاکستان جا رہا ہوں ۔ اگلا خط تم کو ڈھاکے سے
لکھوں گا ۔

اب صبح ہو رہی ہے ۔ ساری رات میں نے تم کو خط لکھنے میں گزار دی ۔ عد ہے ۔ میں
نے جانے کتنے صفحے سیاہ کر ڈالے ہوں گے ۔ ابھی میں نے دریچوں کے پردے ہٹائے اور

باہر جھانکا۔ کراچی جاگ اٹھا ہے۔ کراچی اپنے کام پر جا رہا ہے۔ سینکڑوں ہزاروں انسان سائیکلوں، چھکڑا ایسی بسوں، سائیکل رکشاؤں پر سوار کلرک خانوں اور دفتروں کی طرف رواں ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں بٹیا جن کو عرفِ عام میں جنتا کہا جاتا ہے — طلعت! ان لوگوں نے تو کوئی قصور نہیں کیا۔ کوئی جرم، ان کو تعلیم نہیں دی گئی۔ ان کو بھوکا رکھا گیا۔ ان کو جس لاٹھی سے ہانک دو ہنکائے جائیں گے۔ یہ سب امن سے زندہ رہنے، پیٹ بھر روٹی کھانے آرام سے سونے کے مستحق ہیں۔ طلعت جس وقت صبح سویرے ہزاروں انسانوں کا ریلا پی آئی ڈی سی کے نئے ڈاک یارڈز کی طرف بڑھتا ہے۔ اس وقت قسم خدا کی وہ نظارہ دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ مجھے پاکستان کے مستقبل سے امیدیں سی بندھ جاتی ہیں۔ یہ بڑے معصوم بے ضرر انسان ہیں۔ یہ لوگ جو اس جدید، بے ہودہ، بدشکل بوم ٹاؤن کی پندرہ لاکھ آبادی ہیں۔ یہ مکرانی اونٹ گاڑی والے، رنگ برنگے لہنگے پہنے راجستھانی اور کاٹھیاواڑی مزدورنیں، سعد آباد کولونی میں رہنے والے بنارس کے جولاہے (جن کے پرکھ کبیر کے ساتھ پنچ گنگا گھاٹ پر دوتارہ بجاتے پھرتے ہوں گے) لالو کھیت اور لیاری کی لرزہ خیز مہاجر بستیوں کے باسی، مغربی یو۔ پی کے کاریگر۔ دلی کے بساطی۔ بمبئی کے ٹیکسی ڈرائیور۔ اور چائے خانے والے۔ فٹ پاتھ پر دوکانیں رکھنے والے چھوٹے چھوٹے کاروباری۔ انجام کولونی اور آگرہ تاج کولونی کے باشندے جو ہاکس بے کے راستے پر ہندوؤں کے سابقہ شمشان گھاٹ کی دلدل میں جھونپڑے ڈالے پڑے ہیں اور اپنی جھگیوں پر چاؤ سے چاند تارے کا جھنڈا لہراتے ہیں

ہر سال بارش آتی ہے تو ان کی جھونپڑیاں بہہ جاتی ہیں۔ اپوا کی بیگمات آ کر امریکن دودھ کے ڈبے اور کمبل ان کو تقسیم کرتی ہیں اور ان کی جھونپڑیاں اگلی برسات تک کے لئے پھر آباد ہو جاتی ہیں۔ رات میری رچرڈز مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ بحیثیت سوشیولوجسٹ میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ اس قدر ناقابلِ یقین تکالیف کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے باوجود کراچی کی یہ مخلوق اس قدر آرام پسند کس طرح ہے۔ یہ انقلاب کیوں نہیں برپا کرتی۔ تشدد پہ کیوں نہیں اتر آتی۔ کمال ہے کہ اس کا جواب میری رچرڈز کو بھی معلوم نہیں۔ مجھے بڑی ناامیدی ہوئی۔

نہیں طلعت! یہ بڑے پیارے لوگ ہیں۔ ان سے اس لئے متنفر نہ ہو کہ انھوں نے

بلہ کر کے تمہاری دنیا تقسیم کروا دی — یہ بڑے معصوم انسان ہیں۔ ان کو ان مباحث، ان تاریخ کی ان موشگافیوں اور بحث بازیوں سے کوئی غرض نہیں جو کل رات میں نے اس محفل میں سنیں۔ جو کچھ رونلڈ کہہ رہا تھا جو کچھ تنویر کہہ رہا تھا۔ میری، رچرڈ کہہ رہی تھی۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ سندھ انڈسٹریل اسٹیٹ میں کارخانے کھل گئے ہیں اور ان کی مشینیں یہ انسان چلا رہے ہیں اور جس ملک میں وہ رہ رہے ہیں اس کا نام پاکستان ہے۔ طلب ماضی پر رونے اور ماضی کی غلطیوں پر پچھتانا مضحکہ خیز ہے۔ کیونکہ مستقبل ابھی باقی ہے۔ یہ سوچنا حماقت ہے کہ دونوں ملک پھر متحد ہو جائیں گے۔ دنیا کا نقشہ ہر جنگِ عظیم کے بعد بدلتا ہے۔ ۱۹۴۵ء کے بعد بھی بدل گیا۔ جب میں ماضی کے متعلق سوچتا ہوں میرا دل کٹتا ہے مگر دل کہاں تک کٹے گا۔ زندگی آدھی گذر گئی۔ تھوڑی سی باقی ہے۔ اب بھی موقع ہے کہ ہم اس بچے کھچے وقت کو سوارت کر لیں۔

اس ملک نے مجھے اپنی حفاظت میں لیا ہے۔ مجھے پناہ دی ہے۔ اس کو بنانا یا بگاڑنا اب میرے ہاتھ میں ہے۔ میں نے جو عمر بھر تخریب کے بجائے تعمیر کے خواب دیکھے ہیں۔ کیا تمہارا خیال ہے یہاں کے ذہنی پستیوں کے خلا میں داخل ہو کر میں اپنے آپ کو کھو دوں گا؟ نہیں طلعت میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔۔

میں تعمیر کروں گا۔

پی۔ ایس:۔

تعمیر پر یاد آیا کہ بھیا صاحب کی کوٹھی جس میں میں مقیم ہوں بے حد شاندار ہے۔ ایک اطالوی آرکیٹیکٹ نے بنائی ہے۔ خالص جدید ترین کیلی فورنین وضع کی بھیا صاحب کی دلہن خاصی بدذات ہیں۔ میں سوچ سوچ کر محظوظ ہو رہا ہوں کہ تم ان کو کس قدر ناپسند کروگی۔ وہ اپوا کی بڑی سرگرم کارکن ہیں اور کراچی کی مشہور میزبان خواتین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ دلہن بھابھی میری آبادکاری کے لئے بے حد کوشاں ہیں۔ ابھی انھوں نے میرے لیے ایک ہزار گز زمین خریدوائی اور اپنے ایک بااثر چچا کے ذریعے مکان کی تعمیر کی غرض سے پچاس ہزار روپیہ قرضہ دلوا دیا۔ کل جب ان کا اطالوی آرکیٹیکٹ مکان کا نقشہ

لے کر میرے پاس آیا تو میرا دل چاہا دھاڑیں مار مار کر روؤں۔

دُولہن بھابھی کی چھوٹی بہن نینی تال کانونٹ میں پڑھ رہی ہے۔ عنقریب بھیّا صاحب اور دولہن بھابھی برازیل جانے والے ہیں۔ کوٹھی غیر ملکیوں کو پندرہ سو روپے ماہوار کرایے پر اُٹھا دی جائے گی۔ بابا اور امّی اس کاٹج میں رہیں گے جو بھیّا صاحب نے احاطے میں بنوائی ہے بابا سارا دن اخبار پڑھنے میں گزارتے ہیں۔ امّی کسی سے ملتی جلتی نہیں حالانکہ کراچی میں لکھنؤ کے بہت سے خاندان براج رہے ہیں۔ بابا اور امّی کی حالت دیکھ کر میرا کلیجہ غم سے پھٹتا ہے۔

اب میں پھر جذباتی ہو رہا ہوں۔ لہٰذا خدا حافظ۔

تمہارا
کمل

مزید پی۔ ایس :۔

پچھلے ہفتے گورنمنٹ ہاؤس کے ایک ڈنر میں روشن آراء سے ملاقات ہوئی تھی۔ خاصی موٹی ہو گئی ہے۔ اس کے شوہر کو میں نے نہیں دیکھا۔ وہ کسی مشن پر امریکہ گیا ہوا ہے۔ روشن سے معلوم ہوا کہ تمہاری ساجدہ آپا بھی آج کل امریکہ میں ہیں۔ روشن نے تم لوگوں میں سے کسی کی بھی خیریت نہیں پوچھی۔ مجھ سے دو چار رسمی باتیں کرنے کے بعد دوسرے گروہ میں شامل ہو گئی۔

۹۹

ازمنۂ وسطیٰ کا ہندوستان۔ گھاس پھونس جس کی دیواروں سے اُگ رہا ہے۔ پُرانی دلّی کی عمارتیں۔ اجمیر۔ خاندیش۔ بنگال اور مالوہ کی مسجدیں۔ گوڑ کا داخل دروازہ۔ تانتی پاڑا۔ فیروز مینار۔ گن منت مسجد۔ احمد آباد اور گجرات۔ چندیری اور جودھپور کی مساجد۔ رانی سپاری کی مسجد۔ چمپانیر۔ دھر وار۔ مانڈو کا ہنڈولا محل۔ جہاز محل۔ باز بہادر کا محل۔ کالپی کا

چونسا کی گنبد۔ جونپور کی اٹالا دیوی کی مسجد۔ دولت آباد کے قلعے۔ بہمنی بادشاہوں کی عمارتیں سری نگر کی پگوڈا ایسی چوبی مساجد۔ چندیری کا بادل محل۔ بیدر اور گلبرگہ۔ دکھن۔ دکھن۔ اتر پردیش میں للت پور، متھرا اور کالپی۔ اور شکوہ آباد اور بدایوں اور جونپور۔ مغلوں سے پہلے کا ہندوستان۔

اڑیسہ۔ مدراس۔ کرناٹک۔ آندھرا پردیش۔ حیدر آباد کا دلفریب، پُرشکوہ شاندار شہر۔ اجنتا۔ ایلورا۔ نیلگری کے پہاڑ۔ بنگلور۔ کیرالا۔ ٹراونکور۔ سرل گھوم پھر کر دوبارہ ازمنہ وسطیٰ کی عمارتوں میں پہنچ جاتا۔ ان گنت نام۔ اَن گنت زمانے۔ وقت کے پٹرن۔ وہ جو یوروپ کے قدیم کیتھڈرلوں کی محرابوں کے نیچے گھومتا تھا۔ اب خانہ بدوشوں کی طرح سارے ملک میں چکر لگاتا پھرا۔ ان عمارتوں کے پتھروں پر وہ ہاتھ رکھتا۔ کنول کے پھول۔ ہاتھی۔ گندھرو۔ حوض۔ سیڑھیاں۔ مینار۔ طاق۔ کسی تاریک اجاڑ محراب کے نیچے سے کوئی دیہاتی لڑکی بکریاں چراتی نکل جاتی۔ کوئی لڑکا پیپل کی شاخ پر سے باؤلی میں کود جاتا۔ کوئی فقیر راستہ ٹٹولتا ٹوٹتا محل کے ایک شکستہ کونے میں بیٹھ کر چلم سلگانے میں مصروف ہو جاتا۔ اوپر ٹوٹتے ہوئے گنبدوں اور وسیع صحنوں پر جھکا ہوا نیلا آسمان سنسناتا رہتا۔ بادل مغربی گھاٹ سے جھوم کر اُٹھتے اور دھرواڑ اور چتوڑ پر چھا جاتے۔ خلیج بنگال سے گھٹائیں بڑھتیں اور راج شاہی اور گوڑ پر پھیل جاتیں۔ ازمنہ وسطیٰ کا اداس، خاموش، اُجاڑ ہندوستان بارش میں نہاتا۔ گھاس کے پودے ہوا میں لہراتے۔

یہ پتھر ماضی اور حال دونوں میں شامل تھے اور اس کے ذہن پر اس طرح برستے تھے کہ اسے لگتا تھا کہ اب اس کا دماغ قطعاً ماؤف ہو جائے گا۔ وہ بھاگ کر حال میں پناہ لیتا۔

سارے ہندوستان میں مارے مارے پھرنے کے بعد (وہ کس کا متلاشی تھا؟ اس نے کئی مرتبہ جھنجھلا کر خود سے سوال کیا) وہ پھر کلکتہ پہنچا۔ پھر ہوائی جہاز میں بیٹھ کر مشرقی پاکستان کی سرزمین پر اترتا۔ ڈھاکہ کلب کی بار میں متواتر بیئر پیتے رہنے کے بعد پھر سلہٹ جانے والی ٹرین میں بیٹھ کر منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو جاتا۔

منزلِ مقصود بالآخر یہ تھی۔

ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر دھچکے سے ٹرین رکی۔ طرح طرح کی آوازیں نیند میں تیرتی ہوئی اس تک پہنچیں۔ ڈیم بوائلڈ۔ بوائلڈ ڈیم[1] — ساگرم[2] — ساگرم — ساگرم — ڈیم بوائلڈ — اس نے کھڑکی کا پٹ چڑھا کر پھر باہر دیکھا۔ اس منظر میں کس قدر بے پناہ اداسی تھی۔ اندھیرا چھا رہا تھا۔ باہر فضا میں پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی جو وسیع ہرے ترو تازہ کھیتوں پر سے بہتی ہوئی آئی تھی ایک بوڑھا پھوس ہندو بے شمار گٹھڑیاں اور اسباب اٹھائے جھکا جھکا، تیز تیز قدم اٹھائے جا رہا تھا۔ وہ دیر تک اس بوڑھے کو دیکھا کیا۔ حتیٰ کہ وہ اسٹیشن کے مجمع میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اوہ۔ یہاں کس قدر آبادی تھی۔ عورتیں جن کے ہاتھوں پر بڑی بڑی سرخ بندیاں اور مانگ میں گہرا سرخ سیندور رچا تھا۔ رنگ برنگی سوتی ساریاں پہنے، بچیاں، دھوتیوں کے کنارے سنبھالے ہندو، چارخانہ تہمد باندھے مسلمان، جن کی زیادہ تر داڑھیاں تھیں۔ فاقہ کش کالے کالے لڑکے۔ حکام، اینگلو انڈین گارڈ۔ پالکی بردار (یہاں اب تک پالکیاں چل رہی تھیں) پھر ٹرین چلی۔ بنگالی آوازیں اندھیرے میں معدوم ہو گئیں۔ ٹرین دوبارہ تالابوں کے کنارے کنارے دوڑنے لگی۔ جن میں کنول کے پھول کھلے تھے۔ کسی پھولوں کی بیل سے ڈھکے جھونپڑے کے دروازے پر کوئی عورت اودی ساری پہنے کھڑی نظر آجاتی۔ چند عورتیں گھونگھٹ نکالے بانسوں کے جھنڈ کے نیچے نیچے چل رہی تھیں۔ ان کے نام کیا ہوں گے — آمنہ۔ سکینہ — ریبا — رادھا — ان کی زندگیوں کی کہانیاں کیا ہوں گی بھلا — ! ان کا نظریۂ کائنات — ان کا فلسفہ — !! زندہ رہنے سے مر جانے تک کی داستان۔ تکالیف۔ افلاس۔ قحط — قحط۔ قحط —

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

اللہ کو پڑ دے۔ پانی دے۔ بھات دے رے —

اللہ بھات دے — اس کے کانوں میں اس کورس کے الفاظ گونجے جو اس نے

---

[1] اُبلے انڈے۔ [2] چائے گرم۔

کئی بار ڈھاکے کی محفلوں میں طالب علموں سے سنا تھا۔ اللہ بھات دے۔ اللہ بھات دے — یہ یہاں کا قومی ترانہ ہونا چاہیے۔ اُس نے سوچا اور بنگال کے متعلق اُس نے ہمیشہ سے کتنے رومانی تصورات باندھ رکھے تھے۔ شنیلا دیبی نے اسے ٹیگور پر کیا کیا لیکچر پلائے تھے۔ اور وہ ساری کتابیں جو اُس نے پڑھی تھیں — ڈی۔ سی۔ سین، اور جسیم الدین اور لیلا رائے۔ لوک گیت جمع کرنے والوں کی ٹولیاں۔ ادبی کانفرنسیں۔ کلکتے کے تھیٹر اور تہذیبی سرگرمیاں اور یونیورسٹی لائبریری اور اٹھارھویں اور انیسویں صدی کا پس منظر — اور کمپنی کے زمانے کی بنی ہوئی کوٹھیاں۔ کلایو روڈ جو اب سبھاش چندر بوس روڈ تھی اور علی پور اور دھرم تلہ — مگر وہ سرحد عبور کر چکا تھا۔ کلکتہ اور اس کی طلسماتی فضائیں دوسری طرف رہ گئیں۔ ٹرین ایک اور اسٹیشن پر رُکی۔ اللہ بھات دے — بھات دے — بھات دے —

چند پوربنیں گٹھریاں اور بچے اُٹھائے دھکا پیل میں لڑھکتی پڑھکتی تھرڈ کلاس کے ڈبوں کی طرف بڑھ گئیں۔ اس کے کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور ڈائننگ کار کے بیرے کا سفید براق صافہ اندر داخل ہوا۔

"ڈنر صاحب —؟"

"ہاں۔"

اُس نے کمبل ٹانگوں پر ڈال لیا۔ اور دوبارہ آرام سے لیٹ گیا۔

سلہٹ میں چائے کے باغات میں سینکڑوں پوربی مزدور کام کرتے تھے۔ رام دئی۔ رام اوتار۔ لچھمن اور سیتا۔ تزلوچن اور چنبیلیا — پوربیوں کے یہاں یہ دو نام بہت مقبول تھے۔ رام اور سیتا۔ ہند کا عہدِ عتیق۔ زریں زمانہ پاٹلی پتر، اندر پرستھ — ایودھیا — لکشن وتی شراوستی — جُگ جُگ وجے رام چندر اور متھلا کی جنک کماری سیتا — ارے، واہ رے تاریخ دانو —

"ڈنر صاحب — کافی لاؤں —" بیرے نے ٹرے لاکر سامنے رکھ دی اور سرگوشی کے لہجے میں اس طرح اسے مخاطب کیا۔ گویا وہ دیوتا تھا۔

وہ پھر حال میں واپس آگیا۔ اسے یاد آیا کہ اسے ابھی سری منگل پہنچنا ہے اور رنگاماٹی

اور بندر بن - اُسے مزید روپیہ کمانا ہے۔

دوسرے روز ٹرین سلہٹ پہنچی - اسٹیشن پر اس کا منیجر پیٹر ڈجکسن حسبِ معمول کار لئے اس کے استقبال کو موجود تھا - وہ شہر سے نکل کر سری منگل کی سمت روانہ ہوئے۔

سُرما ندی کے کنارے پہنچ کر اس نے کار روکی - اب شام کی تاریکی چھا رہی تھی - لالٹین لئے بوڑھے اور عورتیں کشتیوں پر سوار ہو رہے تھے - یا اُتر رہے تھے۔ بوٹ گھڑگھڑ کرتی دوسرے کنارے سے لوٹ آئی تھی - ساحل پر شکستہ لاریوں میں لوگ مرغیوں کی طرح ٹھنسے بیٹھے تھے - ایک اندھا فقیر قرآن کی آئتیں پڑھ کر بھیک مانگ رہا تھا - اندھیرے میں اس کی آواز بڑی ہولناک لگی - دو اندھے ایک نوکے میں جا بیٹھے تھے - ایک اندھی عورت درخت کے نیچے بیٹھی تھی۔

یہاں کتنے اندھے تھے - کتنے بے شمار اندھے۔

بوٹ سے تختے جوڑ کر اس کی کار کشتی پر چڑھائی گئی - کشتی مسافروں سے لد گئی۔

"بڑا گندا مجمع ہے - چلو ہم لوگ نوکے میں چلے چلیں" - پیٹر نے کہا - اس نے مزاحمت نہیں کی - وہ تو خود کشتی کی طرح سطح پر بہے جا رہا تھا۔

وہ دونوں کود کر ایک نوکے میں سوار ہو گئے - نوکا بوٹ کے پیچھے چلنے لگا - ساحل دُور رہ گیا - جس پر ٹی کے تیل کے چراغ ٹمٹما رہے تھے اور جس کے عقب میں جھونپڑوں پر پان کی بیلیں چڑھی تھیں - ایک چائے خانے کے آگے لوگ لالٹین کے سامنے جھکے اخبار پڑھ رہے تھے - دریا پر کشتیاں چل رہی تھیں - افق پر سپاری کے درخت ہواؤں میں جھومتے تھے - کس قدر سکون تھا - امٹ سکون -

دفعتاً زور کی ہوا چلی نوکا ہچکولے کھانے لگا۔

بہت بوڑھا مانجھی اپنا پورا زور لگا کر نوکا کھیتا رہا اور پھر گانے میں مصروف ہو گیا۔

اور اس نے دیکھا کہ اس کے بوڑھے ملاح کا نوکا لہروں پر ڈولتا جا رہا ہے - آگے جدھر گھپ اندھیرا ہے اور فضاؤں میں طوفان لرز رہے ہیں اور تاریک دھاراؤں میں مہیب ناگے مُنہ پھاڑے بیٹھے ہیں اور ہوائیں بہت تیز ہیں مگر اس فاقہ زدہ ملاح کی کشتی بڑے مزے میں

عناصر کا مقابلہ کر رہی ہے۔ کیونکہ عناصر کی بہنے رہی اور موت سے اس کی پرانی دوستی ہے۔

آخر جب ہوا کا زور زیادہ بڑھا اور کشتی بار بار ڈولنے لگی تو سرل نے لالٹین اُٹھا کر گھبراہٹ کے ساتھ چاروں طرف نظر ڈالی۔ "پیٹر ہم طوفانوں میں تو نہیں پھنس گئے ——؟" اُس نے پریشانی سے سوال کیا۔

"نہیں۔ یہ تو معمولی سی ہوا ہے۔ پریشان مت ہو۔" پیٹر نے جواب دیا۔ "مگر ذرا اِس کالے سور سے کہو کہ اپنا بھونڈا گانا الاپنے کے بجائے پتوار کی طرف زیادہ توجہ کرے۔ ورنہ اس طرح ہم گھاٹ پر صبح تک نہ پہنچ پائیں گے۔"

"بے چارہ بوڑھا ——" سرل نے چٹائی کی چھت پر جھک کر دوسری اور جھانکتے ہوئے کہا۔ مانجھی نے نظریں اُٹھا کر اسے دیکھا اور صبر کے ساتھ پتوار چلانے میں مصروف رہا۔

"یہ بڑے ذلیل لوگ ہیں۔ جتنی ان میں نام کو نہیں۔" پیٹر نے کہا۔

سرل نے چھت پر جھکے جھکے آواز دی۔

"او آدمی —— کیا نام ہے تمہارا۔"

"ابوالمونشور —— صاحب۔"

"ابوالمونشور ——" سرل نے دہرایا۔

"جی صاحب ——" وہ پھر پتوار پر جھک گیا۔ نوکا اب سرعت سے دوسرے کنارے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

کنارے پر دونوں طرف انناس اور کیلے کے جھنڈ تھے اور گاؤں میں روشنیاں جل رہی تھیں۔ سرل نے نوکے کے اندر جھانکا —— جہاں ابوالمونشور کا مٹی کا دیا اور چٹائی اور جا نماز اور دو کانسی کے برتن رکھے تھے۔ دیوار پر نایل آویزاں تھا۔ یہ اس بوڑھے چوتس سفید داڑھی والے کی ساری کائنات تھی جو دریا کے طوفانی پانیوں پر ڈولتی تھی ... اُس کو بڑا عجیب سا لگا۔ اُس نے آنکھیں ملیں اور خود کو یقین دلانا چاہا کہ یہ سب صحیح ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قسمت کے

ایک انوکھے داؤ نے اسے کیمبرج کی گلیوں سے نکال کر یہاں اس نوکے میں لا بٹھایا ہے اس عجیب و غریب، حسین ملک میں، جسے مشرقی بنگال کہتے ہیں، جسے مشرقی پاکستان کہتے ہیں۔

لالٹین اٹھا کر اس نے دوبارہ چاروں اور نظر ڈالی۔ روشنی سے لہروں پر راستہ سا بن گیا۔ برابر سے ایک شمپان گزر گیا۔ چاند بید کے درختوں کے پیچھے سے آہستہ آہستہ انتہائی کاہلی کے ساتھ طلوع ہو رہا تھا۔

١٠٠

"یہاں گھنگھور گھٹائیں اُمنڈ کر آتی ہیں۔ پر بارش نہیں ہوتی۔
یہاں بیٹا باپ کی، بی بی شوہر کی عزت نہیں کرتی۔
لوگ سبھاؤں میں جمع نہیں ہوتے۔
خوبصورت باغ اور عبادت خانے تعمیر نہیں کئے جاتے
یہاں امیروں کی دولت محفوظ ہے لیکن چرواہے اور کسان دروازوں کی چٹخنی چڑھا کر سوتے ہیں۔
بغیر پانی کی ندی۔ بغیر گھاس کا جنگل۔ بغیر چرواہے کا گلہ۔۔"

پڑھتے پڑھتے کمال نے رامائن بند کر دی۔

"یہ کہاں کا ذکر ہے۔۔" تلت نے پوچھا

"کہیں کا بھی نہیں۔ میں تو رامائن دیکھ رہا تھا۔ یہاں الماری میں پڑی مل گئی۔ مدتوں پرانی۔ اس پر ١٩٢٧ء کی تاریخ پڑی ہے۔۔۔" وہ اداسی سے کتاب کے سرورق پر لکھے ہوئے نام کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگا جس کی سیاہی دھندلی ہو چکی تھی۔

"تم تو اس عقیدت سے پڑھ رہے ہو گویا تلسی داس جی کمیونسٹ تھے۔" تلت نے کہا۔

"ہاں بھگت دیا ہر تھے۔" کمال نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا۔ "اُنھوں

نے لکھا ہے مہابھارت میں کہ اگر بادشاہ ظالم ہو تو اس کے خلاف بغاوت کرو ۔ ایسا بادشاہ بادشاہ نہیں ۔ اسے پاگل کتے کی موت مارنا چاہیئے ۔"

"واہ پنڈت جی ۔" سرل نے ہنس کر کہا ۔ "کیا بات ہے ۔ مگر یہ بتا دوں کہ اب تم یہ رامائن مہابھارت بھول جاؤ ۔ ورنہ آفت میں پھنسو گے ۔"

"ہاں ۔ یہ میں نے بڑی بے وقت کی راگنی چھیڑ دی ۔" کمال نے کہا ۔

دونوں پھر خاموش ہو گئے ۔ گینسے ہوئے برس بیئر کے گلاسوں میں بلبلوں کی طرح تیر اٹھے ۔ آدھ گھنٹہ اور گزر گیا ۔ سرل چپ چاپ بیٹھا ٹیلی پہاڑیوں کو دیکھتا رہا ۔ جن کے اس پار برما تھا ۔

"کیوں جانی ۔ کیا سوچتے ہو ۔" کمال نے اسی الم سے پوچھا

"کچھ نہیں ۔ سوچ رہا تھا کہ برما اگر یہاں سے پاؤں پاؤں جایا جائے تو کتنی دور ہوگا ۔"

"بس ۔ یہی سوچ رہے تھے ۔ ؟"

ایک آوارہ فاقہ زدہ کتا نیچے سے کود کر برآمدے میں آگیا ۔

"دیکھو یہ بھی برما سے آرہا ہے ۔"

"یا برما جانا چاہتا ہے ۔" کمال نے کمینے پن سے کہا ۔

کتا دم ہلاتا رہا ۔

"بلو ۔۔ بلو ۔ لو بسکٹ کھاؤ ۔" سرل نے کتے کی خاطر کی ۔

"یار ، یہ تو ریڈ چائنا سے بھاگ کر آیا ہے ۔" کمال نے اسے غور سے دیکھ کر بڑی متانت سے کہا ۔ "اینٹی کمیونسٹ کتا ہے ۔ آزادی کی تلاش میں یہاں پہنچا ہے ۔"

سرل نے منہ لٹکا کر کمال کو دیکھا ۔ "تم اب بھی کالج کے زمانے کی سی باتیں کرتے ہو ۔"

"اب بھی ۔ کی تعریف نہیں کی جا سکتی ۔"

میز پر چائے کا سامان رکھا تھا ۔ کمال نے ایک سینڈوچ کتے کے سامنے پھینکا اور بولا ۔ "نہیں سرل ۔ میں اب مشرف بہ اسلام ہو چکا ہوں ۔ دیکھو میرا پاسپورٹ ۔" اس نے جیب سے سبز رنگ کا نیا نویلا پاسپورٹ نکالا ۔

"پہلے بتا دو رزمیں تو میں تم کو اس سے اچھی نوکری دلوا دیتا ۔" سرل نے کہا ۔ "کیا

کرنافلی مل کی پلاننگ کرنے آئے ہو تم — یہاں اکثر لوگ اس سلسلے میں آتے ہیں۔"

"میں جھک مارنے آیا ہوں۔ تم سے مطلب۔ تم بنگالی مزدوروں کا خون چوسنے کے لئے نہیں آن موجود ہوئے۔ سنوب بولے تو بولے چھلنی بھی بولی جس میں بہتر چھید — میں تو ہوں ہی زمانے بھر کا نمبر ایک کا بھگوڑا رجعت پسند"

اب اس پر پھر اپنے ضمیر کا دورہ پڑنے والا ہے —" سرل نے بڑے دُکھ سے دوسری طرف مُنہ کر لیا۔

سرل ہاورڈ ایشلے ندیوں، پہاڑیوں اور گھنے جنگلوں میں سے گزرتا کل صبح ہی یہاں پہنچا تھا۔ وہ سری منگل سے کاروبار کے سلسلے میں چاٹگام آیا تھا۔ جہاں سے اس کی چائے ایکسپورٹ کی جاتی تھی۔

چاٹگام میں پھر دل کی وحشت نے زور باندھا اور پیٹر پر کام کی دیکھ بھال چھوڑ کر اس نے پہاڑیوں کا رُخ کیا۔ وہ دوہزاری، اور بندر بن اور چندر گونا کے جنگلوں میں مارا مارا پھرا۔ اور رانگاماٹی کے ڈاک خانے سے اپنے بھائی کو اُس نے فرمانبرداری سے اپنی خیریت کا خط بھی بھیجا۔ جس میں آسام اور سلہٹ اور چاٹگام کے علاقوں کی خوبصورتی پر اس نے روشنی ڈالی اور لکھا کہ امید ہے اگلی کرسمس وہ اس کے ساتھ سلہٹ میں منائیں گے۔

یہ خبر سُن کر کہ سرل نے روزمیری کو طلاق دے دی (اس کی وجہ کسی کو معلوم نہ تھی) اس کے بڑے بھائی لارڈ بارن فیلڈ کے دل پر سے ایک بوجھ سا اتر گیا تھا۔ ان کو محسوس ہوا تھا کہ بوہیمیا سے نکل کر ان کا چھوٹا بھائی بالآخر اب اپنی دُنیا کو واپس لوٹ آئے گا لارڈ موصوف نے کلکتے سے اپنا کاروبار سمیٹ کر اب بڑے پیمانے پر مشرقی پاکستان میں روپیہ لگایا تھا۔ جہاں ان کے چائے کے باغات بھی تھے۔ سرل جو اب کیمبرج سے نکلنے کے بعد روزگار کی تلاش میں لندن میں مارا مارا پھر رہا تھا، اسے ایک روز انھوں نے اپنے کلب میں بلایا اور بغیر تمہید اس سے کہا "میں تم کو پاکستان بھیج رہا ہوں۔"

"بہت اچھا۔" سرل نے اسی انداز میں جواب دیا۔ اب زندگی میں مزید جھگڑا کرنے کی گنجائش کہاں تھی

پچھلے چھ مہینے سے وہ پاکستان میں تھا۔ اسے لندن چھوڑنے کا زیادہ رنج نہیں ہوا گوتم نیلمبر، ہری شنکر، کمال، مائیکل، سرلکھا، سب لوگ پہلے ہی انگلستان کو خیرباد کہہ چکے تھے۔ روانہ ہونے سے پہلے اُس نے شنیلا دیبی کو فون کیا اور طلعت کو بھی مگر طلعت گھر پہ موجود نہ تھی۔

اب وہ سری منگل میں ایک بے حد خوبصورت بنگلے میں رہتا تھا۔ کام سے فرصت ملتے ہی ہندوستان کا چکر لگا آتا تھا۔ دارجلنگ۔ شیلانگ۔ کلکتہ۔ بمبئی۔ حیدرآباد دکن۔ عمارتیں کھنڈر۔ مکانات۔ اسے طرح طرح کی کہانیاں سناتے۔

کل شام جب وہ ایک پگوڈا کے باغ میں گھنٹہ بھر چُپ چاپ بیٹھے رہنے کے بعد سرکٹ ہاؤس واپس پہنچا تو ایک نوجوان کی پُشت پر اس کی نظر پڑی جو پچھلے برآمدے کی ریلنگ پر جھکا نیچے کرنافلی ندی کو دیکھ رہا تھا۔

اس کے قدموں کی آہٹ پر اس نوجوان نے پلٹ کر سرل کو دیکھا۔

یہ نوجوان کمال رضا تھا۔

کمال نے اسے اپنی داستان سُنائی اور اسے مطلع کیا کہ وہ ایک لیبارٹری قائم کرنے کراچی سے ادھر آیا ہے اور سارے صوبے کا دورہ کرتا پھر رہا ہے۔

اب وہ صبح سے برآمدے میں بیٹھے تھے اور زندگی کا غم اُن کے ٹکڑے ٹکڑے کیے ڈال رہا تھا۔

شام کا اندھیرا چھا گیا تھا۔ ملازمین نے سرکٹ ہاؤس میں لیمپ روشن کر دئے۔ چند روز قبل کھیدا ختم ہوا تھا۔ برابر کے کمروں میں ہاتھیوں کا ٹھیکے دار ایک اینگلو انڈین مع اپنے اینگلو انڈین عملے کے ٹھہرا ہوا تھا۔ جو شراب پینے کے بعد بے حد فلسفیانہ باتیں کرتا۔

رات کو نوجوان خوش مزاج افسروں کی ایک ٹولی شور مچاتی ہوئی آئی۔ ان میں سے دو ایک لڑکے علی گڈھ کے تھے۔ کمال کی ان سے علیک سلیک ہوئی۔ کھانے کی میز پر وہ بنگال کے مسئلہ کا تذکرہ کرنے لگے۔

"بہت سے لوگ تو بس نام کے مسلمان ہیں" ان میں سے ایک نے کہا۔

"اچھا! میرا تو خیال تھا کہ اسلام کا یہاں بڑا زور ہے۔ جتنا سارے برّ صغیر میں نہیں ہے۔ مثلاً اتنے نمازی اور اتنا سخت پردہ میں نے اور کہیں نہیں دیکھا۔" کمال نے کہا۔

"— سارا روپیہ یہاں کلکتے کی کمیونسٹ پارٹی سے آتا ہے۔" انھوں نے کہا۔

"بنگال کا مسئلہ ہے — نازک —"

کمال چپ چاپ بیٹھا ان سب کو دیکھتا رہا۔

کھانا کھانے کے بعد وہ سب اپنے اپنے کمروں کی طرف چلے گئے۔ سرل اور کمال پھر پچھلے برآمدے میں آ بیٹھے جس پر نارنجی پھولوں کی بیل پھیلی ہوئی تھی۔ سارے میں خاموشی چھا گئی۔ ندی جہاں مڑتی تھی وہاں پہاڑی پر پاور ہاؤس تھا۔ رات کے سناٹے میں اس کی گھڑگھڑاہٹ بڑی صاف سنائی دیتی۔ اس کے قریب بازار کا سینما ہاؤس تھا جس میں سے "بیجو باورا" کے گانوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ لتا کی آواز ندی کی سطح پر تیرتی ہوئی سرکٹ ہاؤس تک آ رہی تھی۔ کمال جنگلے پر سر رکھے اس آواز کو سنتا رہا۔ لتا کی آواز ایک ایسا مضبوط پل ہے جس نے دو دشمن ملکوں کو ایک دوسرے سے ملا رکھا ہے۔ اس نے سوچا۔

"تم نے لتا کو سنا ہے؟" اس نے باآواز بلند سرل کو مخاطب کیا۔

"وہ کون ہے—" سرل نے چونک کر پوچھا۔

کمال بوریت کے دریا میں غوطہ زن رہا۔

خانساماں کافی کی کشتی لے کر نمودار ہوا۔

کمال کی اس خانساماں سے بہت دوستی ہو گئی تھی۔ کئی بار ان دونوں کا مختلف مسائل پر تبادلۂ خیالات ہو چکا تھا۔

"کہئے خانساماں جی — کیا حال چال ہے۔" کمال نے کہا۔

"مہربانی ہے حضور۔ آپ لوگوں کے آنے سے رونق لگی رہتی ہے۔ ورنہ اس جنگل بیابان میں کیا رکھا ہے۔"

"تم بڑی صاف اُردو بولتے ہو۔ ڈھکیا ہو گیا — ؟"

"جی نہیں سرکار، ہم تو کلکتیہ ہیں۔"

"اچھا۔ ہم بھی تھوڑے سے کلکتیہ تھے ایک زمانے میں۔"

"جی حضور۔"

کمال نے ایک اور جمائی لی۔ خانساماں جھک کر کافی بنانے لگا۔ سرل حسبِ معمول آنکھیں بند کئے بیٹھا رہا۔

گورنر جنرل اور اُن کی پارٹی کھیدا کے بعد بندربن سے لوٹ کر کراچی واپس جا چکی تھی۔ اُن کی آمد کے لیے باشا کا سرکٹ ہاؤس خاص طور پر آراستہ کروایا گیا تھا۔ گورنر جنرل کی شان و شوکت دیکھ کر خانساماں کو سر فریڈرک کا زمانہ یاد آ گیا جو بنگال کے گورنر تھے اور جب شکار کے لیے آتے تھے تو اسی طرح جنگل میں منگل لگ جاتا تھا اور خوب بخشیش ملتی تھی۔

"پچھلے دنوں تو یہاں بڑی چہل پہل رہی ہوگی۔" کمال نے کہا۔

"جی حضور۔ آپ کو اس زمانے میں آنا چاہئے۔ دُور دُور سے صاحب لوگ آیا تھا اب خوشی کی بات یہ ہے کہ بڑے لاٹ صاحب انگریز کے بجائے مسلمان ہیں۔ مگر شان میں انگریزوں سے کم نہیں۔ اسی پر تو غیر لوگ جلتے ہیں۔ اسلام کی شان دیکھ کر حاسدوں کے آگ لگتی ہے —"

"کون جلتے ہیں —" کمال نے پوچھا۔

"ارے صاحب —" اُس نے چاروں طرف دیکھ کر سرگوشی میں کہا۔ "یہاں بڑا بڑا مفسد پڑا ہوا ہے۔"

"یہاں کہاں —" کمال کو اُس کے رازدارانہ لہجے سے ایسا لگا جیسے ان گھنے جنگلوں میں بڑے جید کمیونسٹوں کی کمین گاہیں ہیں۔ ابھی ان کے گوریلا دستے اندھیرے سے نکل کر سرکٹ ہاؤس پر دھاوا بول دیں گے اور وہ بے چارا اپنا فرض منصبی انجام دیتا ہوا شہید ہو جائے گا۔

سرل کپڑے تبدیل کرنے کے لئے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ خانساماں نے کافی کے برتن اُٹھا لئے۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

کچھ دیر بعد ایک امریکن ڈرائینگ روم میں سے نکل کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا بے تکلفی سے آن کر کمال کے پاس بیٹھ گیا۔

"ہاؤ ڈی —" اُس نے مسکرا کر کہا۔

"ار— ہاؤ ڈو یو ڈو —" کمال نے ہاتھ ملایا۔

"میں جان ٹائی ٹس ایبل جونیر ہوں۔ مجھے جونی کہو۔"

"ہلو جونی۔ یہاں کیسے آنا ہُوا؟" پھر دفعتاً کمال کو خیال آیا کہ یہ کیسا غیر ضروری سوال تھا۔

"میں حکمہ قبائل کے متعلق ایک ڈوکومنٹری فلم بنا رہا ہوں —"

"او— ہاؤ اکسائیٹنگ —" کمال اور ٹانگیں پھیلا کر آرام کرسی پہ لیٹ رہا۔

"سگریٹ —؟"

"تھینکس۔"

دوسرے لمحے جونی بھی فضا کے اس سحر میں کھو گیا۔ وہ جنگلے پہ بازو رکھ کر ندی کو دیکھتا رہا۔ جونی کی بش شرٹ پر جو اخبار چھپے تھے۔ کمال آنکھیں کھول کر برآمدے کے مدھم اُجالے میں ان کے الفاظ پڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر اس سے بھی اُکتا گیا۔ دریا پر مکمل سکوت کے ساتھ کشتیاں گزر رہی تھیں۔ کبھی کسی ملاح کے گانے کی آواز بلند ہوتی تھی۔ ان کشتیوں میں چراغ جل رہے تھے۔ اب گھُپ اندھیرا سامنے وادی پر چھا گیا تھا۔

پھر جونی نے بڑے دوستانہ اور بھولے انداز میں کمال سے باتیں شروع کر دیں۔ کمال ہوں ہاں کرتا رہا۔ سرل نے ڈریسنگ گاؤن پہن کر اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے جھانکا۔ اور کمال کو امریکن کے ساتھ سر کھپاتا دیکھ کر چپکے سے غسل خانے کے راستے باہر نکل کر پہلو کے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے بھی دریا بل کھاتا ہُوا بہہ رہا تھا اور کشتیوں کی روشنیاں لرز رہی تھیں۔ اندھیارا جگر کاٹتا سارے میں چھایا جا رہا تھا۔ برآمدے

میں جوتی اپنی یکساں آواز میں کمال کو بتا رہا تھا کہ وہ کچھ عرصہ قبل ہی مشرقی پاکستان آیا ہے۔ لیکن انڈر ڈیولپڈ ممالک کا اسے خاصہ تجربہ ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے وہ ویت نام میں رہ چکا ہے۔ اس کی بیوی نیویارک میں پریس فوٹوگرافر ہے۔ ان کے دو بچے ہیں۔ اس نے جیب سے اپنے بیوی بچوں کی تصویر نکال کر دکھائی اور دیر تک اپنے چھوٹے بچے کا تذکرہ کرتا رہا جو دو سال کا تھا۔ پھر اس نے ایشیا میں کمیونزم کے خطرے پر روشنی ڈالی اور کمال کو بتایا کہ مسلم ممالک اپنی مذہبی اور روحانی طاقت کے ذریعے کمیونزم کے خلاف جہاد میں امریکہ کی بڑی مدد کر سکتے ہیں۔

"اب تو کافی پی لو —" کمال نے جمائی لے کر کہا۔

"نہیں۔ اب میں کھانا کھاؤں گا۔" اس نے مشرقی پاکستان کے سیاسی حالات پر گفتگو شروع کی۔ کمال کو بڑا تعجب ہوا کہ مشرقی پاکستان کے متعلق ساری تفصیلات اعداد و شمار ہر چیز اسے نوکِ زبان تھی اور اسے یہاں آئے صرف ایک ماہ ہوا تھا۔

اتنے میں دو اور امریکن رنگین بش شرٹ پہنے ڈرائنگ روم عبور کرتے ہوئے برآمدے میں آ گئے۔ ایک دفعہ پھر تعارف کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور بہت اخلاق کی باتیں کی گئیں۔ یہ دونو یو۔ ایس۔ آئی۔ ایس ڈھاکے کے افراد تھے اور اسی جوتی کے ہمراہ رانگامائی آئے تھے۔ لوکیشن ڈھونڈنے کے لیے وہ سارا دن جنگلہ گاؤوں میں گھومتے پھر رہے تھے۔ ان کے پاؤں گرد آلود تھے اور بہت تھکے ہوئے تھے۔ بچوں کے ایسے جوش و خروش سے وہ کمال کو اپنے ایڈونچرز سناتے رہے۔

"تم کو معلوم ہے — ریڈ چائنا یہاں سے کس قدر قریب ہے — ان پہاڑیوں سے ذرا ہی آگے بڑھ کر —" جوتی نے ایک اور انکشاف کیا۔

سرکٹ ہاؤس کے خدمت گار نے آن کر اطلاع دی کہ غسل کے لیے پانی لگا دیا گیا ہے۔ وہ سب اسی طرح باتیں کرتے اٹھ کر اندر چلے گئے۔

سرل نے مُنڈیا نکال کر پھر کھڑکی میں سے جھانکا

"گئے تمہارے یار دوست —"

"آجاؤ— اب میدان صاف ہے —" کمال نے جواب دیا۔

سرل باہر آکر اپنی آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ وہ دونوں پھر اپنے اپنے مراقبے میں ڈوب گئے۔

کمال اور سرل پانچ چھ دن وہاں رہے۔

سرکٹ ہاؤس کے نیچے کرنافلی رواں تھی جس پر لکڑی کے بڑے بڑے گٹھے بہا کر چندر گونا کی طرف لے جائے جا رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر اینگلو انڈین ڈپٹی کمشنر کا بنگلہ تھا۔ اس کی آرٹسٹ لڑکی جین سفید ساری پہنے پہاڑیوں پر بیٹھی خاموشی سے تصویریں بناتی نظر آتی۔ بل کھاتے راستوں پر سے منگول شکلوں والے پہاڑی بوجھ پیٹھ پر لادے گزرا کرتے۔ سرکاری جیپ گاڑیاں زن سے نکل جاتیں۔ صبح شام مندروں میں گھنٹے بجتے۔ ہاٹ میں وادی سے آئی ہوئی چیزیں بکتیں۔ رنگ برنگے سُوتی کپڑے۔ مونگے اور فیروزے کے ہار۔ چاندی کے زیور۔ لمبے لمبے پائپ پیتی ہوئی ہنس مکھ پہاڑی عورتیں دوکانیں لئے بیٹھی رہتیں۔ ہندو مسلمان، بدھ۔ سب سکون اور قناعت سے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ اناس کے کھیتوں میں کٹائی کر رہے تھے۔ چاول اُگا رہے تھے۔ عمیق خطرناک جنگلوں سے بانس کاٹ کاٹ کر نیچے لا رہے تھے۔ اکثر کسی انتہائی ویران اور غیر آباد جنگل کی اُونچی پگڈنڈی پر کمال کو ایک بوڑھا تہمد باندھے سر پر بانسوں کا بھاری گٹھا اُٹھائے اپنا راستہ طے کرتا دکھلائی دے جاتا۔ اس گٹھے کو بیچ کر وہ چند آنے کمائے گا۔ صدیوں سے وہ یہی کرتا آ رہا تھا۔ آج بھی اس کی حالت میں ذرہ بھر فرق نہیں آیا تھا۔ جنگلوں میں چکمہ اور ماگھ اور مونگ قبیلے اپنے بانس کے جھونپڑوں میں زندہ تھے۔ بیسیوں میل کا فاصلہ طے کر کے ہاٹ کے لئے رانگامائی آتے تھے۔ یہاں سڑکیں نہیں تھیں۔ یا ریل گاڑیاں یا ہوائی جہاز کی سروس۔ یہ حسین ترین، پُر امن علاقہ "وحشیوں کا ملک" کہلاتا تھا۔ یہ جگہ اینتھروپولوجسٹ کے لئے جنت ہے — جوتی کہتا اور ان کو اپنے ساتھ لوکیشن پر گھسیٹ کر لے جاتا۔ یا وہ دونوں خود ہی جیپ پر بیٹھ کر ساگوان کے جھرمٹوں میں گھس جاتے اور پرندوں کی چہکار سنتے پھرتے۔ پہاڑی لڑکیاں سیاہ دھاری دار

سیرونگ باندھے گگریاں اٹھائے ان جنگلوں میں سے گزر جاتیں۔ کسی بھکشو کے نارنجی لباس کی جھلک دکھلائی دے جاتی۔ کرنافلی کے دھارے پر انھوں نے دور دور تک کشتی رانی کی۔ بندربن جاکر موگھ راجہ سے ملے اور اس کا محل دیکھا اور وہ گھنے جنگل جن میں ہاتھی رہتے ہیں۔

"آسام میں اس سال جو سیلاب آیا تو بے شمار ہاتھی ہجرت کرکے یہاں آگئے۔ ویسے بھی ان جنگلوں کی سرحد کا صحیح تعین کرنا بڑا مشکل ہے۔" ایک افسر نے کمال کو بتایا۔

"تو گویا ان پاکستانی ہاتھیوں میں جن کا کھیدا ہوا مہاجر ہاتھی بھی شامل تھے؟" کمال نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

انھوں نے بندربن کے سارے علاقے کی سیر کی۔ انسانوں کو دیکھا۔ کمال ان کی زبان نہ سمجھتا تھا۔ وہ کمال کی زبان سے ناواقف تھے۔ یہ بھولے، معصوم لوگ جو اب تک تقریباً پتھر کے زمانے میں رہ رہے تھے۔

ان جنگلوں میں خوبصورت جانور بھاگے پھر رہے تھے۔ چیتے اور گلدار۔ اور بارہ سنگھے۔

یہ کیسی صاف ستھری، پاکیزہ دنیا تھی۔

ایک روز شام کو وہ رانگاماٹی سے کرنافلی کے اس پار راج باڑی گئے جہاں چکمہ راجہ رہتا تھا۔ یہاں گویا ہندوستانی ریاستوں کے دم واپسیں کا بڑا موثر منظر کمال کو دکھلائی دیا۔ باغ میں ایک چھوٹی موٹی توپ رکھی تھی۔ ایک مندر تھا۔ آم کے درختوں پر شام کی اداسی میں کوئلیں چلا رہی تھیں۔ سامنے معمولی سے محل میں مدھم بلب روشن تھے۔ کیونکہ رانگاماٹی پاور ہاؤس بے حد کمزور تھا۔

ہال میں راجہ کے پرکھوں کی قدآدم روغنی تصاویر آویزاں تھیں۔ "ان پرکھوں میں بنگال اور آسام کے مغل گورنر بھی شامل تھے"۔ سرل نے فوراً اس علاقے کی ہسٹری کی اس کرم خوردہ کتاب کا حوالہ دیا جو سرکٹ ہاؤس کے ڈرائینگ روم میں رکھی تھی۔

انگلستان کے پڑھے ہوئے نوجوان راجہ اور اس کی ماں نے سرل اور کمال کا استقبال کیا۔

ڈرائینگ روم میں پیانو کے اوپر سادھنا بوس کی تصویر رکھی تھی۔ کشیب چندر سین کی

تصویر آتشدان پر موجود تھی۔ راج ماتا کشیپ چندر سین کی پوتی اور رسا دھنا بوس کی بڑی بہن تھیں۔ "کشیپ چندر سین نے جب اپنی کمسن لڑکی کی شادی مہاراجہ کوچ بہار سے کر دی۔ تو برہمو سماج میں بڑا ہنگامہ ہوا تھا — " کمال نے سرل کے گوش گزار کیا۔

"ہاں۔ میں نے ستی دیوی، مہارانی کوچ بہار کی خود نوشت سوانح حیات پڑھی ہے۔ شنیلا دیبی نے پڑھنے کو دی تھی۔ جب وہ برہمو سماج پر لیکچر دیتی تھیں —" سرل نے آہستہ سے جواب دیا۔

"آپ پاکستان سے آئے ہیں؟" راج ماتا نے پوچھا۔

کمال ایک لحظے کے لیے ہڑبڑا گیا۔ یہ بھی تو پاکستان ہے۔ پھر دوسرے لحظے اس نے صورت حال پر غور کیا۔ کیا یہ پاکستان نہیں ہے —؟ کسی ملک کا تصور در اصل کیا ہے۔ یہ راج باڑی اب کس ملک میں شامل ہے —؟ کیشپ چندر سین اب کدھر کھپتے ہیں؟

رانی صاحبہ کمرے میں داخل ہوئیں جو ایک خوبصورت سی سترہ سالہ لڑکی تھی۔ جس نے ساری عمر دارجلنگ کے کانونٹ اسکول میں گزاری تھی۔ وہ دونوں فوراً تعظیم کے لئے کھڑے ہوئے۔ کمال کے خیالات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اب راجہ جو کافی خوش شکل تھا، اوکسفرڈ کے لہجے میں سرل سے کہہ رہا تھا —

"حکومت کرناٹلی میں بند باندھ کر سارے صوبے کے کارخانوں کے لئے ہائیڈرو الیکٹرک کا ذخیرہ بنانے والی ہے۔ میرے قبیلے کے لوگوں کا علاقہ بھی زیر آب ہو گا۔ ان کو حکومت معاوضے دے کر کہیں اور بسا دے گی۔ یہ میرا مکان مع رانگا ماٹی کے غرقاب ہو جائے گا۔"

"تغیر کے بغیر ترقی ممکن نہیں —" کمال نے آہستہ سے جواب دیا۔

"ہاں۔" راجہ نے کہا۔

راج ماتا کلکتے کی باتیں کرنے لگیں۔ کمال کا ذہن پھر دور دور بھٹک گیا۔ بنگال کے راجواڑوں کا ماحول۔ بردوان۔ کوچ بہار۔ سیمن سنگھ یہ اس الف لیلوی سلسلے کی ایک چھوٹی سی گمنام کڑی تھی۔ جواب ہائیڈرو الیکٹرک کے پانی کے ذخیرے میں غرق ہونے والی تھی۔

کمال اور سرل نے کچھ دیر بعد اجازت چاہی۔ راجہ اور راج ماتا دروازے تک پہنچانے آئے۔

"پھر کبھی ضرور تشریف لائیے گا۔" راج ماتا نے کمال سے کہا۔

"ضرور — خدا حافظ۔"

وہ باہر آ گئے۔ راج باڑی کی روشنیاں ٹمٹمایا کیں۔ کرنافلی پر کشتیوں کا ٹریفک اب کم ہو چلا تھا۔ رات بھیگتی جا رہی تھی۔

دوسری صبح وہ رانگا ماٹی کو خیرباد کہہ کر نیچے میدانوں میں اُتر آئے۔

چاٹگانگ سے وہ ٹرین میں بیٹھ کر سیتا کنڈ روانہ ہوئے۔

راستے میں نوجوان ٹکٹ چیکر کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا اور ٹکٹ دیکھنے کے بعد دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

"تشریف رکھئے۔ سگریٹ لیجئے گا۔" کمال نے کہا۔

اُس نے ذرا بھونچکا ہو کر کمال کو دیکھا اور پھر جھجکتے ہوئے سیٹ کے کنارے پر ٹک گیا۔

"آپ یہیں کے رہنے والے ہیں؟" کمال نے پوچھا

"جی ہاں۔ سپاری کے اس جھنڈ کے ادھر میرا گاؤں ہے۔" ٹکٹ چیکر نے جواب دیا۔

کمال کو اور بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔ اس کو ٹی بی ہو چکی ہے۔ اس کی تنخواہ بہت کم ہے اور گھر کا خرچ بہت زیادہ ہے۔ پانچ بہنوں کی شادی کرنا ہے۔ وہ موجودہ وزارت سے مطمئن نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کی سیاسی معلومات حیرت انگیز تھیں۔ وہ یونیورسٹی کے کسی جوشیلے طالب علم کی طرح مدلّل گفتگو کر رہا تھا۔ حالانکہ وہ محض ایک مدقوق ٹکٹ چیکر تھا جس کی زندگی چھوٹی لائن کی ٹرین پر سفر کرتے گذرتی تھی۔

"پاکستان بننے سے پہلے فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے ڈبوں میں کوئی مسلمان نظر نہ آتا تھا۔ بنگالی مسلمان سماجی اور اقتصادی طور پر اس حد تک پس ماندہ تھے۔ آج آپ لوگوں کو فرسٹ کلاس میں سفر کرتے دیکھ کر میرا دل خوشی سے بھر جاتا ہے۔" اس نے کمال سے کہا

اسٹیشن قریب آ رہا تھا۔ گاڑی کی رفتار مدھم ہونا شروع ہوئی۔

"آپ کو پتہ ہے —" ٹکٹ چیکر نے کھڑے ہوتے ہوئے معاً کمال کو مخاطب کیا — "۱۹۲۸ء سے آج تک اس لائن پر چیکنگ کرتے مجھے اتنے برس بیت گئے۔ آپ پہلے بڑے مسافر ہیں جنھوں نے مجھ سے اخلاق سے بات کی اور مجھے ایک باعزت انسان سمجھا — میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

دوسرے لمحے وہ سرعت سے ڈبے کے باہر نکل گیا۔

کمال اور سرل اسٹیشن پر اترے۔ شام ہو رہی تھی۔ ہوا میں پھولوں کی خوشبو تھی۔

"ہم سیتا کے مندر جانا چاہتے ہیں۔" کمال نے ایک آدمی سے کہا۔

"اب اس وقت نہ جایئے۔ پہاڑی کی چوٹی بہت اونچی اور پرخطر ہے۔ لوٹتے لوٹتے رات ہو جائے گی۔" اسٹیشن ماسٹر نے آگے بڑھ کر کہا۔

"ہم ضرور جائیں گے۔" سرل نے ضد کی۔

اسٹیشن ماسٹر نے ذرا محظوظ ہو کر اسے غور سے دیکھا۔ دس پندرہ لوگ جھجکتے ہوئے ان کے آس پاس جمع ہو گئے۔ یہ ایک بڑا سا خاندان تھا۔ اسٹیشن کا عملہ۔ پولس کانسٹبل۔ چائے کی اسٹال والا۔ گاؤں کے باشندے۔ مندروں کے سادھو۔ ان کی اس مکمل پرسکون دنیا میں یہ دو انوکھے اجنبی کہاں سے آن ٹپکے۔

فوراً بستی میں خبر پھیل گئی۔ دو یاتری آئے ہیں۔ اور ان میں سے ایک انگریز ہے (انگریز بھی یاتری ہی ہوگا۔ ورنہ اس کا دماغ خراب ہوا تھا کہ جان جوکھم میں ڈال کر اتنی دور سیتا جی کی مقدس آگ کے درشن کرنے آتا؟) ایک پالکی لا کر پلیٹ فارم پر رکھی گئی۔ اس کے پردے ہٹا کر ساری کے گھونگھٹ میں سے ایک لڑکی نے بھی ان دونوں اجنبیوں کو حیرت سے دیکھا۔

سرل پالکی کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتا رہا۔

"یہ ہمارے بڑے مولوی صاحب کی بٹیا ہے۔ اپنے سسرال واپس جا رہی ہے۔" کانٹا بدلنے والے نے بتایا۔

کانسٹبل آگے بڑھا "آیئے آپ کو گاؤں تک پہنچا دوں۔" اس نے کہا۔

گاؤں کے راستے میں اُس نے بھی سیاسی گفتگو شروع کر دی۔ گرانی۔ مسلم لیگ کی سیاست۔ مصنوعی قحط۔ عوامی لیگ۔ اے کے فضل الحق۔ کمال کا سر چکرا گیا۔ اس صوبے کا بچہ بچہ کتنے زبردست سیاسی شعور کا مالک تھا۔ گاؤں کے چھوٹے سے بازار میں ایک لڑکا کمال کے پیچھے چلنے لگا۔ وہ کانسٹبل سے چاٹگانگ کی علاقائی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا۔

"یہ فلا کہتا ہے کہ آپ کو کنڈ تک لے جائے گا۔" کانسٹبل نے کہا۔

"ہلو پرفلا۔" سرل نے اس سے مصافحہ کیا

"تمھارا پورا نام کیا ہے۔"

کمال نے اس سے کلکتے کی بنگالی میں پوچھا۔

"پرفلا کمار بسواس۔"

"اسکول میں پڑھتے ہو؟"

"جی نہیں۔ کھیتی کرتا ہوں۔"

"یہاں آرام سے رہتے ہو۔؟"

"آرام سے کیوں نہیں رہوں گا۔؟" پرفلا نے حیرت سے پوچھا۔

کمال خاموش ہو گیا۔

بازار کی کچی سڑک پر تازہ تازہ چھڑکاؤ ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی دوکانوں پر لوگ جمع تھے۔ سب کی نظریں ان دونوں کی طرف تھیں۔ سفید دیو کی طرح سرل آگے آگے اس ننھے سے بازار میں داخل ہوا۔ کمال ایک چاء خانے کے سامنے رُک گیا۔ صاف ستھرے بانس کی ٹٹیوں سے بنے ہوئے چاء خانے میں ہُلّڑ نہیں تھا اور نہ غنڈہ پن کا ماحول اس پر طاری تھا۔ چند آدمی چادریں لپیٹے بنچوں پر بیٹھے بنگالی اخبار پڑھ رہے تھے۔ کونے میں گراموفون بج رہا تھا۔ دیواروں پر بنگالی فلموں کے اشتہار لگے تھے۔ یہ بالکل ایک دوسری دنیا تھی۔ "ہمارے لئے خوب گرم چاء بنانا۔ ہم ابھی پہاڑی پر سے واپس آتے ہیں۔" کمال نے چاء خانے کے مالک سے کہا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں سے کیلے اور پھل لے کر خاطر کے لئے آن موجود ہوئے۔

"آپ یاتری ہیں۔ بڑی دُور سے آئے ہیں۔ آپ کی خدمت ہمارا فرض ہے ــ" ایک داڑھی والے مسلمان نے کہا۔

کمال حیرت سے یہ سب سُنتا رہا۔ کیا ان ہی انسانوں نے نواکھالی اور بہار میں ایک دوسرے کو ذبح کیا تھا؟ اس کا سر پھر چکرا گیا۔

پھر فلا کی معیت میں اُنھوں نے پہاڑی کی اور بڑھنا شروع کیا۔ راستے میں خوبصورت جھونپڑے تھے اور سرسبز کنج۔ جگہ جگہ سرسوتی پوجا کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ گھاس پر اور مکانوں کے سامنے سرسوتی کی بے حد خوبصورت اور رنگ برنگ مورتیاں رکھی تھیں۔ جن کو کمہاروں نے خشک ہونے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ کمال ایک مُورتی کے قریب زمین پر بیٹھ گیا۔ "علم کی دیوی۔ بطخ پر سوار ہو کر ستار بجانے والی برہما کی بی بی۔ مادرِ کائنات ــ" اس نے کہا۔ "ہم انسانوں نے تیرا کیا حشر کیا۔"

نرمل بھی گھاس پر دو زانو بیٹھ گیا۔ "تمہارے گاؤوں کے کمہار کس قدر زبردست ماہرِ فن ہیں ــ" اس نے مُورتی کو بغور دیکھ کر کہا۔

"ہاں ــ" کمال نے فخریہ جواب دیا۔

پھر وہ بانسوں کے جھنڈ میں سے نکل کر پہاڑی کی طرف بڑھنے لگے۔ سامنے سُرخ پتھر کا تالاب تھا جس کے چاروں اور سُرخ مندر تھے اور سنگِ سُرخ کی چوڑی سیڑھیوں پر برگد کی شاخیں جھکی تھیں۔ چاروں اور ہُو کا عالم طاری تھا۔

تالاب کا چکر کاٹ کر وہ ایک اور کنج میں داخل ہوئے۔ یہاں لڑکیاں ننھی ننھی جھیلوں کے کنارے بیٹھی تھیں۔ جھونپڑوں اور مکانوں پر تُرئی کے زرد پھولوں کی بیلیں پھیلی تھیں۔ درختوں سے معطر پھول گر رہے تھے۔

"یار یہ تو بالکل کسی ترقی پسند بنگالی فلم کا سیٹ معلوم دے رہا ہے۔" کمال نے کہا۔

"بنگال کے گاؤوں سے زیادہ حسین مناظر اور کہاں ہوں گے۔ بنگالی استادوں کے ناول انھی خطوں کے عکاس تھے ــ" نرمل نے جواب دیا۔

وہ پہاڑی کی سیڑھیوں پر پہنچ گئے۔ اب ان کے دونوں طرف بے حد گھنے ٹروپیکل جنگل تھے اور عمیق غار اور کھڈ۔ جگہ جگہ سینکڑوں برس پرانے مٹھ درختوں میں چھپے کھڑے تھے۔ بھورے رنگ کے لرزہ خیز ڈراؤنے معبد جن کی مقفل کوٹھریوں میں جہنت دفن تھے مکمل خاموشی طاری تھی۔ عقیدت مندوں کے روپے سے بنائی ہوئی ہزارہا شکستہ سیڑھیاں پیچ در پیچ خطرناک موڑوں سے گزرتی چوٹی تک چلی گئی تھیں۔ جہاں گندھک کے ذخیرے میں ہزاروں برس سے آگ روشن تھی۔

"سیتا مہارانی کو راون نے لنکا سے لا کر یہاں چھوڑ دیا تھا" پرفلا نے بڑے تیقن اور عقیدت کے ساتھ میٹر آف فیکٹ انداز میں اس طرح مطلع کیا۔ گویا یہ کل کا واقعہ ہے۔

چند سادھو نشیب میں مندروں کے ایک جھنڈ کی طرف جاتے دکھلائی دئے۔ سرل اوپر پہنچ کر ایک درخت سے ٹک گیا۔

اندھیرا گہرا ہو گیا۔ شکستہ سیڑھیوں کے نیچے جھرنا گر رہا تھا۔ شام کے گہرے سناٹے میں پرندوں کی سیٹیاں، پتوں کی سرسراہٹ، پانی کی آواز اور شعلوں کی سنسناہٹ، پجاریوں کے منتروں کی مدھم صداؤں میں گھل مل کر بلند ہوتی گئی۔ بہت دور، نشیب کے گاؤں میں روشنیاں اندھی اندھی ٹمٹما رہی تھیں۔ پرفلا اطمینان سے اُچک کر درخت کی شاخ سے لٹک گیا۔ "صاحب! ذرا دھیان رکھئے گا۔ یہاں اژدھے اور بچھو بہت ہیں۔"

"اچھا۔" سرل نے کہا۔ مگر ان دونوں نے بالکل دھیان نہ رکھا اور مزید سیڑھیاں طے کر کے ایک اور مٹھ تک پہنچ گئے۔

اب سورج ڈوب چکا تھا۔ اس کی کرنیں جو اب تک پہاڑی کے جنگل پر طرح طرح کے رنگ بکھیر رہی تھیں۔ تاریکی میں گم ہو گئیں۔ "اب واپس چلو۔ ہمیں دس بجے کی ٹرین پکڑنا ہے۔" کمال نے یاد دلایا۔

انھوں نے پہاڑی سے اترنا شروع کیا۔ آخری سیڑھی تک پہنچتے پہنچتے ان کو ایک گھنٹہ لگ گیا۔ کیونکہ تاریکی بہت گہری تھی اور ان کے پاس ٹارچ تک نہیں تھی۔ گاؤں کے چائے خانے میں ان کا انتظار ہو رہا تھا۔ وہ اندر جا کر ایک صاف ستھرے

بنچ پر بیٹھ گئے۔ ان کے سامنے چار اور دو دو پیسے والے بسکٹ رکھے گئے۔ میزبان لوگ ذرا شرمائے شرمائے، سہمے سہمے، مہمانوں سے ہٹ کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔

"سرل۔"

"ہاں۔"

"دنیا میں اس چاء خانے سے زیادہ خوبصورت جگہ تم نے کوئی اور دیکھی ہے؟"

"نہیں" سرل نے آہستہ سے جواب دیا۔

پھر وہ باہر نکلے۔ بہت سے لوگ ان کو اسٹیشن تک پہنچانے آئے۔ پرفلا پرانے دستوں کی طرح چپ چاپ اُن کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ گاؤں کے بچوں نے ان سے بخشیش کی خواہش ظاہر نہیں کی۔ پرفلا نے بھی انعام لینے سے انکار کر دیا۔ ایسا لگا جیسے "روپے" کی پیش کش کر کے کمال نے اس کی دل شکنی کی ہے۔

"میں بھکاریوں کی دنیا کا رہنے والا بھکاری ہوں۔ اگر کوئی بھیک مسترد کر دے تو مجھے متعجب نہ ہونا چاہیئے؟" کمال نے کہا۔

"ہاں۔" سرل نے جواب دیا

راستے میں ایک جھونپڑی کے برآمدے میں چراغ جل رہا تھا۔ کمال ٹھٹک گیا۔ دیکھو یہاں کیا ہو رہا ہے۔ انھوں نے اندر جھانکا۔ ایک بوڑھا پھونس ہندو، سفید براق دھوتی اور چادر لپیٹے مٹی کے دیے کی روشنی میں چند بچوں کو بنگالی قاعدہ پڑھا رہا تھا۔ بچے زمین پر بیٹھے تھے۔ گرو کے لئے انھوں نے ایک بوسیدہ چٹائی بچھا رکھی تھی۔ اجنبیوں کو دیکھ کر بوڑھا گھبرا کر باہر نکل آیا اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"تم یہ منظر کبھی بھول سکو گے۔" سرل نے کہا

"نہیں۔" کمال نے جواب دیا۔

وہ اسٹیشن پہنچے۔ ٹرین آئی۔ وہ چٹاگانگ واپس پہنچ گئے۔ جہاں جگمگاتے کلب میں پیٹر جیکسن بار روم میں اُن کا منتظر تھا۔

"آپ سیتا کنڈ ہو کر آ رہے ہیں۔" اس کا رنگ فق ہو گیا۔ "غضب خدا کا معلوم ہے وہ پہاڑی

اژدھوں، چیتوں اور خطرناک ترین بچھوؤں کا مسکن ہے۔ وہاں تو دن کے وقت بھی سمجھ دار آدمی بندوق لئے بغیر نہیں جاتے۔"

"مگر وہاں جو اتنے انسان بستے ہیں وہ ؟" کمال نے اعتراضاً کہا۔

"اجی وہ آئے دن سانپ بچھو کے کاٹے سے مرتے رہتے ہیں اور پھر ان کا کیا ہے۔۔ تو ہیں ہی جنگلی۔ وحشی۔ بن مانس لوگ۔"

دوسرے دن انھوں نے سلہٹ کا رُخ کیا۔ وہاں سے سرل کمال کو راج شاہی لے جا کر پہاڑ پور کے گپتا عہد کی سنگتراشی کے شاہکار دکھانا چاہتا تھا۔ سارے ملک میں چپے چپے پر جو پُرانے مندر، مٹھ، مسجدیں اور درگاہیں بنی تھیں۔ سرل کسی ماہر آرکیالوجسٹ کی طرح ان کے متعلق کمال کو بتاتا رہا۔

"تم کو آرکیالوجی میں کب سے دخل ہو گیا۔" ایک روز باریسال جاتے ہوئے کمال نے اُداسی کے ساتھ اس سے پُوچھا۔

"میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔" سرل نے اسٹیمر کی ریلنگ پر جھک کر سمندر کے ایسے وسیع دریا کی پُرشور لہروں کو دیکھتے ہوئے جواب دیا کہ میرے پاس صرف ماضی ہی ایسی چیز ہے جو محفوظ ہے جسے دوسرے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے۔ جو وقت کی دسترس سے باہر ہے۔ میں خود اب ماضی ہوں۔ تمہاری طرح۔ اور ہندو پاکستان کے یہ پُرانے کھنڈر ہی میرے دوست ہیں۔ میں ان کی زبان سمجھتا ہوں۔ اس دیوانے برصغیر میں صرف وہ ہی میرے ہم نوا ہیں۔ مورخین کے متضاد نظریوں کو مسترد کر کے یہ اپنی رام کہانی مجھے الگ سے سُنا رہے ہیں۔ میں ان کا واحد تن تنہا آڈینس ہوں۔ یہ پتھر میرے دوست رہیں گے۔ کمال۔ خدارا یہ نہ کہنا کہ میں ایک اور مغربی یوروپین برطانوی ڈی جنریٹ ڈیکیڈنٹ انٹلکچوئیل بن گیا ہوں۔ مجھے اب ان لیبلوں کی پرواہ نہیں رہی۔ میں اب سمجھ سکتا ہوں کہ لوگ روم اور بازنطیم میں پناہ کیوں ڈھونڈ رہے ہیں میں نے کائنات سے جو یہ نیا رشتہ قائم کیا ہے اپنی تلخی جذبات کے ذریعے اسے توڑنے کی کوشش نہ کرنا۔"

سلہٹ میں وہ خوبصورت بل کھاتے پہاڑی راستوں پر سے گزرتے ایک روز سرحد تک گئے۔

سامنے لکڑی کا بڑے سے شہتیر کا پھاٹک تھا۔ جس کے ادھر پاکستانی سپاہی مستعد کھڑا تھا۔ شہتیر کے دوسری طرف چند آسامی کاہلی سے کھڑے پان چبا رہے تھے۔ چند قدم پر آسام کی سرسبز پہاڑیاں تھیں۔ جن پر خوبصورت مکان بنے تھے۔ کمال لکڑی کے شہتیر پر کہنیاں ٹیکے دیر تک خاموش کھڑا رہا۔

سلہٹ سے اگلے روز اُنھوں نے سری منگل کا رُخ کیا۔ یہ بہت لمبا سفر تھا۔ ندیاں اور گھنے جنگل اور مولوی بازار کا خوبصورت علاقہ عبور کر کے وہ سرل کے مستقر پر پہنچے۔ ایک نیچے سے ٹیلے پر سرل کا بنگلہ تھا۔ جس کی روشنیاں دُور سے نظر آرہی تھیں۔ اب رات ہو چکی تھی۔

یک لخت کمال نے محسوس کیا کہ اس کا جانا پہچانا سرل کسی پُراسرار طریقے سے پل کی پل میں بڑے صاحب میں تبدیل ہو گیا ہے۔ کار روک کر وہ سر اٹھائے سامنے کی اونچی برآمدے کی سیڑھیاں چڑھا اس کے ملازمین کی پلٹن استقبال کے لئے لپک کر آگے بڑھی۔ برآمدے کے نیچے کھڑے ہوئے چند مزدوروں نے جھک جھک کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑے اُس نے آواز دی — "عبدالرحمٰن — غسل کا پانی لگاؤ —" پھر وہ کمال کو ساتھ لئے گیسٹ روم کی طرف بڑھا۔

"یہ تمھارا کمرہ ہے۔" اُس نے کہا۔

بنگلہ شیر کی کھالوں اور چیتے اور بارہ سنگھے کے سروں اور بیش قیمت ساگوان کے فرنیچر سے مزین تھا۔ کمال کو محسوس ہوا۔ وہ ۱۹۲۵ء کے ہندوستان میں داخل ہو گیا ہے اسے گلفشاں شدت سے یاد آئی اور اس کا دوسرا مکان خیابان جو دہرہ دون میں تھا۔ عبدالرحمٰن کو دیکھ کر اسے امیر خاں کا خیال آیا۔ سرل نے ڈرائیور کو پکارا تو کمال نے محسوس کیا۔ شاید میاں قدیر لپکے ہوئے آئیں گے۔

جلاوطنی — جلاوطنی — خداوندا — تُو نے مجھے کیوں جلاوطن ہونے دیا — کمال نے آرام کُرسی پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

ڈائننگ روم میں بیرے نے کھانا لگانا شروع کیا۔ سارے ملازمین اپنی اپنی جگہوں پر اِس سُرعت سے مصروف ہو گئے

بنگالی منشی جی مزدوروں کا حساب کتاب لے کر برآمدے میں ٹہل رہے تھے ٹریڈ یونین کا ایک فرد بہت دیر سے سرل کے انتظار میں برساتی کی سیڑھیوں پر بیٹھا تھا۔ ملازمین کا دستہ سرل کے غسل خانے سے برآمد ہونے کا منتظر تھا۔ بیرہ۔ خانساماں۔ خدمتگار بوائے۔ اس کا پورٹیشین کلرک رالف جوزف برآمدے میں کاغذات لئے کھڑا تھا۔ سرل صاحب کئی دن بعد لوٹے تھے اور بہت سے ضروری کاغذات پر ان کے دستخط درکار تھے۔ کئی چپراسی ادھر اُدھر موجود تھے۔ ایک تن تنہا سرل۔ اور اس کے ذاتی عملے میں ان گنت آدمی شامل تھے۔ مالی اور گراس کٹ اور سائیس اور بہشتی۔ چوکیدار۔ دریا پر اس کی اپنی موٹر لانچ تھی۔ اس سلطنت کا جو سری منگل میں دُور دُور تک پھیلی تھی۔ سرل اپنے بڑے بھائی لارڈ بارن فیلڈ کی شرکت کے ساتھ مالک تھا۔ وہ چاہتا تو ان سب کو اُلٹا لٹکا کر پٹوا سکتا تھا۔ وہی سرل جو کچھ عرصہ قبل کیمبرج میں بودلیئر اور ایلیٹ کی کتابیں لئے گھوما کرتا تھا اور کوہ لوز میں مائیکل کے ساتھ جا کر آلو کھاتا تھا۔

صبح سات بجے چوکیدار نے بنگلے کے ہال کا دروازہ کھولا۔ دھوپ جھلملیوں میں سے چھن چھن کر اندر آنے لگی تو سرل اپنی مسہری سے اُٹھا۔ کمال اپنے کمرے سے نکل آیا تھا اور ڈریسنگ گاؤن پہنے برآمدے میں کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ "یادِ صبح دھن دے رہی تھی ہوا داغِ دل پھول بن بن کر کھلنے لگے۔ میری پلکوں پہ بہارِ کمال آگیا۔" اُس نے زیرِ لب کہا اور لمبا سانس بھر کر ڈرائینگ روم میں داخل ہوا۔ جس کی دیواریں مُکل ڈے، اتل بوس، آبانی سین، رضا، اور حسین کی پینٹنگز سے مزین تھیں۔ کونوں میں تانبے کے مجسمے رکھے تھے۔ الماریوں میں کتابیں چنی تھیں۔ بریکفاسٹ کے بعد وہ سرل کے ساتھ باہر نکلا۔ سرل نے سولا ہیٹ پہنی۔ وہ دونوں کار میں سوار ہوئے۔ پیٹر جیکسن اور رالف جوزف کی قیادت میں منشیوں اور کارکنوں کا جلوس جیپ گاڑیوں میں پیچھے پیچھے چلا۔ سرل نے کمال کو اپنی فیکٹری دکھائی جہاں چائے کی پتیاں تیار کی جا رہی تھیں۔

دوپہر کو لنچ کے لئے وہ کلب گئے اور چند ساتھی پلانٹرز سے نارائن گنج کی شیئر مارکیٹ کے اس روز کے نرخ پر سرل نے تبادلہ خیالات کیا۔ اسٹیسمین اور امرت بازار پتریکا اور ڈھاکے

کے مارننگ نیوز پر نظر ڈالی۔ ابھی کھانے سے قبل بیئر کا دور چل رہا تھا کہ دفعتاً کمال غائب ہو گیا۔

"مسٹر رضا کہاں گئے؟" برآمدے میں آکر سرل نے بیئرر سے پوچھا۔

"پتہ نہیں۔ ابھی میں نے ان کو نورالاسلام چودھری کے ہمراہ باغوں کی طرف جاتے دیکھا ہے۔"

"نورالاسلام چودھری؟" سرل خاموش ہو گیا۔

چودھری مزدوروں کا نمائندہ تھا اور رات سرل سے ملنے آیا تھا مگر سرل نے اس سے ملنے سے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا کہ صبح دفتر میں آئے۔

سرل کار میں بیٹھ کر کمال کو ڈھونڈنے کے لئے نکلا۔ اپنی ٹی اسٹیٹ میں پہنچ کر وہ خاموش سایہ دار سڑکوں پر چکر لگاتا پھرا مگر کمال کا کہیں پتہ نہ تھا۔ آخر اکتا کر اس نے ایک جگہ کار روک لی اور بے دھیانی سے جھاڑیوں کی طرف چلنا شروع کیا۔ موسم بے حد سہانا تھا۔ پرندے درختوں میں چہچہا رہے تھے۔ شاخوں میں سے چھنتی ہوئی دھوپ نے چائے کی جھاڑیوں پر طرح طرح کے نقش بنا دئے تھے۔ چوڑیوں کی جھنکار پر اس نے معاً نظر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ ایک پوربن لڑکی بڑے ماہرانہ انداز میں پتیاں توڑ رہی تھی۔ بڑے صاحب کو دیکھ کر اس نے جلدی سے گھونگٹ کاڑھ لیا۔ سرل مسکرایا۔ اس نے خیالات کے دھارے میں بہتے بہتے ایک لمحے کے لئے ساحل پا کر سوال کیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"ہمرا نام؟ — چمپا۔"

"چمپا۔" اس نے اس طرح دہرایا گویا یہ نام آج پہلی مرتبہ سنا ہے — "چمپا۔ اچھا نام ہے —" یہ کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈھیلے ڈھالے قدم رکھتا پھر کار کی طرف لوٹ آیا۔

لڑکی ذرا تعجب سے اسے درختوں کی دھوپ چھاؤں میں اوجھل ہوتا دیکھتی رہی۔ وہ اور اس کی پچھلی نسلیں ہر طرح کے انگریزوں کو دیکھتی آئی تھیں۔ سنکی۔ بد دماغ۔ بیہودہ۔ بے حد وارد

پینے والے ۔

یہ والا بڑا صاحب سنکی تھا۔

کلب واپس آکر وہ دھڑام سے ایک آرام کرسی پر گر گیا۔ سامنے دیوار پر ملکہ الزبتھ کی تصویر آویزاں تھی۔ ایک تصویر میں شیر کے شکار کا سین تھا۔ ایک میم سفید ٹوپ پہنے احمقوں کی طرح بندوق سنبھالے ہودے پر بیٹھی تھی۔ برابر میں مہاراجہ کوچ بہار رونق افروز تھے۔ میم کی شکل میں اسے اپنی دادی لیڈی بارن فیلڈ کی جھلک نظر آئی جو پچاس برس قبل اکثر ہندوستان آکر مہاراجاؤں کے ساتھ ٹائیگر شوٹ سے شغل کیا کرتی تھیں۔ گڈ مارننگ۔ گرینی — آج کی صبح تم کیسی ہو؟ اُس نے دل میں کہا۔ اور پھر سوچنے میں مصروف ہو گیا۔ کہ کمال اس وقت کہاں ہوگا۔

شام کو سرل نے کمال کے اعزاز میں ایک مخصوص سے ڈنر کا انتظام کیا تھا۔ اس کی غیر موجودگی ہی میں سرل نے پلانٹر مہمانوں کو ڈنر کھلایا اور برج کھیلا۔

بہت رات گئے کمال، سرل کے بنگلے پر واپس لوٹا۔ سرل اس کے انتظار میں ڈرائینگ روم میں بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔

"آپ کہاں تشریف لے گئے تھے؟"

"کہیں نہیں۔ ادھر اُدھر گھوم رہا تھا۔"

"مزدوروں کی بستی گئے تھے؟"

"ہاں۔"

"میرا یہی خیال تھا۔"

"تم ناراض ہو —؟"

"نہیں تو۔ تم بھی اس نظام میں اتنی ہی حد تک شامل ہو جتنا میں۔ ناراضگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"یہاں مزدوروں کو صرف ایک روپیہ چار آنے روز مزدوری ملتی ہے؟"

"ہاں۔"

"کوئی ٹریڈ یونین نہیں ہے؟"

"نہیں ہے۔"

"کوئی کمیونسٹ عناصر؟"

"پتہ نہیں۔"

"بکواس مت کرو۔ تم کو سب پتہ ہے۔"

"کمال کائنات کی ذمے داری کا بوجھ میں نے بھی بہت دنوں اٹھائے رکھا۔ آخر اسے اُتار پھینکا۔ تم بھی اس بوجھ سے سبکدوش ہو چکے ہو۔ پھر اس ہٹ دھرمی کا کیا فائدہ۔ اس طرح کیا تم اپنے ضمیر کو تسکین دینا چاہتے ہو کہ تم مجرم نہیں؟ تم بہت بڑے مجرم ہو کمال رضا — مجھ سے کہیں بڑے مجرم —"

کمال خاموش رہا۔ سرل نے اٹھ کر اس کے لئے وہسکی اور گلاس نکالا۔

"پھر میں تمہارے جیسے ایک نہایت چُغد انسان سے ملا۔ وہ بھی تمہارے ساتھی پلانٹر ہیں۔ شری نہار رنجن داس گپتا —" کمال نے کہا۔

"داس گپتا — اس سے تم کہاں ملے۔ واپس کلب گئے تھے؟"

"نہیں۔ میں پیدل ایک پگڈنڈی پر سے آرہا تھا۔ میرا اسپوٹ بوٹ دیکھ کر انھوں نے لفٹ دینے کے لئے کار روک لی۔ وہ ہی مجھے تمہارے مکان تک چھوڑ گئے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا تمھاری طرح کے رئیس ابن رئیس ہیں۔"

سرل نے وہسکی دو گلاسوں میں انڈیلی۔ کمال کہتا رہا —" میں نے ان سے پوچھا آپ ترکِ وطن کا ارادہ نہیں رکھتے۔ قہقہہ لگا کر ہنسے۔ فرمایا — آپ بھی حد کرتے ہیں۔ انڈیا گورنمنٹ ہر چیز کو قومی ملکیت بنانے پر تلی ہوئی ہے۔ سرمایہ داروں پر دھڑا دھڑ بھاری بھاری انکم ٹیکس لگائے جا رہے ہیں۔ وہ الگ۔ میرا دماغ خراب ہوا ہے جو ترکِ وطن کر دوں گا — یہ صاف گوئی قابلِ تعریف تھی۔"

سرل خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔" میں تم کو پھر بھی دلائے دوں گا — دُنیا بھر کی ہر چیز میں ناک ڈبونے کی جو تمھاری عادت ہے اُسے خدارا اب چھوڑ دو۔ ورنہ آفت میں

پھنسو گے۔"

کمال وہسکی کے بلبلوں کو دیکھتا رہا۔

دوسرے روز صبح وہ راج شاہی روانہ ہو گئے۔ کئی دن تک اس خوبصورت ضلع کی وسعتوں میں خاک چھانتے پھرے۔ دور افتادہ سنتھال گاؤں میں پہنچے جہاں راستے اتنے خراب تھے کہ کئی بار اُن کی جیپ اُلٹتے اُلٹتے بچی۔ سنتھالوں نے کمال کو اور زیادہ مغموم کر دیا۔

"ان بے چاروں کے لئے تو میں ذہن میں بڑا رومینٹک تصور لئے بیٹھا تھا۔ لوک ناچ اور زین العابدین کی مشہور و معروف آبی رنگوں کی تصویر اور جانے کیا کیا۔"

"اور اصلیت میں بوجہ اپنے افلاس یہ درختوں کی جڑیں کھاتے ہیں اور جنگلی جانوروں کی طرح زندہ ہیں —؟ ہے نا —؟" سرل نے جیپ چلاتے چلاتے مڑ کر کہا "میرا بھی شروع میں قدم قدم پر یونہی دل ٹوٹا تھا۔"

"جوتی یہاں نہیں آیا اپنی مُووی بنانے کے لئے۔" کمال نے کہا۔

"یہاں بھی آجائے گا۔" سرل نے اطمینان سے جواب دیا۔

سنتھالوں سے بھی ان دونوں کا بڑا دوستانہ ہو گیا۔ جس روز وہ لوگ واپس لوٹ رہے تھے ایک گاؤں میں سارے سنتھال ان کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ ایک سیاہ فام بےحد دلکش لڑکی نے آگے بڑھ کر گیندے کے ہار ان کے گلے میں ڈالے اور ہاتھ جوڑ کر ان کے آگے جھکی۔ ان کا مکھیا جس کی ٹانگ کٹی ہوئی تھی جس سے اس نے لاٹھی باندھ رکھی تھی ان کے اعزاز میں اپنی اکلوتی تار تار قمیص پہن کر ان کو رخصت کرنے بستی کے موڑ تک آیا۔ ایک نوجوان نے تالاب میں سے سُرخ کنول نکال کر سرل کو پیش کیا۔

رات کو وہ راج شاہی کے سرکٹ ہاؤس واپس پہنچے تو ڈرائینگ روم میں سے چند امریکنوں کی آوازیں آئیں۔

جوتی سنتھالوں کے متعلق ایسٹمین کلر میں ڈاکومنٹری بنانے کے لئے پہنچ چکا تھا۔

سرکٹ ہاؤس کے پہلو میں گنگا بہتی تھی۔ دوسرے کنارے پر مرشد آباد تھا۔

آباد —؟ سراج الدولہ —؟ کرنل کلائیو —؟ کیا بیکار کی باتیں ہیں

وہ سُنو۔ زن سے گولی چلی — کوئی اور آسمگر مارا گیا۔ وہ دونوں گھپ اندھیری رات میں گنگا کے کنارے کنارے خاموش سڑک پر ٹہلا کرتے۔ اور آگے بڑھ کر ضلع کے اعلیٰ حکام کی کوٹھیاں تھیں۔ اس کے بعد بازار۔ چھوٹے چھوٹے چوراہے۔ گلیاں۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے اُداس مکانات۔

"مکان کیسی کیسی کہانیاں سُناتے ہیں۔" سِرل نے پھر دُہرایا۔

سایہ دار کنجوں میں بڑے بڑے ہندو زمینداروں کی حویلیاں اور کوٹھیاں چھپی ہوئی تھیں۔ جن میں سے بیشتر سُنسان پڑی تھیں۔

"سُنا ہے زمینداری ختم کردی گئی ہے۔" کمال نے کہا۔

سِرل نے اسے پھر دیکھا۔ "اب تم نے پھر ناک ڈبونا شروع کی —" اُس نے ڈانٹا۔

وہ اسٹیشن واپس جارہے تھے۔

ڈھاکے واپسی میں پھر ٹرین دریا کے گھاٹ پر رُکی۔ مسافر اُتر کر اسٹیمر پر سوار ہوئے۔ ٹرین کا تجارتی مال اتار کر اسٹیمر پر چڑھایا گیا۔ یہاں کرین نہیں تھے۔ سینکڑوں قلیوں نے آوازیں لگا لگا کر سامان ڈھونا شروع کیا۔ اس طرح کی صداؤں کو کمال نے IPTA والوں کے ساتھ خود کورس میں گایا تھا اور ترقی پسند فلموں میں اس طرح کے گیت سُنے تھے مگر اب اسے معلوم ہوچکا تھا کہ سارا مشرقی بنگال ایک نہایت شدید حقیقت پرست، ترقی پسند فلم کے مناظر کا بہت بڑا SEQUENCE ہے۔

جہاز پر داڑھیوں والے چند بوڑھے اور برقعہ پوش عورتیں آکر تھرڈ کلاس کے فرش پر بیٹھ گئیں۔ یہ بھی بڑا ترقی پسند فلموں والا منظر تھا۔ بے شمار بوڑھے ہندو اور مسلمان، شالیں اوڑھے، ان کی لڑکیاں اور بہوئیں گود میں بچے اُٹھائے گینگ وے پر سے گزرتی سیکنڈ کلاس میں ٹھنس رہی تھیں۔

اب فرسٹ کلاس میں لوگ آ آ کر بیٹھنا شروع ہوئے۔ کیبن میں گئے۔ ڈیک پر کھڑے ہوئے۔ دوربینیں اور کیمرے نکالے گئے۔ اخبار کھولے گئے۔ دو اسمارٹ بیگمات نے ٹہلنا شروع

کر دی۔ چند امریکن جو کسی دُور افتادہ ضلع میں یُو ایس آئی ایس کی شاخ کھولنے جا رہے تھے۔ ایک نوجوان طالب علم سے مصروفِ گفتگو ہو گئے جو تعطیلات کے بعد ڈھاکے واپس جا رہا تھا۔ ایک طرف دو بنگالی مولانا عوامی لیگ کی سیاست پر تبادلہ خیالات کر رہے تھے۔ ڈھاکے کا ایک اُردو اخبار نویس یو ایس آئی ایس والوں کی دعوت پہ بحیثیت ان کے مہمان ان کا ہمسفر تھا۔ ایک اعلیٰ افسر کیبن میں بیٹھے تھے۔

کمال جہاز کے اس منظر کو دیکھتا رہا۔

یہ کیسا جھمیلا تھا؟ یہ کیسی دُنیا تھی جو وجود میں آ گئی تھی؟ یہ گتھی کس نہج پر سلجھے گی؟ اور اس سارے کھیلے میں کتنی لاکھوں جانیں تلف ہوئیں۔ کتنے گھر لٹے۔ کتنے لاکھوں انسان خانماں برباد اور جلاوطن ہوئے اور کتنے کروڑوں انسان جو پہلے بھوکے مرتے تھے اب بھی بھوکے مرتے ہیں۔

کمال ریلنگ پر جھک کر اُفق کو دیکھتا رہا۔ جہاں تک صرف پانی ہی پانی تھا۔ عظیم دریا۔ عظیم ملک۔ عظیم انسان —— کیا یہ سارے انسان عظیم نہیں جو سلاخوں کے ادھر مُرغیوں کی طرح ٹھنسے بیٹھے تھے—؟

اُردو اخبار نویس ٹہلتے ہوئے کمال کے پاس آئے اور اپنا تعارف کرایا۔

"آپ بھی مغربی پاکستان سے تشریف لائے ہیں؟" اُنھوں نے پان کی ڈبیا نکالتے ہوئے دریافت کیا۔

"جی —" کمال نے مختصراً جواب دیا۔

"کراچی —؟"

"جی۔"

اُنھوں نے دوبارہ کمال سے ہاتھ ملایا۔ "صاحب ہم تو یہاں یوں سمجھے کہ کالے پانی میں پڑے ہیں۔ اپنے ہم جنسوں کے لئے بسا اوقات آنکھیں ترس جاتی ہیں (یہ مغربی یُو۔پی کے رہنے والے تھے) سچ عرض کرتا ہوں قبلہ۔ اس خطّے کو تو علیحدہ کر دینا ہی مناسب ہے۔ بالکل نتھنوں میں دم کر رکھا ہے ہمارا۔ ان لوگوں نے —"

ایک نوجوان سرک سے باتیں کرتا قریب سے گزرا۔ اخبار نویس اک ذرا کی ذرا رُکے۔ جب وہ آگے چلا گیا تو بولے "— دیکھا آپ نے — انگریزی کیا لاجواب بولتے ہیں۔ بات کرنے کی تمیز نہیں۔ بس آ گئے جُوٹ کوٹا میں —"

"جُوٹ کوٹا —" کمال نے حیرت سے دُہرایا۔ اُس نے یہ اصطلاح آج ہی سُنی تھی۔

"جی ہاں صاحب — آپ کا قیام ڈھاکے میں ہے؟ شاہ باغ — ؟ اچھا کہیں اور ٹھہرے ہیں —"

اب اعلیٰ افسر بھی کیبن سے باہر نکل آئے۔ اُنھوں نے کمال کو سگریٹ پیش کیا۔ دریا کا پانی سُورج کی کرنوں میں سونے کا رنگ کا ہو گیا تھا۔ برابر سے ایک جوٹ کی بار برداری کرنے والی سیاہ رنگ کی مہیب کارگو بوٹ بڑی تمکنت سے تیرتی ہُوئی نکل گئی۔ کمال مسحور ہو کر اسے دیکھتا رہا۔

"کس قدر حسین منظر ہے —" اُس نے اپنے آپ سے کہا۔

"جی ہاں —" اعلیٰ افسر نے کہا۔ "ان مناظر کی پبلسٹی کرنے کے علاوہ آپ کی مرکزی حکومت کو اور کوئی کام بھاتی نہیں دیتا۔ مگر بس دُور ہی سے یہ نظارے سہانے معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں رہنا پڑے آپ کو تو اصل حقیقت کھُلے — ہم کو دیکھئے — تین سال سے اس وحشی علاقے میں گویا قیدِ تنہائی کی سزا بھگت رہے ہیں —"

"قیدِ تنہائی — ؟"

"جی ہاں اور کیا۔ بالکل بیک ورڈ مُلک ہے یہ۔ ذرا یہاں کے باشندوں سے آپ کو سابقہ پڑے تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو گا۔ ایک سے ایک کاہل۔ سازشی متعصب اور بے ایمان۔ ان پر حکومت کرنا اور ان کو قابو میں رکھنا بڑا دل گُردے کا کام ہے —"

کمال کو یاد آیا۔ اٹھارھویں انیسویں صدی کے انگریزی سفرناموں میں اہلِ بنگالہ اور عموماً سارے نیٹوز کے لئے یہی الفاظ پڑھے تھے۔ اسے لگا گویا وہ اٹھارھویں صدی کے کسی انگریز کلکٹر کی معیت میں سفر کر رہا ہے۔

"یقین فرمائیے۔" اعلیٰ افسر نے بات جاری رکھی۔ جس روز یہ خطہ پاکستان سے علیحدہ ہوگا۔ میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کروں گا اور خوشی کے مارے سات روز تک ڈرنک رہوں گا۔ ان کی ہر شے ہم سے مختلف ہے۔ غیر اسلامی زبان بولتے ہیں۔ وزیراعظم کو پردھان منتری اور امن کو شانتی کہتے ہیں۔ سنسکرت سے اپنا ناطہ جوڑ رکھا ہے۔"

بیرے نے چاء لا کر میز پر رکھی۔ "جہاج جگن ناتھ گھاٹ کو بے پہنچے؟"

کمال نے اس سے پوچھا۔ "امرا اونی کھن وھورے جھاجے ردئے چھی۔"

اخبار نویس اور اعلیٰ افسر دونوں نے اسے چونک کر دیکھا۔

"معاف کیجئے گا۔ آپ کے لب و لہجے سے میں سمجھا تھا کہ آپ بھی لکھنؤ کی طرف کے ہیں۔" اخبار نویس نے کہا۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔" کمال نے مسکرا کر جواب دیا۔

"جناب کا اسم شریف تو اب تک پوچھا ہی نہیں"

"سید کمال رضا۔"

"آپ مٹیا برج کے نواب علی رضا بہادر کے خاندان سے تو تعلق نہیں رکھتے؟"

"جی ہاں۔ انہی کے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔"

"اوہو — ہو — ہو — بڑی خوش قسمتی ہے میری کہ جناب سے ملاقات ہو گئی"

اخبار نویس نے تیسری بار کمال سے مصافحہ کیا۔ "کیا لوگ تھے۔ صاحب کیا خاندان تھا۔ لکھنؤ کی کلچر کی آخری یادگار تھے یہ حضرات۔ ٹمٹکتے ہیں۔ واہ — واہ — وہ زمانے ہی خواب خیال ہو گئے۔ سنا ہے نواب عباس رضا بہادر کا بھی انتقال ہو گیا۔"

"جی ہاں۔"

اعلیٰ افسر کی بیگم اور سالی گوگلز لگائے آرام کرسیوں پر دھوپ کے رخ بیٹھی تھیں۔ سالی فلم فیئر کے مطالعے میں مشغول تھی۔ ترل مقابل کی ریلنگ پر جھکا کھڑا تھا۔ اس کے سنہرے بال سورج کی کرنوں میں سونے کی طرح جگمگا رہے تھے اور وہ غیر معمولی طور پر حسین نظر آرہا تھا۔

زینے کے دوسری جانب سیکنڈ کلاس کا عرشہ تھا۔ ایک سیاہ فام اینگلو انڈین لڑکی جالی سے ٹیک لگائے بیٹھی ٹرو اسٹوری میگزین کے مطالعے میں مصروف تھی۔ اس کے قریب فرش پر اس کا بڑا سا دار جلنگ کا بنا ہوا بیگ رکھا تھا۔ جس میں اس کی نٹنگ، میک اپ کا سامان، اور ایک ٹافی کا ڈبہ رکھا تھا۔ اسی بیگ میں چند ہالی ووڈ کے فلمی رسالے اور برطانیہ کا زنانہ رسالہ "وومن" اور ایک رومانی ناول ٹھنسا ہوا تھا۔ ناول کی چمکدار کاغذی سرورق پر ایک سنہرے بالوں والا ہیرو، نائیلون کے نائٹ گاؤن میں ملبوس ہیروئن کو گلاب کا پھول پیش کر رہا تھا۔

لڑکی نے کچھ دیر بعد سنہرا رومانی ناول نکالا۔ سرورق کے ہیرو کو دیکھتے دیکھتے اس کی نظر پھر ہینڈسم انگریز تک پہنچی جو جالی کے ادھر ریلنگ کے سہارے کھڑا بالکل رلن برانڈو معلوم دے رہا تھا۔ لڑکی نے ایک لمبا سانس لیا اور پھر ناول پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔

اس سانولی سلونی لڑکی کا پورا نام مس مارگریٹ ازابل کرسٹینا ٹینرڈیل تھا۔ یوں اس کے بوائے فرینڈز اور فرینڈز اسے میگی کہتے تھے۔ گو اس کے اتنے لمبے چوڑے نام کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ خاندانی روایت کے مطابق اس کی پردادی مارگریٹ ازابل، سر سرل ایشلے کی اور ایک نیٹو عورت کی اولاد تھی۔ سر سرل ایشلے پچھلی صدی کے بنگال کے بہت نامور آدمی تھے۔ قحط کے زمانے میں اس کی ماں ڈھاکے سے کلکتہ آکر نواب ایشلے کے حرم میں داخل ہوئی۔ مارگریٹ ازابل نے بڑے ہو کر کانپور چھاؤنی کے سارجنٹ جارج ٹینرڈیل سے شادی کر لی تھی جو اصل نسل گورا تھا اور بوجہ کثرت شراب نوشی جوانی ہی میں خدا کو پیارا ہوا۔ چنانچہ مارگریٹ ازابل اپنے بچوں کو لے کر پھر کلکتہ واپس آ گئی اور اس کا خاندان کلکتے کے نچلے طبقے کی اینگلو انڈین سوسائٹی میں رل مل گیا۔

میگی ٹینرڈیل کے ماں باپ دونوں مر چکے تھے۔ وہ گریٹ ایسٹرن ہوٹل میں ٹیلی فون آپریٹر تھی اور بھٹی سے کہ اپنی بیمار خالہ کو دیکھنے آئی ہوئی تھی جو بمبئی میں رہتی تھی۔ اب وہ بمبئی سے کلکتے واپس جا رہی تھی۔

وہ ناول کے کلائیمکس تک پہنچی ہی تھی جس میں ہیرو اسپین جا کر ہیروئن کو ایک بدمعاش کاؤنٹ کے چنگل سے چھڑانے والا ہے کہ اسٹیمر کی سیٹی نے اسے چونکا دیا۔ اس نے

سر اُٹھا کر دیکھا۔ گھاٹ قریب آ رہا تھا۔ مسافر اپنا اپنا سامان سمیٹ رہے تھے۔ فرسٹ کلاس کے عرشے پر کھڑا ہُوا ہیرو بھی ہجوم میں غائب ہو چکا تھا۔ اس کا دل ڈوب سا گیا۔ اُس نے جھک کر اپنی سینڈل کے تسمے باندھے۔ اپنے رنگین پھولدار اسکرٹ کی سلوٹیں ٹھیک کیں۔ آئینے میں اپنے بالوں کے کرل سنوارے اور بیگ اور رسالے سنبھال کر اُٹھ کھڑی ہُوئی۔

سرل اور کمال جہاز سے اتر کر کنارے پر پہنچے۔ مسافروں اور قلیوں کا جمِ غفیر ٹرین کی طرف بڑھا جو گھاٹ سے کافی فاصلے پر کھڑی تھی۔ گھاٹ پہ ہندو عورتیں اشنان میں مشغول تھیں۔ چاروں طرف اہلِ ہنود کی ریل پیل تھی۔ متوسط طبقے کے خوشحال ہندو مرد اور عورتیں غریب طبقے کے بدحال ہندو مرد اور عورتیں۔ کمال اٹیچی کیس اُٹھائے سرل کے ساتھ ساتھ پٹری پر چلتا رہا۔ "ان اضلاع میں ہندوؤں کی آبادی زیادہ ہے۔" سرل نے کہا۔

"یہاں کس قدر سکون ہے ___" کمال نے دوبارہ کہا۔ "دراصل میری سائیکولوجی اتنی خراب ہو گئی ہے۔ میرے ذہن اور اعصاب پر ہندو مسلم پرابلم اس تکلیف دہ شدت سے مسلّط ہے۔ جب میں ان دونوں فرقوں کو کہیں پُرسکون انداز میں اکٹھے زندگی گزارتے دیکھتا ہوں تو یقین نہیں آتا۔ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہاں فساد کیوں نہیں ہو رہا۔"

چڑھائی پر کالی اینگلو لڑکی سر جھکائے اس کے آگے آگے جا رہی تھی ٹرین کے نزدیک پہنچ کر اُس نے اپنا اٹیچی کیس زمین پر رکھا اور رومال سے چہرہ پونچھنے لگی۔ قریب سے گزرتے ہوئے سرل نے اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈالی اور اپنے کمپارٹمنٹ کی طرف بڑھ گیا۔

ڈھاکے پہنچ کر کمال اور سرل اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ روز شام کو وہ کلب میں ملتے اور اکٹھے اپنی جائے قیام پر واپس لوٹتے۔ کام ختم کرنے کے بعد سرل ڈھاکے کی گلیاں اور کوچے کھدرے کھنگالتا پھرتا۔ تنگ و تاریک گلیوں میں سے گزرتی ہوئی جھلملیوں والی بند گھوڑا گاڑیوں کو دیکھ کر فوراً ٹیگور اور ستیا دیوی کے ناولوں کا حوالہ دیتا۔ پیچ در پیچ قدیم محلّوں میں سے نکلتے ہوئے ارمنی ٹولہ کے چار سو سال پرانے قبرستان میں جا کر اُس نے سارا دن ارمنی تاجروں کی قبروں کے کتبے پڑھنے میں گذارا۔

اسٹیٹ بینک کی عمارت کے جنوب میں پیلی باڑی دکھا کر اس نے کمال کو بتایا۔ کہ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا اولین گورنمنٹ ہاؤس تھا۔

ایک روز وہ نمتلا گھاٹ گئے۔ جہاں دریا کے کنارے ایک شکستہ، کھنڈر ایسی دو منزلہ کوٹھی میں بلبل اکیڈیمی قائم کی گئی تھی۔ ہال کے دروازے کے اوپر بلبل کی تصویر آویزاں تھی جس پر پھولوں کا ہار پڑا تھا۔ ہال میں اندھیرا تھا۔ اندر اور اوپر کی منزل میں بڑے بڑے ڈھنڈار لق و دق شکستہ کمرے پڑے بھائیں بھائیں کر رہے تھے۔ زینے کی لکڑی پر برما کا انتہائی خوبصورت نقش و نگار کا کام بنا تھا۔ وہ سارے کمروں میں گھومتے پھرے۔ نیچے ایک کمرے سے گھنگھروؤں کی آواز آئی۔ وہ دونوں اندر گئے۔ جہاں ایک اور خستہ حال کمرے میں جس کی دیواروں سے پلاسٹر گر رہا تھا اور جس کا اینٹوں کا فرش جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ ایک چھوٹی سی دری بچھی تھی اور چند موسیقار ناچ کی گت بجا رہے تھے۔ چار پانچ لڑکیاں بنگالی طرز کے رقص میں مصروف تھیں۔ ایک بوڑھا چیونس لمبی سفید داڑھی والا بنگالی مسلمان ما‌ٔن بجا رہا تھا۔ دبلے پتلے تری سوشل کمار میترا اچک اچک کر لڑکیوں کو ناچ سکھلانے میں مصروف تھے۔ کمال دروازے کی چوکھٹ میں مسحور کھڑا یہ منظر دیکھا کیا۔ اس شکستہ کمرے میں، اس ویران جگہ پہ، یہ چند لوگ جوان بوڑھے، باہر کی دنیا کے سارے دکھ اور کمینے پن اور ظلم و ستم اور مجبوریوں اور پریشانیوں کو فراموش کر کے تھوڑے سے لمحات کے لئے تال اور سُر میں کھوئے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی نے نوواردوں پہ توجہ نہیں دی اور ناچنے اور ساز بجانے میں مصروف رہے۔ کمال دبے پاؤں وہاں سے لوٹا اور وسطی ہال عبور کر کے پچھلے پورٹیکو کی طرف گیا۔ دو لڑکیاں ماتھے پر کُم کُم کے بڑے بڑے ٹیکے لگائے دریا کے رُخ، شکستہ سیڑھیوں پہ خاموش کھڑی تھیں۔ سامنے ایک گائے گھاس چر رہی تھی۔ احاطے کی دیوار کے نیچے کشتیاں بندھی تھیں۔ اوپر کی منزل میں برآمدے کے جنگلے پر دھوتیاں دھوپ میں سکھانے کے لئے پھیلی تھیں اور پتیل کی گڈویاں چم چما رہی تھیں۔ یہاں کتنی بے پناہ، اتھاہ اداسی تھی۔ ان سب لوگوں کے چہروں پر کیسا الم برس رہا تھا۔ یا ممکن ہے۔ وہ سب بے حد بشاش ہوں۔ کمال ہی کو ہر شے میں غم نظر

آتا تھا۔ وہ سرل کو آواز دیتا ہوا باہر نکل آیا۔ وہ نواب پور روڈ کی رکشاؤں چھکڑا ایسی بسوں فقیروں کی ٹولیوں اور یونیورسٹی کے طلباء کے ایک احتجاجی جلوس میں سے گذرتے رمنا کی طرف واپس لوٹے۔

ریس کورس کی سڑک پر ڈھاکہ کلب جگمگا رہا تھا۔ آج وہاں گیسٹ نائٹ تھی۔ اعلےٰ طبقے کی موٹریں باہر کھڑی تھیں اور بال روم میں بیگمات رقصاں تھیں جو کلکتے سے ساریاں خرید کر لاتی تھیں اور جن میں سے اکثر کے بچے دارجلنگ اور شیلانگ کے انگریزی اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ لاؤنج میں بڑے بڑے تاجر اور مل اونر بیٹھے تھے۔

ذرا آگے بڑھ کر نیا شاہ باغ ہوٹل تھا جس میں امریکنوں کی فراوانی تھی۔

دوسرے روز وہ سرل کے ہمراہ لانچ کے ذریعے بوڑھی گنگا پر سرکاری کام سے ایک اور ضلع کی سمت جا رہا تھا۔ سرل کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھتا رہا۔ پھر معاً اُس نے مُڑ کر کمال کو مخاطب کیا —

"وہ سامنے درختوں کے جھنڈ دیکھتے ہو —؟"

"ہاں۔"

"یہ بکرم پور ہے۔ یہاں سروجنی نائیڈو اور بی سی رائے وغیرہ کے بے حد خوبصورت گارڈن ہاؤس ہیں اور بے حد خوبصورت مناظر ہیں۔ یہ گاؤں اب سنسان پڑے ہیں۔ ان کے باسی مغربی بنگال ہجرت کر گئے — چلتے ہو دیکھنے —؟"

"میں قبرستانوں کی زیارت کرتے کرتے عاجز آ گیا ہوں۔ کیا تم مجھے جینے نہیں دو گے"

"نہیں۔" سرل نے جواب دیا۔

"مہاراجہ وکرم سین کی مانند جو لاش کو کندھے پر اُٹھائے مرگھٹ سے آتا تھا اور لاش کا عفریت راستے میں وقت کاٹنے کے لئے روز ان کو ایک قصہ سُناتا تھا۔ تم مجھے قصے سناتے ہو — میں نہیں سُنوں گا تمھارے قصے —" کمال نے غصے سے کہا۔

"وہ وونزلہ گارڈن ہاؤس نظر آیا تھیں ۔" ترل نے اسی طرح ساحل کی طرف اشارہ کیا "اس میں رابندر ناتھ ٹیگور رہا کرتے تھے۔"

"چلو میں تم کو آج کا منظر دکھاؤں ۔" لانچ پانی پر چکّر کاٹ کر نارائن گنج کی سمت مڑ گئی ۔ اور کمال نے ریلنگ پر جھک کر ترل کو مخاطب کیا۔

"ہم آدم جی جوٹ ملز جا رہے ہیں ۔" اُس نے فاتحانہ انداز میں ترل سے کہا۔

"اور وہاں پہنچ کر تم منیجر کے ساتھ لنچ کھانے کے بجائے مزدوروں کی اُجرت کے متعلق اعداد و شمار جمع کرنے شروع کر دینا ۔ مفسد کہیں کے ۔۔ !!" ترل نے جواب دیا۔

کمال مسکراتا رہا۔

وہ ملز پہنچ گئے۔ عظیم الشان کارخانے جس میں پہاڑی عورتیں اور بنگالی مزدور کام کر رہے تھے ۔ بھاری بھاری مشینیں شور مچا رہی تھیں۔ کمال مبہوت بنا مشینوں کو دیکھا کیا۔

پھر وہ لانچ میں سوار ہو کر واپس مڑے ۔

ساحلوں پر بیل گاڑیاں پٹ سن کے گٹھے لادے آ رہی تھیں ۔ کسان تنکوں والی ٹوپیاں اوڑھے گھٹنوں گھٹنوں پانی میں کھڑے کھیتوں میں کام کر رہے تھے ۔ دریا کی سطح پر چاروں طرف چھوٹے بڑے اسٹیمر اور لانچ رواں تھے ۔ جن کے انگریزی نام تھے : میری اینڈرسن ۔ لیڈی لارنس ۔ لیڈی فلورا ۔ روز ماؤنٹ ۔ انگریزوں کے عہد کی یادگاریں ۔ دریائی جہاز رانی آج بھی ایک برطانوی کمپنی کے ہاتھ میں تھی۔

لانچ دریا کے چوڑے دھارے پر چلتی رہی ۔ آسمان کے اودے بادلوں میں سے سورج سُرخ تلک کی طرح چمک رہا تھا ۔ لہریں سُورج کی کرنوں میں سونے کی ایسی جھلملانے لگیں۔

ادون کشتیاں سطح پر حدِ نظر تک تیر رہی تھیں ۔ ایک بوڑھی عورت تیزی سے اپنا ناؤ کھیتی ہوئی لانچ کے قریب سے نکل گئی ۔ دریا پر ایک عظیم الشان، طاقت ور دنیا آباد تھی۔

مغرب کا وقت ہوا ۔ کشتیوں میں چراغ جلے ۔ پانی پر دیوالی منائی گئی ۔ مانجھیوں نے اپنی اپنی کشتیوں میں نماز پڑھنا شروع کر دی ۔ ہوا اُٹھی اور روشنی کی مخالف سمت میں جاتے ہوئے

کشتیوں کے بادبان سفید بگلوں کے پروں کی طرح پھڑپھڑانے لگے۔

یہ سارا منظر ایک عظیم سمفنی تھا۔ بڑا گمبھیر راگ تھا۔ سارا بنگال راگ میں ڈوبا تھا۔ دُکھ کا راگ۔ موت کا راگ۔ زندگی کا راگ۔

رات کو رمنا کی سڑکوں پر مدھم روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ دور ایک مندر سے ایک وشنو بھجن کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ سرل اور کمال برآمدے میں بیٹھے تھے۔ ساون کی گھٹائیں امنڈ کر اُٹھی تھیں۔

سرل نے دوبارہ کتاب کھولی ــ "تالاب کے چاروں اور چمپا کے پھول کھلے ہیں۔ آسمان پر کالے بادل گرجتے ہیں۔ میرے جی میں جذبات کا دھارا موجیں مارتا ہے۔ جیسے اگست کے مہینے میں ندی میں بہیا آجاتی ہے۔ ندی تو تو نہیں جانتی کہ کدھر کو جا رہی ہے پھر اتنی تیزی سے کیوں بہتی ہے ــــ او گھڑے! پانی میں بوند کی طرح ڈوب جا۔ میں بھی تیری طرح اتھاہ سمندر میں ڈوب چکی ہوں ــ"

سرل قرونِ وسطیٰ کے بنگالی لوک گیتوں کے صفحات پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ باہر اندھیرا تھا۔ ایسا اندھیرا جو صرف بنگال کی بھیگی فضاؤں میں رات کے وقت گھنے باغوں پر چھاتا ہے۔ لیمپ کی مضمحل سی زرد روشنی برآمدے میں پھیلی ہوئی تھی۔ دفعتاً بجلی کی چمک کے ساتھ زور کی گھٹا اُٹھی اور ہوا چلنی شروع ہو گئی۔

"میں کل صبح انڈیا کے راستے کراچی کے لئے روانہ ہو رہا ہوں۔" کمال کہہ رہا تھا۔

سرل چونکا۔

"معلوم ہے۔"

"تم سے تو اکثر ملاقات ہوتی رہے گی۔"

"ہاں۔"

ہوا کا جھکڑ تیز ہو گیا۔ برآمدے کے نیچے اسوک کی شاخیں سرسرانے لگیں۔

"اسوک کا درخت ــ!" سرل نے گویا اسے مخاطب کیا۔ "جسے کوئی حسین لڑکی چھُولے تو اس میں فوراً پھول کھل جاتے ہیں ــ!"

کمال نے بارش کی پھوار سے بچنے کے لئے کرسی اندر کو گھسیٹ لی۔

"تم کو مگر کالا لبھے۔" نرمل نے پڑھا۔ "کوئل اس سے زیادہ کالی ہے اور بانکمائی ندی کا پانی اس سے بھی زیادہ کالا ہے — پر اس کے بال سیاہ ترین تھے۔

— بارش کی بوندوں نے باہر تالاب میں جل ترنگ بجانا شروع کر دی۔ بجلی چمکی تو باغ کا ایک ایک پتہ ایک پل کے لئے اس میں جگمگا اٹھا —

"چمپک کے درختوں کے پار، بوڑھی گنگا کی موجیں ہکار شور کر رہی ہیں۔" نرمل نے کہا "ان سے کہہ دو کہ میں نے تمہاری آواز کی طرف سے کان بند کر لئے ہیں۔ میں اپنی کشتی کنارے سے باندھ چکا ہوں۔"

"اچھا۔ میں کہہ دوں گا۔" کمال نے آہستہ سے جواب دیا۔

دوسری صبح کمال نے سرل ایشلے کو ڈھاکے میں چھوڑا اور فلائینگ کلب کا طیارہ لے کر کلکتے پہنچا۔ اس نے سوچا اپنے مرحوم ماموں نواب عباس رضا بہادر کے گھر والوں سے ملنے دت ہاؤس جائے مگر پھر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور ٹرین میں بیٹھ کر لکھنؤ روانہ ہو گیا۔

وہ ہوڑہ اسٹیشن پر ایک پولیس افسر کو اپنی اور آتے دیکھ کر ہڑبڑا گیا اور اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ویزا اور پاسپورٹ کے کاغذات کو چھوا اور مطمئن ہوا کہ وہ غیر قانونی طور پر انڈیا میں داخل نہیں ہو رہا ہے۔ ٹرین چلا کی۔ بردوان آسنسول۔ پٹنہ مغل سرائے۔ الہ آباد۔ لکھنؤ — ٹرین ایک اجنبی سرزمین میں چل رہی تھی۔ سال بھر قبل یہ اس کا اپنا ملک تھا۔ اب اس میں وہ ایک غیر ملکی کی حیثیت سے سفر کر رہا تھا۔ اسے لگا۔ لوگ اسے مشتبہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ سب کی آنکھیں اسی کی طرف ہیں۔ تم پاکستانی ہو۔ تھانے چلو۔ تم پاکستانی ہو مسلمان — جاسوس — مسلمان جاسوس — ٹرین کے پہیوں میں سے یہی آواز نکل رہی تھی۔ غدار — جاسوس غدار — جاسوس — اس نے ہڑبڑا کر آنکھ کھولی۔ ٹرین حسب معمول بڑی شان و شوکت کے ساتھ چار باغ جنکشن میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

چار باغ — لکھنؤ — لکھنؤ —

دو دن وہ عزیزوں کے پاس ٹھہرا۔ اب اسے خیابان کے کلیم کی خانہ پُری کے سلسلے میں ضروری کاغذات لینے دہرہ دون جانا تھا۔ تیسرے دن وہ لکھنؤ سے چلا۔ (یہاں اب کیا رکھا تھا۔ وہ کس کے لیے یہاں ٹھہرتا۔ وہ بدل چکا تھا۔ لہٰذا لکھنؤ بھی بدل گیا تھا) جب ٹرین مُراد آباد کے قریب پہنچی تو اُسے معاً یاد آیا کہ لکھنؤ میں سیتا ڈکشٹ نے اسے بتایا تھا کہ چمپا ولایت سے لوٹ آئی ہیں اور اپنے چچا کے پاس مُراد آباد میں مقیم ہیں۔ اس اطلاع پر کمال نے ویزا پر مراد آباد کا اضافہ کروالیا تھا۔

ٹرین پلیٹ فارم پر پہنچی تو وہ اپنا سامان اٹھا کر گاڑی سے اُتر آیا۔ اسٹیشن سے باہر آکر اُس نے ایک تانگہ لیا اور سیتا ڈکشٹ کا بتایا ہوا پتہ دیکھنے کے لئے جیب سے نوٹ بک نکالی۔ پھر اُس نے تانگے والے سے کہا۔ کٹھ گھر چلو۔

تانگہ روشن بازاروں اور کالجوں اور ہسپتالوں کی بلند عمارتوں کے سامنے سے گزرتا ایک سمت کو چلا۔ سڑک پر ٹھیلے چل رہے تھے اور پردے دار رِیڑھے اور ڈولیاں اور یکے۔ لڑکے بالے۔ برقعہ پوش عورتیں سلیپر گھسیٹتی گلیوں میں گھُس رہی تھیں۔ تانگہ اب ایک محلے میں داخل ہوا جو شاید کمال کی منزلِ مقصود تھی۔ دروازوں کے آگے ٹوٹے پھوٹے چبوترے تھے اور مسجد کی منڈیر پر ایک چیل بیٹھی اونگھتی تھی۔ یہ چمپا باجی کا محلّہ تھا؟

وہ تانگے سے اُترا۔ سامنے بڑا سا پُرانے وقتوں کا پھاٹک تھا جس کے دروازے میں ایک اور چھوٹی کھڑکی کھلتی تھی۔ اندر سیلن تھی اور بھوسے کا ڈھیر۔ دو تین کھٹیاں پڑی تھیں۔ اندر ایک اور بے حد تنگ و تاریک زینہ تھا جو شاید اٹھارھویں صدی میں بنا ہوگا۔ پھاٹک میں وہ چاروں طرف آوازیں دیتا پھرا۔ جب کسی نے اس کو جواب نہ دیا تو وہ ہمت کرکے خود ہی اس زینے پر چڑھ گیا۔ دوسری منزل پر چھوٹا سا آنگن تھا جس میں چینی کے گملے رکھے تھے۔ سامنے برآمدہ تھا اور ایک بڑا کمرہ جو شاید اس گھر کی بیٹھک کا کام دیتا ہوگا۔ اس میں صرف ایک کرسی پڑی تھی اور ایک مسہری۔ ایک الماری میں "خدائی فوجدار" اور اودھ پنچ کی جلدیں رکھی تھیں۔ دروازوں میں ان گنت اودے، نارنجی،

سبز اور سُرخ شیشے لگے تھے۔ باہر کے رُخ چھجا تھا جو پھاٹک کے عین اُوپر شہ نشین کی طرح نظر آتا۔ چھجے میں کھڑے ہو کر اُس نے پچھم کی اور نظر ڈالی۔ گلی دائیں جانب کو مڑ کر محلّے کے دوسرے مکانوں کی طرف چلی گئی تھی۔ ادھر ڈھلوان تھی۔ اینٹوں کے فرش کی گلی بے حد صاف تھی۔ اُس نے غور سے دیکھا۔ نیچے مسجد میں پیش امام نماز پڑھ رہے تھے۔ ان کی جا نماز کے سامنے سجدہ گاہ کے قریب تام چینی کی رکابی میں کچھ رکھا تھا اور محلّے کے تین چار لڑکے بالے بٹ کلیجی بٹ کلیجی کہہ کر ان کو چڑا رہے تھے۔ امام صاحب سلام پھیر کر جلدی سے اُٹھے۔ لڑکوں کو ڈھیلے سے مار بھگانے کے بعد پھر جا نماز پر واپس چلے گئے۔ وہ زینے پر سے اُتر کر پھر گلی میں آیا۔ اسے حیرت تھی کہ اس گھر کے مکین کہاں چلے گئے۔ ناقابلِ بیان سناٹا سارے میں طاری تھا۔ اسی مکان کے دائیں ہاتھ ایک سرسبز ڈھلوان پر قبرستان تھا۔ اسے ایک جھرجھری سی آئی۔ زندہ روحیں۔ مری ہوئی روحیں۔ یہاں کتنی نحوست تھی۔ مُردوں کا شہر — چمپا باجی تم یہاں کہاں ہو — قبرستان کے سرے پر چھپر تھا۔ اور نیم کا درخت جس کے نیچے بکری بندھی تھی۔ چھپر کے اوپر کھڑکی میں سے کوئی لڑکی جھانک رہی تھی۔ کمال کو اپنی طرف دیکھتا پا کر اُس نے جھٹ کھڑکی بند کر دی۔ وہ زینے سے نیچے اُتر کر دوسرے پھاٹک کے سامنے آیا اس کی بھی وہی وضع تھی۔ رنگ برنگے شیشوں والا شہ نشین نیچے دربان کے کھڑے ہونے کے لئے طاقچے۔ شکستہ چبوترہ۔ اس نے پھاٹک کی کُنڈی کھٹکھٹائی۔

"کون ہے —" اندر سے آواز آئی۔

مایوسی اور ڈیپریشن کی وجہ سے کمال کے حلق سے آواز بھی نہ نکلی۔

"کون ہے" دھاری دار گبرون کا سیاہ تنگ پاجامہ پہنے ایک بڑھیا نے اندر سے جھانکا۔

"میں ہوں —"

"اے کیا بات ہوئی۔ اے نام تو بتاؤ بھئیے —"

"میں ہوں کمال رضا۔ پاکستان سے آیا ہوں۔"

بڑھیا نے کچھ دیر بعد واپس آکر کھڑکی کھولی —

"آؤ — آجاؤ میاں۔" اُس نے کہا۔

وہ اندر آگیا۔ انگنائی میں اینٹوں کا فرش تھا۔ دیوار کے ساتھ کیاری میں کسی زمانے میں پودے رہے ہوں گے۔ اب وہ ویران پڑی تھی۔ باورچی خانے کے سامنے مرغیوں کا ڈربہ تھا۔ مرغیوں کے پر ادھر اُدھر اڑ رہے تھے۔ سامنے بڑا دالان تھا۔ دالان میں تخت اس پر چمپا بیٹھی تھی۔

"ارے ہلو — کمال — بھئی حد ہوگئی — !!"

"چمپا باجی — !"

"تم — ! گڈ گاڈ — !!" وہ آہستہ سے اُٹھی اور معذرت طلب انداز میں جلدی جلدی تخت پوش ٹھیک کرنے لگی۔

"میں سامنے والے مکان میں گھس گیا تھا" کمال نے کہنا شروع کیا۔

"میرے گھر والے سب چچا میاں کے یہاں گئے ہوئے ہیں۔ وہیں چلو۔ وہاں اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

اُس نے الگنی پر سے دلائی اتاری اور اسے بڑے سلیقے سے اوڑھا تاکہ سر سے پاؤں تک دُلائی اسے ڈھانپ لے اور گھونگٹ سا نکال کر کمال کے ساتھ گلی میں آگئی۔

"ہمارے یہاں بُرقعے کا رواج نہیں ہے۔ اب تک چادریں اور دُلائیاں ہی اوڑھی جاتی ہیں۔" اس نے گویا تشریح کی —— وہ قدیم مسجد کے پاس پہنچ کر دوسری گلی میں مڑ گئی جو قبرستان کی ڈھلوان کے برابر سے گزرتی تھی۔ یہ بھی بے حد صاف ستھری تھی دیواروں میں گھاس اور پیپل کے درخت اُگ آئے تھے۔

"یہ — یہ" کمال نے قبرستان کی طرف اشارہ کیا۔

"ہم ہی لوگ ہیں۔" چمپا نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے جواب دیا۔ "یہیں جیتے ہیں۔ اور یہیں مریں گے —" اُس نے کچھ توقف کے بعد اضافہ کیا۔

چند قدم چل کر "دیوان خانہ" آگیا۔

"چچا میاں کا مکان — ؟"

"ہاں۔"

وہ ڈیوڑھی میں داخل ہوئے۔ آنگن میں بہت سے تخت بچھے تھے۔ ویرانی کی شدت سے جگہ سنسنا رہی تھی۔

"یہاں تو کوئی بھی نہیں رہتا — ؟" کمال نے ذرا دہشت زدہ ہو کر پوچھا۔

"نہیں۔" چمپا نے اطمینان سے جواب دیا۔ "یہ امام باڑہ ہے۔ یہ جو تخت پڑے ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے اس میں ہمارے یہاں کی مشہور "نخوتوں کی مجلس" ہوا کرتی تھی۔"

اب انھوں نے پھر ماضی کی گردان شروع کر دی۔ کمال نے بوکھلا کر سوچا۔ "اصل مکان اندر ہے۔" چمپا نے بات جاری رکھی "چلے آؤ۔ تم سے پردہ کوئی نہیں کرے گا"

وہ ڈیوڑھی میں سے گزرتا اندر چلا گیا۔ صحن میں کرسیاں اور چارپائیاں بچھی تھیں۔ ایک چارپائی پر کڑھا ہوا پلنگ پوش پڑا تھا۔ باورچی خانے میں سے بگھار کی تیز مہک آ رہی تھی۔ دو تین غیر واضح، غیر اہم سے لوگ ادھر اُدھر بیٹھے تھے۔ بادل گھرے ہوئے تھے مگر ہوا بند ہونے کی وجہ سے شدید حبس ہو گیا تھا۔ برساتی کیڑے چراغوں کے چکر کاٹ رہے تھے۔

"چچا ابا — یہ کمال ہیں —" نیم تاریکی میں چمپا کی آواز آئی۔

"آؤ — آؤ — بیٹھو میاں — بڑی عزت افزائی کی تم نے ہماری —" چچا ابا نے جو پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

لالٹین اُٹھا کر ایک لڑکی باورچی خانے کی طرف لپکی۔ ایک اور لڑکی دالان میں میز پر بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ یا اللہ مڈل کلاس اس قدر ڈیپریسنگ ہوتا ہے۔ کمال نے لرز کر سوچا۔ آنگن میں آنے والوں کی آہٹ سن کر دالان والی لڑکی نے نظریں اٹھا کر کمال کو دیکھا۔ کمال نے جلدی سے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ اس نے مسلمان مڈل کلاس لڑکیوں کے فرسٹریشن اور رومان پرستی کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا اور وہ ہرگز نہ

پہچانتا تھا کملا کی بیٹی مریم لیکن جو پائنتی بیٹھی تھیں اس کے لئے چائے بنا رہی تھی۔ اس کے خیال تھا قسمت رومان شروع کر دیں اور بعد میں لندن سے لمبے لمبے خطوط لکھا کریں محبت نامے۔

اس کی کوفت میں اضافہ ہوتا گیا۔

"یہ میری کزنز ہیں دونوں —" چمپا اسی آواز میں پائنتی بیٹھی اسے بتا رہی تھی "وہ والی مذہب النساء ہیں۔ انھوں نے دلّی سے لائبریری سائنس میں ایم اے کیا ہے چھوٹی والی مریم زمانی ہیں۔ یہ اگری کلچر میں ایم ایس سی کر رہی ہیں۔ جب میں انٹر کے بعد لکھنؤ پڑھنے گئی تھی۔ یہ دونوں کی دونوں بالکل ذرا ذرا سی تھیں۔ زمانہ کس قدر تیزی سے گزرتا ہے — تم کو چپ کیوں لگ گئی ہے —؟"

"کچھ بھی تو نہیں چمپا باجی —"

پھر چچا میاں اس سے آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔ وہی پرانے قصے — پاکستان۔ ہندوستان ہماری تو میاں بڑھیا بیٹھ گئی" انھوں نے کہا۔

"یہاں اتنا سناٹا کیوں ہے —" کمال نے گھبرا کر پوچھا۔ پھر اسے اپنی بیوقوفی کا احساس ہوا "ساری آبادی کہاں چلی گئی۔"

"وہیں جہاں تم چلے گئے۔" چچا میاں نے جواب دیا "کھوکھرا پار کے راستے سے سب نکل لئے۔ رڈیل کھنڈ خالی ہو گیا۔ بس ہم چند بڈھے ٹھڈے باقی رہ گئے ہیں۔ دو تین سال کی بات اور ہے۔ جب ہم مر جائیں گے تو یہاں ہمارے بعد گدھے لوٹیں گے۔"

کمال اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ مریم زمانی نہایت بے تعلقی سے چائے بنا کر لا رہی تھی۔ اس کا رومان شروع کرنے کا ارادہ معلوم نہیں ہوتا۔ کمال نے ذرا اطمینان اور ذرا مایوسی سے سوچا۔

"پاکستان کے کیا حال ہیں۔" چاچا ابا پوچھتے رہے "سنا ہے یہاں سے دھنئے جولاہے جا کر وہاں لکھ پتی ہو گئے۔ اپنے کو سید کہویں ہیں اور کوٹھیوں میں رہیں ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے میاں؟ میرے بھانجے نے لکھا ہے کہ وہاں ہر جگہ پنجابیوں نے یو۔ پی والوں

کا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ اندھیر گردی مچی ہے۔ میاں ہم تو تباہ ہو گئے۔ تباہ اور وہاں بھی کون سے لڈو بل جائنگے۔ میرے بھانجے کا خط کل ہی آیا ہے جہلم سے۔ اس نے شعر لکھا ہے۔ وہ کیا شعر ہے زیبائی بیٹی ۔۔؟ ع

غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

ہئی۔ ہئی ۔۔" اُنھوں نے کرسی پر پہلو بدلا۔" مریم بسکٹ بھی تو لاؤ بھتے کے لئے ۔۔ کمال میاں اسی ڈیوڑھی پر چار چار ملازم موجود تھے۔ اب یہاں سارے میں اُلّو بول رہا ہے ۔۔"

کمال چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اُس نے مسلمان قوم کے متعلق پھر اپنی۔ مجبوب تھیوری دل میں دُہرانا شروع کر دی۔ یہی بڑے میاں ۱۹۴۶ء میں سٹی مسلم لیگ کے صدر رہے ہوں گے۔ سن اڑتالیس تک سوچتے ہوں گے کہ لشکرِ اسلام سرینگر فتح کرنے کے بعد لال قلعہ دلی پر فتح کے پرچم لہراتا یہاں کے مسلمانوں کو لبریٹ کرنے کے لئے بس اب آیا ہی چاہتا ہے۔ کمال کا دم گھبرانے لگا۔

" یہاں بجلی کی روشنی اب تک نہیں آئی" چمپا غیر شخصی آواز میں بتلا رہی تھی۔" محلے میں تو کب کی آچکی ہے جہاں پھوا اماں کی کوٹھی تھی۔ وہ چلی گئیں حیدرآباد سندھ مع اپنے گھر والوں کے۔ لہٰذا کوٹھی کسٹوڈین نے لے لی۔ اس میں سکھوں نے اسکول کھول کر بجلی منگالی ہے۔ ہمارے مکانوں میں نہیں آسکی۔" چمپا کی آواز نیم تاریکی میں ڈرون کرتی رہی۔

" بجلی کے لئے میاں پیسے چہئیں۔" چا آبا نے چائے کی سینی زور سے اسٹول پر رکھتے ہوئے کہا۔ سینی کا توازن قائم نہ رہ سکا۔ جگ لوٹنے سے سارا دودھ انگنائی کے فرش پر بہہ گیا۔ چمپا اسے افسوس سے دیکھتی رہیں۔" اب اتنی رات گئے دودھ کہاں سے آئے گا۔" اُنھوں نے کہا۔

" اس پر افسوس نہ کرو چمپا باجی۔" کمال نے گہری آواز میں آہستہ سے کہا۔

چمپا نے نظر اُٹھا کر اسے دیکھا اور مسکرا دی۔

کمال نے چمپا کو آج ان کی زندگی کی ایک اور سیڑھی پر ایک اور پس منظر میں دیکھا جو ان کا حقیقی پس منظر تھا۔ اُس نے لمحے بھر کے لیے آنکھ بند کر لی۔ لکھنؤ، پیرس، کیمبرج، لندن، روم اور میڈرڈ والی چمپا۔ مُراد آباد کے محلے ٹھمٹھگر کے اس نیم تاریک مکان والی چمپا۔ مڈل کلاس چمپا۔ بہادر چمپا عرف نئے ہندوستان کی عاقل اور دلاور حسینہ۔

واہ بجیا۔ تمہارا جواب نہیں۔ مانتا ہوں۔

کمال مراد آباد میں دو دن رُکا۔ رات کو اسے اسی اودے اور نارنجی شیشوں والے کوٹھے کے کمرے پر پہنچایا گیا۔ جہاں وہ سب سے پہلے جا پہنچا تھا۔ آدھی رات تک وہ چھجے میں کھڑا سامنے کا منظر دیکھتا رہا جہاں چاند نے اپنی مٹیالی روشنی مکانوں کی چھتوں۔ مسجدوں کے میناروں اور نیم کے درختوں پر پھیلا رکھی تھی۔

دوپہر میں قیلولے کے لیے اس کا کھٹولہ زینے کی آخری سیڑھی پر بچھا دیا گیا۔ جہاں رام گنگا کی طرف سے ٹھنڈی ہوا آتی تھی

"سُنا ہے تمہارے یہاں ہندوستان کی ساریوں کی بڑی مانگ ہے۔" چمپا باجی نے آکر دہلیز پر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے بشاشت سے بات شروع کی۔ "تمہاری ہم وطن اعلےٰ سوسائٹی کی خواتین یہاں آتے ہی کپڑے کی دوکانوں پر یلغار کرتی ہیں۔ سُنا ہے تمہارے یہاں کی اعلیٰ سوسائٹی —"

"کیا اعلیٰ سوسائٹی کی گردان کر رہی ہو —" کمال نے جھنجلا کر اس کی بات کاٹی۔ "یہ نہ بھولو چمپا باجی کہ خود تم کو طبقاتی شعور حاصل کرنے میں پورے پندرہ سال لگے —"

چمپا زور سے ہنسی۔ "طبقاتی شعور کی بات کرنا ہے تو میری کزنز سے گفتگو کرو زیباؔ اور مریم۔ بڑی بھاری اسٹوڈنٹ ورکرز ہیں دونوں۔ دلّی کے سالانہ انٹر یونیورسٹی یوتھ فیسٹول میں ہمیشہ یہ لوگ جانے کیا کیا کرامات کرتی ہیں۔ جھانکیاں۔ عوامی ناچ۔ موسیقی کے مقابلے۔ زیباؔ نے پچھلے سال کے فیسٹول میں سنگتراشی میں پہلا انعام حاصل کیا —"

کمال کی سمجھ میں آگیا۔ اس کا خدشہ بیکار تھا۔ یہ مڈل کلاس لڑکیاں اپنے فرسٹریشن اور اپنی رومانیت پر فتح حاصل کر چکی تھیں۔ آج سے پندرہ سال پہلے اگر وہ چمپا کی جگہ ہوتیں تو شاید اسی کی طرح

رومان پرست ہوتیں۔ یہ نئی لڑکیاں تھیں۔ چمپا عبوری دور کی لڑکی تھی۔ اس لیئے لامحالہ اُس نے تجربے کیئے اور ٹھوکریں کھائیں۔

زیبا اور مریم۔ ہمت والی لڑکیاں۔ اُن کے دماغوں میں کوئی اُلجھن نہیں۔

پھر اسے خیال آیا کہ اس کے دیس میں ایسی لڑکیاں نہیں۔ وہاں ابھی عبوری دور بھی پوری طرح شروع نہیں ہوا۔

"کاش میں سنہ ۱۹۴۷ء میں ان دونوں کی ایسی بن گئی ہوتی۔" چمپا نے گویا کمال کے دل کی بات پڑھ لی۔

"اب ہم لوگوں کے اختیار میں تو واقعات نہیں ہوتے۔" کمال نے جواب دیا۔ اُس نے محسوس کیا۔ وہ کس قدر بوڑھا ہو چکا ہے۔ چمپا جو اس کے سامنے چوکھٹ پر بیٹھی ہے۔ کتنی بوڑھی عورت ہے۔ ہم دونوں نے من کی دنیاؤں کی کتنی لمبی سیاحت کی۔ اُس نے حیرت سے سوچا۔

وہ اس وقت ایک اجنبی شہر میں ایک نیم تاریک زینے پر بیٹھا تھا۔ دریا پر سے آتی ہوئی برساتی ہوا اس کے بال پریشان کر رہی تھی۔ وطن کی برسات۔ مگر یہ وطن نہیں تھا۔ اس کے ویزا کی معیاد ختم ہونے والی تھی۔ کل سویرے وہ یہاں سے اپنے ملک روانہ ہو جائے گا۔ مراد آباد، کٹھ گھر۔ یہ زینہ۔ چمپا احمد۔ زیبا۔ مریم۔ چچا ابا۔ سب یہیں رہ جائیں گے۔ کیا اس حقیقت پر آنسو بہانا چاہیئے۔ لیکن اب اسے محسوس ہوا کہ وہ بوڑھا ہو چکا ہے۔ اس میں ضبط آ گیا ہے۔ ضبط۔ توازن اور سکون۔ گریک آئیڈیلز — اسے ہری شنکر کے الفاظ یاد آئے۔

چمپا نے پھر اس کے دل کی بات پڑھ لی۔ اور اس نے پرانی عادت کے مطابق دہرایا

"کہاں ہے تمہارا ہمزاد ہری شنکر ۔۔"

"چمپا باجی۔" اُس نے ذرا غصے سے کہا "ہری شنکر اب میرا ہمزاد نہیں رہا۔ مجھے کیا معلوم۔ وہ اس وقت کہاں ہے۔"

"کیوں اسے خط نہیں لکھتے؟"

"چمپا باجی۔" اُس نے پہلو بدل کر کہا "تم کو یہ اب تک معلوم نہیں ہوا کہ میں دستوں کو

خط نہیں لکھا کرتا۔ میں ہری شنکر سریواستوا کو کیا لکھوں اور کیوں لکھوں۔"

"اب تک جذباتی ہو — !"

"نہیں۔" اُس نے بل کھایا۔ چمپا نے اسے پھر چوری کرتے پکڑ لیا تھا۔ "ہٹائیے چمپا باجی۔" اُس نے جھنجھلا کر جواب دیا۔ "میں اس سارے انڈو پاکستان میلو ڈرامہ سے جو چاروں طرف کھیلا جا رہا ہے قسم خداوند تعالیٰ کی عاجز آچکا ہوں۔ ہری شنکر آج کل نئے بنگلور میں ہے۔ اب میں کیا جا کر روتے ہوئے اس سے لپٹ جاؤں — لاحول ولاقوۃ۔"

"تم اب تک مضبوط نہیں ہوئے۔" چمپا نے آہستہ سے کہا۔ "تم ہری شنکر سے ملنا نہیں چاہتے۔ کیونکہ تم کو ڈر ہے کہ واقعی جا کر روتے ہوئے اس سے لپٹ جاؤ گے — اچھا پھر مجھ سے ملنے کیوں آئے۔ یہ بھی بڑی سخت میلو ڈریمٹک بات تھی۔"

"آخر انسان ملتا ملاتا ہی رہتا ہے پرانے دوستوں سے۔" کمال سے کوئی اور معقول جواب نہ بن پڑا۔ "اور پھر مرادآباد راستے میں ہی پڑتا تھا۔" اس نے منہ لٹکا کر کہا۔

بارش کی بوندیں ٹپ ٹپ ٹین کے چھجے پر برسنے لگیں۔ گلی کی مٹی کی سوندھی خوشبو اڑ کر کمال تک پہنچی۔ ایک عورت تنگ پائجامہ پہنے آم کی کھانچی سر پر اٹھائے آواز لگاتی نیچے سے گزری۔ چمپا دہلیز پر بیٹھی سوکھے سے باہر دیکھتی رہی۔

بہت دیر سے کمال ایک سوال دل میں لئے بیٹھا تھا مگر پوچھنے کی ہمت نہ پاتا تھا۔ آخر اس نے دبی زبان سے دوسری طرف دیکھتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔

"چمپا باجی! اب تم کیا کرنے والی ہو۔"

یہ بڑا بے رحم سوال تھا۔ ہم کسی سے اس کے مستقبل کے بارے میں کس طرح پوچھ سکتے ہیں۔

"میں —" اس نے جواب دیا۔ "میں بالآخر بنارس واپس جا رہی ہوں۔ تم کو یاد ہے میں نے گیم کے کنارے بوٹ ہاؤس میں تم سے کہا تھا۔ میں واپس جانا چاہتی ہوں۔ کوئی ساتھ لے جانے والا نہیں ملتا۔ اب میں نے دیکھا کہ کسی دوسرے کا سہارا ڈھونڈھنا کس قدر زبردست حماقت تھی۔ میں خود ہی بنارس لوٹتی ہوں — جانتے ہو میرے آبائی شہر کا نام کیا

"ہے ـــ"

"شو پوری ـــ"

"ہاں ـ مسرت کا شہر ـ وہ بھی ایک نہ ایک روز واقعتاً مسرت کا شہر بنے گا ـ سارے شہروں کی طرح ـ اس ملک کو دکھ کا گڑھ یا مسرت کا گھر بنانا میرے اپنے ہاتھ میں ہے ـ مجھے دوسروں سے کیا مطلب ـــ ؟" اُس نے اپنے ہاتھ کھول کو غور سے انھیں دیکھا " نتھا صرف کے ہاتھ ـ آرٹسٹ یا بکھک کے ہاتھ ـ ؟ نہیں ـــ یہ صرف ایک عام، اوسط درجے کی ذہین لڑکی کے ہاتھ ہیں جو اب کام کرنا چاہتی ہے ـ"

وہ خاموش ہوگئی ـ کچھ دیر بعد مسجد سے ظہر کی اذان کی صدا بلند ہوئی ـ اُس نے غیرارادی طور پر دوپٹے سے سر ڈھانپ لیا ـ

"کمال ـــ !" کچھ دیر بعد اُس نے کہا " مسلمانوں کو یہاں سے نہیں جانا چاہئے ـ تم کیوں نہیں دیکھتے کہ یہ تمھارا اپنا وطن ہے ـــ " اُس نے بے بسی سے انگلیاں مروڑیں " اور تم کیوں چلے گئے ـ کیا میں تمھارے یہاں آجاؤں تو مجھے ایک سے ایک عمدہ عہدہ نہ مل جائے گا دیکھو میں پیرس اور کیمبرج اور لندن سے کتنی ڈگریاں لائی ہوں ـ"

ہر سنگھار میں رنگے دوپٹے اور پتمبری ساڑیاں پہنے چمپا کی رشتے دار لڑکیاں نیچے دالان میں پکوان چڑھا رہی تھیں " بھئی کچھ یہاں بھی بھجواؤ ـــ " چمپا نے کھڑکی میں سے سر نکال کر آواز دی ـ

"اچھا بجیا ـ ابھی بھیجے ـــ " پھر انھوں نے ایک گیت شروع کر دیا ـــ جھولا کن نے ڈالو ری امریاں ـ

کمال نے کھٹولے پر لیٹے لیٹے آنکھیں بند کرلیں ـ وہ بچپن سے یہ گیت سنتا چلا آرہا تھا برسات آتے ہی اس کے خاندان کی لڑکیاں بھی کڑھائی چڑھا کر یہ گیت الاپنا شروع کر دیتی تھیں ـ

زینے پر پائینچے کی جھونک دکھلائی دی ـ زیبا پھلکیوں کی پلیٹ لے کر اوپر آرہی تھی ـ پیچ پیچ وہ اندر آئی اور پلیٹ فرش پر رکھ کر گنگناتی ہوئی پھر نیچے اتر گئی ـ

چمپا چوکھٹ پر بیٹھی رہی۔ "تم سوچ رہے ہو۔" اُس نے آہستہ سے کہا کہ "اب میرے دوار کون آئے گا۔ لیکن کمال میں سمجھتی ہوں۔ جہاں تک ذاتی کامیابی کا سوال ہے۔ میں تم سے کہیں زیادہ خوش قسمت ہوں۔ میں نے سُراغ پا لیا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو چمپا باجی۔"

نیچے حوض میں برکھا کی پھوہار کا جھالا بج رہا تھا۔ بارش کی وجہ سے سارے میں ہریالی اور تروتازگی چھا گئی تھی۔ گلیوں میں ننھی ننھی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ چھجوں اور پرنالوں سے پانی کے آبشار گر رہے تھے۔ نیچے آنگن میں پانی کی چھوٹی سی شفاف جھیل بن گئی تھی اوپر چمنی کے گملوں میں لگے ہوئے پودے پانی میں لہلہا رہے تھے۔ "یہ میرا جل محل ہے۔" چمپا نے آہستہ سے کہا۔ "یہاں میرے آنسوؤں کا پانی بہتا ہے۔"

دالان میں لڑکیوں کے دوپٹے لہرائے۔ ہلکی کاسنی، زرد اور سبز رنگ کی چنری اوڑھے ایک لڑکی نے جو شاید مریم تھی۔ میرا کا گیت شروع کر دیا۔

"میں ایک عام اوسط درجے کی لڑکی ہوں۔" چمپا کہتی رہی۔ "اگر میں خدا کا خاص الخاص بندہ ہوتی۔ میرا۔ مکتا بائی۔ سینٹ صوفیہ۔ تو میرے جسم پر زخموں کے نشان نظر آتے۔ میرا لبادہ میرے مقدس خون سے سُرخ ہوتا۔ میرے ہاتھوں میں میخیں گڑی ہوئیں۔ میرے سر کے گرد نور کا ہالہ ہوتا۔ مجھے وش کے پیالے اور سانپ کے پٹارے بھجوائے گئے ہوتے لیکن میں محض چمپا احمد ہوں میرے زخم کسی کو نظر نہیں آ سکتے۔ کیونکہ میرے تماشائی بھی میری طرح زخمی ہیں وہ کمزور اور فانی انسان ہیں چشم بینا نہیں رکھتے۔ لوگ ممکن ہے مجھ پر ہنستے بھی ہوں۔ جبکہ سینٹ صوفیہ کی پرستش کی جاتی ہے۔"

ہوا کے زور سے بہت سی جامنیں ٹپ ٹپ کرتی سیڑھیوں پر آن گریں۔ چمپا نے اپنے بالوں سے ایک زرد پتہ نکالا۔

"کمال" اس نے سوچتے ہوئے کہا: "تمھیں وہ لنکا کی آرٹسٹ لڑکی یاد ہے۔ برسوں تک وہ کینوس پر کینوس رنگتی چلی گئی۔ دُنیا کے نگارخانوں کی اُس نے خاک چھانی۔ لندن اور پیرس میں اس کی نمائشیں ہوئیں۔ جن میں بیویاں نئی نئی ساریاں اور فراک پہن کر آتیں۔ معزز مہمان تقریریں

کرتے۔ تصویریں لی جاتیں۔ پریس کے نمائندے اس کا انٹرویو کرتے۔ وہ ایک کونے میں کھڑی مسکرا مسکرا کر سب سے باتیں کرتی۔ آخر میں سب چلے جاتے۔ اس کا ہال خالی ہو جاتا اپنی پینٹنگز کی معیت میں وہ تنہا رہ جاتی اور چپ چاپ باہر نکل کر بس میں بیٹھتی اور گھر کی راہ لیتی۔ تین مرتبہ میں نے یہی منظر دیکھا۔

"میں نے طرح طرح کے جینئس قسم کے لوگوں کے ساتھ وقت بتایا۔ ان میں سے ہر ایک کبھی اپنی جگہ پر خوش ہوتا کبھی رنجیدہ۔ تم خوش کیوں ہو۔ میں ہر ایک سے پوچھتی۔ اتنے ذہین ہوتے ہوئے بھی بشاش ہو —— حد ہے۔ میں برا مان کر کہتی۔ مگر آخر میں میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں اپنے غم کو جنھوں نے دنیا کے غم میں سمو دیا تھا۔ کس قدر آسان بات تھی۔ پہاڑ کے نیچے پہنچے تو معلوم ہوا ہم خود اور ہمارا ذاتی الم کس قدر حقیر شے ہے ——

"آٹھ سال بعد تمہاری طرح میں بھی اپنے وطن واپس لوٹی اور میں نے یہاں کے حالات دیکھے۔ ایسی باتیں دیکھیں جن سے میرا سر فخر سے اونچا اور دل مسرت سے معمور ہو گیا۔ ایسی چیزیں دیکھیں جن سے میرا سر ندامت سے جھک گیا اور میرا دل دکھی ہو گیا۔ میرے سامنے مسائل کا ایک اونچا پہاڑ کھڑا تھا۔ تب جانتے ہو کیا ہوا۔ چیونٹی نے کیا کیا۔ اس نے کانوں میں بالیاں لٹکا کر پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا۔

اب بھی معلوم کرنا چاہتے ہو کہ میں کیا کرنے والی ہوں؟"

دوسرے روز شام کو وہ وہاں سے چلا۔ اس کے لئے تانگہ منگوایا گیا۔ چمپا اور مریم اور زیبا اسے ڈیوڑھی تک چھوڑنے آئیں۔ "ہم اب تک اس محلے میں زبردست پردہ کرتے ہیں ورنہ چار آبا کو خواہ مخواہ صدمہ ہو گا۔ اس لئے ہم بوجہ پردے کے تم کو اسٹیشن تک چھوڑنے نہیں جا سکتے۔" چمپا نے ہنس کر کہا۔

کمال تانگے پر بیٹھا۔ تانگہ گلی سے نکل کر اسٹیشن کی طرف چل دیا اور کمال نے دیکھا۔ چمپا باجی ایک بار پھر دور کھڑی رہ گئیں۔ ٹوٹے ہوئے مکان کی دہلیز پر۔ اسی طرح اس نے ان کو اوکسفرڈ اسٹریٹ پر چونسے کی سرائے کے شیشوں والے دروازے کے پیچھے تنہا کھڑا چھوڑ دیا تھا۔ اسی طرح وہ ایک مرتبہ گلفشاں کے پھاٹک کے سامنے اندھیری سڑک پر کھڑی رہ گئی تھیں جب

بھیا صاحب اُن کو چھوڑ کر پاکستان چلے گئے تھے۔

لیکن اس وقت وہ اکیلی نہیں تھیں۔ اب وہ ہجوم کا حصّہ تھیں۔ اُنھوں نے بالآخر غیر شعوری طور پر ہجوم کی دوسراتھ قبول کر لی تھی۔ چند سال پہلے کمال سوچا کرتا تھا۔ وہ آگے جا رہا ہے۔ چمپا پیچھے رہ گئی ہیں۔ وہ دُور نکل جائے گا۔ نئی دُنیاؤں میں۔ نئے خواب۔ عزائم آئیڈیلز۔

مگر آج اس سمے اس نے دیکھا کہ وہ آگے نہیں جا رہا۔ وہ مع اپنی دُنیا کے مسلسل مستقل مراجعت میں ہے اور تنہا ہے۔ چمپا جو اب تنہا نہیں، جلوس میں شامل ہیں آگے بڑھ رہی ہیں۔ ان کے ساتھ ان کے محلّے کی گلیاں، مسجد کے مینار، زیبا اور مریم، سڑک پر گولیاں کھیلتے ہوئے لڑکے، ٹھیلے والے، برقعہ پوش عورتیں، سب ہیں۔ چمپا باجی ان سب کی ساتھن بن گئی ہیں۔ یہ لوگ آگے بڑھنے کے لیے تیار ہیں۔ آج نہیں۔ کل سہی۔ ایک نہ ایک روز بہت جلد یہ لوگ ترقی یافتہ ہو چکے ہوں گے۔ اس نکتے پر پہنچ کر رسل کے فلسفے کے سارے غیر مرئی تار جھن جھنا کر ٹوٹ گئے۔

تانگہ اب قاضی کے بازار سے گزر رہا تھا۔ دکانیں بڑھائی جا رہی تھیں، چائے خانوں میں ریڈیو بج رہے تھے۔ سینما گھروں کے آگے ہجوم تھا۔ مغرب کے آسمان پر ایک کٹ کنکوا اُڑتا ہوا دکھلائی دے جاتا تھا۔

کیا کروں پارٹنر — ٹرین میں بیٹھتے ہوئے اس نے دل میں کہا — میرا بڑا افسوسناک خاتمہ ہوا ہے —

ٹرین شوالک کی پہاڑیوں سے گزرتی ہمالیہ کے ہرے بھرے دامن میں پہنچی۔ ہردوار رشی کیش۔ ہر کی پوڑی۔ دیودار کے جنگل۔ بانسوں کے جھنڈ۔ جھرنے۔ پہاڑی ندیاں۔ مندر۔ سادھو۔ چٹانیں۔ پھولوں سے لدے ہوئے درخت۔ دہرہ دون کے اسٹیشن پر اتر کر وہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں گیا۔ کلیم ار منقولہ اور غیر منقولہ کے کاغذات با مکان کے قبالے نکالے گئے۔ سرکاری قسم کی گفتگو ہوئی۔ پھر اس نے ڈالن والا کی خوبصورت سڑکوں پر گھومنا شروع کیا۔ اُس نے آخری بار مکانوں کے ناموں کی تختیاں پڑھیں۔

سامنے رسپنا بہہ رہی تھی۔

"یار ہری شنکر" کمال نے کہا۔

"ہاں یار۔"

"یار یہ پروفیسر ٹھیک تو کہتا تھا۔ ہم لوگ کس جنجال میں گرفتار ہیں خدا کی قسم۔"

اس روز انھوں نے تیاگ کے مسئلے پر کافی غور و خوض کیا۔ اور سخت فلسفیانہ موڈ ان پر طاری رہی۔

"آؤ کوٹھیوں کے نام پڑھیں۔ ناموں کے انتخاب سے مکینوں کی سائیکولوجی آشکار ہوتی ہے" چلتے چلتے رک کر ایک پھاٹک کے قریب جاتے ہوئے ہری شنکر نے کہا۔

"ہم کبھی مکان بنا کر نہیں رہیں گے کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ۔" کمال نے کہا۔

"ٹھیک کہتے ہو۔ دیکھو بورژوازی کس قدر افسوسناک طور پر جذبات زدہ ہے ذرا یہ نام پڑھنا۔"

"خوابستان — لاحول ولا قوۃ۔"

"مگر تم خود گلفشاں میں رہتے ہو۔"

"جانتا ہوں۔"

"یار کمال۔"

"ہاں یار"

"ذرا سوچو لوگوں نے مکان بنا رکھے ہیں۔ یہاں سے وہاں تک۔ ایک سے ایک خوبصورت۔ ساری دنیا میں مکان بنے ہوئے ہیں۔"

"ہاں یار۔ بڑی عجیب بات ہے۔"

وہ دونوں ایک پھاٹک کی پلیا پر بیٹھ گئے اور پھر اس مسئلے پر غور و خوض کرنے لگے۔ دراصل ان کو پروفیسر کے دنیا تج دینے نے بے حد مضطرب کر دیا تھا۔ "ایک صحیح الدماغ انسان سائنس داں اور لے کر چل دیا جنگل کو۔ حد ہے۔"

"اس کا مطلب کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔ معنی کے معنی —"

اندھیرا پڑتے تک وہ ڈالن والا کی خاموش معطّر سڑکوں پر مکانوں کے نام پڑھتے پھرے "نسترن" "دولت خانہ" "شیم روک" "آشیانہ" "راج محل"

ان مکانوں کے باغوں میں لگے ہوئے پہاڑی پھلوں کی مہک سارے میں اڑ رہی تھی لمود دنیا بڑی حسین جگہ تھی۔

وہ دونوں منہ لٹکا کر پھر ایک پھاٹک کی پُلیا پر بیٹھ گئے اور نہر کے پانی کو دیکھتے رہے جو سڑک کے کنارے کنارے بہہ رہی تھی۔ پانی میں ایک ٹوٹا پھوٹا جوتا دھارے کے زور سے اچھلتا کودتا چلا جا رہا تھا۔

ایک لمبی سی کار آ کر اس کے قریب رُکی۔ وہ چونک پڑا۔ آنکھیں مل کر اُس نے چاروں اور دیکھا۔ ہری شنکر غائب ہو چکا تھا۔ یہ ۴۷ء نہیں تھا۔ وہ ۵۶ء کے دہرہ دون میں موجود تھا۔ اُس نے دوبارہ آنکھیں ملیں۔ وہ تو اپنے ہی مکان کے پھاٹک پر بیٹھا تھا کار میں سے ایک خوش پوش سردار جی اتر کر اس کی طرف بڑھے۔

"آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں جی۔"

"میں — میں —" وہ گڑبڑا گیا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ سردار جی شاید اسے ٹھگ سمجھ رہے تھے جو ان کے ڈرائنگ روم سے ریڈیو چرانے کے ارادے سے آیا تھا۔ اُس نے دوبارہ پھاٹک میں لگی ہوئی سنگِ مرمر کی تختی پڑھی —

نواب تقی رضا بہادر آف کلیان پور۔

یہ اس کا مکان تھا۔ وہ پُلیا پر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا حلق سوکھ گیا۔ اُس نے ثبوت کے طور پر تبادلے کے کاغذات نکال کر سردار جی کو پیش کئے اور کھسیانی ہنسی ہنسا —

"اوہ — آپ مُوَ ایبل پراپرٹی کے سلسلے میں آئے ہو۔ تشریف لاؤ جی قسمی —"

وہ سردار جی کے ساتھ باغ کی سڑک پر داخل ہوا۔

"آپ کا اسٹور روم حفاظت سے بند ہے جی۔ کُنجی لائے ہو آپ —؟"

"جی ہاں۔"

ڈرائنگ روم میں لے جا کر سردار جی نے اسے چائے پلائی اور کھانا کھلانے پر مُصر رہے۔

سردار جی راولپنڈی کے رہنے والے تھے اور یہاں بہت بڑے ٹھیکیدار تھے۔ دیر تک وہ اپنے وطن کی یاد میں رویا گایا کئے۔ کمال گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"باکس روم کھولنے میں کل صبح آسکتا ہوں؟"

"ضرور جی۔ اپنا ہی گھر سمجھو۔" سردار جی نے کہا اور اپنی کار میں بٹھال کر اسے اس کی قیام گاہ تک پہنچایا۔

صبح کو وہ پھر "خیابان" پہنچا۔ اب دھوپ نکل آئی تھی۔ باغ میں دو نوجوان لڑکیاں ننگے پیر بیڈمنٹن کھیل رہی تھیں۔ سردارنی جی نوکروں پر چیختی چلاتی پھر رہی تھیں اور بھینسوں کی سانی کروا رہی تھیں۔ اندر ریڈیو بج رہا تھا۔ بڑا پُرسکون منظر تھا۔ وہ پہلو کے راستے سے گزرتا اسٹور روم پہنچا اور تالہ کھولنے سے پہلے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔

وہاں ان سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا وہ بیسویں صدی کے ہندوستان کی "گم شدہ نسل" کا ایک فرد تھا۔ اس نے محسوس کیا۔ اس کے خاندان والوں کی دنیا، خزاں زدہ جنگلوں، گلاب کے پھولوں، پہاڑی کالجوں اور تیسرے پہر کی چاندنی میں چاندی کی جھلملاتی بُرنی چائے دانی کی دنیا تھی۔ سامنے دیوداروں کے درمیان سے جو پگڈنڈی گزرتی تھی۔ اُس کے خاندان کی خواتین، رنگین چھتریاں سنبھالے، اس پر چلتی ہوئی کسی پرانے ترکی یا یوروپین افسانے کی خوابناک فضاؤں میں تیرتی معلوم ہوا کرتی تھیں۔

"خیابان" میں چھ بڑے بڑے کمرے تھے، جن کے چاروں اور ——— مزید کمرے اور برآمدے اور گیلریاں۔ جاڑوں میں جب کبھی وہ یہاں آتے وسط کے کمرے میں فرش پر گدّے بچھا دئے جاتے۔ پہاڑی خانساماں فقیرا چار کی کشتی لا کر آتشدان کے سامنے رکھ دیتا۔ آنگن میں چمپا کا ایک درخت کھڑا تھا۔ اس کے تین طرف برآمدے تھے جن میں سے ایک کے سرے پر یہ اسٹور روم تھا۔ آنگن میں اس طرح کا گھریلو ماحول رہتا۔ جس کا ذکر سرت چندر کے ناولوں میں عموماً پایا جاتا ہے۔ جاڑوں کی راتوں میں کمال اور طلعت کے سامنے کتابوں کا ڈھیر لگا ہوتا۔ رنگ بھرنے کی کتابیں۔ پریوں کی کہانیاں، گڑیاں اور میکینو سیٹ۔ جب کبھی یہ گودام کھلتا تو سب بچوں کی طرح شدید تجسس اور اشتیاق سے وہ

بھی اماں بیگم کے پیچھے پیچھے اس میں جا گھستا۔ کیسی کیسی پُراسرار چیزیں اس میں بند رہتی تھیں۔ صندوق۔ ٹوکریاں۔ برتن۔ جھاڑ فانوس بڑے بڑے لیمپ۔ پرانے رسائل۔ خطوں سے بھرے ہوئے اٹیچی کیس۔ نواڑوں کے بنڈل۔ دریاں۔

سردیوں میں کرسیاں بجری پر ڈالے بابا بیٹھے حقہ گڑگڑایا کرتے۔ پیچیوں کے درختوں پر سے کہرہ رفتہ رفتہ چھٹتا۔ شاگرد پیشے میں ترلوچن مالی نے کمرے کی دیوار پر ایک بڑی سی رنگین تصویر لئی سے چپکا رکھی تھی۔ جس میں دکھایا گیا تھا کہ جو منش دنیا میں برے کام کرتے ہیں نرک میں ان کا کیا حشر ہوتا ہے (مثلاً ایک تصویر تھی کہ ایک آدمی مریل سے بیلوں پر منوں بوجھ لادے گاڑی ہنکاتا چلا جا رہا ہے۔ برابر کی تصویر میں وہی آدمی نرک میں ایک گاڑی میں جتا تھا اور لمبی لمبی زبانیں نکالے بندر نما فرشتے گرز مار مار کر اس کو ہانک رہے تھے) اور روزی جمعدارنی جس کی لڑکی انگریزوں کے یہاں آیا گیری کرتی تھی۔ جب چائے دانی کوڑے کی بالٹی میں انڈیلی جاتی تو وہ چائے کی پتیاں اس میں سے نکال کر گھاس پر سکھاتی اور ان کی چائے بنا کر پیتی۔

لکھنؤ سے سارا عملہ ساتھ آتا۔ قدیر جو ہرے رنگ کی لوئی اوڑھے ٹھاٹھ سے بے تانگ کی کرسی پر اپنے کمرے کے آگے بیٹھے رہتے۔ باورچی خانے کے سامنے کٹھل کا درخت تھا حسینی کی بی بی روز کھڑے ہو کر اس کے پھل گنتیں۔

فرنیچر پر سرخ رنگ کا کپڑا منڈھا تھا۔ مونج کے فرش۔ سرخ اور عنابی قالین۔ سامنے کے برآمدے میں دیوار پر ایک رنگین تصویر فریم میں لگی تھی جس میں شکاری کتے ایک بارہ سنگھے کا تعاقب کر رہے تھے۔ ڈرائینگ روم کا آتشدان بانات کی کارچوبی جھالر سے آراستہ تھا اس پر چاندی کے فریموں میں اہلِ خاندان کی تصویریں دھری تھیں۔ کونوں میں پیتل کے بول اسٹینڈز پر رکھے تھے جن میں پام کے گملے رکھے جاتے۔ ڈرائینگ روم کی ہر چیز میں روز تازہ پتے بھرے جاتے جن کی بڑی اچھی سی مہک آتی۔ ڈنرز کے موقع پر میز خالص انگریزی اسٹائل سے سجائی جاتی۔ چھری کانٹے۔ فنگر بول جن میں گلاب کی پتیاں تیرتیں۔ بیرہ ہمیشہ باضابطہ چپکن پہنتا اور صافے پر چاندی کا بلا لگاتا اور کمر میں پٹا باندھتا۔

گرمیوں کی دوپہروں میں جب سارا گھر سو جاتا تو کمال چپکے سے باہر نکل کر پیچیوں کے خنک

جھنڈ میں جا بیٹھتا۔ ایک عظیم آفاقی کاہلی سارے میں چھائی ہوتی۔ بڑے پُرسکون خیالات دماغ میں آتے۔ دور دیوداروں میں ایک پرندہ متواتر بے تکان چلائے جاتا — میں سوتا تھا۔ میں سوتا تھا — کہا جاتا ہے کہ یہ پرند شوالک کی وادیوں کے علاوہ اور کہیں نہیں پایا جاتا۔ اور اسے کبھی کسی نے دیکھا بھی نہیں۔ پہاڑی نوکر کہا کرتے تھے کہ جب پرجاپتی دُنیا بنا رہے تھے اور سارے جانداروں کو ان کی قسمتیں اور اوصاف بانٹے جا رہے تھے (مور کو پَر ملے کوئل کو آواز۔ وغیرہ) اس وقت یہ یہیں کہیں پڑا سو رہا تھا۔ لہٰذا اب یہ اس کا جنم جنم کا رونا ہے۔ اس کی آواز پر کان لگا کر سُنو تو صاف سُنائی دیتا تھا — میں سوتا تھا۔

سردارنی جی ننگے پیر پٹر پٹر کرتی ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جا رہی تھیں۔ انھوں نے زور سے پنڈی کا دروازہ بند کیا۔

کمال چونک کر ۱۹۳۵ء کے دہرہ دون سے بھی واپس آگیا۔

سیڑھیوں پر سے اُٹھ کر اس نے جیب سے کنجی نکالی اور گودام کا دروازہ کھولا۔ اندر جا کر وہ الماریوں کو بے دھیانی سے کھولتا بند کرتا رہا۔ صندوقوں میں جھانکا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ ملکیت کا کیا مصرف ہے۔ اُس نے اس انبار پر نظر ڈالی جسے انسان اپنی ذاتی ملکیت کہہ کر خوش ہوتا ہے اور اس طرح کے سامان کے پشتارے ابھی گلفشاں اور کلیان پور کی حویلی کے کمروں میں مقفّل تھے۔ کمرے کے وسط میں تھوڑی سی خالی جگہ کا جزیرہ سا بن گیا تھا۔ اس میں کھڑے ہو کر وہ سوچتا رہا — اس ملکیت کے لئے دُنیا مری جاتی ہے — !

ان سب کے بدلے میں ایک مرگ چھالا — ایک مرگ چھالا — !

اب جا کر اس کی سمجھ میں آیا کہ لوگ دُنیا تج کر جنگلوں میں کیوں جا بیٹھتے تھے۔

پھر اس نے اکڑوں بیٹھ کر کاغذات کی صندوقچیاں کھولیں۔ چاروں طرف رسالوں اور کتابوں اور پُرانی تصاویر کے انبار لگے تھے۔ اُس نے خط و کتابت کا ایک ٹوٹا پھوٹا اٹیچی کیس اُٹھایا۔ لفافے جن پر عجیب عجیب مُہریں تھیں۔ پٹنہ ۱۹۳۳ء۔ بلاسپور ۱۹۲۹ء۔ جھالاواڑ ۱۹۳۷ء۔ جانے ان خطوں میں کیا تھا۔ اور کن لوگوں نے یہ خط لکھے تھے اور اب وہ کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے۔ مثلاً راس بہاری لال کا خط جو ۱۹۳۴ء میں پٹی بھیت

سے آیا تھا اور شکست میں لکھا تھا۔ یہ صاحب کون تھے اور کیوں تھے اور وشوا نندن پانڈے رانی کھیت۔ اور محمد احمد عباسی منصف ضلع گونڈہ۔ وہ فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اُس نے "خطوکتابت" کے صندوقچے واپس ایک الماری میں ٹھونس دیئے۔ قالینوں کے انبار کے نیچے فائلیں دبی تھیں۔ مقدمات۔ زمینیں۔ مکانات۔ نان و نفقہ۔ خالہ چھنی بیگم کا چھٹم چھٹا جب میر مُرغی سے ہُوا تھا۔ اس کے سارے کاغذات اور ایک تاریخ اودھ بالتصویر جس کا کاغذ اتنا پیلا ہو چکا تھا کہ ہاتھ لگنے سے ٹکڑے ٹکڑے ہُوا جا رہا تھا جس کے اوّلیں صفحے پر ہز ہائی نس دی آنریبل سر مہاراجہ ڈگبجے سنگھ بہادر کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ بلرام پور و تلسی پور صوبہ اودھ کی نہایت مسخرے پن کی قلمی تصویر چھپی تھی اور ان کے قلم سے لکھا ہُوا نہایت مقفّع و مسجع عبارت کا دیباچہ تھا ـــ "القصہ ایسی بے التفاتی کی باتوں سے مضطر ہو کر ایک دن عالی جاہ بسبب تحریک مصاحبانِ سفاہت شعار بغور۔ تامّل و تفکر و تامّل اندیشی لباس گبرو افغر اکا پہن کر بورئیے پر بیٹھے اور رفقائے خاص بھی اسی صورت سے بنے انگشت نمائے خاص و عام ہوئے۔ جناب عالی نے اپنی رفع بدنامی سمجھ کر علی ابراہیم خاں کو نواب عالیہ کی طرف سے کہلا بھیجا کہ میں نے بادشاہ کے حکم سے ـــ"

کمال نے دوسرا صفحہ پلٹا ـــ

"پس صاحبان عالی شان نے سمجھا تسخیر بلادِ ہندوستان تو اسی دن ہو چکا تھا۔ شرق سے غرب تک حقیقت کھل چکی تھی۔ لہٰذا اس زینۂ وزارت پر مستقل رہنا چاہئے پھر مدارجِ سلطنت پر جانا آسان ہو جاوے گا اور یکایک کسی کے گھر میں چلے بجانا چاہئے۔ اگرچہ اس میں ایک مدت گزر جائے۔ اب یہ سب حقیقت حال اس زمانے کی کھل گئی۔ اتفاق قوم سب کا جاتا رہا۔ گویا سب چراغِ ہندوستان بجھ گئے۔"

"ـــ انتقال مرزا وزیر علی خان ـــ بابت ماہ جون ۱۸۱۶ء۔ کلکتہ کے کاسی باغ میں جہاں ٹیپو سلطان کا بیٹا بھی دفن ہے مدفون ہوئے۔ چند غربائے شہر وزیر مینار سمجھ کر ساتھ تھے کچھ شہر کی کسبیاں اُن کی سخاوت و بیکسی یاد کر کے اپنے اپنے دروازوں پر کھڑی

روتی تھیں۔ صاحب نے حکم دیا۔ گورے قنات کے باہر کھڑے رہیں۔ تابوت پر گوروں کا پہرہ تھا۔ اوس عہد میں صاحب ریذیڈنٹ لکھنؤ جان لمسڈن صاحب۔ بنارس میں جان چیری صاحب مقتول نائب تفضل حسین خاں تھے —'

'— مرزا مظفر بخت شاہزادے بیٹے مرزا سلیمان شکوہ، ایک دفعہ اپنی اولوالعزمی و طمع دُنیا سمجھ کر لکھنؤ سے باہر نکلے۔ لکھنؤ کے جو لوگ پریشان حال و معطل تھے ساتھ ہوئے جب ناکام لکھنؤ پھرے سیتی بیگم منجملہ بی بی ہائے جرنل مارٹن سے نکاح کیا اونھیں کی پنشن میں بسراوقات رہی۔ بعد گوری بی بی کے مرنے کے اُنھیں کے مکان میں رہتے تھے۔'

'جانا کرنل ڈبوا صاحب و فریل صاحب و مولوی محمد اسمٰعیل کا لندن کو بسفارت مع ہدایائے شاہ جم جاہ جارج چہارم —'

کتاب اُس نے ٹوکری میں واپس پھینک دی۔ اُس کے ہاتھ پر جو گرد لگ گئی تھی چند لمحو تک وہ اسے افسردگی سے دیکھا کیا۔ بہت دیر تک اُس نے اپنے ہاتھ نہیں پونچھے۔

یہ سامان کہیں نہیں جائے گا۔ ان سب چیزوں کو ضبط ہو لینے دو۔ اُس نے دل میں کہا۔ گودام سے نکلتے ہوئے اُس نے ایک بیس سال پرانا گروپ فوٹو فرش پر سے اُٹھا لیا۔ اس میں بڑے ابا مرحوم ہار پھول پہنے درمیان میں بیٹھے تھے۔ یہ کسی ضلع کا الوداعی گروپ تھا جس میں بہت سے ڈپٹی کلکٹران اور وکلاء قطار میں بیٹھے تھے۔ پیچھے بڑے بڑے دروازوں والا برآمدہ تھا۔ سکینہ صاحب۔ رضوی صاحب۔ ٹھاکر رام نرائن صاحب مسعود الحسن صاحب۔ یہ کیسے عجیب لوگ تھے۔ سیدھے سادے۔ شریف۔ بھولے بھالے جعلسازی غالباً ان میں سے کسی کو نہ آتی ہوگی۔ ریکٹ چلانا ان کا مشغلہ نہ رہا ہوگا۔ فراڈ اور چار سو بیس سے یہ حضرات ناواقف تھے۔ کس قدر بیوقوف لوگ تھے۔ ان کے مخصوص طرح کے مذاق ہوتے تھے مخصوص مشغلے مشاعرے۔ مقدمے بازیاں۔ شکار۔ پکے گانے کی محفلیں۔ کیسی پُرامن زندگیاں یہ لوگ گزار گئے۔ اسے ان لوگوں کے مذاق یاد آئے۔ رضوی صاحب کی چڑ گلاب جامن تھی۔ ان کے سامنے گلاب جامن کا دونا دھرا ہے اور وہ ہائے توبہ کر رہے ہیں۔ ٹھاکر صاحب کی توند پر پھبتیاں کسی جا رہی ہیں۔ میرٹھ کی نوچندی جا

پروگرام بن رہے ہیں چھڑیوں کے میلے کا تذکرہ ہے۔ سالے بہنوئیوں کی چوٹیں چل رہی ہیں۔ کیسا پُرسکون ان کا معاشرہ تھا۔ کمال اس تصویر کو دیکھتا رہا۔ ہم نے کس طرح ان کی نسل سے خود کو بہتر ثابت کیا ۔۔۔؟ بے چارے بوڑھو ۔۔۔ میں تمہارے آگے شرمندہ ہوں۔ میں تم کو اپنا مُنہ نہیں دکھانا چاہتا۔ میں اپنا مُنہ چھپا کر دُور بھاگ رہا ہوں ۔۔۔ خدا حافظ۔ اُس نے گروپ کو آہستہ سے پھر گودام کے فرش پر گرا دیا۔ اور تالہ لگا کر باہر آگیا۔

دیوداروں میں پرندہ بدستور چلّائے جا رہا تھا۔ میں سوتا تھا ۔۔۔ میں سوتا تھا ۔۔۔ ارے سوتا بھی تھا تو کیا حرج تھا ۔۔۔ کمال نے جھنجھلا کر دل میں کہا۔ جگ رہا ہوتا تب بھی پرجاپتی مجھے کون بڑا سکھ عطا کر دیتے۔ مگر پچھتاوے کے احساس اور توبہ تِلّا سے بھی تو اپنی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ ارے میں پوچھتا ہوں آپ ہیں کون چیز۔ کمال رضا۔ اور سرل ایشلے۔ اور گوتم نیلمبر ۔۔۔ جو طرح طرح کی ٹرٹر لگا رکھی ہے ۔۔۔

دلّی کے اسٹیشن پر جیجا جی اُس کے منتظر تھے۔ ان کے ہمراہ وہ جمنا روڈ آیا۔ لاج برآمدے میں کھڑی اُس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ وہ اس سے لپٹ کر رونے لگی ۔ "مت جاؤ کمّن ۔۔۔ نرمل سورگباشی ہو گئی۔ شنکر سدا باہر رہتا ہے۔ تم پاکستان چلے گئے ۔۔۔" روتے روتے لاج وتی کی ہچکی بندھ گئی۔

وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ "کاہے روتی ہو ۔۔۔" اُس نے آہستہ سے کہا۔ "روؤ متی ۔۔۔"

اس کی ٹرین شام کو امرت سر جاتی تھی۔ مگر وہ جلد از جلد لاج وتی کے گھر سے بھاگنا چاہتا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ جیجا جی کے ساتھ نئی دلّی جانے کے لئے تیار ہوا

"ارے گوتم کو تو فون کر لو۔ وہ چندی گڑھ گیا ہُوا تھا۔ شاید لوٹ آیا ہو ۔۔۔" جیجا جی نے کہا۔

کمال نے بیدلی سے ٹیلیفون ڈائریکٹری اٹھائی اور اوراق پلٹنے لگا۔ بہت سے جانے پہچانے نام صفحات پر اسے نظر آئے۔ مس صولت رحمٰن فلمز ڈویژن مس کملا جسپال منسٹری آف ایکسٹرنل افیرز۔

اُس نے صفحے پلٹے۔ مرولا، ہرتیش چندر نرائن، ایم جے، نیلمبر، گوتم ——

—— اس نے نمبر ڈائل کیا۔

"ہلو —— ارے تم یہیں موجود ہو —— اُلّو کے پٹھے ——" اُس نے بے حد کوشش کرکے نارمل بشاش آواز میں بات شروع کی۔" ابے یار —— ہاں ہاں۔ آج ہی صبح دہرہ دون سے —— ہیں —— ؟ ہاں ڈھاکہ سے آرہا ہوں بذریعہ ریل گاڑی۔ لکھنؤ میں؟ —— ہاں۔ امّی نے تم کو دعا کہلوائی ہے —— ہاں —— ہاں مزے میں ہیں۔ سب مزے میں ہیں اِلّا میرے۔ کیا کہا میں نے ؟ کچھ نہیں میں کہہ رہا تھا میں بھی بہت ٹھاٹھ کر رہا ہوں آج کل۔ نام بنام سب کی خیریت بتاؤں ؟ —— پوچھو —— تدیّر اور قمرن ؟ بھئی واہ۔ تم کو خوب یاد رہے۔ تم کو کون چیز یاد نہیں ہے ؟ سب یاد ہے ، تمہارا حافظہ بہت تیز ہے ماشاءاللہ۔ تدیّر تو زمانہ ہوا۔ مرزا پور واپس چلے گئے۔ موٹر کب کی بک گئی۔ کیوں بک گئی ؟ —— اجی یہاں زندگیاں ہی بک گئیں۔ تم ایک موٹر لئے پھرتے ہو۔ تم نہیں بکے —— ؟ ہاں ہاں میں کب کہتا ہوں۔ میں تو اپنی بات کر رہا تھا۔ قیمت اچھی مل رہی تھی۔ یونہی کا وقت تھا۔

اور پوچھو —— کس کس کی خیریت دریافت کرنا ہے —— چھٹکی۔ رم دیا —— ؟ غضب خدا کا، تم کو چھٹکی اب تک یاد ہے —— ؟ اس غریب کا انتقال ہوگیا۔ ہاں بڑا افسوس ہوا —— کیسے ؟ برسات میں گلفشاں مرحومہ کے باغ کی گھاس کھود رہی تھی۔ سانپ نے کاٹ لیا۔ ہاں کئی سال ہوگئے اسے مرے۔ گنگا دین تو آج کل کہیں مدھیہ پردیش میں ٹریکٹر چلا رہا ہے۔ اُس نے اپنی بتا رہی تھیں ایف اے پاس کر لیا ہے ہاں۔ اسے اصل ترقی کہتے ہیں —— میں گنگا دین کے کریر کا احوال سن کر بہت خوش ہوا۔

—— اور باتیں کروں —— ؟ نہیں میں تم سے مل نہیں سکتا۔ مجھے فرصت نہیں ——

ہیں ؟ تمہاری کانفرنس تین بجے ختم ہوگی ۔ اس کے بعد تم میرا انتظار کروگے ۔ الیس ہیں ؟
— کیا کروگے انتظار کرکے ۔ نہیں ۔ میں کسٹوڈین سے ملنے جا رہا ہوں ۔ 'پی' بلاک —
اس کے بعد — اچھا دیکھو پہنچنے کی کوشش کروں گا — مگر میرا زیادہ انتظار نہ کرنا
— اچھا ۔ سو لونگ — "

کمال نے ٹیلیفون بند کر دیا ۔ لاجونتی دروازے میں کھڑی تھی ۔ " اچھا اب میں چلا — "

" جلدی آنا — "

" ہاں ہاں ۔ "

" تمہارے ناشتے کے لئے کیا کیا بنا دوں ۔ "

" وہی سب جو ہمیشہ بناتی ہو — " وہ ذرا جھنجھلا کر بولا ۔ تم یہ اپنا بہنوں کی محبت والا جال پھیلاتی رہو ۔ میرا دل اس سے تھوڑا ہی پسیج سکے گا ۔ نہ میرے قدم ڈگمگائیں گے ۔ میں مضبوط ہوں ۔ میں بوڑھا ہوں ۔ مجھ میں ضبط اور توازن اور سکون ہے ۔ اس نے دل میں کہا ۔

وہ جمنا روڈ سے نکلا ۔ علی پور روڈ ۔ کشمیری گیٹ ۔ سینما کے بڑے بڑے اشتہار ۔ لال قلعے کا میدان ۔ دوکانیں ۔ نئے نئے بازار ۔ کناٹ پلیس پہنچ کر وہ دوکانوں میں رکھی ہوئی نئے ہندوستانی مصوروں کی پینٹنگز دیکھتا پھرا ۔ برآمدے میں سے گزرتی ہوئی ایک لڑکی میں اسے سرکھیا کی جھلک نظر آئی ۔ وہ ذرا آگے بڑھا ۔ وہ کوئی اور لڑکی تھی ۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی ۔ ابھی تین بجنے میں بہت دیر تھی ۔ سارا دن باقی پڑا تھا ۔ سرکھیا ہی سے چل کر مل لوں ۔ اس نے کاہلی سے سوچا ۔ " یہاں ڈانس اکیڈمی کا پتہ بتا سکتے ہیں ۔ " اس نے ایک آدمی سے پوچھا ۔

" کون سی ڈانس اکیڈمی ۔ یہاں بے شمار ڈانس کالج ہیں ۔ آپ سنگیت اکادمی تشریف لے جائیے ۔ وہاں سے آپ کو شریمتی سرکھیا دیوی کا پتہ معلوم ہو جائے گا ۔ " اس نے یہ ارادہ بھی ترک کیا ۔ اپنے جانے پہچانے کناٹ پلیس میں وہ اجنبیوں کی طرح گھومتا رہا ۔

موٹر کاروں، خوشحال مطمئن انسانوں، مصروف کاروباریوں، عظیم الشان دوکانوں کے وسط میں کھڑے ہوئے اسے بے حد ڈر لگا۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ جانے سے پہلے اسے سول لائینز کے تھانے میں جا کر اطلاع کرنی ہے کہ وہ ہندوستان سے جا رہا ہے۔

بھادوں کے مہینے کی دھوپ بڑی سخت تھی۔ وہ بہت مضطرب، بہت تھکا ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ پَر لگا کر کراچی واپس پہنچ جائے۔ اس نے طے کر لیا۔ اب وہ ہندوستان کبھی نہیں آئے گا۔

"وہ دیکھو سامنے سے کون آتا ہے۔" اُس نے ڈاکٹر ہینس کریمر کو دیکھ کر مصنوعی بشاشت سے کہا۔ دل میں خوش بھی ہوا کہ پہاڑ سی دوپہر ان کی سنگت میں کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جائے گی۔

"ہلو — ہلو — مائی ڈیر بوائے —" ڈاکٹر ہینس کریمر نے بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔ "کیا عجیب اتفاق ہے۔"

ان کے ساتھ انفرمیشن ڈویژن کی ایک لڑکی تھی۔ اُس نے متانت سے کمال کے سلام کا جواب دیا۔ اور ایک پمفلٹ سے پنکھیا جھلتی رہی۔

"بڑی شدید گرمی ہے۔" ڈاکٹر ہینس کریمر نے خوشی سے باغ باغ ہوتے ہوئے کہا۔ "بالکل خالص مشرقی موسم!!"

کمال بھی تکلفاً ہنسا۔

"میں ڈاکٹر کو قومی میوزیم لیے جا رہی ہوں۔ آپ بھی چلئے۔ اگر آپ کو اور کوئی کام نہ ہو" لڑکی نے جس کا نام شاید کماری اہونا باجپئی تھا۔ کمال کو مخاطب کیا۔ کمال نے آنکھیں بند کر لیں۔ اگر نرملا زندہ ہوتی تو آج وہ بھی اسی طرح کام میں مصروف ہوتی۔

"جی ہاں۔ ضرور۔" اُس نے جواب دیا۔

براڈکاسٹنگ ہاؤس سے دو اور یوروپین دانشوروں کو ہمراہ لیتے ہوئے وہ راشٹرپتی بھون روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر ہینس کریمر اور ان کے ساتھی اسی دنیا کے باسی تھے جس میں کمال کچھ عرصہ قبل خود شامل تھا۔ ان کا بھی زندگی سے وسیع تر آؤٹ لک تھا۔ انھیں بھی چیزوں میں رمزیت

نظر آتی تھی۔ ان کے پاس بھی علم کے علاوہ ادراک تھا۔ یہ بدھ جینتی کے لئے ہندوستان آئے ہوئے تھے اور سری نگر کے ایک ہاؤس بوٹ میں رہ کر ہندوستانی فنِ سنگ تراشی پر ایک کتاب لکھ رہے تھے۔ ان سے ملنے کے لئے ان ہی کی طرح دوسرے ملکی اور غیر ملکی دانشور ان کے یہاں جاتے۔ یہ ہاتھ ملتے جاتے اور فرش پر کشن اور چٹائیاں بچھاتے اور سبز چائے تیار کرتے اور کپل کا تذکرہ ہوتا۔" ابھی میں راہل سنکرائتن سے ملنے الموڑے گیا تھا۔" ڈاکٹر کریمر نے کمال سے کہا۔

"خوب۔"

"مارگ میں میرا اپنا مضمون ضرور پڑھنا۔"

"ضرور۔"

"تم ملک راج سے واقف ہو۔"

"جی ہاں۔"

پھر انھوں نے دوسرے ناموں کا ذکر شروع کیا۔ ہمایوں کبیر۔ تارا علی بیگ۔ اگرجین کارل کھنڈالاوالا۔ کمال موٹر کی کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔

راشٹرپتی بھون کی سیڑھیوں پر پہنچ کر ڈاکٹر ہینس کریمر نے ہاتھ ملتے ہوئے نظریں اوپر اٹھائیں اور سونے کے شیروں کے نیچے لکھا ہوا "ستیہ میو جیتے" باوازِ بلند پڑھا — "سچ جیتے گا۔" انھوں نے کمال کی خاطر اس کا ترجمہ کیا اور ذرا کی ذرا آنکھیں بند کر لیں۔ پھر وہ سب کماری رونا کی قیادت میں اندر داخل ہوئے۔ سابق وائسریگل لاج کے عظیم الشان مرمریں ایوانوں میں بے اندازہ خنکی تھی جو باہر کی کڑی دھوپ کے مقابلے میں بہت آرام دہ معلوم ہوئی۔ عہدِ عتیق اور قرونِ وسطیٰ کے مجسموں نے کمال کو اپنی بے نور آنکھوں سے گھورنا شروع کیا۔ ڈاکٹر ایک ایک مجسمے کے سامنے ٹھٹھک کر فرانسیسی یا جرمن میں تبادلۂ خیالات کرتے۔ دربار ہال میں وائسرائے ہند کے تخت کی جگہ مہاتما بدھ کا شاندار قدیم مجسمہ استادہ تھا۔ اس کے پس منظر میں عنابی رنگ کے مخملیں پردوں کا آبشار سا گر رہا تھا۔ کمال تخت کی سیڑھیوں پر جا کر بیٹھ گیا۔ چاروں طرف برٹش میوزیم کا سا ماحول طاری تھا۔

"یہ تو عارضی میوزیم ہے۔" اس کے قریب آکر کماری اروناؔ نے معذرت خواہ انداز میں کہا۔ "ہمارا زیرِ تعمیر قومی عجائب خانہ ہمارے ورثے کے شایانِ شان ہوگا۔"

"جی — یقیناً۔" کمالؔ نے جواب دیا۔ سال بھر قبل وہ خود اسی دلّی میں ٹام سے اسی لہجے میں باتیں کر رہا تھا۔ "آپ نے ہماری تازہ ترین عمارات دیکھیں —؟ ریزرو بنک آف انڈیا — اور — اخباروں کے دفاتر کی فلیٹ اسٹریٹ جو بننے والی ہے اور اسوکا ہوٹل —" کماری اروناؔ نے بحیثیت ایک فرض شناس انفرمیشن آفیسر اس سے پوچھا۔

"جی۔" کمالؔ نے اسے یہ بتانے کی ضرورت نہ سمجھی کہ وہ خود بھی یہیں کا رہنے والا تھا —

"آئیے ادھر چلیں — آپ نے ہمارے موہن جوڈارو کی قدیم تہذیب کی "ڈانسنگ گرل" دیکھی —؟"

کماری اروناؔ اسے سنگِ مرمر کی گیلریوں میں گھماتی پھری۔ چنہو دارو۔ موہن جوڈارو۔ وادیٔ سوات۔ ہڑپہ۔ ٹیکسلا۔ روپڑ۔ اب ہم موجودہ زمانے کے قریب آتے جا رہے ہیں۔" اس نے ایک جگہ رُک کر کہا — "یہ پتھر دیکھئے۔ یہ اشومیدھ تیسری صدی قبل مسیح میں دہرہ دون کے علاقے میں منعقد کیا گیا۔ یہ اہی چھتر کے مجسّمے ہیں۔ اہی چھتر کو اب ضلع بریلی کہتے ہیں —" اس نے مڑ کر ہینس کریمر سے کہا جو اس دوران میں ان کے قریب آکر کھڑے ہو گئے تھے۔

چلتے چلتے وہ ایک عورت کے مجسّمے کے سامنے آئے۔ یہ ARCHAIC وضع کا تھا۔ "یہ شراوستی کی کُھدائی سے اسی سال نکلا ہے" — ایک لڑکی کدم کی ٹہنی جھکائے درخت کے تنے سے لگی کھڑی تھی۔ "سُرخ مٹی کی اس مورتی کا سن غالباً چوتھی صدی قبل مسیح ہے۔" ڈاکٹر ہینس کریمر نے اپنا مسودہ نکال کر پروفیشنل آرکیالوجسٹوں کے انداز میں اپنے فرنچ ساتھی سے کہا۔

وہ ٹھنڈے فرش پر مورتی کے آگے بیٹھ گئے۔ مورتی کے نقوش میں قوت تھی۔ زندگی کی سُرخی اور تپش۔ ماورائے حیات کے بجائے حیات۔ زمین کی اہم تخلیق۔

اس کی بانہیں بہت گداز تھیں۔ آنکھیں بہت بڑی بڑی۔ جسم مضبوط اور سڈول۔ خطوط اور حجم اور توازن شانت اور لوچ اور حرکت کے احساس کا مکمل امتزاج۔ ایک لرزہ خیز حسن پتھروں سے تشکیل ہوا ہے ۔۔۔ بھاری۔ منجمد۔ خوفناک۔۔۔ موسیو راؤل نے ایش کی مانند کہا۔

"فن سنگتراشی کے آئندہ نظریوں کی داغ بیل یہیں سے پڑی۔" ڈاکٹر کرمیسر نے کہا۔ "یہ متھرا سے پہلے کا نمونہ ہے۔ اب ہمیں اس فن کی تاریخ کے متعلق بہت سی تھیوریز کو بدلنا پڑے گا۔"

"اس عہد کے فن کاروں کے سامنے، یہ مسئلہ رہا ہوگا کہ خیال محض علامت کے ذریعے دیکھنے والے تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ اسی نظریے نے ویدوں کے عہد کے بعد اصنام پرستی کی ترویج کی۔" ارونا نے اظہارِ خیال کیا۔

روپ اور ارُوپ اور بھاؤ اور ابھاؤ کے متعلق وہ جو کچھ جانتا تھا اب وہ کس سے کہنے جائے گا۔ اس سارے علم کا اسے اب کوئی فائدہ نہیں۔ کمال نے سوچا۔ اس حیرت انگیز مورتی کے پاس اس کے لئے کوئی پیغام نہیں۔

"ویدانت کے نزدیک خالص جمالیاتی تجربہ غیر متعلق آنند ہے۔" ڈاکٹر راؤل نے کہا۔ "بجلی کی طرح اکھنڈ ہے۔ اسے تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ خود ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی سوپرکاش ہے۔ جس طرح فن کار کا تصور وشواکرمن کے تصور میں شامل ہے۔ اسی طرح دیکھنے والا آتما یا خود میں موجود ہے۔ جو ہمہ وقت دیکھتا ہے اور جس کا سروپ ساری کائنات کا مظہر ہے سَت چِت آنند روپم پرتی روپ ۔۔۔ تمہارا کیا خیال ہے ویدانت کے اس نظریئے کے متعلق ۔۔۔؟ تمہیں یہ مجسمہ اچھا لگا ۔۔۔ یا تم متھرا کے اسٹائل کو ترجیح دو گے ۔۔۔؟" ڈاکٹر موصوف نے مڑ کر کمال سے پوچھا۔

"بھوکشتم ناپرتی بھاتی کم چِت[1] ۔۔۔ میں جمالیات اور مابعد الطبیعات کی موشگافیاں

---

[1] بھوکے کو کوئی شے اچھی نہیں لگتی۔

کرنے سے قاصر ہوں۔" اس کی آواز کی بے پناہ تلخی اور اُداسی نے سب کو چونکا دیا۔

"یہ کمیونسٹ ہے ___" ڈاکٹر آشیورٹ نے طے کیا۔

اس کے فرسٹریشن کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ کماری اَرونا نے سوچا جو امریکہ سے نفسیات میں ڈاکٹریٹ کر کے آئی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر کمال کو دیکھا اور سوچا۔

پڑھا لکھا لڑکا ہے اور کتنا خوش شکل۔ "آپ سنسکرت بھی پڑھ چکے ہیں۔" اس نے توصیفاً کہا۔

"پڑھی تھی ایک زمانے میں۔" کمال نے مختصر جواب دیا۔

پھر اس نے گھڑی دیکھی۔ کسٹوڈین سے ملنے کا وقت قریب آرہا تھا۔

وہ مورتی کے چبوترے پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا ___ مورتی کا پتھر خنک تھا۔ پتھر جو TIMELESS BECOME کی علامت ہے ___ حال کا بہاؤ اس قدر تیز ہے کہ جو پتے پچھلے کلپوں سے بہتے ہوئے آرہے ہیں۔ وہ اب آن کر دلدل میں پھنس گئے ہیں۔ اُس نے دل میں سوچا۔ جبھی سے تو میں کہتا ہوں۔ ایک کدال لے کر ان پتوں اس کوڑے کرکٹ کی صفائی کردو۔ آج کل میں صفائی میں لگا ہوں۔ دماغ کی۔ دل کی۔ ذہن کی۔ عقل کی صفائی، اسپرنگ کلیننگ۔ اس ماضی سے میں ناطہ توڑ چکا ہوں۔ اُس نے ان یورپین ماہرین کو بتانا چاہا۔ پھر وہ مورتی کی طرف مڑا ___ اسی لئے شراوستی کی سدرشن یکشنی! جو کوئی بھی تیرا بنانے والا تھا۔ وہ اپنا پیغام مجھ تک نہیں پہنچا سکا۔ تیرا خالق اب مجھ سے کمیونی کیٹ نہیں کرے گا۔ میں روپ اور اروپ کی بحث میں حصہ لینے سے انکار کرتا ہوں یہ قومی عجائب خانہ مع سارے ماضی، سارے ہندوستان کے میں نے کماری ارونا کو سونپا ___

وہ وہاں سے آگے بڑھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا گیلری عبور کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے کانوں میں یوروپین دانشوروں کی آواز آتی رہی۔

"کاش ہم جان سکتے کہ اس سنگتراش کا نام کیا تھا جس نے یہ مورتی بنائی۔ مگر اس عجیب و غریب ملک میں تاریخ کی کوئی حیثیت نہیں" ڈاکٹر کریمر کہہ رہے تھے۔ "واقعات

کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ حقیقت روایت ہے۔ وقت کا فاصلہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ لمحہ لافانی ہے۔ انسان گمنام ہے۔ اس کی تخلیقات، فن پاروں، تصنیفات کی بھی ابدیت کے اس سمندر میں کوئی علیحدہ حیثیت نہیں سمجھی جاتی۔"

"ہاں۔" موسیو راول نے کہا۔" انسان مرجاتا ہے تو اس کو جلا دیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی تاریخی معنویت کچھ نہیں۔"

"کوئی کرائسس ہندوستانی ذہن پر اثر انداز نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ کرائسس بھی وقت میں شامل ہے۔ تاریخ نہیں ہے ——— ماضی۔ مستقبل۔ فنا۔ بقا۔ کسی شے کا وجود نہیں۔ لہٰذا اب اس جسم کو جلادو۔ کیونکہ یہ اب حال میں شامل نہیں رہا ——" ڈاکٹر اسٹیوارٹ نے کہا۔

"اسی لیے مشرق کے فن کار نے اپنا نام ثبت کرنے کی ضرورت کبھی نہ سمجھی۔ کاش ہم ان سنگتراشوں کے متعلق بھی کچھ جان سکتے ——" ڈاکٹر گریبر نے چاروں طرف دیکھ کر کہا۔" یہاں کتنے مائیکل اینجلو بڑے اطمینان سے ہنسی خوشی گمنام مرگئے ——!"

کمال گیلری سے باہر نکل آیا۔

"یہ احساس کہ ہم خود وقت ہیں ——" موسیو راول کہہ رہے تھے۔

"وسعت کو محسوس کیا جاتا ہے۔ وقت کو صرف سوچا جاسکتا ہے۔" ڈاکٹر گریبر کہہ رہے تھے۔

کمال سیڑھیاں اتر کر باہر سرخ بجری کی چوڑی سڑک پر آگیا۔ اور پی بلاک کی طرف روانہ ہوگیا۔

کسٹوڈین سے دماغ کھپانے کے بعد وہ گوتم نیلمبر سے ملنے واپس نہیں گیا۔ وہ سیدھا لاج کے گھر پہنچا۔ اور اس نے لاج سے کہا۔ اگر میرا فون آئے تو کہہ دینا۔ میں ابھی واپس نہیں آیا ہوں۔ پھر وہ کمرے کا دروازہ بند کرکے اسٹیشن جانے کے وقت تک پڑا سوتا رہا۔

گوتم ایک گھنٹے تک ریسٹوران میں کمال کا منتظر رہا۔ اس نے کئی جگہ ٹیلیفون کیے

جب کمال کی طرف سے بالکل نا امید ہوگیا تو پھر اپنے دفتر لوٹا۔ بدھ جینتی کے سلسلے میں حکومت بڑے زوروں کی پبلسٹی کر رہی تھی اور اسے چراغ جلے تک دفتر میں مصروف رہنا پڑتا تھا۔ ایک انتہائی ضروری اور فوری فائل کے سلسلے میں اس نے اپنی منسٹر کماری اردنا باجپئی کو فون کیا۔

مگر معلوم ہوا کہ کماری اردنا باجپئی ڈاکٹر ہینس کریمر کو لے کر نیشنل میوزیم گئی ہوئی ہیں لاحول ولا قوۃ" ——— اس نے غصے سے کہا۔ کمال سے نہ مل سکنے کی وجہ سے وہ بے حد مضمحل تھا۔ اسے اس ملک پر، اپنے آپ پر، کمال پر، دنیا کی ہر چیز پر غصہ آرہا تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو ڈاکٹر کریمر اور ڈاکٹر اسٹوارٹ اور کماری اردنا باجپئی ان سب کو کچا چبا ڈالتا۔

فائل بے حد ضروری تھی اور اسے جلد از جلد محکمے کے جوائنٹ سیکرٹری کو پہنچانا تھا۔ وہ کار میں بیٹھ کر راشٹرپتی بھون پہنچا۔ میوزیم کے اندر جا کر اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ مگر وہ لوگ وہاں سے جا چکے تھے۔ بے دھیانی سے وہ کمروں میں گھومتا رہا۔ ایک مورتی کے سامنے انفرمیشن ڈویژن کے پمفلٹ پڑے تھے جو شاید ڈاکٹر کریمر یہاں بھول گئے تھے۔ گوتم نے جھک کر وہ اٹھائے۔ پھر اس نے بے دھیانی سے مورتی کو دیکھا۔ شراوستی کی سدرشن یکشنی۔

اس کی شکل بھلا کیسی تھی۔ اس نے دفعتاً سوچنا شروع کیا۔ پھر اس نے غصے سے چلتے چلتے مرمریں فرش پر زور سے پیر پٹخے۔ تم سمجھتی کیا ہو اپنے آپ کو۔ میں نے تو تمہیں کبھی کچھ بھی نہیں سمجھا۔ میں تو تمہاری شکل بھی بھولتا جا رہا ہوں۔ شکل تو محض ہیولےٰ ہوتا ہے۔ میرے دل کے اندر جو روپ محفوظ ہے۔ اسے صرف وشوا کرمن ہی پہچان سکتا ہے۔

مورتی جو شراوستی کی کھدائی میں برآمد ہوئی تھی کدم کی ٹہنی جھکائے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اسے دیکھا کی۔ گوتم نے اس کے قریب جا کر اس کے چہرے کو چھوا۔

ARCHAIC سنگتراشی کا اچھا نمونہ ہے۔ اس نے دل میں کہا۔ کلچرل پبلسٹی کے رسائل میں اس تازہ دریافت کے متعلق ایک مضمون ہو جانا چاہئے۔ اس نے ایک مستعد

اور فرض شناس پبلسٹی ایکسپرٹ کی طرح سوچا۔ پھر باہر نکل آیا۔

شام پڑے کمال، لاج کے گھر سے اسٹیشن کے لئے روانہ ہوا۔

"ابھی ٹرین میں دیر ہے۔ آؤ تمہیں گھما لائیں۔" جی جا جی نے تجویز کیا۔ "تم دن بھر گھامڑ بے مارے مارے پھرے ہو اب تازہ ہوا کھاؤ گے طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔" وہ پہاڑی پر گئے۔ حدِ نظر تک نئی بستیوں کی روشنیاں تیزی سے جگمگا رہی تھیں۔ پٹیل نگر۔ آزاد نگر۔ قرول باغ۔ رج کے علاقے میں کالجوں کی دنیا میں چہل پہل تھی۔ یونیورسٹی۔ میرانڈا ہاؤس سینٹ اسٹیفنز۔ بے شمار نئے کالج بن گئے تھے۔ سپرو ہال میں بڑے غلام علی خاں کا کونسرٹ ہو رہا تھا۔ ایک تھیٹر میں ہیر رانجھا کا اوپیرا دکھایا جا رہا تھا۔ آرٹ گیلریوں میں نمائشیں منعقد ہو رہی تھیں۔ بڑی بڑی دوکانوں پر ساریاں پہنے جوڑے باندھے سیلز گرل باوقار انداز میں سامان فروخت کر رہی تھیں۔ برلا مندر کے سامنے ہجوم تھا۔ اوپر سنگِ مرمر کے فرش پر جگہ جگہ لوگ منہ کے بل پڑے ہوئے تھے۔

لکشمی نرائن کی بھدی بدذوق خالص مڈل کلاس جیسا مورتیاں پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجمع کو دیکھ رہی تھیں۔ اوپر گیتا بھون میں ہارمونیم پر کیرتن ہو رہا تھا۔ چاندنی کے فرش پر مڈل کلاس عورتوں اور مردوں کی بھیڑ تھی۔ جامع مسجد کے سامنے شکستہ حال مسلمان اپنی دوکانیں لئے بیٹھے تھے۔

"دلی دنیا کے خوبصورت ترین دارالسلطنتوں میں سے ہے۔" کار میں اس کے پاس بیٹھی ہوئی لاج خوشی سے کہہ رہی تھی۔ "کل امریکن سفیر کی بیوی روشن آرا کلب میں مجھ سے کہہ رہی تھی کہ یہ تو واشنگٹن کی طرح خوبصورت ہے اور ٹوکیو کی طرح ترقی یافتہ — اور پرانی دلی کو دیکھ کر لندن کی گلیاں یاد آتی ہیں۔ تم تو دنیا گھوم آئے ہو ٹھیک ہے یہ بات ہے؟"

راج گھاٹ میں لوگوں کے غول ہوا خوری کر رہے تھے۔ فوارے چل رہے تھے۔

ایک بوڑھی عورت گاندھی کی سمادھی کے سامنے سجدے میں پڑی تھی۔

ٹرین کا وقت ہو گیا۔ وہ لاج اور جیجا جی کو خدا حافظ کہہ کر کمپارٹمنٹ میں بیٹھا۔ ٹرین آہستہ آہستہ اسٹیشن سے باہر نکلی۔ جمنا کا پل۔ لال قلعے کی دیواریں۔ بازار۔ سڑکیں۔ مکانات۔

وہ کھڑکی میں سے دیکھتا رہا۔ وہ جا رہا ہے۔

براڈ کاسٹنگ ہاؤس کے زینے پر رکھا ہوا نٹراج کا عظیم الشّان مجسمہ۔ جامعہ نگر۔ نظام الدین اولیا۔ متھرا روڈ۔ سب یہیں رہ جائے گا۔ زندگی جاری رہے گی۔ ایک آدمی کے نکل جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ لوگ اب مختلف تھے۔ دوسرے راستے پر جا رہے تھے۔ ان کے اور کمال کے پاس اب کوئی موضوع مشترک نہیں۔ اسے اب ان سے کوئی غرض نہیں۔ وہ بھی اب کمال کی غیر موجودگی کو محسوس نہیں کریں گے۔

پریس کلب میں دنیا بھر کے اخباروں کے نمائندے جمع تھے۔ لوک سبھا میں پنڈت نہرو تقریر کر رہے تھے۔ جامعہ نگر میں اردو ڈرامے پر ریسرچ کی جا رہی تھی۔ للت کلا مندر میں سرکھیا دیوی رقصاں تھیں۔

موسیقی۔ تھیٹر۔ مُووِیز۔ ڈاکومنٹری فلمز۔ بچّوں کے تھیٹر اور ہسپتال۔ عورتوں کی یونیورسٹیاں۔ فیشن شوز۔ بیلے۔ یونیورسٹیوں کی ایئر کنڈیشنڈ لائبریریاں۔ دوسرے پانچ سالہ پلان کے بلیو پرنٹ۔ بھاری انڈسٹری۔ افلاس۔ سوشلسٹ اسٹیٹ۔ نئی دلی کے انتہائی پرتعیش ریستوران۔ امپیریل دتی۔ سوشلسٹ دتی۔ ضلعوں کی کلکٹر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ خواتین۔ سادھو اور بھکاری۔ بجلی کی روشنی سے جگمگاتے ہوئے قصبے اور گاؤں۔ بھودان کی تحریک۔ قدسیہ باغ، روشن آرا باغ اور بیلا روڈ پر ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ اولڈ سول لائینز کی کوٹھیوں میں پھول کھلے تھے۔ ان کے گھاس کے قطعوں پر پرانے زمانے کے کائستھ خاندانوں کے چند افراد بیٹھے طباطبائی کی شاعری پر تبادلہ خیالات کر رہے تھے۔ نیشنل فزیکل لیبارٹریز کی عظیم الشان ایئر کنڈیشنڈ گیلریوں میں سے سائنسدان لڑکیاں سرعت کے ساتھ نکل کر الٹرا ماڈرن سیلف سروس کیفے ٹیریا میں داخل ہو رہی تھیں۔ نئی دتی میں آل انڈیا مشاعرہ ہو رہا تھا۔ روشن آرا کلب کے وسیع لان پر پنکھوں کے نیچے چند اعلیٰ عہدے داروں اور سیٹھوں کی بیبیاں تاش کھیلنے میں مصروف تھیں۔

ٹرین اب کھیتوں میں آ گئی۔ ہر سفر میں بڑی معنویت ہے۔ ہمارا ادھر سے ادھر جانا۔ ایک مرتبہ گوتم نے کہا تھا۔ جب وہ بقول طلعت خلیل جبران کے المصطفیٰ کی طرح مکالمے ادا

کیا کرتا تھا۔

ہندوستان کا سارا سمبل سفر ہے۔ چلتے رہنے، تلاش کرنے کی عادت — شاید اشپنگلر نے لکھا تھا —

اُس نے رادھا کرشنن کی کتاب اُٹھائی —

"ہندوستانی فلسفے میں کوئی کسی کو حکم نہیں دیتا — یہ ضرور کرو۔ یا یوں تم کو کرنا پڑے گا۔ یہاں انسان اپنے فعل کا خود مختار ہے۔"

اُس نے کتاب کھڑکی سے باہر پھینک دی۔ اور سیٹ پر لیٹ گیا۔

پنجاب کے اسٹیشن گزرتے رہے۔ انبالہ۔ لدھیانہ۔ امرتسر۔ دیواروں پر اُردو میں فلموں کے اشتہار لگے تھے۔ پلیٹ فارم کے دُھلے ہوئے فرش پر سکھ عورتوں کی رنگین شلواریں رات کی روشنی میں جھلملا رہی تھیں۔

صبح ہوئی۔ ٹرین امرتسر پہنچ رہی تھی۔ جگہ جگہ مسلمان پیروں کی زیارات تھیں جو سنسان پڑی تھیں۔ سکھ عورتوں کے غول پگڈنڈیوں پر سے گزر رہے تھے۔ سکھ ہلواہے کھیتوں میں پہنچ چکے تھے۔ جگہ جگہ اب بھی مکان جلے ہوئے پڑے تھے۔ امرتسر کے پلیٹ فارم پر شکستہ حال برقعہ پوش عورتیں اور بوڑھے سلاخوں کے ادھر ویزا پر دستخط ہونے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ ایک موٹا سکھ افسر ایک غریب مسلمان عورت سے درشتی سے پوچھ رہا تھا۔ "تمہارا نام کیا ہے —"

"امینہ — یہ میری بیٹی سکینہ ہے۔ یہ پاکستانی ہے۔ میں خورجے سے اسے لینے آئی ہوں۔ اس کا باپ مر رہا ہے۔" پاکستانی سکینہ اپنی بھارتی ماں امینہ سے علیحدہ سلاخوں کے اس پار کھڑی سہمی نظروں سے افسر کو دیکھ رہی تھی۔ "اس کا ویزا ٹھیک ہے نا — " ماں پُر امید آواز میں پوچھ رہی تھی۔

ٹرین چلی — دونوں طرف کے سپاہی ڈبوں میں چڑھے۔

یکایک دوسرا مُلک شروع ہو گیا۔ دو سردار جی گھاس پر کھڑے پہرہ دے رہے تھے۔

میں اب پاکستان میں ہوں۔ ہندوستان سے آیا ہوں۔ مہاجر۔ یو۔پی کا مسلمان۔
مہاجر — پناہ گزین — بے خانماں۔

جب ٹرین نے بارڈر کراس کیا تو وہ جو اتنے دنوں سے اپنی ساری ہمت صرف کرکے اپنے آنسو ضبط کر رہا تھا۔ کھمبے کے پاس ایک سردارجی کو کھیسیں نکالے بندوق تانے کھڑے دیکھ کر وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ پھر اُس نے محسوس کیا کہ اس کا ہم سفر جو پولس کا افسر تھا اور امرتسر سے واپس جا رہا تھا اسے غور سے دیکھ رہا ہے۔

کمال بہت پشیمان ہوا اور اسے لگا جیسے پولیس ا۔ کہہ رہا ہے۔ تم اب تک دو متضاد وفاداریوں کے دوراہے پر کھڑے ہو۔ لعنت ہو تم پر۔

اُسے محسوس ہوا جیسے ساری دُنیا کی آنکھیں اُس کی طرف لگی ہیں۔ تم ہندوستانی ہو۔ ہندوستانی جاسوس۔

ٹرین کے پہیوں میں سے بھی یہی آواز نکل رہی ہے۔ جاسوس۔ غدار — جاسوس غدار۔

اُس نے ہڑبڑا کر آنکھ کھولی۔ ٹرین آہستہ آہستہ لاہور اسٹیشن کے کسٹم کی سلاخوں والے حصے میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

لاہور سے وہ ہوائی جہاز میں بیٹھا۔ ہوائی جہاز نے کراچی کی طرف پرواز کرنا شروع کر دیا۔

اب اُس کی نئی زندگی اُس کے سامنے تھی۔ اُس نے ڈائری نکالی۔ کراچی واپس پہنچ کر اسے کتنے ضروری کام کرنے تھے۔ چچا غلاں سے کلیم کے متعلق سفارش کروانا تھی۔ کوٹھی کے لیے بلیک سے سیمنٹ اور لوہے کا انتظام کرنا تھا۔ مسٹر ایکس کو جم خانہ میں ایک پارٹی دینا تھی بنا۔۔ یں کہاں جاؤں۔ اُس نے خود سے سوال کیا۔ خراب الخطاط پذیر سوسائٹی میں سان کا شریف رہنا کہاں تک ممکن ہے۔۔۔؟ اس مسئلے پر بھی سوچنے کی ضرورت تھی۔
اُس نے ایر ہوسٹس سے پھر کافی منگوائی۔ اور ڈان اخبار اٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔

"کابینہ میں کرائسس وزیر اعظم کا استعفیٰ۔ نئے وزیر اعظم کا جہانگیر پارک میں ملت سے خطاب ۔"

اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ آسمان پر بادل تیزی سے پھیلنے لگے۔ کوئی دم میں بارش شروع ہو جائے گی۔

اس نے کھڑکی کا پردہ برابر کر دیا۔

میں ہی لاش ہوں اور میں ہی گورکن اور میں ہی نوحہ گر۔ اس نے دل میں کہا اور سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

۱۰۱

کچی سڑک پر لڑکا بیل گاڑی ہانکتا ہوا جا رہا تھا۔ ایک اسٹیشن ویگن دھواں چھوڑتی دھول اڑاتی ایک دھچکے کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ سامنے ایک بیل گاڑی اور آ رہی تھی۔ گاڑیبان نے بیل کی دم مروڑ کر موٹر والوں کو ڈانٹا۔ "دیکھ کر نہیں چلات ہو موٹریا۔ ابھی جو ہمرا بیل چپک جایت ——" امریکن اخبار نویس نے فوراً کیمرہ نکال کر اس کی تصویر لے لی۔ پیچھے پیچھے ایک اور موٹر آ رہی تھی۔ اس میں بیٹھی ہوئی مسز باج واڈے نے منڈیا نکال کر جھانکا اور پھر لیڈی کملیش ورما سے باتوں میں لگ گئیں۔ شراوستی ابھی بہت دور تھا۔ سورج بادلوں میں چھپا جا رہا تھا اور بارش سر پہ کھڑی تھی۔ ڈاکٹر راول نے اگلی اسٹیشن ویگن میں بیٹھے ہوئے کماری ارونا باجپئی سے پھر کچھ پوچھنا چاہا۔ اس نے فوراً پبلیکیشنز ڈویژن کی کتابوں ڈل ان کی ناک میں ٹھونس دیا اور سوالات سے بچنے کے لئے ننگ میں جٹ گئی رری موٹر میں لنکا اور جاپان کے چند بھکشو لدے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ہی فلمز ڈویژن کا کیمرہ مین تھا۔ دو تین کسان لڑکیاں منڈیر پہ کھڑی اس قافلے کو دیکھتی رہیں۔ پھر ارہر کے کھیت میں کود کر کام میں لگ گئیں۔ دوسری طرف ٹریکٹر چل رہے تھے۔ سامنے کی موٹر میں بیٹھے ہوئے چند نوجوانوں نے جن گن من گانا شروع کر دیا۔ پچھلی سیٹ پہ زور زور سے باتیں ہو رہی تھیں۔ اس سارے ہنگامے سے بے نیاز

گوتم نیلمبر نے جواب تک موٹر چلا رہا تھا۔ مڑ کر کماری اروناباجپئی سے کہا۔ "اگر وہیل تم لے لو۔ تو میں یہاں سے اتر کر پیدل اپنے گھر چلا جاؤں۔"

"کیا بہت بور ہو گئے —" کماری ارونا نے پوچھا۔ اسے خود سفر کی تکان کی وجہ سے نیند آ رہی تھی۔

"ہاں۔ میں یہیں سے کھیتوں کھیتوں نکل کر چلا جاؤں گا۔ شارٹ کٹ سے۔ ذرا جا کر نہا دھو کر آرام کر لوں۔ صبح سے پھر یہ سارا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ موسیو راول اگر آپ اجازت دیں —" اس نے فرنچ مصنّف کو مخاطب کیا

اس نے موٹر روکی اور اتر کر منڈیر پر کھڑا ہو گیا۔ موٹریں ایک ایک کر کے دھول اڑاتی آگے نکل گئیں۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ بارش کا ایک قطرہ ٹپ سے اس کے بالوں پر آن گرا۔ اس نے ہاتھ پھیلا کر ہوا کو سونگھا۔ اور ارہر کا ایک ڈنٹھل توڑ کر پگڈنڈی پر چلنے لگا۔

مینہ برسنا شروع ہو گیا۔ اس نے پھوار سے بچنے کے لئے آم کے ایک گھنے جھنڈ میں پناہ لی۔ درخت کی جڑ پر بیٹھ کر وہ دیر تک ہوا اور پتّوں کے سنگیت سنا کیا۔ آدھ گھنٹے بعد اس نے پھر اپنا راستہ طے کرنا شروع کیا۔ حدِ نظر تک کھیت لہلہا رہے تھے۔ شہر ابھی بہت دور تھا۔

گوتم نیلمبر نے چلتے چلتے ٹھٹھک کر پیچھے دیکھا۔ راستے کی دھول بارش کی وجہ سے کم ہو چکی تھی۔ گو اس کے اپنے پاؤں مٹّی سے اٹے تھے۔ برسات کی وجہ سے گھاس اور درخت زمرّد کے رنگ کے دکھلائی پڑ رہے تھے۔ اسوک کے نارنجی اور سرخ پھول گہری ہریالی میں تیزی سے جھلملاتے تھے اور بیرے کی ایسی جگمگاتی لڑیاں گھاس پر ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئی تھیں۔ گھاٹ پر کشتیاں کھڑی تھیں اور برگد کے نیچے کسی من چلے ملّاح نے زور زور سے ساون الاپنا شروع کر دیا تھا۔ آم کے جھرمٹ میں ایک اکیلا مور پر پھیلائے کھڑا تھا۔ دوسرے کنارے پر دریائی گھاس اور نیلے پھولوں کی گھنی بیلیں پانی کی سطح پر جھکی تھیں۔ برگد کے سائے تاریک ہو چلے تھے۔ سارس اور مور سمٹے سمٹائے

اُداس کھڑے تھے۔ چار پانچ آدمی انگوچھے کندھے پر ڈالے جلدی جلدی گاؤں کی اور قدم بڑھا رہے تھے۔

بہرائچ کے مضافات شروع ہو گئے۔ سول لائینز کی سایہ دار سڑک پر پہنچ کر وہ اپنے باپ کی زود رنگ کی دو منزلہ کوٹھی میں داخل ہوا۔

اس کے بابا سروپ نرائن لان پر ٹہل رہے تھے۔

"ہلو بیٹے۔" انھوں نے کہا۔ "میں سمجھتا تھا۔ تم غیر ملکی مہمانوں کو لے کر سیدھے سہٹ مہٹ[1] چلے گئے۔"

"جی نہیں بابا۔" اُس نے جھک کر ان کے پیر چھوتے ہوئے کہا۔ "پہلے راستے میں ان کو ہم فارم دکھانے لے گئے تھے۔ ان لوگوں کو سوائے فارم دیکھنے اور کانفرنسیں اٹینڈ کرنے کے اور کوئی کام نہیں۔ ایک مہینے سے مجھے سر کھجانے کی مُہلت نہیں۔"

"تمھاری ڈاکٹر باجپئی تو بڑی قابل لڑکی ہے۔ وہ ان کو سارا ڈوپ دے رہی ہوگی۔"

"جی۔"

پھر وہ اندر جا کر اپنی ماں سے ملا۔

"دمینتی بُوا کہاں ہیں۔۔؟" اُس نے غسل خانے میں نہاتے ہُوئے آواز دی۔

"شہر میں۔ ان کے پاس بھی ہو آنا۔"

"جی اچھا۔"

"تم اچھی طرح ہو بیٹے۔"

"جی ہاں۔ بچّن کا بیاہ کب ہو رہا ہے؟"

"اگلے پھاگن میں۔" ماں نے جواب دیا۔

"پرکاش چاچا کی کوٹھی بن گئی۔"

"نہیں۔ وہ خان بہادر محمد حسین نہیں تھے ریٹائرڈ جج۔ وہ پاکستان چلے گئے۔ ان کی کوٹھی

---

[1] شراوستی کا موجودہ نام

نیلام ہو رہی تھی۔ وہ پرکاش نے لے لی۔ بہت سستی مل گئی۔"

غسل خانے سے نکل کر کھانے کی میز پر بیٹھتے ہوئے اسی طرح کی دو چار اور گھریلو باتیں لیڈی دیپ نرائن سے اس نے کیں۔ پاکستان کے نام پہ اس کے ذہن کے تار جھنجھنا اُٹھے۔ پاکستان کو تو وہ ہمیشہ بھلائے رکھتا تھا۔ حالانکہ ابھی اسے شرادتی کے ان مغربی زائرین کو کشمیر کا مسئلہ بھی سمجھانا ہوگا۔

اس کا دم بے طور گھبرانے لگا۔ اس پر وہی وحشت طاری ہو گئی۔ جس نے چند روز قبل اسے نئی دتی میں آن دبوچا تھا۔

"میں ذرا ہوا کھانے دریا تک جاتا ہوں۔" اُس نے اپنی ماں سے کہا۔

"ابھی تو اتنا لمبا سفر طے کر کے آ رہے ہو۔ اب پھر چل دیئے۔ لیٹ کر آرام کرو۔" ماں نے پریشان ہو کر کہا۔

وہ باہر نکل آیا اور اپنے باپ کی کار لے کر دریا کی طرف چل دیا۔ بارش ختم ہو چکی تھی اور ہوا بند تھی۔ دریا کے کنارے پہنچ کر وہ ایک شکستہ مندر کی سیڑھیوں پر جا بیٹھا۔ یہاں مکمل تنہائی تھی اور وہ بالکل خالی الذہن ہو جانا چاہتا تھا۔ اس لمحے اسے زندگی میں پہلی بار خیال آیا۔ کاش نروان ممکن ہوتا۔ خوف، تنہائی کا احساس، رنج، نفرت، فرار کی خواہش، وسعت اور اضافیت کا تصور — نروان — جو زندگی سے، موت سے، سونے جاگنے، محبت، رحم اور لاتعلقی سے ماورا ہے اور پھر بھی حقیقی ہے۔ معدومیت — صفر — صفر —

کیا یہ غیر ملکی مفکرین سمجھ سکتے تھے کہ اس کے ہندوستان کی روح کے دکھ کیا ہیں؟

اُس نے سگریٹ سلگایا اور مندر کے فرش پر نیم دراز ہو گیا۔ برسات کا زمانہ ہے۔ یہاں سانپ اور کیڑے مکوڑے ضرور ہوں گے۔ اُس نے اطمینان سے سوچا۔ اسے لگا۔ گویا جنگل سے اُس کی بہت پرانی دوستی ہے۔ آخر وہ انہی فضاؤں، انہی پودوں اور درختوں کی معیت میں پلا بڑھا تھا —

دفعتاً اسے پیروں کی آہٹ اور کسی کی مدھم ہنسی کی آواز سنائی دی —

"تم کون ہو بھائی۔" نیچے سے کسی نے پوچھا۔

"میں ہوں۔" گوتم نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔

دوسرا نوجوان مندر کی منڈیر کود کر اندر آ گیا۔

"یہ کیا وحشت ہے — میں تم کو ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔ تمہارے گھر گیا۔ تمہارے اماں ابا نے بتلایا کہ تم دریا پر براج رہے ہو۔"

"ہاں۔ یار۔ اس وقت غیر معمولی حبس طاری ہے — ایک پتہ تک نہیں ہل رہا۔ تمہارا دن کیسا بیتا۔"

"بور ہو گئے میاں۔" ہری شنکر نے قریب کی سیڑھی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ بُڈھا جینٹی، کچھ دن اور اسی طرح چاؤ رہی تو استعفےٰ مرا باحسرت و یاس۔ دیکھو اسی چکر میں لکھنؤ نہ جا سکا۔ بنگلور سے جے ایس کا تار ملتے ہی پہنچا دلی اور اب یہ یاتری لوگ اور نا باچینی کہہ رہی تھی کہ یہاں سے سیدھے کپل وستو اور گیا جانے پر تُلے بیٹھے ہیں۔ راستے بھر ڈاکٹر ہینس کیمر نے مجھے مہایانا اور ہنیان کے فرق پر وہ لیکچر دیئے ہیں کہ بیڑا ہو گیا۔ میرا تمہاری موٹر میں تو صرف رسو را اوکل ہی تھے —"

پھر یک بیک وہ چپ ہو گیا۔ ندی پر شفق کی سرخی پھیل گئی تھی۔ وہ دونوں بے حد اداس ہو گئے۔

"یار گوتم —"

"ہاں۔"

"یار۔ کمال ہمیں دغا دے گیا —" ہری شنکر نے چند لمحوں بعد آہستہ سے کہا۔

"ہاں۔"

"تم کو پتہ ہے۔ سالا دلی ہوتا ہوا گیا۔ اگر مجھے تار دے دیتا تو میں اس سے مل لیتا۔"

"میں تو دلی میں موجود تھا۔ اس کے باوجود وہ مجھ سے نہیں ملا۔" گوتم نے آہستہ سے جواب دیا۔

وہ دونوں پھر چپ ہو گئے۔

"جانے اس وقت وہ کہاں ہوگا" ہری شنکر نے تاسّف سے کہا۔

"کراچی میں ہوگا اور کہاں ہوگا" گوتم نے نیچی آواز میں جواب دیا۔

وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ سیڑھیاں اُتر کر وہ ندی کے کنارے آئے اور پانی کو دیکھتے رہے۔ شاید وہ دونوں اکٹھے سوچ رہے تھے کہ ابوالمنصور کمال الدین کس طرح ہندوستان میں داخل ہوا تھا اور کس طرح ہندوستان سے نکل گیا۔

ندی رواں رہی۔ وہ دونوں جھک کر اس میں اپنا عکس دیکھنے لگے۔ گوتم نے ایک کنکر پانی میں پھینکا اور لہروں کا دائرہ وسیع ہوتا گیا جس میں ان دونوں کے عکس پھیل سے گئے۔

گھاٹ سے کچھ فاصلے پر کمیونٹی پروجیکٹ کے سنٹر میں روشنی ہو رہی تھی۔ لوک گیت منڈلی نے سالانہ یوتھ فیسٹول کے لئے اپنی پریکٹس شروع کر دی تھی۔ ان کی آوازیں تیرتی ہوئی ان دونوں تک آرہی تھیں۔ دُور گاؤں کی چوپال میں نوٹنکی ہو رہی تھی۔ آم کے جھنڈ کے باہر آلہا اودل گایا جا رہا تھا۔ کانگریس کمیٹی کے دفتر میں الیکشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ دور مسلمانوں کے محلے میں پنڈال لگے تھے اور گیس کے ہنڈے نصب تھے اور شاید میلاد شریف پڑھا جا رہا تھا۔ آگے سول لائینز میں ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی میں یوروپین مہمان ڈنر کھا رہے تھے۔

گوتم نے ایک اُلٹی ہوئی ناؤ پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ ندی کے کنارے اکیلا کھڑا تھا۔ ہری شنکر کسی کسان سے باتیں کرتا کمیونٹی پروجیکٹ سنٹر کی طرف جا چکا تھا۔ بادل اب دریا پر بہت نیچے جھک آئے تھے۔

اُس نے اپنے تھکے ہوئے پاؤں کو دیکھا۔ بڑھتی ہوئی تاریکی پر نظر ڈالی لیکن ڈرنے کی کیا بات تھی۔ وہ زمین کے ساتھ تھا۔ زمین اس کی ماں تھی۔ زمین اس کا ساتھ دے گی۔

اُس نے آگے چلنا شروع کیا۔

گھاس کی بھینی خوشبو، پتھروں کی خنکی اور مٹی کی قوت اُس نے اپنے تلووں کے نیچے محسوس کی۔ اُس نے بازو پھیلا کر ہوا کو چھُوا اور آہستہ آہستہ دہرانا شروع کیا۔۔۔ زمین کے

تیری پہاڑیاں، برفانی پہاڑ، اور جنگل مسکرا رہے ہیں۔ میں تیری سطح پر کھڑا ہوں۔ میں مغلوب نہیں ہُوا۔ مجھے کوئی گزند نہیں پہنچا۔ مجھے زخم نہیں لگے۔ میں سالم ہوں۔ مجھے کوئی ختم نہ کر سکا۔

طرح طرح کے پودے اور پھولوں کی ٹہنیاں اس کے راستے میں جھک آئیں۔ پرندے اُس کے ہمراہ سیٹیاں بجا رہے تھے۔ ساون کی بوندیں کنول کے پتوں پر جل ترنگ بجا رہی تھیں۔

وہ ایک منڈیر پر کھڑا ہو گیا اور بھیگی آنکھوں سے اُس نے کھیتوں کو دیکھا۔ بڑھتی جا — بڑھتی جا او جَو کی بالیو۔ تاکہ ہمارے گھڑے بھر جائیں۔ طوفانوں سے محفوظ رہو — جَو کی اونچی بالیو — سمندر کی طرح اتھاہ رہو — وہ سب امر رہیں۔ جو تمھاری خدمت کرتے ہیں۔ تمھارے کھلیان اٹوٹ رہیں۔

وہ منڈیر پر سے اُتر کر پگڈنڈی پر آ گیا اور دریا کے کنارے کنارے سڑک پر چلنے لگا۔ اُفق پر سیاہ بادل گرج رہے تھے۔ اس کے دل میں طوفانی دریا لہریں مار رہے تھے اس کے دماغ میں سُریلے آبشار گیت گا رہے تھے۔ مور جھنکار رہے تھے۔ پپیہے چلا رہے تھے۔ بھنورے گونج رہے تھے۔ کدم کے بہت سے پھول ڈال سے ٹوٹ کر اس کے قدموں میں آن گرے۔

گانے والوں کی آوازیں قریب آتی گئیں۔

منڈلی نے گایا —

بنجر آج ہرے رے
کھیتن میں ناج بھرے رے
جیون آج سپھل رے
اچھی دھان اچھی فصل رے

وہ ٹہنیاں ہٹاتا اس طرف بڑھنے لگا۔ جدھر سے آوازیں آ رہی تھیں۔

ڈالوں کے بیچ بیچ پتوں کے بیچ بیچ

مرتین کی لالن کی لڑیاں اگائے ہو —

او نیرے آئے ہو —

وہ غور سے سُنا کیا۔ جب الفاظ اس کی سمجھ میں آئے اور تبسم اس کے ہونٹوں پر بکھر گیا۔ چٹانیں، او لانش، گلیشر، آندھیاں، طوفان، جھکڑ، ان سب میں سے گزرتا سُر کی لہروں پر بہتا وہ گوری شنکر کی اونچی چوٹی پر چڑھ کر بادلوں میں چھپ گیا۔ چوٹی پر وہ دو زانو بیٹھ گیا اور اُس نے دیکھا کہ چاروں اور خلا ہے اور اس میں ہمیشہ کی طرح وہ تنہا موجود ہے۔ دُنیا کا ازلی اور ابدی انسان۔ تھکا ہُوا۔ شکست خوردہ۔ بشاش۔ پُرامید۔ انسان جو خدا میں ہے اور خود خدا ہے —— وہ مسکرا کر نیچے اُترا۔ اور اس نے آنکھیں کھولیں۔

جاگنے والوں کا جاگنا مبارک ہو۔

قانون کا پرچار مُبارک ہو

سنگھ میں امن مبارک ہو

ان لوگوں کی ریاضت مبارک ہو۔

جنھیں شانتی میسر آگئی ہے۔

شاکیہ منی نے کہا ——

وہ منڈیر پر سے اُترا۔ اُس نے ایک لمبا سانس لیا اور آہستہ آہستہ قدم رکھتا بستی کی طرف واپس چلا گیا۔

ماری پور۔ کراچی۔

اگست ۵۶ء۔ دسمبر ۵۷ء۔